www.KitaboSunnat.com

تفسیر

أحسن الكلام

للشيخ أبي زكريا سيد عبد السلام الرستمي

ترجمہ و تخریج

نصیب شاہ سلفی منجاکوٹی

جلد دوم

سورۃ البقرہ آیت ۲۳۰ تا سورۃ النساء

مکتبہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

library@mohaddis.com

www.KitaboSunnat.com

حقوق طبع محفوظ ہیں

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ

تفسیر

أحسن الكلام

للشيخ أبي زكريا سيد عبد السلام الرستمي رحمه الله

ترجمہ وتخریج

نصیب شاہ سلفی متجاکوٹی

جلد دوم

سورۃ بقرہ آیت ۲۳۰ تا سورۃ نساء

مکتبہ محمدیہ

نیو حاجی کیمپ سلطان آباد کراچی

0343-5302948

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(تمام جملہ حقوق محفوظ ہیں)

کتاب کا نام : تفسیر حسن الکلام

مصنف : شیخ القرآن سید عبد السلام رستمی رحمہ اللہ

مترجم : شیخ نصیب شاہ سلفی منجاکوٹی حفظہ اللہ

اشاعت اول : 2021

ملنے کا پتہ : مکتبہ محمدیہ نیو حاجی کیمپ سلطان آباد کراچی

0300-2615407 - 0347-5114825

جامعہ عربیہ لاشاعۃ التوحید والسنۃ بڈھ بیر پشاور۔ 0313-8580078

اسکے علاوہ پاکستان کے ہر بڑے شہر کے معروف مکتبہ سے حاصل کریں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
1.	تین طلاق کے بعد حکم شرعی	1
2	علامہ [illegible] کی نظر میں	2
3	تین طلاق کے ایک ہونے پر قدیم اجماع ہے	4
4.	رضاعت کے مسائل	10
5	شوہر کی وفات پر عدت	14
6.	نماز عصر کی تاکید	22
7	قیام رکن نماز ہے	23
8.	دور جاہلیت میں عورتوں کے ساتھ عدت میں ظلم	25
9.	موت کے خوف سے غیر شرعی راستہ اختیار کرنے کا نتیجہ	29
10.	بنی اسرائیل کی تاریخ	33
11.	خلافت کا حقدار کون؟	35
12.	بنی اسرائیل کے صندوق کا واقعہ بطور معجزہ	37
13.	لفظ سکینہ قرآن میں 6 مرتبہ مذکور ہے	38
14.	طالوت بادشاہ کی سیاست	40
15.	داؤد علیہ السلام کا واقعہ	43
16.	نبیوں کی الگ الگ خصوصیات	47
17.	محمد ﷺ سب سے اعلیٰ درجہ آخری نبی کو حاصل ہے	47
18	آیۃ الکرسی کے فضائل	52
19.	آیۃ الکرسی میں متعدد اقوال سے 18 ناموں کا اثبات	52
20.	اکراہ اور جبر کا فرق	58
21.	طاغوت کے معنی	58
22	اللہ کی دوستی اور شیطان کی دوستی کے نتائج	60
23.	نمرود اور ابراہیم علیہ السلام کے درمیان مناظرہ	62
24.	عزیر علیہ السلام کا واقعہ	66
25.	ابراہیم علیہ السلام کے چار پرندوں کے انتخاب کا واقعہ اور طرز عمل کی تشریح	71
26.	انفاق فی سبیل اللہ کیلئے مثالیں	79
27.	حرمت سود اور اس کی تشریح	105
28.	لین دین سے متعلق آیت مداینہ	114
29.	صحابہ کرامؓ کے دلوں کا امتحان اور کامیابی	127
30.	اس سورۃ کی خصوصیات	135
31.	سورۃ آل عمران میں اہم مضامین اور سبب نزول	137
32.	سورۃ کا بنیادی مضمون اہل نصاریٰ کے شرک پر دو طریقوں سے رد	139
33.	متشابہ کی تشریح	147
34.	تاویل کی تشریح	152
35.	فتنہ پرور لوگوں کی علامات	153
36.	انسانی خواہشات کی تفصیل	164

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

37	کافروں سے محبت کی غیر شرعی قسمیں	183
38	تقیہ کا معنی اور اس کی تشریح	184
39	اللہ تعالیٰ سے محبت رسول کی اطاعت میں مضمر ہے	189
40	صحابہ سے عداوت کی جگہ مرتا ہے عمل کرو کیونکہ صحابہ والے میں سب تو ابو جہل عبد المطلب ، عمر ابن عبد العزیز ... میں ہو گئے	197
41	نبی علیہ السلام کو قرآن کریم پر اجتہاد سے آزادی حاصل ہے	198
42	کرامات اولیاء اور اہل حق کا نظریہ	199
43	قبر پرستوں کی دلیلیں اور ان کی حقیقت	201
44	پانچ خواتین جن سے مریم بھی ہیں جو تمام خواتین سے افضل ہیں	207
45	اہل شرک کی تردید	210
46	... کی تشریح	221
47	موسیٰ اور ابراہیم علیہم السلام کے درمیان فاصلہ	236
48	تجارت میں جھوٹی قسموں پر وعید	244
49	امت محمدیہ دو متضاد چیزوں تک	247
50	لفظ کان قرآن میں 71 مقامات پر مختلف معنوں کیلئے آیا ہے۔	248
51	غیر اللہ کے لئے سجدہ جائز نہیں	250
52	موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو میری پیروی کرتے	251
53	قرآنی آیات کی ...	258
54	محبوب مال اللہ تعالیٰ کی رضا میں خرچ کرنا اعلیٰ معیار کی نیکی ہے	261
55	زمین پر پہلا گھر اللہ کیلئے کعبہ بنا ہے	204
56	حبل اللہ سے قرآن مراد ہے	273
57	تفرق و اختلاف میں فرق	277
58	کچھ لوگوں کے چہرے سفید اور کچھ کے سیاہ ہوں گے	278
59	ہر مسلم خرچ کیجیے اللہ تعالیٰ نے آپ دوست قرار دیئے	294
60	مختار کل صرف اللہ ہے	301
61	اللہ کی کرسی اور عرش کی عظمت	306
62	مومنین گناہوں پر اصرار نہیں کرتے	311
63	نبی کریم کی موت کی افواہیں	318
64	ابو بکر کا خطبہ	320
65	عقیدہ میں آسانی اور تنگی دور ہے	327
66	صحابہ کرام کی احد میں اجتہادی غلطی اور امت کیلئے درس و نصیحت	328
67	عثمان کے متعلق ایک خارجی کے اعتراض پر ابن عمر کا جواب	336
68	شان رسول کا بیان	339
69	خیانت پر امت کے لئے شدید وعید	342
70	انسانوں میں سے رسول کیوں بنایا	344
71	منافقین کی تردید کیلئے اللہ کی راہ میں شہادت کی عظمت	349

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نمبر	عنوان	صفحہ
72	صبغت اللہ کی وضاحت	372
73	زکوٰۃ نہ دینے پر قیامت کے دن مال کا اژدھا بن جانا	372
74	نبی کریم رات کو تہجد کیلئے اٹھتے تو ان آیات کے آخر تک تلاوت فرماتے	375
75	مختلف چیزوں میں فکر کا حکم دیا گیا ہے	377
76	رابطوا کی تشریح اور نماز کا ارتباط	386
77	سورۃ النساء کی تفسیر	387
78	معاشرے سے انسداد ظلم	387
79	سورۃ نساء کی فضیلت	388
80	یتیم کے متعلق احکام	392
81	یتیم بچیوں کے احکام	394
82	نسل بڑھانے کی ترغیب	397
83	هنيئاً مريئاً کی تشریح	401
84	میراث سے محرومی کے اسباب 4 ہیں	411
85	میراث کا علم ان تینوں آیتوں میں ہے احادیث میں توضیح و تشریح ہے	410
86	... ابو بکر سے ... حاصل ہوئی ... جب انہوں نے ...	411
87	ماں باپ کو برابر کا حصہ	413
88	کلالہ سے مراد کیا ہے	422
89	دور جاہلیت میں عورتوں پر ظلم	426
90	... کے حوالے سے کسی روایت میں نقل ہے ... ضعیف ہے	429
91	محرمات ابدیہ کی تفصیل جو کہ 14 ہیں	430
92	"الا ما قد سلف" کے معنی	437
93	"المحصنات" کی مراد کیا ہے	444
94	اسلامی معاشرہ ...	448
95	اس صورت کی آٹھ آیتوں کی فضیلت	448
96	... بیویوں سے ...	451
97	مردوں کو عورتوں پر حکمران بنایا ہے	457
98	خواتین کی اصلاح کے تین طریقے	463
99	نبی کریم پر ابن مسعود کی تلاوت اور نبی کی قیامت پر گواہی	470
100	حرمت شراب کی تفصیل	477
101	فتیل، نقیر، قطمیر کی تشریح	493
102	جبت اور طاغوت کی تشریح	495
103	ہر ایک کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت کے ماتحت ہوگی	505
104	اختلاف کی صورت میں اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرنا	507
105	مقلدین و منافقین کی یکساں صفات	510
106	مبتدعین کے غلط استدلال کا تفصیلی جواب	514
107	منافقین کی آٹھ بری صفات	530
108	سلام ... آداب سلام	547
109	مومن کے قاتل کی سزا کی تشریح	557

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

575	صلاۃ خوف سفر	.110
580	نبی کی موجودگی میں کوئی دوسرا نماز نہیں پڑھا سکتا	.111
584	شعائر اللہ کی تشریح	.112
592	اہل تشیع کے غلط استدلال کا جواب آ جاتا ہے	.113
596	نبی کی مخالفت اور مومنین کے راستے سے انحراف	.114
601	اگر [illegible] قوم کے خلاف دشمنی [illegible]	.115
613	عورت شوہر کے خوف سے بعض حقوق معاف کر سکتی ہے	.116
615	میاں بیوی کے اختلاف کی صورت میں صلح	.117
627	لفظ خوف 12 مرتبہ قرآن میں مذکور ہے	.118
635	ایمان والوں کے لئے اللہ و رسول کے فرمان میں فرق نہیں	.119
636	فرق کرنے والے حقیقی کافر ہیں	.120
651	نصاریٰ کے شبہات کا جواب	.121

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فَإِن طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِن بَعْدُ حَتَّىٰ تَنكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۗ فَإِن طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَن يَتَرَاجَعَا إِن ظَنَّا أَن يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۗ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿٢٣٠﴾ ترجمہ: پھر اگر اس کو (تیسری بار) طلاق دے دے تو اب اس کے لئے حلال نہیں ہے جب تک کہ وہ عورت اس کے سوا دوسرے سے نکاح نہ کرے، پھر اگر وہ بھی طلاق دے دے تو ان دونوں کو میل جول کر لینے میں کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ یہ جان لیں کہ اللہ کی حدود کو قائم رکھ سکیں گے، یہ اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں جنہیں وہ جاننے والوں کیلئے بیان فرما رہا ہے (230)

تفسیر 230: اس آیت میں تین حصے ہیں جن میں تیسری طلاق اور اس کے بعد اس سے حلال ہونے کا طریقہ ذکر کیا گیا ہے۔ فَإِن طَلَّقَهَا: امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس لفظ میں تیسری طلاق ہونے پر اتفاق ہے۔ اگر لفظ تسریح میں تیسری طلاق کی طرف اشارہ کیا گیا ہو تو وہ اجمالی تھا اور یہ اس کی تفصیل ہوئی اور اگر لفظ تسریح سے مراد رجوع نہ کرنا ہو تو پھر اس میں مستقل تیسری طلاق کی طرف اشارہ ہے اور اس کی دلیل حرف (فا) ہے جو تیسری طلاق کو ما قبل سے متصل کرتا ہے کیونکہ الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ میں دو اور اس میں تیسری طلاق مذکور ہے۔ اور یہ بھی دلیل ہے کہ طَلَّقَهَا میں جو فاعل کی ضمیر ہے وہ اس شوہر کی طرف راجع ہے جس نے دو طلاقیں دی ہیں اور (ھا) کی ضمیر اس عورت کے لئے ہے جس کو دو طلاقیں دی گئی ہیں۔ اور حرف (فا) میں اشارہ ہے کہ تیسری طلاق دو طلاقوں کے بعد دی ہے تینوں کو جمع نہیں کرنا ہے۔ یہی شرعی طریقہ ہے۔ علمائے احناف نے بھی تین طلاقوں کو ایک مجلس یا الفاظ میں بدعی طلاق قرار دیا ہے کیونکہ یہ شریعت مطہرہ کے خلاف ہے۔ فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِن بَعْدُ حَتَّىٰ تَنكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ: حَتَّىٰ (انتہا) غایہ کیلئے ہے اور لَهُ: ضمیر پہلے شوہر کیلئے ہے اور مِن بَعْدُ تیسری طلاق دینے کے بعد مراد ہے۔ تَنكِحَ: میں عورت کی طرف نسبت کی گئی ہے کیونکہ یہاں صرف نکاح مراد نہیں بلکہ جماع مراد ہے یا پھر اس عبارت میں اختصار ہے۔ احناف نے اس سے مراد لیا ہے کہ عورت خود نکاح کر سکتی ہے۔ زَوْجًا سے دوسرا شوہر مراد ہے۔ جب تَنكِحَ سے جماع مراد لیا جائے تو عقد نکاح پہلے سے ہو چکا ہے اور اگر تَنكِحَ سے مراد عقد نکاح لیا جائے تو زَوْجًا مجازاً (بطور تاویل) ذکر کیا ہے۔ اس لفظ میں متعہ اور فاسد نکاح سے حلال ہونے کی تردید ہوتی ہے کیونکہ اس پر زوج یعنی شوہر کا اطلاق نہیں ہوتا ہے۔ غَيْرَهُ: میں تاکید مراد ہے کہ گزشتہ شوہر نہیں بلکہ دوسری شادی اور دوسرا شوہر مراد ہے۔ اس نکاح سے قبل عدت لازمی ہے دیگر آیتوں کی بنا پر جبکہ گزشتہ شوہر سے نکاح کیلئے دوسرے شوہر سے جماع لازم ہے جو حدیث عُسَيْلَة سے ثابت ہے جسکو امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الشہادات میں ذکر کیا ہے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور اس میں المسیب نے (؟) حتی یذوق العسیلۃ کی بجائے محض جماع کا مفہوم لیا ہے۔ بعض فقہاء نے سعید بن المسیب کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے اور جماع کی شرط کے قائل نہیں تھے مگر امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے اس پر رد کیا اور ثابت کیا ہے حدیث عسیلۃ تو سعید بن المسیب سے بھی منقول ہے۔ فائدہ: حلالہ: یا دوسری شادی کی غرض سے کہ شوہر پہلے کے لئے حلال ہونے کے لئے کیا جاتا ہے؟ اور یہ نکاح کیسا ہے؟ اور عورت پہلے شوہر کے لئے حلال ہو گی یا نہیں؟ [illegible] امام مالک، اوزاعی، سفیان ثوری رحمہم اللہ کا موقف یہ ہے کہ یہ نکاح فاسد ہے اور باطل ہے اور اس سے عورت پہلے شوہر کے لئے حلال نہیں ہوتی ان کی دلیل یہ حدیث ہے: لَعَنَ رَسُولُ اللهِ ﷺ اَلْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهُ اس روایت کو شیخ ناصر صاحب نے بھی صحیح کہا ہے (صحیح سنن ابن ماجہ) یعنی نبی کریم ﷺ نے حلالہ کرنے اور کروانے والے دونوں پر لعنت کی ہے۔ اس کو سنن نسائی اور جامع ترمذی نے نقل کیا ہے۔ اور امام ترمذی نے حسن صحیح قرار دیا ہے (ترمذی کتاب النکاح حدیث 1120، نسائی کتاب الطلاق حدیث 3445، احمد 448/1) اس حدیث پر عمر فاروق، عثمان غنی، ابن عمر رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عمل کیا ہے اور امام سفیان ثوری، امام ابن مبارک، امام مالک، امام شافعی، امام احمد رحمہم اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے اور اس سے اہل الرائے کی تردید ہوتی ہے اور ابن ماجہ میں عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ایسے شخص کو (تَيْسٌ مُسْتَعَارٌ) کرائے کا سانڈ قرار دیا گیا ہے۔ مستدرک حاکم (کتاب الطلاق حدیث 2806) بروایت ابن عمر: كُنَّا نَعُدُّ هٰذَا سِفَاحًا عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ، عہد نبوی ﷺ میں اس کو ہم زنا تصور کرتے تھے۔ امام ذہبی نے علی شرط الشیخین قرار دیا ہے۔ ابن ابی لیلیٰ، اوزاعی کے نزدیک یہ نکاح جائز ہے اور شرط حلالہ باطل ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے دو روایات مروی ہیں: (۱) دخول کے بعد سابقہ شوہر سے نکاح جائز ہے عورت حلال ہو جائے گی۔ (۲) دوسری روایت یہ ہے کہ اس نکاح سے عورت حلال نہیں ہوگی۔ اس میں دیگر اقوال بھی ہیں جن کو امام قرطبی نے نقل کیا ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے مذکورہ حدیث کی طرح مزید (۷) سات احادیث نقل کی ہیں اور اس نکاح کو جمہور ائمہ اور علماء کے نزدیک باطل قرار دیا ہے۔ صحیح قول یہ ہے کہ اس سے عورت حلال نہیں ہوگی اور احناف کی تاویلات حدیث کے ظاہر سے متصادم ہیں۔ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا: اس جملہ میں نکاح ثانی کے بعد پہلے شوہر کے لئے عورت کے حلال ہونے کا ذکر ہے۔ یا تین شرائط کے ساتھ: (۱) دوسرے شوہر کا طلاق دینا (۲) عدت گذارنا (۳) عورت کی رضامندی عَلَيْهِمَا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ضمیر پہلے شوہر کی طرف راجع ہے "أَنْ يَّتَرَاجَعَا": ساتھ شوہر اور بیوی کی طرف راجع ہے "أَنْ يَّتَرَاجَعَا" اس میں حسن معاشرت کے ساتھ نکاح کا نیا عقد ہے "إِنْ ظَنَّا أَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللهِ" ظن سے مراد علم ہے مگر مستقبل کے متعلق تو یقین حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس کو ظن سے تعبیر کیا ہے۔ حُدُوْدَ اللهِ اس سے مراد اچھا سلوک اور میاں بیوی کے واجبی حقوق کی ادائیگی ہے۔ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ: حدود کے بیان سے اس کی تشریح اور وضاحت مراد ہے۔ اور اچھے طریقے سے ان کی حکمتیں، علتیں اور تفصیلات کے ساتھ بیان مقصود ہے۔ لِقَوْمٍ اس میں لام فائدہ کیلئے ہے کیونکہ (انتفاع) فائدے کے لئے علم شرط ہے۔ لفظ قوم میں اشارہ ہے کہ اہل علم کے ذریعے علم سے معاشرے کو قوت اور مضبوطی حاصل ہوتی ہے۔ تین طلاق کا مسئلہ: تین طلاق ایک ہی کلمہ اور ایک ہی مجلس میں پے در پے دیدے تو واقع ہوتی یا نہیں؟ اس مسئلہ میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ پہلا قول: اکثر اہل علم کا ہے کہ اس طرح تین طلاق واقع ہوتی ہے اور اس لیئے تحلیل کا حکم ہے۔ اور چاروں ائمہ کا بھی یہی قول ہے۔ دوسرا قول: علی، ابن مسعود، ابن عباس، زبیر بن عوام، عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم اجمعین، تابعین اور ائمہ یعنی محمد بن اسحق، حجاج بن ارطاۃ رحمہم اللہ، امام طاؤس اور بعض اہل ظواہر اور علماء اندلس یعنی محمد بن زنباع، محمد بن بقی بن مخلد، محمد بن عبد السلام الخشنی، محمد بن مقاتل الرازی کا ہے اس کو طحاوی نے نقل کیا ہے، اصبغ بن حباب، احمد بن مغیث الطلیطلی، اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ، امام ابن قیم الجوزی رحمہم اللہ کا ہے ان علماء کے نزدیک صرف ایک طلاق رجعی واقع ہوگی۔ تیسرا قول: مقاتل اور داؤد ظاہری کا ہے کہ اس سے کوئی طلاق نہیں ہوگی، امام ابن عاشور نے ان دونوں اقوال کو شاذ قرار دیا ہے اور مسلمانوں نے بالاجماع اس قول کو ترک کیا ہے۔ کیونکہ لفظ طلاق اور نیت طلاق کے موجود ہوتے ہوئے کیسے طلاق واقع نہیں ہوگی۔؟ (۴) چوتھا قول ابن جبیر عطاء، ابن دینار، جابر بن زید رحمہم اللہ کا ہے ان کا کہنا ہے کہ عورت باکرہ شوہر دیدہ نہ ہو تو صرف ایک طلاق واقع ہوگی باقی دو طلاق لغو اور باطل ہونگی۔ ان کا کہنا ہے کہ جب کہا جائے کہ "أَنْتِ طَالِقٌ" تجھے طلاق ہے تو ایک واقع ہوگئی اور اس کے لئے عدت نہیں ہے لہذا (ثلاث) تین کیلئے محل باقی نہیں رہا اور پہلے قول میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک حیض اور نفاس میں طلاق دینا یا تین طلاق اکٹھی دینا طلاق بدعی یعنی خلاف سنت ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک بدعی نہیں ہے۔ دلائل کی تفصیل: قول اول کے قائلین کے دلائل حدیث عویمر ہے جس کو امام بخاری و مسلم نے باب لعان میں ذکر کیا ہے (صحیح بخاری حدیث 4745

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کتاب التفسیر، صحیح مسلم فی اللعان حدیث 1492، ابوداؤد 2245، 5308) اس روایت میں ہے کہ انہوں نے لعان کے بعد اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی تھیں لیکن یہ دلیل درست نہیں کیونکہ ان کی بیوی تو لعان سے حرام ہو گئی اب طلاق کا تو محل نہیں تھا۔ البتہ ان کو لعان سے بیوی کی حرمت کی خبر ابھی نہیں دی گئی تھی۔ لہٰذا یہ طلاق مہمل ٹھہری۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ دور نبوی میں تین طلاق کے واقع ہونے کے بارے میں جو روایات ہیں وہ کذب (جھوٹی) ہیں۔ اور جو صحیح روایات ہیں وہ تین طلاق متفرقہ کے متعلق ہیں۔ فتاویٰ جلد ۳۳ ص ۳۷۔ دوسری دلیل موطا میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کسی نے ان سے کہا میں نے اپنی بیوی کو ۱۰۰ طلاقیں دی ہیں، انہوں نے فرمایا تین طلاق سے تمہاری بیوی کو طلاق ہو گئی اور باقی ۹۷ سے تم نے آیتوں کی تضحیک کی (مذاق اڑایا ہے)۔ لیکن یہ بات گزر چکی ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ صرف ایک طلاق رجعی کے قائل تھے پھر تو یہ دونوں اقوال میں تعارض ہو گیا لیکن بقول امام ابوداؤد رحمہ اللہ، انہوں نے قول اول سے رجوع کیا تھا۔ عون المعبود جلد ۲ صفحہ ۲۲۷۔ الصواعق المرسلۃ ۲ ص ۶۲۱۔ دلیل (۳) امام آلوسی نے فرمایا ہے کہ صحابہ کرام میں سے ایک جماعت نے یہ نقل کیا ہے اور دیگر صحابہ کرام نے اس پر فتویٰ دیا ہے لیکن امام قاسمی نے فرمایا ہے کہ کتاب و سنت اور مسلمانوں کے خلیفہ اول ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور تین سالہ دور خلافت عمر رضی اللہ عنہ میں کسی صحابی نے تین طلاق کے تین ہونے پر فتویٰ نہیں دیا ہے۔ امام ابن قیم فرماتے ہیں کہ کسی صحابی سے متضاد قول اس دور میں ثابت نہیں اور تین طلاق کے ایک ہونے پر قدیم اجماع ہے یعنی جو تین طلاق بیک وقت دے گا تو صرف ایک واقع ہوگی۔ اغاثۃ اللھفان جلد ۱ صفحہ ۳۳۶۔ دلیل (۴) حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ابتدائی تین سالہ دور خلافت میں تین طلاق کو ایک ہی شمار کیا جاتا تھا لیکن پھر عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حکم جاری کیا کہ جس عمل میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کو ڈھیل دی تھی کہ بتدریج عمل کرو لوگوں نے اس میں جلد بازی سے کام لینا شروع کیا ہے لہٰذا عمر رضی اللہ عنہ نے ان پر تین طلاقیں جاری کر دیں (صحیح مسلم باب الطلاق الثلاث 1472) لیکن یہ دلیل درست نہیں کیونکہ یہ قضاء بطور زجر یعنی سزا ہے اور اجتہادی عمل ہے اور اجماع نہیں اس لیے امام شافعی، باقلانی، امام غزالی اور امام رازی وغیرہ نے لکھا ہے کہ یہ اجماع سکوتی حجت شرعی نہیں ہے۔

قول ثانی کے دلائل:۔ (۱) پہلی دلیل کتاب اللہ کی ترتیب ہے یعنی پہلے دو طلاقوں کا ذکر کیا ہے اور پھر بعد میں تیسری طلاق کا اور اس کی حکمت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ظاہر ہے کہ انسان طلاق رجعی میں رجوع کرے اور جلد بازی سے نکاح کا انقطاع نہ کرے۔ اور جب تین طلاقیں ایک ساتھ مانی جائیں گی تو یہ حکمت برباد ہو گی۔ اس حکمت کو سورۃ طلاق میں اس طرح ذکر کیا ہے "لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ أَمْرًا" دوسری دلیل: ابن عثیمین نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے احسان کا حکم دیا ہے لیکن تین طلاق یکمشت دینے والے نے احسان نہیں کیا جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے "اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ" تیسری دلیل: حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ جس کو امام مسلم وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، خلافت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور ابتداء دور عمر رضی اللہ عنہ میں تین طلاقوں کو ایک ہی شمار کیا جاتا تھا (صحیح مسلم باب الطلاق الثلاثۃ حدیث 1472)۔ مخالفین کا کہنا ہے کہ اس میں طاؤس سے وہم ہوا ہے اس کا جواب ابو الولید الباجی نے دیا ہے کہ حدیث طاؤس بالکل درست ہے اور صحیح ہے بڑے بڑے آئمہ حدیث نے اس سے نقل کیا ہے معمر اور ابن جریج وغیرہ جبکہ امام طاؤس خود ہی بہت بڑے امام ہیں۔ نیز ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مخالف روایت کا اعتبار نہیں ہے کیونکہ حدیث مرفوع کی موجودگی میں صحابی کے اجتہاد پر عمل نہیں ہو سکتا ہے۔ چوتھی دلیل: رکانہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے ڈالی تھیں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو رجوع کا حکم دیا تھا (دارقطنی وغیرہ) مخالفین نے اس حدیث پر مضطرب کا حکم لگایا ہے لیکن ابن عاشور فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کی بات کمزور ہے اگرچہ یہ حدیث اعلیٰ درجہ میں نہیں ہے لیکن مضطرب کا اعتراض حقیقت میں بے بنیاد ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ حدیث البتۃ کو علل کے بڑے بڑے محدثین نے ضعیف اور اس کے راویوں کو مجہول قرار دیا ہے جیسا کہ امام احمد امام بخاری، امام ابو عبید، امام ابن حزم وغیرہ حدیث والے طلاق ثلاثۃ کو طلاق البتہ کہتے تھے۔ فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۳۳، ص ۱۵، ۶۷، ۳۳۷۔ پانچویں دلیل: امام دارقطنی نے ابن عمر رضی اللہ عنہ کی تین طلاق ذکر کی ہیں جس پر ان کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رجوع کا حکم دیا تھا مگر وہ روایت ضعیف ہے۔ تیسرے قول والوں کی دلیل: جنہوں نے کہا ہے کہ تین طلاق کہنے سے ایک بھی واقع نہیں ہوگی۔ "وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوْءٍ" اور "الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ" اور اس کے بعد "اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ فَاِنْ طَلَّقَهَا" ان کا کہنا ہے کہ قرآن میں تین طلاقوں کا ذکر اکٹھا نہیں ہے لیکن یہ بات گزر گئی لہذا یہ قول شاذ ہے۔ اور ان کا طریقہ استدلال کمزور ہے۔ فائدہ نمبر ۱: اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ تین طلاق کو ایک ساتھ دینے سے تین واقع ہونے میں اختلاف ہے، اتفاق نہیں یہ اجماعی مسئلہ نہیں ہے۔ ائمہ اربعہ کو چھوڑ کر دیگر علماء نے اختلاف کیا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فائدہ نمبر ۲: دارالافتاء والوں کو چاہئے کہ طلاق دینے والے کے حال کے مطابق فتویٰ دیں کیونکہ اگر غور کیا جائے تو جاہل لوگ تین طلاقیں دینے کے بعد حلالہ کا دروازہ کھولتے ہیں جو کہ سبب لعنت ہے۔ اس مسئلہ کی تفصیل کیلئے فتاویٰ ابن تیمیہ جلد ۳۲ ص ۸۷، ۳۱۱، ج ۳۳ ص ۷، ۱۴، ۶۷، ۷۱، ۹۸، ۱۴ الصواعق المرسلۃ جلد ۲، ص ۶۱۹۔ اعلام الموقعین اغاثۃ اللھفان لابن قیم جلد ا ص ۳۲۵ مذکورہ کتب کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ انہوں نے اس میں مناسب ابحاث لکھے ہیں۔

فائدہ نمبر ۳: شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عمل کا تفصیلی جواب فتاویٰ جلد ۳۳، ص ۹۶ میں ذکر کیا ہے۔ (ا) یہ اجتہادی فیصلہ تھا یہ وقتی سزا ہے لہٰذا یہ شریعت کا لازمی حکم نہیں ہے۔ ابن قیم رحمہ اللہ نے اغاثۃ اللھفان میں ابویعلیٰ کی روایت نقل کی ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے اس فتوے کے مفاسد اور تحلیل کے لیے حیلہ بازیاں دیکھ کر اس پر ندامت کا اظہار کیا تھا۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۫ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾

"اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پھر وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انہیں اچھے طریقے سے رکھ لو، یا انہیں اچھے طریقے سے چھوڑ دو اور انہیں تکلیف دینے کیلئے نہ روکے رکھو، تاکہ ان پر زیادتی کرو اور جو ایسا کرے سو بلاشبہ اس نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ اور اللہ تعالیٰ کی آیات کو مذاق نہ بناؤ اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو اور اس کو بھی جو اس نے کتاب و حکمت میں سے تم پر نازل کیا ہے، وہ تمہیں اس کے ساتھ نصیحت کرتا ہے اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے (231)

تفسیر 231: یہ عطف ہے "فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَا" پر یعنی ایک حکم شرعی کا دوسرے حکم شرعی پر عطف ہوتا۔ اور اس میں ایک جاہلانہ رسم کا رد ہے کہ ان کے نزدیک رجوع میں کوئی تعداد نہیں تھی اور عورتوں کو ستانے کیلئے رجوع کیا کرتے تھے لہٰذا جاہلیت کے اس عمل کو اس آیت میں رد کیا گیا ہے۔ **سوال:** یہ مضمون تو فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ میں گزر گیا ہے تو تکرار کی کیا ضرورت تھی؟ جواب نمبر 1: وہاں طلاق کا مقصد ذکر تھا اور اس میں بیوی رکھنے کی کیفیت کا ذکر ہے۔ جواب نمبر 2: وہاں بیوی کو رکھنا یا رخصت کرنا اختیاری حکم کا ذکر تھا جبکہ یہاں پر جاہلیت کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

طریقے کا رد ہے۔ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ: بلوغ الاجل سے آخری مدت تک پہنچنا مراد ہے۔ جبکہ بعد والی آیت میں مذکور ہے۔ اور یہ مجازاً قرب مدت کیلئے مستعمل ہے کیونکہ عدت گزرنے کے بعد رجوع نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کو مجاز مشارفت کہا جاتا ہے۔ اَجَل کلام عرب میں اس مدت کو کہا جاتا ہے جس میں کسی کام کا تعین ہو جائے اور اس کے کرنے کیلئے اس کو مہلت دی جائے لہٰذا اس کے آخر کو اجل مدت قرار دیا گیا ہے۔ عورت کی طرف بلوغ کی نسبت اور اَجَل کی اضافت کی گئی ہے کیونکہ وہ انتظار میں ہوتی ہے حلال ہونے اور دوسرے نکاح کیلئے بھی۔ ''فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ: اس کو تسریح پر ترغیب اور افضلیت کی وجہ سے مقدم کیا ہے۔ اِمْسَاكٌ سے مراد رجوع ہے بعض علماء کے نزدیک صرف (قول) زبان سے اور بعض علماء کے نزدیک قول اور جماع دونوں سے لازم ہے۔ مَعْرُوْفٍ سے مراد بیوی کے حقوق کی ادائیگی اور اس کو ضرر سے بچانا ہے۔ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ: اس کو جواز اور اختیار کی تکمیل کیلئے ذکر کیا ہے۔ اور معروف سے مراد وہی احسان ہے جو پہلی آیت میں مذکور ہو چکا ہے۔ فائدہ: سابقہ آیت میں احسان اور اس میں معروف کا ذکر ہے اس میں کیا حکمت ہے؟ پہلی بات یہ ہے کہ اس آیت میں معروف سے مراد ضرر سے منع ہے لہٰذا جن سے ضرر کا خطرہ ہوتا ہے ان سے احسان کی توقع یا مطالبہ نہیں ہوتا جبکہ وہاں اختیار کا ذکر تھا اس لیے اس کے ساتھ احسان کا لفظ مناسب تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ معروف اولیٰ ہے اور احسان اعلیٰ ہے جب سابقہ آیت میں احسان کا حکم ہوا تو یہ وہم پیدا ہو گیا کہ تسریح یعنی رخصت کرتے وقت احسان واجب امر ہے تو یہاں پر معروف کا ذکر کر کے واضح ہوا کہ رخصت کے وقت معروف واجب ہے اور احسان تو امر استحبابی ہے۔ ''وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا: اس میں جاہلیت کی رسم کا رد ہے کہ بیویوں سے رجوع کرتے تھے اور بلا ضرورت بیوی کو روک لیتے صرف تنگ کرنے، عدت کو طول دینے اور عورت کو پریشان کرنے کیلئے لہٰذا اس سے منع کیا گیا۔ سوال: یہ مقصد تو فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ میں حل ہو گیا ہے تو تکرار کی کیا ضرورت پیش آئی۔؟ جواب: اس میں دو فائدے ہیں۔ (۱) فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ میں دوام اور ہمیشگی کا حکم نہیں تھا اس لیے نہی لائی گئی تاکہ تمام اوقات کو شامل اور عام ہو جائے۔ (۲) دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ضِرَار بہت ناپسندیدہ عمل تھا اس لیے اس کی نفی کیلئے وضاحت ضروری تھی۔ ضِرَارًا: یہ مفعول لہ ہے اس میں بدسلوکی خرچ میں تنگی عدت میں طول وغیرہ کو شامل ہیں۔ لِّتَعْتَدُوْا: یہ ضِرَار کے ساتھ متعلق ہے یا لام عاقبت کے لیے ہے اور متعلق ہے۔ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ کے ساتھ یہاں اعتداء عام ہے چاہے بیوی پر ہو یا احکام الٰہی میں۔ ''وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ: اس میں ایک وہم کا رد مقصود ہے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جیسا کہ پہلے معلوم ہوا کہ شوہر دو بار تک عورت پر حاوی ہے اور اس کے نفس پر اس کا کوئی وبال نہیں آتا ہے تو اس جملہ میں اس امر کو ختم کیا ہے کہ اصل ظلم تو اپنے اوپر ہے اور دو وجوہات کی بنا پر ہے پہلی وجہ یہ کہ اپنے آپ کو عذاب الٰہی میں گرفتار کرتا ہے۔ دوسری یہ کہ دنیاوی اور اخروی منافع اپنے اوپر بند کر لیتا ہے کیونکہ لوگ اس کی بداخلاقی سے متنفر ہو کر رشتہ نہیں دیں گے اور دنیاوی معاملات میں لوگ اس سے اجتناب کریں گے یہ دنیاوی نقصان ہے اور اخروی نقصان یہ ہوگا کہ حسن معاشرت اور احکام الٰہی کی بنا پر جو اجر و ثواب ملتا ہے اس سے محروم ہو جائے گا۔" وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا: دونوں کے حقوق بیان کرنے کے بعد یہ جملہ تاکید کیلئے لایا گیا ہے۔ کیونکہ اکثر جاہلی لوگ عورتوں کے حقوق کی ادائیگی میں سستی برتتے تھے۔ هُزُوًا اصل میں حقارت کے معنی میں ہے اور آیتوں کی تحقیر یہ ہے کہ ان کو بے عمل چھوڑ دیا جائے یا اصل میں مَهْزُوًّا کے معنی میں ہے۔ اس کے تحت وہ لوگ داخل ہیں جو آیتوں کا مذاق اڑاتے ہیں یا آیتوں کا کفر کرتے ہیں یا طلاق دینے غلام آزاد کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ یہ جاہلیت والوں کے طریقے تھے جو ہمارے معاشرے میں آج بھی رائج ہیں مثلاً پر نادم نہ ہونے والا، طلاق میں سنت سے تجاوز کرنے والا۔ یہ سب آیت مذکورہ میں داخل ہیں جیسا کہ امام قرطبی اور امام ابوحیان نے لکھا ہے۔" وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ: اس جملہ میں سابقہ احکام پر عمل کرنے کی تاکید ہے اور آیتوں کے مذاق کے مقابل ہے۔ نعمت سے مراد اسلام اور احکام کا بیان اور رسول اللہ ﷺ کی بعثت و ہدایت ہے۔ ذکر سے مراد شکر اور اس پر عمل ہے۔" وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ یہ نِعْمَتَ اللّٰهِ" پر معطوف ہے خاص کو عام پر عطف کیا ہے۔ اور یہ نعمت ہی کے اجمال کی تفصیل و تفسیر ہے۔ عَلَيْكُمْ میں امت کی شرافت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ کتاب و سنت کی اتباع کے مکلف ہیں اگرچہ انزال صرف رسول اللہ ﷺ پر ہوا ہے۔ کتاب سے قرآن، حکمت سے سنت مراد ہے۔ ابن کثیر، قرطبی، ابوحیان رحمہم اللہ نیز امام ابوحیان رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس میں دلیل ہے کہ سنت بھی مُنَزَّلٌ مِّنَ اللّٰهِ ہے جیسا کہ سورۃ نجم آیت ۳ میں مذکور ہے يَعِظُكُمْ بِهٖ یہ ضمیر اَنْزَلَ سے حال ہے یا مبتدا ہے اور يَعِظُكُمْ اس کی خبر ہے۔ اصل میں وعظ امر و نواہی اور تخویفات کو کہا جاتا ہے جو منع اور زجر کی صورت میں مذکور ہیں۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ یہ جملہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ پر عمل کرنے کیلئے تاکید ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کتاب و سنت پر عمل کرنے سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔" وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ: اعمال بعض ظاہر بعض مخفی ہوتے ہیں اور نیتوں میں بھی فرق ہوتا ہے اس کی تاکید کیلئے یہ جملہ بطور تنبیہ لایا گیا ہے۔ وَاعْلَمُوْٓا میں اشارہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ مذہب و سنت سے انحراف اور مخالفت کے وقت انسان مثل جاہل ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی اس صفت سے بے خبر ہوتا ہے۔ اس امر میں علم کا ذکر اہم امر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس صفت پر عقیدہ و ایمان رکھنے سے کتاب و سنت پر عمل پیرا ہونا آسان ہوتا ہے اور اصل تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَن يَنكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُم بِالْمَعْرُوفِ ۗ ذَٰلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَن كَانَ مِنكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۗ ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ "اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پھر وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انہیں اس سے نہ روکو کہ وہ اپنے شوہروں سے نکاح (تجدید) کر لیں۔ جب وہ آپس میں اچھے طریقے سے راضی ہو جائیں۔ یہ بات ہے جس کی نصیحت تم میں سے اس کو کی جاتی ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو۔ یہ تمہارے لیے زیادہ ستھرا اور پاکیزہ ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے" (232)

تفسیر 232: اس آیت میں تدبیر منزل کے امور میں سے گیارہواں حکم ہے۔ اس میں ان کی اس رسم کا رد ہے کہ وہ عورت کو عدت کے ختم ہونے پر شوہر سے (تجدید) دوسرے نکاح کر لینے سے منع کرتے تھے۔ چاہے سابقہ شوہر سے یا کسی دوسرے سے۔ اس آیت میں اس رسم سے اجتناب کا حکم ہے۔ اس میں بھی دو جہات ہیں: (۱) غیرت نفسانی (۲) حکم شرعی۔ پہلے والے سے اجتناب لازم ہے اور دوسرے والے پر عمل ضروری ہے۔ ربط نمبر ۱: پہلے ضرر اور تعداد طلاق کی جاہلیت کی رسم کا رد ہوا اور رجوع کی تعداد اور ضرر وغیرہ جبکہ اب ایک اور رسم کا رد ہے۔ ربط نمبر ۲: سابقہ حکم حالت عدت سے متعلق تھا اور یہ عدت کے بعد کے حالات سے متعلق ہے۔ "وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ" آیت کا سبب نزول یہ اس عورت کے بارے میں ہے کہ طلاق کے بعد عدت کی مدت ختم ہونے پر سابقہ شوہر سے نکاح چاہتی تھی اور ولی اس کو منع کرتا تھا۔

ذَٰلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَن كَانَ مِنكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ: رسم و رواج کی مخالفت نفسوں پر مشکل گزرتی ہے اس لیے تین تاکیدات کا ذکر ہو رہا ہے۔ پہلی تاکید اس جملہ میں ہے کہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ حکم الٰہی پر عمل کیا جائے۔ ذٰلِكَ میں عضل سے منع کرنے کا اشارہ ہے۔ يُوعَظُ سے مراد تذکیر اور تخویف ہے۔ ایمان باللہ سے شرعی احکام پر ایمان مراد ہے اور ایمان بالآخرت سے مراد احکام الٰہی کی مخالفت پر عذاب آخرت کا خوف ہے۔ "ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ": دوسرا یہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دوسرے بسری نے اس میں ترتیب کے بعد قریب ہے۔ ذٰلِکُمْ میں اس وقت کا نکاح کی اجازت دینے کی طرف اشارہ ہے۔ اَزْکٰی کے معنی سے ایسا کیا جانا پاکیزگی کے معنی میں ہے یعنی دنیا میں ترقی، برکت اور آخرت میں اجر کثیر ہو گا۔ اَطْہَرُ سے مراد گناہوں کا ازالہ ہے اور اَزْکٰی سے مراد برائی سے بچنا ہے اور اَطْہَرُ سے مراد یہاں یہ بھی ہے کہ شخص بدکاری سے پاک رہے۔ کیونکہ جب مرد و عورت نکاح چاہتے ہیں اور اولیاء ان کا نکاح کر لیتے ہیں تو ہو سکتا ہے وہ دونوں خفیہ طور پر تعلقات قائم کر لیں جو بعد میں اور بھی بڑے مفاسد کا موجب ہوں۔ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ: یہ تیسرا جملہ ہے اس میں حکم شرعی اور رسم و رواج کے فرق کی طرف اشارہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام میں انسانوں کے لیے فائدے اور مصلحتیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم لوگ اپنے علم میں نہیں ہیں۔ لہٰذا ایک مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ رسم و رواج کو چھوڑ کر احکام شرعی پر عمل پیرا ہو جائے۔

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ ۖ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۚ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ بِوَلَدِهِ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَٰلِكَ ۗ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۗ وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا آتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٣٣﴾ "مائیں اپنی اولاد کو دو سال کامل دودھ پلائیں جن کا ارادہ دودھ پلانے کی مدت پوری کرنے کا ہو اور جن کے بچے ہیں ان کے ذمے ان کا روٹی کپڑا ہے جو دستور کے مطابق ہو۔ ہر شخص کو اتنا ہی مکلف بنایا جاتا ہے جتنی اس کی طاقت ہو۔ ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے یا باپ کو اس کی اولاد کی وجہ سے کوئی ضرر نہ پہنچایا جائے۔ وارث پر بھی اسی جیسی ذمہ داری ہے۔ پھر اگر دونوں (ماں باپ) اپنی رضامندی اور باہمی مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں اور اگر تمہارا ارادہ اپنی اولاد کو دودھ پلوانے کا ہو تو بھی تم پر کوئی گناہ نہیں جب کہ تم ان کو مطابق دستور کے جو تم نے ان سے طے کیا ہے ادا کر دو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور جانتے رہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔" 233

ف 233: گزشتہ احکام میں سے یہ بارہواں حکم ہے اور اس میں طلاق اور عدت کے بعد تربیت اولاد کا مسئلہ ذکر ہو رہا ہے جس میں ... عدت ختم ہونے کی تعلق سے ہوتا ہے۔ ربط 1: گزشتہ آیت طلاق اور عدت کے بعد نکاح کرنے سے متعلق ایک حکم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ذکر ہوا جس میں رد کیا گیا تھا نکاح کے بارے میں عورت پر ظلم کرنے پر۔ اب ایسی طلاق اور عدت کی حالت میں دودھ پلانے کے بارے میں عورت پر ظلم کرنے پر رد کیا جا رہا ہے جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں ہوتا تھا کہ عورت سے زبردستی دودھ پلانے کا مطالبہ ہوتا تھا۔

ربط ۲: بعض اوقات مطلقہ عدت کے بعد رضاعت کی وجہ سے دوسرا نکاح نہیں کر سکتی کیونکہ دودھ پلانے میں مصروف رہتی ہے اور نان نفقہ کی وجہ سے بچے کا والدین میں اختلاف پیدا ہوتا ہے اس لیے اس آیت میں اس کی تفصیل ذکر کی گئی ہے۔ اس آیت میں (۹) جملے ہیں اور ہر جملے میں الگ حکم اور مقصد ہے۔ پہلا جملہ۔ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ: یہ سابقہ آیت کے مضمون پر عطف ہے اور مناسبت (ربط) پہلے گزر چکی ہے۔ وَالْوَالِدٰتُ: اس میں دو احتمالات ہیں: پہلا احتمال یہ عام ہے مطلقہ اور عام عورتوں کو شامل ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد صرف عدت گزارنے والی مطلقہ عورتیں ہیں۔ یہ قول چار وجوہات کی بنا پر راجح ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ سابقہ آیت پر عطف ہے اور اس میں خاص مطلقہ عورتیں مذکور ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ رضاعت کی مدت میں اختلاف حالت نکاح میں نہیں بلکہ فراق (جدائی) میں پیدا ہوتا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ بعد والے ارشاد میں فرمایا ہے کہ "وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ: جبکہ طلاق سے قبل تو یہ شوہر پر واجب ہے یعنی دودھ پلاتی ہو یا نہیں اور بعض حالت عدت میں بھی یہ اس پر لازم ہے۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ طلاق دینے کے بعد دونوں میں بغض اور نفرت پیدا ہوتی ہے اس لیے عدت دو سببوں سے بچے کو تکلیف دیتی ہے۔ (۱) اس کو خرچہ نہیں ملتا۔ (۲) دوسرے شوہر کی رغبت چاہتی ہے جبکہ دوسرا شوہر اس بچے کو پالنا نہیں چاہتا۔ مذکورہ وجوہات کی بنا پر وَالزَّوْجٰتُ نہیں فرمایا بلکہ وَالْوَالِدٰتُ فرمایا ہے۔ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ: یہ خبر ہے اور امر استحبابی کے معنی میں ہے جس کی دلیل سورۃ طلاق آیت 6 میں وارد ہے۔ البتہ دودھ پلانا والدہ کا حق ہے اگر وہ خوشی سے دودھ پلاتی ہے بلا معاوضہ یا والد مالدار ہو اور اس کو معاوضہ دے سکتا ہو تو پھر والدہ کی رضامندی لازمی ہے۔ اس کی رضا کے بغیر کسی اور سے دودھ نہیں پلوا سکتے۔ حَوْلَيْنِ حول کے معنی گھومنا اور چکر کاٹنا ہے، سال کو حول اس لیے کہا جاتا ہے کہ مختلف موسموں کے اعتبار سے سال چکر کاٹتا ہے اور اس سے مراد قمری چاند کا حساب ہے۔ کیونکہ شرعی حساب چاند سے کیا جاتا ہے اس میں (کاملین) اکثری حصہ مراد نہیں ہے بلکہ کامل دو سال یعنی چوبیس مہینے مراد ہیں۔ "لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ: اس کا مبتدا مقدر (مخفی) ہے یعنی هٰذَا الْحُكْمُ لِمَنْ الخ۔ (مَنْ) سے مراد والدین یا والد فوت ہونے کی صورت میں قریبی ورثاء ہیں۔ یعنی ان میں سے ایک دودھ پلانا چاہتا ہو اور دوسرا انکار کر رہا ہو تو مذکورہ حکم ہے اگر دونوں رضامندی سے دودھ چھڑانا چاہتے ہیں تو پھر ان کیلئے ان الفاظ میں ذکر ہے۔ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا فائدہ: رضاعت کی مدت میں اختلاف ہے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اکثر اہل علم جن میں عمر، ابن عباس، ابن مسعود رضی اللہ عنہم بھی ہیں اور امام زہری، امام قتادہ، امام شعبی، امام سفیان ثوری، اوزاعی، احمد بن حنبل، امام شافعی، امام ابو یوسف، امام محمد بن حسن رحمہم اللہ کا قول ہے کہ مدت رضاعت دو سال ہے اس سے اضافی دودھ پلانا منع ہے جس کی دلیل یہ آیت ہے۔ کیونکہ اس میں حَوۡلَیۡنِ تثنیہ کا ذکر ہے۔ کَامِلَیۡنِ اور پھر "اَنۡ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ" اس پر واضح دلائل ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ مدت رضاعت ڈھائی سال بتاتے ہیں۔ وَحَمۡلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوۡنَ شَهۡرًا سے استدلال کرتے ہیں۔ لیکن لفظ ثلاثون کو صرف فصالہ سے متعلق کرنا بلاغت کلام سے بہت ہی بعید ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک قول منقول ہے کہ اگر بچہ رحم میں (6) مہینے گزارتا ہے تو دودھ کی مدت 24 مہینے اور (7) والے کیلئے 23 اور (8) والے کیلئے 22 اور (9) والے کیلئے 21 مہینے میں تکمیل ہوگی۔ اس کی مزید تفصیل سورۃ احقاف میں ہوگی ان شاء اللہ۔ وَعَلَى الۡمَوۡلُوۡدِ لَهٗ رِزۡقُهُنَّ وَكِسۡوَتُهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ: یہ دوسرا جملہ ہے اس میں بچے کے والد پر دودھ پلانے والی کا خرچہ اور لباس کا ذکر ہے۔ اَلۡمَوۡلُوۡدِ لَهٗ بچے کا والد ہے۔ یہاں پر لفظ وَالِدٌ یا اَبٌ اس لیے ذکر نہیں کیا کہ بچے کے والد پر جو نعمت الٰہی ہے اس کو یاد دلانا ہے کہ وہ دودھ پلانے والی کا حق ادا کرے دوسرا سبب یہ ہے کہ نسب والد کے ساتھ منسلک ہوتا ہے البتہ بعض قرائن سے ثابت ہے کہ حسن و حسین رضی اللہ عنہما فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف نسباً منسوب ہیں جو کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملتا ہے۔ رِزۡقُ سے نان و نفقہ اور کِسۡوَتُ سے لباس مراد ہے۔ بِالۡمَعۡرُوۡفِ عرف سے لیا گیا ہے جو کہ باعتبار جنس رزق و لباس ہے۔ اور مقدار میں اعتبار عرف کا ہوگا۔ چونکہ ان حالات میں خواتین نقد رقم کا مطالبہ نہیں کرتیں بلکہ کفالت نان و نفقہ لباس کا مطالبہ کرتی ہیں۔ اس لیے اس کی تخصیص کی گئی۔ لَا تُكَلَّفُ نَفۡسٌ اِلَّا وُسۡعَهَا: یہ تیسرا جملہ ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ اس میں اعتبار والد کی مالی حالت کا ہے اس حساب سے دیا جائے گا اس میں مقدار متعین نہیں اور نفس سے والد یا والدہ مراد ہے تو معنیٰ یہ ہوگا کہ والد کو اسراف پر مجبور نہیں کیا جائے گا اور والدہ کو نان و نفقہ میں تنگ اور پریشان نہیں کیا جائے گا۔ یہ آیت اپنے عموم پر محمول ہے اور مراد تمام احکام ہیں جیسا کہ اس سورۃ کی آیت 286 میں مذکور ہے اور نفقہ کا حکم بھی اس میں داخل ہے۔ اصل میں تکلیف وہ حکم ہے جس کے کرنے سے مشقت کا اثر چہرے یا بدن پر ظاہر ہو جانے جیسا کہ (كَلَفُ الْوَجْهِ) اصطلاح شریعت میں ان تمام ضروری احکام کو کہا جاتا ہے جو تمام عاقل و بالغ انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہوئے ہوں۔ وُسۡعَ اصل میں کھلے برتن کو کہا جاتا ہے البتہ اس سے مراد استطاعت ہے گویا کہ نفس احکام کو شریعت کیلئے ایک وسیع برتن کی مانند قرار دیا گیا ہے۔ "لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوۡلُوۡدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ: یہ چوتھا جملہ ہے اور سابقہ جملہ کی تشریح یا تفسیر ہے۔ یعنی والدہ کیلئے جائز نہیں کہ رضاعت سے انکار کرے یا زیادہ اجرت کا مطالبہ کرے یا شوہر نان نفقہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے انکار کرے یا عورت دودھ پلانے سے منع کرے لَا تُضَآرَّ میں دو احتمال ہیں۔ پہلا احتمال: یہ مجہول کا صیغہ ہے یعنی لَا تُضَآرَّ اصل میں لَا تُضَارَرْ ہے اور سابقہ معنی اس کے مطابق ہے اور وَالِدَةٌ نائب فاعل ہے۔ دوسرا احتمال: یہ ہے کہ یہ معلوم کا صیغہ ہے۔ لَا تُضَآرِّ اور وَالِدَة اس کا فاعل ہے والدہ بچے کی وجہ سے والد کو تنگ نہیں کرے گی یعنی زیادہ اجرت کا مطالبہ نہیں کرے گی یا رضاعت سے انکار نہیں کرے گی۔ جبکہ بچے کا والد بچے کی وجہ سے بچے کی والدہ کو تنگ نہ کرے کہ انہیں دودھ پلانے سے روک دے یا نان نفقہ نہ دے۔ یہاں ولد (بچہ) کی نسبت دونوں کی طرف شفقت کی وجہ سے کی گئی ہے۔ ورنہ نسب تو صرف والد سے منسلک ہے۔ اس لیے "وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ فرمایا۔" "وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ" کے مصداق میں (۶) اقوال ہیں مگر اس میں صحیح قول ضحاک، قبیصہ اور بشیر بن نصر وغیرہ رحمہم اللہ کا ہے۔ ان اقوال کو امام قرطبیؒ، ابوحیانؒ نے نقل کیا ہے کہ اس سے مراد بچہ، مرضعہ دودھ پلانے والی ہے۔ یعنی والد فوت ہو جائے تو اس بچے کو میراث ملے گا اس میں سے والدہ کو نان و نفقہ دیا جائے گا اور میراث نہ ملنے کی صورت میں ورثاء پہ یہ ذمہ داری عائد ہوگی۔ اس قول کے صحیح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ الْوَارِثِ اسم فاعل ہے اس کو کہا جا سکتا ہے جس میں صفت وراثت موجود ہو اور والد کے فوت ہونے کے بعد یہ بچہ وارث ہو سکتا ہے۔ لہٰذا "اَلْوَارِثِ" میں الف لام مضاف الیہ سے بدل ہے۔ یعنی وَارِثُ الْمَوْلُوْدِ لَهٗ. مِثْلُ ذٰلِكَ اس میں اشارہ ہے کہ نان و نفقہ احسن طریقے سے بغیر ضرر و تکلیف دیئے کے ادا کرنا ہے۔ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا: یہ چھٹا جملہ ہے اور پہلے والے جملے سے متعلق ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دو سال کامل دودھ پلانا واجب نہیں ہے۔ فَاِنْ اَرَادَا، مِنْهُمَا، عَلَيْهِمَا ضمائر میاں بیوی کی طرف راجع ہیں۔ فصال اور فطام کا معنی ایک ہے یعنی بچے کو ماں کا دودھ چھڑانا۔ عَنْ بعد یا اجلیہ کے معنی میں ہے۔ "عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا" اس سے مراد یہ ہے کہ دودھ چھڑانا ضرر یا خوف سے نہیں بلکہ دونوں کے مشورے سے ہوگا۔ وَتَشَاوُرٍ یعنی ماں باپ بغیر مشورے کے دودھ چھڑانے پر راضی ہو جائیں۔ مشورے میں اپنی رائے اور فکر کو بچے کے فائدے اور مصلحت میں استعمال کرنا ہے۔ یعنی مشورے کے بغیر رضامندی فائدہ نہیں دیتی ہے۔ اصل میں مشورہ رائے لینے کو کہا جاتا ہے جس میں بندہ دوسرے ساتھی کے مشورہ کا محتاج ہوتا ہے اس لیے اس کو باب مفاعلہ یا تفاعل سے ذکر کیا جاتا ہے۔ "فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا" یعنی دو سال کی تکمیل سے پہلے اگر دودھ چھوٹ جائے تو میاں بیوی پر گناہ نہیں۔ "وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ: یہ ساتواں جملہ ہے اس میں والدین کو خطاب ہے اور اس میں غائب سے مخاطب کی طرف التفات کیا گیا ہے۔ اس جملہ میں مستقل حکم ہے یعنی کسی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

غیر عورت سے دودھ پلانا اور یہ اس وقت ہوسکتا ہے جب والدہ یا دودھ پلانے سے قاصر یا انکاری ہو مگر ماں باپ دونوں راضی ہوجائیں رضاعی ماں سے دودھ پلانے پر۔ "اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا" کا معنیٰ ہے دودھ والی خاتون سے طلب رضاع۔ "اَوْلَادَكُمْ" میں لام مقدر ہے دودھ پلوانا اجرت پر ہوتا ہے اس لیے بعد میں شرط کا ذکر کیا گیا ہے۔ اِذَا سَلَّمْتُمْ تسلیم میں مکمل اجرت دینے کا معنیٰ ہے یعنی مقرر کردہ اجرت میں کمی نہیں کریں گے۔ "مَّآ اٰتَيْتُمْ" میں وہ اجرت دینا مراد ہے جو دونوں نے بالاتفاق مقرر کی ہے۔ امام زمخشری کے بقول وہ جو تم نے دینے کا ارادہ کیا ہو۔ "بِالْمَعْرُوْفِ" سے مراد رواج کے مطابق ہے یعنی نہ بہت زیادہ اور نہ کم یا مراد مدت شرعی ہے۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اس میں اشارہ ہے کہ احکام شرعیہ عقد و اجرت میں مرضعیہ میں رعایت قائم رکھو اور یہ آٹھواں جملہ ہے۔ "وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ": یہ نواں جملہ ہے تذکیر اور تنبیہ کیلئے ہے۔ بَصِيْرٌ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے بغیر تشبیہ، تمثیل، تاویل اور تحریف ماننا چاہیے۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾

"تم میں سے جو لوگ فوت ہوجائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، وہ عورتیں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن عدت میں رکھیں، پھر جب مدت ختم کرلیں تو جو وہ اچھائی کے ساتھ اپنے لئے کریں اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں اور اللہ تعالیٰ تمہارے ہر عمل سے باخبر ہے" (234)

تفسیر 234: اس میں تدبیر منزل کے امور میں سے تیرہواں حکم ہے جو وفات کی عدت سے متعلق ہے اور اس میں مقصد جاہلیت کے طریقے سے اجتناب ہے۔ اس حکم میں بھی دو جہات ہیں۔ (۱) جاہلیت کا طریقہ۔ (۲) شریعت کا طریقہ۔ ربط ۱: سابقہ آیت میں عدت طلاق کا ذکر گزر گیا تو اب "مُتَوَفّٰى عَنْهَا" جس کا شوہر فوت ہوجائے اس کی عدت کا ذکر ہے۔ ربط ۲: سابقہ آیت میں "اَلْوَارِثُ" میں خاوند کی وفات کی طرف اشارہ تھا اور اس میں عورت کے نفقہ رضاعت کا ذکر ہوا تھا تو اب شوہر کی وفات پر عدت کا ذکر ہو رہا ہے۔ "وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ" یہ قصہ کو قصہ پر عطف کیا گیا ہے اور اس میں مناسبت خواتین کے مسائل کا حکم ہے۔ تَوَفّٰى اصل میں کسی چیز کا پورا پورا لینا ہے۔ لہٰذا فوت ہونے والا اپنا رزق اور عمر مقرر لیکر دنیا سے چلا گیا۔ یا بدن اور روح دونوں قبض کر دیئے گئے۔ مراد موت ہے۔ "وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا" یہ لفظ عام ہے بیوی آزاد ہو یا لونڈی جس سے مباشرت کی گئی ہے یا نہیں حاملہ ہے یا غیر حاملہ۔ بالغہ ہے یا غیر بالغہ۔ اکثر فقہا کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نزدیک لونڈی اس میں داخل نہیں کیونکہ اس کی عدت دو ماہ ۵ دن ہے اور اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور مجتہدین کے نزدیک حاملہ بھی اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ اس کی عدت بچے کی ولادت ہے۔ جس کا ذکر سورہ طلاق نمبر ۴ میں ہے اور صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4909 اور صحیح مسلم کتاب الطلاق حدیث 1484 میں میں سبیعہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ شوہر کی وفات سے ۱۵ دن بعد اس نے بچے کو جنا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ آپ کی عدت پوری ہو گئی اب آپ دوسرا نکاح کر سکتی ہیں۔ البتہ جس سے مباشرت نہیں کی گئی وہ اس حکم سے مستثنیٰ نہیں کی گئی ہے۔ ''يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا'': یہ الَّذِيْنَ کی خبر ہے مگر تقدیری عبارت کے ساتھ یعنی ''وَاَزْوَاجُ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ'' يَاَزْوَاجُهُمْ يَتَرَبَّصْنَ'' تَرَبَّصْنَ: سے مراد عدت ہے مگر لفظ عدت ذکر نہیں کیا کیونکہ تَرَبَّصْنَ میں عدت کی طرف اشارہ ہے چونکہ دوسرے نکاح سے منع ہے۔ شوہر کے گھر میں رہے گی، خوبصورت کپڑے سرخی پاؤڈر، کریم، مہندی، ناخن پالش، خوشبو اور زینت کے دیگر تمام امور سے گریز کرے گی اس کو (احداد) کہا جاتا ہے جن سے سنت مطہرہ میں ان ایام کے دوران میں ممانعت ثابت ہے۔ عَشْرًا اس لیے فرمایا کہ اس کی تمیز لَيَالِيْ راتیں مراد ہیں۔ اس لیے عَشْرَةً نہیں فرمایا ہے۔ جمہور کے نزدیک دسواں دن بھی اس میں داخل ہے۔ امام ابوحیان نے فرمایا ہے کہ جب معدود مذکر ہو اور مقدر ہو تو اسم عدد تانیث و تذکیر دونوں آسکتا ہے اور یہاں مراد ایام ہیں۔ امام دمشقیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ ایام غم پریشانی کے ہیں عدت اور حزن کی وجہ سے راتوں کے مشابہ ہیں۔ فائدہ: اس مدت کے مقرر کرنے میں فائدہ یہ ہے کہ عورت کے رحم کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ حمل ہے یا نہیں۔ اور سبب یہ ہے کہ چار مہینوں میں ماں کے رحم میں بچہ تیار ہوتا ہے۔ چار مہینوں کے بعد اس میں روح ڈالی جاتی ہے پھر وہ حرکت میں آتا ہے۔ جب چار مہینے اور دس دن گزر جائیں اور ماں کے رحم میں کوئی حرکت وغیرہ محسوس نہ ہو تو معلوم ہوا کہ رحم بچے سے خالی ہے اور یہ خاتون دوسرے شخص سے نکاح کر سکتی ہے۔ یہ ابوالعالیہ کا قول ہے۔ ''فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ: اس جملہ میں اشارہ ہے کہ چار مہینے دس دن گزرنے کے بعد اس عورت پر طریقہ جاہلیت کی طرح کوئی گناہ نہیں ہے۔ بُلُوْغُ اَجَلُ سے مراد عدت کا اختتام ہے۔ عَلَيْكُمْ میں عورت کے اولیاء، حکام اور علماء سب داخل ہیں کیونکہ وہ ''نَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ'' اور اَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ کے مکلف ہیں۔ بِالْمَعْرُوْفِ: دوسرا نکاح زیب و زینت اختیار کرنا شوہر کا گھر چھوڑنا یعنی منتقل ہونا یہ سب مراد ہے۔ ''وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ: اس میں مخالفت کرنے والوں کے لئے تنبیہ ہے۔ خَبِيْرٌ: یعنی باریک چیزوں، باطن چیزوں کا علم رکھتا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنتُمْ فِي أَنفُسِكُمْ ۚ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ
سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَن تَقُولُوا قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ
يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۝ ع

"اور نہیں ہے تم پر کوئی گناہ ان الفاظ میں جن کے ذریعے تم ان عورتوں سے نکاح کا اشارہ کرتے ہو، یا اپنے دل میں پوشیدہ ارادہ کرو، اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ تم ضرور ان کو یاد کرو گے۔ لیکن تم ان سے پوشیدہ وعدہ نہ کر لو ہاں یہ اور بات ہے کہ تم بھلی بات بولا کرو اور عقد نکاح جب تک کہ عدت ختم نہ ہو جائے پختہ نہ کرو، جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ ان باتوں پر بھی عالم ہے جو تم دلوں میں رکھتے ہو تو ڈرو ان سے اور یہ بھی جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ بخشش اور علم والا ہے۔" (235)

تفسیر 235: اس آیت میں امور تدبیر منزل میں سے چودھواں (۱۴) حکم ہے۔ شوہر کی وفات کے بعد عورت کو نکاح کا پیغام دینے سے متعلق ہے۔ اور مقصود اس آیت میں اس عدت کی حالت میں چند امور سے اجتناب مقصود ہے (1) نکاح کے خفیہ وعدے سے (2) عقد نکاح سے منع فرمایا ہے۔ اور دو باتوں کی اجازت دی ہے۔ (۱) اشارۃً نکاح کا پیغام۔ (۲) دل میں نکاح کا ارادہ رکھنا۔ اور اس مسئلہ میں یہ دونوں مذکور صورتیں ہیں۔ ربط ۱: سابقہ آیتوں میں طلاق اور اس کی عدت وفات اور عدت کا ذکر گزر گیا تو اب حالت عدت میں نکاح کے پیغام کا ذکر ہو رہا ہے۔ ربط ۲: پہلے فرمایا کہ عورت عدت کے بعد معروف کام کر سکتی ہے تو اب فرمایا کہ یہ کام یعنی نکاح عدت میں حرام ہے۔ اس مناسبت کی وجہ سے ماقبل پر اس کو عطف کیا ہے۔ وَلَا جُنَاحَ۔ جُنَاحَ لغت میں مشکل کام کو کہا جاتا ہے اور شریعت میں گناہ کو کہا جاتا ہے اور عَلَيْكُمْ میں عام مسلمانوں کو خطاب ہے۔ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ بلغت میں تعریض تصریح کی ضد ہے اور اصطلاح میں کلام کو اس طرح ترتیب دینا کہ معنی کے اعتبار سے مقصد پر دلالت کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور غیر مقصود پر بھی مگر اس میں مقصود کی طرف اشارہ مکمل ہو۔" مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ: خطبہ اصل میں خطب کے معنی میں ہے۔ اور خطب حاجت کو کہا جاتا ہے۔ خطبہ خطابت سے لیا گیا ہے اور اس سے مراد کسی عورت سے نکاح کرنے کے بارے میں باتیں کرنا ہے۔ اور تعریض کے الفاظ یہ ہیں کہ اس کی خوبیاں بیان کی جائے اور اپنا ارادہ ظاہر کرے کہ میں نکاح کا ارادہ رکھتا ہوں اور اپنی صفات بھی بیان کرے۔ النِّسَاءِ: سے عورتوں کی بعض اقسام مراد ہیں۔ وہ عورتیں جو عدت وفات میں یا عدت طلاق مغلظ یا بائنہ میں ہوں یا لعان والی ہوں اگرچہ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ أَوْ أَكْنَنتُمْ فِي أَنفُسِكُمْ "اِکْنَان" اعلان کی ضد ہے۔ چھپانے کے معنی میں ہے یعنی نکاح کا ارادہ رکھتا ہے مگر اظہار بھی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نہیں کرتا اور تعریض بھی نہیں یعنی تصریح و تعریض دونوں سے اجتناب کرتا ہے۔ یا دل میں پختہ ارادہ کرتا ہے کہ عدت گزرتے ہی میں واضح پیغام دوں گا۔ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ یہ لَا جُنَاحَ کیلئے علت ہے یعنی جب دل میں میلان اور رغبت پیدا ہو جائے تو اس کو ختم کرنا مشکل ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کو ختم کرنے کیلئے اور ایمان والوں کو تنگی سے نجات کیلئے دو طریقے بتائے ہیں۔ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ: اس کے بعد مخفی عبارت ہے یعنی تعریض اور اکنان کے ذریعے سے ذکر کر سکتے ہو اور یہ ذکر زبان یا دل سے ہوگا۔ بعض مفسرین کے بقول اس میں ڈانٹ ہے۔ "وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا: اس استدراک میں دو قول ہیں۔ (۱) یہ "سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ: سے استدراک ہے یعنی اقسام اور طریقے تو بہت ہیں مگر ان میں سے بعض اقسام یہاں ممنوع ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ پہلا جملہ مقدر ہے یعنی ان کو یاد کرو ان کا تذکرہ کرو مگر مخفی وعدے سے گریز کرو (سِرًّا) کے معنی میں بھی بہت سے اقوال ہیں۔ (۱) اس سے مراد زنا ہے۔ (۲) اس سے خفیہ وعدہ کرنا نکاح کیلئے (۳) نکاح کا صراحتاً اعلان کرنا۔

اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا: یہ استثنیٰ منقطع ہے کیونکہ لفظ معروف (سِرًّا) کی جنس میں سے نہیں ہے۔ لہٰذا اِلَّا لٰكِنَّ کے معنیٰ میں ہے۔ یا استثنیٰ متصل ہے مگر لَا تُوَاعِدُوْهُنَّ سے لہٰذا عبارت اس طرح ہے۔ لَا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا اور معروف سے تعریض مراد ہے جو گزر گئی یعنی اس سے احسان مصالحت کفالت کی باتیں ذکر کرنا یہ تعریض کیلئے ہے۔ "وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ: عزم کسی کام پر پختہ ارادے کو کہا جاتا ہے جس کے صلہ میں علیٰ آتا ہے۔ جو یہاں پر مقدر ہے۔ عزم کبھی وجوب ایجاب کیلئے آتا ہے جو رخصت کے مقابل ہوتا ہے۔ اس معنی میں یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور پہلے معنی کے لحاظ سے یہ اللہ تعالیٰ کیلئے صفت نہیں ہو سکتی۔ ایجاب وجود کیلئے سبب ہوتا ہے تو معنی یہ ہوگا کہ نکاح مت کرو۔ عقد مضبوط کرنے اور باندھنے کو کہا جاتا ہے۔ عُقْدَةَ گرہ باندھنے کو کہا جاتا ہے اس لیے نکاح اور دیگر عقد میں اس کا استعمال ہوتا ہے کہ یہ ایک پختہ مضبوط ہے۔ کتاب مکتوب کے معنی میں ہے یعنی فرض کیا ہوا وقت۔ امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ کتاب قرآن کے معنی میں ہے۔ یعنی فَرْضَ الْقُرْاٰنُ اس میں مضاف مخفی ہے۔ اجل مدت کی انتہا کو کہا گیا ہے۔ "وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ" یہ تخویف اور تنبیہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ ہر حال میں ظاہر و مخفی اعمال کو جانتا ہے۔ فَاحْذَرُوْهُ ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے یعنی عِقَابَهٗ اس کے عذاب سے ڈرو۔ امام زمخشری کے بقول یہ ضمیر "مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ کی طرف راجع ہے۔ جس سے مراد غیر شرعی چیزیں ہیں۔ "وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ: خوف کے بعد اب بشارت کا ذکر ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مومن کا ایمان خوف اور امید کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

درمیان واقع ہے۔ مَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ تکرار سے آئے گا تو علم بھی اپنے متعلق کے ساتھ تکرار سے آنا چاہئے۔ دوسرے جملہ میں خبر کو اسم ذکر کیا ہے جو ہمیشگی اور ثبوت کیلئے ان صفات پر دلیل ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚۖ وَّ مَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾

"اگر تم عورتوں کو بغیر ہاتھ لگائے اور بغیر مہر مقرر کئے طلاق دے دو تو بھی تم پر کوئی گناہ نہیں، ہاں انہیں کچھ نہ کچھ فائدہ دو۔ خوشحال اپنے اندازے سے اور تنگدست اپنی طاقت کے مطابق دستور کے مطابق اچھا فائدہ دے۔ بھلائی کرنے والوں پر یہ لازم ہے۔" (236)

تفسیر 236: امور تدبیر منزل میں سے اس آیت میں پندرھواں امر ہے۔ اس آیت میں بیوی کے ساتھ ہم بستری کر لے سے پہلے طلاق دینے کا مسئلہ بیان ہو رہا ہے بتقدیر مہر سے پہلے یا بعد میں۔ اور اس میں مقصد جاہلیت کے مظالم سے اجتناب ہے۔ اس میں دو جہات ہے پہلی اس آیت میں دوسرا، دوسری آیت میں۔ ربط: اس مقام تک ان خواتین کے مسائل بیان ہوئے جن کے ساتھ شوہروں نے ملاپ کیا ہے یا بیوہ عورتوں کی عدت۔ اب ان خواتین کا ذکر ہو رہا ہے جن سے ابھی تک شوہروں نے ملاپ (جماع) نہیں کیا ہے۔ "لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ" مَا مصدریہ ظرفیہ ہے یعنی نہ چھونے کی مدت۔ مسیس جماع سے کنایہ ہے اور اصل میں جماع آدمی کا عمل ہے اس لیے اسکی طرف نسبت کی گئی ہے۔ سوال: اس سے تو یہ بات معلوم ہوئی کہ مہر مقرر کرنے سے پہلے اور جماع سے پہلے طلاق دینے میں گناہ نہیں حالانکہ جماع کرنے اور مہر مقرر کر لینے کے بعد بھی گناہ نہیں ہے تو اس تخصیص کا کیا فائدہ ہے؟

جواب ۱: یہاں پر طلاق دینے کیلئے عام جواز ہے خواہ عورت حائضہ ہو یا (طاہرہ) پاک ہو۔ جبکہ جماع کے بعد حالت حیض میں طلاق منع اور گناہ ہے۔ (تفسیر اللباب)۔ جواب ۲: امام ابن عطیہ، زمخشری اور قفال نے کہا ہے کہ یہاں پر جُنَاحَ سے مراد خسارے اور نقصان کا ثقل (بوجھ) ہے۔ جس کو (تَبِعَة) کہا جاتا ہے۔ یعنی اس قسم کی طلاق میں مہر وغیرہ کا نقصان نہیں ہے۔ خواہ پورا ہو یا آدھا، اس کیلئے نہ چھونا اور مہر مقرر نہ کرنا قرینہ ہے۔ نیز آنے والی آیت اس آیت کے مقابل ہے۔
جواب ۳: امام ابن عاشورؒ کا قول ہے کہ احادیث سے ثابت ہے کہ شوہر بیوی سے احسن طریقے سے پیش آئے صحیح بخاری حدیث 5186 صحیح مسلم حدیث 1468 اور نکاح کا مقصد مستقل رکھنا ہے صرف عارضی لذت لینا نہیں ہے جیسا کہ بعض

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لوگوں کا مزاج ہے کہ کثرت سے شادیاں کرتے ہیں اور لذت عارضی حاصل کرنے کے بعد طلاق دیتے ہیں جو کہ حدیث میں منع ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ جماع سے قبل طلاق میں گناہ کا وہم تھا جب نکاح میں ہمیشہ رکھنے کا ارادہ ہو۔ اسی طرح نکاح کے بعد طلاق دینا سبب گناہ ہے جب صرف لذت لینا مقصود ہو۔ تو لَا جُنَاحَ کے ذریعے اس وہم کو ختم کیا۔

اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً یہ تَمَسُّوْهُنَّ پر معطوف ہے اور اَحَدُ الشَّيْئَيْنِ کے لیے دونوں میں سے ایک یعنی دونوں سے خالی ہونا مراد ہے۔ یا اَوْ اِلَّا اَنْ کے معنیٰ میں ہے یا واو کے معنیٰ میں ہے۔ فرض متعین کرنے کے معنیٰ میں ہے اور فَرِيْضَةً مفعول بہ ہے جس کا معنیٰ شَيْئًا مَفْرُوْضًا ہے۔ اس آیت سے ثابت ہوا کہ صرف نکاح کے الفاظ سے مہر فرض نہیں ہوتا بلکہ مقرر کرنے اور جماع سے لازم آتا ہے۔ اور یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ مہر نکاح کی تکمیل سے تعلق نہیں رکھتا۔ یعنی تَوَابِعْ اور مُتَتِمَّات میں سے نہیں ہے۔ وَّمَتِّعُوْهُنَّ: اس میں شوہروں کو حکم ہے اور هُنَّ سے مراد وہ عورتیں ہیں جو جماع اور مہر مقرر کرنے سے پہلے طلاق پا چکی ہوں۔ اکثر علماء اس امر کو وجوب کیلئے مطلق مانتے ہوئے عورت کو کچھ دینا واجب سمجھتے ہیں۔ جبکہ بعض کے نزدیک یہ حکم مستحب کے درجے میں ہے۔ اس میں کوئی شرعی مقدار نہیں ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ متعہ کا اعلیٰ درجہ غلام لونڈی دینا ہے اور ادنیٰ درجہ قمیص شلوار، ازار، دوپٹہ اور چادر دینا ہے۔ بقول امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے یہ رقم آدھا مہر یعنی پانچ درہم سے زیادہ نہیں ہوگی۔ " عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ: یہ دلیل ہے کہ شوہر کی مالی حیثیت کا اعتبار کیا جائے گا عورت چاہے غریب ہو یا مالدار۔ لفظ عَلٰی بھی فائدے کا سامان دینے کے وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ اَلْمُوْسِعِ یعنی شوہر کے مالی حالت یعنی مالدار شوہر مراد ہے۔ قَدَرُهٗ میں مضاف پوشیدہ ہے یعنی قَدَرُ وُسْعِهٖ۔ قَدْرَ اور قَدَرَ میں بہت سے علماء فرق نہیں کرتے مگر بعض علماء کہتے ہیں کہ جب "قَدْرَ" دال کے سکون کے ساتھ ہو تو معنیٰ وسعت اور طاقت ہے۔ اور اگر قَدَرَ۔ دال کے زیر کے ساتھ ہو تو معنیٰ مقدار ہے اَلْمُقْتِرِ۔ قتر سے ہے تنگدستی کو کہتے ہیں یعنی تنگ رزق والا قَدَرُهٗ یعنی قَدَرَ اِقْتَارِهٖ۔ اس کی تنگدستی کے مطابق یعنی " قَدَرُ وُسْعِهٖ۔ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ یہ مفعول مطلق ہے اور تمتیع کے معنیٰ میں ہے۔ یا مَتَاعًا حال ہے بِالْمَعْرُوْفِ اور اس کی مقدار وہ ہوگی جو عرفاً یا شرعاً معلوم ہو جو دینے والے پر بھاری نہ ہو۔" حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ، حَقًّا متاع کیلئے صفت بنتا ہے یا فعل مقدر ہے۔ یعنی حَقَّ حَقًّا۔ وجوب کے معنیٰ میں ہے۔ محسنین سے مراد مومنین ہیں کیونکہ ہر مومن اسلام کے سبب اپنے ساتھ احسان کرتا ہے نیز ہر نیک عمل کرنے والا محسن ہوتا ہے اور یہ مومن کی صفت ہے۔ بعض اہل علم کے نزدیک یہ سامان واجب نہیں ہے اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ان کی دلیل لفظ محسنین ہے اور ان کا کہنا ہے کہ کامل مؤمن کو محسن کہا جاتا ہے۔لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ان تمام اعمال کی ترغیب کیلئے محسن صفت کو ذکر کیا گیا ہے۔

وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَا الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۚ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٣٧﴾ ”اور اگر تم عورتوں چھونے سے پہلے طلاق دو اور تم نے ان کا مہر بھی مقرر کر رکھا ہو تو مقررہ مہر کا آدھا مہر دے دو، یہ اور بات ہے کہ وہ خود معاف کر دیں یا وہ شخص معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے تمہارا معاف کر دینا تقویٰ کے بہت قریب ہے اور آپس کی مہربانی کو فراموش نہ کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے“ (237)

تفسیر 237: اس آیت میں ان عورتوں کے مہر کا بیان ہو رہا ہے۔ جو ما قبل میں ذکر ہونے والی عورتوں کے مقابل ہے یعنی وہ عورتیں جن کے لیے مہر متعین کیا گیا ہو البتہ دخول (جماع) ان سے بھی نہیں کیا گیا ہو۔ فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ نصف اصل میں دو ٹکڑوں کو کہا جاتا ہے یہاں مبتدا مخفی ہے یعنی فَالْوَاجِبُ نِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ آدھا بیوی اور آدھا شوہر کا ہوگا۔

فائدہ: دونوں آیتوں میں لفظ (مسیس) چھونا مذکور ہے جس سے مراد جماع ہے۔اگر صحیح (مسیس) جماع نہ ہو سکے مگر میاں بیوی کی خلوت صحیحہ ہو جائے یعنی کمرے میں دونوں ایسی حالت میں ہوں کہ کوئی رکاوٹ درمیان میں نہ ہو یعنی عورت حائضہ نہ ہو، حالت روزہ میں نہ ہو۔تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ وامام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک یہ حکم (مسیس) جماع میں داخل ہے۔

ان ائمہ کی دلیل عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور خلفاء الراشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کا وہ فیصلہ ہے کہ جب میاں بیوی دروازہ بند کر لیتے ہیں یا پردہ لٹکا لیتے ہیں تو میراث بھی ثابت ہوگی اور عدت بھی۔تو معلوم ہوا کہ مہر بھی لازم ہوگا۔اس روایت کو امام دارقطنی نے مرفوع نقل کیا ہے (دارقطنی 307/3) ثوبان رضی اللہ عنہ کی رویت ہے جو مرسل اور ابن لھیعہ کی وجہ سے ضعیف ہے البتہ مراسل ابوداود میں ثوبان“ کی سند سے منقول ہے جس کو ورجالہ ثقات فرمایا ہے تعلیق المغنی ج3 ص308)۔امام قاضی شریح رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک مہر واجب نہیں ہوگا مہر کی باقی تفصیل ان شاءاللہ سورۃ نساء آیت 21 میں آئے گی۔إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَا الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ: یہ استثنیٰ منقطع ہے اور لٰكِنْ کے معنی میں ہے يَعْفُونَ چھوڑنے کے معنی میں ہے اپنے آدھے حصے کو چھوڑ کر اس سے منہ پھیر لینا یہ حکم عاقل وبالغ عورت کے لیے ہے وہ اپنے مہر میں بااختیار ہے الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ: اس سے مراد شوہر ہے جیسا

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

کہ جبیر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں وارد ہے جس کو امام قرطبی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔ جس کو امام دارقطنی نے مرفوع نقل کیا ہے (دارقطنی کتاب النکاح حدیث 126 قال شمس الحق رواہ ثقات)۔ یہ قول اکثر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تابعین اور امام ابوحنیفہ امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے کہ عورت کے ولی کا اس میں اختیار نہیں ہے البتہ بعض تابعین وامام مالک رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد نکاح کا ولی ہے جس کو عرف عام میں نکاح کا بھائی کہا جاتا ہے۔ سوال: عَفْوٌ چھوڑنے کے معنی میں ہے تو ولی اور شوہر کی طرف اس نسبت کا کیا مطلب ہے؟ جواب ۱: عام عادت یہ ہے کہ بوقت نکاح شوہر سارا مہر دیتا ہے تو جب مہر دینے کے بعد خلوت (جماع) کے بغیر طلاق دے دی تو آدھا مہر واپس لینا شوہر کا حق تھا لیکن جب شوہر واپس نہ لے تو بلکہ معاف کر دے تو اس کو عَفْوٌ کہا جاتا ہے اور اگر شوہر نے پورا مہر ادا نہیں کیا تھا اور طلاق دے دی تو عورت آدھا مہر طلب کر سکتی ہے۔ اب جب وہ معاف کرتی ہے اور مطالبہ نہیں کرتی ہے تو اس کو عفو کہا جاتا ہے۔ جواب ۲: عَفْوٌ آسانی کے معنی میں ہے۔ وَ اَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی یہ عورتوں اور مردوں سب کو عام خطاب ہے مگر مذکر صیغہ تغلیباً ذکر کیا گیا ہے۔ لِلتَّقْوٰی اَقْرَبُ کبھی لام سے متعدی ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے اور کبھی الی کے ساتھ متعدی ہوتا جیسا کہ سورۃ ق آیت 16 میں مذکور ہے۔ یہاں پر لام أجلیہ ہے اور لفظ حصول اس میں مخفی ہے یعنی لِحُصُوْلِ التَّقْوٰی الی التقوی سے معنی میں بہتر ہے کیونکہ اس میں علیت کا معنی نہیں ہے۔ مُفَضَّلٌ عَلَیْہِ مخفی ہے یعنی مِنْ تَرْکِ الْعَفْوِ۔ کیونکہ اپنا حق چھوڑنے میں یا کسی سے لینے میں شدت بخل اور کنجوسی معلوم ہوتی ہے اور درگزر اور عفو میں سخاوت اور سماحت نظر آتی ہے جو کہ متقی کی اصل صفت ہے۔ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَیْنَکُمْ: اس جملہ میں بھی سابقہ جملہ کی طرح درگزر کے لئے ترغیب ہے اور سبب عفو ودرگزر کا ذکر ہے نسیان کا معنی (ترک) کرنا چھوڑنا ہے فضل سے مراد غیر واجب ہے یعنی جو نیکی ہوگی اس کو فضل قرار دیا جائے گا۔ یہاں پر شوہر کی طرف سے پورا مہر دینا فضل ہے جبکہ بیوی کا شوہر کو معاف کر دینا فضل ہے۔ بَیْنَکُمْ اس میں آپس کی محبت الفت ایک دوسرے کی ضرورت کے خیال کرنے کی تاکید ہے جس کو اخوت اسلامی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ۔ عَفْوٌ اور فَضْلٌ میں حق دینا مقصود ہے جو کہ نظر آنے والی چیز ہے اس لئے تو آیت کا اختتام صفت بصیر سے کیا گیا۔

حٰفِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰی ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ ﴿۲۳۸﴾ "نمازوں کی حفاظت کرو، بالخصوص درمیان والی نماز کی اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لئے کھڑے رہا کرو۔" (238)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تفسیر 238: تدبیر منزل کے احکام میں سے سولواں حکم ہے جس میں دنیاوی مصروفیات کے باوجود نمازوں کی پابندی کا ذکر ہے۔ یہاں دنیاوی مصروفیات کی وجہ سے نمازوں میں سستی یا خوف سے اور دیگر مشاغل سے اجتناب مقصود ہے۔ اس میں بھی دو جہات ہیں یعنی کثرت اُمورِ دنیا کی وجہ سے غفلت برتنا جبکہ اس کے برعکس مصروفیات کے باوجود پابندی کا حکم ہے۔

ربط 1: سابقہ آیتوں میں بیویوں کے بہت سے مسائل ذکر کیے گئے تو اکثر ان جھگڑوں میں مصروف ہو کر دینداری میں فرق آجاتا ہے۔ جس کی وجہ سے نمازوں میں انسان سستی کرنے لگتا ہے اس لیے پابندی کا حکم دیا گیا ہے۔

ربط 2: پہلے حقوق العباد کی ادائیگی کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ تو اب حقوق اللہ کا ذکر ہو رہا ہے۔

ربط 3: پہلی آیت میں عفو و درگزر کا حکم دیا گیا مگر چونکہ نفس میں بخل اور حرص بڑا مانع ہے لہٰذا اس کے علاج کیلئے دو طریقے بتا دیئے۔ پہلا طریقہ دنیاوی عقلی ہے کہ آپس میں احسان مت بھولو۔ وَ لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَیْنَكُمْ۔ دوسرا اخروی روحانی علاج ہے یعنی نماز جو کہ ہر قسم کی برائیوں اور فحاشیوں سے روکنے والی ہے۔ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ: اس وجہ سے بعد میں (علی) ذکر کیا ہے کہ باب مُفَاعَلَة تکرار اور ہمیشگی کیلئے ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ بندے کی جانب سے نماز کی پابندی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مال و جان کی حفاظت ہے۔ لفظ محافظت میں ہمیشگی، مستحب اوقات کی پابندی فرائض وسنن کا لحاظ سب شامل ہے۔ حٰفِظُوْا: اس لفظ سے تعبیر کرنے میں اشارہ ہے کہ تمام مشاغل سے فارغ ہو کر نماز کی طرف متوجہ ہو جائے الصَّلَوٰتِ اس سے مراد پانچوں نمازیں ہیں ایک قول کے مطابق چار نمازیں ہیں بعد میں جن کا ذکر ہونے والا ہے وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى: وُسْطٰى. اَوْسَط کی مونث ہے درمیان کو کہا جاتا ہے۔ اس میں تفضیل کا معنی ہے جو بہتر کے معنی میں مناسب ہے۔ بعض علماء نے درمیانی نماز مراد لی ہے۔ لیکن پہلا قول بہتر ہے کیونکہ (تفضیل) افضلیت وہاں ہوتی ہے جہاں کمی بیشی کے معنی ہو سکتے ہوں جبکہ یہ معنی درمیان میں نہیں ہو سکتا ہے۔ اس اہمیت کی وجہ سے یہ تعمیم کے بعد تخصیص ہے۔ دوسرے قول کی بناء پر عطف مغایرت کیلئے ہے اور پانچویں نماز اس میں مراد ہے وُسْطٰى کے معنی میں محدثین اور مفسرین نے سترہ اقوال ذکر کیے ہیں۔ لیکن ان تمام اقوال میں بہتر قول یہ ہے کہ یہ عصر کی نماز ہے۔ کیونکہ اس میں صحیح مرفوع حدیث (صحیح بخاری کتاب الجہاد حدیث 2931 صحیح مسلم فی المساجد حدیث 1071، 627) میں وارد ہے۔ جس میں صلوٰۃ عصر کی تعیین آیا ہے جبکہ باقی روایات موقوف یا صرف فضیلت پر وارد روایتیں اور اقوال ہیں۔

فائدہ: مصنف صاحب اللباب اور ہدایہ کے شارحین نے لکھا ہے کہ نمازوں کی کم از کم تعداد پانچ ہے۔ کیونکہ الصَّلَوٰتِ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جمع ہے جس سے مراد تین ہوگی یا چار زیادت کی ضرورت نہیں کیونکہ جمع کم سے کم تین پر بولا جاتا ہے صَلٰوۃ عطف ہے۔ اور معطوف معطوف علیہ میں مغایرت ہوتی ہے۔ لہٰذا اس سے دوسری نماز مراد ہے۔ اَلْوُسْطٰی کا تقاضیٰ یہ ہوتا ہے کہ اس کے جانبین برابر ہوں اگر تین مراد لیا جائے تو تین کا حقیقی وسط نہیں ہوتا۔ تو معلوم ہو گیا کہ اَلصَّلَوٰاتِ سے چار نمازیں مراد ہیں۔ اور وَالصَّلٰوۃِ سے پانچویں مراد ہوگی اور یہ زیادہ عدد تعداد میں بھی ہو سکتا ہے۔ مگر وہ الفاظ کے مقتضا سے زیادہ ہوتا ہے۔ وَقُوْمُوْا لِلّٰہِ قٰنِتِیْنَ اس جملہ میں دلیل ہے کہ قیام پر قدرت رکھنے والے شخص کیلئے قیام رکن نماز ہے خواہ نمازی مقتدی ہو یا منفرد یا امام، البتہ نفلی نماز بعض نصوص کی بناء پر اس سے مستثنیٰ ہے لِلّٰہِ اس بات کی دلیل ہے کہ بحیثیت عبادت قیام غیر اللہ کیلئے حرام ہے، اور وہ قیام جو اہل عجم کا شعار ہے جس کو مُثّل کہا جاتا ہے حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے (صحیح ترمذی حدیث 2754، ابوداؤد فی الادب حدیث 5229، قال الالبانی صحیح مشکوٰۃ 4624)۔ قیام بطور اکرام بغیر مثلیت ہو اس میں اختلاف ہے۔ قٰنِتِیْنَ لغت میں کسی چیز پر صابر ہو کر ہمیشگی سے منسلک رہنا مراد ہے۔ جبکہ شریعت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر استقامت کے معنی میں ہے۔ اس میں بہت سے اقوال ہیں جو اس معنی میں داخل ہیں۔ پہلا قول جو کہ اکثر اہل علم کا ہے کہ اس سے مراد اطاعت ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث منقول ہے کہ قرآن مجید میں ہر قنوت اطاعت کے معنی میں ہے۔ بحوالہ مسند ابو یعلی، مسند احمد لیکن اس روایت کی سند میں ابن لہیعہ راوی ضعیف ہے۔
دوسرا قول امام مجاہد کا ہے کہ قنوت خشوع کے معنی میں ہے۔ تیسرا قول امام شعبی اور جابر کا ہے کہ قنوت (طَوعٌ) خوشدلی کے معنی میں ہے۔ چوتھا قول ابن عمر رضی اللہ عنہ کا ہے کہ قنوت کا معنی قیام ہے۔ جو کہ طویل قراءت سے حاصل ہوتا ہے۔ پانچواں قول ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے کہ قنوت دعاء کے معنی میں ہے۔ چھٹا قول مُصَلِّیْنَ کے معنی میں ہے۔ ساتواں قول قادرین کے معنی میں ہے۔ آٹھواں قول عابدین کے معنی میں ہے۔ یہ اقوال تینوں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہیں۔ نواں قول امام زمخشری نے نقل کیا ہے کہ ذاکرین کے معنی میں ہے۔ دسواں قول اپنی نگاہوں اور ہاتھوں کو غیر مناسب حرکات سے روکنا قنوت ہے۔ یہ مجاہد کا قول ہے اور یہ خشوع کی تعبیر ہے جو اس سے پہلے نقل کی جا چکی ہے۔
نوٹ: اس سے رفع الیدین کی ممانعت پر استدلال کرنا جہالت ہے۔ کیونکہ امام ابوحیان نے مجاہد سے اس کا معنی خشوع نقل کیا ہے۔ اگر اس قول کو مانا بھی جائے تو مراد بے محل حرکت ہوگی جبکہ خاص مقامات پر رفع الیدین کرنا تو متواتر احادیث سے ثابت ہے۔ گیارہواں قول قنوت سکوت کے معنی میں ہے اور نماز میں کلام سے منع ہے لیکن قراءت سے سکوت مراد

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نہیں ہے جیسا کہ بعض جاہلوں کا خیال ہے کیونکہ یہ حکم تو امام کو بھی ہے۔ لہٰذا جنہوں نے خلف الامام کی قراءت پر اس سے استدلال کیا ہے وہ درست نہیں ہے کیونکہ یہ منفرد کیلئے بھی ہے جبکہ اس پر بالاتفاق قراءت فرض ہے۔ بہتر قول یہ ہے کہ کلام سے نماز میں سکوت مراد ہے کیونکہ اس پر دو احادیث وارد ہیں۔ پہلی حدیث زید بن ارقم سے مروی ہے کہ ہم نماز میں باتیں کیا کرتے تھے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی ہمیں نماز میں کلام سے منع کیا گیا اور سکوت اور خاموشی کا حکم دیا گیا۔ یہ حدیث صحیح مسلم (صحیح ترمذی حدیث 2754، ابوداؤد فی الادب حدیث 5229 قال الالبانی صحیح مشکوٰۃ 4624) مسند احمد اور ابن کثیرؒ نے نقل کیا ہے۔ دوسری حدیث (ابن حبان معجم ابن عساکر 218) ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ہم نجاشی کے پاس سے جب پلٹ کر آئے اور نماز کی تلاوت میں نبی اکرم ﷺ پر سلام پیش کیا تو انہوں نے نماز میں جواب نہیں دیا اور بعد میں فرمایا کہ اِنَّ فِي الصَّلٰوةِ لَشُغْلًا صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ حدیث 1199 صحیح مسلم حدیث 34، 538۔ مزید تفصیل کیلئے تفسیر قرطبی اور دیگر محدثین کی کتب کی طرف رجوع کیجئے۔

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾

''اگر تمہیں خوف ہو تو پیدل یا سواری پر ہی سہی، ہاں جب امن میں ہو جائے تو اللہ کا ذکر کرو جس طرح کہ اس نے تمہیں اس بات کی تعلیم دی جسے تم نہیں جانتے تھے'' (239)

تفسیر 239: جب قیام کی فرضیت کا مسئلہ سابقہ آیت میں ذکر ہوا تو اب قیام ساقط ہونے کیلئے عذر کا بیان ہو رہا ہے۔ فَاِنْ خِفْتُمْ یہ خوف دشمن، سیلاب، درندوں وغیرہ کو شامل ہے کہ نماز کا وقت ہو جائے اور نمازی ایک جگہ نہیں ٹھہر سکتا۔ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا اس سے پہلے فَصَلُّوْا یا فَحَافِظُوْا عَلَيْهَا کا فعل مقدر ہے۔ فَرِجَالًا: رَاجِلٌ کی جمع ہے یعنی پیدل جانے والے۔ رُكْبَانَ: رَاكِبٌ کی جمع ہے جاندار سواری پر ہو یا کسی بھی سواری پر اس کو راکب کہا جاتا ہے اس صورت حال میں رکوع سجود کیلئے اشارہ کریگا نیز اس حالت میں جماعت بھی نہیں ہو سکتی۔ قتال اور جنگ کی حالت میں کہ جب دشمن سے مڈبھیڑ ہو جائے تو صلوٰۃ خوف اور دیگر حالات کا ذکر سورۃ نساء آیت ۱۰۲ میں آئے گا، ان شاء اللہ۔ اس حالت کو یہاں پر خاص ذکر کیا ہے کہ قیام اس میں ساقط ہوتا ہے جبکہ صلوٰۃ خوف کی دیگر حالتوں میں قیام ساقط نہیں ہوتا۔ امام قرطبی فرماتے ہیں کہ اس میں انتہائی اہتمام کا ذکر ہو رہا ہے کہ ایسے مشکل وقت میں بھی نماز ساقط نہیں ہے۔ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ: یعنی ابتداء سے امن میں ہو یا خوف ختم ہو جائے تو فَاذْكُرُوا اللّٰهَ اللہ تعالیٰ کو یاد کرو۔ ذکر سے مراد نماز ہے اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عام شکر بھی اس میں داخل ہے۔ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ کاف برائے تشبیہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی تعلیم سے بذریعہ وحی جلی اور خفی مراد ہے۔ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا اس سے مراد عام احکام شرع اور نماز خوف اور امن میں نمازیں سب مراد ہیں آیت کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تعلیم کے ذریعے تم پر انعام کیا ہے تو مناسب ہے کہ اس کا شکر اس کی نعمت کے موافق ادا کرو۔ اور حالت امن میں اس ترتیب سے ارکان حرکات وسکنات سے نماز ادا کرو جس کی وحی جلی وخفی یعنی قرآن و حدیث سے تمہیں تعلیم دی گئی ہے لَمْ تَكُوْنُوْا یعنی یہ تعلیم عقل سے تم نہیں پاسکتے اس آیت میں واضح دلیل ہے کہ نماز کا سنت طریقہ صرف قرآن وحدیث ہی سے معلوم ہوسکتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

”جو لوگ تم میں سے فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ وصیت کر جائیں کہ ان کی بیویاں سال بھر تک فائدہ اٹھائیں انہیں کوئی نہ نکالے، ہاں اگر وہ خود نکل جائیں تو تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں جو وہ اپنے لئے اچھائی سے کریں، اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے“(240)

تفسیر 240: اس آیت میں تدبیر منزل میں سے سترھواں (۱۷) حکم ہے جو ان عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک اور برتاؤ سے متعلق ہے جن کے شوہر فوت ہو جائیں، اور اس میں مقصد ان امور اور مظالم سے اجتناب کرنا ہے جو دوران عدت جاہلیت والے عورتوں کے ساتھ روا رکھتے تھے۔ جاہلیت والوں کا طریقہ موطا امام مالک اور دیگر کتب حدیث (صحیح بخاری کتاب الطلاق حدیث 2338) میں مذکور ہے، ان کا طریقہ یہ تھا کہ عورت کو انتہائی پرانے کپڑے پہنا کر ایک تنگ کمرے میں بند کر لیتے اور ساتھ میں حیوان بھی باندھ لیتے اس عورت کو اپنے وجود کو جانور کے وجود کے چمڑے سے رگڑنے کا حکم بھی دیا جاتا سال تک خوشبو غسل اور زینت نہیں کر سکتی سال گزرنے پر اس کے ہاتھ میں مینگنی تھما دیا جاتا تاکہ نکلتے وقت اس کو اپنے پیچھے یا گزرنے والے کسی جانور کی طرف پھینک دیں اس طریقے سے نکل کر وہ اپنے والدین کے پاس چلی جاتی۔ ان مظالم کو ختم کرنے کیلئے شرعی حکم نازل ہوا۔ ربط ۱: پہلے اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان احسان کا ذکر ہوا اب میاں بیوی کے درمیان احسان کا ذکر ہو رہا ہے۔ ربط ۲: پہلے میاں بیوی میں طلاق کے وقت فضل واحسان کرنے کا ذکر ہوا تو اب وفات کے وقت احسان وفضل کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ درمیان میں نماز کا ذکر بطور جملہ معترضہ ہوا ہے۔ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا میں وَصِيَّةً کو زبر سے پڑھنے میں دو قول ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ یہاں پر لِيُوْصُوْا یا يُوْصُوْنَ مخفی فعل ہے اور خبر ہے اَلَّذِيْنَ کی۔ یا فعل پوشیدہ ہے اَلَّذِيْنَ سے پہلے اور یہ اَلَّذِيْنَ۔ اس کے لیے فاعل ہے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا الْوَصِيَّةُ (الخ) اس میں مقصد یہ ہے کہ شوہر اپنے وفات سے قبل بیویوں کو وصیت کرے کہ سال تک میرے گھر میں رہو اور تمہیں نان و نفقہ میرے مال میں سے دیا جائے گا ایک سال تک پھر ان کی مرضی ہے کہ اس وصیت کو قبول کرتی ہیں یا نہیں یا ایسی وصیت اپنی بیویوں کے متعلق ورثاء کو کرے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وَصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے کہ اپنے شوہروں کے گھروں میں ایک سال تک رُکی رہو یہ تم پر لازم ہے۔ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ یہ حکم اللہ تعالیٰ کی جانب سے بطور وجوب ہے۔

فائدہ: اس آیت میں دو قول ہیں جس کو امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی (صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4531) میں نقل کیا ہے۔ پہلا قول یہ ہے کہ آیت مذکورہ منسوخ ہے جیسا کہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی روایت سے ثابت ہوتا ہے۔ اور آیت کا ناسخ آیت ۲۳۴ ہے اور نزول میں یہ آیت مقدم ہے اور وہ مؤخر ہے عدت وفات ایک سال تھی اور نان و نفقہ خرچہ بھی ورثاء کے ذمہ تھا بعد میں چار مہینے دس دن والی آیت نازل ہوئی اور سال والا حکم منسوخ ہو گیا۔ اور میراث والی آیت سے یہ بات ثابت ہوئی کہ وارث کیلئے وصیت نہیں ہے۔ دوسرا قول امام بخاری رحمہ اللہ نے (صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4531) میں امام مجاہد رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ اس آیت میں منسوخیت نہیں ہے بلکہ عدت وفات ابتداء سے چار ماہ دس دن ہے البتہ بطور استحباب اور احسان اس میں وصیت کے ذریعے سے سات مہینے اور بیس دن بڑھا دیے گئے ہیں۔ لہٰذا یہ اس حدیث کے بھی منافی نہیں ہے جس میں ہے کہ لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ وارث کیلئے وصیت نہیں ہے، اس قول کو اکثر مفسرین نے پسند کیا ہے۔ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ: حرف جر کو حذف کر کے اسکو منصوب کیا ہے یعنی بمتاع۔ اس سے مراد کھانا لباس وغیرہ بطور احسان دینا ہے۔ غَيْرَ اِخْرَاجٍ یہ مَّتَاعًا سے حال یا بدل ہے یعنی میت کے ورثاء کیلئے جائز نہیں ہے کہ اس خاتون کو جبراً گھر سے نکال دیں کیونکہ وصیت بدلنا جائز نہیں ہے اگرچہ (وصیت) بطور احسان ہو۔ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ: اس سے مراد شوہر کے گھر سے اپنی خوشی سے نکل جانا ہے۔ لیکن پہلے قول کے مطابق سال کی تکمیل کے بعد یہ نکل جانا جائز ہوگا۔ مَعْرُوْفٍ: لفظ عام ہے اگر ولی اس خاتون کا خرچ بند کر دے سال گزر لے پر یا گھر سے فارغ کر دے یا خاتون دوسری شادی کیلئے نکل جاتی ہے۔ وفات پانے والا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

شوہر کے گھر سے شرعی طریقے سے اپنے لئے نان ونفقہ خرچہ کماتی ہے تو ان کاموں میں کوئی حرج نہیں ہے۔

فائدہ: آیت ۲۳۴ میں بِالْمَعْرُوفِ فرمایا تھا اور یہاں پر مِنْ مَّعْرُوفٍ فرمایا اس میں اشارہ ہے کہ وہاں صرف زینت سے اجتناب تھا جو کہ متعین چیز ہے اور یہاں تو کئی باتیں ہیں جن کا ذکر گزر گیا اس لیے نکرہ مِنْ کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ ان تمام اقسام کی طرف اشارہ ہو جائے۔ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔ لفظ عزیز میں مذکورہ حکم کی مخالفت یعنی عورت کو ظلماً نکالنے اور جبر کرتے ہوئے عورت کو ستانے پر وعید ہے اور لفظ حَكِيمٌ میں اس حکم کے فائدوں کی طرف اشارہ ہے۔

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿٢٤١﴾

طلاق والیوں کو اچھی طرح فائدہ دینا پرہیزگاروں پر لازم ہے''(241)

تفسیر 241: اس آیت میں تدبیر منزل میں سے اٹھارھواں حکم ہے کہ مطلقہ خواتین کو احسن طریقے سے ان کا حق دو اور ان کے ساتھ احسان بھی کرو جاہلیت کے مظالم سے اجتناب کرو یعنی طلاق کو ظلم کیلئے سبب مت بناؤ بلکہ مطلقہ عورتوں کو منافع دو۔ ان کی خوشی اور دلجوئی کیلئے ضرور کچھ دینا چاہئے۔ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوفِ آیت ۲۳۶ میں خاص عورت کو متاع دینے کا حکم تھا جس سے جماع نہیں ہوا تھا اور جن کا مہر مقرر نہیں ہوا اور اس میں عام سب مطلقہ عورتوں کو متاع دینے کا حکم ہوا ہے۔ یا سابقہ آیت میں صرف لباس وغیرہ مراد تھا اور اس آیت میں نفقہ خرچ مراد ہے کیونکہ خرچ کو بھی متاع کہتے ہیں۔ لفظ اَلْمُطَلَّقَاتُ میں دو قول ہیں: (۱) پہلا قول یہ ہے کہ تمام مطلقہ عورتیں اس سے مراد ہیں اور سب کو متاع خرچ لباس وغیرہ دینا چاہئے۔

(۲) دوسرا قول سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ اور ابو العالیہ اور زہری رحمہم اللہ کا یہ ہے کہ اس میں تمام مطلقہ عورتیں شامل ہیں مگر یہ حکم استحباب کے درجہ میں ہے البتہ آیت ۲۳۶ میں حکم واجب ہے یہ قول جمہور علماء کا ہے۔ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ۔ جب حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ نازل ہوئی تو بعض لوگوں نے کہا کہ اگر ہم احسان کرنا نہیں چاہتے تو متاع (خرچ) وغیرہ نہیں دیں گے تو مذکورہ حکم اترا کہ یہ تو متقین پر حق ہے اور اس مقام پر احسان تقویٰ کے مترادف یعنی ہم معنی ہے۔ متقین سے عام مومنین مراد ہیں جو شرک و نفاق سے بچتے ہیں۔ فائدہ: آیت ۲۳۶ میں قبل از جماع طلاق دی گئی خاتون کو متعہ خرچ دینا واجبی قرار دیا گیا تھا جس سے شوہر نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا تھا لہٰذا عرف میں اس کو احسان کہا گیا اس لیے ان لوگوں کو محسنین کہا گیا ہے۔ اور یہاں پر عام مطلقہ عورتوں کا ذکر ہے جن سے شوہروں نے فائدہ بھی اٹھایا ہے ان کو مہر بھی دیا گیا ہے ان کو طلاق دینے پر دل آزاری اور دکھ بہت زیادہ ہوا ہے تو ان کی دل آزاری سے بچنے کیلئے لفظ تقویٰ کا استعمال مناسب تھا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٢٤٢﴾

اللہ تعالیٰ اسی طرح اپنی آیتیں تم پر ظاہر فرما رہا ہے تاکہ تم سمجھو۔ (242)

تفسیر 242: اس آیت میں سابقہ اور آنے والے احکام پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب ہے جیسا کہ تفصیل اور وضاحت پہلے ہو چکی ہے اسی طرح بعد میں بھی ہوگی۔ یا کاف کو کمال کیلئے لایا ہے کہ یہ بیان بلاغت، فصاحت اور کامل درجے والا ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ: وضاحت کے بعد مسائل شرعیہ میں تدبر اور تفکر کا کام عقل ہی کر سکتی ہے اس لیے تَعْقِلُوْنَ فرمایا البتہ جب مغیبات کی باتیں یا مجملات یعنی وہ مسائل جو مزید وضاحت شرعیہ کے محتاج ہوں ان میں عقل کام نہیں کرتی۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۠ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۣ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٢٤٣﴾

"کیا تم نے انہیں نہیں دیکھا جو ہزاروں کی تعداد میں تھے اور موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا مر جاؤ، پھر انہیں زندہ کر دیا بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔ لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے ہیں" (243)

تفسیر 243: اس آیت سے آیت ۲۵۳ تک کا خلاصہ۔ یہ چوتھا باب ہے اس میں جہاد کی ترغیب کیلئے دو واقعات کو ذکر کیا گیا ہے۔ پہلے واقعہ میں اشارہ ہے کہ بزدلی اور موت کے خوف سے جہاد فی سبیل اللہ کو مت چھوڑو پھر متصل حکم ہوا کہ قتال اور انفاق فی سبیل اللہ کرتے رہو۔ آیت ۲۴۵ تک ترغیب ہے، پھر دوسرا واقعہ ذکر ہوا ہے جس میں جہاد کے واجب ہونے کا سبب ذکر کیا گیا ہے۔ شرعاً وطبعاً اس کے (موانع) رکاوٹیں: نیز ضرورت امیر شرعی کی طرف اشارہ ہے، آیت ۲۴۶ میں پھر امیر کے حقیقی حقدار ہونے کیلئے اللہ تعالیٰ کی برکات کی واپسی جو اس کے منتخب ہونے کیلئے اشارہ ہے اور امیر کی شرائط و انتخاب کا ذکر ہے آیت ۲۴۷، آیت ۲۴۸۔ پھر امیر کی سیاست کا ذکر ہے کہ بہادر اور بزدل، سست لوگوں میں تمیز کرے اور اشارہ ہے کہ افرادی قوت اور تعداد کی کمی کی وجہ سے جہاد مت چھوڑو آیت ۲۴۹، آیت ۲۵۰ میں میدان جنگ کی دعا کا ذکر ہے۔ پھر آیت ۲۵۱ میں داؤد علیہ السلام کا تذکرہ فتح اور خلافت حقہ کی طرف اشارہ کیا گیا اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذکر کیا کہ فتح دراصل نتیجہ ہے نصرت الٰہی کا اور قتال کے فوائد بھی ذکر کیے گئے۔ پھر کفر و شرک کے مقابلہ کیلئے آخری نبی کا ارسال، آیت ۲۵۲ میں ذکر ہوا ہے۔ سابقہ انبیاء کا تذکرہ اور ان میں باہم تفاضل آیت ۲۵۳ میں ذکر کیا گیا اور یہ بھی اس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آیت میں بتایا گیا کہ قتال کا سبب انسانوں کا کفر و ایمان میں باہمی اختلاف ہے۔ ربط ۱: پہلے مسائل نکاح اور اس سے متعلق مسائل کا ذکر کیا گیا جو انفرادی اور ازدواجی زندگی احسن طریقے سے گزارنے کا ذریعہ ہیں اور جن سے معاشرے کی اصلاح اور نفس کی پاکی ہوتی ہے۔ تو اب جہاد کا ذکر ہو رہا ہے جس سے مال و جان کی حفاظت کے ساتھ ساتھ حفاظت دین حاصل ہوتا ہے جو سیاسی اور اجتماعی اصلاح ہے۔ ربط ۲: پہلے احکام تکلیفیہ کا ذکر تھا جس سے قتال کی استعداد اور طاقت پیدا ہوتی ہے تو اب قتال کا ذکر ہوگا۔ ربط ۳: آخری حکم میں وفات کا ذکر تھا جو حقیقی موت ہے اب موت کی ایک اور قسم کا ذکر ہو رہا ہے جو موت عقوبت ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ لفظ اَلَمْ تَرَ کبھی اس شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے کہ جب اس کو واقعہ کی پہلے سے خبر ہو یہ تذکیر اور تقدیم کے لیے ہوتا ہے مگر ایسے مقامات قرآن مجید میں بہت کم ہیں۔ کبھی ان لوگوں کو مخاطب کرنے کیلئے ہوتا ہے جن کو پہلے سے علم نہ ہو تو پھر یہ تنبیہ اور تعجب کیلئے ہوتا ہے۔ (تفسیر قاسمی) جب رُویت کا فعل متعدی ہوا ہو اس چیز کی طرف جس کو سننے والے نے پہلے سے نہیں دیکھا ہے تو اس کلام میں اس چیز کے حصول کی ترغیب ہے جس کی رُویت اس کی طرف حرف (الی) کے ساتھ متعدی ہوئی ہے۔ مفسرین کا اجماع ہے کہ یہاں پر ھمزہ استفہام حقیقی نہیں ہے۔ اور خطاب بھی معین نہیں ہے۔ اس استفہام میں تین اقوال ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ یہ تعجب اور تعجیب کیلئے ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ استفہام اَلَمْ نَشْرَحْ کی طرح تقریری ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ استفہام انکاری ہے اور تینوں حالتوں میں بعد والی چیز کے علم پر تیزی دلانا مقصود ہے۔ امام ابن عاشور اور امام قرطبی نے فرمایا ہے کہ یہ رُویت قلبی ہے جس کا معنیٰ ہے اَلَمْ تَعْلَمْ کیا آپ نہیں جانتے۔ امام سیبویہ کے نزدیک معنیٰ ہے تَنَبَّهْ اِلٰى اَمْرِ الَّذِيْنَ اس کام کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ یہ رؤیت دو فعل نہیں چاہتی۔ ابو حیانؒ کا قول ہے کہ یہ ہمزہ استفہام نفی پر داخل ہے۔ تو یہ استفہام تقریری ہو گیا جس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ مخاطب کو پہلے سے اس کا علم ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے سے علم نہ ہو البتہ مراد اس میں تعجب و تنبیہ ہو اور یہ رویت علمیہ ہے متضمن ہے لیے فعل کو جو (الیٰ) کے ساتھ متعدی ہوتا ہے تو یہاں پر معنیٰ یہ ہوا کہ اَلَمْ يَنْتَهِ عِلْمُكَ اِلٰى كَذَا یعنی فلاں واقعہ کی طرف آپ کے علم کی رسائی نہیں ہوئی۔ مذکورہ تمام اقوال سے معلوم ہوا کہ لفظ اَلَمْ تَرَ علم اور رویت کو مستلزم نہیں ہے یعنی جاننا اور دیکھنا اس سے لازم نہیں آتا۔ لہٰذا جاہلوں کا یہ قول کہ نبی اکرم ﷺ کیلئے سابقہ واقعات اور مستقبل کا علم اس سے ثابت ہوتا ہے اور وہ ہر جگہ حاضر و ناظر تھے اور اب بھی ہیں تو یہ حقیقت میں تحریف قرآن ہے۔ اَلَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ: اس قوم کے متعلق مشہور دو اقوال ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ یہ بنی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اسرائیل طاعون کے خوف سے اپنے ملک سے فرار ہوئے تاکہ موت سے بچ جائیں اس لیے امام قرطبیؒ نے اس آیت کے تحت احکام طاعون ذکر کیے ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ حزقیل علیہ السلام کی قوم تھی جن کو اپنے بادشاہ نے جہاد کیلئے جانے کا حکم دیا تو موت کے خوف سے علاقہ چھوڑ کر بھاگ گئے اللہ تعالیٰ نے ان کو موت دی پھر آٹھ دن کے بعد حزقیل علیہ السلام کی دعا سے زندہ ہوگئے۔ لیکن امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے ان اقوال کو ضعیف قرار دیا ہے۔ البتہ تورات فصل باب ۳۷ میں بنی اسرائیل کے واقعات میں باب نبوت حزقیل میں یہ واقعہ درج ہے۔ قرآن مجید میں اکثر ان واقعات کا ذکر ہے جو یہودیوں کے قرب کی وجہ سے عرب میں مشہور تھے۔ اور یہ قول اس لئے بہتر ہے کہ وَقَاتِلُوْا قتال کا حکم اس کی بعد مذکور ہے۔

وَهُمْ اُلُوْفٌ اس میں دو قول ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ یہ الف کی جمع ہے پھر اس میں بھی بہت سے اقوال ہیں لیکن بہتر یہ ہے کہ دس ہزار یا کچھ زیادہ لوگ تھے کیونکہ جمع کثرت کا صیغہ استعمال ہوا ہے یا نفس کثرت مراد ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ اِلْفٌ کی جمع ہے یعنی آپس میں متفق اور متحد تھے۔ یعنی قتال انہوں نے اختلاف کی وجہ سے نہیں چھوڑا تھا بلکہ موت کے خوف سے چھوڑا تھا۔ حَذَرَ الْمَوْتِ۔ یہ خرج کیلئے مفعول لہٗ ہے اور حذر کا خوف ہے جس میں جان بچانا مقصد ہو۔

فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا: اس میں تکوینی امر ہے۔ یعنی اللہ کا امر جلد واقع ہونا قضاء و تقدیراً ہے، تشریعی قول مقصود نہیں ہے۔ امام ابن العربی کا قول ہے کہ یہ سزا عقوبت کی موت ہے جس کے بعد دنیاوی زندگی ہوتی ہے جبکہ اجلی موت کے بعد اخروی برزخی حیات ہے دنیاوی نہیں ہے۔ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ان کو اللہ تعالیٰ نے حزقیل علیہ السلام کی دعا سے پھر زندہ کیا جو کہ عیسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کی طرح ان کو بھی یہ معجزہ حاصل تھا ایسا واقعہ آیت ۵۵ میں بنی اسرائیل کا گزرا ہے۔ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کے دیدار کی طلب گستاخانہ انداز میں کی تھی اور گائے کے واقعہ میں بھی آیت ۷۳ میں گزر چکا ہے یہ تیسرا مقام ہے۔ فائدہ: امام قرطبی نے ابن عطیہؒ سے نقل کیا ہے کہ اس واقعہ میں عبرت ہے کہ موت کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے جس سے کسی بھی صورت میں چھٹکارا نہیں ہوسکتا۔ نیز یہ موجودہ امت کو جہاد کیلئے تمہید بھی ہے یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر یہ لوگ بزدلی اور سستی سے کام لینگے تو جہاد چھوڑنے سے ان پر ذلت مسلط ہوگی۔ فائدہ: منکرین معجزات نے اس واقعہ کے ظاہر سے انکار کیا ہے۔ وہ تاویل کرتے ہیں کہ ان کی موت ایسی نہیں تھی جس کی وجہ سے روح بدن سے جدا ہوجائے بلکہ یہ ایک بیماری تھی جو بے ہوشی اور سکتہ سے زیادہ طویل ہوتی ہے اس میں روح بدن سے الگ نہیں ہوتی اور ایسا ہی ابن راوندی نے یہ عقیدہ تمام مردوں کے متعلق رکھا ہے کہ ان سے روح جدا نہیں ہوتی بلکہ بدن ہی میں کسی جگہ قرار کر لیتی ہے خواہ کسی بھی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جگہ ہو لیکن بدن کے ٹکڑوں (اجزاء) میں ہی ہوتی ہے۔ امام آلوسیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ عقیدہ عقل و شریعت دونوں کے منافی اور خلاف ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو اس قسم کے عقائد اختیار کرنے سے محفوظ فرمائے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ: یہ علت ماقبل کی طرح ہے۔ یعنی ان لوگوں پر فضل دوبارہ زندگی عطاء کرنے سے کیا گیا جبکہ دیگر لوگوں پر فضل عبرت لینے کیلئے اس واقعہ کو بیان کرنے سے کیا گیا۔ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ یہ مخفی عبارت سے استدراک ہے یعنی سارے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی شکر گزاری فرض ہے۔ لیکن بہت سارے لوگ ناشکری کے جرم میں مبتلاء ہیں جیسا کہ سورۃ بنی اسرائیل آیت ۸۹ میں مذکور ہے اور شکر گزار لوگوں کی تعداد قلیل (کم) ہی ہوتی ہے۔ جیسا کہ سورۃ سباء آیت ۱۳ میں ہے۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾

اللہ کی راہ میں قتال کرو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ سنتا، جانتا ہے۔" [244]۔

تفسیر 244: اس آیت میں اس امت کو قتال کا حکم ہو رہا ہے اور یہ سابقہ آیت کے مضمون پر عطف ہے یعنی سستی اور بزدلی کی وجہ سے قتال مت چھوڑو۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ تمام عبادات فی سبیل اللہ میں داخل ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے بہت ہیں اور ہر راستے کیلئے جہاد و قتال ضروری ہوتا ہے۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ: اس میں ترغیب اور تحذیر دونوں ہیں۔ وہ سَمِيْعٌ سننے والا اور مجاہدین کی آوازیں ان کے گھوڑوں کی آوازیں ان کے اسلحہ استعمال کرنے کی آوازیں سب سنتا ہے۔ یا مراد کسی اور کو جہاد کی ترغیب دینا مقصود ہے عَلِيْمٌ یعنی نیتوں کو جانتا ہے کہ کس کی نیت قتال فی سبیل اللہ کی ہے اور کس کی دنیاوی اغراض کی۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ۭ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۠ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾ "ایسا بھی کوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کو اچھا قرض دے پس اللہ تعالیٰ اسے بہت بڑھا چڑھا کر عطا فرمائے، اللہ ہی تنگی اور کشادگی کرتا ہے اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔" (245)

تفسیر 245: اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کرنے کی ترغیب ہے کیونکہ قتال بغیر اسباب کے نہیں ہو سکتا ہے اور حصول اسباب کے لئے مالی انفاق ضروری ہے اس کو جہاد بالمال کہا جاتا ہے۔ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا: اس استفہام میں مقصد تیزی دینا ہے۔ مَنْ استفہامیہ ہے اور ذا موصول مبہم کے لیے ہے۔ لغت میں قرض کاٹنے کو کہا جاتا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لہذا مال سے ٹکڑا کاٹنا یہ قرض ہے۔ امام زجاج اور کسائی کے نزدیک ہر اس عمل کو قرض کہا جاتا ہے جس پر بدلہ (جزاء) طلب کیا جاتا ہے۔ خواہ خیر یا شر ہو جبکہ بعض کے نزدیک خیر پر اطلاق ہوتا ہے۔ عرف میں مال وغیرہ کسی کو دینے اور پھر واپس لینے کو کہا جاتا ہے۔ لیکن یہاں مراد ہے اللہ تعالیٰ کے راستے میں کسی چیز کو صرف کرنا طلب جزاء کیلئے خواہ مال جان نفس کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنا ہو۔ قَرْضًا حَسَنًا: لفظ حَسَنٌ میں اشارہ ہے کہ یہ مال ریا کے عیب، تکلیف جتلانے وغیرہ سے پاک ہو اور خالص نیت پر اس کی بنیاد ہو۔ امام قرطبی نے فرمایا ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ کو انسانوں کے قرض کے ساتھ مشابہ کیا ہے۔ اس میں اعمال صالحہ کی ترغیب دی ہے۔ کیونکہ قرض واجب الادا ہوتا ہے اور مقروض قرض ادا کرنے کے ساتھ شکر بھی ادا کرتا ہے۔ فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً۔ ضعف اصل میں مقدار کے لحاظ سے کسی چیز کے مثل، برابر کو کہا جاتا ہے جبکہ مُضَاعَفَۃ مثل یعنی برابر سے زیادہ کو کہا جاتا ہے اَضْعَافٌ جمع ہے ضِعْفٌ کی مراد اس سے کثرت ہے البتہ اس کثرت کی انتہا صرف اللہ کو معلوم ہے اس کی حد معلوم نہیں۔ فَيُضٰعِفَهٗ اس کو منصوب اس لیے پڑھا جاتا ہے کہ یہ معناً جواب استفہام ہے۔ لہذا (اَنْ) ناصبہ اس کے جواب میں مقدر ہے۔ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ اس میں ترغیب ہے کہ مال میں کمی کے خوف سے انفاق مت چھوڑو کیونکہ اس سے کمی اور زیادتی نہیں آتی۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے نیز اس جملہ میں بہت سے اقوال ہیں **پہلا قول:** فراخی اور تنگی اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے **دوسرا قول:** صدقات قبول کرکے وسیع بدلہ دیتا ہے۔ **تیسرا قول:** موت لاتا ہے روح قبض کرتے ہوئے اور طویل زندگی دیتا ہے۔ **چوتھا قول** بعض دلوں میں تنگی اور بعض میں خوشی فراخی پیدا کرتا ہے۔ اور بھی اقوال ہیں۔ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ اس میں آخرت کیلئے تنبیہ اور تذکیر ہے اور اعمال کے جزاء کی واپسی کی تنبیہ ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ۭ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآىِٕنَا ۭ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿٢٤٦﴾ ”کیا آپ نے موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کی جماعت کو نہیں دیکھا کہ جب انہوں نے اپنے پیغمبر سے کہا کہ کسی کو ہمارے لئے بادشاہ بنا دیجئے تا کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ پیغمبر نے کہا کہ ممکن ہے کہ جہاد فرض ہو جانے کے بعد تم جہاد نہ کرو، انہوں نے کہا بھلا ہم اللہ کی راہ میں جہاد کیوں نہ کریں گے؟ ہم تو اپنے گھروں سے

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

نکالے گئے ہیں اور بچوں سے دور کر دیے گئے ہیں۔ پھر ان پر جہاد فرض ہوا تو سوائے تھوڑے سے لوگوں کے سب پھر گئے اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔" (246)

تفسیر 246: اس آیت میں بنی اسرائیل کا دوسرا واقعہ ذکر ہو رہا ہے۔ ربط ۱: پہلے وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ میں قتال کا حکم ذکر ہوا تھا تو اب قتال کی فرضیت کے بعد سستی اور بزدلی پر تحذیر اور تنبیہ مقصود ہے کہ اگرچہ تم کم ہو مگر جہاد سے کنارہ کشی مت کرو ورنہ ذلیل اور رسوا ہو جاؤ گے۔ ربط ۲: پہلے قتال کا حکم ہوا تو اب قتال کیلئے امیر یا بادشاہ کی ضرورت کا ذکر ہو رہا ہے۔ اَلْمَلَاِ یہ اسم جمع ہے۔ اس جماعت کو کہا جاتا ہے جس کا آپس میں اتفاق و اتحاد ہو مِلْأٌ سے یہ لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں برتن کو پانی وغیرہ سے بھرنا۔ اہل عرب کی یہ عادت تھی کہ جب پانی کے چشمہ پر جمع ہوتے تو ایک دوسرے کے برتنوں مشکیزوں کو بطور تعاون بھرتے تھے اور چونکہ پانی پر تو حیات کا دارومدار ہے۔ لہٰذا اس میں اشارہ ہے کہ جو لوگ ایک دوسرے سے دنیاوی منافع میں تعاون کرتے ہیں ان لوگوں کو ملاء کہا جاتا ہے۔ گویا کہ یہ لوگ دنیاوی یا اخروی شرافت سے سرشار ہیں۔ بقول امام زجاج یہ لوگ اپنی ضرورت کی چیزوں سے سیراب ہیں۔ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰی اس سے موسیٰ علیہ السلام کی وفات مراد ہے۔ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ اس سے مراد صموئیل علیہ السلام ہے جن کو عربی میں شمویل کہا جاتا ہے۔ لِنَبِيِّهِمْ اس لیے نہیں فرمایا کہ یہ نبی معروف نہیں تھے جس وقت قرآن مجید کا نزول جاری تھا (یعنی عرب معاشرے میں یہ نبی زیادہ معروف نہیں تھے) دوسرا سبب یہ ہے کہ واقعے کی عبرت کے لئے نبی کی تعین کی ضرورت نہیں کیونکہ نبی کوئی بھی ہو اس کی مخالفت ذلت و رسوائی ہے۔ اِبْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ تاریخ نویسوں کا قول ہے کہ اس وقت تک بنی اسرائیل میں سرداری نظام تھا یعنی ہر قبیلہ کا سردار خواہ نبی ہو یا نہیں قائد و رہنما کی حیثیت سے انکی باگ ڈور سنبھالتا تھا اور ان کے فیصلے بھی وہ سردار کرتے جن کو عَصْرُ الْقُضَاتِ کہتے تھے۔ اور صموئیل علیہ السلام اس زمانہ کے آخری نبی تھے۔ امام ابن کثیر نے لکھا ہے کہ بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کے بعد کچھ عرصہ تک دین پر قائم تھے پھر رفتہ رفتہ شرک و بدعت اور بے دینی کے کاموں میں مشغول ہو گئے نبیوں نے ان کو دعوت دی مگر بعض نبیوں کو انکار کرتے ہوئے جھٹلایا بعض کو قتل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ان کے دشمن فلسطینیوں کو مسلط کیا جو جالوت کی قیادت میں ان پر غالب ہوئے۔ اس نے ان کو گھروں سے نکالا ان کے بچوں کو غلام بنایا تورات کے تابوت کو ان سے چھین کر اُشْدُوْدِ و علاقہ میں لے گئے۔ اس وقت بنی اسرائیل جان گئے کہ ان جالوتیوں کے خلاف منظم جہاد لازم ہے لیکن اس وقت بدن کے اعتبار سے صموئیل علیہ السلام

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کمزور ہو گئے تھے تو انہوں نے اس سے نظام جہاد چلانے کے لئے ملک (بادشاہ) کا مطالبہ کیا تو اس کے بعد ان میں عُصَرُ الْمُلُوْكِ پیدا ہو گئے۔ اس قسم کے واقعات تورات میں سفر صموئیل الاول اصحاح سابع میں مذکور ہیں۔ قَالَ هَلْ (الخ) یہ استفہام تقریری ہے اور اَلَّا تُقَاتِلُوْا میں مُسْتَفْهِم ہے، هَلْ کے لئے عَسٰى کیلئے خبر ہے۔ اور اِنْ شرطیہ کے جواب کیلئے دلیل ہے۔ یعنی اَلَّا تُقَاتِلُوْا میں هَلْ عَسٰى اور اِنْ کے معنی کا تنازع ہے لہٰذا اس میں ترک جہاد، بزدلی اور شیطانی وسوسوں کی وجہ سے مخالفت رسول پر وعید وتحذیر ہے۔ اور نبی صموئیل علیہ السلام کا بھی یہی گمان تھا کہ سابقہ گناہوں کی وجہ سے یہ قتال سے گریز کریں گے۔ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یہ جملہ اصل میں ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا پر معطوف ہے اور درمیان میں ان کے نبی کا ذکر جملہ معترضہ کے طور پر ہے۔ (مَا) بمعنی اَيُّ شَيْءٍ استفہام انکاری کے طور پر ہے۔ یعنی قتال نہ کرنے کا کون سا سبب ہمارے پاس ہے۔ یعنی ہمارے جہاد کیلئے کوئی رکاوٹ نہیں اور ہم بزدلی بھی نہیں کریں گے اور اللہ تعالیٰ کی مدد کی بھی امید ہے۔ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا: یہ جملہ حالیہ ہے سابقہ انکار کیلئے بطور علت واقع ہے۔ اس میں شرعی اور طبعی اسباب قتال کا ذکر ہے کیونکہ انسان طبعاً غیرت وانتقام کی وجہ سے دشمن سے بدلہ لینا چاہتا ہے۔ اصل میں اخراج کسی چیز کو اپنی جگہ اور ساتھی سے علیحدہ کرنے کو کہا جاتا ہے تو یہ معنی لفظ اَبْنَآئِنَا کو شامل ہے کیونکہ ان کو اولاد سے الگ کر کے اولاد کو عقوبت خانوں (جیلوں) میں ڈال دیا تھا۔ تاریخ نویسوں نے لکھا ہے کہ ۴۴۰ لڑکوں کو غلامی کا طوق پہنایا تھا۔ لیکن ان کے ضعف کا اصل سبب یہ تھا کہ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ قَدْ اَمَرَنَا اللّٰهُ بِالْقِتَالِ وَاَوْجَبَ عَلَيْنَا یعنی ان کا ارادہ قتال میں حکم الٰہی کی تکمیل اور صحیح نیت کا نہیں تھا بلکہ انہوں نے صرف طبعی غیرت کا ذکر کیا۔ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ: یہ خلاصہ اور اجمالی خاکہ آنے والے تفصیلی قصہ اور واقعہ کا ہے۔ یہ وہ کمزوری ہے جس کا سب سے پہلے ذکر ہوا ہے۔ اس واقعہ میں اس امت کو (تحذیر) تخویف ڈراوا ہے کہ تم بنی اسرائیل کی طرح جہاد فرض ہو جانے کے بعد بزدلی سستی اور دنیا کی محبت کی وجہ سے مت چھوڑ نا۔ اِلَّا قَلِيْلًا حدیث میں وارد ہے کہ یہ اصحاب بدر کی طرح ۳۱۳ افراد تھے۔ جو کہ اسلام کا پہلا معرکہ تھا۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ اس میں وعید ہے اور اشارہ ہے کہ فرض جہاد سے منہ پھیر دینا ظلم ہے۔ اور اس قسم کے ظلم سے قوموں کی ذلت و تباہی ہوتی ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٤٧﴾ "اور ان سے ان کے نبی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ بنا دیا ہے تو کہنے لگے بھلا اس کی ہم پر حکومت کیسے ہو سکتی ہے؟ اس سے تو بہت زیادہ حقدار بادشاہت کے ہم ہیں، اس کو تو مالی کشادگی بھی نہیں دی گئی۔ نبی نے فرمایا سنو، اللہ تعالیٰ نے اسی کو تم پر برگزیدہ کیا ہے اور اسے علمی اور جسمانی برتری بھی عطا فرمائی ہے، بات یہ ہے کہ اللہ جسے چاہے اپنی (طرف سے) بادشاہت دے، اللہ تعالیٰ کشادگی والا اور علم والا ہے۔" (247)

تفسیر 247: اس آیت میں اس قول اِبْعَثْ لَنَا کی قبولیت اور بنی اسرائیل کی قباحت مذکور ہے کہ انہوں نے اپنے نبی کی مخالفت کی ہے نیز امارت کیلئے منتخب ہونے والے شخص کی صفات مذکور ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا لفظ اِنَّ تاکید کے لیے ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف واضح نسبت ہے لفظ "قَدْ" میں اشارہ ہے کہ طالوت بادشاہ کا انتخاب نبی کی رائے سے نہیں تھا۔ تورات میں اس کا نام شاول مذکور ہے لہٰذا طالوت اس کا لقب تھا یا اصطلاح قرآن اور قوم میں بادشاہ ہونے سے قبل اس کا لقب ہوا۔ امام مجاہد کا قول ہے کہ ملکاً سے مراد امیر لشکر ہے۔ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا الخ یہ کلام ہٹ دھرمی ہے۔ یہ بنی اسرائیل کی قدیم عادت رہی ہے کہ نسب میں ادنیٰ درجہ والے کو اعلیٰ درجہ والے پر برتری نہیں دیتے اور فقیر انسان کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں کیونکہ ان میں دو خاندان مشہور تھے ایک گھرانہ نبوت کے اعتبار سے جو لاوی بن یعقوب علیہ السلام کی اولاد تھی اور دوسرا گھرانہ یہودا کا تھا جو بادشاہت کیلئے منتخب تھا۔ تو انہوں نے مالداری اور نسب کو اللہ تعالیٰ اور رسول کے چناؤ پر مقدم کیا حالانکہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان اور تقدیر الٰہی کے مقابلے میں مال اور اسباب نسب کمزور ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ سورۃ حجرات آیت ۱۳ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت والا شخص تم میں سے وہ ہے جو متقی ہے۔ اور صحیح حدیث میں وارد ہے کہ لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ اِلَّا بِالتَّقْوٰى (مسند احمد و رجالہ رجال الصحیح بلوغ الامانی 226/12) عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں مگر تقویٰ کی وجہ سے۔ یعنی مالداری، خاندان، نسب، علاقہ زبان، کوئی چیز فضیلت کا سبب نہیں صرف تقویٰ سبب ہے۔ (تفسیر ابوحیان) بنی اسرائیل کی یہ عادت آج بھی اس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

امت کے جاہلوں میں پائی جاتی ہے کہ مالداری اور نسب کو دینداری پر فوقیت دیتے ہیں۔ وَ نَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ یہ بھی اللہ تعالیٰ پر اعتراض کی ایک صورت ہے کہ بہتر اور حقدار شخص کو اللہ تعالیٰ نے حق نہیں دیا۔ اس میں اپنی ذات کی بے محل پاکی بیان کرنا ہے۔ اور یہ دونوں بدترین عادات ہیں۔ یہاں پر حقیقت میں مال اور نسب کے اعتبار سے دعویٰ ہے ۔وَ لَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ: یہ ان کی نظر میں رکاوٹ ہے کہ غریب وفقیر انسان بادشاہت کا حقدار نہیں ہے۔ آج بھی یہ خصلت یہودیوں میں موجود ہے قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ یہ ان کے قول وَ نَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ کا جواب ہے کہ یہ انتخاب میں نے اپنی جانب سے نہیں کیا ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے امر سے ہوا ہے۔ اور یہ یقینی دلیل ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ بندوں کی مصلحتوں کو خوب جانتا ہے لہٰذا طالوت کے انتخاب میں بہت ساری حکمتیں ہیں۔ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ یہ ان کے اس قول کا رد ہے کہ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ یعنی شریعت نے مالداری کی بنیاد پر فضیلت نہیں دی ہے بلکہ علم اور جسم کی زیادت پر برتری دی انتخاب باشاہت اور امارت کیلئے یہ شرعی صفات ہیں۔ الْعِلْمِ سے تدبیر جنگ رعایا کے حقوق سیاسی امور پر دسترس وغیرہ مراد ہے اور یہ وحی کے علم اور دین سے حاصل ہوتا ہے الْجِسْمِ: سے مراد قوت طاقت والا صبر والا وجود ہے جو مدمقابل پر ہیبت، رعب اور خوف طاری کردے اور اس کے لیے سبب شکست ہو۔ نیز زیادت معنوی زیادت خیر اور سبب شجاعت ہے۔ وَ اللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ یہ بھی ان کے نبی کا کلام ہے اور یہ ان کی مخالفت کا تاکیدی رد ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فاعل مختار ہے لہٰذا اس کے انتخاب کا رد نہیں ہوسکتا۔ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ یعنی اللہ تعالیٰ وسیع اور فراخ فضل والا ہے جس کو وہ غریب وفقیر پر بھی کرتا ہے اور امارت بادشاہت کے مستحق کو بخوبی جانتا ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾ ع

"ان کے نبی نے پھر کہا کہ اس کی بادشاہت کی ظاہری نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق آجائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے دلجمعی ہے اور آل موسیٰ اور آل ہارون کا بقیہ ترکہ ہے، ملائک اس کو اٹھا کر لائیں گے۔ یقیناً یہ تو تمہارے لئے کھلی دلیل ہے اگر تم ایمان والے ہو۔" (248)

تفسیر 248: اس آیت میں طالوت کی بادشاہت کی حقانیت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک علامت کا ذکر ہو رہا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکات کا نزول ہے جو ایک مستحق ملک بادشاہ کیلئے ہوتے ہیں وَ قَالَ لَهُمْ ظاہر کلام سے معلوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی ہٹ دھرمی کی بنا پر نبی سے علامت طلب کی تھی جس کے جواب میں یہ علامت ظاہر ہوئی۔ یہ وہ صندوق تھا جوان کی نافرمانیوں کی وجہ سے فلسطین کے عمالقہ قوم نے ان سے چھین لی تھی اس صندوق کا بغیر کسی جنگ وجدال ملائکہ کے ذریعے سے واپس لانا ایک معجزہ ہے اور اس کے اندر بھی علامات اور امور معجزہ موجود تھے۔ موجودہ تورات میں بھی سفر صموئیل علیہ السلام میں اس صندوق کے آنے کا ذکر اور طریقہ موجود ہے۔ مفسرین نے بھی مختلف قصے نقل کئے ہیں۔ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ صندوق آنے کا ذکر مجازی طور پر ہوا ہے۔ تابوت صندوق کو کہا جاتا ہے البتہ اس میں الف لام سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں یہ معلوم اور معروف تھا یہ وہ صندوق تھا۔ جس میں موسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے اصل الواح تورات کے رکھے ہوئے تھے جس کو تابوت الشہادت کہا جاتا تھا۔ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ: فِيْهِ کی ضمیر میں دو اقوال ہیں۔ یہ ضمیر تابوت آنے کی طرف راجع ہے کیونکہ وہ خرق عادت طریقے سے آیا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ صندوق کی طرف ضمیر راجع ہے کیونکہ اس کے اندر معجزانہ چیزیں موجود تھیں۔ سَكِيْنَةٌ وقار واطمینان کے معنیٰ میں ہے اصل میں سکون سے لیا گیا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں نماز کیلئے آنے والے سے کہا گیا ہے عَلَيْكُمْ بِالسَّكِيْنَةِ (صحیح مسلم کتاب المساجد حدیث 602) براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔ تِلْكَ السَّكِيْنَةُ تَنَزَّلَتْ لِلْقُرْآنِ (صحیح بخاری کتاب التفسیر 4839 مسلم حدیث 795)۔ اسید بن حضیر کی حدیث میں ہے تِلْكَ الْمَلٰٓئِكَةُ دَنَتْ لِصَوْتِكَ (صحیح بخاری کتاب فضائل القرآن حدیث 5018) پہلی حدیث سے اصحاب السکینہ یعنی ملائکہ مراد ہیں صندوق کا آنا طالوت سے متعلق ان کے دلوں کے اطمنان کا سبب بنا حالات جنگ میں دلوں کا اطمینان وسکون بنا کیونکہ یہ معجزہ تھا اور اس میں اللہ تعالیٰ کی کتاب موجود تھی وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ۔ بَقِيَّةٌ اس چیز کو کہا جاتا ہے جو زیادہ مقدار سے بچ جائے اور نفیس اور پسندیدہ چیز کو بھی بقیہ کہا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں بہت سے اقوال ہیں (۱) موسیٰ کی لاٹھی ہارون وموسیٰ کے کپڑے (۲) موسیٰ کی لاٹھی ہارون کی پگڑی (۳) تورات بقول امام مجاہد وعطاء (۴) جہاد فی سبیل اللہ اور اس پر اللہ تعالیٰ کا حکم۔ بقول امام ضحاک۔ اٰلُ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ کی اضافت میں مضاف ومضاف الیہ دونوں شامل ہیں۔ یعنی موسیٰ وہارون علیہما السلام خود اور ان کے آل واہل بیت پیروکار شامل ہیں مفسر ابوحیان نے فرمایا ہے کہ آل سے مراد وہ انبیاء کرام ہیں جو ان دونوں کی اولاد میں آئے تھے یہ چیزیں ان انبیاء کو وراثت میں منتقل ہوئی تھیں جو تابوت میں تھیں یہاں تک کہ عمالقہ نے ان سے قبضہ میں لے لیں۔ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ یہ جملہ حالیہ یا مستانفہ ہے یہ بھی اس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تابوت کی عظمت شان پر دلیل ہے۔ ملائکہ نے اس تابوت کو لا کر طالوت کے قریب رکھ دیا اس لانے میں ظاہری اسباب نہیں ہیں اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمْ ۔ ذٰلِکَ میں تابوت آنے کی طرف اشارہ ہے اور آیت میں اشارہ ہے کہ طالوت کی امارت اور بادشاہت پر یہ دلیل ہے۔ اور دشمن کے مقابلہ میں تمھاری نصرت کیلئے علامت ہے۔ ان شرطیہ ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کی قدرت پر، ملائکہ اور معجزات پر جب کوئی صحیح ایمان والا ہوگا تو تسلیم کریگا اور ان کیلئے یہ آیت کہلائے گی یا مومن تصدیق کے معنیٰ میں ہے یعنی طالوت کی بادشاہت پر یقین والے۔ فائدہ: لفظ سکینہ چھ مرتبہ قرآن مجید میں مذکور ہے۔ پہلی یہ آیت ہے، سورۃ توبۃ آیت ۲۶۔۴۰ سورۃ فتح آیت ۴۔۱۸۔۲۶ آخری پانچ آیات میں تسکین کا نزول نبی اکرم ﷺ اور صحابہ پر ذکر ہوا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے لفظ بقیہ قرآن مجید میں تین مرتبہ مذکور ہے پہلی یہ آیت دوسری سورۃ ہود آیت ۸۶۔۱۱۶۔ اکثر مفسرین کے نزدیک مذکورہ دونوں آیتوں میں بقیہ سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت دین کی سمجھ وشعور مراد ہے۔ معلوم ہوا کہ اس آیت میں بھی بقیہ سے مراد علم ہے جو تورات کے علاوہ ہارون وموسیٰ علیہم السلام کو دیا گیا تھا صاحب اللباب کہتے ہیں کہ بقیہ سے مراد موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا شریعت اور دین ہیں اس لیے کہ تورات تو سکینہ کے لیے مصداق ہے اس علم کو انبیاء کرام کی حدیث کہا جاتا ہے۔ یعنی اس تابوت کی وجہ سے انکا باقی دین منظم اور مضبوط ہوگیا۔ حاصل کلام یہ ہوا کہ اس صندوق میں کتاب الٰہی (تورات) اور انبیاء بنی اسرائیل کی احادیث تھیں اور یہ دونوں دلوں کے اطمینان کا سبب ہیں اس میں آیت الٰہی بھی ہے ان کو برکات الٰہی بھی کہا جاتا ہے کیونکہ طالوت کے سبب سے یہ برکات واپس آگئیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صالح دیندار بادشاہ اور امیر کی وجہ سے ملک میں کتاب اللہ وسنت کی تعلیم عام ہوجاتی ہے اور خوشحالی آتی ہے۔ فائدہ ۲ سوال: جب بقیہ سے مراد موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی ہارون علیہ السلام کی پگڑی لباس ہو اور اس کے سبب سے اطمینان قلب اور نصرت الٰہی ہوسکتی ہو تو اس سے معلوم ہوا کہ چیزوں سے تبرک حاصل کرنا جائز ہے؟ جواب ۱: یہ بات گزر گئی کہ اس میں بہتر قول یہ ہے کہ بقیہ سے مراد کتاب اللہ سنت انبیاء۔ دین شریعت ہیں اور مذکورہ چیزیں یقیناً سبب برکت الٰہی ہیں۔ جواب ۲: اگر ثابت ہوجائے یہ چیزیں پگڑی، لاٹھی، اور لباس موسیٰ وہارون علیہما السلام وغیرہ تھے تو بھی اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ حدیث سے ثابت ہے کہ صحابہ کرام نے نبی کریم ﷺ کے وضو کے پانی کو داڑھی مبارک کے بالوں کو برکت کیلئے اور شفاء کیلئے استعمال کیا تھا۔ (صحیح بخاری کتاب الحج وکتاب الوضوء حدیث 170، 171)۔ اس بارے میں بہت سی احادیث ہیں۔ مگر اس تبرک کیلئے شرائط

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور شرعی طریقہ اختیار کرنا لازم ہے۔(۱) پہلی شرط یہ ہے کہ جس طرح حدیث کیلئے صحیح سند کا ہونا ضروری ہے اسی طرح اس تبرک والی چیز کا سند صحیح سے ثابت ہونا لازم ہے کہ یہ نبی کی چپلیں اور آپ ﷺ کے بال، لاٹھی اور پگڑی ہیں ورنہ وہ نبی پر جھوٹ قرار دیا جائے گا جیسا کہ مختلف جھوٹے تبرکات کے قصے مشہور کیے گئے ہیں۔دوسری شرط۔اس تبرک والی چیز کو شرک وبدعت کا ذریعہ نہیں بنائیں گے یعنی وہاں عرس میلہ لگانا۔طواف۔سجدے کرنا۔رکوع کی طرح جھکنا وغیرہ یہ سب حرام فعل ہیں۔تیسری شرط یہ ہے کہ اس کو موثر مستقل سبب نہیں مانیں گے کیونکہ برکت کی بطور فاعلیت صرف اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت ہوتی ہے جس کی تفصیل میں نے ''تنشیط الاذھان فی اصول تفسیر القرآن'' باب شرک فی البرکات میں کی ہے۔

چوتھی شرط یہ کہ غیر نبیوں کی چیزوں کو نبیوں کے ساتھ برکات پر قیاس نہیں کیا جائے گا۔اگرچہ بعض علماء نے اس بارے میں جواز کا قیاس کیا ہے لیکن ان کے پاس کوئی دلیل نہیں سوائے نبیوں کی برکات پر قیاس کرنے کے۔قیاس مساوات چاہتا ہے جبکہ نبی معصوم اور غیر نبی جو کہ معلوم نہیں ہوتا کی چیزوں میں بہت ہی فرق ہے۔امام شاطبیؒ نے الاعتصام جلد ۲ ص ۸ میں صحابہ کرام کا اجماع نقل کیا ہے کہ انہوں نے غیر نبی مثلاً ابوبکر اور عمر اور دیگر بڑے بڑے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی چیزوں سے قیاس کر کے تبرک حاصل نہیں کیا۔اس میں دو وجوہات ہیں۔پہلی وجہ یہ ہے کہ ان کے علم میں یہ بات تھی کہ برکات انبیاء کی چیزوں سے حاصل ہوتی ہیں دیگر لوگوں کی چیزوں کو ان پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔دوسری وجہ یہ کہ وہ غلو اور شرک سے ڈرتے تھے یہی وجہ ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس درخت کو جس کے نیچے بیعت رضوان ہوئی تھی جڑ سے کاٹ دیا تھا(فتح الباری مصنف ابن ابی شیبہ تفسیر زاد المسیر و تفسیر فتح البیان وغیرہ۔جب ان کو معلوم ہوا کہ اس کے نیچے لوگ جمع ہوتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں انہوں نے درخت کو کاٹا اور اس راستے کو بھی بند کر دیا۔دور حاضر میں جاہلوں نے اپنے پیروں کے آستانوں اور چلوں مراقبوں اور عبادت کی جگہوں کو کعبہ کی طرح برکت والی جگہیں قرار دیے ہے وہاں عرس و میلے لگاتے ہیں اور ان مقامات کی طرف سفر کرتے ہیں۔اہل علم اور داعیوں اور ذمہ دار لوگوں کو چاہیئے کہ اس قسم کے راستے بند کریں تاکہ لوگ شرک میں واقع نہ ہوں اور لوگوں کو اس بات کی ترغیب دیں کہ قرآن وسنت کی ثابت شدہ صحیح برکات حاصل کریں ایسی تفصیلات امام شاطبی نے الاعتصام میں علامہ عبدالحیؒ نے مجموعۃ الفتاویٰ جلد ا ص ۲۷۸ میں ذکر کی ہیں۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾

"جب طالوت لشکروں کو لے کر نکلے تو کہا سنو اللہ تعالیٰ تمہیں ایک نہر سے آزمانے والا ہے، جس نے اس میں سے پانی پی لیا وہ میرا نہیں اور جو اسے نہ چکھے وہ میرا ہے، ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے۔ لیکن سوائے چند کے باقی سب نے وہ پانی پی لیا۔ طالوت مومنین سمیت جب نہر سے گزر گئے تو وہ لوگ کہنے لگے آج تو ہم میں طاقت نہیں کہ جالوت اور اس کے لشکروں سے لڑیں کہا ان لوگوں نے جو یہ یقین کر رہے تھے کہ یہ اللہ کے سامنے جانے والے ہیں بہت مرتبہ کم لوگ زیادہ لوگوں پر غالب آئے ہیں اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے" (249)

تفسیر 249: اس آیت میں طالوت بادشاہ کی سیاست کا ذکر ہو رہا ہے انہوں نے امتیاز کے لئے اس طرح کیا تاکہ کمزور دنیا پرست اور امیر کے نافرمان بہادر اور نیک فوجیوں سے الگ ہو جائے تاکہ جہاد میں کامیابی ملے۔ انہوں نے قتال کے انتظام کیلئے بادشاہ طلب کیا تھا تو اس کے انتخاب و تصدیق کے بعد تابوت کے آنے سے تیاری جہاد شروع ہو گئی۔ فَصَلَ یہاں پر لازمی معنیٰ میں ہے یعنی اِنْفَصَلَ وَ خَرَجَ۔ آبادی اور شہر سے نکل گئے۔ یا پھر یہ متعدی ہے مفعول مقدر ہے یعنی فَصَلَ نَفْسَهٗ بِالْجُنُوْدِ یہ با تعدیت یا مصاحبت کیلئے ہے۔ جُنُوْدِ جُنْدٌ کی جمع ہے۔ مخلوق کی ہر قسم کو جند کہا گیا ہے۔ روحوں کو بھی جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَةٌ کہا گیا ہے۔ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ: قَالَ کا فاعل طالوت ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہے۔ البتہ طالوت نے شمویل علیہ السلام کی وحی (دعا) لوگوں میں نشر کی کیونکہ بادشاہ کا کام وحی کا نفاذ ہوتا ہے۔ مُبْتَلِيْكُمْ اس امتحان میں دو فائدے ہیں۔ پہلا فائدہ یہ ہے کہ نافرمان اور فرمانبردار، بہادر اور بزدل میں امتیاز ہو جائے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ صبر کے ذریعے ان کو مشکلات اور تکالیف کا عادی بنا دیا جائے۔ نیز اللہ تعالیٰ کا امتحان لوگوں کے فائدے اور ان کو باخبر کرنے کیلئے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے علم حاصل نہیں کرتا اور فائدے کا محتاج بھی نہیں ہے۔ تفسیر ماجدی میں اس نہر کے متعلق لکھا ہے کہ یہ نہر یردون (اردن) ہے۔ جو فلسطین میں بہہ رہی ہے شمال سے جنوب کی جانب بحر مردہ میں گرتی ہے۔ جس کی ابتداء میں میٹھا پانی ہے آگے جا کر اس میں بیکار پانی ہے امتحان اس طریقے سے کیا گیا تھا کہ موسم گرمی کا تھا اور سفر صحرا میں تھا پانی کی قلت کی وجہ سے ان کو شدت کی پیاس لگی۔ امتحان کا طریقہ اس طرح تھا کہ۔ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ، شُرْبٌ کے بعد جب مِنْ۔ آجائے تو کثرت غ۔ پر دلالت کرتا ہے یعنی اوندھا لیٹ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کر نہر سے پانی پینا۔ کبھی عام بھی استعمال ہوتا ہے بعد والے قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر کرع۔ کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ مِنِّیْ میں مِنْ تبعیض کیلئے ہے یعنی حصہ۔ ٹکڑا یعنی میری فرمانبردار جماعت میں سے نہیں ہے۔ اس طرح سورۃ آل عمران آیت ۲۸ اور سورۃ انعام آیت ۱۵۹ میں مذکور ہے۔ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ۔ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ: طَعَمٌ اصل میں ذائقہ چکھنے کو کہا جاتا ہے اور یہ کھانے پینے دونوں میں مستعمل ہے [سوال] وَمَنْ لَّمْ يَشْرَبْهُ کیوں نہیں فرمایا؟ جواب طَعَمٌ چکھنے کی نفی سے پی لینے کی نفی لازم ہوگی جب پانی منہ میں ڈال کر واپس نکال دیا جاتا ہے تو چکھ لینے کا اطلاق اس پر ہوگا جبکہ منہ سے واپس گرانے پر شُرْبٌ کا اطلاق نہیں ہوگا۔ اس نفی میں بہت مبالغہ ہے کہ پینا تو کیا۔ چکھ لینا بھی نہیں۔ امام ابن عطیہؒ کا قول ہے کہ اس میں حرام ذرائع سے بندش کی طرف اشارہ ہے۔ سوال: یہاں پر يَطْعَمْهُ فرمایا ہے اور لَمْ يَطْعَمْهُ مِنْهُ نہیں فرمایا؟ جواب: پہلے شَرِبَ مِنْهُ فرمایا تھا تاکہ ظاہراً یہ معلوم ہو جائے کہ شرب منہ لگا کر ہو یا ہاتھ و برتن کے ذریعے ہو سب منع ہے۔ دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ اِغْتَرَفَ کا استثنیٰ متصل صحیح ہو جائے کیونکہ وہ ہاتھ سے پی لینا ہے۔ منہ لگا کر نہیں۔ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ یہ پہلے جملہ سے استثنیٰ ہے۔ یعنی فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ چونکہ اس میں پینے کی حرمت کا ذکر ہے لہذا اس میں چلو بھر پینے کا جواز مذکور ہے۔ دوسرا جملہ درمیان میں معترضہ ہے اور سابقہ جملہ کیلئے تکملہ ہے کیونکہ اس کو استثنیٰ سے قبل لایا گیا ہے۔ غُرْفَةً غین کے پیش کے ساتھ مفعول کے معنے میں ہے اور یہ وزن کم چیز کیلئے مستعمل ہوتا ہے۔ جیسا لُقْمَةً نوالہ اور اگر غین کے زبر سے ہو تو مصدر ہے یکبارگی کے لیے آتا ہے امام مبردؒ نے کہا ہے کہ زبر کے ساتھ عام ہے یعنی زیادہ اور کم دونوں کیلئے اور غین کے پیش کے ساتھ بھرے ہوئے چلو کیلئے آتا ہے۔ بِيَدِهٖ۔ غُرْفَةً کیلئے تفسیر ہے یعنی ایک ہاتھ کا چلو مراد ہے دونوں ہاتھ نہیں۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جس نے ایک چلو پر صبر کیا تو اس کیلئے کافی ہوا اللہ نے اس میں برکت ڈال دی کیونکہ وہ معجزہ یا طالوت ولی کی کرامت تھی۔ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ منہ میں اشارہ ہے کہ انہوں نے بے صبری کرتے ہوئے نہر سے پانی منہ لگا کر پیا اور خوب سیراب ہو کر پیٹ بھر لیا یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قلیل دو قسم کے لوگ تھے ایک وہ افراد تھے جنہوں نے بالکل چکھا ہی نہیں یعنی عزیمت والے درجہ کو اختیار کیا دوسرے افراد وہ تھے جنہوں نے ایک ایک چلو پی لیا یعنی رخصت پر عمل کیا۔ ظن سے مراد یقین ہے۔ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے طالوت کے ساتھ نہر پار کی تھی اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اطاعت اور بہادری انہوں نے قیامت پر پختہ یقین کی وجہ سے کی تھی کم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مِّنۡ فِئَةٍ قَلِيۡلَةٍ غَلَبَتۡ فِئَةً كَثِيۡرَةًۢ بِاِذۡنِ اللّٰهِ: اس قول میں اپنے ساتھیوں کو جہاد فی سبیل اللہ کی ترغیب دینا ہے۔ اور جالوت اور اس کے ساتھیوں سے خوف کھانے اور بزدلی دکھانے سے منع کرنا مقصود تھا کَمۡ یہاں پر تکثیر کیلئے ہے۔ فِئَةٍ لوگوں کی جماعت کو کہا جاتا ہے۔ لفظ فَیۡءٌ سے لیا گیا ہے۔ رجوع کو کہا جاتا ہے۔ جماعت کے لوگ بھی ایک دوسرے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ بِاِذۡنِ اللّٰهِ: اِذۡن توفیق اور نصرت کے معنی میں ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ دشمن کی زیادہ تعداد سے خوفزدہ ہو کر قتال نہیں چھوڑنا چاہیے۔ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ: یہ ان کا قول ہے یا اللہ تعالیٰ کا قول ہے اور صبر پر ترغیب دینا مقصود ہے۔

وَلَمَّا بَرَزُوۡا لِجَالُوۡتَ وَجُنُوۡدِهٖ قَالُوۡا رَبَّنَاۤ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿٢٥٠﴾ "جب ان کا جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ ہوا تو انہوں نے دعا مانگی کہ اے پروردگار ہمیں صبر دے، ثابت قدمی دے اور قوم کفار پر ہماری مدد فرما۔" (250)

تفسیر 250: اس آیت میں میدان جنگ میں قتال کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے ہے دعا کی تعلیم مقصود ہے بَرَزُوۡا۔ بَرَزَ میدان جنگ میں قتال کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے کی تعلیم مقصود اور مبارزہ مقابلہ کیلئے دشمن کا دشمن سے آمنا سامنا ہونا۔ رَبَّنَاۤ یہ لفظ زیادہ عاجزی اور اپنے احوال کی اصلاح کیلئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی طلب ہے۔ رَبَّنَاۤ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا اِفۡرَاغ کا معنی ہے برتن سے پانی بہالینا یہاں تک کہ برتن خالی ہوجائے۔ لفظ عَلٰی صبر کے استعلاء کی طرف اشارہ ہے اور اِفۡرَاغ میں کثرت کی طرف اشارہ ہے۔ اور عَلٰی میں غلبہ صبر اور احاطہ صبر پر دلیل ہے۔ اور صَبۡرًا نکرہ میں اس کی عظمت پر دلیل ہے۔ وَثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا قدموں کی مضبوطی دلوں کی مضبوطی کے ساتھ مربوط ہے اور وہ صبر ہے تو دل کا صبر سبب ہے قدموں کی مضبوطی کے لئے اور اس سے مراد میدان جنگ کے فرار سے بچنا ہے۔ وَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ: نصرت کے بعد لفظ علیٰ غلبہ کیلئے ہے نصرت عام ہے خواہ اسباب نصرت جنگ ہو، یا غیبی مدد ہو۔ یعنی مجاہد فی سبیل اللہ صبر و استقلال کے باوجود نصرت الٰہی کا محتاج ہے۔

فَهَزَمُوۡهُمۡ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوۡتَ وَاٰتٰٮهُ اللّٰهُ الۡمُلۡكَ وَالۡحِكۡمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوۡلَا دَفۡعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعۡضَهُمۡ بِبَعۡضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الۡاَرۡضُ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿٢٥١﴾

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

"چنانچہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے انہوں نے (جالوتیوں) کو شکست دے دی اور داؤد (علیہ السلام) کے ہاتھوں جالوت قتل ہوا اور اللہ تعالیٰ نے داؤد (علیہ السلام) کو مملکت وحکمت اور جتنا کچھ چاہا علم بھی عطا فرمایا۔ اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو بعض سے دفع نہ کرتا تو زمین میں فساد پھیل جاتا لیکن اللہ تعالیٰ دنیا والوں پر بڑا فضل وکرم کرنے والا ہے۔" (251)

تفسیر 251: اس آیت میں دشمن کی شکست کا تذکرہ ہے داؤد علیہ السلام کو بادشاہت اور نبوت کا ایک ساتھ عطاء کیا جانا پھر قتال میں نصرت حکمت الٰہی کا ذکر کرنا ہے کہ اس کے ذریعے سے زمین سے فساد کا خاتمہ کرتا ہے۔ فَهَزَمُوْهُمْ۔ (فا) سببیت پر دلالت کر رہی ہے یعنی کچھ لوگوں کا امیر کی اطاعت کرنا، اللہ پر توکل، صبر اور نصرت کی دعا کرنا دشمنوں پر غلبے کا سبب بنا۔ بِاِذْنِ اللّٰهِ: 'اذن' کو اس لیے ذکر کیا ہے کہ تمام اسباب تاثیر میں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں۔ هَزَمَ اصل میں توڑ دینے کو کہا جاتا ہے۔ یہاں پر دشمن کی طاقت وقوت کو توڑ دینا اور شکست دینا مراد ہے۔ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ: یہ ان کی شکست کی کیفیت کا ذکر ہو رہا ہے۔ یعنی طالوت کے اس لشکر میں داؤد بن ایشا یا ایسا نام کا ایک شخص شریک تھا جو یہودا ابن یعقوب علیہ السلام کا بیٹا تھا یعنی اولاد میں سے تھا۔ اس کے ہاتھ سے جالوت قتل ہوا جس کا تفصیلی قصہ مفسرین نے لکھا ہے مگر قرآن وسنت میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ اس جنگ میں جالوت کے اور بھی بہت سارے ساتھی قتل ہوئے اور جو بچ گئے وہ کمزور ہو کر شکست سے دوچار ہوئے۔ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ: یہ بات گزر گئی تھی کہ بنی اسرائیل میں موسیٰ علیہ السلام کے بعد نبوت اور بادشاہت ایک بندے میں اکٹھی نہیں کی گئی تھی۔ لھٰذا داؤد علیہ السلام پہلے شخص ہیں جو بنی اسرائیل کے نبی بھی اور بادشاہ بھی۔ اَلْمُلْكَ: اس سے کامل بادشاہت مراد ہے جو انسانوں کے شایان شان ہو۔ وَالْحِكْمَةَ ابن کثیرؒ وغیرہ نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد نبوت ہے اور بعض کا قول ہے کہ زبور مراد ہے اور کسی نے کہا ہے کہ ہر چیز کا استعمال اپنے اپنے محل پر کرنا مراد ہے جو نبوت سے حاصل ہوتا ہے۔ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ: اس سے جنگی ساز وسامان بنانے کا ہنر یعنی کاریگری مراد ہے۔ معجزے کے ذریعے زرہ وغیرہ بنانا جیسا کہ سورۃ سبا آیت ۱۰، اور ۱۱ میں مذکور ہے۔ پرندوں کی باتیں جاننا دین کا علم فیصلوں کے متعلق اچھے انداز میں صلح وغیرہ کرنا۔ بہترین آواز يَشَآءُ: ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے۔ بعض نے ضمیر کو داؤد علیہ السلام کی طرف راجع کیا ہے۔ امام قرطبیؒ نے نقل کیا ہے کہ یہ فعل مضارع فعل ماضی کے معنی میں ہے جس کیلئے قرینہ عَلَّمَهٗ ہے۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ: یہ مومنوں کے ساتھ نصرت کی حکمت اور جہاد کے راز اور حکمت کا ذکر ہے۔ یہاں پر دفع کرنے والا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ذات الٰہی ہے بَعْضَهُمْ اَلنَّاسُ سے بدل بنا ہے۔ بَعْضَهُمْ سے مراد مدفوع ہے یعنی دھکیلے گئے یا شکست دیے گئے لوگ اور بِبَعْضٍ مدفوع بِہٖ ہے۔ جن کے ذریعے سے دفع کیا گیا ہے۔ اس دفاع کی کئی اقسام ہیں۔ **پہلی قسم:** میں انبیاء علیہم السلام اور داعیان حق ہیں جو دلائل کے ساتھ کافروں کے کفر کو ختم کرتے ہیں۔ **دوسری قسم:** نہی عن المنکر کے ذریعے سے نافرمانیوں کو ختم کرنے والے لوگ ہیں جو دین پر عمل پیرا ہو کر برائیوں کو مٹاتے ہیں۔ **تیسری قسم:** انبیاء کرام مسلمانوں کے خلفاء اور ملائکہ ہوتے ہیں جو دنیا سے فساد اور فتنوں کو ختم کرتے ہیں۔ **چوتھی قسم:** نیک اور صالح لوگوں کا وجود ہے جو لوگوں کی مصیبتوں اور تکالیف سے بچاؤ کا سبب ہوتے ہیں۔ **پانچویں قسم:** کسی علاقہ میں صالح انسان ہوتا ہے اس کی وجہ سے اس علاقہ قبیلہ و اولاد سے برائیاں ختم ہوتی ہیں۔ جس کو حدیث میں خیر کے کھولنے اور شر کو بند کرنے کی چابی سے تعبیر کیا ہے صحیح الجامع حدیث 4108 شیخ البانی نے اس روایت کو حسن کہا ہے۔ اس کی تائید سورت کہف آیت ۸۲ اور سورۃ فتح آیت ۲۵، سورۃ انفال آیت ۳۳ میں موجود ہے۔ **چھٹی قسم:** صحیح گواہوں کا وجود ہے جن کے ذریعے سے سچی گواہی پر انصاف کے فیصلے ہوتے ہیں جس سے مستحقین کو حق حاصل ہوتا ہے اور شر و فساد ختم ہوتا ہے۔ **ساتویں قسم:** قتال فی سبیل اللہ میں مصروف مجاہدین ہیں جو قوت اور طاقت سے مشرکین اور کفار کی قوت کو کچل دیتے ہیں اور دین کو غالب کر دیتے ہیں یہ قسم داؤد علیہ السلام کے واقعہ کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے جنہوں نے قوت جالوت کو ختم کر کے دین کو غالب کیا تھا۔ مذکورہ اقوال مفسر قرطبی، ابو حیان، ابن کثیر، تفسیر اللباب رحمہم اللہ وغیرہ نے ذکر کیے ہیں۔ صاحب اللباب نے فرمایا ہے کہ الفاظ کے عموم کی وجہ سے یہ جملہ مذکورہ تمام اقسام کو شامل ہے۔ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ الفاظ کی عمومیت کی وجہ سے اس میں معاش کی خرابی فتنے گناہوں اور تکالیف میں اضافہ باطل دعوے کرنا کفر کا اور کافروں کا غلبہ سب اس میں داخل ہیں۔ سورۃ حج آیت ۴۰ میں جو سبب مذکور ہے عبادت خانوں کی ویرانی وغیرہ وہ بھی اس میں داخل ہے۔ لہٰذا یہ جملہ ان لوگوں کا صریح واضح رد ہے جو جہاد اسلامی اور دعوت توحید و سنت کو فساد یا دہشت گردی سے تعبیر کرتے ہیں جبکہ یہ عین اصلاح معاشرہ ہے۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ: اس استدراک میں ایک فسادی وہم کو ختم کیا گیا ہے یعنی اگر کوئی خیال کرے کہ میرا مقصد پورا نہیں ہوا لہٰذا میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہوا تو اس وہم کا جواب یہ ہے کہ یہ مفسد بھی عالمین میں داخل ہے لہٰذا ان کو اللہ تعالیٰ کا فضل پہنچ گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس شخص کے فساد کو ختم کرنا بھی اس پر فضل ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٢٥٢﴾

"یہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جنہیں ہم حقانیت کے ساتھ آپ پر پڑھتے ہیں، بالیقین آپ رسولوں میں سے ہیں" (252)

تفسیر 252: اس آیت میں آخری نبی کی نبوت کی تصدیق کی گئی ہے یعنی اے محمد ﷺ سابقہ کتابوں میں ان واقعات کا ذکر موجود ہے مگر آپ نے تو وہ کتابیں نہیں پڑھیں لیکن پھر آپ نے یہ واقعات سچ سچ بتا دیے اس لیے کہ آپ کو ہم نے وحی کی ہے جو آپ کی نبوت کی واضح دلیل ہے۔ ربط: داؤد علیہ السلام کے سابقہ واقعہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ فساد ختم کرنے کیلئے نصرت الٰہی اور جہاد کی ضرورت ہے تو اب یہ بات بتائی جاتی ہے کہ خاص کر آخری رسول ﷺ اور دیگر انبیاء فساد کے خاتمہ کیلئے ارسال کیے گئے ہیں۔ تِلْكَ: سابقہ آیتوں کی طرف اشارہ ہے یعنی بالخصوص طالوت اور داؤد علیہ السلام کے متعلق آیتیں جو بہت ساری عبرتوں اور معجزات پر مشتمل ہیں۔ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ: اس میں دلیل ہے کہ تلاوت اللہ تعالیٰ کی صفت ہے بلا تاویل و تمثیل اللہ تعالیٰ کیلئے ماننا چاہئے۔ بِالْحَقِّ یہ صدق کے معنی میں ہے اور اس امر کے متعلق ہے جو اس واقعہ کے مطابق ہے جو اہل کتاب کی کتابوں میں مذکور ہے۔ اس میں شیطانی القاء و کہانت وغیرہ نہیں ہے۔

وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ یہ عطف ہے مگر مسبب کو سبب پر عطف کیا گیا ہے اور نتیجے کو دلیل پر عطف کیا گیا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۭ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۣ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝

"یہ رسول ہیں جن میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، ان میں سے بعض وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے بات کی ہے اور بعض کے درجے بلند کئے ہیں، اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو معجزات عطا کیے اور روح القدس سے ان کی تائید کی۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کے بعد والے اپنے پاس سے دلیلیں آجانے کے بعد ہرگز آپس میں لڑائی نہ کرتے، لیکن ان لوگوں نے اختلاف کیا، ان میں بعض تو مومن ہوئے اور بعض کافر، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو یہ آپس میں نہ لڑتے لیکن اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔" (253)

تفسیر 253 ربط ۱: سابقہ آیت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی اور ان کو تسلی کا تذکرہ ہوا کہ آپ دعوت حق لیکر آئے ہیں تو اب سابقہ نبیوں پر جو مصائب مشکلات آئے تھے جو کفار کے ساتھ قتال کرتے اور دعوت وقتال میں صبر کرتے تھے اس میں ان کے صبر واستقلال کا ذکر کر کے تسلی دی گئی ہے۔ ربط ۲: اَلْمُرْسَلِيْنَ لفظ سے ثابت ہوا کہ تمام رسول منصب رسالت میں برابر ہیں تو اب بتایا جا رہا ہے کہ ان کے مراتب میں تفاضل ہے۔ ربط ۳: فساد ختم کرنے کیلئے قتال فی سبیل اللہ اور آخری نبی کا ارسال ذکر کرنے کے بعد اب ایک وہم کو ختم کیا جاتا ہے یعنی کوئی یہ خیال نہ کرلے کہ ہوسکتا ہے فساد اور لڑائی لوگوں میں نبیوں کے درجات کی وجہ سے ہوئی ہو اور ان کے احکام میں اختلاف سے ہوئی ہو تو اس وہم کو دفع کیا جا رہا ہے کہ یہ مراتب اختلاف کا سبب نہیں بلکہ اختلاف لوگوں کا ایمان اور کفر میں ہوا ہے یعنی فروعی مسائل سبب اختلاف نہیں ہیں بلکہ اصولی مسائل سبب اختلاف ہیں۔ تِلْكَ الرُّسُلُ: تِلْكَ لفظ مونث ذکر کیا ہے۔ یعنی تِلْكَ جَمَاعَةُ الرُّسُلِ: یہ رسولوں کی جماعت ہے اور تِلْكَ میں چند اقوال ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ مشار الیہ یعنی جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ انبیاء ہیں جن کا ذکر اس سورۃ میں گزر گیا ہے یعنی ابراہیم، اسماعیل، اسحٰق، یعقوب، شموئیل اور داؤد علیہم السلام۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس میں وہ انبیاء مراد ہیں جو المرسلین میں ذکر ہوئے ہیں جن کو فساد کے خاتمہ کیلئے مبعوث کیا گیا تھا اور لفظ الرسل میں بھی اس خصوصیت کی طرف اشارہ ہے۔ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ: سورۃ بنی اسرائیل آیت ۵۵ میں بھی اس طرح ہے۔ امام قرطبی کا موقف یہ ہے کہ یہ مرتبوں کا فرق معجزات مہربانیوں، عزت اور دیگر احوال میں ہے۔ نبوت اور صفت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

رسالت میں سب مساوی ہیں۔ اس قول سے اس حدیث کا مفہوم بھی واضح ہوا کہ لَا تُفَضِّلُوْا بَيْنَ الْأَنْبِيَآءِ وَلَا تُفَضِّلُوْنِيْ عَلَى الْأَنْبِيَآءِ. وَلَا تُخَيِّرُوْا بَيْنَ الْأَنْبِيَآءِ۔ (صحیح بخاری کتاب احادیث الانبیاء حدیث 3414، صحیح مسلم کتاب الفضائل حدیث نمبر 2373) یعنی نبیوں کو ایک دوسرے پر فضیلت مت دو۔ مجھے نبیوں پر برتری مت دو۔ یہ ممانعت نبوت کے اصل مرتبہ میں ہے اس طرح مذکورہ حدیث کا جواب میں ہوگا ابن کثیر نے مزید اور چار جوابات ذکر کئے ہیں مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ : یہ تفاضل کی بعض صورتوں کی تفسیر ہے۔ نبوت کے بعد کلام الٰہی کا عظیم شرف ہے اس لیے اس کی تخصیص کی۔ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ اس میں مختلف اقوال ہیں ایک یہ ہے کہ یہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ خاص ہے جس کی دلیل سورۃ نساء آیت ۱۴۶ ہے دوسرا قول یہ ہے کہ اس میں آدم علیہ السلام اور آخری نبی بھی داخل ہیں اور اس کلام سے مراد جبریل یا دیگر ملائکہ کے واسطے کے بغیر کلام مراد ہے۔ یہ اکرام اور تشریف کے طور پر ہے۔ لہٰذا شیطان کے ساتھ کلام اس میں شامل نہیں کیونکہ اس سے کلام بذریعہ ملائکہ یا بطور (زجر) ڈانٹ اور تذلیل ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ کلام اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور اس صفت کا ذکر قرآن وسنت میں سمع اور تلاوت کے ساتھ مذکور ہے تو اس میں کلام لفظی بھی شامل ہے مگر بلا تمثیل، تاویل، تشبیہ اور تحریف ثابت ہے۔ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ: اس میں اختلاف ہے کہ بَعْضَهُمْ کا مصداق کون ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ہر نبی اس سے مراد ہو سکتا ہے کیونکہ ہر نبی کو وہ خصوصیت حاصل ہے۔ جو دوسرے کو حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا یہ جملہ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ کی تفسیر ہے اور اس سے جزوی فضیلت مراد ہے دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد صرف پانچ اولوالعزم انبیاء ہیں جن کا ذکر سورۃ شوریٰ ۱۳ اور سورۃ احزاب آیت ۷ میں مذکور ہے۔ اور دَرَجٰتٍ سے کثرت امت اور معجزات مراد ہیں یہ بھی ان پانچ نبیوں کے درمیان جزوی فضیلت ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد صرف پانچ نبیوں کے درمیان جزوی فضیلت ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد صرف آخری رسول ﷺ ہیں یعنی رسولوں پر کلی فضیلت مراد ہے۔ اور لفظ بَعْضَهُمْ میں ان کی بلندی شان کی طرف اشارہ ہے۔ اور اس کے دلائل وہ آیتیں واحادیث ہیں جو آخری نبی کی عظمت میں وارد ہیں۔ پہلی آیت سورۃ انبیاء آیت ۱۰۷ میں وارد ہے کہ وہ سارے عالم کیلئے رحمت ہیں۔

دوسری دلیل: سورۃ الانشراح آیت ۴ میں ہے۔ تیسری دلیل: اللہ تعالیٰ نے ان کی اطاعت بیعت رضا اور استجابت کو اپنی اطاعت بیعت رضا استجابت قرار دیا ہے سورۃ نساء آیت ۸۰، سورۃ فتح آیت ۱۰، سورۃ توبہ آیت ۶۲، سورۃ انفال آیت ۲۴ چوتھی دلیل: قرآن مجید کی بقاء ان کا مستقل معجزہ ہے۔ پانچویں دلیل: سورۃ انعام آیت ۹۰ میں دلیل ہے کہ نبی ﷺ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میں سابقہ تمام نبیوں کے محاسن اچھائیاں موجود تھیں۔ چھٹی دلیل: ساری دنیا والوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا۔ ساتویں دلیل قیامت کے دن تمام انبیاء ان کے جھنڈے کے نیچے ہونگے اور یہ فرمان نبوی ہے کہ میں آدم کی اولاد کا سردار ہوں گا أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ وَلَا فَخْرَ۔ صحیح بخاری جلد ۱ ص ۱۹۰ مسند احمد جلد ۱ ص ۲۸۱، ترمذی جلد ۵ ص ۵۸۵، در منثور جلد ۱ ص ۲۳۰۔ اس بارے میں متعدد احادیث ہیں اور ان روایتوں کے علاوہ بھی بہت احادیث ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ بَعْضَهُمْ کا مصداق آخری نبی ﷺ ہے وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ اس کی تفصیل آیت ۸۷ میں گزری ہے یہاں پر یہ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ کیلئے تفسیر ہے۔ سوال: مقام تفضیل میں خصوصیت کے ساتھ صرف موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟ جواب: نزول قرآن مجید کے وقت ان دونوں کی امتیں موجود تھیں لہٰذا یہ ان دونوں کی امتوں پر طعن کیا گیا ہے کیونکہ اتنے فضائل کے باوجود ان نبیوں کا دین اور شریعت انہوں نے بدل ڈالی تھی۔ عیسیٰ علیہ السلام کی تخصیص بینات اور تائید بروح القدس یہودیوں کا رد ہے کیونکہ انہوں نے ان کی نبوت اور معجزات سے انکار کیا تھا۔ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلُوا وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ربط ۱: یہ ہے کہ اس میں ایک وہم کو ختم کیا ہے وہم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دلائل اور معجزات کے ساتھ نبیوں کو بھیجا تو لوگوں نے پھر کیوں قتل و غارت گری کی؟ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ لوگوں میں قتل و قتال ایمان اور کفر میں اختلاف کی وجہ سے ہوا ہے۔ ربط ۲: انبیاء کے درجات اور برتری کا مسئلہ بیان کرنے کے بعد اب یہ بیان مقصود ہے کہ قتل و قتال کا سبب انبیاء کے درجات میں فرق نہیں ہے بلکہ عقائد کا اختلاف اس کا سبب بنا ہے۔ لَوْ شَاءَ اللَّهُ میں شَاءَ کا مفعول مقدر ہے۔ جس کی دلیل اس کی جزاء ہے۔ یعنی وَلَوْ شَاءَ اَلَّا يَقْتَتِلُوْا مَا شَاءَ اَلَّا يَخْتَلِفُوْا مشیت ارادہ تکوینی اور تقدیری معنی میں ہے۔ تشریعی اور رضا کے معنی میں نہیں ہے۔ اسے جنگ و جدال کی کثرت کی طرف اشارہ ہے۔ مِنْ بَعْدِهِمْ میں ضمیر الرُّسُلُ کی طرف راجع ہے اور بَعْدِ سے مراد ہر رسول کے بعد اس کی امت میں اختلاف اور قتال و جدال ہے۔ اس کی مثال طالوت و جالوت کے واقعہ میں ذکر ہوگئی۔ بعض علماء کا قول ہے کہ تمام نبیوں کے بعد آخری امت میں مشرکین عرب یہود اور نصاریٰ سے قتال مراد ہے مگر پہلا قول بہتر ہے۔ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ اس سے مراد وہ دلائل، معجزات اور کتابیں ہیں۔ جو اختلاف دفع کرنے کا سبب ہیں اور دفع قتال مشروط ہے ایمان لانے کے ساتھ یہ اختلاف سبب شرعی ہے۔ وَلَٰكِنِ اخْتَلَفُوا: یہ مَا اقْتَتَلَ سے استدراک ماقبل سے ہے سبب اِقْتِتَال کے ذکر کے ساتھ جو کہ اصولی اختلاف ہے اور یہ اِقْتِتَال کا شرعی سبب ہے اور یہ دلیل ہے کہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تقدیر الٰہی کے ساتھ ساتھ لوگوں کے اعمال بھی اختلاف اور اقتتال کیلئے سبب ہے اور ایسے اعمال میں مشیت انسانی کو دخل دیا گیا ہے لہٰذا یہ جبریہ کے گروہ پر رد ہے اور مشیت الٰہی کا ہونا قدریہ اور معتزلہ کا رد ہے۔ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ: اس میں دلیل ہے کہ فروعی اختلاف اگرچہ لوگ ایک دوسرے پر کفر کے فتوے بھی لگائیں لیکن شرعی طور پر وہ قتال کیلئے سبب نہیں ہے۔ بلکہ شریعت کے خلاف ہے اس جملہ میں اختلاف کی تفصیل مذکور ہے۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا: اس جملے میں دو قول ہیں پہلا قول یہ کہ اس کو تکرار کے طور پر تاکید کے لئے ذکر کیا ہے جو ان لوگوں کا رد ہے جو بندوں کے اعمال خواہ شر والے ہوں یا عام تقدیر کے ساتھ منسلک نہیں مانتے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ان دونوں میں مغایرت ہے چند وجوہ کے ساتھ (۱) یہ متعلق ہے پہلے اِقْتِتَالٌ کے عدم مشیت کے وجود کے ساتھ اور دوسری مشیت کے متعلق عدم امر ہے۔ دوسرا فرق یہ کہ پہلے جملے سے سابقہ انبیاء اور کافروں کا اقتتال مراد ہے جبکہ دوسرے جملے میں اس امت کے مومنین کا اقتتال بمقابلہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین مراد ہے۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ پہلے جملے میں سبب قتال شرعی ذکر کیا ہے اور اس مشیت میں سبب تقدیری ذکر ہوگا۔ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ: اس میں لوگوں کے تفاوت کی طرف اشارہ ہے کہ بعض لوگوں کو توفیق ایمان دیتا ہے اور بعض کو نہیں کسی میں کفر پیدا کرتا ہے کسی میں ایمان اور اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ اس میں صفت ارادہ بھی ثابت ہوتی ہے جیسا کہ اس کی شان کے ساتھ لائق ہے۔ اس میں دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ ضرور مکمل ہوتا ہے کوئی اس میں رکاوٹ پیدا نہیں کرسکتا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّ لَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾ اے ایمان والو جو ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے رہو اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ تجارت ہے نہ دوستی اور نہ شفاعت اور کافر ہی ظالم ہیں۔ (254)

آخری حصے کا خلاصہ: اس آیت ۲۵۴ سے سورۃ کے آخر تک چوتھا حصہ ہے جو انفاق فی سبیل اللہ سے متعلق ہے۔ اس حصے میں چار ابواب ہیں (۱) پہلا باب آیت ۲۶۰ تک ہے اس میں پہلے مال خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے اس کی قبولیت کے وقت (۲) دوسرے پر مسئلہ توحید ہے دس دلائل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اسماء صفات ذکر کرکے اور انفاق کا مقصد بیان ہوا ہے۔ (۳) ایک سوال کا جواب اور دو فرقوں کے حال کا ذکر ہے جن میں ایک کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے دوسرے کا شیطان کے ساتھ ہے۔ (۴) دونوں گروہوں کی مثالیں ذکر کی ہیں پہلی مثال شیطانی گروہ سے متعلق ہے جبکہ دوسری

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور تیسری اللہ تعالیٰ کے گروہ کے ساتھ متعلق ہے۔

تفسیر 254: ربط ۱: پہلے قتال کا ذکر ہوا تو اب قتال کو جاری رکھنے کیلئے انفاق کرنے کا ذکر ہو رہا ہے یعنی جہاد بالنفس کے بعد جہاد بالمال کا ذکر ہے۔ ربط ۲: پچھلی آیت میں فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَ مِنْهُمْ ذکر کیا گیا ہے تو اب خالص ایمان والوں کو خطاب ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا یعنی ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ: اس میں عام (انفاق) خرچ کرنا مراد ہے خواہ فرض یا نفل ہو۔ البتہ ماقبل عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ میں خرچ مراد ہے اور وہ بھی فرض ہے۔ مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ: اصل میں بعض مال کا انفاق فرض ہوتا ہے اس لیے (مِنْ، مَا) کو ذکر کیا ہے جس کا معنی (میں سے) ہے۔ مومن اپنے مال میں سے فرض زکوٰۃ کے علاوہ بھی خرچ کرتا ہے مگر چونکہ اس کیلئے کوئی متعین مقدار مقرر نہیں ہے اس لیے مِمَّا فرمایا گیا ہے جو کہ اس کی مرضی پر ہے اور رزق سے حلال مال مراد ہے جس کی دلیل صحیح حدیث ہے۔ لَا صَدَقَةَ مِنْ غُلُوْلٍ (رواہ البخاری فی الجامع، ارواء الغلیل کتاب الطھارۃ حدیث ۱۲۰) یعنی حرام مال سے صدقہ قبول نہیں ہوگا۔ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ: اس آیت میں فی الفور جلد مال خرچ کرنے کی ترغیب ہے کیونکہ اس دن کے آنے کی کوئی خبر نہیں کہ کب وہ اچانک واقع ہوجائے۔ یَوْمٌ سے قیامت کا دن مراد ہے کیونکہ آنے والے جن حالات اور جن چیزوں کی نفی ہو رہی ہے وہ قیامت ہی کا دن ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے موت کا دن مراد ہو جیسا کہ سورۃ منافقون آیت ۱۰ میں مذکور ہے۔ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ یعنی وہ انفاق جو دنیا میں تم سے فوت ہوجائے تو اس کے حصول کے لئے پہلا طریقہ بَیْعٌ کا ہے کہ انسان اپنے لئے کوئی مال یا ثواب کمائے تو جیسے بَیْعٌ (فروخت) نہیں ویسے ہی لینا بھی نہیں ہے۔ وَّ لَا خُلَّةٌ: دوسرا طریقہ اس کے حصول کا مخلص دوستی ہے کیونکہ ایسے مشکل حالات میں مخلص دوست ہی اپنے دوست کی مدد کرتا ہے۔ لفظ وُدٌّ یا صَدَقَةٌ نہیں فرمایا اس لیے کہ خُلَّةٌ خالص دوستی کو کہا جاتا ہے کیونکہ مجبوری اور پریشانی میں ہر دوست مدد کیلئے ہاتھ نہیں بڑھاتا تو مخلص دوست ہی کام آتا ہے۔ یہاں خُلَّةٌ یعنی دوستی کی نفی مقید ہے غیر متقین کے ساتھ اس لیے کہ متقی لوگوں کی دوستی قیامت میں بھی کام آئے گی جیسا کہ سورۃ زخرف آیت ۶۷ میں ہے۔ وَّ لَا شَفَاعَةٌ: کسی چیز اور فائدے کے حصول کیلئے تیسرا طریقہ سفارش کا ہے۔ یعنی ایسا سفارش کرنے والا جس کی سفارش قبول کی جاتی ہو لیکن اس سے بھی یہ قیامت کے دن محروم ہوگا۔ سفارش کبھی مصیبت سے نجات کیلئے ہوتی ہے اور کبھی کسی فائدے کے حصول کے لیے۔ یہاں سفارش مقید ہے قبولیت کے ذریعے اور سفارش بالاذن ہے اور وہ سفارش مومن کے لئے ہے۔ یہ منکرین کیلئے مطلق

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

شفاعت کی دلیل نہیں ہے جس کا منکرین حدیث اور معتزلہ نے انکار کیا ہے۔ ان کے رد میں مختلف آیتیں اور متواتر احادیث موجود ہیں جن میں سے کچھ تفصیل پہلی جلد کے مقدمہ اور آیت ۴۸ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ وَ الْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ: یہاں پر اعلیٰ درجے کا ظلم مراد ہے اس لیے اسکو کافروں کے ساتھ خاص کیا ہے۔ اس جملے کے متعلق بہت سی توجیہات ذکر کی گئی ہیں پہلی توجیہہ یہ ہے کہ یہ ماقبل کے تقید کیلئے علت ہے یعنی سفارش مخلص دوست کافروں کیلئے نہیں ہے کیونکہ وہ تو ظالم ہیں اور ظالموں کیلئے احسان اور دوستیاں نہیں ہوتیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس میں مومنین کو تنبیہ ہے کہ کافروں کی اقتداء مت کرو وہ مال خرچ نہیں کرتے اور دیگر نیک اعمال نہیں کرتے تم مال خرچ کرنے اور دیگر نیک اعمال کی طرف سبقت کرو کیونکہ انہوں نے اس بدعملی کی وجہ سے خود پر ظلم کیا ہے۔ تیسری بات یہ کہ انفاق کرنا (مال خرچ کرنا) کافروں کے ظلم و جبر کو ختم کرنے کیلئے بھی ہوتا ہے کیونکہ وہ مومنوں پر ظلم کرتے ہیں۔ فائدہ: عطاء بن دینار رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ الحمدللہ کہ اللہ تعالیٰ نے یوں نہیں فرمایا ہے والظّٰلِمُوْنَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ کیونکہ ہر گناہ کا مرتکب ظالم تو ہے مگر کافر نہیں۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ ۚ وَ لَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ ۚ وَ لَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَ هُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ﴿۲۵۵﴾

"اللہ تعالیٰ ہی معبود (برحق) ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں جو زندہ اور سب کا تھامنے والا ہے، جسے نہ اونگھ آئے نہ نیند، اس کی ملکیت میں زمین اور آسمانوں کی تمام چیزیں ہیں۔ کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے سامنے شفاعت کر سکے، وہ جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جتنا وہ چاہے اس کی کرسی کی وسعت نے زمین و آسمان کو گھیر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت سے نہ تھکتا اور نہ اکتاتا ہے، وہ بہت بلند اور بہت بڑا ہے" (255)

تفسیر 255: ربط ۱: جب موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کا ذکر گزر گیا کہ حق پر قائم تھے تو چونکہ ان کے امتیں قرآن کریم کے نزول کے وقت موجود تھے لیکن انہوں نے اپنے دین میں کفر، ظلم کو ملایا تھا توحید اور اللہ تعالیٰ کے صفات سے انکار کیا تھا انہوں نے توحید سے بھی اور صفات باری تعالیٰ سے بھی اعراض کیا تھا تو اس آیت میں انکو تنبیہ کی گئی کہ صرف موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی طرف نسبت کرنے سے نجات نہیں ہو سکے گی۔ جب تک توحید ربانی کو قبول نہیں کرو گے۔ ربط ۲: پہلے فرمایا وَ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

الْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ اس آیت میں ان کے بڑے ظلم کا ذکر ہے یعنی تفصیلات توحید سے اعراض۔

ربط ۳: جب مالی انفاق کی طرف ترغیب دی گئی تو اب انفاق فی سبیل اللہ کا مقصد ذکر ہو رہا ہے۔

اس آیت کے فضائل: اس آیت کو اعظم آیۃ الکرسی کہا گیا ہے۔ (صحیح مسلم 780، ترمذی 2878) سید البقرۃ۔ تفسیر (البحر المحیط) سید آی القرآن (تفسیر قرطبی) جس نے رات کو سونے سے پہلے اس کی تلاوت کی تو ہمیشہ کیلئے ایک محافظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کیلئے مقرر ہوگا اور صبح تک شیطان اس کے قریب نہیں آسکے گا۔ (صحیح بخاری کتاب الوکالۃ حدیث 2311-3275) یہ آیت قرآن مجید کے تیسرے حصہ کے مساوی ہے۔ (تفسیر البحر المحیط) اس آیت کی فضیلت میں امام ابن کثیر نے بارہ روایتیں ذکر کی ہیں اس آیت میں پچاس کلمات ہیں اور پچاس اس کی برکات بھی ہیں۔ یہ قرآن مجید میں سب سے محترم آیت ہے اس لیے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا نام ضمیر اور اسم ظاہر کے ساتھ اٹھارہ مرتبہ ذکر ہوا ہے۔ (قرطبی)

اس آیت میں توحید کے دس جملے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی صفات کے ذریعے اثبات توحید کا استدلال کیا گیا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے پانچ نام مذکور ہیں۔ صفات ثبوتی تین اور صفات سلبی بھی تین ذکر ہیں اور اس میں شِرْك فِي الْاُلُوْهِيَّة۔ شِرْك فِي التَّصَرُّف شِرْك فِي الْعِلْم کا رد کیا گیا ہے اور رد شفاعت قہری شرکیہ بھی اس میں ہے تو یہ باب توحید میں ایک کامل آیت ہے۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: اس جملہ کی تفسیر آیت ۱۶۳ اور مقدمہ میں لفظ اللہ کی تشریح گزر چکی ہے۔ یہاں پر لفظ اللہ مبتدا اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اس کی خبر ہے۔ یعنی الوہیت کی صفت خصوصیت کے ساتھ صرف اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت ہے۔ باقی تمام سے منفی ہے اور یہ توحید کا دعویٰ ہے جس پر بعد میں دس دلائل ذکر کئے گئے ہیں۔ اَلْحَيُّ: یہ صفت اللہ تعالیٰ کے لئے سورۃ آل عمران آیت ۲، سورۃ طٰہٰ آیت ۱۱۱، سورۃ فرقان آیت ۵۸، سورۃ غافر آیت ۶۵ میں مذکور ہے۔ یہ لفظ هُوَ سے بدل ہے یا مقدر مبتدا کیلئے خبر ہے یا لفظ اللہ کیلئے خبر ثانی ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی صفت بھی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ناموں اسماء الحسنیٰ میں سے ایک نام ہے اور اسم اعظم بھی اس کو کہا گیا ہے۔ اس سے مراد اَلْحَيُّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ ہے جیسا کہ سورۃ فرقان آیت ۵۸ میں ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ باقی رہنے کے معنی میں ہے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ایسی صفت ہے جو کسی اور کیلئے ثابت نہیں۔ یعنی ہمیشہ زندہ رہنا جس پر کبھی زوال نہ آئے۔ امام ابن جریر کا قول ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات فعلی ضروری ہیں لیکن ان میں فکر کرنا منع یعنی مخلوق کے ساتھ مشابہت یا مماثلت نہیں دینی ہے۔

اس میں الٰہ باطلہ کا رد ہے کیونکہ یا وہ فوت ہونے والوں کو پکارتے ہیں یا جمادات بتوں کو جن میں جان نہیں یا زندوں کو جن

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پر موت آنے والی ہے۔ جس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ. كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ عزت وجلالت والی ذات کے علاوہ سب کچھ فنا ہونا ہے۔ ہر ایک نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ جنہوں نے کہا کہ حی زندہ ہے مگر بغیر صفت حیات کے تو یہ معتزلہ اور ان کے ہم نواؤں کا قول ہے جو کہ باطل ہے۔ الْقَيُّومُ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت میں مبالغے کا صیغہ ہے۔ سورۃ آل عمران طٰہٰ ۱۱۱ میں مذکور ہے۔ اس کے معنی میں مختلف اقوال ہیں: بقول مجاہد ضحاک، ربیع رحمہم اللہ وہ ذات ہے جو ہر چیز پر ان کے احوال جاننے کے ساتھ قائم نگران ہے جیسا کہ سورۃ رعد آیت ۳۳ میں ہے۔ بقول سعید بن جبیرؒ وہ ذات جس کا وجود ہمیشہ ہو۔ بقول ابن عباس رضی اللہ عنہما وہ ذات جس پر کبھی زوال نہیں آتا ہو۔ قتادہ کا قول ہے کہ تمام مخلوق کا محافظ اور مدبر ہے۔ یہ اقوال ہم معنی ہیں اور اس میں مشرکین کا رد ہے کیونکہ وہ کبھی کسی معبود باطل کو مدبر عالم قرار دیتے ہیں تو کبھی کہتے ہیں کہ عالم کا مدبر تو اللہ ہے البتہ ہمارے معبود سفارشی اور شریک ہیں اور تمام کاموں کی تقسیم کرنے والے ہیں۔ یونان والوں کا عقیدہ ہے کہ مخلوقات میں تصرف کرنے کیلئے ہر الہ کے پاس اختیارات ہیں۔ صوفیوں کا عقیدہ ہے کہ عالم کا نظام چلانے والے قطب اور غوث ہیں ان لوگوں کے پاس اس بارے میں کوئی دلیل نہیں ہے اور نہ ہی کوئی مرفوع اور نہ ہی کوئی موقوف حدیث۔ البتہ امام ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں ایک بے سند قول ذکر کیا ہے۔ بعض صوفیوں نے تو اپنے آپ کو اور اپنے پیروں کو اس صفت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ برابر کیا ہے اور اپنے آپ اور اپنے پیروں کو قیوم زمان قرار دیتے ہیں۔ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ: یہ اللہ تعالیٰ کی صفت سلبی دائمی ہے جو کمال کو مستلزم ہے۔ یہ قَيُّومُ کیلئے تاکید ہے کیونکہ صفت قیوم و غفلت دو متضاد صفتیں ہیں جس کا کسی ایک ذات میں جمع ہونا محال ہے۔ اس میں ایک خیال کی نفی کی گئی ہے اور وہ خیال یہ ہے کہ اگر کہا جائے کہ ہو سکتا ہے۔ اَلْحَيُّ الْقَيُّومُ بطور مجاز اور مبالغہ ہو۔ تو جواب دیا گیا کہ مبالغہ نہیں صفت حقیقی ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لَا تَأْخُذُهُ غالب ہونے کے معنی میں ہے لیکن اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا صفت نَوْمٌ اور سِنَةٌ سے عدم القاف ہے۔ سِنَةٌ یہ نیند کا پہلا جھونکا ہے اس کا غلبہ سر پر آتا ہے۔ اور نُعَاسٌ آنکھوں پر آتا ہے اور نیند دل پر آتی ہے اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ سِنَةٌ اس سستی اور فتور کو کہا جاتا ہے انسان پر جس کے واقع ہونے سے عقل، شعور اور ہوش ختم نہیں ہوتا۔ یعنی اللہ تعالیٰ پر کوئی خلل، تھکاوٹ۔ نہیں آتا (قرطبی ۲۷۲/۲) نوم نیند و فتور ہے جو بدنی تھکاوٹ اور بخارات کی وجہ سے دماغ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اور اندھیرے میں دماغ طبعی سکون چاہتا ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ حواس کی طاقت ختم ہوتی ہے۔ اعضاء

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بھا۔ بی ہوجاتے ہیں یہ کمال غفلت ہے۔ سوال: نَوْمٌ پر سِنَةٌ کی نفی کو کیوں مقدم کیا ہے؟ جواب: اس میں ادنٰی سے اعلیٰ کی طرف ترقی کی گئی ہے یعنی اللہ تعالیٰ پر نہ ہی کم غفلت آتی ہے نہ زیادہ نہ کبھی اختیاری اور نہ ہی غیر اختیاری۔

جواب ۲: بیضاویؒ وغیرہ کا قول ہے کہ اس میں ترتیب وجودی کی رعایت ہے کیونکہ پہلے اونگھ آتی ہے پھر نیند لیکن ابن عاشورؒ نے اس قول کی مخالفت کی ہے ان کا کہنا ہے کہ کبھی انسان کو بغیر اونگھ کے بھی نیند آتی ہے اور کبھی اونگھ آتی ہے۔ لہٰذا جب دونوں لازم ملزوم نہیں ہیں تو اس لیے ان دونوں کی نفی الگ الگ کی گئی۔ سوال: اس میں نعاس کی نفی کیوں نہیں کی؟

جواب ۱: سِنَةٌ کے وجود میں لفظ نُعاس ضرور آتا ہے اور برعکس بھی اس لیے ایک کی نفی سے دوسرے کی نفی ہوگئی۔

جواب ۲: بعض لغت والوں نے ان دونوں کو ہم معنی قرار دیا ہے۔ تنبیہ: جن مفسرین نے موسیٰ علیہ السلام کے متعلق جو روایات یہاں پر نقل کی ہیں امام قرطبیؒ و امام ابن کثیرؒ نے ان روایتوں کو ضعیف اور اسرائیلیات قرار دیا ہے۔ اور مفسر صاحب اللباب نے کہا ہے کہ ایسی باتیں نبی کی شان کے خلاف ہیں۔ ہوسکتا ہے اس کی قوم کے جاہلوں کی بنائی ہوئی باتیں ہوں۔ امام ابوحیانؒ کا قول ہے کہ بعض حشویہ فرقے کے لوگوں نے یہ روایتیں بنائی ہیں تاکہ موسیٰ علیہ السلام کا جہل اور گناہ ثابت کریں۔ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ یہ صفت ثبوتیہ ہے لَهٗ کو مقدم لانا تخصیص کی دلیل ہے لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ: اس میں لفظ (مَا) عموم کیلئے ذوی العقول اور غیر ذوی العقول سب کیلئے مستعمل ہے۔ آسمانوں اور زمینوں سے کل کائنات مراد ہے اور جب اللہ تعالیٰ کیلئے ملک بادشاہت اس انداز میں ثابت ہے کہ بطور حصر جس سے کوئی ذرہ باہر نہیں اور پھر لَهٗ کو مقدم کر کے مزید تاکید کی گئی تو اس میں مشرکین کا رد ہوا جو ستاروں اور دیگر باطل معبودوں کو کائنات کے تصرف میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرتے ہیں۔ لَهٗ میں لام تملیک تصرف اور اختیار کیلئے ہے اور اس کو اختیار الوہیت کہتے ہیں۔ اور جب ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مخلوق مملوک مربوب میں داخل ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہیں ہوسکتی ہے۔ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ: یہ بھی صفت ثبوتی ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کیلئے کبریائی و عظمت ثابت کرنا مقصود ہے۔ اور اس میں مشرکین کے عقیدہ شفاعت شرکیہ قہریہ کا رد ہے۔ جس کا ذکر سورۃ یونس آیت ۱۸ میں ہے۔ سورۃ زمر آیت ۳ میں ہے۔ اِذْنِهٖ میں دلیل ہے کہ قیامت کے دن انبیاء، علماء، شہداء اور ملائکہ کیلئے شفاعت ثابت ہے مگر ان شرائط کے تحت جن کا ذکر دیگر نصوص میں وارد ہے۔ امام قرطبیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں اس کی تفصیل ذکر کی ہے۔ عِنْدَهٗ. يَشْفَعُ کے ساتھ متعلق ہے مشہور معنی کے ساتھ۔ یا مقدر لفظ کے ساتھ متعلق ہے یعنی جو اللہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تعالیٰ کے قریب ہو جب ملائکہ انبیاء اور صالحین اللہ تعالیٰ کے قریب ترین لوگ بغیر اللہ تعالیٰ کی اجازت کے شفاعت نہیں کر سکتے تو دوسروں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَ مَا خَلْفَھُمْ یہ اور صفات ثبوتیہ ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کیلئے ہر چیز پر علم محیط کو ثابت کیا گیا ہے۔ اور یہ سابقہ جملوں کیلئے تاکید ہے اور مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ کیلئے علت ہے۔ مقصد یہ ہے کہ بغیر اذن اللہ کے شفاعت کوئی نہیں کر سکتا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی اجازت اس لیے شرط ہے کہ اسی کو علم ہے کہ شفاعت کا حقدار کون ہے اور محرومین شفاعت کون ہیں۔ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَ مَا خَلْفَھُمْ ان کی ضمیریں مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ کی طرف راجع ہیں۔ جس میں آسمانی اور زمینی مخلوق سب شامل ہے۔ اس میں بہت سے اقوال ہیں: امام مجاہد اور عطاء رحمہم اللہ کا قول یہ ہے کہ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ سے مراد دنیاوی امور اور مَا خَلْفَھُمْ سے اخروی مراد ہیں۔ امام ضحاک اور کلبی رحمہم اللہ کا قول برعکس ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق اس سے مراد آسمان اور زمین ہیں اور دوسرا قول یہ ہے کہ گذرے حالات اور آنے والے حالات یا اسکا برعکس ہے۔ یا پہلے سے مراد محسوسات اور دوسرے سے مراد معقولات ہے۔ ہر ایک قول ہو مگر مراد ہر چیز کا علم ہے اور شفاعت کرنے والا اور جس کے لئے شفاعت چاہتا ہے۔ اس جملہ میں ان لوگوں فلاسفہ اور منطقیوں کا رد ہے جو علم ربانی کے منکر ہیں۔ وَ لَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ: یہ جملہ ما قبل کیلئے تتمہ اور تکملہ ہے اس لیے اس کو عطف کیا ہے اور ایسا ہی کوئی بھی علم بکل شئی نہیں رکھتا اور جو علم انہیں حاصل ہے اس میں بھی یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے محتاج ہے اور احاطے سے مراد تمام مخلوق کیلئے کیفیات ہیں۔ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اس ضمیر میں دو احتمال ہیں۔ پہلا احتمال یہ ہے کہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے تو مصدر مضاف ہے فاعل کی طرف اور علم معلوم کے معنی میں ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ ضمیر مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَ مَا خَلْفَھُمْ کی طرف راجع ہے تو اضافت مصدر کے مفعول کی طرف کی گئی ہے۔ اِلَّا بِمَا شَآءَ یہ اس سورۃ کی آیت ۳۲ کی طرح ہے۔ شَآءَ کا مفعول مقدر ہے۔ یعنی شَآءَ اللّٰهُ اَنْ یُّحِیْطُوْا بِهٖ پہلے قول کی بنا پر جب ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو اور اضافت تخصیص کیلئے ہو اور علم سے غیب حقیقی مراد ہو تو اِلَّا بِمَا شَآءَ استثنیٰ منقطع ہے یعنی لٰكِنْ يُّعْطِيْهِ الْعِلْمَ بِمَا شَآءَ بِبَعْضِ الْجُزْئِيَّاتِ۔ دوسرے احتمال کی بنا پر استثنیٰ متصل ہے اور علم سے مراد علم اضافی ہے اور یہ مثل سورۃ آل عمران آیت ۱۷۹، سورۃ جن ۲۶، ۲۷ کی ہے البتہ ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے افادہ علم ہے جبکہ اس آیت میں علم کیلئے بندوں کا استفادہ ہے۔ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ: یہ بھی اللہ تعالیٰ کی صفت ثبوتیہ ہے۔ کرسی کے متعلق مختلف اقوال

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہیں: پہلا قول ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے دو قدموں کی جگہ ہے۔ اس قول کے متعلق امام ابن کثیرؒ نے کہا ہے کہ مرفوعاً درست نہیں موقوفاً درست ہے۔ امام حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور امام ذھبی نے اس کی تائید کی ہے۔ امام بیہقی نے الاسماء والصفات ۲، ۴ میں ذکر کیا ہے۔ لہٰذا یہ آیت صفات میں سے ہے البتہ ان شرائط کے تحت ہے کہ بلا تمثیل بلا تشبیہ اور بلا تاویل اس کا ماننا فرض ہے۔ دوسرا قول امام حسن بصری رحمہ اللہ کا ہے کہ کرسی اور عرش ایک ہی چیز ہے لیکن اس قول کو امام ابن کثیرؒ نے رد کیا ہے۔ تیسرا قول بھی ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے کہ کرسی اللہ تعالیٰ کا علم ہے۔ قول اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ملکیت اور سلطنت ہے۔ لیکن ایسے اقوال دمعانی ملحدین سے نقل کئے گئے ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے عرش اور کرسی کے منکر ہیں۔ (قرطبی) پانچواں قول فلاسفہ کا ہے کہ یہ آٹھواں فلک ہے جسے فلک الثوابت کہا جاتا ہے جو سات افلاک سے اوپر ہے مگر یہ سب خیالی باتیں ہیں۔ کیونکہ بہت ساری آیتوں میں صرف سات آسمانوں کا ذکر ہے۔ کرسی کی وسعت کا ذکر بہت روایتوں میں ہے۔ ان احادیث میں سے ایک یہ ہے جس کو ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ سات آسمان کرسی کے مقابل ڈھال میں سات روپیہ ڈالنے کے مترادف ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی کا ثبوت اور دلیل ہے۔ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا جملہ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ پر تتمہ کے طور پر عطف ہے۔ یہ صفت سلبیہ ہے اللہ تعالیٰ کیلئے کمال علم اور قدرت پر دلیل ہے کیونکہ حفاظت قدرت کاملہ اور علم کامل کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ يَئُودُهُ: بھاری اور مشقت میں ڈالنے کے معنی میں آتا ہے۔ أَوَدٌ۔ ٹیڑھے پن کے معنی میں ہے جبکہ مَوْؤُدَةِ زندہ در گور کرنے والی بچی اس مادہ سے لیا گیا ہے۔ هُ کی ضمیر اللہ تعالیٰ یا کرسی کی طرف راجع ہے۔ اس جملہ میں اشارہ ہے کہ اس آیت میں انسان کی حفاظت کیلئے فائدہ موجود ہے جیسا کہ حدیث صحیح اس کے متعلق گزر چکی ہے۔ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ: یہ جملہ سابقہ جملے پر عطف ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی دو صفات ثبوتیہ موجود ہیں۔ امام ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ یہ آیت اور اس ضمن میں جو صحیح احادیث وارد ہیں یہی صحیح طریقہ سلف صالحین کا ہے کہ وہ ان کو ظاہری طریقے پر بغیر کیفیت اور تشبیہ کے محمول کرتے ہیں۔ امام سمعانیؒ کا قول ہے کہ (الْعَلِيُّ) مخلوق سے بلند اور شرکاء سے بالاتر کے معنی میں ہے یعنی مُتَعَالٌ ہے اور کسی نے کہا کہ بادشاہت اور سلطنت پر بلند ہے۔ مفسر ابوحیانؒ کا قول ہے کہ (عَلِيٌّ) کے معنی مخلوق کے اوپر بلند ہونے کے ہے امام ماوردی کا قول ہے کہ دو وجوہات پر عالی اور علی میں فرق ہے۔ (۱) عَالِي وہ ہے جو بلند مقام پر ہو اور عَلِيٌّ وہ ہے جو برتری اور بلندی کا مستحق ہو۔ (۲) عالی وہ ہے جو دوسرے سے شراکت کا امکان رکھتا ہو جبکہ عَلِيٌّ وہ ہے جس کے ساتھ دوسرے کی شراکت کا امکان

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نہ ہو۔ فائدہ: قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی بلندی سات قسم کے دلائل اور تعبیرات سے ثابت ہے۔ (۱) عُلُوٌّ اسراء آیت ۴۳ (۲) اَلْمُتَعَالِ رعد آیت ۹ (۳) اَعْلٰی دو مرتبہ مذکور ہے۔ (۴) عَلِیٌّ آٹھ مرتبہ مذکور ہے (۵) تعالیٰ چودہ مرتبہ آیا ہے۔ (۶) فوقیت تین مرتبہ مذکور ہے۔ انعام آیت ۶ اور ۱۸ نحل آیت ۵۰۔ (۷) استویٰ علی العرش اعراف آیت ۵۴، یونس آیت ۳، رعد آیت ۲، طٰہٰ ۵، فرقان آیت ۵۹، الم سجدہ آیت ۴، حدید آیت ۴۔ اَلْعَظِیْمُ: یعنی شرف اور قدر اس کی بہت ہی عظیم ہے۔ (قرطبی) عظمت کا حقدار ہے ہر چیز اس سے نیچے ہے کوئی اس سے اعظم نہیں ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾ ”دین عقیدے کے بارے میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت گمراہی سے روشن ہو چکی ہے، اس لئے جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے معبودوں کا انکار کر کے اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا، جو کبھی نہ ٹوٹے گا اور اللہ تعالیٰ سننے والا، جاننے والا ہے۔ [256]۔

تفسیر 256: ربط ۱: آیت الکرسی میں توحید الٰہی کے دلائل اور عظمت رب العلمین کا ذکر ہوا تو ان دلائل کا تقاضا ہے کہ بغیر کسی جبر و اکراہ عقل والے ان کو قبول کریں۔ تو ایک سوال پیدا ہوا کہ ان مشرکین کو اپنی حالت پر چھوڑا جائے گا یا ان سے جبراً یہ عقیدہ منوایا جائے گا؟ تو جواب ہوا کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ: دین میں جبر نہیں اس کو جملہ استینافیہ بیانیہ کہا جاتا ہے۔ ربط ۲: یہ قَاتِلُوْا کے ساتھ متعلق ہے اور درمیان میں جملہ معترضہ ہے۔ تو اس میں سوال کا جواب ہے کہ قتال سے تو معلوم ہوتا ہے دین میں جبر جائز ہے تو جواب اس جملہ میں دیدیا۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ: اِكْرَاهٌ اصل میں کسی ناپسندیدہ عمل یا قول پر مجبور کرنے کو کہا جاتا ہے اور یہ اس وقت کیا جاتا ہے جب اس ناپسندیدہ قول یا عمل سے زیادہ ناپسندیدہ سزا کا خوف ہو۔ اِكْرَاهٌ اور جبر میں فرق یہ ہے کہ لفظ اکراہ میں رضا نہیں ہوتی ہے مگر اختیار باقی رہتا ہے اور جبر میں دونوں یعنی رضا اور اختیار چھین لئے جاتے ہیں۔ اَلدِّيْنِ سورۃ فاتحہ میں دین کے معانی گزر گئے ہیں۔ یہاں پر دین کا معنیٰ دل کا عقیدہ ہے۔ (مراغب، قرطبی، ابوحیان رحمہم اللہ) اس جملے میں دو اقوال ہیں۔ (۱) یہ جملہ خبریہ ہے۔ (۲) یہ جملہ خبریہ انشاء (نہی) کے معنیٰ میں ہے۔ پہلے قول کے مطابق اس کے دو معنیٰ ہیں۔ پہلا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دین اسلام قبول کرنے میں زبردستی نہیں ہے بلکہ وہ تو اختیاری بنا ہے جس کی دلیل سورۃ کہف آیت ۲۹ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ یہاں پر بعد والے جملے میں بھی اس بات کی دلیل ہے کہ دین روشن واضح ہو چکا ہے۔ جبر کی ضرورت نہیں

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

۔دوسرا معنی یہ ہے کہ کوئی انسان دوسرے پر عقیدہ میں جبر نہیں کر سکتا کیونکہ عقیدہ تو دل کی چیز ہے جس میں جبر نہیں چلتا اس کی دلیل سورۃ یونس آیت ۹۹ میں مذکور ہے۔ امام قرطبیؒ نے فرمایا ہے کہ فقہی معاملات جیسے ھبہ، بیع اور نکاح میں جو اکراہ ہوتا ہے یہاں وہ مراد نہیں ہے۔ ان توجیہات کی بنا پر یہ جملہ منسوخ یا خاص نہیں ہے بلکہ محکم اور عام ہے۔ دوسرے قول کے مطابق جب انشاء کے معنی میں ہے تو اس میں امام قرطبیؒ نے چھ اقوال نقل کئے ہیں۔ جن میں بعض اقوال اس کی منسوخیت اور بعض میں مخصوص حالات میں تخصیص کا دعویٰ ہے۔ اگر یہ قتال سے متعلق ہوجائے تو قتال میں زبان پر تو جبر ہوسکتا ہے کہ جبراً کلمہ پڑھادے مگر دل پر جبر نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا قتال کی آیتوں پر اس کا منسوخ ہونا یا خاص ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ یہ لَآ اِكْرَاهَ کیلئے دلیل ہے اور تَبَيَّنَ سے مراد یہ ہے کہ دین خوب واضح ہوچکا ہے اس سورۃ میں اور آیت الکرسی اور سارے قرآن میں بھی اَلرُّشْدُ ہدایت تک رائے کی حقانیت رسائی اور مقصد تک پہنچنے کو کہا جاتا ہے۔ اَلْغَيِّ یہ الرُّشْدُ کے مقابل ہے گمراہی خطاعقیدے اور رائے میں واقع ہو تو اس کو اَلْغَيِّ کہتے ہیں۔ یہاں پر حق باطل اور کفر وایمان مراد ہے۔ مِنَ تمیز اور فرق پر دلالت کررہا ہے۔ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ: اس میں اصحاب الرشد اور اصحاب الغی کی تفصیل ہے۔ کفر انکار کے معنی میں ہے اور یہ لغوی معنی ہے طاغوت، طغیان سے ماخوذ ہے جو حد سے گزرنا ہے اس میں اختلاف ہے۔ ابن علی فارسی کے نزدیک یہ مصدر ہے اور سیبویہ کے نزدیک اسم جنس مراد ہے مبرد کے نزدیک یہ جمع ہے۔ کبھی تو یہ مونث آتا ہے جیسا کہ وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا سورۃ زمر آیت ۱۷۔ اور کبھی مذکر آتا ہے جیسا کہ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ (سورۃ نساء آیت ۶۰) اس کے مصداق میں اختلاف ہے۔ پہلا قول: طاغوت شیطان ہے یہ قول عمر فاروق رضی اللہ عنہ، مجاہد رحمہ اللہ قتادہ رحمہ اللہ کا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ کاہن کو طاغوت کہا گیا ہے۔ (ابن جریرؒ) تیسرا قول طاغوت بمعنی ساحر ہے۔ (ابوالعالیہ)۔ چوتھا قول: ہر وہ چیز جو کسی کو سرکش بنادے۔ پانچواں قول: ہر وہ ذات جس کی عبادت (اللہ کے علاوہ) واطاعت اس کی رضا سے ہورہی ہو۔ چھٹا قول: ہر زیادتی سرکشی کرنے والا جس کی عبادت ہورہی ہو۔ ساتواں قول ہر معبود جو مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ہو۔ اس سے بہتر بات یہ ہے کہ مذکورہ تمام معانوں کو شامل ہے نیز ہمارے تفسیر کے مشائخ کا قول ہے کہ چھٹے اور ساتویں معنی میں نیک صالح لوگوں کو بھی شامل ہے یعنی وہ خود تو سرکش طاغوت نہیں ہیں مگر ان کی بندگی لوگوں کیلئے گمراہی کا سبب بنی ہے اور یہ معنی مجازی ہے۔ مگر یہ صفت صالحین کے ساتھ مناسب نہیں ہے اور صالحین پر کسی اور مقام میں بھی یہ اطلاق نہیں ہوا ہے۔ فائدہ ۱: قرآن مجید میں طاغوت آٹھ بار

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آیا ہے کبھی غیر شرعی حاکم کیلئے آیا ہے جیسا کہ سورۃ نساء آیت ۶۰ کبھی ہر سرکش شیطان کیلئے متصل آیت میں ہے اور کبھی ہر معبود من دُوْنِ اللہِ جیسا کہ اس آیت اور سورۃ زمر ۱۷ میں ہے۔

فائدہ ۲: کفر بالطاغوت کو پہلے ذکر کیا اس لیے کہ یہ حقیقت میں ایمان سے پہلے ہے اور فائدہ حاصل کرنے کیلئے پہلے فساد کو ختم کرنا پڑتا ہے۔ وَ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ اس سے مراد ایمان شرعی ہے۔ سوال: طاغوت کا انکار مستلزم ہے ایمان باللہ کے لئے تو ایمان باللہ کو بعد میں کیوں ذکر کیا ہے؟ جواب: ان میں استلزام نہیں ہے کیونکہ کبھی ایک انسان طاغوت کی بندگی نہیں کرتا مگر پھر بھی ایمان نہیں لاتا اس کا کوئی دین نہیں ہوتا۔ سوال: ایمان باللہ تو کفر بالطاغوت کو مستلزم ہے تو پھر ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ جواب: یہاں مراد مکمل اِنْسِلَاخ کفر سے نکلنا ہے اسی وجہ سے اس کو پہلے اور مستقل ذکر کیا۔ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى: یہ ماقبل کیلئے جزاء ہے اگرچہ شرط اس کیلئے فعل مضارع ہے۔ لیکن جزاء کے مبالغہ کیلئے فعل ماضی لایا گیا یعنی گویا یہ تو پہلے سے ایمان پر مضبوط ہے۔ عُرْوَةِ: لوہے کے اس کڑے اور کنڈے کو کہا جاتا ہے جس کو انسان تھام سکتا ہے۔ الْوُثْقٰى یہ اوثق سے مؤنث ہے یعنی خوب مضبوط کڑا۔ سورۃ لقمان آیت ۲۲ میں بھی اس طرح ہے۔ لَا انْفِصَامَ لَهَا سے حال بن رہا ہے۔ اِنْفِصَامَ فَصَمَ سے ہے۔ اور فَصَمَ بغیر جدا کرنے کاٹنے کے معنی میں ہے۔ اور قصم اس جدائی کو کہا جاتا ہے جس میں قطع لازم ہو اور کبھی ایک دوسرے کے معنی میں آتے ہیں اور جب ایسا ہی قطع نہیں آتا ہے تو جدائی کے ساتھ تو بطریق اولی قطع نہیں آئے گا اس جملہ میں مبالغہ سمیت چھ (6) وجوہات سے تشبیہ ہے۔ (۱) فعل ماضی کا استعمال۔ (۲) تَمَسُّكْ یعنی تھام لینا۔ (۳) باب استفعال سے لانا جو خوب پختگی اور مضبوطی کیلئے ہے۔ (۴) عُرْوَةِ (۵) وُثْقٰی (۶) عدم اِنْفِصَام یعنی نہ ٹوٹنا۔ یہ وہ رسی اور کڑا ہے جو انتہائی مضبوط ہے اور تھامنے والے نے اس کو قوی ہاتھوں سے تھام رکھا ہے۔ لہٰذا اس انسان کیلئے طوفان، سیلاب اور گرنے سے مکمل محفوظ رکھتا ہے۔ تشبیہ کی وضاحت یہ ہے کہ ایمان اور توحید مثل اس کڑے کی ہیں اور یہ عقلی و نقلی ایسے دلائل سے مضبوط ہیں۔ جن کا توڑ کسی کے بس میں نہیں ہے۔ مومن کا ایمان ویقین ان دلائل پر قوی اور بلا شک ہے اور علم بھی ان دلائل پر پختہ ہے تو ایسا مومن دنیا میں تمام فتنوں اور آخرت میں عذاب سے محفوظ رہے گا۔ سوال: یہاں رُشد والوں کا ذکر ہوا تو اَلْغَيِّ کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ جواب: حکم کے مقابلے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ طاغوت پر ایمان اور اللہ تعالیٰ پر کفر کرتے ہیں جیسا کہ سورۃ نساء آیت ۵۱ میں مذکور ہے۔ اور ان کے عقیدے کی مثال سورۃ ابراہیم آیت ۲۶ میں ذکر ہے لیکن چونکہ سابقہ جملوں میں ایمان کی طرف ترغیب ہے چنانچہ اسی وجہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے پہلی قسم کے ذکر پر اکتفا کر لیا اور یہ ترغیب کے لیے کیا ہے۔ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ امام سمعانیؒ نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی دعوت کو سنتا ہے جو آپ اسلام کی طرف بلاتے ہیں اور آپ کی اس دعوت کیلئے جو جذبہ ہے اس کو بھی جانتا ہے۔ یا مومن کا کلمہ شہادت اور کافر کا کلمہ کفر سنتا ہے۔ صاحب اللباب نے لکھا ہے کہ مومن کے پاک اور خالص عقیدے اور کافر کے ناپاک عقیدے کو جانتا ہے۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔــھُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ "ایمان والوں کا کارساز اللہ تعالیٰ ہے وہ انہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال لے جاتا ہے اور کافروں کے اولیا شیاطین ہیں۔ وہ انہیں روشنی سے نکال کر اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ لوگ جہنمی ہیں جو ہمیشہ اسی میں رہیں گے" (257)

تفسیر 257: اس آیت میں ہدایت اور گمراہی والوں کے متعلق مختلف نسبتوں کا ذکر ہے۔ ایمان والوں کی نسبت اللہ کی دوستی کی طرف جبکہ کفر والوں کی نسبت شیاطین طاغوت کی دوستی کی طرف کی گئی ہے۔ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: لفظ اللہ تعالیٰ سے ابتداء کرنے میں دو سبب ہیں۔ (۱) اللہ تعالیٰ مومنین کو تسلی اور اطمینان دیتا ہے کہ تمہیں میرا قرب حاصل ہے۔ (۲)۔ دوسری وجہ نزدیک والا جملہ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ کے ہے کہ اَللّٰهُ وَلِيُّ۔ ولی اصل میں قریب قرب کے معنی میں ہے پھر اس کا استعمال کئے معنوں پر مشتمل ہے لیکن ان سب معانوں میں نزدیک کا معنی پایا جاتا ہے۔ اس مقام میں بھی مختلف اقوال ہیں۔ پہلا قول مددگار (۲) دوسرا محبت کرنے والا (۳) متولی کاموں کا اختیار رکھنے والا۔ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اس سے ایمان والے مراد ہیں جن کا ذکر پچھلی آیت۔ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ میں ہوا ہے دوسرا قول یہ ہے کہ ایمان لانے کا ارادہ رکھنے والے مراد ہیں۔ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ مفسر ابو حیانؒ نے واقدی سے نقل کیا ہے کہ قرآن میں سورۃ انعام آیت ا کے علاوہ جہاں بھی ظلمات آجائے تو مراد کفر اور نور سے مراد ایمان ہوتا ہے۔ یا مراد ظلمات سے شکوک اور شبہات ہیں اور نور سے مراد یقین ہے۔ سوال: اِخْرَاج یعنی نکل جانے سے پہلے تو داخل ہونا لازم ہوتا ہے تو کیا تمام ایمان والے ایمان سے قبل کفر میں داخل تھے؟ جواب ۱: اس سے مراد وہ مسلمان ہیں جو پہلے کفر میں داخل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایمان کی توفیق دی جیسا کہ اکثر صحابہ کرام کا بھی معاملہ تھا۔ جواب ۲: اس سے تمام مومنین مراد ہیں کیونکہ مومنین جب شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جواب ۳: اٰمَنُوْا سے وہ لوگ مراد ہیں جو ایمان

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نہیں لائے البتہ ایمان لانے کا ارادہ ہے۔ جواب ۲: اِخراج سے منع کرنا ہے کیونکہ اگر مومنین اللہ تعالیٰ کی توفیق سے محروم ہو جائیں تو یقیناً ظلمات میں داخل ہو نگے لہذا اللہ تعالیٰ کی توفیق ان کیلئے ظلمات سے روکنے کا سبب بنی۔

سوال: ظلمات کو جمع اور نور کو مفرد ذکر کیا ہے؟۔ جواب: ظلمات کی اقسام بہت ہیں یعنی شرک وکفر بدعت شبہات اور پھر ان میں بھی مختلف قسمیں ہیں جبکہ نور ایمان اور یقین ایک ہی ہے۔ وَالَّذِينَ كَفَرُوٓا أَوْلِيَآؤُهُمُ الطَّاغُوتُ یہ دوسرے گروہ کا ذکر ہے۔ جو أَصْحَابُ الْغَيِّ لوگ ہیں ان میں سے پہلی صفت کفر کو ذکر کیا ہے۔ اس میں ان کے بدترین قبیح حال کی طرف اشارہ ہے اور یہ مابعد کیلئے علت ہے۔ أَوْلِيَآءُ سے مراد ان کے ساتھی یا وہ لوگ مراد ہیں جن کی یہ پیروی کرتے ہیں۔ الطَّاغُوتُ مصدر ہے جو بمعنی جنس ہے یا مفرد جنسی ہے۔ لہذا اس میں جمع مفرد ایک جیسا ہوتا ہے یہاں پر جمع کے معنی میں ہے کیونکہ انسی اور جنی شیاطین کی تعداد بہت ہے۔ يُخْرِجُونَهُم مِّنَ النُّورِ سوال: کافر تو پہلے سے اسلام کے نور میں داخل نہیں ہیں تو انکو نکالنے کا کیا معنی ہے؟ جواب ۱: اس سے خاص وہ یہودی مراد ہیں جو محمد ﷺ کی بعثت سے قبل ان پر ایمان رکھتے تھے (کہ ایسا نبی آئے گا) مگر جب وہ تشریف لے آئے تو انہوں نے انکار کیا اور اپنے پیروں، مولویوں، احبار ورھبان کی تقلید میں حق کو چھوڑ کر کفر کیا۔ جواب ۲: اس سے سارے کافر مراد ہیں اور اخراج سے مراد منع کرنا ہے یعنی اسلام قبول کرنے سے شکوک وشبہات کی وجہ سے رک گئے۔ أُولَٰٓئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ۔ أُولَٰٓئِكَ اس میں کفار طواغیت تابع اور متبوع سب کی طرف اشارہ ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ ۖ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٢٥٨﴾ "کیا آپ نہیں دیکھ رہے ہیں اس شخص کو جس نے لڑائی کی ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ان کے رب کے بارے میں اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے اسکو بادشاہت دی تھی، جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میرا رب تو وہ ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے، وہ کہنے لگا میں زندہ کرتا اور مارتا ہوں، ابراہیم علیہ السلام نے کہا اللہ تعالیٰ سورج کو مشرق کی طرف سے لے آتا ہے تو اسے مغرب کی جانب سے لے آ۔ اب تو وہ کافر حیران اور لاجواب ہو گیا، اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا" (258)

تفسیر 258: ربط: یہ بات گزر گئی کہ اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں ایمان والوں کو شکوک وشبہات اور وسوسوں سے نکالتا ہے جبکہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

طاغوت اپنے ساتھیوں کو شکوک وشبہات میں ڈالتا ہے تو اللہ تعالیٰ تین واقعات ذکر کرتے کے ذریعے اس پر دلائل پیش کرتا ہے اس لئے اس کو سابقہ عبارت پر عطف نہیں کیا۔ پہلا واقعہ دو گروہوں سے متعلق ہے جبکہ بعد والے دونوں واقعات کا تعلق صرف پہلے والی جماعت سے ہے۔ یعنی نمرود ظلمات سے نہیں نکلا کیونکہ وہ طاغوت کا پیروکار تھا جبکہ ابراہیم علیہ السلام اس پر غالب ہوئے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان کا ولی تھا۔ اس واقعہ کو چند وجوہات سے مقدم کیا ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ ایسے کافر کثرت سے ہیں دوسری وجہ یہ ہے کہ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ عبارت کے قریب ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ قدرت الٰہی کو ثابت کرنے کیلئے واضح دلیل ہے۔ جبکہ بعد والے دونوں واقعات میں خرق عادت امور ہیں جو اثبات قدرت الٰہی کیلئے ہیں۔ اَلَمْ تَرَ اس کی تفسیر کلام سابق میں گزر گئی ہے۔ الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ وہ شخص یقینا کافر تھا جو کہ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ سے ثابت ہوتا ہے۔ اکثر مفسرین کا قول یہ ہے کہ یہ نمرود بن فالخ بن عابر تھا جو حام بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے تھا۔ اور کسی نے کہا ہے کہ یہ نمرود بن کنعان بن کوش بن سام بن نوح تھا، ظالم بادشاہ تھا۔ اور شہر بابل کو اس نے آباد کیا تھا اور اپنے لئے اس شہر میں بہت بڑا محل تعمیر کیا تھا اس کو نمرود اور نمروذ کے نام سے پکارا گیا ہے۔ حَآجَّ حجت سے لیا گیا ہے لیکن غالباً باطل لڑائی میں استعمال ہوتا ہے یہاں پہ یہی کیفیت ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ وہ باطل لڑائی لڑ رہا تھا۔ اسی لئے اس کا فاعل کافر کو قرار دیا گیا ہے اور مفاعلہ کا باب اس لیے استعمال کیا ہے کہ وہ اپنے خیال میں خود کو غالب تصور کر رہا تھا۔ فِيْ رَبِّهٖٓ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی صفت کے متعلق جھگڑنا ہے یعنی تصرف اور تدبیر سارے عالم کی اللہ تعالیٰ کرتا ہے اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس پر دلیل بعد میں آنے والے الفاظ ہیں کہ انہوں نے موت اور زندگی کا مالک خود کو تصور کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا منکر نہیں تھا وہ فرعون کی طرح صرف اپنی ربوبیت کا دعوے دار تھا جو کہ الوہیت کے دعوے کو مستلزم ہے اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ لام کے حذف کے ساتھ اور یہ حَآجَّ کیلئے علت ہے۔ علت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ بادشاہت تکبر کرنے کا سبب بنی اس لیے اس نے ابراہیم علیہ السلام سے جھگڑا کیا یا پھر طنز اور ندامت کے لیے ہے مطلب یہ ہے کہ اس کو چاہئے تھا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتا جس نے اس کو حاکم بنایا مگر اس نے شکر کے بجائے تکبر کفر اور جھگڑا کیا۔ مُلْكَ سے مراد کثرت مال قوت افراد، پیروکار، نوکر وغیرہ ایسی بادشاہت کافروں کو اللہ تعالیٰ دیتا ہے جو ان کیلئے استدراج اور امتحان کے طور پر ہوتی ہے۔ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ یہ حَآجَّ کیلئے ظرف ہے اور یہ دلیل ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے توحید کی دعوت دی تھی اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تصرف اور ربوبیت کو اللہ تعالیٰ کے لئے اپنے بیان میں خاص کیا تھا تو اس کی وجہ سے نمرود نے جھگڑا شروع کیا جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوت دیتے ہوئے اَنَا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہا اور پھر توحید ربوبیت کی تفصیل بیان کی جو سورۃ شعراء آیت ۱۹ میں مذکور ہے۔ صفت اَحْیَاءِ اور اَمَاتَتْ بطور دعویٰ یا بطور استدلال ہے لیکن یہ بہت ہی واضح اور جامع صفت ہے۔ احیاء کا معنیٰ ہر عقل والا جانتا ہے خواہ انسان یا حیوان کی پیدائش ہو یا زمین کی انسان اور حیوان کی نطفہ سے پیدائش مراد ہے جبکہ زمین کا احیا قوت نباتی اس میں پیدا کرنا ہے۔ اور موت سے مراد روح کو بدن سے الگ کرنا ہے خواہ انسان کی ہو یا حیوان کی اور زمین خشک کرنا مراد ہے اور ہر صاحب عقل جانتا ہے کہ یہ کام صرف اللہ تعالیٰ کرتا ہے کیونکہ یہ کام وہی ذات کر سکتی ہے جو کامل علم اور ہر چیز پر قدرت کامل رکھتی ہو۔ وہ ذات جس پر موت نہ آتی اور اپنی حیات میں کسی کی محتاج نہ ہو اور اس کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہ ہو یہ صفات صرف ذات باری تعالیٰ ہی کی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ربوبیت اس کے لئے خاص ہے۔ سوال: سورۃ ملک آیت ۲ سورۃ بقرۃ آیت ۲۸ سورۃ شعراء آیت ۸۱ میں موت کو حیات سے پہلے ذکر کیا ہے جبکہ یہاں برعکس ہے؟ جواب: یہاں توحید ربوبیت کی دعوت دینا مقصود ہے اس میں وہ تصرف پہلے ذکر کرنا چاہئے جو زیادہ موثر ہو یعنی اس میں تعجب زیادہ ہو اور یہ پیدائش میں زیادہ ہے اس لیے اس کو مقدم کیا ہے۔ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ یہ (حَآجَّ) جھگڑے کی تفصیل ہے اور اس قول میں چاہے دعویٰ ہو یا دلیل دو وجوہات سے مغالطہ دینا مقصود تھا۔ پہلی وجہ جیسا کہ عام مفسرین نے نقل کیا ہے کہ اس شخص کو معاف کرنے کا حکم جاری کیا جس کو پھانسی دینے کا حکم سنایا تھا جبکہ یہ اَمَاتَتْ نہیں بلکہ قتل ہے۔ دوسری وجہ اَحْیَاءِ اور اَمَاتَتْ تو خفیہ عمل ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے اس نے اس لفظ کے ذریعے سے اس کو اپنا عمل قرار دیا البتہ یہ نہیں کہا کہ اَنَا الَّذِیْ اُحْیٖ میں وہ ذات ہوں جو زندگی دیتا ہوں یہ اس لیے نہیں کہا کہ اس کا دعویٰ حصر کا نہیں تھا کہ یہ کام صرف میں کرتا ہوں بلکہ اپنے آپ کو اس صفت میں شریک منواتا تھا کیونکہ اس سے قبل بہت سارے لوگ پیدا ہوئے اور فوت ہوئے تھے اس لیے اس نے اس صفت کو اپنے لئے خاص نہیں کیا۔ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ: یہ فا مقدر شرط کے جواب کیلئے ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے اس سے کہا کہ تم نے اپنے بارے میں زندگی اور موت کے اختیار کا دعویٰ کیا تو اس سے لوگوں میں غلط عقیدے کا التباس پیدا ہوا لہٰذا اب واضح حجت اور دلیل سنو کہ سورج کے حرکات تصرفات فلکیہ ہے اس میں تصرف کر کے دکھاؤ اور یہ بندوں کے دعوے سے بلند ہے لہٰذا میرا رب سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے تم اس کو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مغرب سے طلوع کر کے دکھاؤ کیونکہ تمہارا دعویٰ تصرف کا ہے اور یہ بات یقینی ہے کہ مشرق سے طلوع آفتاب اللہ تعالیٰ کا تصرف ہے۔ سوال: اصول مناظرہ تو یہ ہے کہ مقابل کی دلیل پر اعتراض کیا جائے تاکہ اس کا باطل ہونا واضح ہو جبکہ یہاں تو ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف منتقل ہوئی ہے؟ جواب ۱: اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ اس میں مقابل کو چپ کرانے کے لیے دلیل واضح سے اوضح (زیادہ واضح) دلیل کی طرف انتقال کیا گیا ہے اور یہ بات بحث والے کے لیے درست ہے۔ امام ابن کثیرؒ نے اس کو منطقیوں کا قول قرار دیا ہے۔ پھر بھی اس پر اعتراض وارد ہوتا ہے۔ اس میں تو مقابل کے نزدیک پہلی دلیل کا ضعف ثابت ہو گیا جو کہ درست نہیں ہے۔ امام رازی نے بھی اس توجیہ پر اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ دوسری دلیل پہلی دلیل سے زیادہ واضح نہیں ہے۔ تفسیر رازی میں انہوں نے وجوہات ذکر کی ہیں۔ جواب ۲: امام ابن کثیرؒ اور امام رازیؒ نے فرمایا ہے کہ پہلی دلیل سے دوسری دلیل کی طرف منتقل ہونا نہیں ہے بلکہ اسی پہلی دلیل کیلئے دو مثالیں دی ہیں۔ (۱) ایک مثال احیاء یعنی زندہ کرنا (۲) دوسری مثال سورج کی حرکت میں تصرف۔ اصل میں دلیل تو چیزوں کا پیدا کرنا ہے جس کیلئے ایک محدث (موجد) قادر وقدرت والی ذات کا ہونا ضروری ہے اور وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے تو ان حوادث میں سے ایک مثال یہ ہے کہ معدوم سے وجود میں لاتا ہے اور وجود سے عدم میں۔ دوسری مثال افلاک اور ستاروں میں حرکت کرنا ہے۔ لیکن اس پر بھی اعتراض ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ فریق مخالف نے پہلی قسم کی نسبت اپنی طرف کی تو اس کا رد ہونا چاہیے تھا۔ جواب ۳: امام رازی اور صاحب الشہاب نے لکھا ہے کہ اس میں کوئی انتقال نہیں ہوا ہے۔ بلکہ یہ مقدر سوال کا جواب ہے جو فریق مقابل کی طرف سے ہوا ہے وہ اس طرح کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے دلیل پیش کی تو منکر نے اعتراض کیا کہ یہ تصرف آسمانی یا زمینی اسباب ہے یا ان کے ذریعے سے ہے۔ پہلا قول تو حقیقت اور واقع کے خلاف ہے اور دوسرے قول کی دلیل مقصد پر پوری نہیں اترتی کیونکہ کوئی انسان بھی بعض اسباب ظاہری سے اَحْیَاء اور اَمَاتَت پر قادر ہو جاتا ہے یعنی اَحْیَاء کیلئے بیوی سے جماع کرنا اور اَمَاتَت کیلئے زہر پلانا اور کوئی ذریعہ اختیار کرنا تو ابراہیم علیہ السلام نے جواب اس قول کے ساتھ ذکر کیا کہ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ مان لیا کہ حیات اور موت اسباب پر ہے لیکن ان میں حرکات فلکیہ بڑا جز ہیں اور اس کا مدبر فاعل تو اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے اگر فریق مخالف کو اپنے تصرف کا دعویٰ ہے تو حرکت مخالف اس میں پیدا کر دے۔ یہ جواب صحیح تو ہے لیکن ایک مقدر سوال کا محتاج ہے۔ [illegible] آبادی نے اپنی تفسیر مواہب الرحمان

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میں لکھا ہے کہ مناظرہ میں جانبین کیلئے پہلے دعویٰ پھر استدلال ذکر کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے پہلے دعویٰ ذکر کیا کہ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِ وَيُمِيتُ حصر اور تخصیص کے ساتھ۔ تو نمرود نے بھی دعویٰ کیا کہ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيتُ یعنی تصرف میں کرتا ہوں چیزوں میں ایجاد اور فنا میں کرتا ہوں۔ پھر ابراہیم علیہ السلام نے اپنے دعوے پر دلیل پیش کی فَاِنَّ اللّٰهَ اور اس سے بھی دلیل کا مطالبہ کیا۔ مگر وہ دلیل پیش کرنے سے عاجز آ گیا یہ جواب احسن اور اصول مناظرہ کے موافق ہے یعنی مخالف فوراً لاجواب ہوا ہے۔ اور لفظ (فا) دلیل میں ذکر ہوتی ہے۔ کیونکہ دعویٰ دلیل کا تقاضا کرتا ہے تو مقتضاء میں فا داخل ہوتی ہے۔ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ: ظاہر میں فاعل ابراہیم علیہ السلام اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہے۔ اسلئے مجہول صیغہ ذکر ہوا۔ اور لفظ اَلَّذِيْ كَفَرَ میں اشارہ ہے۔ بُہِتَ کی علت کی طرف اور بُہِتَ حیران ہونے اور ہیبت زدہ ہونے کو کہا جاتا ہے۔ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ وہ گونگا ہو کر خاموش ہوا۔ اور صاحب اللباب نے لکھا ہے کہ مغلوب ہوا اور جواب دینے پر قادر نہیں تھا۔ اور ابن عاشورؒ نے لکھا ہے کہ مناظرہ کرنے سے عاجز ہوا۔ سوال: نمرود نے یہ کیوں نہیں کہا کہ سورج کو مشرق سے میں طلوع کرتا ہوں۔ تیرا رب اس کو مغرب سے طلوع کر لے؟۔ جواب ۱: امام سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ اس مجلس میں نمرود سے بڑی عمر والے لوگ موجود تھے۔ اگر وہ دعویٰ کر لیتا تو بظاہر وہ لوگ ڈر کی وجہ سے خاموش رہتے مگر دل میں ضرور اس کی تکذیب کر لیتے۔ کیونکہ وہ دکی پیدائش سے پہلے بھی سورج مشرق سے طلوع ہوتا تھا۔ لہٰذا یہ تیرا دعویٰ باطل ہے۔

جواب ۲: امام سمعانیؒ نے لکھا ہے کہ وہ دل میں جانتا تھا کہ اگر ابراہیم علیہ السلام سے کہوں گا کہ تیرا رب مغرب کی جانب سے طلوع کرے تو اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے اور مزید شرمندگی ہوگی۔ جواب ۳: اللہ تعالیٰ نے اس سے جواب بھلا دیا تاکہ لوگوں پر اظہار حق ہو جائے۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس قول میں یہی مراد ہے کہ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ: اس ہدایت سے مراد دلیل اور حجت کی رہنمائی ہے۔ ایمان والوں کی جہاں تک بات ہے تو ان کا ذکر سورۃ عنکبوت کے آخر میں ہے کہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ مراد اس سے ہدایت خاصہ ہے۔ یا یہاں ظالم سے مراد ضدی عنادی جس کے دل پر مہر لگی ہوئی ہو۔ فائدہ ۱: اس واقعہ میں دلیل ہے کہ اظہار حق کیلئے مناظرہ کرنا سنت انبیاء ہے البتہ شرط یہ ہے کہ ریا، ضد عناد اور تعصب کیلئے نہ ہو۔ امام قرطبیؒ نے اس کے لیے اور بھی دلائل ذکر کیے ہیں۔

: اس واقعہ میں رد شرک فی الربوبیت ہے اور ربوبیت سے تصرف مراد ہے یعنی مخلوق کی تدبیر اور تصرف کرنا اور یہ مستلزم ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت کو کہ بعث بعد الموت پر وہ قادر ہے بعد میں آنے والے واقعات اس پر واضح دلیل ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اَوْ كَالَّذِىْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْىٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ۚ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۚ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۚ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾ "یا اس شخص کے مانند کہ جس کا گزر اس بستی پر ہوا جو چھتوں کے بل اوندھی پڑی تھی، وہ کہنے لگا اس کی موت کے بعد اللہ تعالیٰ اسے کس طرح زندہ کرے گا؟ تو اللہ تعالیٰ نے اسے مار دیا سو سال کے لئے، پھر اسے اٹھایا، پوچھا کتنی مدت تجھ پر گزری؟ کہنے لگا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ، فرمایا تو سو سال تک رہا، پھر اب تو اپنے کھانے پینے کو دیکھ کہ بالکل خراب نہیں ہوا اور اپنے گدھے کو بھی دیکھ، ہم تجھے لوگوں کیلئے ایک نشانی بناتے ہیں تو دیکھ کہ ہم ہڈیوں کو کس طرح اٹھاتے ہیں، پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں، جب یہ سب کچھ اس پر ظاہر ہو چکا تو کہنے لگا میں خوب جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔" (259)

تفسیر 259: یہ دوسرا واقعہ ہے اور اَللّٰهُ وَلِىُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو شبہات سے یقین کی طرف لے جاتا ہے۔ ربط ۱: پہلے واقعہ میں توحید ربوبیت کی دلیل تھی جو ایمان کے اصولوں میں سے پہلا اصول یا بنیاد ہے اب دوسرے واقعے میں دوسرا اصول بیان ہو رہا ہے جو بعث بعد الموت یعنی مرنے کے بعد اخروی زندگی پر ہے۔ ربط ۲: پہلے واقعہ میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ذکر تھا کہ حیات و ممات اور تصرف انقلابات سورج وغیرہ میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت میں ہے۔ تو اب اس کی فروعات بیان ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ مرنے کے بعد زندگی پر بھی قادر ہے اور اسی طرح دیگر امور خارقہ بھی اسی کی قدرت میں ہیں۔ اَوْ كَالَّذِىْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ: اَوْ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے لئے برائے تنویع ہے کہ پہلے ایک قسم کی قدرت کا ذکر تھا اب دوسری قسم کی قدرت الٰہی کا ذکر ہے۔ اور یہ کسائی اور فراء کے نزدیک ما قبل کے معنی پر عطف ہے۔ امام مبرد کے نزدیک یہ لفظ پر عطف ہے البتہ اس میں مخفی عبارت ہے۔ یعنی اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖٓ. اَلَمْ تَرَ مَنْ هُوَ اَوْ كَالَّذِىْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ اور ان دونوں حالتوں میں کاف اسم ہے اور مثل کے معنی میں ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ اس واقعہ جیسی مثالیں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی اور بھی بہت ساری ہیں۔ اَلَّذِىْ میں بہت سے اقوال ہیں۔ اکثر مفسرین کے نزدیک اس سے مراد عزیر بن شرخیا علیہ السلام ہے اور بعض کے نزدیک ارمیا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بن حلقیا علیہ السلام نبی ہے اور بعض کے نزدیک ہزقیل بن بوزی مراد ہیں۔ امام سمعانیؒ کے بقول پہلا قول صحیح ہے اور امام ابن عاشورؒ کے نزدیک تورات کے مطابق تیسرا قول صحیح ہے اور اکثر معتزلہ فرقے نے حزقیل بن بوزی نبی کو کافر قرار دیا ہے۔ **قَرْيَةٍ**: اکثر مفسرین کے نزدیک یہ بیت المقدس کی قریہ ہے بنی اسرائیل کی اس بستی کو جس کو بخت نصر ظالم بادشاہ نے ویران کیا تھا بعض رہنے والوں کو قتل اور بعض کو ہجرت پر مجبور کیا تھا نیز تورات کو بھی جلا ڈالا تھا۔ یا اس سے ارض مقدسہ مراد ہے یہ ضحاکؒ کا قول ہے۔ یہ وہ بستی ہے جس سے ہزاروں کی تعداد میں خوف جہاد سے لوگ بھاگ گئے تھے جس کا ذکر آیت ۲۴۳ میں گزر گیا ہے۔ البتہ ابن عطیہؒ نے اس قول کو رد کیا ہے کہ اس سے مراد ہرقل کی بستی یا سابور آباد ہے۔ سدیؒ کا قول ہے کہ یہ سلم آبادی کی بستی ہے۔ **وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا** یہ جملہ حالیہ ہے اور **خَاوِيَةٌ** دو معنوں میں ہے۔ (۱) گر جانا (۲) خالی ہونا۔ یہاں پہلا معنیٰ مراد ہے۔ عروش عرش کی جمع ہے مکان کی چھت اور چھپروں کو کہا جاتا ہے۔ یعنی اس بستی کی چھتیں باغات چھپرے پہلے گر گئے پھر ان کی دیواریں اوپر گر گئی تھیں جس سے ڈھیر بن گئے تھی جیسا کہ آج بھی پرانے ویران کھنڈرات کی کیفیت ہوتی ہے۔ **قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا**۔ **أَنَّىٰ** **كَيْفَ** کے معنیٰ میں ہے اور بستی کی زندگی سے مراد اس کے باشندوں کی زندگی مراد ہے اور بستی کی موت سے مراد ہے اس کی ویرانی اور اس کے مکانات کا گرنا ہے۔ یہ سوال ان لوگوں کی زندگی پر مشتمل ہے جو اس بستی میں زندہ اور آباد تھے۔ یہ سوال انکار کے طور پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور عظمت کے طور پر تھا کہ اس کی قدرت بہت عظیم ہے۔ یا آنے والے بنی اسرائیل پر افسوس کے طور پر تھا یا دوسری زندگی کی کیفیت سے متعلق تھا۔ یعنی دوسری زندگی تو ایک حقیقت ہے لیکن ابھی تک ان کو اس کیفیت کا علم نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو موت کی طرح ایک بار فوری زندگی دے گا یا تدریجاً آہستہ آہستہ زندہ کرے گا۔ جیسے پہلی زندگی ہوتی ہے **تنبیہ**: زمخشریؒ اور ابو علیؒ وغیرہ معتزلہ کا قول ہے کہ یہ شخص کافر تھا اور یہ سوال بطور شک اس نے کیا تھا۔ لیکن ابن عطیہؒ نے اس کا رد کیا ہے۔ صاحب اللباب نے لکھا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ اور موت کے بعد حیات مانتے تھے مگر اجمالاً البتہ اس کی تفصیل سے بے خبر تھے تو معلوم ہوا کہ یہ شخص مومن تھا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہم کلام ہونے میں دلیل ہے کہ یہ نبی بھی تھا۔ **فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ**۔ **أَمَاتَهُ** کیلئے **مِائَةَ** ظرف ہے۔ البتہ ایک لفظ مقدر ہے یعنی **وَأَلْبَثَهُ** یعنی ٹھہرایا اس کو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف نسبت کی تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو لوگوں کی نظروں اور دیگر حوادث سے محفوظ رکھا تھا۔ یہ موت اگرچہ روح اور بدن جدا ہونے کی صورت میں تھی لیکن وہ موت حقیقی جس کے بعد واپس دنیا میں نہیں آنا ہوتا ہے وہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مراد نہیں تھی۔ یہ بطور خرق عادت تھی۔ اس سورۃ میں ایسے تین واقعات ذکر ہوئے ہیں جن میں سے یہ چوتھا ہے۔ منکرین معجزات و منکرین حدیث اس کے منکر ہیں اور تحریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قرآن میں دنیاوی زندگی پھر موت اور پھر قیامت میں اٹھنا ذکر ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قیامت تم اس لیے مانتے ہو کہ قرآن میں ذکر ہے تو ایسے واقعات تو قرآن ہی میں ہیں لہٰذا اس کا ماننا بھی لازم اور ضروری ہے۔ سوال: ثُمَّ بَعَثَهٗ فرمایا اَحْيَاهُ نہیں فرمایا؟ جواب: بَعَثَهٗ اس لیے فرمایا کہ جس حال میں موت دی تھی اسی حال میں عقل شعور علم نظر وغیرہ کے ساتھ زندہ کیا۔ لفظ اَحْيَاءِ سے یہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا ہے مفسرین نے لکھا ہے کہ ستر سال اس شخص پر گزرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک فارسی بادشاہ کو جس کا نام لوشک یا لوسک تھا کو قوت عطاء کر دی انہوں نے بیت المقدس کو پھر آباد کیا اور بنی اسرائیل کو جابر کے چنگل سے آزاد کیا اور بیت المقدس میں آباد ہو گئے تو پھر تیس سالوں میں یہ لوگ پوری طرح آباد ہوئے۔ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ: امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ظاہری عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال کرنے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے کیونکہ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا: کے الفاظ اس پر دلیل ہیں۔ سوال: اللہ تعالیٰ کو اس کی موت کی مدت بھی معلوم تھی اور یہ بات بھی کہ دوران موت انسان کو دنیا کے حالات معلوم نہیں ہوتے تو پھر اس سوال کا کیا مطلب؟ جواب ۱: یہ اس لیے کہ اس پر موت اور نیند میں شک اور اشتباہ نہ ہو کیونکہ نیند تو سو سال نہیں ہو سکتی ہے۔ جواب ۲: جاہلوں کے اس عقیدے کا رد ہوا ہے جو انہوں نے اپنایا ہے کہ مردے دنیا کے حالات سے واقف بھی ہوتے ہیں اور مدد بھی کر سکتے ہیں تو یہاں اللہ تعالیٰ نے سوال اور جواب کے لئے ذکر کیا کہ سیدنا عزیر علیہ السلام کو اگرچہ موت مؤجل نہیں آئی تھی لیکن اس کے باوجود انہیں احوال اور موت کی مدت معلوم نہیں تھی اور اس طرح دنیا میں دیگر گزرے حالات سے بھی وہ بے خبر تھے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ جو وقت مقررہ سے فوت ہو جائے تو وہ بدرجہ اولیٰ بے خبر ہوگا۔ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ یہ قول ان کے اندازے پر بنا تھا۔ اور قانون یہ ہے گمان غالب پر جب کوئی خبر وغیرہ واقع ہو اور وہ غلط ثابت ہو جائے تو اسے جھوٹ نہیں کہا جائے گا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کے فوت ہونے کا وقت صبح کا تھا اور پھر بعث کا وقت دن کے آخر غروب شمس کا تھا۔ لہٰذا جب اس نے سورج کو نہیں دیکھا تو یوماً کہا لیکن جب دیکھا کہ ابھی تو سورج غروب نہیں ہوا ہے تو بعض یوم فرمایا۔ یہاں پر (اَوْ) بَلْ کے معنی میں ہے۔ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ آپ ایک دن یا کچھ حصہ نہیں بلکہ سو سال رہے ہیں۔ اس میں اس سوال کا جواب ہے کہ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا پہلا جواب اس کا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے بدن میں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ظاہر کیا یعنی اللہ تعالیٰ دوبارہ زندگی اس صورت میں دیگا جیسے عزیر علیہ السلام کو بالغ عاقل عالم اور حواس خمسہ سے مزین پیدا کیا۔ فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْ مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کے پاس سفر کا زاد راہ تھا یعنی طعام انجیر پینے کیلئے انگور کا رس یا دودھ تھے۔ سو سال گزرنے پر بھی مذکورہ چیزیں خراب نہیں ہوئیں لَمْ یَتَسَنَّهْ میں ھا ذاتی اصلی ہے اور (لَمْ) کی وجہ سے پیش ہٹا دیا گیا۔ نحاس نحوی نے کہا ہے کہ یہ سنہ سے لیا گیا ہے۔ اور سالوں کا گزر جانا تبدیلی کو مستلزم ہے۔ لیکن یہاں پر التزامی معنیٰ ہے یعنی تبدیلی بھی نہیں ہوئی ہے ان سالوں کے گزرنے کی وجہ سے اور بد بودار بھی نہیں ہوا ہے۔ لَمْ یَتَسَنَّهْ یہ جملہ حالیہ ہے یعنی اس کا حال نہ بدلنے پر نظر کرو۔ سوال: یہ مفرد کا صیغہ ہے جبکہ ذکر تو دو چیزوں کا ہے یعنی طعام و شراب؟ جواب: اصل میں دونوں ایک غذا کے حکم میں ہیں کیونکہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ عادت میں لازم ملزوم ہیں۔ سوال: بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ کی تشریح کیلئے وَ انْظُرْ اِلٰی حِمَارِكَ ذکر کیا جانا چاہیے تھا کیونکہ وہ زیادہ عرصہ گزارنے پر دلالت کرتا ہے۔ جبکہ کھانا پینا تبدیل نہ ہونا زیادہ عرصہ گزارنے کی دلیل نہیں ہے؟ جواب: مِائَةَ عَامٍ سے ایک وہم پیدا ہوا تھا کہ اس کا بدن کیوں خراب نہیں ہوا جبکہ اس پر سو سال کا دورانیہ گزر چکا تھا تو اس پر یہ وہم ختم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ عظیم قدرت کا مالک ہے کہ جو چیزیں جلدی خراب ہونے والی ہیں وہ اس قدرت والے نے محفوظ رکھی ہیں۔ اس طرح عزیر علیہ السلام کا بدن اللہ تعالیٰ نے محفوظ کیا ہے اور سارے نبیوں کے اجسام محفوظ ہیں اور بعض شہداء اور اولیاء کے اجسام اور تمام انسانوں کی ریڑھ کی ہڈی جس کو عجب الذنب کہا گیا ہے محفوظ رہتی ہے یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عظیم نشانی ہے۔ وَ انْظُرْ اِلٰی حِمَارِكَ اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ ان کا گدھا مر چکا تھا کھال اور گوشت تو ختم ہو گیا تھا البتہ ہڈیاں بکھری پڑی تھیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم قدرت کا اظہار کرتے ہوئے یہ مزید نشانی بھی دکھا دی۔

سوال: کھانے پینے کے ساتھ حالت کا بھی ذکر کیا تھا جو کہ محل عبرت ہے جبکہ گدھے کے ساتھ ذکر نہیں کیا ہے؟ جواب: ضحاکؒ اور وہب بن منبہؒ کا قول یہ ہے کہ وہ گدھا اپنی جگہ محفوظ کھڑا تھا اور اس کو کھانے پینے کی طرح اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا تھا۔ بقول زمخشری سو سال تک اس گدھے نے کھایا پیا نہیں بلکہ اپنی جگہ پر کھڑا تھا تو یہ بھی قدرتِ الٰہی کی عظیم دلیل ہے اس لیے اس کی حالت کی تفصیل بیان نہیں کی۔ وَ لِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ: امام فراءؒ نے فرمایا ہے کہ اس کا فعل بعد میں مقدر ہے یعنی فَعَلْنَا ذٰلِکَ یہ کام ہم نے کیا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ واو اضافی ہے۔ اور یہ اُنْظُرْ سے متعلق ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہاں کلام مقدر ہے یعنی اَرَیْنٰکَ ذٰلِکَ لِتَعْلَمَ قُدْرَتَنَا وَلِنَجْعَلَکَ الخ۔ یہ ہم نے اپنی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قدرت کی نشانی دکھائی تا کہ آپ کو ہماری قدرت تامہ کی جھلک دکھائی جائے۔ اور لوگوں کے لئے ہم آپ کو قدرت کی نشانی بنائی۔ لِّلنَّاسِ: اس میں الف لام عہدی ہے یعنی وہ لوگ جو عزیر علیہ السلام کے دور میں موجود تھے اور ان کو اپنے آنکھوں سے دیکھا، یا الف لام جنسی ہے تو مراد قیامت تک آنے والے لوگ ہیں جو اس واقعہ کو سنیں گے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ موت کے وقت ۴۰ سال کے تھے اور جب دوبارہ معاشرے میں آئے تو اسی طرح جوان تھے اور نواسوں کو دیکھا تو سو سال سے بھی انکی عمریں زیادہ تھیں۔ انہوں نے اس کو بعض نشانیوں اور خصوصاً تورات کے حافظ ہونے سے پہچان لیا۔ امام ابن عطیہؒ کا قول ہے اتنا عرصہ مردہ رکھنا اور پھر زندہ کرنا یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ایک عظیم نشانی ہے اس کو کسی ایک بات کے ساتھ خاص کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تنبیہ: عزیر علیہ السلام کا یہ واقعہ یہودیوں کے بعض لوگوں کیلئے سبب بنا کہ عزیر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور تمام علوم کا مظہر ہیں۔ انہوں نے یہ باطل عقیدہ اختیار کیا اور توحید کی دلیل سے شرک کی دلیل بنائی۔ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ. اُنْظُرْ کو مکرر ذکر کیا اس لیے کہ اس نظر اور سابقہ نظر میں فرق ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلی نظر گدھے کو مارنے اور اس کی ہڈیوں کی طرف تھا کہ اس کو سو سال تک محفوظ رکھا اور یہ نظر دوبارہ زندہ کرنے کی طرف ہے جو بطور مشاہدہ ہے۔ اکثر مفسرین کے نزدیک یہ حال ہے اور بعض کے نزدیک یہ عظام سے بدل ہے۔ یعنی اس کی ہڈیوں کا حال دیکھ لو۔ پھر دو حالتیں مذکور ہیں (۱) پہلا نُنْشِزُهَا: یہ اَنْشَزَ سے لیا گیا ہے۔ جس کے معنی لغت میں اٹھانے کے ہے۔ اور ابن عطیہؒ کا قول ہے کہ اٹھانے سے مراد رفتہ رفتہ اور پیوست جوڑنا تو معنی یہ ہے کہ اس کی ہڈیوں کو حرکت دیتے ہیں اور بعض ہڈیاں بعضوں پر رکھ چھوڑتے ہیں بعض قرائتوں میں (ر) کے ساتھ صرف زندہ کے معنی میں ذکر ہے۔ لیکن اس میں صرف زندہ کرنے کے معنی ہیں جبکہ یہاں زندہ کرنے کی کیفیت کا ذکر ہے اس لیے یہاں (ز) مناسب ہے۔ دوسرا حال ہڈیوں کا ہے یعنی ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا یہ پہلی ترکیب کے ساتھ بعض حالتوں میں برابر ہے جیسا کہ سورۃ مومنون آیت ۱۴ میں ذکر ہوا ہے۔ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ: اس کا مفعول مقدر ہے یعنی كَيْفِيَّةُ الْاِحْيَاءِ یا مَا اَشْكَلَ عَلَيْهِ۔ یعنی زندہ کرنے کی کیفیت یا اس پر جس میں اشتباہ تھا۔ بقول زمخشری بعد والا كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. تَبَيَّنَ کیلئے تقدیری طور پر مفعول ہے اور ظاہری طور پر اعلم کیلئے مفعول ہے۔ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: اَعْلَمُ سے علم مشاہدہ مراد ہے۔ جو اس واقعہ کے بعد پیدا ہوا پہلا علم موجود تھا مگر مشاہدے کے بعد مزید قوی ہوا فعل مضارع اس لیے ذکر کیا کہ اس میں مزید نئے علم کا اضافہ ہوا۔ آیت کے اختتام پر قَدِيْرٌ ذکر کیا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نمونے اس میں ذکر ہوئے ہیں۔ (۱) مردہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بدن کو محفوظ رکھنا۔ (۲) بغیر کھائے پیئے ۱۰۰ سال تک محفوظ رکھنا (۳) سو سال بعد عزیر علیہ السلام کو پھر زندہ کرنا (۴)۔ بعض انسانوں کو دنیا میں مشاہدے کا علم عطاء کرنا۔ فائدہ: اس آیت میں دلیل ہے کہ گدھے پر سواری نبیوں کی سنت ہے اور ہمارے نبی ﷺ نے بھی گدھے پر سواری کی ہے جیسا کہ حدیث معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ میں مذکور ہے (صحیح بخاری کتاب الاستئذان حدیث 6254، صحیح مسلم فی المغازی حدیث 1423، ترمذی فی السلام حدیث 2702)۔

کسی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ مسلمان ہو کر پھر بھی گدھے کی سواری پر کسی کا مذاق اڑائے۔ جو لوگ مجرم چور وغیرہ کو تذلیل کیلئے گدھے پر بٹھاتے ہیں وہ یہودیوں اور انگریزوں کی سازشوں کا شکار ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ وہ سنت انبیاء کی توہین کے مرتکب ہوتے ہیں۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَٰهِـۧمُ رَبِّ أَرِنِى كَيْفَ تُحْىِ ٱلْمَوْتَىٰ ۖ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن ۖ قَالَ بَلَىٰ وَلَـٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِى ۖ قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ ٱلطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ ٱجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ٱدْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا ۚ وَٱعْلَمْ أَنَّ ٱللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٦٠﴾ "اور جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ اے میرے پروردگار مجھے دکھا تو مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا؟ (جناب باری تعالیٰ نے) فرمایا، کیا تمہیں ایمان نہیں؟ جواب دیا ایمان تو ہے لیکن تاکہ میرے دل کو اطمنان ہو جائے، فرمایا چار پرندے لو، ان کے ٹکڑے کر ڈالو، (پال لو) پھر ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دو پھر انہیں پکارو، تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آ جائیں گے اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمتوں والا ہے" (260)

تفسیر 260: یہ تیسرا واقعہ ہے اور اس کا تعلق اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ابراہیم علیہ السلام کو ایک قسم کی ظلمت سے جو سوال میں ہے علم یقینی کے ساتھ ساتھ مشاہدے کی روشنی میں لے آیا۔ یہاں سابقہ قصے سے مزید ترقی ہے وہاں سوال اَنّٰی لفظ سے کیا گیا تھا جبکہ یہاں پر لفظ کَیْفَ سے ہوا ہے جو سوال کی کیفیت میں بہت واضح ہے۔ وہاں عزیر علیہ السلام کے وجود میں نمونہ ظاہر کیا تو یہاں پر خارجی حیوانوں میں ظاہر کیا۔ وہاں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں دکھائیں تو یہاں پر اس کی قدرت کی حکمتوں کا ذکر کیا۔ وہاں پر گدھے اور انسان کی ہڈیوں کا نمونہ دکھایا کہ بغیر ملانے کے اس کو رب کائنات نے زندہ کیا تو یہاں پر ہڈیوں کے خلط ملط ہونے کے باوجود ان کو الگ کر کے زندہ کرنا دکھایا۔ ان وجوہات سے ابراہیم علیہ السلام کی فضیلت عزیر علیہ السلام پر ثابت ہوتی ہے۔ عزیر علیہ السلام کے واقعہ کو (پہلے) ذکر کیا ہے جو حیات بعد الممات میں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی ہے۔ وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِمُ: ان مناسبتوں کی وجہ سے اس کو حرف واؤ کے ساتھ سابقہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پر عطف کیا ہے۔ربِّ اَرِنِیۡ كَیۡفَ تُحۡیِ الۡمَوۡتٰی: مفسرین نے اس سوال کے مختلف اسباب ذکر کیے ہیں مگر بہتر یہ ہے کہ جب بعد میں مذکور ہے یعنی لِّیَطۡمَىِٕنَّ قَلۡبِیۡ: انبیاء اور علماء کے نزدیک اضافہ علم محبوب ترین چیز ہے۔ اور لفظ اَرِنِیۡ دلیل ہے کہ علم کو مشاہدے کی ضرورت ہے لفظ كَیۡفَ بھی وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں پر سائل اور مسئول کے درمیان جو چیز موجود ہو وہ معلوم ہو لیکن اس کے بعض احوال معلوم نہ ہوں۔ یہاں بھی معاملہ ایسا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو بعث بعد الموت کا علم ہے اور اس پر یقین بھی ہے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ جب ہڈیاں بوسیدہ ہو کر خلط ملط ہو جائیں یہ ان کو کچلا جائے تو ان کو اللہ تعالیٰ کس ترتیب سے بنائے گا الگ الگ کر کے یا رفتہ رفتہ یا فوری طور پر ان میں روح ڈال کر سب کو حیات دے گا؟ یعنی مردوں کی اجزاء وترکیب خلق کے متعلق سوال تھا۔ قَالَ اَوَلَمۡ تُؤۡمِنۡ ؕ قَالَ بَلٰی: اس سوال و جواب میں لوگوں کا وہم ختم کرنا مقصود ہے یعنی اگر کوئی سوال کرے کہ ابراہیم علیہ السلام کا یہ سوال تو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بعث بعد الموت میں شک کرتے تھے؟ تو جواب کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود ان سے اَوَلَمۡ تُؤۡمِنۡ کے سبب سے دریافت کیا جس کا انہوں نے جواب دیا کہ بلیٰ کیوں نہیں اور اس جواب پر اللہ تعالیٰ راضی تھا ورنہ اس کا اللہ تعالیٰ رد کر دیتا۔ وَلٰكِنۡ لِّیَطۡمَىِٕنَّ قَلۡبِیۡ: طمانیت اصل میں سکون اور اعتدال کو کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ نماز کے ارکان میں تعدیل اور طمانیت ہے جبکہ دل کا اطمینان ان چیزوں میں فکر کرنا جن پر عقیدہ ہو وہ اس موقعہ میں زندہ کرنے کی کیفیت ہے اس میں طمانیت یہ ہے کہ علم ضروری علم استدلالی سے مل جائے تو شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ یہ قول زمخشری اور ابوحیان ؒ۔ سعید بن جبیرؒ کا قول ہے کہ زیادت یقین کو طمانیت کہا جاتا ہے۔ بقول قتادہؒ ایمان کے ساتھ مزید ایمان کا اضافہ مراد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو کتاب الایمان میں زیادت ایمان کیلئے بطور دلیل ذکر کیا ہے۔ امام ابن عاشور نے لکھا ہے کہ قلب سے مراد علم ہے یعنی ذکر محل کا ہے اور مراد حال ہے اور اطمینان سے مراد علم محسوس انشراح نفس ہے تو معلوم ہوا کہ انبیاء بھی علم کے مرتبوں میں اضافے کے محتاج ہیں۔ سوال: امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب التفسیر اور کتاب الایمان میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ ہم شک کرنے میں ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ حقدار ہیں آپ ﷺ نے فرمایا تھا۔ نَحۡنُ اَحَقُّ مِنۡ اِبۡرٰهٖمَ اِذۡ قَالَ رَبِّ اَرِنِیۡ (الخ)(صحیح بخاری کتاب التفسیر 4537، صحیح مسلم کتاب الایمان 238) اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہ کلمہ شک کی بنیاد پر کہا تھا جبکہ انبیاء تو قدرت الٰہی میں شک سے پاک ہیں؟ جواب: امام قرطبیؒ، ابن عطیہؒ اور صاحب اللبابؒ نے امام خطابی سے نقل کیا ہے کہ یہ تواضع کے طور پر ہے اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مراد اس میں تعلیق ہے لَوْ كَانَ هٰذَا الْقَوْلُ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ عَلٰى سَبِيْلِ الشَّكِّ فَنَحْنُ اَحَقُّ بِهٖ یعنی بفرض محال اگر ابراہیم علیہ السلام یہ جملہ بطور شک کہتے تو پھر ہم زیادہ شک کرنے کے حقدار ہوتے حالانکہ جب ہم شک نہیں کرتے تو ابراہیم علیہ السلام شک کرنے سے زیادہ پاک تھے۔ ابن جریرؒ اور طبریؒ نے اس کے متعلق شک کا جواز ذکر کیا ہے ان پر رد کرتے ہوئے ابن عطیہ نے ان کی اس بات کو مردود قرار دیا ہے۔ قرطبیؒ اور نیشاپوریؒ نے بھی اس کا سختی سے رد کیا ہے۔

قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ : عملی اور محسوسی طریقہ ہے جو آنکھوں کے دیکھنے اور ہاتھوں کے چھو لینے سے کسی بھی چیز کے متعلق کمال علم حاصل ہونے کا ذریعہ ہے۔ اَرْبَعَةً اللہ تعالیٰ نے تعداد کو متعین کیا ہے مگر پرندوں کی تخصیص کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس لئے اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کے مختلف اقوال ہیں۔ امام مجاہد اور عطاء رحمہم اللہ کا قول ہے کہ پرندوں سے مراد (۱) مور (۲) مرغا (۳) کبوتر (۴) چیل جبکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول میں کبوتر کی جگہ گدھ کا ذکر ہے۔ سوال: ایک ہی پرندے کا حکم کیوں نہیں دیا؟ جواب: ابراہیم علیہ السلام کے سوال میں مَوْتٰی جمع کا ذکر ہے تو جواب میں بھی جمع ہونا چاہیے تھا۔ جواب ۲: یہاں پر مختلف اجزاء کو ملانا اور پھر زندہ کرنا مقصود ہے جو کہ ایک ہی پرندے سے نہیں ہو سکتا۔ سوال: پرندوں کی تعیین میں کیا حکمت ہے؟۔ جواب ۱: پرندے بلندیوں پر اڑ کر سفر کرتے ہیں جبکہ ابراہیم علیہ السلام بھی ملکوت تک رسائی حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ جواب ۲: اس میں اشارہ ہے کہ اڑنے سے بھی کوئی ذی روح موت سے نہیں بچ سکتا ہے۔ سوال: چار پرندوں کے تعیین کی کیا وجہ اور حکمت تھی؟ جواب ۱: انسان کے بدن میں چار عناصر کی طرف اشارہ ہے۔ جواب ۲: پرندوں کی صفات چار میں منحصر ہیں۔ (۱) زینت خوبصورتی یہ مور میں ہے (۲) شدت شہوت یہ مرغے میں ہے (کھانے میں حرص یہ چیل یا گدھ میں ہے۔ (۴) بہت غفلت یہ کبوتر میں ہے۔ لہٰذا ہر صفت سے ایک ایک جمع کی ہے اور ان صفات میں پرندوں کے ساتھ انسان بھی مشابہت رکھتا ہیں۔ تنبیہ: ہر نبی کو بعض معجزات اللہ تعالیٰ نے عطاء کر دیئے تھے جن سے اس نبی کی خصوصیت ثابت ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے بہت سارے رازوں اور حکمتوں کو ہم نہیں جانتے۔ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ : امام ابوحیانؒ اور قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما مجاہد ضحاکؒ ابن اسحاقؒ کے نزدیک اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ان کو ٹکڑے ٹکڑے کرو۔ ابوقتادہ کا قول ہے کہ اس کو الگ الگ کرو یہ بھی پہلے معنیٰ کے موافق ہے۔ بقول عطاءؒ اپنے ساتھ مائل کرو امام کسائی کا بھی یہ قول ہے یعنی عادی بنا لینا۔ سدھا لینا سابقہ معانوں میں اِلَيْكَ خُذْ کے ساتھ متعلق ہے اور آخری معنیٰ میں صُرْهُنَّ سے متعلق ہے۔ اس میں مشہور دو قراءتیں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

[illegible] ساتھ۔ امام فراء کا قول ہے کہ ص کا پیش پڑھا جائے تو ٹکڑے کرنا اور مائل [illegible] ہیں۔ [illegible] سے ٹکڑے کرنے کا معنی راجح اور بہتر ہے ایک وجہ تو یہ ہے کہ کلام میں مقدر [illegible] مائل کرنے کے معنی میں قطعھن عبارت مقدر ماننی پڑے گی۔ اور کلام میں [illegible] ہے۔ ترجیح کی مزید صورتیں تجزیہ میں بیان ہونگی۔ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا [illegible] چیز کے ٹکڑے کو جزء کہا جاتا ہے (تجزی) ٹکڑا کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ بھی واضح ثبوت [illegible] كُلِّ جَبَلٍ: امام مجاہد اور ضحاک کے نزدیک اس سے مراد بحسب الامکان ہے یعنی [illegible] قول ہے کہ چاروں اطراف کے پہاڑ مراد ہیں۔ اس کو استغراق عرفی کہا جاتا ہے۔ [illegible] کُلّ بھی استغراق عرفی کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ پہاڑوں پر رکھنے میں ایک مقصد تو یہ ہے کہ پرندے اکثر [illegible] ہیں۔ [illegible] یہ ہے کہ پہاڑوں میں کسی چیز کو تلاش کرنا مشکل کام ہے مگر قدرت الٰہی کیلئے کوئی مشکل [illegible] ثُمَّ ادْعُهُنَّ [illegible] سے مراد ندا، آواز اور بلانا ہے۔ یہ پکار عبادت کی صورت میں نہیں ہے اس لیے کہ یہاں انہیں [illegible] نے انہیں پکارا گیا۔ بہت ساری آیتوں اور احادیث میں ہے کہ بطور عبادت پکارنا سوائے اللہ تعالیٰ کے [illegible] اللہ تعالیٰ [illegible] کرنے کا حکم نہیں دیتا۔ جس نے اس لفظ سے یہ معنی مرادلیا ہے تو اس نے اللہ تعالیٰ کی [illegible] معنوی کی ہے۔ مرنے اور ٹکڑے کرنے کے بعد آواز دینے اور ان کے زندہ ہونے اور اڑ کر آنے میں اللہ تعالیٰ کی [illegible] قدرتیں [illegible] رونما ہوئی ہیں اس میں ابراہیم علیہ السلام کا معجزہ بھی ہے کہ انکی آواز سے پرندے زندہ [illegible]۔ يَأْتِيْنَكَ سَعْيًا یہاں مصدر اور اسم فاعل کے معنی میں حال بن رہا ہے۔ یعنی سَاعِيَاتٍ، دوڑنے [illegible] لفظ إتیان اور سعی زمین پر چلنے کیلئے اکثر مستعمل ہے یعنی ایسے طریقے سے ان کا آنا جو ان کی عادت کے خلاف [illegible] یعنی ان کی عادت تو اڑنا ہے لیکن اس کے برخلاف وہ چل کر آ گئے۔ یہ بھی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ تفسیر کی روایات میں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے ان کو پکڑ کر ذبح کیا پھر ان کے گوشت ہڈیوں پروں کو باہم خلط ملط کیا پھر قریب پہاڑوں پر تقسیم کر کے رکھ دیا پھر ہر ایک کو باواز بلند پکارا ہر ایک کی ہڈی پھر گوشت جدا ہو کر ایک ہی جسم میں جڑ کر پرندہ تیار ہوا اور دوڑ کر ابراہیم علیہ السلام کے پاس حاضر ہوا۔ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ: اللہ تعالیٰ کی صفت عزیز سے اس کا قادر مطلق اور غالب ہونا یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے یعنی ایسا قابل تعجب خلاف عادت عقل سے ماوراء کام

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ان کی غالب قدرت کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے لہٰذا کسی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ اس سے انکار کرے۔ حَكِيمٌ: اس میں اشارہ ہے کہ اس واقعہ میں اللہ نے بہت سی حکمتیں سمجھائی ہیں جن میں سے بعض کو ہم نے بیان کیا ہے۔

فائدہ: اس میں اشارہ ہے کہ روز قیامت اللہ تعالیٰ تمام انسانوں اور جنوں کو دوبارہ پیدا کرے گے ہر ایک مر کر مٹی کے ساتھ مٹی ہو کر ختم ہو جائے گا یا ہوا وں میں اڑ کر ذرات کی شکل میں دیگر چیزوں کے ساتھ خلط ملط ہو جائے گا تو قادر مطلق پھر بھی ہر شخص اجزاء کو آپس میں جوڑ کر اس کو زندہ کر کے میدان حشر کی طرف دوڑتا ہوا لے آئے گا۔

تنبیہ: اس آیت میں فَصُرْهُنَّ میں بہت معنے ذکر کیئے گئے ہیں جن میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔

پہلا قول: ابو مسلم اصفہانی اور دور حاضر کے منکرین حدیث کا ہے جن کے قول کا خلاصہ یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے پالے ہوئے پرندوں کو آواز دی تو سدھائے ہونے کی وجہ سے حاضر ہوئے جو کہ پرندوں کے سدھانے والوں کا طریقہ ہے کہ جب ان پرندوں کو بلاتے ہیں تو وہ قریب آجاتے ہیں۔ تنبیہ: اس آیت میں "فَصُرْهُنَّ" کے مختلف معانی ذکر ہوئے ہیں اور اس میں مفسرین کے تین اقوال ہیں۔ پہلا قول: ابو مسلم اصفہانی اور دور حاضر کے منکرین حدیث کا ہے انکا قول یہ ہے "صُرْهُنَّ" کا معنی اپنے ساتھ مائل اور عادی کرنے کا ہے یعنی جیسے پرندوں کے ساتھ کھیلنے والوں کا طریقہ ہوتا ہے کہ ان کو اپنے ساتھ عادی بنا لیتے ہیں اور جب ان کو بلاتے ہیں تو وہ بلانے والوں کی آواز پر فوری دوڑتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس سوائے اس کے اور کوئی دلیل نہیں ہے صرف "صُرْهُنَّ" کا معنی مائل کرتے ہیں یعنی ابراہیم علیہ السلام نے مائل اور عادی کئے پرندوں کو آواز دی تو وہ اس کے پاس آگئے۔ دوسرا قول: یہ ہے کہ "صُرْهُنَّ" ٹکڑے کے معنی میں ہو تو "إِلَيْكَ" لفظ یا بے فائدہ ہے یا پھر کلام میں تقدیم وتاخیر ماننا لازم ہوگا۔ تیسرا قول: یہ ہے کہ "هُنَّ" کی ضمیر زندہ پرندوں کی طرف راجع کرنی ہوگی کیونکہ اجزاء کی طرف راجع نہیں ہو سکتی۔ منکرین حدیث اور معتزلہ کا یہ قول انکار معجزات پر مبنی ہے۔ ان کے دلائل کے جوابات بالترتیب درج ذیل ہیں۔ (1) "صُرْهُنَّ" کی تفسیر سدھانے، مائل کرنے کے بالکل نہیں ہے یہ قول شاذ اور ضعیف ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ (2) لفظ "إِلَيْكَ" "خُذْ" کے متعلق ہے کلام عرب اور قرآن مجید میں بہت سے مقامات میں تقدیم وتاخیر ثابت ہے۔ (3) اجزاء کی طرف "هُنَّ" کی ضمیر راجع کرنے پر کوئی اعتراض اور مانع نہیں ہے۔ اس قول پر جہت سے اعتراضات ہیں۔ پہلا اعتراض: یہ ہے کہ یہ قول انکار معجزات پر مبنی ہے جو کہ کفر کی طرف لے جانے والا ہے۔ دوسرا اعتراض: یہ ہے کہ اس عمل پر ابراہیم علیہ السلام کیلئے کوئی خصوصیت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ثابت نہیں ہوتی کیونکہ اس طرح تمام بٹیر باز اور پرندوں کو پالنے والے دیگر تمام لوگ کر سکتے ہیں **تیسرا اعتراض**: یہ ہے کہ جزء اور جزئی میں فرق ہے جزء کل کے ٹکڑے کو کہتے ہیں اور جزئی مستقل فرد کو کہا جاتا ہے۔ یہاں پر لفظ جزء واضح دلیل ہے کہ ان کو ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا۔ چوتھا اعتراض: یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے سوال پرندوں کو سدھانے یا مائل کرنے کا نہیں بلکہ حیات اور ممات کا کیا تھا تو معتزلہ کے معنی میں اس کا جواب تو ہے نہیں اور یہ مقصد قرآن مجید کے بالکل خلاف ہے۔

چوتھا قول: یہ ہے کہ بعض مفسرین اہل سنت نے کہا ہے کہ "صُرْهُنَّ" کا معنی مائل کرنے کا ہے البتہ "قَطِّعْهُنَّ" اس میں مقدر ہے جس کی دلیل لفظ "جُزْءًا" ہے۔ اس قول میں معجزات کا انکار نہیں ہے لیکن یہ سابقہ قول میں شک پیدا کرنے کا ذریعہ بنتا ہے یہی وجہ ہے کہ منکرین حدیث جب اس ترجمے کو سنتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں کہ یہ ہماری تفسیر اور معانی کی تائید ہے۔ اس پر میرا تجربہ ہو چکا ہے کہ ایسے معنی کرنے والوں کو وہ داد دیتے ہیں۔ جبکہ شریعت نے شک پیدا کرنے والے الفاظ اور معنوں سے منع کیا ہے جیسا کہ تفسیر "رَاعِنَا" میں گزر چکا ہے۔ نیز بغیر ضرورت اس میں "قَطِّعْهُنَّ" کی عبارت بلا ضرورت مقدر کرنی پڑتی ہے اور یہ مشہور تفسیر کے بھی خلاف ہے جو بعد میں مذکور ہے۔

پانچواں قول: اکثر اہل سنت کا ہے کہ "صُرْهُنَّ" کا معنی ٹکڑے کرنے کے ہیں یہ تفسیر راجح ہے ترجیح کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں۔ (۱) امام صاحب اللباب متوفی 880ھ کا قول ہے فرماتے ہیں "أَجْمَعَ الْمُفَسِّرُوْنَ عَلَى أَنَّ الْمُرَادَ مِنَ الْآيَةِ الْكَرِيْمَةِ قَطِّعْهُنَّ" (جلد:4، صفحہ:373) (2) امام نیشاپوری متوفی 728ھ کا قول ہے۔ "وَزُيِّفَ قَوْلُ أَبِيْ مُسْلِمٍ بِأَنَّهُ خِلَافُ إِجْمَاعِ الْمُفَسِّرِيْنَ" (جلد:2، صفحہ:30) امام ابو حیان متوفی کا قول ہے کہ "وَاحْتَجَّ لِلْقَوْلِ الْأَوَّلِ بِإِجْمَاعِ الْمُفَسِّرِيْنَ الَّذِيْنَ كَانُوْا قَبْلُ" (ابو مسلم، جلد2، صفحہ:649،) (4) امام رازی کا قول ہے۔ "أَجْمَعَ أَهْلُ التَّفْسِيْرِ عَلَى الْمُرَادِ بِالْآيَةِ قَطِّعْهُنَّ غَيْرَ أَبِيْ مُسْلِمٍ" (جلد:7، صفحہ:41،) (5) امام آلوسی متوفی 1270ھ کا قول ہے۔ "وَلَا يَخْفَى أَنَّ هٰذَا خِلَافُ إِجْمَاعِ الْمُسْلِمِيْنَ وَضَرْبٌ مِنَ الْهَذَيَانِ لَا يَرْكَنُ إِلَيْهِ أَرْبَابُ الدِّيْنِ ...... یعنی قول ابی مسلم" (جلد:3، صفحہ:30،) مذکورہ اقوال کا بالترتیب ترجمہ پیش خدمت ہے۔ (1) مفسرین کا اجماع ہے کہ آیت میں "قَطِّعْهُنَّ" معنی ہے۔ (2) ابو مسلم کا قول ضعیف مانا گیا ہے اس لئے کہ مفسرین کے اجماع کے خلاف ہے۔ (3) ابو مسلم سے پہلے مفسرین کا اجماع ہے پہلے والے قول پر (4) تمام مفسرین نے ابو مسلم کے علاوہ "قَطِّعْهُنَّ" پر اجماع کیا ہے۔ (5) یہ بات کسی پر مخفی نہ ہو کہ ابو مسلم کا قول مسلمانوں کے اجماع کے خلاف ہے دیندار لوگ اس کو کوئی حیثیت نہیں دیتے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۔سوال: اس میں صرف ابو مسلم کے قول کا رد ہے اور دوسرے قول کا رد نہیں ہے۔؟ جواب ۱: پہلے قول اور چوتھے قول میں یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ "قَطِّعْهُنَّ" کا معنی اجماع سے ثابت ہے لہٰذا "صُرْهُنَّ" کا معنی سدھانا کرنا اجماع کے خلاف ہے۔ جواب ۲: یہ بات گزر چکی کہ دوسرا قول وہم پیدا کرتا ہے اور منکرین حدیث ابو مسلم اور معتزلہ کے قول کے مشابہ ہے لہٰذا اس کو رد کیا ہے۔ ترجیح کا دوسرا سبب یہ ہے کہ امام ابن کثیر نے دو معانی ذکر کیے ہیں "قَطِّعْهُنَّ" "اَوْثِقْهُنَّ" اور "اَمِلْهُنَّ" کے معنی کی طرف بالکل التفات نہیں کیا ہے۔ جبکہ ابن کثیر متداول تفاسیر میں سب سے صحیح اور راجح تفسیر ہے۔ تیسرا سبب امام قرطبی نے "اَمِلْهُنَّ" صیغہ قِیْلَ کے ساتھ ذکر کیا ہے اور کسی کی طرف اس قول کی نسبت بھی نہیں کی ہے جبکہ "قَطِّعْهُنَّ" کی نسبت بعض صحابہ کرام و تابعین عظام کی طرف کی ہے۔ چوتھا سبب ابن جریر متوفی 310ھ کی تفصیل ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کوفے کے بعض نحویوں نے کہا ہے کہ کلام عرب میں "صُرْهُنَّ" "قَطِّعْهُنَّ" کے معنی میں مستعمل نہیں ہے الا یہ کہ "ص" مکسور پڑھا جائے تو قطع کے معنی میں ہے جبکہ بصری نحویوں نے فرمایا ہے کہ "ص" کی زیر اور پیش دونوں تقطیع کے معنی میں ہے۔ پھر ابن جریر نے فرمایا ہے کہ بنسبت کوفیوں کے بصریوں کا قول زیادہ حق کے قریب ہے کیونکہ مفسرین کا اجماع ہے کہ لفظ "صُرْهُنَّ" ان دو ہی معنوں میں ہے یعنی "قَطِّعْهُنَّ" اور "اَضْمِمْهُنَّ" لہٰذا اس اجماع میں کوفیوں کے قول کی غلطی اور بصریوں کے قول کی صحت کی دلیل ہے پھر انہوں نے سولہ سندوں کے ساتھ "قَطِّعْهُنَّ" "شَقِّقْهُنَّ" "فَرِّقْهُنَّ" کا معنی نقل کیا ہے اور دیگر مرادف معنی ذکر کیے ہیں پھر آخر میں فیصلہ کیا ہے کہ اس میں واضح دلیل ہے کہ وہ معنی جو ہم نے ذکر کئے ہیں وہ صحیح ہیں یعنی "قَطِّعْهُنَّ" اور اس کا مخالف قول فاسد ہے پھر مندرجہ ذیل الفاظ کیلئے تین اسانید نقل کی ہیں۔ "اَوْثِقْهُنَّ" "اِضْمِمْهُنَّ" "اَجْمِعْهُنَّ" اور "اَمِلْهُنَّ" کیلئے مسند اور غیر مسند کوئی قول ذکر نہیں کیا ہے۔ تفسیر ابن جریر صفحہ: 54 تا 57 جتنی اسانید ہیں ان میں کلام ہے مگر کثرت طرق سے حدیث درجہ حسن تک پہنچ جاتی ہے یعنی اصول حدیث میں یہ قاعدہ ہے اسی طرح امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی "صُرْهُنَّ" کا معنی "قَطِّعْهُنَّ" ذکر کیا ہے (صحیح بخاری کتاب التفسیر) علامہ عینی نے لکھا ہے کہ یہ معنی ابن عباس رضی اللہ عنہما عکرمہ، سعید بن جبیر، ابو مالک، حسن بصری اور سدی وغیرہ سے منقول ہے۔ (عمدۃ القاری) اور "اَمِلْهُنَّ" کو ضعیف صیغہ قیل سے نقل کیا ہے۔ علامہ سیوطی نے درمنثور جلد: 2، صفحہ: 35، میں بقول ابن عباس، عکرمہ سعید بن منصور، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم اور شعب الایمان للبیہقی، سعید بن جبیر، قتادہ، مذکورہ حوالوں میں مختلف اسانید ہیں ان میں "صُرْهُنَّ" کا معنی "قَطِّعْهُنَّ" کیا ہے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور "آملمیّ" کے متعلق کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔ مذکورہ سندوں میں کذاب قسم کا راوی بھی ہے مگر بہت سی اسانید کذب سے خالی ہیں۔ بعض احادیث ان میں ضعیف ہیں مگر حسن کا درجہ ان میں پیدا ہوتا ہے نیز حدیث پر ضعف کا الزام لگا کر یا بہانہ بنا کر اس تفسیر کا انکار کرنا یا مرجوح قرار دینا یہ جہل ہے اور انکار معجزات کی طرف میلان ہے۔ فائدہ ۱: اس تفصیل کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ منکرین حدیث کی تحریف قرآن لوگوں پر عیاں اور ظاہر ہو۔ فائدہ ۲: امام آلوسی اور تھانوی نے لکھا ہے کہ پرندوں کے ٹکڑوں کو جمع کرنا ان کو آواز دینا اور ان کو زندہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ برزخی زندگی کیلئے بُنْیَہ یعنی سالم محفوظ بدن لازم نہیں ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ ان کو قبر میں عذاب یا راحت دینے پر قادر ہے خواہ ان کے ذرات جہاں بھی ہوں البتہ ان میں روح کی مستقل واپسی شرط نہیں ہے۔ جبکہ حیات اخروی میں ان ذرات کو جمع کر کے ثابت سلامت بدن دے گا اس میں روح ڈال دے گا اور حیات حقیقیہ اخرویہ عطاء کرے گا۔ "اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ الْھُدٰی وَالتُّقٰی وَالْعَفَافَ وَالْغِنٰی"

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ "جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کی مثال اس دانے کی ہے جس میں سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں اللہ تعالیٰ بڑھا چڑھا کر دیتا ہے جس کو وہ چاہے اور اللہ تعالیٰ کشادگی اور علم والا ہے" (261)

تفسیر 261: یہ اس حصہ کا دوسرا باب ہے جو آیت نمبر 274 تک جاری ہوگا۔ اس میں انفاق فی سبیل اللہ کیلئے چار مثالیں ذکر کی گئی ہیں۔ پہلی اور تیسری مثال اللہ تعالیٰ کی راہ میں شرعی طریقے پر خرچ کرنے والوں کیلئے ہے۔ پھر پہلی مثال ان لوگوں کیلئے ہے جو دعوت اور جہاد میں مال صرف کرتے ہیں اور تیسری مثال ان لوگوں کیلئے ہے جو دعوت اور جہاد کے ماسوا اخلاص کے ساتھ مال صحیح مصارف میں خرچ کرتے ہیں تاکہ ان کے دل مضبوط ہوں دوسری اور چوتھی مثال ان لوگوں کیلئے ہے جو غیر شرعی طریقے پر مال خرچ کرتے ہیں۔ دوسری مثال میں ان لوگوں کا ذکر ہے کہ مال تو صحیح مصارف میں خرچ کرتے ہیں مگر ریاء اور جتلانے تکلیف دینے سے اس کو ضائع کر دیتے ہیں۔ چوتھی مثال ان لوگوں کی ہے کہ غیر شرعی مصارف میں مال صرف کرتے ہیں مزید یہ کہ ظلم، فسق و فجور، بدعات اور رسموں میں بھی پیش پیش ہیں۔ مال خرچ کرنے کیلئے پانچ شرطیں ذکر ہوں گی۔ دو شرطیں سلبی ہیں یعنی احسان نہیں جتلائے گا اور تکلیف بھی نہیں دے گا اور تین صفات ثبوتی ہیں یعنی (۱) اس میں صرف

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

رضائے الٰہی ہو (۲) تَثْبِيتًا الْقَلْبِ دل کی مضبوطی کیلئے ہو (۳) مال پاک ہو پھر چھ مسائل اس کے متعلق ہیں (۱) شیطان کے وسوسوں کو ختم کرنا آیت: 268، (۲) مال خرچ کرنے کی اقسام آیت: 270، پھر اس کے ادا کرنے کا طریقہ آیت: 271، میں ذکر ہے۔ وہم کو ختم کرنا اور اخلاص سے خرچ کرنے کا فائدہ آیت: 272، میں ذکر ہے اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال صرف کرنا آیت: 273، میں ہے مال خرچ کرنے میں تعمیم یعنی عام اوقات اور احوال میں خرچ کرنا آیت: 274، میں ہے۔ سابقہ آیت سے ربط ۱: جب سابقہ واقعات میں حیات قیامت یعنی اخروی زندگی ثابت ہوگئی تو اب اس کیلئے زاد راہ مال خرچ کرنے کا ذکر ہے۔ ربط ۲: جب بعد الموت حیات کو خرقِ عادت چیزوں سے ثابت کیا تو اب زمین سے پودوں کو اگانے کی مثال سے دوسری حیات کو ثابت کیا جاتا ہے۔ ربط ۳: جب آیت 254، میں مال خرچ کرنے کا حکم اور درمیان میں بطور جملہ معترضہ عقیدہ توحید اور حیات اُخروی کا ذکر کیا گیا تو اب اس انفاق کی تفصیل ذکر ہوگی۔ "مَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ" سوال: مال خرچ کرنے والوں کی مثال دانے کے ساتھ دینا واضح نہیں؟

جواب: عبارت میں مقدر الفاظ ہیں یعنی "مَثَلُ صَدَقَاتِ الَّذِينَ" یا "مَثَلُ كَبَاذِرِ حَبَّةٍ" مثال زمیندار (کاشت) کرنے والے کی ہے۔ لفظ مثل اور انفاق کی تفسیر ابتداء میں گزر چکی ہے۔ "فِي سَبِيلِ اللَّهِ" سے مراد قتال، جہاد اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے ہے قرآن وسنت کی طرف دعوت اور درس وتدریس کے مراکز کی تعمیر اور دروس وانتظام دروس اس میں داخل ہیں۔ کیونکہ ان سب سے اعلاء کلمۃ اللہ دین کی بلندی ہوتی ہے۔ اس انفاق میں عمومیت ہے یعنی اپنے اوپر اور غیر پر خرچ کرنا سب مراد ہیں تاکہ بدن میں قوت طاقت آنے سے دعوت اور جہاد کا کام کرسکیں۔ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنبَتَتْ حَبَّةٍ اس دانے کو کہا جاتا ہے جس میں انسانوں اور حیوانوں کی روزی کا بندوبست اور گزران ہو۔ یعنی چاول، گندم، مکئی، جو، دالیں سب اس میں داخل ہیں۔ "أَنبَتَتْ" میں دانے کی طرف اسناد مجازی طور پر ہے ورنہ اصل فاعل اگانے والا تو ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ دانے میں یہ صفت اس وقت پیدا ہوگی جب اس کو نرم زمین میں کاشت کیا جائے مناسب کھاد دی جائے اوقات کا لحاظ کرتے ہوئے پانی کا بندوبست کیا جائے اور حیوانوں اور دیگر جوانب سے حفاظت کا انتظام ہو تو تب فصل میں ترقی آئے گی۔ "سَبْعَ سَنَابِلَ" یعنی ایک دانے میں سے ایک کونپل نکلے اور پھر اس ایک کونپل میں سے سات بالیاں شاخیں بن جائیں ہر ایک میں سو دانے ہوں۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ اس طرح پودے گندم بعض علاقوں میں یا مکئی، جاروس، باجرہ وغیرہ ہیں اگر ایسے پودے نہ بھی ہوں تو بطور مثال ذہن میں ہونا کافی ہے۔ لفظ سُنابل جمع ہے یہاں پر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جمع قلت کی جگہ جمع کثرت ذکر کیا ہے تو وجہ یہ ہے کہ صرف سات مراد نہیں ہیں بلکہ کثرت مراد ہے۔ امام ابوحیانؒ کا قول ہے کہ سَبْعٌ دہائیوں میں کثرت کا عدد ہے اور سَبْعُوْنَ سینکڑوں میں کثرت کا عدد ہے اور سبع سینکڑوں ہزار میں کثرت کا عدد ہے اور عرب کے محاوروں میں بھی اسی طرح مستعمل ہے۔ قرآن مجید میں ''سَبْعَ سُنْبُلَاتٍ، سَبْعَ بَقَرَاتٍ'' ''سَبْعَ سَمٰوٰتٍ'' ''سَبْعَ سِنِيْنَ'' ''سَبْعِيْنَ مَرَّةً'' ''سَبْعُوْنَ ذِرَاعاً'' حدیث میں ''سَبْعَ مِائَةِ ضِعْفٍ'' ''سَبْعَ مِائَةِ اَلْفٍ'' مذکور ہیں۔ ابوحیان نے لکھا ہے کہ ''سَبْعَ'' اصل میں جمع منتہیٰ ہے لہٰذا یہ کثرت پر دلیل ہے۔ ''فِيْ كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ'' یہ جملہ ''سَبْعَ سَنَابِلَ'' کیلئے صفت ہے۔ امام ابن عطیہ کا قول ہے گندم کی اکثر بالی میں سو دانے ہوتے ہیں جبکہ مکئی کے سٹے میں تو اس سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ یہاں پر بھی تعیین تعداد مقصد نہیں ہے بلکہ تکثیر یعنی کثرت مراد ہے۔ ''وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ'' اس جملہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ماقبل میں کثرت مقصد ہے اس زیادت سے سات سو یا اس سے زیادہ مراد ہے جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ یہ جملہ مثال کے ساتھ متعلق ہے یعنی بعض بالیوں میں سو سے بھی زیادہ دانے ہوتے ہیں یا اس کا تعلق ممثل کے ساتھ ہے کہ کسی کو سات سو تو کسی کو اس سے بھی زیادہ مگر اس کیلئے تعداد متعین نہیں ہے (490000) چالیس لاکھ یا کم زیادہ بلکہ وہ بغیر حساب اجر و ثواب ہے۔ ''وَاللّٰهُ وَاسِعٌ'' اس کی تفسیر سابقہ کلام میں گزر گئی ہے۔ یہاں مراد ہے وسیع قدرت والا اور مطلب یہ ہے کہ وسیع اجر دینے والا ہے کہ اس کے پاس بغیر حساب کا بدلہ ہے۔ ''عَلِيْمٌ'' خرچ کرنے والوں کی نیتوں اور درجات کا علم رکھتا ہے۔ فائدہ ۱: امام قرطبی کا قول ہے کہ زمین کی کاشتکاری میں بہت فائدے ہیں کیونکہ اس میں فائدہ دوسروں تک بھی پہنچتا ہے مثلاً انسانوں چرند، پرندوں تک البتہ زمیندار کو اس طرح مگن اور مشغول نہیں ہونا چاہیے جو نماز، جہاد اور دیگر دینی کاموں سے یعنی دعوت وغیرہ سے غافل ہو جائے۔ فائدہ ۲: اس مثال کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ ایک ہی دانہ اچھی زرخیز زمین میں بویا جائے پھر کاشتکار اس کے پانی کا بندوبست وقت کے مطابق کرتا ہے اور ضرر والی چیزوں سے بچاؤ کا انتظام کرتا ہے پھر اس دانے سے جو سات سو دانے پیدا ہوئے اس کو ایک اور قابل نرم زرخیز زمین میں بویا جائے یعنی زراعت کی جائے پھر اس کو اور قابل فصل فراخ زمین میں بویا جائے اور اسی طرح پانی اور حفاظت کا انتظام کرتا ہے تو اس سے چار لاکھ نوے ہزار (490000) دانے پیدا ہوں پھر اس کو ایک مزید ایک وسیع فراخ کاشت کاری کے قابل زمین میں زمینداری کر کے بوئے گا تو کروڑوں دانے کھیتوں میں فصلوں کی شکل میں نظر آئیں گے جن سے انسانوں، حیوانوں، چرند اور پرندوں میں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے ہر ایک کو فائدہ پہنچے گا۔ کھیتیاں سرسبز وشاداب نظر آئیں گی ہر طرف بہار ہی بہار کا سماں ہوگا اور لوگوں کو خوراک کی فراوانی ہوگی یاد رہے ان پہلے والے دانوں کا تعلق بالیوں کے ساتھ ہے اور بالیوں کا تعلق پودے کے ساتھ ہے اور اس کے مساوی مثال سورۃ فتح آیت: 29، میں ہے یعنی "كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ" اس مثال کی تطبیق اس طرح سے ہے کہ کسی مجاہد یا داعی حق کے تھوڑے سے مال کے ذریعے سے مدد کی جائے یعنی اس کی روزی کا بندوبست اور عقیدے کی اصلاح اور عملی اخلاقی تربیت کی جائے۔ قرآن وسنت کی تعلیم سے اس کی ذہنی سیرابی کی جائے پھر وہ ایک شخص حسبِ مزید افراد کی تربیت اُس منہج پر کرتا ہے اور اسی تربیت سے ہر ایک داعی آگے دعوت وجہاد کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا رہتا ہے یہاں تک کہ لاکھوں اور ہزاروں داعیان کتاب وسنت اور مجاہدین فی سبیل اللہ پیدا ہوتے ہیں اور توحید وسنت کے بڑے بڑے مراکز آباد ہوتے ہیں ہر طرف توحید وسنت کی صدائیں گونج اُٹھتی ہیں لیکن شخص اول سب سے زیادہ اجر کا مستحق ہے کیونکہ اس نے تھوڑی سی پونجی (مال) سے اس کی بنیاد ڈالی ہے۔ حدیث سے بھی اس کی تائید ملتی ہے کہ "مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا" (صحیح مسلم کتاب الامارۃ حدیث ۱۸۹۳) جس نے دین کے کسی نیک عمل کی بنیاد رکھی اس کو اس کا اجر ملے گا اور ان لوگوں کا اجر بھی جو اس اچھے عمل کو اپنائیں گے جبکہ ان عمل کرنے والوں کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہوگی اس کو اجر غیر ممنون کہا گیا ہے اور یہ مقصد "وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَن يَشَاءُ" میں ذکر ہے اس عنوان کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے جو کتاب التوحید میں امام بخاری رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے۔ کہ جس شخص نے کھجور کے مقدار صدقہ اپنے حلال کمائی میں سے دیا تو اللہ تعالیٰ اس صدقہ کو قبول فرمالیتا ہے جیسا کہ تم (فلو) اونٹنی کے بچے کو پالتے ہو یہاں تک کہ وہ نیکی پہاڑ جتنی ہو جاتی ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الزکاۃ حدیث 1410، صحیح مسلم حدیث 1014) امام ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ اس مثال میں اشارہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ زرخیز زمین کی فصل کو زمیندار کاشت کیلئے بڑھاتا ہے تو اسی طرح اس صدقہ کرنے والے کے لئے صدقہ بڑھاتا ہے۔

الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى ۙ لَّهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٦٢﴾ "جو لوگ اپنا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر اس کے بعد نہ تو احسان جتلاتے ہیں اور نہ ایذا دیتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے ان پر نہ تو کچھ خوف ہے نہ وہ اداس ہونگے" (262)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تفسیر 262: اس آیت میں دو شرطوں کا ذکر ہے جو سلبی شرطیں ہیں جو قبولیت عمل اور اضافہ اجر کیلئے ہیں اور یہ دونوں ساتھ آیت میں مذکور ہیں یعنی "مَنّ" اور "أَذًى" یعنی تکلیف دینے اور صدقہ جتلانے سے اجتناب کرنا "ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى" زمخشری نے لکھا ہے کہ "ثُمَّ" یہاں زمانہ کی تراخی کیلئے نہیں بلکہ انفاق میں فرق کیلئے اور جتلانے تکلیف دینے کیلئے ہے یعنی یہ دونوں کام عقل کے خلاف ہے۔ مفسر قاسمی نے لکھا ہے کہ یہ "ثُمَّ" اس بات کی دلالت کیلئے ہوتا ہے کہ بعد والا عمل پہلے والے عمل کے بعد لازم ہے معنی یہ ہے کہ اس شخص کا یہ معمول رہتا ہے صرف ایک دو بار نہیں اور "إِتْبَاعٌ" لفظ سے بھی پتا چلتا ہے کہ یہ دوام کیلئے ہے اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ صدقہ فی سبیل اللہ قبولیت کی طرف رواں دواں تھا مگر "مَنّ" اور "أَذًى" نے اس کا راستہ بند کیا۔ "مَنّ" جتلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ نے کسی کے ساتھ نیکی کی یعنی احسان کیا پھر اس کو کسی موقع پر احسان جتلاتے ہوئے کہے کہ میں نے آپ کے ساتھ فلاں فلاں نیکی اور احسان کیا ہے یا کسی اور سے تذکرہ کریں اور وہ اس تک پہنچائے۔ امام قرطبیؒ نے اس کو کبیرہ گناہ قرار دیا ہے۔ "أَذًى" یہ ہے کہ جس کو صدقہ دیا ہے اس سے کام لیتا رہتا ہے جیسے بعض تاجروں، وڈیروں اور زمینداروں کا طریقہ ہے کہ زکوۃ و صدقات دینے کے بعد ان سے کام کاج لیتے ہیں یا اس کے ساتھ کئے ہوئے احسان کو ایسے لوگوں سے ذکر کرتے ہیں کہ جن کا باخبر ہونا اس کو برا لگے۔ "لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ" دیگر نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ اجر کیلئے شرط یہ ہے کہ یہ مرتکب شرک و کفر نہ ہو۔ سوال: یہاں پر "فَا" ذکر نہیں کی حالانکہ موصول مبتداء معنی شرط کو متضمن ہوتا ہے جیسا کہ آیت 274، میں ہے؟ جواب: جہاں بیان ایسے لوگوں کا ہو جو خصوصی طور پر جزاء اور بدلے کے حقدار ہوں تو وہاں "فَا" نہیں لائی جاتی یعنی وہ لوگ ہی اجر و ثواب کے مستحق ہیں جو مال خرچ کرتے ہیں مگر اس شرط سے کہ "مَنّ" اور "أَذًى" نہیں کرتے نہ کہ وہ لوگ جو "مَنّ" و "أَذًى" کرتے ہیں۔ بعد والی آیت کے حصہ میں حصر مقصود نہیں ہے بلکہ حالات اور اوقات کا ذکر مقصود ہے اس لئے وہاں "فَا" ذکر کی جو صرف سبب پر دلالت کرتی ہے۔ "وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ" اس کا ایک معنی یہ ہے کہ ان کو اس بات کا کوئی خوف نہیں ہوگا کہ ان کا خرچ کیا ہوا مال ضائع ہوگا اور نہ ہی اس کے عدم وجود پر ان کو کوئی غم ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان پر آئندہ زمانے میں عذاب کا کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ ہی وہ سابقہ گزری ہوئی زندگی پر ندامت کریں گے۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾ "نرم بات کہنا اور معاف کر دینا اس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد ایذا رسانی ہو اور اللہ تعالیٰ بے نیاز اور بردبار ہے" (263)

تفسیر 263: اس آیت میں صدقہ دینے کے بعد ایذا رسانی کی قباحت ایک اور انداز سے مذکور ہے اور سائل کو جواب دینے کے آداب کا ذکر ہے۔ "قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ" اس قسم کی بات جس کو دل خوشی سے قبول کرے۔ مراد خوش اخلاقی سے سائل کو واپس کرنا ہے۔ بقول امام عطاء رحمہ اللہ اس سے مراد مسکین سے وعدہ ہے۔ بقول امام سمعانی رحمہ اللہ تھوڑا تھوڑا دیکر برکت کی دعاء کرنا ہے یا نہ دیتے ہوئے دعاء کرنا مراد ہے۔ "وَمَغْفِرَةٌ" اس سے مراد اس کی حاجت پر پردہ پوشی یا اگر سائل مانگتے وقت کچھ بد اخلاقی یا سختی کرے تو اس پر در گزر کر لینا یا مراد یہ ہے کہ "قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ" پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے مغفرت کی امید ہے۔ "قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ" چونکہ ہر اعتبار سے بہتر ہے اس لئے مغفرت پر اس کو مقدم کیا ہے کیونکہ "قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ" کمی پر دلالت کرتا ہے جبکہ "صَدَقَةٍ" میں تنوین کثرت مقدار پر دلیل ہے تو معنی یہ ہوا کہ زیادہ صدقہ جس کے بعد جتلانا یا تکلیف دینا ہو اس سے قول معروف بہتر ہے اگرچہ کم ہو۔ سوال: یہاں صرف "أَذًى" کو ذکر کیا گیا ہے "مَنٌّ" نہیں۔؟ جواب: اس کو اکتفا کہا جاتا ہے یعنی ایک چیز کو بیان کرنا اور دوسری چیز کو حذف کرنا لیکن وہ بیان کردہ چیز حذف کردہ چیز پر دلالت کرتی ہے یعنی یہاں پر "أَذًى" عام ہے جو "مَنٌّ" کیلئے مستلزم ہے یعنی "مَنٌّ" اس لئے بدترین کام ہے کہ اس سے ایذاء پیدا ہوتی ہے۔ "وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ" "غنی" میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے صدقات سے مستغنی بے پرواہ ہے۔ بندوں کو صدقات کا حکم حصول اجر و ثواب کیلئے ہے۔ اشارہ ہے کہ "مَنٌّ" اور "أَذًى" ایک قسم شرک کو مستلزم ہے اور جس عمل میں شرک کی آمیزش ہو اللہ تعالیٰ اس کو قبول نہیں کرتا اور اس سے بری ہے۔ "حَلِيْمٌ" جو لوگ "مَنٌّ" اور "أَذًى" کرتے ہیں ان کو فوری طور پر عذاب نہیں دیتا بلکہ ان کو مہلت دیتا ہے کہ توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٦٤﴾ "اے ایمان والوں اپنے صدقات کو تکلیف رسانی اور احسان جتانے سے ضائع مت کرو اس شخص کی مانند جو لوگوں کے دکھاوے کے لیے مال صرف کرتا ہے اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان نہیں لاتا ہے اس کی مثال اس پتھر جیسی ہے جس پر تھوڑی سے مٹی ہو پھر اس پر زوردار موسلا دار بارش ہو اور اسے صاف ستھرا چھوڑ دے ان کے کیئے ہوئے کسب میں کسی چیز پر ان کو (حاصل) کرنے کی قدرت نہ ہو اللہ تعالیٰ کافر قوم کو ہدایت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نہیں دیتا ہے"(264)

تفسیر 264: اس آیت میں "خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ " کیلئے علت اور "مَنّ" "وَأَذًى" سے منع کرنے میں تاکید کا ذکر ہے (1) "يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا" سے تاکیدی خطاب ہے کہ ایمان کا تقاضا ہے کہ "مَنّ" "وَأَذًى" سے اجتناب کیا جائے اس لیے کہ یہ دونوں ایمان کے منافی ہیں۔(2) "مَنّ" "وَأَذًى" سے صدقات کا باطل قرار پانے کی بھی تصریح ہے۔ (3) ریاکاری سے مثال دینا یہ بھی تاکید ہے (4) "صَفْوَانٍ" کے ساتھ مثال دینا۔ "لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ" عمل کا باطل ہونا اس طرح سے ہے کہ اگر وہ صدقہ فرض ہے اور اس کا اثر مرتب نہ ہو یعنی اجر ضائع ہو گیا ہو تو فریضہ اس کے ذمہ باقی ہے کیونکہ جب کسی عمل کا رکن ضائع ہو جائے تو اس کے سبب سے سارا عمل ضائع ہوگا اگر صدقہ نفلی ہے تو ثواب برباد ہو گیا کیونکہ اجر کیلئے شرعی رکاوٹ آگئی۔ یہاں پر صدقات لفظ عام ہے جس میں نفلی اور فرضی دونوں شامل ہیں لہٰذا باطل ہونے کا معنیٰ بھی عام ہے۔ امام سمعانی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ صدقہ میں "مَنّ" اس طرح ہے جس طرح نماز کیلئے بے وضوء ہونا۔ بقول امام قرطبی رحمہ اللہ آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ جس صدقہ میں "مَنّ" اور "أَذًى" ہوگا تو وہی صدقہ باطل ہوگا اس کے علاوہ اگر کسی صدقہ اور عمل میں "مَنّ" اور "أَذًى" نہیں ہے تو وہ سب باطل نہیں ہوں گے۔ جبکہ کفر و شرک سے تمام اعمال باطل ہوتے ہیں۔ عرب لوگ اپنے محاورہ میں ایسے صدقہ کو کالا ہاتھ کہتے ہیں جس کے بعد "مَنّ" "وَأَذًى" کیا جائے اور جو بغیر مانگے صدقہ دیا جائے اس کو سفید ہاتھ اور مانگنے کے بعد دیا جائے اس کو سبز ہاتھ سے موسوم کرتے ہیں۔ "لَا تُبْطِلُوا" عام ہے اور اس میں دو جہات ہیں۔(1) اخلاص سے خرچ کیا تھا مگر بعد میں "مَنّ" "وَأَذًى" کیا۔(۲) صدقہ دیتے وقت "مَنّ" اور "أَذًى" کرنا۔ "كَالَّذِي يُنفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ" یہاں پر مضاف مقدر ہے یعنی "كَإِبْطَالِ الَّذِي" "رِئَاءَ" "رَأَى" سے لیا گیا ہے جس میں اچھا عمل لوگوں کو دکھانا مقصود ہے تاکہ لوگ اس کی تعریف کریں یعنی ریاء کار انسان لوگوں سے تعریف کی صورت میں بدلہ چاہتا ہے۔ تشبیہ کی وجہ یہ ہے کہ ریاء کرنے والا رضائے الٰہی نہیں بلکہ لوگوں سے مدح سرائی کا طالب ہوتا ہے۔ اسی طرح فقیر مسکین کو صدقہ دینے کے بعد تکلیف اس لئے دیتا ہے کہ مقصد رضا الٰہی نہیں ہے۔ ہر دونوں صورتوں میں لوگوں کو دکھاتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے دین کا کام کر رہا ہوں اور میرا مقصد رضائے الٰہی ہے حالانکہ ریاکاری کرتا ہے معلوم ہوا کہ ظاہری عمل کچھ اور ہے اور باطن میں نیت کچھ اور ہے۔ ریاءکاری کی مذمت میں متعدد وعیدات نصوص میں وارد ہوئی ہیں۔(1) یہ منافقین کا عمل ہے۔ (سورہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نساء، آیت: 142، 38، سورہ ماعون، آیت: 6، اور صحیح حدیث میں اس کو شرک خفی اور اصغر کہا گیا ہے۔ (ابن ماجہ حدیث ۴۲۰۴ قال الشیخ الالبانی حسن) ''وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ'' اس میں دو قول ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ جب ریاء کار شخص اللہ تعالیٰ سے اجر کے بجائے لوگوں کی خوشنودی چاہتا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ اس شخص کا اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں ہے ورنہ اس اجر پر وہ یقین رکھتا۔ یہاں ایمان کی حقیقی نفی نہیں ہے۔ اس قول کی طرف امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اشارہ کیا ہے اور تمیصر الرحمٰن میں امام مہائمی کا بھی یہی موقف ہے تو اس سے مراد مسلمان ریاء کار ہے۔ دوسرا قول: یہ ہے کہ یہاں پر ایمان شرعی کی حقیقی نفی کی گئی ہے یعنی وہ شخص منافقت کے طور پر کافر ہے کیونکہ کفر صریح سے ویسے ہی تمام اعمال برباد ہوتے ہیں لہٰذا اس کا کفر مخفی ہے اور منافقت اس کی ظاہر ہے لہٰذا اس منافقت سے اس کے اعمال ضائع ہیں چنانچہ اس سے منافق ریاکار مراد ہے۔ ''فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ'' ''فَمَثَلُهٗ'' کی ضمیر میں دو احتمال ہیں۔ پہلا احتمال: یہ ہے کہ یہ ''الَّذِيْ يُنْفِقُ'' کی طرف راجع ہے یعنی ریاکار کی مثال پتھر اور چٹان پر کاشت کاری کرنے والے کی سی ہے۔ دوسرا احتمال: یہ ہے کہ یہ مَانٌ اور مُؤْذِيْ کی طرف راجع ہے تو سابقہ مثال کے بعد دوسری مثال ہے۔ ''صَفْوَانٍ'' صاف، چکنے، چمکدار پتھر کو کہا جاتا ہے۔ اس میں اہل لغت کے تین اقوال ہیں۔ (1) مفرد ہے۔ (2) جمع ہے۔ (3) جمع مفرد دونوں ہیں۔ ''فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ'' اس میں (ہ) کی ضمیر ''صَفْوَانٍ'' یا ''تُرَابٌ'' کی طرف راجع ہے۔ ''وَابِلٌ'' موسلادھار تیز بارش کو کہا جاتا ہے۔ (''اَخْذًا وَّبِيْلًا'' بھی اس سے لیا گیا ہے) اور لفظ ''اَصَابَ'' بھی تیز بارش پر دلالت کرتا ہے۔ ''فَتَرَكَهٗ صَلْدًا'' یہ ضمیر صرف ''صَفْوَانٍ'' کی طرف راجع ہے۔ ''صَلْدًا'' چکنا پتھر، مٹی سے پاک خشک پتھر، مفرد کی تشبیہ مفرد سے دی ہے یعنی کافر کی مثال ''صَفْوَانٍ'' کے ہے اسکا کوئی عمل قبول نہیں۔ ''تُرَابٌ'' کی مثال ''صَفْوَانٍ'' پر انفاق والے کی ہے جس طرح مال خرچ کرنے سے وہ اپنے کردار کو چھپاتا ہے جس طرح مٹی چٹان کو اور ''وَابِلٌ'' اس کا کفر ہے جبکہ ریاء ''مَنٌّ'' ''وَاَذًى'' ہے جس سے اس کے اعمال باطل ہوئے۔ ''صَلْدًا'' یعنی بعض مومنین پر اس کا کفر ظاہر ہوگا دنیا میں جبکہ جہنم کی طرف جاتے ہوئے سارے مسلمانوں پر افشاء ہو جائے گا۔ مثال کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک صاف ستھرا پتھر ہے جس پر گرد و غبار مٹی لگ گئی ہے۔ تو ایک بے وقوف انسان اس کو ہموار زمین تصور کر کے اس میں بیج ڈالتا ہے اس خیال سے کہ اس میں فصل یا دیگر پودے پیدا ہو جائیں لیکن جب اس پر موسلادھار بارش برستی ہے تو اس مٹی کو بیج سمیت ہر چیز سے صاف کر دیتی ہے۔ وہ کم عقل انسان افسوس کرتے ہوئے اپنے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مال بیج اور محنت پر افسوس کرتا ہے لیکن اس کو افسوس کے علاوہ ہاتھوں میں کچھ نہیں آتا۔ اسی طرح ریاء کار شخص مَنّ اور اَذیٰ کرنے والا صدقات کرتا رہتا ہے اور اس کا خیال یہ ہے کہ مجھے اس کا بدلہ ملے گا لیکن دنیا میں عارضی مدح کے علاوہ آخرت میں اس کو کچھ بھی ملنے والا نہیں ہے۔ بے خبر لوگ اس کی تعریفوں میں مصروف ہیں کہ وہ بہت ہی اچھا شخص ہے یہ تعریفی کلمات اس کیلئے بمنزلہ "تُرَابٌ" کے ہیں کیونکہ اس کے ذریعے اس کا حال لوگوں سے چھپا ہوا ہے۔ حدیث میں وارد ہے کہ تم جب اپنی تعریف کرنے والوں کو دیکھو تو ان کے منہ میں مٹی ڈال دو "إِذَا رَأَيْتُمُ الْمَدَّاحِينَ فَاحْثُوا فِي وُجُوهِهِمُ التُّرَابَ" (صحیح مسلم کتاب الزهد حدیث ۳۰۰۲، ادب المفرد للبخاری ۳۳۹، والترمذی وابن ماجہ واحمد وابن حبان حدیث ۲۰۰۲، سلسلۃ الصحیحۃ 912) اس میں اشارہ برابر بدلہ کی طرف ہیں۔ البتہ جب بعض ایمان والوں کو ان کی حقیقت معلوم ہو جائے کہ یہ مَنّ اور اَذیٰ والے ریاء کار ہیں تو ان کی عزت کا پردہ چاک ہو جاتا ہے اور آخرت میں منافقت کی وجہ سے اجر سے محروم ہونگے تو خالی ہاتھ حیران و پریشان ہونگے۔ "لَا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا" اس میں تین اقوال ہیں۔ پہلا قول: یہ ہے کہ ضمیر مخاطبین کی طرف راجع ہے جو کہ "لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُم" میں مخاطب ہیں یعنی جب تم اس کام کا ارتکاب کرو تو اپنے اعمال میں سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکو گے۔ دوسرا قول: یہ ضمیر "الَّذِي يُنفِقُ" کی طرف راجع ہے "الَّذِي" بمعنی جمع ہے یعنی وہ ریاکار لوگ کسی قسم کا بھی اجر و ثواب نہیں پائیں گے اس لئے کہ انہوں نے اپنا اجر و ثواب "مَنّ" "اَذیٰ" کے ذریعے ضائع کر دیا۔ تیسرا قول: یہ ہے کہ ضمیر عام ہے چٹان پر بیج ڈالنے والا تیز بارش کے بعد کچھ بھی حاصل نہیں کر سکا تو اس کی مثال کافر و مشرک کی طرح ہے کہ اپنی محنت و مزدوری اور جو کچھ خرچ کیا تھا سب سے محروم ہو گیا ہے۔ "وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ" اس میں آخرت تک اجر پہنچانا مراد ہے اور مؤمنین کیلئے تنبیہ ہے کہ کافروں کی مشابہت سے ڈرتے رہنا کیونکہ وہ ہر اعتبار سے نقصان میں ہیں۔

وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ فَآتَتْ أُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَإِن لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٦٥﴾ "وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور اپنے نفسوں کی مضبوطی کے لئے مال خرچ کرتے ہیں اس کی مثال اس باغ جیسی ہے جو زرخیز بلند زمین پر ہو اگر زوردار بارش اس پر برسے تو دوگنا پھل لائے اگر بارش نہ برسے تو پھوار شبنم ہی کافی ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھنے والا ہے" (265)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تفسیر 265: اس آیت میں تیسری مثال کا ذکر ہے جو دیگر صحیح مقاصد کی حصول اور صحیح مصارف میں شرائط شرعیہ کی مطابق خرچ کرنے والوں کا ہے۔ اور یہ سابقہ آیت کے برعکس ہے وہاں ریاکاروں کے لئے رِئَآءَ النَّاسِ کا ذکر تھا تو یہاں پہ اِبْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ذکر ہوا ہے وہاں لَا یُؤْمِنُوْنَ الخ کا ذکر تھا تو یہاں پہ وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ: ذکر ہوا ہے۔
سوال: خوبصورت فصلیں اور پودے تو ہموار زمین میں ہوتے ہیں تو "رَبْوَةٍ" کیوں کہا گیا۔؟ جواب ۱: یہ عرب کے عرف کے مطابق کہا گیا ہے کیونکہ اس قسم کی زمینیں عرب میں زیادہ فصل دیتی ہیں حالانکہ ان تک نہروں کا پانی نہیں پہنچتا۔
جواب ۲: امام رازی کا قول ہے کہ اس سے مراد بلندی پر واقع زمین نہیں ہے بلکہ وہ زمین ہے جو زرخیز اور اچھی زمین ہو جس کی دلیل سورہ حج آیت 5 ہے اس مقام پر "رَبْوَةٍ" اس قسم کی زمین کو قرار دیا ہے۔ "اَصَابَهَا وَابِلٌ" یہ "رَبْوَةٍ" کی یا "جَنَّةٍ" کیلئے صفت ہے "اٰتَتْ" کیلئے دو مفعولوں کی ضرورت ہے ان میں سے ایک حذف ہوا ہے یعنی "اَهْلَهَا" جبکہ "اُكُلَهَا" دوسرا مفعول ہے "ضِعْفَيْنِ" حال ہے۔ یا "اٰتَتْ" "اَخْرَجَتْ" کے معنی میں ہے اور "اُكُلَهَا" اس کیلئے مفعول ہے اور "اِیْتَا" کی نسبت مجازی ہے۔ "اُكُلٍ" اکثر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو کھائی جاتی ہے اکثر درختوں کے پھلوں کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے جیسا کہ "ذَوَاتَیْ اُكُلٍ خَمْطٍ" (سورۃ سبا) "تُؤْتِیْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا" (سورۃ نحل) "ضِعْفَيْنِ" تثنیہ تکرار کیلئے ہے یعنی بہت پھل دیتی ہے۔ امام عطاء رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ایک سال میں دو سالوں کے مقدار پھل دیتا۔ "فَاِنْ لَّمْ یُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ" اس کی یا تو خبر مقدر ہے یعنی "یَكْفِیْهَا" یا فعل مقدر ہے۔ یعنی "فَیُصِیْبُهَا طَلٌّ" "طَلٌّ" کا معنی بوندا باندی یا شبنم لیکن یہ مجازی معنی ہے جو یہاں مراد نہیں ہے۔ مثال کی تفصیل اس طرح سے ہے۔ یعنی ایسا باغ جو زرخیز زمین پر ہو جس سے اس کو نمی حاصل ہوتی ہے اور تیز زوردار بارش سے اس کے درختوں اور پھلوں میں بہت ترقی ہوتی ہے اس میں پھل بہت آتے ہیں یعنی اس باغ کو دو طریقوں سے پانی کا فائدہ ملتا ہے اس لئے دگنا پھل دیتا ہے اگر تیز زوردار بارش اس کو سیراب کرے تو دگنا ورنہ اس کے نیچے پائی جانے والی نمی ہی اس کیلئے کافی ہوتی ہے۔ مثال کی مطابقت ۱: ایک مؤمن اپنا حلال مال سے خرچ کرتا ہے تو اس کے مقصد بھی دو ہیں یعنی اوپر کی جانب اللہ تعالیٰ کی رضا یعنی "اِبْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ" اور دوسرے کا تعلق نیچے سے ہے یعنی "تَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ" لہٰذا اس انفاق کے بہت سے فائدے ہوں گے اور جب ان کا مقصد "تَثْبِیْت" ہی ہو جو کہ مستلزم اخلاص ہے اور منّ و اذیٰ سے پاک ہے تو ایک ثواب ملا یعنی ثواب کا سبب تو ہے جبکہ ضائع ہونے کا کوئی سبب نہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مطابقت ۲: اس باغ سے ہر حال میں پھل حاصل ہوتے ہیں زیادہ ہوں یا کم اسی طرح مومن کا خرچ سبب اجر ہے زیادہ مال ہو یا کم عند اللہ مقبول ہے جب مَنّ و اَذیٰ سے پاک ہو۔ ''وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ'' خرچ کرنے والے اور نہ کرنے والے سب کو عام خطاب ہے۔ ''بَصِيْرٌ'' میں اشارہ ہے کہ خرچ کرنے کی مقدار کیفیات اور اس کے اسباب اللہ تعالیٰ سے مخفی نہیں ہیں اور وعدہ اور وعید دونوں کی طرف اشارہ ہے

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۚ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝ ''کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اس کا کھجوروں کا اور انگوروں کا باغ ہوں جس میں نہریں جاری ہوں اور ہر قسم کے پھل اس میں موجود ہوں اور اس شخص پر بڑھاپا آ گیا ہو اور اسکے چھوٹے چھوٹے بچے ہو اور اسکے باغ کو بگولا پہنچ جائے جس میں آگ ہو پس وہ جل جائے اللہ تعالیٰ اسی طرح تمہارے لئے آیتیں بیان کرتا ہے تاکہ تم غور وفکر کرو'' (266)

تفسیر 266: اس آیت میں بظاہر مثال کا کوئی صریح لفظ نہیں ہے البتہ ضرورتاً عبارت مثال پر دلالت کرتی ہے۔ یہ چوتھی مثال ہے اس میں ان لوگوں کی مثال ہے جو باطل طریقے سے مال خرچ کرتے ہیں اور دیگر اس قسم کے اعمال کا ارتکاب کرتے ہیں جن سے ان کے سابقہ صحیح اعمال بھی ضائع اور باطل ہوں۔ اس کی عمر اور مال برباد ہو جاتا ہے اور پھر مال کمانے کی عمر بھی نہ رہی ہو (بڑھاپا آ گیا ہو)۔ ''اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ'' ہمزہ استفہام انکاری کیلئے ہے۔ ''وَدٌّ'' دل کی کامل محبت جس کے ساتھ زبان کی تمنا بھی شامل ہو جائے۔ ''لفظ يُحِبُّ یا يُرِيْدُ نہیں کہا گیا (بلکہ يَوَدُّ کہا) اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس طرح کی حالت کا نہ ہونا ہر شخص کی شدید چاہت ہوتی ہے۔ اس کو انکار تام کہا جاتا ہے (یعنی کوئی شخص باغات کی بربادی نہیں چاہتا)۔ ''اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ'' ''جَنَّةٍ'' اسم جنس ہے مراد وہ باغات ہیں جن میں کھجور و انگور کے درخت کی کثرت ہو۔ ''نَخِيْلٍ'' اسم جمع ہے یا نخل کی جمع اسم جنس ہے اگرچہ اس میں اختلاف ہے۔ امام راغب نے فرمایا ہے کہ کھجور کو نخیل اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ منخول ہے چھانا گیا یعنی تمام درختوں میں چنا ہوا ہے کیونکہ اس میں فائدے بھی زیادہ ہیں اور مومن کے ساتھ مشابہت بھی ہے جیسا کہ حدیث میں وارد ہے صحیح بخاری کتاب العلم حدیث 62 لہٰذا اس لئے اس کو نخیل کہا گیا ہے۔ ان دونوں درختوں کا ذکر اس لئے بطور خاص کیا ہے کہ ان کے فائدے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دوسرے درختوں کی نسبت زیادہ ہیں اور سب سے اہم اور زیادہ پھل دینے والے درخت ہیں اور چونکہ عرب میں ان دونوں کی کثرت بھی ہے ورنہ باغوں میں تو درخت اور بھی ہیں۔ سوال: قرآن مجید میں اکثر کھجور کا ذکر ہوتا ہے اور اس کے پھل کا ذکر نہیں ہوتا جبکہ انگور کے پھل ذکر کیے ہیں؟ جواب: اس میں وجہ یہ ہے کہ کھجور کے پتوں، ٹہنیوں، شاخوں، چھلکوں، تنے اور پھل سب میں فائدے ہیں جبکہ انگور کے فائدے صرف پھل (دانہ) میں ہیں باقی بیل وغیرہ کو ذکر نہیں کیا ہے۔ ''تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ '' یہ باغ کی صفت ہے اس میں اشارہ ہے کہ ان باغات کو پانی کی ضرورت نہیں ہے ان کی تو اپنی نہریں جاری ہیں۔ قلت پانی سے باغ خراب ہونے کا خطرہ نہیں ہے۔ ''لَهٗ فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ'' کھجور، انگور کے سوا بھی اس باغ میں پھلوں کی متعدد انواع واقسام موجود ہیں۔ زمخشری کا قول ہے کہ اس سے مراد باغ سے حاصل ہونے والے دیگر فائدے ہیں۔ امام اخفش کے نزدیک (مِنۡ) زائد ہے۔ کوفیوں کے نزدیک مِنۡ زائد ہونے کیلئے شرط ہے کہ بعد والا کلام نکرہ ہو جبکہ بصریوں کے نزدیک مقدم کلام منفی اور بعد والا نکرہ ہونا ضروری ہے۔ جبکہ وہ شرطیں موجود نہیں ہیں لہذا (مِنۡ) زائد نہیں ہے البتہ عبارت مقدر ہے یعنی ''لَهٗ فِيۡهَا ثَمَرَاتٌ مِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ'' ''وَاَصَابَهُ الۡكِبَرُ'' یہ جملہ حالیہ ہے یا ماضی کو ''يَوَدُّ'' پر عطف کیا ہے یا معنی کے اعتبار سے ''تَكُوۡنَ'' پر عطف ہے۔ اس میں عطف بہتر ہے اس میں بعد والی صفت کو پہلی صفت سے جمع کرنے سے انکار ہے یعنی کوئی یہ نہیں چاہتا کہ ان دونوں حالتوں سے ان کا واسطہ پڑ جائے۔ اور لفظ ''اَصَابَ'' میں کامل بڑھاپے کی طرف اشارہ ہے۔ ''وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ'' ''ضُعَفَآءُ'' سے کمسن بچے مراد ہیں جو والد کے ساتھ کام میں ہاتھ نہیں بٹا سکتے ہوں یا فقراء مراد ہیں جو کسی بھی طور پر اس کے ساتھ مدد نہیں کر سکتے۔ ''فَاَصَابَهَاۤ اِعۡصَارٌ فِيۡهِ نَارٌ فَاحۡتَرَقَتۡ'' اصل میں ''اِعۡصَارٌ'' نچوڑنے کو کہا جاتا ہے جبکہ عرف میں ایک تیز آندھی کا نام ہے۔ اکثر علماء کے نزدیک اس آندھی کا نام ہے جو زمین سے آسمان کی جانب گول ستون کی طرح بلند ہوتی ہے اور جس طرح کسی چیز یا کپڑے کو نچوڑا جاتا ہے اس طرح یہ آندھی درختوں، پودوں اور دیگر چیزوں کو اپنے ساتھ نچوڑتی ہے۔ بعض علماء کے نزدیک یہ بادلوں کو نچوڑتی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ اس سے مراد وہ تیز آندھی ہے جس میں جلا دینے والی ہوا ہو۔ ابن عطیہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ کیفیت تیز گرمی اور تیز سردی میں پیدا ہوتی ہے۔ ''نَارٌ'' اس سے تیز گرم ہوا لو مراد ہے اس کو تشبیہ بلیغ کہتے ہیں۔ ''فَاحۡتَرَقَتۡ'' باغ کی سارے پتے زمین پر گر گئے کیونکہ آگ نے انہیں مرجھا کر جلا دیا پھل بھی زمین کی نذر ہو گئے تو سخت ضرورت کے وقت فصل اور پھل سے محروم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہونا انتہائی پریشانی اورنا امیدی کا باعث ہے۔ مثال کی تفصیل اس طرح سے ہے کہ ایک شخص کا باغ ہے جس میں اس نے اپنی ساری توانائی صرف کی ہے اور اس کی ساری متاع یہی باغ ہے جس میں پھل، ہر قسم ضروریات کی چیزیں ہیں خود باغبان ضعیف ہو گیا ہو بچے بھی کم سنی کی عمر میں ہوں اب اچانک اس باغ کو آگ بگولے نے جلا ڈالا تباہ و برباد کر ڈالا کس صورت میں بچوں کا بھی اور اپنا بھی بڑھاپے کی حالت میں بوجھ اٹھانا کتنا مشکل ہوگا۔ کیونکہ نہ تو یہ خود مالی جسمانی طاقت رکھتا ہے جس سے پھر اس باغ کو دوبارہ آباد کر سکے اور نہ ہی اس کے بچے اس قابل ہیں کہ باپ کی معاونت کر کے جانشین بن جائیں۔ اور اس باغ کو پھر سے اس طرح آباد و شاداب بنائیں۔ لہٰذا ایسی صورت حال میں باغ کا مالک کتنا غمگین اور پریشانی اور کرب کے عالم میں ہوگا۔ مثال کی تطبیق صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4538 میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے صحابہ کرام سے اس کی تفسیر طلب کی تو انہوں نے واللہ اعلم فرما کر خاموشی اختیار کر لی۔ جس پر انہوں نے غصہ ظاہر کیا۔ اس کیفیت کو دیکھ کر ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ایک مالدار شخص نیک اعمال میں مصروف ہوتا ہے اتنے میں اس پر شیطان مسلط ہوتا ہے اور جو کچھ اس نے نیک اعمال کیے تھے وہ سب برے اعمال کی وجہ سے ضائع کروا دیتا ہے۔ امام ابن کثیر نے فرمایا کہ اس قول میں تفسیر کیلئے کفایت ہے البتہ مثال کی وضاحت اس طرح ہے کہ ایک شخص کو اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی مالداری سے نوازا ہوا ہو اور اس میں سے وہ فی سبیل اللہ خرچ بھی کرتا ہو مال بھی دو طرح سے خرچ کرتا ہو یعنی فرائض میں اور نوافل میں فرض صدقہ اور نفلی صدقہ۔ جیسا کہ اس کے باغات میں نہریں ہیں تو اسی طرح مال میں صدقہ دینے سے اضافہ ہوتا رہتا ہے تو ایمانی قوت سے باغات کی سیرابی ہوتی ہے۔ اس باغ کے علاوہ بھی مالداری ہے تو مزید نیک اعمال بھی ہیں یعنی بدنی عبادات وغیرہ اور یہ ضعیف ہو گیا تو مراد یہ ہے کہ کمزور عقائد و بدعات کی طرح شیطانی وسوسوں کی طرف مائل ہو گیا اور صحیح ایمان اور سنت کے مطابق اعمال کو ترک کیا اور جس طرح باغبان کی اولاد ہے مگر کمزور ہے تو اسی طرح اس شخص پر لوگوں کے حقوق آ گئے بسبب اس کے ظلم کے مگر حقوق والے اس کی مدد نہیں کر سکتے بلکہ اپنے حقوق کو پورا کرنے کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔ جس طرح اس کے باغ پر جلا دینے والی تیز آندھی آئی ہے تو اس کے اعمال میں بھی بدعات، شرکیات اور ریاکاری محض واڈ ٹی رسم ورواج کے آنے سے وہ اجر سے خالی کر دیئے گئے جس طرح اس آندھی نے باغ کو نچوڑ کر ضائع کیا اسی طرح مذکورہ اعمال نے اس کا اجر نچوڑ کر ضائع کیا اور اعمال صرف بظاہر نیک نظر آتے ہیں حقیقت میں وہ اجر سے خالی ہیں۔ جس طرح آندھی میں آگ کے بگولے نے باغ کو جلایا تو اس کے اعمال میں ظاہرا

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

کفر اور شرک آیا جس نے اس کے سابقہ اعمال کو ضائع کیا۔ جس طرح تیز آندھی نے انتہائی بڑھاپے کی حالت میں اس کے باغ کو جلا ڈالا تو اسی طرح قریب الموت مشرک اور بدعتی ہونے سے تمام اعمال ضائع ہوئے۔ کیونکہ اعمال کا اعتبار خاتمے پر ہے۔ اب عذاب قبر اور حشر میں مبتلا ہوگا کیونکہ نتیجہ اعمال کے خاتمہ پر ہے۔ اس طرح مثال ابوحیان نے ابن عباس رضی اللہ عنھما سے نقل کی ہے کہ یہ اس شخص کی مثال ہے جس نے نیک اعمال اور اطاعت کی ہے مگر خاتمہ غلط عقائد اور اعمال پر ہوا ہے۔ "كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ" اس جملہ میں قرآن کی آیتوں کا علم اور ان پر عمل کی طرف ترغیب ہے مثال کو جاننے کیلئے فکر کی ضرورت ہے تاکہ مثال اور ممثل لہ صحیح انفاق اور غیر صحیح انفاق میں امتیاز کر کے صحیح کو اختیار اور غیر مفید سے اجتناب کر سکیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝ "اے ایمان والو! اپنے مال میں سے جو پاک ہو خرچ کرو جو تمھارے ہاتھوں کی کمائی ہو اور زمین میں سے تمہارے لئے جو پیدا کیا ہے اور اس چیز کے خرچ کرنے کا قصد مت کرو جسے تم خود بھی لینے کیلئے تیار نہیں ہو مگر یہ کہ لیتے وقت چشم پوشی اختیار کرو اور جان لو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ تعریف کیا ہوا ہے۔" (267)

تفسیر 267: ربط ا: سابقہ آیتوں میں انفاق کی طرف ترغیب دی گئی اور صدقہ قبول ہونے یا رد ہونے کے اسباب ذکر کئے گئے ہیں اور یہ تمہید تھی تو اب اس مقصد کو بیان کیا جاتا ہے جو مال خرچ کرنے کا امر ہے ربط ۲: جب ان شرطوں کو بیان کیا گیا جن کی وجہ سے صدقہ قبول یا رد ہوتا ہے تو اب مال کی قبولیت کیلئے فرض شرط کو ذکر کیا جاتا ہے۔ "اَنْفِقُوْا" سیدنا علی رضی اللہ عنہ، حسن بصری، اور امام ابن سیرین رحمھم اللہ کا قول یہ ہے کہ اس میں حکم فرض زکوٰۃ اور عشر کا ہے جبکہ دیگر علماء کا موقف یہ ہے کہ اس میں فرض و نفلی تمام صدقات شامل ہیں۔ "مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ" مال دو قسم کا ہے جس کی وجہ سے لوگ دو حصوں میں تقسیم ہیں۔ (۱) سرمایہ دار یعنی تجارت پیشہ لوگ کارخانے وغیرہ کے مالک (۲) جاگیر دار، زمیندار یعنی صاحب جائیداد لوگ۔ لہٰذا ان دونوں قسموں میں مال خرچ کرنے کا حکم ہے۔ مذکورہ جملے میں پہلی قسم کے انسانوں کا ذکر ہے۔ "طَيِّبٰتِ" "طَيِّبَةٌ" کی جمع ہے اور اس کو صفت غالبہ کہا جاتا ہے۔ یعنی موصوف کے بغیر ذکر کیا جاتا ہے اس کا معنی پہلے ذکر ہو گیا ہے یہاں مراد یہ ہے کہ مال صاف ستھرا ثابت ہو اور حلال کی شرط بھی شامل ہے "كَسَبْتُمْ" کسب

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وہ عمل ہے جو بدن کی تھکاوٹ سے ہوتا ہے یعنی تجارت، کاریگری، نوکری، مزدوری سب اس میں داخل ہیں۔ "وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ" اس میں دوسری قسم مذکور ہے یعنی زمین سے حاصل ہونے والی آمدنی فصلیں، معدنیات وغیرہ اس میں بیسواں حصہ یا عشر دسواں حصہ یا زکوۃ فرض ہے۔ تنبیہ: "مَا كَسَبْتُمْ" اور "مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ" یہ دونوں عام ہیں لیکن اس کی تشریح حدیث میں وارد ہے یعنی نقد رقم سونا چاندی تجارت کا مال اس پر زکوۃ فرض ہے یعنی چالیسواں حصہ جبکہ فصلوں میں دسواں اور بیسواں حصہ وغیرہ اور جانوروں کا نصاب زکوۃ یہ سب تفصیل سے احادیث میں مذکور ہے۔ حدیث کے بغیر قرآن پر عمل نہیں ہوسکتا۔ فائدہ ۱: سوال: "مَا كَسَبْتُمْ" کے ساتھ "طَيِّبٰتِ" ذکر کیا ہے جبکہ "مَآ اَخْرَجْنَا" کے ساتھ ذکر نہیں کیا ہے۔؟ جواب: اس میں اکتفا کے اصول کو اپنایا گیا ہے یعنی ایک چیز کو ذکر کرنا دوسرے کو چھوڑ دینا کہ اس میں بھی وہ مراد ہوتا ہے۔ فائدہ ۲: "زَرَعْتُمْ" یا "اَنْبَتْنَا" نہیں فرمایا کیونکہ عشر وغیرہ فصلوں کے حاصل ہونے کے وقت ہوتا ہے اور اس پر اخراج کا لفظ دلالت کرتا ہے اور زمین کی معدنیات کو زرع اور انبات شامل نہیں ہے بلکہ لفظ اخراج اس کو شامل ہے۔ "وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ" لغت میں تیمم "تَيَمَّمُ" کا معنی قصد کرنا اور ارادہ کرنے کو کہتے ہیں۔ آمّ یا یمّم سے لیا گیا ہے۔ بقول خلیل کے "اَمَمَ" آگے سے قصد کرنے کو کہا جاتا ہے اور "يَمَّمَ" ہر جانب سے قصد کرنے کو کہا جاتا ہے۔ "اَلْخَبِيْثَ" یہاں پر ردی چیز کو کہا گیا ہے جس میں وصف حرام بھی ہو "مِنْهُ" اس کی ضمیر "مَا كَسَبْتُمْ" اور "مَآ اَخْرَجْنَا" کی طرف راجع ہے اور "تُنْفِقُوْنَ" حال ہے اس جملہ میں کھرا حلال مال دینے کی تاکید ہے۔ اور ایک وہم کو ختم کرنا مقصود ہے وہم یہ ہے کہ مالوں میں کھرا اور ردی دونوں مال خلط ملط ہوتا ہے تو ان کو الگ کرنا تکلیف دہ ہے تو اس جملہ میں اس وہم کو ختم کیا گیا ہے کہ ردی مال کو چن چن کر فی سبیل اللہ خرچ کرنا منع ہے جبکہ خلط ملط کی صورت میں خرچ کرنا درست ہے۔ فائدہ: "اَلْخَبِيْثَ" کا مادہ قرآن مجید میں (16) سولہ مرتبہ ذکر ہوا ہے جو سات معنوں پر مشتمل ہے۔ (1) پہلا معنی جو اس آیت میں ہے یعنی ردی مال (2) دوسرا معنی منافق ہے۔ (آل عمران، آیت: 179)، (3) تیسرا معنی حرام ہے۔ (مائدہ آیت: 100)، (4) شرک کے معنی میں ہے۔ (انفال، آیت: 37)، (5) بنجر نمکین زمین۔ (اعراف، آیت: 57)، (6) کڑوا درخت۔ (ابراہیم، آیت: 26)، (7) گناہوں کے معنی میں ہے۔ (انبیاء، آیت: 74) "وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ" اس جملہ میں ردی کی تعریف کی گئی ہے۔ یہ جملہ حالیہ ہے یا "وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ" کیلئے علت ہے یعنی جو مال تم کسی اور سے اپنے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لئے قبول نہیں کرتے لیکن دینے والے اگر تمہیں یا ادھار میں لیتے وقت تم اس کی طرف نہ دیکھتے یعنی مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں دیتے ہو تو کیوں پسند کرتے ہو اپنے لئے مال اچھا اور اللہ کیلئے ردی کیا ہے۔ "إِغْمَاضٌ" آنکھ بند کرنے کو کہا جاتا ہے۔ وہ چیز جس سے کچھ لئے اغماض کرتے ہیں۔ (1) آنکھیں بند کر لینا (2) تسامح یعنی چشم پوشی مالی معاملے میں۔ یہاں پر آخری معنی مراد ہے۔ یعنی جب کسی شخص کو اپنا حق ملنے کی امید ہو اور اس حق میں کمی بیشی ہو تو چشم پوشی کرتا ہے مگر جب اس کو حق نہ ملتا ہو تو مجبوراً درگزر سے کام لیتے ہوئے ناپسندیدہ چیز بھی لے لیتا ہے۔ "وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ" "وَاعْلَمُوا" میں تنبیہ ہے یعنی مقصد ہے ان کو آگاہ کرنا کہ اللہ تعالیٰ سے نام والی چیز نہ دیا کرو یا اللہ تعالیٰ محتاج نہیں ہے۔ اس میں سوال کا جواب ہے کہ انسان اپنے حق میں جب چشم پوشی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی کرے گا؟ جواب ملا کہ انسان تو ضروریات اور محتاجی کی وجہ سے ایسا کرتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ تو غنی ہے یہ صفت نہیں کہ وہ اغماض کرے۔ "حَمِيدٌ" محمود کے معنی میں ہے یعنی وہ انعامات پر تعریف کے لائق ہے یا حامد کے معنی میں ہے یعنی جو صالح اعمال تم کرتے ہو ان کی تعریف کرتا ہے۔ غنی کی یہ صفت اس لئے نہیں ہے کہ انسانوں میں مالدار لوگ جب کسی سے درگزر اور معافی کا معاملہ نہیں کرتے تو برے کہلائے جاتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ تو غنی ہونے کے باوجود قابل تعریف ہے۔

الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَاءِ ۖ وَاللَّهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٦٨﴾

"شیطان تمہیں فقیری سے ڈراتا ہے اور (بخیل) بے حیائی کا تمہیں حکم (درس) دیتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ اپنی جانب سے معافی درگزری اور فضل کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ وسیع (فضل والا) اور ہر چیز پہ عالم ہے" (268)

تفسیر 268: اس آیت سے آیت: 274 تک چھ امور انفاق فی سبیل اللہ سے متعلق ہیں۔ اس آیت میں پہلا مسئلہ ہے کہ (انفاق) خرچ کرتے وقت شیطانی وسوسوں سے اپنے نفس کو بچاؤ۔ ربط: مال خرچ کرنے کی ترغیبات سابقہ آیتوں میں ذکر کرتے ہوئے پھر آخر میں حلال اور اچھا مال دینے کی ترغیب دی گئی لیکن ان اعمال سے روکنے کیلئے ہر وقت شیطان سرگرم رہتا ہے تو اب اس سے متعلق علاج کا ذکر ہے اور یہ علاج احکام الٰہی اور شیطانی وسوسوں کے تقابل کے ذریعے بتایا گیا ہے کہ شیطان کیا حکم کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا حکم کیا ہے؟۔ "يَعِدُكُمُ" خیر اور شر دونوں میں وعدہ مستعمل ہے۔ خیر کی مثال سورہ فتح آیت: 20، میں ہے۔ جبکہ شر کی مثال سورہ حج آیت: 82، میں ہے یہاں پر بھی شر کے ساتھ ذکر ہے جو کہ فقر ہے اور جب خیر و شر کا ذکر نہ ہو تو شر کیلئے وعید اور خیر کیلئے وَعْد کا لفظ آتا ہے۔ یہاں پر "يَعِدُكُمُ" خوف دلانے کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

معنی میں ہے۔شیطان عام ہے جنی وانسی اور نَفْسِ اَمَّارَۃٌ بِالسُّوْءِ بھی اس میں داخل ہے۔"اَلْفَقْرَ" اصل میں کمر کی ہڈی یا ریڑھ کی ہڈی جبکہ عرف میں سخت فقیری کو کہا جاتا ہے یعنی زندگی گزارنے کے اسباب نہ ہونے کی وجہ سے یا کم ہونے سے لہٰذا فقیر کی مثال کمر ٹوٹے ہوئے شخص کی سی ہے کہ مالی کمزوری سے کمزور ہوتا ہے شیطان یہ وسوسہ دیتا ہے کہ مال خرچ مت کرو ورنہ فقیر ہو جاؤ گے۔"وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ" پہلے سلبی صفت ذکر ہوئی پھر ثبوتی صفت ذکر ہو رہی ہے جو کہ وسواس الشیاطین کے ڈرانے میں مزید اضافہ ہے۔"يَأْمُرُ" امر حقیقت میں کلام کرنا ہے یہاں پر اس کا اطلاق وسوسوں پر ہوا ہے کیونکہ وہ بھی دل میں غلط کاموں کی تاثیر پیدا کرنا یعنی برے کاموں کی ترغیب دینا ہے اور ان کو خوبصورت دکھانا مقصود ہے۔"اَلْفَحْشَاءِ" حد سے تجاوز کرنے کو کہا جاتا ہے اور فحش سے لیا گیا ہے۔"فَحْشَاءِ" ہر اس قول اور فعل کو کہا جاتا ہے جو ہر ذی عقل کے نزدیک (قبیح) برا ہو ہر صاحب عقل اس کی برائی کا قائل ہو۔امام قرطبی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ہر گناہ کو فحشاء کہا جاتا ہے بخل بھی اس میں داخل ہے۔فائدہ: فقیری کے خوف کو فحشاء پر مقدم کیا ہے کیونکہ سارے عقل والوں کے نزدیک بخل ناپسندیدہ عمل ہے لہٰذا شیطان ابتداء سے یہ طاقت نہیں رکھتا کہ کسی برائی کو ابتداء سے خوبصورت کر کے دکھادے البتہ رفتہ رفتہ انسان کو برائی پر آمادہ کرتا ہے۔یعنی پہلے اس کو فقیری سے ڈراتا ہے پھر اس کو کنجوسی کا عادی بناتا ہے۔یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شیطانی وسوسوں میں خیر کی کوئی امید ہی نہیں بلکہ شر ہی شر ہے۔"وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا" اللہ کے اسم ذات کو زیادہ اطمینان اور تسلی کیلئے پہلے ذکر کیا ہے۔"يَعِدُ" یہاں پر وعدے کے معنی میں ہے۔"مَّغْفِرَةً" لفظ کو نکرہ لانا پھر اس کو "مِّنْهُ" کے ساتھ مقید کرنا مغفرت کی عظمت کی دلیل ہے۔یہ سارے گناہوں کی مغفرت اور تمام عیبوں پر پردہ پوشی بھی اس میں شامل ہے۔"وَفَضْلًا" یہ عام ہے زیادت، برکت مال دنیا میں اور اجر و ثواب آخرت میں۔امام قرطبی رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر کے دو وعدے ہیں جبکہ شر کے دو وعدے شیطان کی طرف سے ہیں تو عقل والوں کو چاہیے کہ دونوں کا انصاف سے موازنہ کریں اور شیطان سے خود کو بچائیں۔"وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ" اللہ تعالیٰ کی جود و سخاوت، مغفرت اور فضل بہت وسیع ہے۔اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدوں کی مخالفت اس لئے نہیں کرتا کہ اس کے فضل و رحمت میں تنگی نہیں ہے۔"عَلِيمٌ" یعنی فضل کی مناسب جگہوں کو وہ خود جانتا ہے بعض اوقات کسی پر تنگی مسلط کرتا ہے اس لیے کہ اس کے حال کی خبر اسی کو ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿٢٦٩﴾

''قرآن کا فہم جسے چاہے عطا کرتا ہے اور جو قرآن کا فہم دیا گیا تو وہ بہت خیر دیا گیا۔(269)

تفسیر 269: ربط: اللہ تعالی اور شیطان کے وعدے ذکر ہوئے تو ان کی تمیز کیلئے سبب چاہئے اور وہ حکمت ہے اب اس کی تقسیم بیان ہو رہی ہے کہ یہ حکمت اللہ تعالی ہی تقسیم کرتا ہے کیونکہ وہ علیم ہے۔''یُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ'' ایتاء کا استعمال مال، اعیان، اعراض سب معانی میں مستعمل ہے۔جو لوگ اس کو اموال اور اعیان کے ساتھ خاص کرتے ہیں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔''الْحِكْمَةَ'' یہ اَحْكَامٌ سے مصدر ہے۔علم میں قول اور فعل میں مضبوطی کو حکمت کہتے ہیں۔امام ابن عطیہ وامام قرطبی رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ قرآن وسنت حکمت ہے۔امام ابوحیان نے اس کے متعلق علماء کے انتیس (۲۹) اقوال جمع کئے ہیں۔ابن عطیہ نے فرمایا کہ وہ تمام اقوال ایک دوسرے کے ہم معنی ہیں البتہ سدی کا قول الگ ہے کہ حکمت نبوت کو کہا گیا ہے۔ابن عباس رضی اللہ عنہما علی بن طلحہ، قتادہ، ابوعالیہ رحمہم اللہ کی روایات میں ہے اس سے مراد قرآن مجید کا علم، ناسخ ومنسوخ، محکم ومتشابہ اور اسکے پہلے نازل کئے ہوئے اور بعد میں نازل کئے ہوئے کو معلوم کرنا حکمت ہے۔ابو عثمان کا قول ہے کہ ایسا علم جو شیطانی وسوسہ اور الہام میں فرق کرے وہ حکمت ہے یہ معنی بہتر ہے اور اس میں سابقہ آیت سے ربط بھی ظاہر وثابت ہوتا ہے۔خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن وسنت کا علم وہ راسخ مضبوط علم ہے جس کے ذریعے حق وباطل میں فرق کر سکے حق پر عمل اور باطل سے اجتناب کرے تو یہ مکمل شرعی حکمت ہے۔امام رازی نے اشارہ کیا ہے کہ اللہ تعالی کے وعدے کی ترجیح حکمت اور عقل سے معلوم ہوتی ہے اور شیطانی وعدے کی ترجیح خواہشات کی پیروی سے معلوم ہے۔عقل وحکمت تو خواہشات سے بہت افضل ہے جو لوگ اس سے یونانیوں فلسفیوں کی حکمت مراد لیتے ہیں وہ تحریف قرآن کے مرتکب ہیں۔''وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ'' لفظ حکمت کو دوبارہ اہمیت، شرافت اور عظمت کی وجہ سے ذکر کیا ہے۔''فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا'' سوال: شرط فعل مستقبل ہے تو جزاء کا فعل ماضی کیوں ذکر کیا گیا ہے؟ جواب: جس فعل ماضی پر لفظ قد داخل ہو جائے اور وہ جواب شرط ہو تو وہ لفظاً ماضی اور معناً مستقبل ہوتا ہے لہذا اس میں تقدیری عبارت کی ضرورت نہیں ہے۔اور جہاں قد کے داخل ہونے کے بعد لفظاً اور معناً دونوں فعل ماضی ہوں تو وہاں جواب شرط مقدر ہوتا ہے جیسا کہ ''وَإِنْ يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِكَ'' ''خَيْرًا'' کو نکرہ عظمت کی وجہ سے ذکر کیا ہے اور یہ عظمت کیفیت کے اعتبار سے ہے۔''كَثِيرًا'' کثرت افراد کے اعتبار سے ہے۔امام قرطبی نے فرمایا ہے کہ جس کو کتاب اللہ کا علم دیا گیا تو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس کو سابقہ کتابوں اور صحیفوں کا علم دیا گیا ہے۔ اسی طرح صحیح بخاری کی حدیث میں بھی ہے کہ "مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ" (صحیح بخاری کتاب العلم حدیث 71 صحیح مسلم کتاب الزکوۃ حدیث 33) جس کیلئے اللہ تعالیٰ خیر کا ارادہ فرماتا ہے اس کو دین کی سمجھداری یعنی علم عطاء کرتا ہے۔ فائدہ: حلال مال کو آیت 272 ، میں خیر کہا گیا ہے۔ جبکہ یہاں سے علم کو خیر کثیر کہا گیا ہے جو دنیا داری پر علم کی فضیلت کی واضح دلیل ہے نیز جو شرائط و ترغیبات انفاق کے متعلق سابقہ آیتوں میں گزر چکی ہیں وہ خیر کثیر میں بھی مراد ہیں۔ "وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ" اَلْبَابٌ لفظ لُبٌّ کی جمع ہے خالص عقل کو کہا جاتا ہے جو ہر قسم کے اوہام سے پاک ہو۔ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حکمت سے فائدہ حاصل کرنے کیلئے خالص عقل ضروری ہے۔ اس صفت کو سورہ بقرہ آیت: 197 ، میں ذکر کیا گیا ہے سورہ آل عمران آیت: 7، 190 سورہ زمر آیت: 18، سورہ طلاق آیت: 10 میں تفصیل مذکور ہے۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝ "جو کچھ تم خرچ کرو یا نذر مانو کوئی نذر تو اس سے اللہ تعالیٰ اس کو اچھی طرح جانتا ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا" (270)

تفسیر 270: حکمت کا ایک تقاضا تو یہ ہے کہ انسان مال خرچ کرتا ہے مگر دو طریقوں سے ایک تو نذر مانتے ہوئے اپنے اوپر لازم کر دیتا ہے جبکہ دوسرا طریقہ عام صدقہ کی طرح ہے پہلے کو نذر جبکہ دوسرے کو انفاق کہا گیا ہے۔ اس آیت میں دوسرا حکم مذکور ہے جو خرچ کرنے سے متعلق ہے اور وہ دو قسموں پر ہے۔ "وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ" اس سے مراد صدقہ ہے کیونکہ ظاہرا یہی ثابت ہوتا ہے اس میں شرعی اور غیر شرعی سب شامل ہیں جو کہ سابقہ آیتوں میں تفصیلا مثالوں کے ساتھ گزرا ہے۔ "مِّنْ نَّفَقَةٍ" اس عمومیت میں مقصد یہ ہے کہ مال زیادہ ہو یا کم فرض صدقہ ہو یا نفل عبادت مالی ہو یا بدنی سب شامل ہیں۔ "اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ" یہاں پر بھی مذکورہ دونوں عمومات مراد ہیں۔ یعنی نذر اطاعت کی ہو یا معصیت کی مشروط ہو یا غیر مشروط نذر میں کسی چیز کو نام سے معین کیا ہو یا نہیں ان سب کو شامل ہے اور ان کی تفصیلات اور مختلف احکام حدیث میں مذکور ہیں۔ لغت میں نذر کسی چیز کو اپنے دل میں باندھنے کو کہتے ہیں یعنی دل کو اس چیز کے ساتھ مربوط کرنا۔ شریعت میں نذر اس عبادت کو کہا جاتا ہے جسکو انسان اپنے اوپر لازم کر لے جو اللہ تعالیٰ نے لازم نہیں کی تھی "فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ" پہلا ما شرطیہ ہے اور یہ جواب شرط ہے۔ یہ جزاء دینے سے کنایہ ہے خواہ شر یا خیر کی جزاء ہو "ہ" ضمیر مفرد ہے جو لفظ (ما) کی طرف راجع ہے۔ "وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ" یہ ناجائز خرچ والے اور غیر شرعی نذر ماننے والوں کیلئے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وعید ہے۔ نیز لفظ "ظَالِمِيْنَ" عام ہے تمام گناہ کرنے والوں اور شرک کرنے والوں کو شامل ہے۔ خاص کر صحیح مصارف میں خرچ نہ کرنا یا غیر شرعی طریقوں سے خرچ کرنا یا منّ اور اذیٰ دینا یہ سب ظلم ہے۔ غیر اللہ کے نام پر جانور ہو یا نقد رقم یا عبادت وغیرہ سب ظلم ہے۔ سوال: اس سے ثابت ہوتا ہے کہ گناہ گار کیلئے شفاعت نہیں ہے جبکہ منکرین حدیث اور معتزلہ کا یہی مذہب ہے۔؟ جواب ۱: شفاعت کرنے والے کو عرف میں ناصر اور مددگار نہیں کہا جاتا۔ آیت: 123، میں شفاعت اور نصرت کی نفی الگ الگ ذکر کی گئی ہے کیونکہ شفیع تو صرف مہربانی اور شفقت کر لیتا ہے۔ جبکہ ناصر قوت اور طاقت سے کام کرتا ہے۔ جواب ۲: یہ آیت عام ہے جس میں تمام اشخاص، افراد و اوقات داخل ہیں جبکہ شفاعت کے دلائل خاص ہیں اور خاص، عام پر مقدم ہوتا ہے۔

إِن تُبْدُوا الصَّدَقَٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۖ وَإِن تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَيُكَفِّرُ عَنكُم مِّن سَيِّـَٔاتِكُمْ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝ "اگر تم صدقات (وغیرہ) ظاہراً دو تو یہ اچھی بات ہے اگر تم اسے چھپا کر فقیروں کو دیدو تو تمہارے لئے بہت ہی اچھا ہے اور اللہ تعالیٰ مٹاتا ہے تم سے تمہارے گناہوں کو اور وہ جو تم عمل کرتے اس سے خوب باخبر ہے"(271)

تفسیر 271: اس آیت میں انفاق کے متعلق تیسرا مسئلہ مذکور ہے یعنی ظاہراً اور خفیہ مال خرچ کرنا۔

ربط: جب یہ بات معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ ہر قسم خرچ کرنے پر باخبر ہے تو وہم پیدا ہوا کہ پھر اظہار کرنا عبث ہے تو جواب یہ ہوا کہ ریاکاری کے بغیر دیگر فائدوں کیلئے ظاہراً مال خرچ کرنا درست ہے۔ "إِن تُبْدُوا الصَّدَقَٰتِ" ابداء سے مراد ظاہراً مال دینا ہے تاکہ اور لوگ دیکھیں۔ "الصَّدَقَٰتِ" صدق کا مادہ اس بات کی دلیل ہے کہ مال پاک اور صحیح ہے۔ زکوٰۃ خیرات کو صدقہ اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ مال کے صحیح و کامل ہونے کیلئے سبب ہے۔ یا بندے کے کامل ایمان و صدقِ ایمان کی دلیل ہے۔ اور یہاں لفظ صدقاتِ عام ہے فرض نفل دونوں کو شامل ہے۔ حسن بصری اور قتادہ رحمہم اللہ نے فرض زکوٰۃ مراد لی ہے جبکہ دیگر مفسرین نے نفل صدقہ مراد لیا ہے فرض زکوٰۃ دینے سے متعلق ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ اس میں خفیہ دینے کے بجائے اظہار افضل ہے اس پر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اجماع نقل کیا ہے۔ اس میں بہتر یہ ہے کہ نیت ریاکاری سے پاک ہو مگر لوگوں کو ترغیب دینا مقصود ہو نیت میں فرض کی ادائیگی ہو مگر لوگوں کو اپنی اقتداء پر چلانا مقصود ہو اور لوگوں کی بدگمانی سے اپنے آپ کو بچایا جائے مذکورہ شروط کا لحاظ کیا جائے تو ظاہراً دینا افضل ہے اگر اس طرح نہ ہو تو پھر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

خفیہ دینا بہتر ہے اور نفلی صدقات تو مخفی ہی بہتر ہیں۔ "فَنِعِمَّا هِيَ" اصل عبارت اس طرح ہے۔ "نِعْمَ الشَّيْئُ شَيْئًا هِيَ" "هِيَ" کی ضمیر "اِبْدَاءَ الصَّدَقَاتِ" کی طرف راجع ہے۔ معنی یہ ہے کہ چیزوں میں بہتر چیز فرض زکوٰۃ ظاہراً دینا ہے۔ لفظ "نِعْمَ" جواز اور معمولی افضلیت پر دلالت کرتا ہے اور استعمال کے موقعوں سے پتا چلتا ہے اس لئے اس کو فعل مدح کہا گیا ہے۔ "وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ" اس جملہ میں مخفی خرچ کرنے کی تفصیل مذکور ہے بشرطیکہ فقراء کو دیا جائے۔ سوال: جب صدقات سے مراد فرض زکوٰۃ اور "تُخْفُوْهَا" میں ضمیر بھی اس کی طرف راجع ہے اور سابقہ کلام میں اس کا ظاہر دینا افضل ثابت ہوا ہے نیز جب زکوٰۃ فقراء کا ہی حق ہے تو یہاں پر فقراء کی قید لگانے کا کیا فائدہ ہے؟۔ جواب ۱: اکثر مفسرین کے نزدیک نفلی صدقہ مراد ہے اور وہ مالداروں کے بجائے فقراء کو دینا بہتر ہے دوسری بات یہ کہ ظاہر او دینا صرف جائز اور مخفی دینا افضل ہے۔ جواب ۲: صدقات سے مراد فرض و نفل دونوں ہیں البتہ "اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ" میں فرض مراد ہے اور "تُخْفُوْهَا" ضمیر میں نفل مراد ہے جب لفظ میں ایک معنی مراد ہو اور ضمیر میں دوسرا معنی تو اسکو علم بدیع میں اِسْتِخْدَام کہتے ہیں۔ جواب ۳: پہلے بھی فرض صدقات مراد ہے اور ضمیر میں بھی لیکن افضلیت ریاء اور نمود سے بچنے میں ہے۔ اور صحیح نیت سے بغیر ریاء و نمود ظاہرا دینا صرف جائز ہے۔ جب اس میں دوسرے فوائد کا لحاظ نہ ہو۔ فائدہ: اِبْدَاء میں فقیروں کا اِیْتَاء ذکر نہیں کیا جبکہ مخفی صدقہ دینے میں فقیروں کو ذکر کیا ہے تو بقول امام عصام اس میں حکمت یہ ہے کہ ظاہر دینے میں لوگ فقیر کو جانتے ہیں تو وہاں ذکر نہیں کیا اس لیے ضرورت نہیں ہے لیکن مخفی دینے میں تفتیش کی اشد ضرورت ہے ایسا نہ ہو کہ مالدار کو صدقہ دیا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ خفاجی نے بیضاوی کی شرح میں لکھا ہے کہ پہلے والے کے ساتھ اس لئے ذکر نہیں کیا کہ وہاں مراد فرض زکوٰۃ ہے جبکہ فرض زکوٰۃ کے مصارف اور بھی ہیں اور مخفی صدقہ تو نفلی ہے جو غیر فقیروں کو دیا جا سکتا ہے لیکن فقیروں کو دینا افضل ہے۔ "فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ" ابو حیان کا قول ہے کہ خَيْرٌ۔ اس کا مفضل علیہ پہلے ذکر ہو چکا جو کہ اسم تفضیل ہے "مِنْ اِبْدَاءِهَا" ہے۔ "وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ" یہ صیغہ غائب کے ساتھ رفع کی قراءت ہے اگرچہ اور بھی قراءتیں اس میں نقل ہیں اس قراءت میں واؤ عاطفہ ہے جس نے جملہ کو جملہ پر عطف کیا ہے۔ اور یہ جملہ مستانفہ ہے جس کی مبتدا مقدر مخفی ہے یعنی "وَاللّٰهُ يُكَفِّرُ" "يُكَفِّرُ" کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے یا هُوَ ضمیر مقدر ہے جو اِبْدَاء یا اِخْفَاء اور اِیْتَاء کی طرف راجع ہے۔ تکفیر چھپانے کو کہا جاتا ہے یہاں مراد مغفرت ہے۔ "مِنْ سَيِّاٰتِكُمْ" "مِنْ" یہاں پر تبعیض کیلئے ہے کیونکہ صدقات سے سارے گناہ معاف نہیں ہوتے ہیں بعض گناہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

معاف ہوں گے۔ "سَيِّاٰتِكُمْ" "سَيِّئَةٌ" کی جمع ہے۔ مصیبت، سخت حالات اور گناہ کو کہا جاتا ہے۔ جبکہ حدیث میں بھی آیا ہے کہ صدقات سے مصائب اور پریشانی ٹل جاتی ہے رواہ طبرانی فی الکبیر واسنادہ حسن مجمع الزوائد ج3 ص115۔ "وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ" خفیہ چیزوں کے علم میں صفت خبیر استعمال ہوتی ہے۔ یہاں پر اشارہ ہے کہ صدقات دینے والوں کی نیتوں سے وہ باخبر ہے کہ وہ خالص صحیح نیت ہے یا دکھلاوے، نمود و نمائش، ریاکاری کی نیت سے خرچ کرتا ہے لہذا اگر خالص اللہ تعالیٰ کی رضامندی مقصود ہے تو ان کیلئے اجر و ثواب کا وعدہ ہے۔ جبکہ ریاکاری اور نمائش کرنے والوں کیلئے وعید ہے۔ اس میں خفیہ دینے والوں کی فضیلت کی طرف بھی اشارہ ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾ "حق تک رسائی ہدایت دینا تیرے ذمے نہیں البتہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت کی توفیق دیتا ہے۔ اور جو تم اپنے مال میں سے خرچ کرتے ہو تو اس کا فائدہ تمہارے ہی نفسوں کیلئے ہے۔ اور نہیں تم خرچ کرتے مگر اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے اور جو بھی تم حلال مال سے خرچ کرتے ہو تمہیں اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور تمہارے ساتھ ظلم نہیں ہوگا۔" (272)

تفسیر 272: اس آیت میں چوتھی بات یعنی امر کا ذکر ہے۔ آیت کے شروع میں ایک سوال کا جواب ہے پھر اخلاص کے ساتھ انفاق کی ترغیب ہے کہ تمہیں اجر حاصل ہوگا۔ ربط: سابقہ آیتوں میں بہت سارے لوگوں کی قسموں کا ذکر گزر گیا ہے کہ وہ گمراہ اور احسان جتلانے والے تکلیف دینے والے شیطان کے وسوسوں پر چلنے والے غیر شرعی طریقے سے نذر خرچ کرنے والے ہیں اس قسم کے لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے پریشانی کا سبب تھے کہ یہ لوگ احکام شرعیہ پر عمل کیوں نہیں کرتے۔ اسباب نزول سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رشتہ داروں پر اس لئے خرچ نہیں کرتے تھے تاکہ تنگ ہو کر ایمان کی طرف مائل ہو جائیں۔ اس آیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی کہ دلوں میں تنگی مت پیدا کرو اگر وہ ایمان نہیں لاتے تو ہدایت کے اختیارات اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں البتہ ان کو صدقات دیا کرو تاکہ وہ اسلام کی طرف مائل ہو جائیں۔ نیز اس سے مراد نفلی صدقات ہیں فرض زکوۃ صرف اہل توحید کو دینا ہے مشرکین کفار کیلئے نہیں ہے۔ البتہ تالیف قلب کیلئے دینا جائز ہے۔ فائدہ: اس آیت میں ان لوگوں کو تسلی دی جاتی ہے جو دعوت اور دینی امور میں مال صرف کرتے ہیں مگر جب لوگ ایمان نہیں لاتے کوئی دینی فائدہ حاصل نہیں ہوتا تو وہ نادم اور پشیمان

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہوتے ہیں۔ خلاصہ کلام: یہ ہوا کہ تم اخلاص کے ساتھ خرچ کرو خواہ کوئی ایمان قبول کرے یا نہ کرے کیونکہ ہدایت کا اختیار اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ (تمہیں ہر دونوں صورتوں میں اجر ملے گا۔) "لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ" اس سے مراد جبری طور پر یا توفیق ہدایت ہے اس کی اللہ تعالیٰ نے سورہ قصص، آیت: 56، میں عام بندوں اور نبی اکرم ﷺ سے نفی کی ہے۔ "وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ" اس سے مراد وہی ہدایت ہے جس کی نبی اکرم ﷺ سے سابقہ جملہ میں نفی کی گئی ہے۔ "وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ" ہدایت کی نفی کرنے کے بعد اب انفاق کی ترغیب دی جارہی ہے کہ جو چیز تمہارے اختیار میں ہے یعنی مال خرچ کرنا وہ کرتے رہو اس کو مت چھوڑنا۔ اس جملے میں پہلے ترغیب دی ہے کہ جو تم لوگوں کی ہدایت کیلئے مال خرچ کرتے ہو اس لئے اس کو جاری رکھو کہ اس کا فائدہ تمہارے ہی نفسوں کو ہے "خَيْرٍ" مال کے معنی میں ہے اس لئے کہ مال میں دنیا و آخرت دونوں کے فائدے ہیں بشرطیکہ حلال ہو۔ "وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ" یہ دوسری ترغیب ہے۔ امام فراء بغوی نے فرمایا کہ یہ نفی نہی کے معنی میں ہے اور یہ سابقہ جملہ کیلئے علت ہے کہ خیر کا فائدہ تمہیں اس لئے پہنچا ہے کہ تمہارا خرچ ریا و نمود و نمائش کیلئے نہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے ہے۔ یہ صفت چونکہ کامل مؤمن کیلئے ہر وقت ہوتی ہے اس لئے اس کو نفی کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس وجہ سے امام قرطبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صحابہ کرام کے اخلاص کی شہادت ہے کہ انہوں نے اپنے اموال کو خالص رضائے الٰہی کیلئے خرچ کیا تھا۔ "وَجْهِ اللّٰهِ" یہ کیفیت کے اعتبار سے متشابہات میں سے ہے جبکہ معنی کے اعتبار سے محکم اور ظاہری معنی پر محمول ہے یعنی اس سے مراد چہرہ ہے۔ سلف صالحین کا یہی موقف ہے کہ اس سے مراد بغیر تاویل و تشبیہ و تمثیل چہرہ ہے "وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ" یہ تیسری ترغیب ہے اور ایک وہم کا ازالہ ہے کہ جب مال خرچ کرنے سے ہدایت حاصل نہ ہو تو ثواب کے نقصان کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے تو اس جملہ میں اس وہم کو ختم کیا ہے یہ جملہ سابقہ جملوں پر بنا ہے یعنی تم نے جو مال خرچ کیا وہ تو صرف تم نے وجہ اللہ، اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کیا ہے اور وہ خرچ تم نے ذاتی فائدے کے لئے کیا ہو تو اس کا اجر و ثواب تمہیں بغیر کسی کمی کے ملے گا۔ "يُوَفَّ" یہ وفا سے لیا گیا ہے جو کثرت کے منافی نہیں ہے۔ "وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ" یہ یوف کی تاکید ہے ظلم نقص کے معنی میں ہے جیسا کہ سورہ کہف آیت: 33، میں مذکور ہے۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۡ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝ ع

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

"(صدقات) کے مستحق صرف وہ محتاج لوگ ہیں جو اللہ کے راستے میں روک دیئے گئے ہیں جو ملک بھر میں چل پھر نہیں سکتے نا سمجھ لوگ ان کوحرام سے اجتناب اور نہ مانگنے کی وجہ سے مالدار سمجھتے ہیں آپ ان کو خاص نشانیوں سے پہچان لیںگے۔ لوگوں سے بے ضرورت (چمٹ کر) سوال نہیں کرتے اور جو کچھ تم حلال مال سے خرچ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے"[273]۔

تفسیر 273: اس آیت میں خرچ کرنے کے متعلق پانچواں مسئلہ ہے یعنی اللہ کے راستے میں خرچ کرنا، سابقہ آیت میں ان لوگوں پر خرچ کا ذکر ہوا جن کو فائدہ نہیں ہوا یعنی وہ مشرف بالاسلام نہیں ہوئے تو اب ان لوگوں پر خرچ کرنے کا ذکر ہے جو کامل ہدایت والے ہیں۔ "لِلْفُقَرَآءِ" یہ مقدر کلام کے متعلق ہے یعنی "اَلنَّفَقَاتُ فِي سَبِيلِ اللهِ لِلْفُقَرَآءِ"

فائدہ: فرض زکوٰۃ کے مصارف سورۃ توبہ آیت: 60 میں مذکور ہیں یہاں پر دعوت اور جہاد کیلئے خرچ کا ذکر ہے۔ اس لئے یہاں پر مجاہدین اور داعیوں کی صفات مذکور ہیں۔ اس زمانے میں اصحاب صفہ مسجد نبوی میں قرآن وسنت کی تعلیم حاصل کرتے تھے پھر اس کی دعوت دیتے تھے اور جب محاذ پر جانے کی ضرورت پیش آتی تھی تو جہاد پر چلے جاتے۔ یہاں پر ان کی فقیری (غربت) کے ساتھ چھ صفات مذکور ہیں اب بھی اگر یہ صفات کسی میں ہیں تو انفاق فی سبیل اللہ کا مصرف ہے۔ پہلی صفت فقیری یعنی یہ لوگ کھانے، پینے، لباس اور ضروریات زندگی اور دعوت وجہاد کے لئے مال کے محتاج تھے مال نہ ہونے کی وجہ سے یہ ضروریات پوری نہیں کر سکتے تھے۔ "الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيلِ اللهِ" یہ دوسری صفت ہے۔ احصار کا معنیٰ یہ ہے کہ انسان کو ایسی حاجت درپیش ہو کہ سفر پر جانے سے رک جائے یعنی مرض، دشمن، خرچ کا نہ ہونا، درس، دعوت، جہاد یہاں پر آخری حاجت جہاد مراد ہے جس کی دلیل لفظ فی سبیل اللہ ہے۔ "اُحْصِرُوْا" صیغہ مجہول لانے میں اشارہ ہے کہ یہ اتنا مصروف ہے کہ اس کو فرصت اور فراغت نہیں ملتی۔ "لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ" یہ تیسری صفت ہے یہ جملہ حالیہ یا مستانفہ ہے سابقہ جملہ میں سبب کا ذکر تھا اور اس میں مسبب کا ذکر ہے۔ "ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ" یہ تجارت سے کنایہ ہے سفر کرنے سے عدم استطاعت کا سبب فی سبیل اللہ کاموں میں مصروفیت ہے۔ یا دشمنوں کے غلبے نے ان کو روک رکھا ہے۔ لہٰذا ایک صفت ان کی ثبوتیہ ہے جو کہ دینی امور میں مشغول ہونا ہے جبکہ دوسری صفت ان کی صفت سلبیہ ہے یعنی طاقت کا نہ ہونا۔ اصل میں یہ ان کے فقر کیلئے سبب ہے اس لئے اس کو واضح کیا گیا ہے۔

"يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ" یہ ان کی چوتھی صفت ہے۔ "الْجَاهِلُ" یہاں جہل علم کے مقابل نہیں بلکہ تجربے کے مقابل ہے یعنی نا سمجھ لوگوں کو یہ تجربہ نہیں ہے کہ ان کا حقیقی حال کیا ہے۔ "مِنَ التَّعَفُّفِ" میں مِنْ اَجْلِيَه

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے یا ابتدائیہ ہے اور یہ "یَحْسَبُهُمُ" کے ساتھ متعلق ہے۔ "التَّعَفُّفِ" عفت سے لیا گیا ہے۔ اور عفت کا معنی ہے کسی چیز پر قدرت رکھنے کے باوجود اعراض کرنا اس لئے کہ وہ چیز یا عمل ناپسندیدہ ہے۔ اس میں مقصود یہ ہے کہ یہ لوگ بے ضرورت مانگنے اور حرام کھانے پینے سے اجتناب کرتے ہیں۔ تَفَعُّلٌ کا صیغہ لانے میں مبالغہ کی دلیل ہے یعنی ہر قسم حرام سے اجتناب کرتے ہیں شرکیہ کھانوں دعوتوں اور رسمی کھانوں سے بھی اپنے آپ کو بچاتے ہیں۔ اس کیفیت کو دیکھ کر لوگ یہ گمان کر لیتے ہیں کہ یہ مالدار لوگ ہیں چنانچہ پھر ان کو زکوۃ صدقات نہیں دیتے یہ بھی ان کے فقر کی دلیل ہے۔ "تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ" یہ ان کی پانچویں صفت ہے اور یہ جملہ سوال کا جواب ہے۔ سوال: یعنی جب وہ مالدار نظر آتے ہیں تو ان کو مسلمانوں کے صدقات کی رسائی کس طرح ہوگی۔؟ جواب: خلاصہ یہ ہے کہ ان کے قریب کے مسلمان ان کے فقر کے حالات سے باخبر ہیں کیونکہ ان کی مخصوص علامات سے ان کو پہچانتے ہیں اس میں اشارہ ہے کہ سمجھدار مسلمانوں کو ان کی علامات سے انہیں پہچاننا چاہئے اس قسم کے ساتھیوں کے حالات سے آگاہی حاصل کرنی چاہئے۔ "سِيمَا" میں مختلف اقوال ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کے نزدیک اس سے مراد خشوع ہے۔ لیکن اس کی ظاہری علامت تواضع ہے۔ ربیع اور سدی رحمھم اللہ کا قول یہ ہے کہ یہ بھوک کے آثار ان میں نظر آتے ہیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ ان کے رنگوں کی زردی اور کمزوری مراد ہے یعنی کھانے پینے کی کمی سے یہ آثار ان میں ظاہر ہوئے ہیں۔ ابن عطیہ کا قول ہے کہ اس سے مراد زیادہ سجدہ ریز ہونے کے آثار مراد ہیں۔ امام رازیؒ نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد ان کا لوگوں کے دلوں میں رعب و ہیبت ہے ان کے دیکھنے سے لوگ متاثر ہوتے ہیں بقول امام رازیؒ کے اس سے مراد ظاہری آثار نہیں ہیں ورنہ پھر تو اور لوگ بھی ان کو پہچان لیتے۔ "لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا" یہ چھٹی صفت ہے۔ "إِلْحَافًا" مقدر فعل کیلئے مفعول مطلق ہے یا حال کی جگہ واقع ہوا ہے۔ اور یہ لحف سے لیا گیا ہے یعنی جس طرح لحاف بندے کے ساتھ پیوست ہوتا ہے اسی طرح مانگنے والا شخص بھی ہر بندے سے مانگتے ہوئے چمٹ جاتا ہے۔ سوال: اس عبارت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مانگتے تو ہیں مگر الحاف نہیں کرتے یعنی چمٹ کر نہیں مانگتے جبکہ تَعَفُّف سے معلوم ہوتا ہے کہ بالکل نہیں مانگتے۔؟ جواب ۱: یہاں مقید اور قید دونوں کی نفی ہے یعنی بالکل نہیں مانگتے۔ جواب ۲: الحاف لازمی معنی میں ہے یعنی بلا ضرورت نہیں مانگتے اور تَعَفُّف سے مراد حرام مانگنے سے اجتناب ہے یعنی بلا ضرورت مانگنا حدیث میں یہ معنی مذکور ہے کہ "مَنْ سَأَلَ وَلَهُ أَرْبَعُونَ دِرْهَمًا فَقَدْ أَلْحَفَ" ابوداؤد حدیث 1627 و مالک فی الموطا 999 قال الشیخ البانی اسنادہ صحیح۔ یعنی جس شخص کے پاس چالیس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

درھم ہوں اور پھر بھی وہ مانگتا پھرے تو اس نے الحاف کیا۔ (سنن نسائی وسنن بیہقی) ایک اور حدیث میں ہے کہ۔ "مَنْ سَأَلَ مِنْكُمْ وَلَهُ أُوقِيَّةٌ أَوْ عَدْلُهَا فَقَدْ سَأَلَ إِلْحَافًا" جس کے پاس چالیس درہم (اوقیہ) یا اس کے برابر قیمت موجود ہو پھر بھی وہ مانگتا پھرے تو یہ الحاف ہے۔ عطاء سے الحاف کی تفسیر میں منقول ہے کہ جس کے پاس دو پہر کی خوراک موجود ہے تو رات کی خوراک کا بندوبست کرنے کیلئے کسی سے بھیک نہیں مانگے گا۔ اسی طرح برعکس بھی۔ یعنی بلا ضرورت نہیں مانگے گا۔ اللباب: امام قرطبی رحمہ اللہ کا قول بھی اسی چالیس درہم والی حدیث کا ہے۔ تو اس توجیہ میں قید کی نفی ہوئی عربیت کا عام قانون یہ ہے کہ نفی کلام میں مقید فقط قید کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ امام رازی کا یہ بھی قول ہے کہ غربت کی نشانی ظاہر کرنا بھی الحاف ہے اس معنی میں سابقہ جملہ کے ساتھ مناسبت اور موافقت بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنا فقر اور آثار مسکینی کیوں ظاہر نہیں کرتے اس لئے کہ یہ الحاف ہے جبکہ وہ الحاف سے بچنا چاہتے ہیں۔ "وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ" یہ جملہ انفاق کی ترغیب میں تاکید کیلئے ہے۔ "فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ" اس میں بھی اجر وثواب کے حصول کی ترغیب ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے چنانچہ وہ تمہارے اجر کو ضائع نہیں کریگا۔

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ "وہ لوگ جو اپنے مال دن رات ظاہر اور خفیہ طور پر خرچ کرتے ہیں ان کے لئے ان کے رب کے پاس اجر ہے ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔" (274)

تفسیر 274: اس آیت میں انفاق فی سبیل اللہ سے متعلق چھٹی بات ہے۔ اس سے مراد اوقات اور حالات کی عمومیت ہے اور اس میں انفاق کرنے والوں کیلئے بشارت اخروی ہے۔ "الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ" آیت عام ہے جو اوقات وحالات اور ضروریات کی مناسبت سے ترغیب ہے۔ امام ابن جریر وامام قرطبی رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے متعلق ہے جنہوں نے گھوڑے جہاد کیلئے پال رکھے ہیں وہ رات دن چرتے ہیں کبھی ظاہر اور کبھی مخفی ہوتے ہیں۔ حدیث میں بھی اجر کا تذکرہ اس طرح ہے کہ ان گھوڑوں کا گھاس کھانا ان کی لید، پیشاب وغیرہ سب قیامت کے دن میزان حسنات میں تولے جائیں گے۔ "صحیح بخاری کتاب الجھاد حدیث 2849" "بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ" اس میں اشارہ ہے کہ صدقہ خیرات کیلئے کوئی مخصوص دن یا رات مثلاً جمعہ کی رات، تیجہ چہلم وغیرہ خاص کرنا بدعت ہے کیونکہ لیل ونہار عام ہے۔ لیل کو مقدم کرنے میں اشارہ ہے کہ رات کا صدقہ دن سے افضل ہے۔ "سِرًّا وَعَلَانِيَةً" اس میں حالات کی مناسبت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے خرچ کرنے کا ذکر ہے یعنی ریاء، منّ و اذیٰ کے بغیر خرچ مراد ہے یہاں پر بھی لفظ "سِرًّا" کو مقدم کیا ہے کیونکہ علانیہ خرچ میں ریا، نام و نمود کا خوف و احتمال ہے۔ "فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ" یہ "اَلَّذِیْنَ" کیلئے جزاء ہے کیونکہ وہ معنیٰ شرط اور علّیت کو متضمن ہے۔ یعنی وہ انفاق اللہ سے اجر لینے کیلئے علت ہے۔ "عِندَ رَبِّهِمْ" میں اشارہ ہے کہ یہ اجر عظمت والا ہے۔ "أَجْرُهُمْ" جزاء ثبوتی اور "لَا خَوْفٌ" جزاء سلبی ہے۔

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا ۗ وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا ۚ فَمَن جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّهِ فَانتَهَىٰ فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَمَنْ عَادَ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ "وہ لوگ جو سود کھاتے ہیں (قبروں سے) کھڑے نہیں ہوں گے مگر اس شخص کی طرح جس کو شیطان نے چھو لینے سے پاگل بنایا ہو اور یہ اس لئے کہ انہوں نے کہا کہ سود بھی تجارت کی طرح ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام اور تجارت کو حلال قرار دیا ہے پس جو بھی اپنے رب کے وعظ و دلائل آنے کے بعد رک گیا تو اس کیلئے وہی ہے جو گزر گیا (یا جو اس نے دیا ہے) اور اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے۔ اور جس نے پھر بھی حلال جانا تو وہی لوگ جہنمی ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔" (275)

تفسیر 275: تیسرے باب کا خلاصہ ہے یہاں سے (283) تک تیسرا باب ہے۔ اس میں پہلے ان لوگوں کو جو سود کو حلال قرار دیتے ہیں خوف اور تنبیہ ہے۔ پھر ان لوگوں کے لئے خوشخبری ہے جن میں صفات ایمانیہ ہیں یعنی بدنی و مالی عبادات جو کہ سود لینے والوں میں نہیں ہیں۔ پھر ایمان والوں کو سود سے آیت 278، 279 میں منع کیا گیا ہے۔ اور قرضداروں سے نرمی والا معاملہ کرنے کی ترغیب دی ہے اور ساتھ میں تخویف بھی ہے۔ آیت 280، 281 پھر آیت مداینہ مالی امور میں جھگڑوں سے بچنے کیلئے لین دین کے آداب ہیں جس طرح سود سبب فساد ہے تو اسی طرح ان آداب سے اعراض بھی فساد ہے یہ دو آیتوں 282، 283 میں مذکور ہے۔ ربط ۱: انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیبات ذکر کرنے کے بعد اب سود کے راستے حرام مال کمانے سے منع مذکور ہے۔ کیونکہ حرام اور خبیث مال خرچ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

ربط ۲: خرچ کرنے سے مال کم ہوتا ہے جبکہ سود سے مال بڑھتا ہے تو مناسبت تضاد کا ہے تو پہلا سبب برکات کا ہے دوسرا سبب نحوست دنیا و آخرت میں بے برکتی کا ہے۔ ربط ۳: سابقہ آیت میں انفاق فی سبیل اللہ کرنے والوں کو جو کہ عمل صالح ہے آخرت میں بشارت کا ذکر ہے تو اس آیت میں آخرت میں سود سے پیدا ہونے والے عذاب کے تخویف کا ذکر ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

''اَلَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ الرِّبٰوا '' یہ مستقل کلام ہے کیونکہ یہ مقابل کے خلاف ہے اس لئے اس کو ما قبل پر عطف بھی نہیں کیا ہے۔ آکل سے مراد سود کے طریقے سے کمائی ہے لیکن کھانا مالداروں، دنیا پرستوں کا اہم مقصد ہوتا ہے اس لئے اکل کا ذکر فرمایا اور اس میں سود خوروں کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا مقصد جانوروں کی طرح پیٹ بھرنا ہے۔ ''الرِّبٰوا '' عربی لغت میں بلندی اور اضافے کو کہا جاتا ہے جیسا کہ سورہ حج آیت:5، میں ''رَبَتْ '' مذکور ہے۔ شریعت میں ربا کی دو قسمیں ہیں۔ (1) ربا نسیئۃً قرض کا ہے۔ (2) زیادت عوض ہے۔ پہلی والی تو جاہلیت میں بہت مشہور تھی یعنی کسی کو قرض دیکر پھر ماہانہ یا سالانہ اس پر اضافہ کرتے رہنا یعنی کسی کو ایک سو روپیہ قرض، یا پھر اس سے مہینے کے بعد ایک سو بیس لینا وغیرہ۔ جیسا کہ دور حاضر میں بینکاری کرنے والوں کی بھی یہی ترتیب ہے کہ لوگوں سے رقم لیتے ہیں اور اس رقم پر واپسی مقدار بڑھا کر دیتے ہیں جو سود ہے۔ دوسری قسم گندم، کھجور وغیرہ کسی کو ایک من دیکر واپس دگنا لیتے ہیں اگرچہ دونوں کے معیار میں فرق ہو یہ سب سود کی قسمیں ہیں۔ جیسا کہ مشہور احادیث میں چھ قسم کی اجناس کا ذکر ہوا ہے کہ یہ دینے یا لینے میں وزن، ناپ تول میں برابر اور نقد و نقد ہوں گے۔ (متفق علیہ) مزید تفصیل وتشریح احادیث کی کتب وفقہاء کی کتابوں میں درج ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ سود کی حرمت کی آیت احکام کی آیتوں میں نزول کے اعتبار سے آخری آیت ہے صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4544۔ سورہ روم آیت نمبر 36، میں اس کا ذکر ہے اس کے بارے میں مفسرین نے وضاحت کی ہے کہ جو کسی کو تحفہ دیتا ہے مگر نیت زیادہ لینے کی ہو یعنی بدلہ میں زیادہ تحفہ ملے گا تو یہ بھی سود ہے اور اسکو یہود کی صفت قرار دیا ہے جیسا کہ سورہ نساء آیت: 161، میں مذکور ہے۔ اس جرم سے ایمان والوں کو سورہ آل عمران آیت: 130، میں منع کیا گیا ہے ''لَا يَقُوْمُوْنَ '' ابن عباس رضی اللہ عنہما، سعید بن جبیر، قتادہ، مجاہد رحمہم اللہ وغیرہ سے منقول ہے کہ اس سے مراد قیامت کے دن قبروں سے اٹھنا ہے۔ اس کی تائید ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں لفظ يَوْمَ الْقِيَامَةِ آیا ہے۔ اس معنی میں یہ تخویف ہے اور ابن عطیہ نے اس کو مجازی معنی پر محمول کیا ہے یعنی یہ زندگی انتہائی حرص کی حالت میں تھکاوٹ پریشانی والی زندگی دیوانوں، پاگلوں کے مانند گزارتے ہیں۔ یعنی یہ مال کا دیوانہ ہے بدحالی اور مال کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے اس مجازی معنی میں یہ سود والوں کی برائی، بدحالی بیان کرنا مقصود ہے۔ اس میں بہتر تفسیر پہلی ہے دوسری تو صرف بطور تاویل اس میں داخل کی جا سکتی ہے۔ ''اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ '' خَبَطَ اصل میں ایسے مارنے کو کہا جاتا ہے جس سے انسان کا دماغ کام کرنا چھوڑ دے اور غلط

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

ملط ہوجائے۔ جبکہ عرف عام میں چلنے پھرنے کی چال میں بدنظمی کو خبط کہا جاتا ہے۔ شیطان سے مراد سرکش جن ہے۔ اس میں دو احتمالات ہیں (۱) جن شیطان کو اللہ تعالیٰ نے یہ قوت دی ہے کہ وہ انسان کو مغلوب و بے بس کر دے کہ اس کے دماغ پر اثر کر دے۔ اس کے حواس کو خراب کر دے جس کو مجنون کہا جائے۔ امام ابوحیان کا قول ہے کہ یہ بات عقل کے خلاف 8
نہیں ہے۔ (۲) اللہ تعالیٰ بندے میں اس طرح کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے کہ اس کی عقل کام کرنا چھوڑ دیتی ہے اور اس کی نسبت شیطان کی طرف تشبیہا یا مجازاً کی گئی ہے۔ "مِنَ الْمَسِّ" مفسرین کے اس میں دو قول ہیں۔ پہلا قول: یہ "يَتَخَبَّطُهُ" کے ساتھ متعلق ہے۔ ایک وہم کا ازالہ کرنا مقصود ہے وہم یہ ہے کہ لفظ تَخَبُّط مجازی معنی میں ہو یعنی گناہوں کو مزین کرنا جسکو اغوا کہتے ہیں لہذا "مِنَ الْمَسِّ" عبارت سے یہ وہم ختم ہوا۔ اور اس معنی میں مَسّ سے مراد شیطان کا انسان پر تسلط ہے جو انسان میں داخل ہو کر اس کے دماغ، عقل و حواس پر اثر کر لیتا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کی رد میں ہے جو انسانوں پر جنات کی تاثیر کو نہیں مانتے۔ دوسری دلیل وہ صحیح حدیث ہے کہ شیطان بندے کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے۔ صحیح مسلم کتاب السلام حدیث 2174 صحیح ابوداؤد 2470 صحیح ترمذی 1172 صحیح ابن ماجہ 1779 تاویلات کرنا معتزلہ کا مذہب ہے۔ زمخشری معتزلی نے بھی اقرار کیا ہے کہ میں نے جنات کے بہت سے واقعات دیکھے ہیں جن سے انکار مشاہدات سے انکار کے مترادف ہے۔

دوسرا قول: یہ "لَا يَقُومُونَ" کے متعلق ہے اور لفظ مَسّ سے مراد جنون ہے تو ابن عطیہ رحمہ اللہ کی تاویل کے مطابق جنون تشبیہی مراد لیا جائے گا۔ لیکن پہلے قول و تفسیر کی بنا پر امام ابوحیان رحمہ اللہ نے اس کو لَا يَقُومُونَ کے ساتھ متعلق کرنے پر دو طریقوں سے رد کیا ہے اس کے رد کا پہلا طریقہ اس طرح ہے کہ قیامت کے دن لوگوں پر حقیقی جنون نہیں آئے گا۔ دوسرا طریقہ انہوں نے رد کا یہ اختیار کیا ہے کہ الا استثنائیہ کے بعد کوئی لفظ استثناء سے ماقبل کے ساتھ متعلق نہیں ہو سکتا مگر اس صورت میں کہ استثناء کے توابع میں سے ہو جبکہ یہاں اس طرح نہیں ہے۔ "ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا" "ذٰلِكَ" میں قیام کے اس حال کی طرف اشارہ ہے جو عذاب کا مخصوص انداز ہے جو کہ لفظ خبط میں گزرا ہے یا "ذٰلِكَ" میں سود کھانے کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ اس لئے سود کھاتے ہیں کہ اس کو حلال تصور کرتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ سود اور تجارت دونوں میں فائدہ زیادہ مقدار میں ہے سود اور تجارت یکساں ہیں اس لئے کہ سود میں بھی وقت مقررہ پر نفع حاصل ہوتا ہے اور تجارت میں بھی جب وقت آ لے پر وصولی ہوتی ہے تو منافع ہوتا ہے چنانچہ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے یہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لوگ اصل میں حلال ہونے کے لحاظ سے سود کو تجارت سے تشبیہ دینا چاہتے ہے مگر مبالغہ پیدا کرنے کے لئے تجارت کی تشبیہ سود سے دی ہے۔ اور یہ تشبیہ واضح دلیل ہے کہ انہوں نے حرام کو حلال قرار دیا ہے جو کہ ان کے کافر ہونے کی واضح دلیل ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیز کو حلال قرار دینا کفر کے ارتکاب میں سے ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو کہ "لَا يَقُوْمُوْنَ" کا عذاب کفار کے لئے ہے "وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا" اس میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے قول کا جواب ہے وہ یہ کہ حلال وحرام کے اختیارات صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں اور اس نے یہ فرق کرلیا ہے۔ امام ابوحیان رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ دلیل ہے کہ نص کے مقابل قیاس کرنا جائز نہیں ہے۔ اس کی لغوی واصطلاحی اور آثار جو اس پر مرتب ہوتے ہیں اس میں فرق بالکل واضح ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک یہ کفار کا کلام ہے جو اللہ تعالیٰ کی حلت وحرمت کے فیصلے کو معیوب قرار دیتے ہیں اور ان کا یہ عمل جان کر ارتکاب کفر ہے۔ "فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ" "مَوْعِظَةٌ" تانیث حکمی ہے اسلئے اس کے ساتھ فعل مذکر ذکر کیا ہے۔ یہاں "مَوْعِظَةٌ" سے قرآن مجید کی آیت اور سود کی حرمت کی وعید مراد ہے۔ یہ اقوال مختلف ہیں مگر سب کا مقصد ایک ہے۔ "مِنْ رَّبِّهٖ" یہ "جَآءَ" کے ساتھ متعلق ہے یا "مَوْعِظَةٌ" کیلئے تقدیر (مقدر) صفت ہے۔ دونوں حالتوں میں عظمت وعظ کی طرف اشارہ ہے اور لفظ "رَبّ" میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے احکام کے ذریعے سے بندوں کی اصلاح کرتا ہے لہٰذا اس کا حکم ماننا ضروری ہے۔ "فَانْتَهٰى" "جب اس نہی کی تابع ہوجائے اور توبہ کرکے ہر حرام کمائی سے پرہیز کرے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے ایک خاتون سے آٹھ سو درہم ادھار پر لونڈی خریدی تھی پھر اس خاتون پر رقم کی ادائیگی کی تاریخ سے پہلے 600، سو درہم نقد پر فروخت کی۔ عائشہ رضی اللہ عنھا نے اس خاتون سے کہا کہ تو نے جو خرید وفروخت کی ہے وہ بہت بری ہے۔ اور زید کو پیغام بھیجا کہ توبہ کرلو ورنہ تمھارا جہاد باطل ہوجائے گا۔ پھر اس خاتون نے زید کو دو سو درہم معاف کیے۔ عائشہ رضی اللہ عنھا نے یہ آیت تلاوت کی۔ (تعليق المغنى وقال شمس الحق رحمه الله نقلاً عن التنقيح اسناده جيد جلد 3/53) اس میں اشارہ ہے کہ یہ آیت ہر قسم فاسد تجارت، لین دین کو شامل ہے۔ "فَلَهٗ مَا سَلَفَ" "سلف اس عمل کو یا گناہ کو کہا جاتا ہے جو اس آیت کے نزول یا حرمت ربا سے پہلے انہوں نے کیا تھا یعنی ان پر گناہ نہیں ہے یا مراد یہ ہے کہ توبہ سے قبل جو سود کیلئے رقم دی ہے اس سے اصل رقم لینگے اور زیادہ رقم یعنی سود نہیں لیں گے۔ "وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ" (ہ) اس ضمیر میں چار اقوال ہیں۔ پہلا قول: یہ سود سے رک جانے والے کی طرف راجع ہے امر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے تمام وہ امور مراد ہیں جو اس سے متعلق ہیں یا مراد ان کا معاملہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے سزا، جزاء، حساب ان کے حوالے ہے یا اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ کہ انہوں نے حکم الٰہی کو تسلیم کیا۔ دوسرا قول: مَاسَلَفَ کی طرف راجع ہے یعنی اس کا معاملہ نقصان زائل کرنے عفو ودرگزر کرنے میں اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے۔ تیسرا قول: سود کا لین دین کرنے والے کی طرف راجع ہے کہ یہ گناہ پر قائم رہتا ہے یا منع پر دوام کرتا ہے۔ چوتھا قول: یہ ربا کی طرف راجع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حرام کیا ہے۔ "وَمَنْ عَادَ" مراد یہ ہے کہ اس قول کی طرف پلٹ جاتا کہ "اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا" (سود اور تجارت برابر ہے)۔ یعنی سود کو حلال سمجھے عود سے مراد صرف عمل نہیں ہے کیونکہ دیگر نصوص سے یہ بات ثابت ہے کہ ہمیشہ کیلئے جہنم میں جانا فقط سودی کاروبار سے نہیں ہے۔ (بلکہ سود کو حلال سمجھنے یا قرار دینے کی وجہ سے ہے)۔ "فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ" معتزلہ جیسے زمخشری کا قول ہے کہ اس آیت میں دلیل ہے کہ فاسق ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ لیکن پہلے ہم بتا چکے ہیں کہ صرف سود کھانے سے بندہ جہنم میں ہمیشہ نہیں رہے گا بلکہ سود کو حلال قرار دینے سے وہ کفر کا مرتکب ہوا جس کی دلیل یہ ہے کہ اپنی پہلی بات کی طرف انہوں نے اعادہ کیا یعنی "اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا" ہے۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾ "اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی نافرمان اور ناشکرے سے محبت نہیں کرتا" (276)

تفسیر 276: اس آیت میں تحذیر مقصود ہے کہ سود اور صدقات میں فرق کر کے سود کے انجام سے ڈر جائے۔ اور تقابل دونوں میں یہ ہے کہ سود خور انسان حرص کی وجہ سے صدقات نہیں کرتا۔ "يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا" محق اصل میں مٹانے نقص پیدا کرنے کو کہا جاتا ہے۔ سود کا محق دنیا میں چار طریقوں سے ہے۔ (۱) پہلی صورت یہ ہے کہ اس کی عاقبت فقر اور زوال برکت ہے۔ (۲) دوسری صورت یہ ہے کہ سود خور کے اندر سے عدل اور امانت زائل ہو جاتی ہے اور وہ سخت دل بن جاتا ہے۔ (۳) تیسری صورت یہ ہے کہ جس نے بھی اس سے سود کی رقم لی ہے تو وہ اسے بددعا دیتا ہے۔ (۴) چوتھی صورت یہ ہے کہ جب اس کی سودی مالداری لوگوں میں معروف ہوتی ہے تو چور ڈاکو وغیرہ ان پر مسلط ہوتے ہیں اور اس کے مالی نقصانات کے درپے ہوتے ہیں۔ آخرت میں محق تین طریقوں سے ہوتا ہے۔ (۱) ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ سود خور کی عبادت مردود ہے۔ (۲) مال تو تباہ و برباد ہو جائے گا اور گناہ و عقوبت اس کے ذمہ باقی ہوگا۔ (۳) مالدار دیندار

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لوگ مؤمن فقیروں سے پانچ سو سال کے بعد جنت میں جائیں گے۔تو جو حرام مال سے مالدار بنیں گے وہ تو بہت بعد میں جائیں گے۔" وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ " اربا، اضافے کو کہا جاتا ہے یہ بھی دنیا و آخرت میں ہوتا ہے یہ ان امور کے برعکس ہے۔جو لفظ ربا میں بیان ہوئے (اللباب) امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یمحق ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا سب مال چھین لے سب غرق کر دے غرق ہونے یا گم ہو جانے سے اور اس کو تباہ کر دے دنیاوی عذاب سے اور آخرت میں بھی۔نیز اسی طرح سورہ روم آیت:39۔ میں بھی ہے۔" وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ " امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس سے کافر اور قولی و فعلی گناہ گار بھی مراد ہے۔سبب یہ ہے کہ سود خور انسان اللہ تعالیٰ کی تقسیم سے خوش نہیں ہے شرعی طریقے سے مال کمانے کے بجائے باطل ذریعے سے مال جمع کرتا ہے لہٰذا یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا منکر ہے۔اور حلال مال پر اکتفاء نہ کرنے سے مجرم ہے اور لوگوں کا مال ناجائز طور پر کھانے سے گناہ کا مرتکب ہے۔امام ابو حیان رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ سود کھانا کافروں کا عمل ہے۔لفظ " اَثِيْمٍ " کو تاکید اور مبالغے کیلئے ذکر کیا ہے۔صاحب اللباب نے فرمایا ہے کہ " اَثِيْمٍ " اور " كَفَّارٍ " مبالغے کے اوزان پر ہیں مطلب یہ ہے کہ کفر اور گناہ ان کی عادات میں سے ہے یہ موافق ہے اس کیلئے جو سود کی حرمت سے منکر ہے۔اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کافروں کا وصف راجع ہے ان لوگوں کی طرف جو سود کھاتے اور اسے حلال بھی تصور کرتے ہیں۔اور " اَثِيْمٍ " کا وصف ان کی طرف راجع ہے جو سود کے جرم میں مبتلا تو ہیں مگر اس کو حلال نہیں مانتے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ "یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کئے اور نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ ادا کی ان کیلئے ان کے رب کے پاس اجر ہے۔نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے"(277)

تفسیر 277: تخویف کے بعد اب بشارت کا ذکر ہے۔اور بری صفات کے بعد اب اچھی صفات کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ان صفات کی تشریح بتفسیر گزر گئی ہے۔سوال: جب ایک شخص صحیح ایمان کے ساتھ نماز اور زکوٰۃ کی فرضیت کا عقیدہ رکھتا ہے تو اہل سنت کے نزدیک یہ ثواب کا حقدار ہے اس سے معلوم ہوا کہ اجر و ثواب کا دارومدار عمل پر موقوف نہیں ہے پھر اس کے ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے۔؟ جواب: اعمال ذکر کرنا ثواب کے استحقاق کیلئے نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ ہر نیک عمل کا حصول ثواب ہوتا ہے برخلاف مرجیہ کے جو اس کے منکر ہیں۔ان اعمال سے درجات کی بلندی یا دخول جنت حصول

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے۔(اللباب) اس آیت میں وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ سودخوروں کے مقابل ہے کیونکہ ربا کرنے والے زکوٰۃ نہیں دیتے تو اس سے معلوم ہوا کہ سود مومن کی صفت نہیں ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

"اے لوگوں جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور سود میں سے جو باقی ہو اسے چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔(278)

تفسیر 278: سابقہ آیتوں میں کافروں کے عقیدے کا رد کیا گیا ہے کہ وہ سود کو حلال جانتے ہیں تو اب ایمان والوں کو خطاب ہو رہا ہے۔"فَلَهٗ مَا سَلَفَ" میں احتمال تھا کہ جو معاملہ ہو چکا ہے یعنی حرمت سے قبل ان مالوں کا حساب نہیں ہوگا یہ بھی احتمال تھا کہ ابھی مقروض کے ذمے تھے لیکن طے شدہ ہے تو وصول کرنا جائز ہوگا تو اس آیت میں دوسرے احتمال کو رد کیا جاتا ہے کہ" وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا "یعنی جو مال ابھی وصول نہیں کیا ہے تو وہ معاف کر دو۔"يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ "اس خطاب میں آنے والے حکم کو ماننے کی ترغیب مقصود ہے۔تقویٰ کا حکم دینا سودی مال چھوڑ دینے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کام جہنم کی آگ سے بچاؤ کا ذریعہ ہے۔"مَا بَقِيَ "میں دو احتمال ہیں۔پہلا احتمال یہ ہے کہ وہ مال جو مقروض کے ذمہ باقی ہو دوسرا یہ کہ الربوا کے ان طریقوں سے اجتناب مقصود ہے جو دوسرے علاقوں یا ملکوں میں ہوں۔"اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ "یہ شرط برائے تاکید ہے امام مقاتل سے منقول ہے کہ "اِنْ" بمعنی "اِذْ" ہے۔ یا پہلے خطاب میں زبان کا ایمان اور لفظ مومنین میں دل کا ایمان مراد ہے۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝ "اگر تم ایسا نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جنگ کیلئے تیار ہو جاؤ البتہ اگر تم توبہ کرلو تو تمہارا اصل مال تمہارا ہی ہے نہ تم ظلم کرو نہ تم ظلم کئے جاؤ گے"(279)

تفسیر 279: حرمت سود نازل ہونے کے باوجود سود کھانے والوں کو شدید ڈانٹ ہے۔"فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا "فعل سے مراد ترک ہے یعنی سود کا جو پیسہ باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو۔امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم سود کی حرمت کا اقرار نہیں کرتے تو پھر"فَاْذَنُوْا "اذن سے علم مراد ہے یا استماع یعنی غور سے سننا مراد ہے۔" بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ" اگر اس سے مراد کفار ہیں تو پھر ان سے اللہ تعالیٰ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں جنگ کرو کیونکہ وہ ربا کو حلال مانتے ہیں اگر اس سے مراد مومنین ہیں تو ان کو ڈانٹنے میں مبالغہ مراد ہے یعنی مسلمان حکمران کو ان سے جنگ کرنی چاہیے۔ان کو باغی سمجھ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کران سے جنگ کی جائے گی۔ " بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ " اس میں لفظ حرب نکرہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب برائے تاکید مبالغہ ہے یعنی ان سے جنگ لازمی ہونی چاہیے۔ " حَرْبَ اللّٰهِ " اس لئے نہیں فرمایا کہ اس میں مفعول کی طرف اضافت کا احتمال تھا جبکہ یہاں پر (حرب) جنگ اللہ کی طرف سے ہے لہٰذا اس میں بہت ہی تاکید ہے۔ " وَرَسُوْلِهٖ " نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں خود قتال مراد ہے اور وفات رسول ﷺ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور سنت کے مطابق جہاد ہے۔ " وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ " اس میں ہر قسم کے سود سے توبہ کرنے کی ترغیب ہے۔ جس کی تفصیل امام قرطبیؒ نے اس طرح بیان کی ہے کہ اس کے ہاتھ میں سود کا مال موجود ہو اور جن سے لیا ہو وہ حاضر ہوں تو وہ مال واپس کرے اور جو موجود نہ ہوں ان کو بلا کر دیدے اور جو فوت ہو گیا ہو یا ان سے ملاقات سے نا امید ہو تو وہ صدقہ کرے۔ یہ حکم ہر اس حرام مال کا ہے جو ظلم و جبر اور زیادتی سے حاصل کیا گیا ہو۔ " رُءُوْسُ " جمع ہے رَأْسٌ کی اصل مال مراد ہے جو انہوں نے سود لینے کے لئے دیا تھا۔ " لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ " پہلا صیغہ معلوم ہے جس کا مفعول مقدر ہے۔ (اَلْغَرِيْمَ الْمَقْرُوْضَ) یعنی قرضدار پر ظلم مت کرو یعنی اصل رقم سے زیادہ مت لو۔ اور " وَلَا تُظْلَمُوْنَ " مجہول کا صیغہ ہے یعنی تم پر رأس المال (اصل) رقم میں (ظلم) کمی نہیں کی جائیگی اور نہ ہی ٹال مٹول سے کام لیا جائے گا۔ پہلے جملہ میں ظلم زیادت کے معنی میں ہے جبکہ دوسرے جملہ میں نقصان کے معنی میں ہے۔ تو معلوم ہوا کہ ظلم زیادت و نقصان دونوں میں لغت کے اعتبار سے مستعمل ہے۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ " اگر مقروض شخص تنگدست ہو تو اس کی فراوانی (مالداری) تک انتظار تم پر لازم ہے۔ اور اگر تم بطور صدقہ اس کو معاف کرو تو تمہارے لئے بہت ہی اچھا ہے اگر تم جانتے ہو" (280)

تفسیر 280: اس آیت میں قرض خواہوں کیلئے آداب کا ذکر ہے اور یہ " فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ " پر عطف ہے۔ یعنی قرض لینے والوں کو لینے کا حق حاصل ہے مگر اس صورت میں جب مقروض دینے کی طاقت رکھتا ہو لیکن اگر وہ تنگدست ہے تو اس کی مالداری اور فراخی کا انتظار کیا جائے گا۔ امام قرطبیؒ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حسن بصریؒ، اور عام فقہاء کے متعلق ذکر کیا ہے کہ انہوں نے اس آیت کو عام قرار دیا ہے یعنی قرضدار سود ربا کا ہو یا عام قرض کا۔ كَانَ تامہ ہے اور وقع وجد کے معنی میں ہے اور یہ صرف فاعل چاہتا ہے۔ کوفیوں کے نزدیک یہ کان ناقصہ ہے جس کی خبر مَنْ مقدر ہے یعنی " غَرِيْمًا "

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ "عُسْرَۃٍ" مال نہ ہونے کی وجہ سے تنگدستی مراد ہے۔ "فَنَظِرَۃٌ" اس کا مبتدا مقدر ہے یعنی "فَالْوَاجِبُ" یا خبر مقدر ہے یعنی "فَعَلَیْکُمْ نَظِرَۃٌ" "نَظِرَۃٌ" انتظار اور مہلت دینے کے معنی میں ہے۔ "اِلٰی مَیْسَرَۃٍ" یہ یُسْر سے لیا گیا ہے۔ اس سے مراد وقت یسار ہے جو عسار کے مقابل ہے۔ جس سے مراد اتنا مال ہے جس سے صرف قرض ادا ہو۔ زیادہ مالداری مراد نہیں ہے۔ "وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ" یہ بتاویل مصدر مبتدا ہے۔ اور اس میں دو قول ہیں۔ پہلا قول: اس سے مراد مہلت دینا ہے لیکن اس کو تَصَدُّق ترغیب کیلئے کہا گیا ہے۔ دوسرا قول: اس سے مراد قرض معاف کرنا ہے اور اس بات کی دلیل یہ ہے کہ قرض معاف کرنا صدقہ ہے۔ "خَیْرٌ لَّکُمْ" یعنی مہلت دینے سے صدقہ کرنا بہت بہتر ہے کیونکہ دنیا میں تعریف اور آخرت میں ثواب و اجر عظیم کیلئے سبب ہے۔ "اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ" یہ شرط خیریت کیلئے قید ہے یعنی اچھائی برائی میں فرق کیلئے علم چاہیے۔ یا یہ شرط صرف ترغیب کیلئے ہے تَعْلَمُوْنَ سے مصدری معنی مراد ہے یعنی اگر تم علم والے ہو۔ یا پھر اس کا مفعول مقدر ہے۔ یعنی "فَضْلُ التَّصَدُّقِ عَلَی الْاِنْظَارِ" یعنی تمہیں اگر مہلت دینے کے بجائے صدقہ کرنے کی فضیلت معلوم ہو۔

وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَی اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ "اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے جاؤ گے پھر ہر نفس کو اس کے کیے ہوئے عمل کا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اور وہ ظلم نہیں کیے جائیں گے۔" (281)

تفسیر 281: اس آیت میں آخرت کے تخویف کا ذکر ہے اور گزرے ہوئے احکام پر عمل کرنے کی ترغیب ہے خاص کر سود سے اجتناب اور تنگدست شخص کو مہلت یا مال معاف کر کے صدقہ کرنا۔ "وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَی اللّٰهِ" "یَوْمًا" سے قبل عذاب و حساب کا لفظ مقدر ہے۔ رجوع سے قیامت کے دن عدالت الٰہی میں سوال و جواب حساب و میزان کیلئے پیشی مراد ہے۔ "اِلَی اللّٰهِ" سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا پناہ کی جگہ نہیں اور بادشاہی بھی اسی کی خاص ہوگی۔ اکثر مفسرین نے اس سے قیامت والا دن ہی مراد لیا ہے۔ "ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ" پیشی ہونے کے بعد جزاء یا سزا ہے اس لئے "ثُمَّ" فرمایا ہے۔ "تُوَفّٰی" کی تفصیل سورہ زلزال آیت 7، 8 میں امام قرطبی نے فرمائی ہے۔ "مَا کَسَبَتْ" دلیل ہے کہ دار و مدار جزا و سزا کا عقیدہ و عمل پر ہوگا۔ "وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ" یہاں لفظ ظلم زیادت اور کمی دونوں کیلئے ہے۔ اس آیت کی سابقہ آیت سے مناسبت یہ ہے کہ کیا تم چاہتے ہو کہ قیامت کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دن اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ اچھائی کا معاملہ کرے تو پھر تم دنیا میں اللہ تعالیٰ کے بندوں سے اچھائی کا معاملہ کرو۔ صحیح بخاری کی روایت کے مطابق نزول کے اعتبار سے قرآن مجید کی آخری آیت ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ یہ ما انزل اللہ کی آخری آیت ہے۔ صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4544 البتہ جبریل علیہ السلام نے فرمایا کہ اس آیت کو 280، کے بعد رکھو پھر مختلف اقوال ہیں کہ اس آیت کے نزول کے 3، یا 7، یا 21، یا 81، دن بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوئے ہیں۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَٱكْتُبُوهُ ۚ وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِٱلْعَدْلِ ۚ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَن يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ ٱللَّهُ ۚ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ ٱلَّذِى عَلَيْهِ ٱلْحَقُّ وَلْيَتَّقِ ٱللَّهَ رَبَّهُۥ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ۚ فَإِن كَانَ ٱلَّذِى عَلَيْهِ ٱلْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَن يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُۥ بِٱلْعَدْلِ ۚ وَٱسْتَشْهِدُوا۟ شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ ۖ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَٱمْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ ٱلشُّهَدَآءِ أَن تَضِلَّ إِحْدَىٰهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَىٰهُمَا ٱلْأُخْرَىٰ ۚ وَلَا يَأْبَ ٱلشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوا۟ ۚ وَلَا تَسْـَٔمُوٓا۟ أَن تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰٓ أَجَلِهِۦ ۚ ذَٰلِكُمْ أَقْسَطُ عِندَ ٱللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَٰدَةِ وَأَدْنَىٰٓ أَلَّا تَرْتَابُوٓا۟ ۖ إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَٰرَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا ۗ وَأَشْهِدُوٓا۟ إِذَا تَبَايَعْتُمْ ۚ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ ۚ وَإِن تَفْعَلُوا۟ فَإِنَّهُۥ فُسُوقٌۢ بِكُمْ ۗ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ ٱللَّهُ ۗ وَٱللَّهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٨٢﴾

"اے وہ لوگوں! جو ایمان لائے ہو جب تم کوئی معاملہ مدت تک ادھار کرو تو اسے لکھ لو اور چاہیے کہ تمہارے درمیان کوئی کاتب انصاف کے ساتھ لکھے کاتب لکھنے سے انکار نہ کرے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے سکھایا ہے تو چاہیے کہ وہ لکھے جس پر حق (قرض) ہے۔ اور چاہیے کہ وہ اپنے رب سے ڈرے اور اس میں سے کوئی چیز کم نہ کرے یا پھر اگر وہ شخص جس پر حق (قرض) ہے۔ بیوقوف یا ضعیف ہو یا لکھنے کی طاقت نہیں رکھتا ہو کہ وہ لکھوائے تو چاہیے کہ اس کا مختار (وکیل) انصاف کے ساتھ لکھوائے۔ اور تم اپنے مسلمانوں میں سے دو مردوں کو گواہ بنا لو البتہ تم میں دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان گواہوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں۔ یہ (اس لئے) کہ اگر ان دونوں میں سے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایک بھول جائے تو دوسری اس کو یاد دلائے گی۔ اور جب گواہوں کو بلایا جائے تو وہ (آنے سے) انکار نہ کریں۔ اور تمہیں اکتاہٹ نہ ہو کہ تم وقت مقررہ کیلئے چھوٹے یا بڑے معاملے کو لکھو۔ یہ لکھنا (اللہ تعالیٰ کے نزدیک) زیادہ قرین انصاف ہے اور گواہی کو بہت درست رکھنے والا ہے اور اس بات کے زیادہ قریب ہے کہ تم شک میں نہ پڑو البتہ اگر سودا نقد بنقد ہو جس کو تم آپس میں لیتے دیتے ہو تو کوئی حرج (گناہ) تم پر نہیں ہے اگر اسے نہ لکھو اور جب اس میں لین دین کرو تو گواہ بنالو۔ کاتب اور گواہ کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ اور اگر ایسا کیا تو یہ نافرمانی ہے جس کا گناہ تمہیں ہوگا اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور تمہیں (اللہ تعالیٰ) سکھلاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ (282)

تفسیر 282 :ربط ۱: سابقہ آیتوں میں انفاق فی سبیل اللہ کا حکم اور سود سے ممانعت ذکر ہوئی تو وہم پیدا ہوا کہ اس سے مالداری کم ہوگی۔ تو اب حلال مال کمانے اور اس کی حفاظت کا طریقہ بیان ہو رہا ہے۔ ربط ۲: سود سے منع کیا گیا ہے کیونکہ وہ ذریعہ فساد ہے تو اب فساد کے اور طریقے بیان کئے جاتے ہیں تاکہ ان سے بچا جا سکے۔ ربط ۳: ربوٰ اور بیع سلم کے طریقے ایک دوسرے کے قریب ہیں البتہ سود حرام اور بیع سلم حلال ہے بیع سلم میں بھی قیمت پیشگی دی جاتی ہے اور سود میں بھی رقم پہلے دی جاتی ہے لہٰذا اب بیع سلم کا حلال ہونا اور طریقہ ذکر ہو رہا ہے۔ اس آیت کی خصوصیت یہ ہے۔ کہ یہ قرآن مجید کی سب سے طویل آیت ہے۔ اور اس کو آیت مداینہ کہا جاتا ہے۔ مفسرین کے بقول بعد والی آیت کو ملا کر ان دونوں میں 25 مسائل ہیں جبکہ میں راقم الحروف نے 33 مسائل ذکر کئے ہیں۔ بقول مفسرین اس آیت میں اوامر یعنی احکام صرف رہنمائی کے لئے ہیں مگر مطلب یہ بھی نہیں کہ یہ صرف مستحب ہیں اگر خوف ہو تو پھر ان پر عمل واجب ہے یعنی پہلے قرض دینے میں اگر خوف فساد و اختلاف ہو تو پھر اس پر عمل فرض ہے اگر مذکورہ خوف کم ہو تو پھر بعد والی آیت میں رہن کا ذکر ہے اور جب کوئی خوف نہ ہو تو پھر امانت کا مسئلہ مذکور ہے۔ "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا" اس لفظ کے خطاب سے پتا چلتا ہے کہ شرعی معاملات جاری کرنا ایمان کا تقاضا ہے۔ "اِذَا تَدَایَنْتُمْ" چونکہ لین دین کیلئے قرض جہت بڑا سبب ہے کیونکہ کبھی ایک انسان صنعت و تجارت کی فہم و فراست کا مالک ہوتا ہے مگر رقم نہ ہونے کی وجہ سے تجارت سے قاصر ہوتا ہے اور کبھی انسان کے پاس رقم تو ہوتی ہے مگر فراست تجارت سے محروم ہوتا ہے تو اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کیلئے راستہ تَدَایُنْ لین دین کا یہ راستہ کھول دیا ہے۔ اس لئے قرض کے معاملے کو مقدم کیا۔ "تَدَایُنْ" باب تفاعل سے ہے یعنی قرض کا لین دین کرنے والا اس میں لینے دینے والوں کا ذکر ہے۔ خواہ رقم قرض ہو یا کسی اور چیز کی صورت میں ہو اور نقد ہو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تو اس کو قرض سودا کہا گیا ہے اور سامان مبیعہ قرض ہو اور قیمت نقد ہو تو اس کو سلم اور سلف کہا گیا ہے۔ یہ دونوں قسمیں کاروبار کیلئے جائز ہیں۔ البتہ قرض سودا قرض پر جائز نہیں ہے۔ ’’بِدَيْنٍ‘‘ اس لفظ کے ذکر نے میں تین فائدے ہیں۔ پہلا فائدہ: تمام تجارت کو شامل ہو قیمت ہو یا سودا کم ہو یا زیادہ۔ دوسرا فائدہ: بعد میں ’’فَاكْتُبُوْهُ‘‘ کی ضمیر اس کی طرف راجع ہو۔ تیسرا فائدہ: لفظ دَيْنٍ سے معلوم ہوا کہ یہاں مجازی معنی مراد نہیں ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرض ہر اس معاملہ کو کہا جاتا ہے جس میں ایک نقد اور دوسرا ادھار ہو۔ ابن عاشور رحمہ اللہ کے بقول ادھار لین دین کو کہا جاتا ہے۔

’’اِلٰٓى اَجَلٍ‘‘ لغت میں اجل انتہائے وقت کو کہا جاتا ہے جو کسی چیز کیلئے مقرر کیا ہو لہٰذا قرض کا اجل یہ ہے کہ آئندہ زمانہ میں کوئی وقت یا تاریخ متعین کی جائے تو اس کو اجل کہا گیا ہے۔ ’’مُّسَمًّى‘‘ یعنی جب کسی وقت کو نام کے ساتھ متعین کیا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مجہول وقت مقرر کرنا درست نہیں ہے۔ جیسا کہ گھاس کاٹنے، گندم، موسم حج، فصل پکنے وغیرہ مقرر کرنا درست نہیں ہے۔ لفظ ’’تَدَايَنْتُمْ‘‘ یہ لفظ متعین وقت کو مستلزم ہے مگر چونکہ یہاں اس کی تعیین مقصود ہے چنانچہ لفظ اجل کو صراحتاً ذکر کیا تعین وقت سودا میں لازمی شرط ہے۔ جبکہ سلم میں اس کے علاوہ بھی شرائط ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ نو شرطیں ہیں جو احادیث میں تلاش کرنے سے مل سکتی ہیں۔ ’’فَاكْتُبُوْهُ‘‘ امر کی ضمیر لفظ دَيْنٍ اور اَجَلٍ مُّسَمًّى کی طرف راجع ہے اور اس کے بعد جو اوامر ہیں ان میں استحباب اور وجوب کے اعتبار سے اختلاف ہے۔ یہ بات گزر گئی ہے کہ جب فریقین کا اعتماد ایک دوسرے پر نہ ہو تو پھر فساد جھگڑے کا خطرہ یقینی ہوتا ہے جبکہ فساد اختلاف جھگڑے کو ختم کرنا فرض ہے تو بہتر قول یہ ہے کہ یہ وجوب کیلئے ہے۔ جیسا کہ بعد میں لفظ ’’اَلَّا تَرْتَابُوْٓا‘‘ مذکور ہے۔ امام ابن عاشور رحمہ اللہ کی یہ تحقیق ہے کہ لفظ ’’فَاكْتُبُوْا‘‘ تک پانچ مسائل ذکر ہوئے ہیں۔ یعنی (۱) قرض لین دین جائز ہے۔ (۲) سلم کا جواز (۳) وقت مقرر کرنا (۴) اجل مبہم غیر معین فاسد ہے۔ (۵) لکھنا واجب ہے۔ فائدہ: امام ابن کثیرؒ نے سوال و جواب کی صورت میں لکھا ہے کہ صحیح مسلم کی حدیث میں مذکور ہے۔ ’’اِنَّا اُمَّةٌ اُمِّيَّةٌ لَا نَكْتُبُ وَلَا نَحْسُبُ‘‘ صحیح بخاری کتاب الصوم حدیث 1913 صحیح مسلم حدیث 1081 ہم امی (ان پڑھ) امت ہیں ہمیں لکھنا پڑھنا نہیں آتا؟ جواب: دین بحیثیت دین لکھنے کا محتاج نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے دین کو حفظ سے اپنے سینوں میں محفوظ کیا ہے۔ جزوی مسائل میں لکھنے کا حکم ہے مناسب محل میں مزید جوابات بھی ہیں۔ ’’وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ‘‘ اس جملہ میں جواب ہے سوال یہ تھا کہ کتابت لینے اور دینے والے پر واجب ہے تو جواب ہوا کہ مراد ان ہی پر

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

واجب نہیں ہے بلکہ کوئی بھی کاتب ہو اس سے لکھوالو اور یہ بھی لازم قرار دیا گیا کہ لین دین والے کا حاضر ہونا لازم ہے "بِالْعَدْلِ" یہ "وَلْيَكْتُبْ" کے متعلق ہے عدل ایک صفت ہے جس کے ذریعے انسان اپنے آپ کو بڑے گناہوں سے اجتناب اور چھوٹے گناہوں پر استمرار (ہمیشگی) سے بچاتا ہے۔ اس عدل لفظ کے تحت یہ امور داخل ہیں کہ کمی زیادتی نہ کرے گا۔ مجمل، مہمل مشکوک الفاظ نہیں لکھے گا نیز حق لکھے گا دل اور قلم سے کسی ایک کی طرف میلان نہیں کرے گا۔ کتابت گواہی کی بنیاد ہے گواہی میں عدل کرنا شرط ہے جس کا ذکر بعد میں ہوگا۔ لہٰذا کتابت میں بھی عدل کرنا شرط ہے۔ "وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ" یہ ماقبل کیلئے تاکید ہے۔ امام شعبی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ جب اور عادل کاتب موجود ہوں تو یہ کتابت فرض کفایہ ہے۔ اور جب دیگر عادل کاتب موجود نہ ہوں تو پھر اس کاتب پر یہ فرض عین ہے۔ "كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ فَلْيَكْتُبْ" اس کاف کے متعلق تین اقوال ہیں۔ پہلا قول: یہ "أَنْ يَكْتُبَ" کے متعلق ہے اور عبارت میں تقدیر ہے یعنی اس طرح لکھنا جس طرح اس کو اللہ تعالیٰ نے لکھنے کا علم اور حکم دیا ہے۔ دوسرا قول: یہ بعد والے فَلْيَكْتُبْ کے متعلق ہے۔ مفسر زمخشری نے دونوں اقوال میں فرق یہ کیا ہے کہ پہلے منع کیا ہے کہ کاتب کو متعین کتابت سے انکار نہیں کرنا چاہیے اس لئے فرمایا فَلْيَكْتُبْ یعنی متعین تحریر کرے، جبکہ دوسرے قول میں مطلق کتابت سے منع ہے لہٰذا أَنْ يَكْتُبَ پر کلام ختم ہوا۔ پھر حکم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے علم کے مطابق تحریر کرے اس طرح کلام میں مزید تاکید پیدا ہوئی۔ تیسرا قول: جس کو امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے پسند کیا ہے کہ یہ "لَا يَأْبَ" کے متعلق ہے اور کاف برائے تعلیل ہے یعنی کاتب پر اللہ تعالیٰ نے احسان کیا ہے لہٰذا اس کو کتابت سے انکار نہیں کرنا چاہیے اس پر لازم ہے کہ محتاجوں کی ضرورت کو پورا کرے ان کے ساتھ احسان کرے۔ اس جملہ میں پانچ مسائل ہیں۔ مسئلہ ۱: کتابت جاننے والوں پر لکھنا فرض عین ہے یا کفایہ ہے۔ مسئلہ ۲: دونوں فریق کا حاضر ہونا شرط ہے۔ مسئلہ ۳: عدل کرنا شرط ہے۔

مسئلہ ۴: ضرورۃ کے وقت کتابت سے انکار کرنا گناہ ہے۔ مسئلہ ۵: کتابت علوم شرعیہ میں سے ایک علم ہے اس لیے اللہ نے اس کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔ "وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ" اس میں کتابت کا طریقہ ذکر ہے کہ رسید یا اسٹامپ پیپر کس کی طرف سے لکھا جائے گا۔ "وَلْيُمْلِلْ" کا فعل ماضی أَمْلَلَ ہے کبھی دو لام الف سے بدل جاتا ہے تو املی استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ فرقان آیت 5: میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "فَهِيَ تُمْلَىٰ عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا" یہاں پر اصل فعل استعمال ہوا ہے دونوں کا معنی الاملا ء ہے یعنی سنا لکھوانا حفظ کروانا یا کلام سنانا۔ "الْحَقُّ" اس سے مراد

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قرض ہے جو اس کے ذمہ لازم ہے۔یعنی مقروض کے ذمے لازم ہے لفظ املاء میں قرض اس کی جنس یعنی چیز اور اس کی صفت، تاریخ وغیرہ کا اقرار سب کو شامل ہیں۔''وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ''اس میں اقرار کرنے والے کیلئے بہت تاکید ہے جس کیلئے لفظ اللہ، اور لفظ رب دونوں کو جمع کیا ہے۔اس میں علت تقویٰ کی طرف اشارہ ہے کہ توحید الوہیت اور ربوبیت کو تقویٰ کے لیے علت قرار دیا ہے۔اور اس میں مراد یہ ہے کہ قرض سے انکار نہ کرے اور اس مقدار، جنس وصفت سے جو متعین ہوا ہے۔''وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا'' یہ بھی تقویٰ کا طریقہ ہے۔مِنْهُ کی ضمیر حق کی طرف راجع ہے اور بَخْسٌ مطلق نقصان کو کہا جاتا ہے اور خصوصاً چوری کے ذریعے پہنچایا گیا نقصان۔اور یہاں پر نقصان حیلہ کرنے، دھوکا دینے، انکار وغیرہ کی صورت میں ہے۔یہ معنی سورۃ اعراف آیت:85، میں ہے۔وہاں اس طرح فرمایا ہے۔''وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ ''۔''فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا ''اس آیت میں ان عذروں کا ذکر ہے کہ املاء اور اقرار نہیں ہوسکتا یا قبول نہیں ہوسکتا۔اس میں نیابت کا مسئلہ بھی مذکور ہے۔یہاں پر تین عذروں کا ذکر ہے اور حرف ''اَوْ'' کو درمیان میں ذکر کیا ہے جو کہ فرق کی دلیل ہے۔پہلا عذر:''سَفِيْهًا'' سفاہت کی تشریح آیت:13، میں گزر گئی ہے۔یہاں پر مفسرین نے مختلف تعبیرات نقل کیے ہیں۔مثلاً معاملات اور لکھنے سے لاعلم خاتون ہو یا نابالغ ہو، اسراف کرنے والا ہو، دین کو فاسد کرنے والا، کم عقل، مال ضائع کرنے والا مسرف، دین اسلام سے لاعلم، ان کو ابو حیان رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ دوسرا عذر:''اَوْ ضَعِيْفًا'' کمزور صحت والا، معذور ہو، زیادہ بیمار ہو، زیادہ بوڑھا ہو۔ تیسرا عذر:''اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ ''گونگا ہونا، موجود نہ ہو، کاتب کی زبان سے ناواقف ہونا۔اس میں ''اَوْ'' مانع خلو کے لیے ہے اس میں کبھی دو یا تین حالات بھی جمع ہو جاتے ہیں۔دو وجوہات سے ''هُوَ'' ضمیر کو لایا ہے۔پہلی وجہ: یہ ہے کہ یہ عدم استطاعت پر خود تصریح ہے۔دوسری وجہ: یہ ہے کہ مخفی ضمیر کی طرف مجازی نسبت ختم کیا گیا ہے۔''فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ''اس میں ''وَلِيُّهٗ'' کی ضمیر ''الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ '' کی طرف راجع ہے جو کہ مذکورہ صفات میں سے کسی صفت سے متصف ہو۔بقول ابن جریر حق کی طرف راجع ہے۔ولی سے مراد وہ شخص ہے جو کام کرنے کا اختیار رکھتا ہو یہ شخص (۱) کم عقل اور بے وقوف اور بچے کے لئے وصی ہوگا، (۲) گونگے کے لئے ترجمان ہوگا (۳) اور لَا يَسْتَطِيْعُ والے کے لئے وکیل ہوگا۔نیز ولی قائم کرنا اس پر دلیل ہے کہ شریعت میں سفیہ انسان کو اپنے مال میں اختیار استعمال کرنے سے روک دیا گیا ہے جیسا کہ سورہ نساء آیت 5: میں ذکر ہے۔''بِالْعَدْلِ '' یہ ''فَلْيُمْلِلْ '' کے متعلق ہے۔غیر کی طرف سے اقرار بھی شہادت کے قائم مقام ہے تو اس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میں بھی عدالت شرط ہے۔ اس جملہ میں چھ احکام ہیں۔ (1) تحریر میں مقروض کا اقرار لازم ہے۔ (2) اقرار میں احتیاط و تقویٰ فرض اور لازم ہے۔ (3) اس میں ہر قسم کی خیانت حرام ہے۔ (4) عذر کے وقت نیابت جائز ہے۔ (5) نیابت کیلئے اقسام ہیں یعنی ولی، وصی، وکیل، ترجمان۔ (6) سفیہ بے وقوف انسان پر شریعت میں مال و نفس میت تصرفات کی پابندی لاگو کرنا جائز اور ضروری ہے۔ ''وَاسْتَشْهِدُوْا'' قرض کے معاملات میں دو چیزیں ضروری ہیں ایک چیز لکھنا ہے اور دوسری چیز شہادت ہے۔ یہاں تک لکھنے کے مسائل کا ذکر تھا اور اب گواہی کے مسائل ذکر ہوں گے۔ اور ان دونوں کے یہ فائدے ہیں۔ کہ کبھی ادائیگی کا وقت قریب آئے تو ادائگی سے انکار بلکہ قرض سے ہی انکار کر دے کہ میں نے کوئی رقم یا چیز نہیں لی۔ یا جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتا مگر بھول جاتا ہے تو ان دونوں حالتوں میں تقریر اور گواہی کام کرتی ہے۔ اس میں جانبین کے مال کی حفاظت ہے۔ قرض دینے والا زیادہ مال کا دعویٰ نہیں کر سکتا ہے۔ قرضدار کو معلوم ہے کہ تحریر موجود ہے لہٰذا فساد و جھگڑے کے اسباب لکھنے اور شہادت سے ختم ہوتے ہیں۔ نیز ''وَاسْتَشْهِدُوْا'' میں (س) تاکید یا طلب کیلئے ہے۔ ''شَهِيْدَيْنِ'' لفظ شَهِيْدَ شاہد کی بنسبت مبالغہ ہے یعنی ایسے شخص کو گواہ بناؤ جو کہ شہادت کو جانتا ہو شہادت کے مواقع جانتا ہو اور جس کی شہادت رد نہ کی گئی ہو اس میں صفت عدالت کی طرف اشارہ ہے اور تعداد گواہ بھی ذکر ہے۔ ''مِنْ رِّجَالِكُمْ'' یہ متعلق ہے وَاسْتَشْهِدُوْا یا شَهِيْدَيْنِ کے، اور یہ اس لفظ مقدر کی وجہ سے صفت ہے۔ لفظ رجال بلوغت کی دلیل ہے نابالغ کی شہادت درست نہیں ہے۔ اکثر اہل علم کا یہ قول ہے اور لفظ كُمْ میں اشارہ ہے کہ شہادت مومن کی لازم اور شرط ہے یعنی کافروں کی شہادت قبول نہیں ہے اسی طرح غلاموں کی شہادت میں معاملات کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ''فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ'' لفظ يَكُوْنَا میں دو قول ہیں۔ پہلا قول: کان ناقصہ ہے ضمیر تثنیہ شَهِيْدَيْنِ کی طرف راجع ہے وہ اس کا اسم ہے اور ''رَجُلَيْنِ'' اس کیلئے خبر ہے۔ خلاصہ معنی یہ ہے کہ اگر حقدار شخص یا لکھنے والا غلطت یا جان بوجھ کر یا کسی بھی وجہ سے دو مرد گواہ نہ بنائے تو پھر ایک مرد اور دو خواتین کی شہادت کافی ہے یعنی عورتوں کی شہادت کیلئے ضروری نہیں ہے کہ مرد موجود ہی نہ ہو۔ دوسرا قول: یہ ہے کہ کان تامہ ہے رجلین حالیہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے تو اس صورت میں معنی یہ ہے کہ اگر مرد کسی صورت دستیاب نہیں تو عورتوں کی گواہی کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ ابن عطیہ رحمہ اللہ نے اس قول کو ضعیف قرار دیا ہے اور صاحب اللباب نے اس قول کو اجماع کے خلاف قرار دیا ہے۔ ابن عاشور رحمہ اللہ نے پہلا معنی مراد لیا ہے اس میں اشارہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کو مستقل گواہی کا موقع دیا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے جو کہ جاہلیت والوں کے برعکس ہے۔ ''فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ'' یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر مقدر ہے یعنی ''یَشْهَدُوْنَ'' یا پھر مبتدا مقدر ہے یعنی ''فَالشَّاهِدُ'' آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مرد گواہ کے ساتھ عورتوں کی شہادت مالی معاملات میں درست ہے اس میں وسعت اس لئے کی گئی ہے کہ یہ معاملات اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر معاملات میں عورتوں کی شہادت کے متعلق علماء کا اختلاف ہے البتہ جن امور کا تعلق خاص طور پر خواتین سے ہے یعنی بکارت، ولادت، خاص عیوب وغیرہ تو اس میں علماء کا تنہا شہادت کا جائز ہونے پر اتفاق ہے۔ ''مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ'' بہتر یہ ہے کہ یہ لفظ وَاسْتَشْهِدُوْا کے متعلق ہے اور اس قید کو تمام گواہوں کے ساتھ متعلق کیا جائے گا۔ ''تَرْضَوْنَ'' یہ خطاب مسلمانوں کیلئے عام ہے اس قید سے پتا چلتا ہے کہ مسلمانوں میں اس قسم کے لوگ بھی ہیں جن کی شہادت مردود ہے۔ امام ابوحیان و صاحب اللباب رحمہم اللہ نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جن کی شہادت مقبول ہے ان میں مندرجہ ذیل صفات کا ہونا ضروری ہے۔ (1) مسلمان ہونا (2) آزاد ہونا یعنی غلام نہ ہونا (3) بالغ ہونا (4) عادل ہونا (5) شہادت والی چیز پر عالم ہونا (6) شہادت میں ذاتی مفادات کا نہ ہونا (7) اپنا دفاع اس میں غرض نہ ہونا (8) اس گواہ کے متعلق خطاء (غلطی) کا معروف نہ ہونا (9) اس قسم کے کاموں میں مشہور نہ ہو جو انسانیت کے خلاف ہوں (10) جس کے خلاف گواہی دے رہا ہو اس کے ساتھ کوئی بغض، دشمنی و عناد نہ ہو۔ ''اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى'' اس میں لام اجلیہ تقدیر ہے۔ یعنی ''لِاَنْ تَضِلَّ'' یہ امْرَاَتٰنِ کیلئے علت ہے۔ یعنی دو عورتیں ایک مرد کی جگہ علت کی وجہ ہے کہ ایک سے بھول واقع ہو تو دوسری یاد کرا دیگی۔ اس میں ضلال یاد کرانے کیلئے علت ہے اس لئے اس میں فا سببیہ ذکر کیا ہے۔ پھر مجموعہ علت ہے اِمْرَاَتٰنِ کیلئے اور ابن حاجب نے امالی میں ذکر کیا ہے کہ لغت عربی کا قاعدہ یہ ہے کہ جب وہ علت ذکر کرتے ہیں تو پھر علت کیلئے علت لاتے ہیں تو وہ علۃ العلت پہلے اور علت بعد میں (فا) کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ زمخشری نے کشاف میں لکھا ہے کہ اس ترتیب میں تذکیر کی شان کا اہتمام مقصود ہے ''تَضِلَّ'' سورہ فاتحہ کی تفسیر میں ضلال کا معنی گزر گیا ہے۔ ضلال یہاں پر نسیان کے معنی میں ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے ابوعبیدہ سے نقل کیا ہے کہ شہادت میں ضلال کا معنی یہ ہے کہ ایک جز یاد ہو اور دوسرے کو بھول جائے۔ تو انسان حیران (ضَالٌّ) رہ جاتا ہے۔ اور پوری شہادت بھول جانے پر اس کو ضَلَّ فِيْهَا نہیں کہا جاتا۔ اس میں اشارہ ہے کہ ساری شہادت بھول جانے پر دوسرے کی یاد دہانی سے یاد نہیں آتی۔ ''اِحْدٰىهُمَا'' کو دو مرتبہ ذکر کیا ہے کیونکہ پہلی بار سے مراد

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بھلانے والی اور دوسری کا مصداق یاد کرانے والی ہے اس لیے یہاں ضمیر پر اکتفا نہیں ہو سکتا تھا۔ بقول ابو حیان عورتوں کی طبیعت میں رطوبت و برودت زیادہ ہوتی ہے اس لئے ان میں بھول زیادہ ہے لیکن دونوں پر یہ کیفیت کم ہی ہو سکتی ہے۔ صحیح بخاری کتاب الحیض حدیث 304 و صحیح مسلم کتاب الایمان حدیث 79 میں ہے کہ ان کی عقل کی وجہ سے یہ نقصان ہے یعنی مجموعی طور پر مرد حضرات خواتین سے عقل میں قوی ہیں۔ بعض مشائخ کا قول ہے کہ بھول نسیان کیلئے سبب گناہ ہے اور مردوں کی نسبت خواتین میں گناہ زیادہ ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کا حکم علتوں پر بنا نہیں ہے۔ اس لئے اپنی عقل دوانے سے اللہ تعالیٰ کے حکم کو بدل دینا ایک عورت کی گواہی کو مرد کی گواہی برابر قرار دینا اس دور کے گمراہ لوگوں کا تصور ہے۔ ''وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوا'' جس طرح کتابت کی تاکید کیلئے ''وَلَا يَأْبَ'' فرمایا اسی طرح شہادت کیلئے بھی تاکیداً یہی جملہ فرمایا ''إِذَا مَا دُعُوا'' کے متعلق قتادہ اور ربیع رحمہم اللہ کا قول یہ ہے کہ اس سے شہادت کا تحمل مراد ہے کہ شاہد بننا جبکہ ان کو شھداء مجازاً کہا گیا یعنی مستقبل کے اعتبار سے فرمایا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ شہادت فرض کفایہ ہے جبکہ اس سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک بلانے کے وقت شہادت دینا ہے۔ یعنی شہادت دیتے وقت فرض عین ہے جبکہ زجاج کے قول کے مطابق دونوں مراد ہیں۔ یعنی شہادت اور ادائیگی شہادت مراد ہے ان جملوں میں نو احکام ہیں۔ (1) کتابت میں شہادت بھی ضروری ہے۔ (2) دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔ (3) ایک مرد کی جگہ دو خواتین کی گواہی صحیح ہے۔ (4) گواہوں کیلئے بلوغت شرط ہے۔ (5) مسلمان ہونا بھی شرط ہے۔ (6) عادل ہونا بھی گواہی کیلئے شرط ہے۔ (7) گواہوں کو ایک دوسرے کو یاد دلانا جائز ہے۔ (8) گواہ بننا فرض کفایہ ہے۔ (9) گواہی دینا فرض عین ہے۔ ''وَلَا تَسْـَٔمُوٓا أَن تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰٓ أَجَلِهِۦ'' پہلے اس بات سے منع کیا کہ شہادت سے مت رو کو تم اس لئے کہ اس میں فساد کا خطرہ ہے تو اب کتابت میں بڑی یا چھوٹی چیز کو مت دیکھو بلکہ ہر چیز کو قلمبند کرو اس لیے کہ اس میں بھی فتنہ اور جھگڑے کا امکان ہے۔ لہٰذا یہ نہی مالوں کی حفاظت جھگڑوں سے اجتناب کے لیے ہے۔ ''تَسْـَٔمُوٓا'' عربی لغت میں سامت تھکاوٹ، پریشانی جس سے مراد سستی و کاہلی ہے۔ البتہ کسل منافق کی صفت ہے اس لیے یہ لفظ استعمال نہیں کیا۔ ''أَن تَكْتُبُوهُ'' یہ ''وَلَا تَسْـَٔمُوٓا'' کا مفعول ہے اور حرف جر مِن کو حذف کیا گیا ہے۔ یا متعدی بالذات ہے اور (ہ) ضمیر دین یا کتاب کی طرف راجع ہے۔ ''صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا'' یہ ضمیر تَكْتُبُوا سے حال بن کر آیا ہے۔ یعنی وہ قرض ہر حال میں ادا کرنا ہے تھوڑا ہو یا زیادہ لکھنا (سند) مختصر ہو یا طویل تحریر کرنا ہے۔ ان دونوں کو اس لیے ذکر کیا ہے کہ تھوڑا مال ہو تو کہنے والے یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہ کوئی لکھنے کی چیز ہے اور جب زیادہ ہو تو کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ کوئی بھولنے والی رقم ہے اس کا انکار ہو سکتا ہے؟ اس لیے اللہ تعالیٰ نے دونوں عذروں کو ختم کیا لفظ صَغِيْرًا اور كَبِيْرًا کہا۔ قَلِيْلًا و كَثِيْرًا کیوں نہیں فرمایا۔؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں قرض کا بوجھ، وزن اور بھاری پن بیان کرنا مقصود تھا لہٰذا اس کے لیے مناسب الفاظ "صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا" ہیں۔ "اِلٰٓى اَجَلِهٖ" اس میں دو قول ہیں۔ پہلا قول: یہ محذوف کلام کے متعلق ہے حال ہے یعنی "مُسْتَقِرًّا فِي الذِّمَّةِ اِلٰى اَجَلِهٖ" دوسرا قول: یہ "تَكْتُبُوْهُ" کے متعلق ہے اور الیٰ مع کے معنی میں ہے۔ لفظ اجل اس لئے ذکر کیا ہے کہ کتابت میں تاریخ کا تعیین کرنا لازم ہے "ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا" کتابت اور شہادت کے تین فائدے ذکر ہو رہے ہیں اس لئے یہ واجب ہے۔ "ذٰلِكُمْ" سابقہ مجموعہ گفتگو کی طرف اشارہ ہے۔ اَقْسَطُ "اَعْدَلُ" کے معنی میں ہے یہ کہ یہ بہت انصاف وعدل والی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اختلاف اور ظلم سے بچنے کیلئے یہ حکم صادر فرمایا۔ لفظ اَقْسَطُ میں تین قول ہیں۔ پہلا قول: یہ اَقْسَطَ سے عدل کے معنی میں لیا گیا ہے۔ قَسَطَ ظلم کے معنی میں ہے لیکن رباعی سے اَفْعَلُ کا وزن شاذ ہے۔ دوسرا قول: یہ قِسْطٌ (ق) کے پیش کے ساتھ عدل کے معنی میں ہے اور "قَسْطٌ" (س) کے زبر کے ساتھ جور کے معنی میں ہے۔ "وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ" یعنی اچھے طریقے سے شہادت کو قوی اور برابر کر لیتا ہے اور یہ دوسرا فائدہ ہے یعنی کتابت کی وجہ سے وہ گواہی صحیح دیں گے اس کے خلاف نہیں کر سکیں گے۔ پہلا فائدہ: اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا حصول ہے۔ دوسرا فائدہ: دنیا کا ہے کہ آپس میں جھگڑے فساد سے بچ جائیں گے اس لئے لفظ اَقْسَطُ کو اَقْوَمُ پر مقدم کیا ہے۔ "وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا" بہت قریب ہے شک دور کرنے کیلئے لینے اور دینے والے کے دل سے یعنی یہ تیسرا فائدہ نفسوں کا ضرر دور کرنے کیلئے ہے۔ یعنی جب دل میں پریشانی ہوتی ہے تو بندہ ناراض ہوتا ہے۔ اس میں غیر سے بھی ضرر دور کرنا مقصود ہے کیونکہ کسی اور کو ان کی طرف جھوٹی نسبت کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی لہٰذا اسے بھی غیبت اور جھوٹ سے پناہ حاصل ہوگی۔ شک سے نجات بھی ہوگی کیونکہ شک جنگ وفساد کے لئے سبب ہے لینے، دینے اور گواہوں کیلئے انتہائی مضر بھی ہے: مقروض پر شک یہ ہے کہ وہ انکار کر دیگا، قرض خواہ پر یہ ہے کہ یہ زیادہ مال کا دعویٰ کریگا، اور گواہوں پر طرفداری کا الزام ہوگا۔ اسی طرح قاضی اور حاکم بھی شک نہیں کریں گے۔ کتابت کے واجب ہونے میں یہ بھی اہم فائدہ ہے۔ اس جملہ میں تین احکام ہیں۔ پہلا مسئلہ: کم یا زیادہ کا عذر بنا کر لکھنے سے انکار کرنا منع ہے۔ دوسرا مسئلہ: اس کتابت پر گواہوں کی موافقت ضروری ہے۔ تیسرا مسئلہ: یہ ہے کہ اس کتابت کے سبب

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تمام متعلقہ افرادِ شک سے نکل جائیں گے۔ "اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً حَاضِرَۃً" اس استثناء میں دو قول ہیں۔ پہلا قول: یہ استثناء متصل ہے یعنی ہر حال میں معاملات کتابت واجب ہیں سوائے نقد تجارت کے۔ دوسرا قول: یہ استثناء منقطع ہے یعنی تجارت جب نقد ہو تو اس میں تحریر لازم نہیں ہے اکثر علماء نے اس قول کو پسند کیا ہے۔ اور "تَکُوْنَ" یہاں پر ناقصہ ہے اور اس کا اسم مقدر ہے۔ یعنی "تَکُوْنَ الْمُعَامَلَۃُ اَوِ التِّجَارَۃُ حَاضِرَۃً" یعنی وہ چیز (مُبِیْعَۃ) جس کو بیچا جا رہا ہے یا اس کی قیمت اس میں مدت مقرر نہ کی گئی ہو یا وہ خریدی جانے والی چیز جس کو لینے والا اپنے قبضہ میں فی الفور لے لیتا ہے۔ "تُدِیْرُوْنَهَا بَیْنَکُمْ" اس سے مراد ہاتھوں ہاتھ لینا ہے۔ یا اس سے عام نقد سودا مراد ہے۔ "حَاضِرَۃً" میں ادھار یا سلم کی بیع سے احتراز کیا گیا ہے۔ جبکہ "تُدِیْرُوْنَهَا" کے ذریعے سے بیع غیر منقول سے احتراز کیا گیا ہے یعنی زمینوں، جائیدادوں وغیرہ کی فروخت اگرچہ نقد ہو لیکن اس کو لکھنا ہے اس کی کتابت ضروری ہے۔ "فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَکْتُبُوْهَا" اس میں جناح مضرّت کے معنی میں ہے مگر ان علماء کے نزدیک جو اس امر کو وجوب کے لیے نہیں مانتے۔ اور جو علماء اس کو فرض و واجب قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک بمعنی گناہ ہے۔ اس میں گناہ نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ نقد تجارت منقولات میں بہت ہوتی ہے اگر اس کا لکھنا لازم کر دیا تو مسلمانوں کیلئے حرج ہوگا لہٰذا اس مشقت اور تکلیف سے نجات کیلئے اس کتابت کو ترک کیا گیا نیز انکار کا بھی خوف نہیں ہوتا۔ "وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَایَعْتُمْ" نقد بیع میں کتابت کو ساقط کیا گیا تو شہادت کو برقرار اس لئے رکھا گیا کہ تجارت میں توثیق مضبوطی باقی رہے۔ اور "تَبَایَعْتُمْ" عام ہے نقد ادھار سب کو شامل ہے۔ اس امر میں منسوخ یا محکم ہونے میں اختلاف ہے۔ بعض علماء کے نزدیک یہ امر استحبابی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اختلاف وفساد کا خوف ہو یعنی لینے دینے والوں کا ایک دوسرے پر اعتماد نہ ہو تو پھر یہ حکم واجب و فرض ہے اور جب یقین اور اطمینان ایک دوسرے پر ہو تو لکھنا مستحب ہے۔ لفظ اِذَا شرطیہ ہے تو بعض کے نزدیک جزاء مقدر ہے اور بعض کے نزدیک جزاء متقدم ہے یا اِذَا ظرفیہ ہے اور یہ قول بہتر ہے۔ "وَلَا یُضَآرَّ کَاتِبٌ وَّلَا شَهِیْدٌ" یہ آداب کا ذکر ہے اور کتابت وشہادت کے حکم سے متعلق ہے۔ "وَلَا یُضَآرَّ" اس میں دو احتمال ہیں۔ پہلا احتمال: یہ صیغہ معلوم کا ہے اور اس کا فاعل شہید و کاتب ہے اور اس کا مفعول مقدر ہے۔ دوسرا احتمال: یہ صیغہ مجہول کا ہے اور کاتب اس کا نائب فاعل ہے اور اصل فاعل اس کا مقدر ہے۔ اور ضرر کا معنی ہے ایک دوسرے کو نقصان پہنچانا یعنی کاتب اور گواہ کو خرید لے، بیچنے والے کو بلا ضرورت بلانا اور ان کو بار بار تکلیف دینا اگر کرایہ کا خرچہ ہو تو کرایہ نہ دینا اس سے منع کیا گیا ہے۔ اسی طرح کاتب لکھنے میں کوتاہی کی نہیں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کریگا۔ اور موقع پر حاضر ہوگا شاہد (گواہ) گواہی دینے سے انکار نہیں کریگا چھپائے گا بھی نہیں بیان تبدیل نہیں کریگا ضرر کے طریقے اس کے علاوہ بھی ہیں لہذا ہر ایک قسم سے بچنا چاہیے۔ ''وَإِن تَفْعَلُوا فَإِنَّهُ فُسُوقٌ بِكُمْ'' ''تَفْعَلُوا'' کا مفعول مقدر ہے ''الْإِضْرَارُ'' یا عام ہے تمام اوامر ونواہی مراد ہیں فسوق سے مراد عملی فسق ہے یعنی تکلیف ضرر دینا مخالفت وغیرہ کرنے کی طرف اشارہ ہے کہ یہ گناہ کبیرہ ہے۔ ''بِكُمْ'' اس میں (با) الصاق کیلئے ہے یعنی یہ گناہ اور بدنامی تمہارے ساتھ اس طرح چمٹ جانے والی ہے جو توبہ کیے بغیر ہٹے گی نہیں۔ یا پھر (با) فی کے معنی میں ہے۔ فسق ذکر کرنے کے بعد اب تقوی کا ذکر ہے تاکہ تقوی کے ذریعے سے فسق سے بچ سکے اور فسق وفجور میں داخل نہ ہو۔ ''وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ'' اس جملہ میں ماقبل احکام پر عمل کی ترغیب ہے۔ اور یہ بھی اشارہ ہے کہ ماقبل احکام علوم شرعیہ میں داخل ہیں۔ یہاں تک پانچ مسائل ذکر ہوئے ہیں۔ (1) ہاتھوں ہاتھ لین دین نقد جائز ہے۔ (2) اس میں گواہ ضروری ہے۔ (3) ایک دوسرے کو تکلیف دینا حرام ہے۔ (4) یہ گناہ کبیرہ اور سبب فسق ہے۔ (5) یہ احکام معاملات کے علوم شرعیہ میں داخل ہیں اس آیت میں یہاں تک ظاہری احکام اٹھائیس ثابت ہوئے ہیں۔ ''وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ'' اس میں سابقہ احکام پر عمل کرنے کی ترغیب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اسم کو تین بار ذکر کیا ہے۔ یہ ان احکام کی تعظیم کیلئے ہیں۔ ان احکام میں تمہاری دنیاوی اخروی مصلحتیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا علم سب پر محیط ہے۔ آخر کے تین جملوں میں لفظ اللہ تین مرتبہ آیا ہے یہ ان احکام کی تعظیم کے لئے ہے۔

وَإِن كُنتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَّقْبُوضَةٌ ۖ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ

ع أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ ۗ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿٢٨٣﴾

''اگر تم سفر میں ہو اور کاتب نہ پاؤ تو رہن (کوئی چیز) قبضہ دے رکھو۔ البتہ اگر آپس میں تم ایک دوسرے سے مطمئن ہو تو جسے امانت دی گئی ہے تو وہ اسے ادا کرے اور اللہ تعالیٰ سے جو اس کا رب ہے ڈرتا رہے اور گواہی کو مت چھپاؤ جو بھی اسے چھپائے گا تو اس کا دل گناہ کا مرتکب ہوگا اور تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے'' (283)

تفسیر 283: یہ سابقہ آیت کے مضمون پر عطف ہے پہلی آیت میں ادھار لین دین مع کتابت اور شہادت کے ذکر کیا گیا تو اس آیت میں رہن گروی اور امانت کے ذریعے خرید وفروخت کا ذکر ہے۔ چونکہ یہ دونوں قسمیں الگ الگ تھیں اس لیے ان کو الگ آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ سابقہ آیت میں فرمایا تھا کہ اگر جھگڑے اور فساد کا خطرہ ہو تو شہادت وکتابت

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

لازم کرو تو اس آیت میں فرمایا کہ اعتماد کم ہو تو رہن کا اہتمام کرو اور اعتماد زیادہ ہو تو پھر امانت پر عمل کرو۔ "وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ" لفظ "عَلَىٰ" میں اشارہ ہے کہ سفر اس قسم کا ہے کہ کوئی پڑاؤ نہیں تو ایسی صورت میں گواہ تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے۔ "وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا" یہ فعل شرط یعنی "كُنْتُمْ" پر عطف ہے یا لفظ سَفَرٍ پر عطف ہے یا پھر "كُنْتُمْ" کے اسم سے حال ہے۔ "فَرِهَانٌ" یہ خبر ہے اور اس کا مبتدا مقدر ہے یعنی "فَالْوَثِيقَةُ رِهَانٌ" یا مبتدا ہے اور اس کی خبر مقدر ہے یعنی "فَرِهَانٌ تَكْفِي" یا فعل مقدر ہے یعنی "فَتَكْفِي عَنْ ذٰلِكَ رِهَانٌ" "رِهَانٌ" مصدر ہے مفعول کے معنی میں ہے یا "رِهَنٌ" کی جمع ہے اور مفعول کے معنی میں ہے۔ لغت میں رھن استمرار، دوام، اور ثبوت کو کہا جاتا ہے۔ جبکہ اصطلاح شریعت میں کسی چیز کو قرض کے بدلے میں رکھ لینا تاکہ مقروض اگر قرض دینے میں ٹال مٹول سے کام لے تو مال کا مالک اس گروی شدہ چیز سے اپنا حق وصول کر سکے۔ یا اس کے منافع سے وصول کر سکے۔ امام قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ رھن شدہ چیز کو مرتھن راھن کو نہیں دے گا جب تک اس کا حق ادا نہ ہو جائے۔ "مَقْبُوضَةٌ" اس میں رھن شدہ چیز کی تصریح اور وضاحت مراد ہے کہ مَرْهُوْن چیز کا قبضہ میں رکھنا فرض ہے کیونکہ یہ صحت رھن یا اہتمام رہن کیلئے شرط ہے۔ یہ قبض صرف وثوق کیلئے ہے انتفاع کو مستلزم نہیں ہے۔ یہ قبض صرف وثوق کیلئے ہے اس لئے یہ بات جان لینی چاہیے کہ گروی چیز سے فائدہ اٹھانا منع ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ امام مالک، شافعی، احمد، ابوحنیفہ رحمہم اللہ نے فرمایا کہ سواری کی چیز پر سواری کرنا دودھ والی چیز سے دودھ لینا جائز ہے۔ اور فائدہ اٹھانے کیلئے اجرت کا حیلہ بنانا درست نہیں ہے مگر شرط یہ ہے کہ حقیقی اجارہ ہو۔ فائدہ: مجاہد رحمہ اللہ کے نزدیک سفر اور کاتب کا نہ ہونا رھن کے جواز کیلئے شرط ہے جبکہ جمہور کے نزدیک سفر، حضر کاتب کی موجودگی یا غیر موجودگی ہر حالت میں رھن درست ہے۔ جمہور کی دلیل صحیحین کی حدیث ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جنگی قمیص زرہ یہودی کے پاس مدینہ طیبہ میں رھن (گروی) رکھوائی تھی صحیح بخاری کتاب الرھن حدیث 2513۔ البتہ سفر کی شرط اور کاتب کا نہ ہونا اکثر اوقات میں ہوتا ہے کیونکہ اس قسم کے حالات میں گواہ اور کاتب میسر نہیں ہوتے ہیں۔ "فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا" اس میں تیسری بیع کا ذکر ہے یعنی وہ بیع جس میں رھن کتابت کے بغیر صرف مضبوط اعتماد کی بنیاد پر خرید و فروخت ہوتی ہے کامل اعتماد کی وجہ سے لفظ "أَمِنَ" ذکر کیا ہے۔ یعنی "أَمِنَ وَقْتَ الْبَيْعِ الْمُؤَجَّلِ بَعْضُكُمْ" مراد یہ ہے کہ سودے کے وقت بعض ایک دوسرے پر اعتماد کریں۔

"فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ" "اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ" اس سے مراد مدیون ہے خواہ خریدار ہو یا بیچنے والا یا ویسے ہی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مقروض ہو۔"اؤْتُمِنَ "وصف بیان کرنے میں ادائیگی قرض کی ترغیب ہے۔"اَمَانَتَهٗ "کی ضمیر لفظ اَلَّذِی کی طرف راجع ہے یا مقروض کی طرف راجع ہے۔امانت مصدر ہے مگر مراد اس سے قرض ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرض وامانت ادا کرنا فرض ہے۔"وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ "پہلے قرض دیتے وقت تقویٰ کا ذکر تھا اور اب قرض ادا کرتے وقت تقویٰ کا ذکر ہے۔لفظ اللہ اور رب دونوں کو جمع کرنا تاکید شدید کیلئے ہے۔یہاں پر ہر قسم خیانت سے بچنا مراد ہے امانت لاداء کرنے کی وجہ سے اور اس کی ادائیگی میں۔"وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ "کتمان سے مراد چھپانا ہے۔اس میں اشارہ ہے کہ شہادت میں حفظ کی قوت کو استعمال کرے اور یہ نہی تحریم کیلئے ہے۔"وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ "یہ دلیل ہے کہ سابقہ نہی تحریم کیلئے ہے اس لئے سبب گناہ ہے اور جب شہادت اور کتمان کا تعلق دل سے ہے تو نسبت اِثم کی دل کی طرف کی ہے اور دل جب گنہگار ہو تو تمام جسم میں گناہ سرایت کر جاتا ہے۔جیسا کہ صحیح بخاری کی حدیث ہے"اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ "(صحیح بخاری کتاب الایمان حدیث 52 صحیح مسلم کتاب المساقات حدیث 1599)دل گوشت کا وہ ٹکڑا ہے جب اس میں فساد واقع ہوتا ہے تو سارے جسم میں فساد واقع ہوتا ہے اور جب اس کی اصلاح ہو جائے تو کا سارا جسم درست ہو جاتا ہے۔"وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ "اس جملہ میں تخویف ہے۔اور"مَا تَعْمَلُوْنَ "میں شہادت چھپانا اور ادا کرنا دونوں عمل شامل ہیں۔اللہ تعالیٰ کے علم میں جزاء وسزا کی طرف اشارہ ہے۔اس آیت میں چھ احکام ذکر ہیں۔(1)سفر میں تجارت جائز ہے۔(2)رھن کے ذریعے سے تجارت (3)رھن میں چیز کو قبضہ میں رکھنا (4)قرض امانت کے حکم میں داخل ہے۔(5)امانت ادا کرنا واجب ہے (6)شہادت چھپانا گناہ کبیرہ ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ "آسمانوں وزمینوں میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کی ملکیت ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے تم ظاہر کرو یا چھپالو اس کا تم سے اللہ تعالیٰ حساب لے گا پھر جسے چاہے عذاب دے گا اور جسے چاہے بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے"(284)

چوتھے باب کا خلاصہ: اس آیت سے سورۃ کے آخر تک چوتھا باب ہے۔اس باب میں مسئلہ توحید، رسول ﷺ کی سچائی اور نبی کریم ﷺ کی تصدیق سے اس سورۃ کے مضمون کی تاکید ہے آیت 285، میں پھر ترغیب دی ہے جہاد نفسی ومالی کی طرف اپنی طاقت کے مطابق اور استطاعت نفسی جہاد اور مالی انفاق فی سبیل اللہ ہے تاکہ اس سورۃ میں جو مضمون ہے اس کو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عالم میں نشر کیا جائے اور دعاء پر اختتام ہے جو کہ اس سورۃ پر عمل کرنے سے متعلق ہے۔ ربط ۱: سابقہ آیت میں شہادت چھپانے کی وعید ذکر کی گئی ہے جو کہ دل کا گناہ ہے تو اب اس کی وعید ذکر ہے اور یہاں پر قلب سے اَنْفُس پر تعبیر کی گئی ہے۔ امام شعبی اور عکرمہ رحمہم اللہ کا قول ہے کہ یہ آیت کتمان شہادت کے متعلق اتاری گئی ہے۔ ربط ۲: سابقہ آیت کا اختتام علم الٰہی پر کیا گیا تو اب اس آیت میں اس کی علت کا ذکر ہے یعنی اختیار کلی تصرفات اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں یعنی "اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ" ابومسلم کا قول ہے کہ متصرف اور خالق تو معلوم ہوا کہ تمام چیزوں پر عالم ہے۔ ابوحیان کا قول ہے کہ سارا سورۃ کا اس آیت سے تعلق اس طرح ہے کہ اس میں توحید، نبوت، آخرت کے دلائل ذکر ہو گئے اور پھر نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد، قصاص، حیض، طلاق، عدت، ایلاء، خلع، رضاعت، ربا، بیع، لین دین کے طریقے ذکر کرنے کے بعد اب اس کی علت کا بیان ہو رہا ہے۔ کہ متصرف مالک اللہ تعالیٰ ہے تو اس کی مرضی ہے جس طرح بھی اپنے بندوں کو اپنا حکم ماننے کا پابند بناتا ہے اس پر کسی قسم کا اعتراض نہیں ہو سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان تمام اعتقادات و عبادات کا مرکز دل ہے اس لئے کہ تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور نیت کا مرکز دل ہے۔ اس آیت میں مسئلہ توحید کے ساتھ رد شرک فی التصرف اور فی العلم ذکر ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ علم میں یا کسی کام میں کوئی شریک نہیں ہے۔ اس سورۃ میں یہ چوتھا مقام ہے جس میں توحید کے دعویٰ کا ذکر کیا گیا ہے۔ "لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ" رد شرک فی التصرف اور اس کی تعبیرات پہلی جلد کے مقدمے میں ذکر کی گئی ہیں۔ "لِلّٰهِ" میں لام تملیک ملک اور عبدیت پر دلالت کرتا ہے۔ "مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ" میں تمام موجودات اعیان اعراض داخل ہیں۔ "السَّمٰوٰتِ" آسمانوں کو عظمت شان کی وجہ سے مقدم کیا ہے اور ظرف مظروف کے حکم میں داخل ہوتا ہے۔ "وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ" لفظ (ما) عام ہے نفسوں کے تمام افعال اس میں داخل ہیں اختیاری غیر اختیاری جیسا کہ محبت، ارادہ، علم، جہل، شہادت کو چھپانا، شک یقین، وسوسے، دل کے خیالات وغیرہ۔ مقصد یہ ہے کہ (اخفاء) چھپانا (ابداء) ظاہر کرنا مخلوق کے اعتبار سے ہے اللہ تعالیٰ کیلئے دونوں برابر ہیں۔ (ابداء) "مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ" جو دل میں ہو زبان سے ظاہر کیا جاتا ہے جو اقوال کے متعلق ہو اور بدن کے جوڑوں سے ظاہر ہوتا ہے اگر اعمال سے متعلق ہو۔ "يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" حساب عام ہے صالحین سے صرف پیش کرنے کے اعتبار سے ہے کبھی سخت حساب بصورت مناقشہ ہوتا ہے ہر حساب میں عذاب لازم نہیں ہے اس لئے بعد میں عذاب اور مغفرت دونوں کو ذکر کیا ہے۔ حساب کرنا اللہ تعالیٰ کے ظاہر اور مخفی علم کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

واضح دلیل ہے۔ فائدہ: اس آیت کے متعلق مفسرین کے مشہور دو قول ہیں۔ پہلا قول: اکثر مفسرین نے اس آیت کو منسوخ قرار دیا ہے۔ کیونکہ لفظ (ما) عام ہے جس میں غیر اختیاری وسوسے بھی داخل ہیں جس کی تفصیل مسند احمد جلد 1 ص 332 کی روایت میں مذکور ہے جس کو امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر یہ آیت شاق گزری آیت سخت معلوم ہونے کی وجہ سے نبی اکرم ﷺ کے سامنے دو زانو ہو کر سوال کیا کہ ہم تو ایسے اعمال پر مکلف تھے جو ہماری طاقت میں ہوں لیکن اب جو حکم صادر ہوا ہے اس کی ہم طاقت نہیں رکھتے۔ تو رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تم سابقہ کتاب والوں یعنی اہل کتاب کی طرح یہ مت کہو کہ "سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا" بلکہ یوں کہو۔ "سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس کلام پر بعد والی آیت نازل ہوئی جس میں ان کے اعمال کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اطاعت کا ذکر کیا گیا تو بعد والی آیت پر اس حکم کو منسوخ کیا گیا۔ امام مسلم نے بھی اس طرح نقل کیا ہے۔ صحیح مسلم کتاب الایمان حدیث 125 دوسرا قول: ابن جریر، قرطبی، ابن عطیہ، ابن کثیر رحمہم اللہ نے نقل کیا ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں محکم ہے اور اس میں تین وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ: یہ ہے کہ اس میں محاسبہ مقابلے کیلئے لازم نہیں بلکہ حساب کبھی صرف پیش کرنا ہوتا ہے یعنی ان پر حساب کو پیش کیا جائے گا تو پھر منسوخیت کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسری وجہ: یہ ہے کہ "مَا فِي أَنْفُسِكُمْ" سے مراد وہ عقائد و نظریات ہیں جن کو دل میں بسا چکے ہیں اور لفظ (فی) اس پر دلیل ہے۔ باقی لفظ ابداء و اخفاء کی نسبت بندوں کی طرف کرنے میں اشارہ ہے کہ یہ اختیاری ہے لہذا اس میں نفسی وسوسہ داخل نہیں ہے۔ اب دونوں اقوال میں محاکمہ یہ ہے کہ بعض صحابہ کرام نے "مَا فِي أَنْفُسِكُمْ" سے غیر اختیاری وسوسہ مراد لے لیا تھا اس لئے ان پر آیت مشکل گزر گئی لہذا ان کے اشکال کو اللہ تعالی نے "لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا" پر ختم کیا اور ان کو اس کی تشریح کر دی کہ غیر اختیاری وسوسے اس میں داخل نہیں ہیں کیونکہ وہ انسان کی طاقت سے خارج ہیں جبکہ انسان ہر اس چیز پر مکلف ہے جو اس کی طاقت میں ہو اس کو تقیید اور تشریح کہا جاتا ہے جبکہ متقدمین کی اصطلاح میں اس کو منسوخ کہا جاتا ہے۔ "فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ" یہاں پر مبتدا مقدر ہے یعنی "فَهُوَ يَغْفِرُ" یہ یحاسب کیلئے تشریح ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ ہر حساب کے بعد عذاب لازم نہیں ہے۔ اس میں یہ بھی دلیل ہے کہ نیک لوگوں کو ثواب اجر اور برے لوگوں کو سزا وعذاب دینا اللہ تعالی پر فرض نہیں ہے۔ بلکہ پکڑ لینا اور معاف کرنا دونوں اس کے اختیار میں ہیں۔ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ: چونکہ معاف کرنا یا عذاب دینا ہر دونوں حالتیں اللہ تعالی کے علم و قدرت سے منسلک ہیں اس لیے اس صفت کو ذکر کیا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے لہذا اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے قدرت اختیارات تصرفات کے ساتھ عمومیت علم کا تذکرہ ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾ "رسول ایمان لایا اس چیز جو نازل کی گئی اللہ تعالیٰ کی جانب سے اور مومنین بھی ایمان لائے اللہ تعالیٰ پر اس کے ملائکہ پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ہر ایک پر ایمان لائے ہم انکے رسولوں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور انہوں نے کہا کہ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی اور تیری مغفرت طلب کرتے ہیں اور تیری ہی طرف پلٹ کر آنا ہے" (285)

تفسیر 285: ربط ۱: سابقہ آیت میں پہلے قول کے مطابق جب صحابہ کرام پر یہ آیت مشکل گزری تو انہوں نے شکایت کی جس پر معلم ربانی نے ان کو آداب سکھائے اس ادب کی وجہ سے اس آیت میں ان کی مدح سرائی ہوئی۔ ربط ۲: امام قرطبی نے زجاج سے نقل کیا ہے کہ اس سورۃ میں بہت سے احکام ذکر ہوئے ہیں یعنی عقیدہ وغیرہ تو آخر میں نبی کریم ﷺ کی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کی تصدیق ذکر کی گئی ہے ان تمام امور کی جو اس سورۃ میں ذکر ہیں اور یہ برائے تاکید ہے اس کی مثال اس طرح ہے کہ جب کوئی حکمران حکم نامہ جاری کرتا ہے تو سب سے پہلے اپنے وزراء اور مشیروں سے اس پر دستخط کرالیتا ہے۔ کیونکہ ان کا دستخط اس پر لازم ہوتا ہے۔ ربط ۳: امام ابوحیانؒ کا قول ہے کہ بڑی سورتوں میں یہ ترتیب ہے کہ سورۃ کا آخر اول کے ساتھ موافقت رکھتا ہے تو اس سورۃ میں بھی اسی طرح ہوا کہ شروع میں ایمان والوں کی صفات کا ذکر ہوا تو اب آخر میں پھر ایمان کی کچھ تفصیل ذکر ہے اور لفظ بالغیب کی تفصیل مومن بہ چیزوں پر ایمان سے ہو رہی ہے۔

"اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ" میں الف لام عہدی ہے یعنی محمد رسول اللہ ﷺ "بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ" اس میں ہر وہ چیز داخل ہے جس پر ایمان لانا لازم ہے قرآن وسنت میں اور خاص کر اس سورۃ میں جو احکام ہیں۔ اس میں یہ بھی دلیل ہے نبی ﷺ بھی احکام شرعیہ کے پابند ہیں اس کی کچھ تفصیل سورہ اعراف: 158، میں ہے۔ نبی اکرم ﷺ کو یقین تھا کہ یہ کلام سحر، کہانت، شیطانی القاء نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل شدہ کلام ہے۔ "وَالْمُؤْمِنُوْنَ" یہ لفظ اَلرَّسُوْلُ پر عطف ہے یا پھر یہ مبتدا ہے اور بعد والا جملہ اس کی خبر ہے پہلا قول اس میں بہتر ہے۔ ابن عاشورؒ نے فرمایا ہے کہ اس مقام پر یہ صحابہ کرام کا لقب ہے تو پھر یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ لفظ "اٰمَنَ" کے ساتھ "الْمُؤْمِنُوْنَ" ذکر کرنے میں کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔ "كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ" یہ "اٰمَنَ" میں جو اجمال ہے اس کی تفصیل ہے اللہ پر ایمان کا مطلب

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے اس کا وجود اور توحید کی تمام اقسام کی تصدیق کرنا یہ ایمان کا پہلا مرتبہ ہے۔ ''وَمَلٰٓئِكَتِهٖ'' یہ بھی عبارت ہے تصدیق سے یعنی ملائکہ کی وہ صفات جو کہ قرآن وسنت میں مذکور ہیں ان پر ایمان لانا ہے برعکس مشرکین کے ایمان کے جو کہ شرک پر مبنی تھا۔ یہ ایمان کا دوسرا مرتبہ ہے کیونکہ ملائکہ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان وحی پہنچانے کا ذریعہ ہیں۔ ''وَكُتُبِهٖ'' اللہ تعالیٰ کی تمام کتب پر ایمان جن کی تصدیق اجمالی اور تفصیلی قرآن مجید میں موجود ہے یہ ایمان کا تیسرا مرتبہ ہے یہ کتب ملائکہ کے ذریعے سے انبیاء کرام تک پہنچی ہیں۔ ''وَرُسُلِهٖ'' ان رسولوں پر ایمان جن کا تفصیلی یا اجمالی ذکر صفتوں کے ساتھ موجود ہے یعنی ان کی بشریت، عبدیت رسالت وغیرہ یہ ایمان کا چوتھا مرتبہ ہے ملائکہ اور کتابوں کے ذریعے ان تک احکام الٰہیہ اس لیے پہنچائے گئے تا کہ یہ احکام وہ انبیاء اپنی امتوں تک کما حقہ پہنچائیں۔ ''لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ'' یہ جملہ حالیہ ہے جس میں ''يَقُوْلُوْنَ'' مقدر ہے اور اس میں ایک وہم کو ختم کیا گیا ہے وہم اور اشکال یہ تھا کہ انبیاء کے دین میں درجات کا فرق واضح موجود ہے جو کہ فروع کے اعتبار سے ہے تو رسالت پر ایمان میں بھی فرق ہوگا یا نہیں؟ تو جواب یہ ہوا کہ فروع اور مراتب کا فرق رسالت میں فرق کو مستلزم نہیں ہے چنانچہ رسالت پر ایمان لانے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس میں یہود ونصاریٰ کا واضح رد ہے کیونکہ یہ بعض نبیوں کو مانتے ہیں بعض کا انکار کرتے ہیں۔ سوال: لفظ ''بَيْنَ'' تو تعدد کی طرف مضاف ہوتا ہے جبکہ ''اَحَدٍ'' میں تعدد نہیں ہے۔؟ جواب ۱: ''اَحَدٍ'' جمع کے معنی میں ہے البتہ اس کو بعض مفسرین نے رد کیا ہے۔ جواب ۲: عبارت میں تقدیری الفاظ ہیں یعنی ''بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَبَيْنَ غَيْرِهٖ'' جواب ۳: اس لفظ میں عموم ہے کیونکہ نفی میں مستعمل ہے جو کہ جمع کا معنیٰ دیتا ہے لہٰذا بین کی اضافت اس کی طرف صحیح ہے۔ ''وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا رَبَّنَا'' چونکہ کمال ایمان علم کے بغیر نہیں ہو سکتا بلکہ مقصود یہ ہے کہ ایمان کو عقیدتاً وعملاً قبول کیا جائے صحابہ کرام کا یہ قول گزر گیا ہے کہ ''سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا'' جبکہ انکے برعکس یہودیوں اور نصاریٰ کا قول یہ تھا کہ ''سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا'' اور ان کے مفعول مقدر ہیں یعنی ''سَمِعْنَا قَوْلَكَ وَاَطَعْنَا اَمْرَكَ'' امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ عدم ذکر مفعول مقدر اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ کوئی اور قول اس طرح نہیں ہے جس کی سمع واطاعت کی جائے۔ ''سَمِعَ'' سے مراد صرف سننا نہیں ہے کیونکہ صرف سننے پر کسی کی تعریف نہیں ہوتی جب اطاعت نہ ہو۔ لہٰذا مراد یہ ہے کہ ہم نے سنا اور مانا مراد یہ ہے کہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ جو کچھ ملائکہ کے واسطے بذریعہ انبیاء ہم کو ملا ہے وہ حق اور یقینی ہے اور واجب القبول ہے اس معنی میں سورۃ ق آیت: 37، میں مذکور ہے۔ ''اَطَعْنَا'' دلالت کرتا ہے کہ قبولیت کے ساتھ عمل

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لازم ہے اس کو کامل ایمان کہا جاتا ہے۔ "غُفْرَانَكَ" یہ بات معلوم ہے کہ قبولیت اطاعت میں بشری تقاضا کے تحت کچھ کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اور یہ بات بھی گزر گئی "فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ" اس لئے مغفرت کا سوال ذکر کیا گیا ہے۔ امام سیبویہ کے نزدیک اس سے پہلے لفظ "اِغْفِرْ" مقدر ہے۔ مغفرت کا معنی وسیع ہے۔ جو کہ انبیاء کرام علیھم السلام کیلئے بھی عام ہے۔ "وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ" چونکہ خوف قیامت سے مغفرت کی طلب ہو رہی ہے تو اس لئے اس جملہ میں قیامت کا تذکرہ فرمایا یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف جانا اور قیامت پر ایمان، ایمان کے ابتدائی اصول میں سے ہے مگر عقیدے اور عمل کے سات قبولیت کے لیے علت غایہ ہے۔ اللباب۔

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۗ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِن نَّسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ ۖ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا ۚ أَنتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٢٨٦﴾ مکلف نہیں کرتا اللہ تعالیٰ کسی نفس کو مگر اس کی طاقت کے مطابق ہر نفس کیلئے اسکے کیے ہوئے اعمال کا بدلہ ہے اور ہر ایک نفس پر اپنے کیے ہوئے اعمال کا وبال ہے۔ (انہوں نے کہا) اے ہمارے رب! ہماری بھول اور خطاؤں پر مواخذہ (پکڑ) نہ کرنا۔ اے ہمارے رب! ہم پر وہ بھاری بوجھ نہ ڈالنا جس کے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں ہے جیسا کہ ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے ہمارے رب! ہم پر وہ کچھ نہ ڈالنا جس کی ہم میں اٹھانے کی طاقت نہیں ہے۔ اور ہمیں معاف فرما اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر تو ہی ہمارا مالک ہے پس ہمیں کافر قوم پر غلبہ عطا فرما" (286)

تفسیر 286: اس آیت میں اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں خرچ کرنے کی ترغیب ہے۔ پھر دعاء کا ذکر ہے اور اس دعاء خطاء ونسیان سے درگزر اور اس سورۃ پر عمل کے متعلق ہے اور اس قسم کے عمل سے بچاؤ یعنی شرک، کفر، توجہ نہ کرنا وغیرہ جو کہ اصر کا حمل ہے۔ اور دعوت وجہاد میں مصیبتوں کا برداشت نہ کرنا۔ پھر تین دعاؤں کا ذکر ہے۔ اور چوتھی دعاء ان لوگوں کے متعلق ہے جو اس سورت کے مقاصد سے انکار کر کے مقابلہ کرتے ہیں۔

ربط 1: ایک اشکال پیدا ہوا کہ مغفرت اس لئے مانگی گئی کہ احکام الٰہی طاقت سے زیادہ ہیں تو جواب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر اضافی وزن نہیں ڈالتا اس میں بھی کوتاہی کرنے والوں سے اللہ تعالیٰ درگزر فرماتا ہے۔ ربط 2: "لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا" یہ جملہ اگر مؤمنین کے کلام میں شامل ہو تو پھر یہ ان کے قول "سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا" کے لیے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

علت ہے اگر اللہ تعالیٰ کا کلام ہو اور بطور استیناف کلام ہو تو پھر ان لوگوں کو تسلی دی گئی ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو مستقل ہمیشہ سمع واطاعت کرتے ہیں اور ان کو یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ عمل تمہاری طاقت سے زیادہ نہیں ہے۔ اور اس میں تعلیم دعاء ہے اس وقت کیلئے جب انسان سے تقصیر ہوجائے۔ ربط ۳: یُحَاسِبْكُمْ "منسوخ ہے لَا يُكَلِّفُ اللهُ" کی بنا پر بھاری حکم کو ختم کر کے خفیف حکم نازل کیا ہے۔ "لَا يُكَلِّفُ اللهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا" آیت 233، میں بھی اس طرح کی آیت گزر چکی ہے اور سورہ انعام آیت: 152، اور سورہ اعراف، آیت: 42، سورہ مؤمنون، آیت: 62، میں متکلم "لَا نُكَلِّفُ" کا صیغہ موجود ہے۔ "لَا يُكَلِّفُ" دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے۔ دوسرا مفعول مقدر ہے یعنی "عِبَادَةً" یا "شَيْئًا" یہاں پر استثناء مفرغ دوسرے مفعول کی جگہ پر قائم ہے۔ تکلیف کا معنیٰ ہے کسی پر ذمہ داری ڈالنا اور یہ اللہ کی جانب دو قسم کی ہے۔ مصائب کو نیہ یعنی امراض حادثات وغیرہ۔ احکام شرعیہ قلبی مالی، بدنی یہاں پر دونوں قسموں کا احتمال ہے۔ البتہ سورۃ میں احکام ذکر کرنے کی مناسبت سے دوسرا معنی بہتر ہے۔ "وُسْعَهَا" اس میں فراخی وسعت کا معنی ہے جو انسان کی طاقت میں بغیر کسی تنگی کے ہو۔ یہ لفظ تو مصدر کا ہے لیکن اس سے مراد مفعول ہے۔ لفظ قدرت، طاقت، جہد کی بنسبت اس لفظ میں آسانی بہت ہے اس لیے اس کو استعمال کیا گیا ہے۔ اس میں دلیل ہے کہ یہ تکلیف مالا یطاق یعنی تکلیف بالمحال نہیں ہے۔ اسکے واقع ہونے میں بہت اختلاف ہے۔ اس کی تفصیل امام قرطبیؒ، جصاص، اللباب، ابن عاشورؒ وغیرہ نے لکھی ہے۔ لفظ "إِلَّا وُسْعَهَا" میں غیر اختیاری باتیں مراد ہیں۔ یعنی دل میں وسوسوں کا آنا وغیرہ۔ اس سے خارج ہے تو وہ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ میں داخل نہیں ہے یا پھر اس سے تخصیص ہوئی ہے جس کو منسوخ کہا جاتا ہے۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ یہ جملہ نفسا سے حال بن کر آیا ہے اور اس میں وسعت کی کیفیت کو دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یا تو اس نے حَسَنَاتْ (نیکیاں) جمع کی ہوں گی تو انسان یعنی کسب کرنے والے کیلئے فائدہ ہے۔ یا سَيِّئَاتْ کئے ہوں گے تو وہ اس پر وبال (نقصان) ہوگا كَسَبَ اور اِكْتِسَابْ اختیاری امور میں سے ہے لہٰذا اس میں خیالات اور وسوسے داخل نہیں ہیں۔ البتہ اہل لغت کے نزدیک کسب اور اکتسبت خیر وشر میں ایک چیز ہے اس کی دلیل بقرہ آیت: 81، انعام آیت: 164، مدثر آیت: 38 میں ہے جبکہ یہاں پر لام اور علیٰ کی وجہ سے ہے یعنی لَهَا وَعَلَيْهَا اور بعض کے نزدیک اِكْتِسَابْ كَسَبَ سے خاص ہے۔ کسب اپنے لئے اور غیر کیلئے دونوں معنوں میں مستعمل ہے جبکہ اِكْتِسَابْ صرف اپنے لئے استعمال ہوتا ہے۔ سوال: خیر کے ساتھ لفظ كَسَبَتْ اور شر کے ساتھ لفظ اِكْتَسَبَتْ ذکر کرتے میں کیا حکمت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے؟ جواب: ابن عطیہ کا قول ہے کہ حسنات میں تکلیف نہیں ہے کیونکہ دین کا کام آسان ہے اس کے ساتھ کَسَبَتْ ذکر کیا ہے جبکہ گناہ (سَیِّئَاتْ) مشکل مشقت سے کرنے پڑتے ہیں لوگوں سے چھپا کر ڈاکہ، چوری زنا وغیرہ اور آخرت میں انجام کے اعتبار سے بڑا مشقت ہے اس لئے اس کے ساتھ اِکْتَسَبَتْ ذکر ہوا ہے اس آیت میں دلیل ہے کہ کام کی نسبت جب بندے کی طرف ہو تو کسب استعمال کرے قدرت لفظ سے اجتناب بہتر ہے کیونکہ وہ موہم ہے۔ دونوں جملوں میں لَهَا اور عَلَيْهَا تخصیص کیلئے ذکر کیا ہے۔ پہلے والے جملے میں شفاعت شرکیہ کا رد ہے جبکہ دوسرے والے میں موافقت ہے۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ کے ساتھ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اس میں دو احتمال ہیں:

پہلا احتمال: اس میں قَالُوْا مقدر ہے ایمان والوں کے بعد والے قول کی حکایت ہے جو انہوں نے قَالُوْا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا: کہا ہے اور درمیان میں معترضہ جملے ہیں یعنی ایمان والے! ایمان کا اقرار اطاعت کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف دعا (تضرع) یعنی عاجزی کرتے ہوئے متوجہ ہوتے ہیں۔ دوسرا احتمال: اللہ تعالیٰ کی طرف سے سورہ فاتحہ کی طرح تلقین ہے لہٰذا اس احتمال سے اس میں قُوْلُوْا: مقدر ہے مُؤَاخِذَةٌ أَخْذٌ سے ہے جس کا معنی عذاب دینا ہے جیسا کہ سورۃ عنکبوت آیت 40 میں ہے اور مفاعلہ بمعنی مجرد ہے دعا میں مبالغہ و تاکید پیدا کرنا مقصود ہے۔ یا آخَذَ اللّٰهُ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عقوبت اور بندے کی طرف سے عفو و درگزر طلب کرنے کے معنی میں ہے۔ إِنْ نَّسِيْنَا أَوْ أَخْطَأْنَا: نسیان ذکر کے مقابل ہے معنی یہ ہے کہ اس چیز کو بھلا دینا جس کے کرنے کا حکم دیا گیا ہو اس چیز کا یا عمل کا بھول کر ارتکاب کرنا جس سے منع کیا گیا ہو۔ یعنی نماز بھول جائے، روزہ کی حالت میں بھول کر کھائے پیئے یا کسی ممنوع چیز کو بھول کر کھائے قرآن میں اس کا مادہ پینتالیس (45) مرتبہ ذکر ہے جس کا استعمال مختلف طریقوں سے ہوا ہے۔ مثلاً (۱) بھول جانے کے معنی ہیں یہ تو بہت سی آیتوں میں ذکر ہے۔ سورۃ طٰہٰ: 115، سورۃ کہف آیت 61، (۲) اس صفت سے اللہ تعالیٰ مبرا ہے سورۃ مریم آیت: 64، سورۃ طٰہٰ آیت: 52، (۳) جان کر کسی چیز یا عمل کو چھوڑ دینا۔ سورۃ اعراف آیت: 164، سورۃ جاثیہ آیت: 34 (۴) اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کو ذلت کے ساتھ چھوڑنا بطور مجاز۔ سورۃ توبہ آیت: 67، سورۃ اعراف آیت: 51، (۵) شیطان کی طرف اس کی نسبت گمراہی کے طریقے پر سورۃ المجادلۃ آیت (۶) نسیان جس کی نسبت شیطان کی طرف کی گئی ہے یا تسلط کے طور پر یا اس کے خوش ہونے کی وجہ سے سورۃ یوسف آیت: 42، سورۃ کہف آیت: 63 (۷) اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت بطور شریعت سورۃ بقرۃ آیت: 106، امام راغبؒ نے فرمایا ہے کہ ہر وہ بھول جس کو اللہ تعالیٰ نے بطور مذمت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بیان کیا ہے تو وہ عمداً چھوڑتا ہے اور عذر تو قصداً نہیں ہوتا ہے۔ اَوْ اَخْطَاْنَا امام راغبؒ نے فرمایا ہے کہ جب بندہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے اور اچانک اس سے کوئی اور کام صادر ہو جاتا ہے اس کو خطاء کہتے ہیں اس کی تین قسمیں ہیں (۱) کسی کام کا ارادہ کرے اور وہ اچھا کام نہ ہو اس کو کر جائے تو اس کو خطاء تام کہا گیا ہے۔ شرک اور کفر کو بھی خطاء کہا گیا ہے جیسا کہ اسی سورۃ میں گزرا ہے۔ اَحَاطَتْ بِہٖ خَطِیْٓئَتُہٗ (۲) ارادہ اچھے کام کا کیا ہے مگر غلطی سے اس کے خلاف ہوا تو اس کے بارے میں حدیث ہے۔ رُفِعَ عَنْ اُمَّتِیْ الْخَطَاءُ وَالنِّسْیَانُ (۳) تیسرا یہ ہے کہ ارادہ گناہ کا کیا مگر کام اس سے اچھا صادر ہو جائے تو ارادہ میں گنہگار ہے اور عمل صحیح ہونے کے باوجود قابل مذمت ہے۔ سنن ابن ماجہ کی حدیث میں ہے۔ رُفِعَ عَنْ اُمَّتِیْ اَلْخَطَاءُ وَالنِّسْیَانُ وَمَا اسْتُکْرِھُوْا عَلَیْہِ میری امت کو بھول جانے خطاء اور جو ان پر جبر کیا گیا ہو معاف کیا گیا ہے۔ ابوداؤد حدیث 4398 ابن ماجہ 2041 ابن حبان حدیث 1496 شیخ البانی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے ارواء الغلیل ج2 ص 4 حدیث 297 سوال: تو جب یہ معاف ہے تو اس کی دعا مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟ جواب 1: تفسیر اللباب میں ہے کہ نسیان سے مراد اس عمل کو چھوڑنا ہے جس کا حکم دیا گیا ہو تاویل فاسد کے ذریعے سے اور خطاء سے اس کام کا ارتکاب تاویل فاسد کے ذریعہ سے کرنا مراد ہے۔ جواب 2: نسیان دو قسم کا ہے ایک یہ ہے کہ اس کا مرتکب بے خبر ہے تو وہ معذور ہے جیسا کہ کسی کو اپنے کپڑوں میں گندگی کا علم نہ ہو اور اس میں نماز ادا کر لیتا ہے یا ایک شخص تلاوت قرآن پاک مسلسل کرتا ہے لیکن اس سے پھر بھی بھول ہو جائے تو یہ انسان معذور ہے۔ دوسری قسم وہ ہے کہ اس کام میں بندہ معذور نہیں ہے جیسا کہ اپنے کپڑے میں گندگی دیکھ لی ہے لیکن صفائی میں تاخیر کرتے ہوئے بھول گیا یہاں تک کہ اس میں نماز بھی ادا کر لی یا تلاوت قرآن پاک چھوڑ دیتا ہے یہاں تک کہ بھول جاتا ہے اس کیفیت میں گنہگار غیر معذور ہے۔ اس آخری شخص کو مغفرت کی طلب کرتے رہنا چاہئے اور خطاء کا اطلاق عمداً گناہ پر ہوتا ہے وہ یہاں مراد ہے۔

جواب 3: یہ دعا خطاء و نسیان ہر دور گزرے پہلے ہے لہٰذا دعا قبول ہونے کے بعد بطور نعمت ذکر ہوا ہے۔ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَآ اِصْرًا۔ اِصْرٌ اصل میں بوجھ اور وزن کو کہا جاتا ہے اور عہد اور وعدہ کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ جیسا کہ سورۃ آل عمران آیت: 81 میں ذکر ہے امام ابو حیان رحمہ اللہ نے اور بھی اطلاقات بیان کئے ہیں۔ وہ گناہ جس میں کفارہ اور توبہ نہ ہو۔ مسخ شدہ شکلوں کی صورت میں جلد آنے والا عذاب یہاں پر وہ سخت اعمال و تکالیف اور سزائیں مراد ہیں جو کہ ملت بنی اسرائیل پر مقرر کی گئی تھیں جیسا کہ پچاس نمازیں ہر زکوۃ میں چوتھائی حصہ، گندگی لگ جانے کی صورت میں کپڑے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لباس سے کاٹ لینا۔ امام قفال کا قول ہے کہ تورات کے سفر خامس میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔ سوال: مذکورہ مشکلات تو اس امت پر اللہ تعالیٰ نے نہیں رکھی ہیں تو پھر یہ دعا مانگنے کی کیا ضرورت اور فائدہ ہے؟ جواب 1: اس دعا کے بعد اس امت میں وہ اعمال اللہ تعالیٰ نے فرض نہیں کئے ہیں۔ جیسا کہ صحیح مسلم کتاب الایمان حدیث 199 مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا "نَعَمْ قَدْ فَعَلْتُ" جواب 2: یہ دعا بطور نعمت مانگی جاتی ہے لفظ اِصْرًا سے مراد وہ گناہ ہے کہ اس سے توبہ نہ ہوئی ہو یا بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتا ہو جیسا کہ شرک، کفر وغیرہ۔ وَلَا تَحْمِلْ امام سمعانیؒ اور صاحب اللبابؒ نے فرمایا ہے کہ یا اللہ ہمیں اس قسم کے گناہ سے محفوظ فرما۔ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا: پہلے قول کی بناء پر اس سے مراد یہودی ہیں اور دوسرے قول کی بناء پر مشرکین کے اکابر مراد ہیں اہل کتاب میں سے ہوں یا غیر کتابی ہوں۔ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ: اس میں بہتر قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ مشکلات اور تکلیفیں ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام اور صالحین لوگوں پر دین کی دعوت وجہاد کے راستے میں آئی تھیں۔ اگرچہ وہ انکی طاقت کے مناسب تھیں لیکن ہر ایک انسان کو اسکی طاقت وقوت کے مناسب اللہ تعالیٰ نے آزمایا ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں پر سابقہ لوگوں کی تشبیہ اور مثال نہیں دی۔ اور لفظ مَا لَا طَاقَةَ لَنَا اصراً سے سخت ہے اس لئے کہ اصراً انسان کی طاقت میں ہے تو اس کے ساتھ حمل کو تخفیف کی ساتھ ذکر کیا ہے اور یہاں پر تحمل تشدید کی ساتھ ذکر کیا ہے یعنی اصراً کا اٹھانا ممکن ہے اور مَا لَا طَاقَةَ لَنَا کا امکان نہیں ہے۔ اگر وہ بندے پر ڈالا جائے تو وہ اس کے سامنے مجبور ہوگا۔ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا: امام راغب اور ابن کثیر رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ انسان گناہوں کے متعلق تین چیزوں کے محتاج ہیں۔ (۱) پہلی عفو ہے تاکہ گناہوں کی سزا ساقط ہوجائے (۲) مغفرت ہے تاکہ گناہوں پر پردہ پوشی ہوجائے تاکہ شرمندگی سے پناہ حاصل ہو۔ (۳) رحم یعنی مزید احسانات کرنا اور آئندہ گناہوں سے اجتناب کرنا ان میں سے ہر ایک پہلے والے سے ابلغ یعنی اعلیٰ ہے۔ سوال: اس جملہ کے ساتھ ربنا نہیں فرمایا ہے۔ جواب: پہلا سبب یہ ہے کہ عرب لوگ اپنے کلام میں تین بار سے زیادہ تکرار کرنا پسند کرتے ہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ سابقہ تینوں ان تینوں کیلئے مثل فروع (شاخوں) کی ہے۔ عفو اصل ہے پکڑ سے بچاؤ کیلئے اور مغفرت اصل ہے مشقت ہٹانے کیلئے اور رحم اصل ہے دنیاوی اور اخروی (عقوبات) سزاؤں سے نجات کیلئے۔ تو سابقہ تینوں کی استجابت ہوگئی۔ اَنْتَ مَوْلٰنَا اس کو عطف کے بغیر اس لئے ذکر کیا ہے کہ ان دعاؤں کیلئے علت یہ ہے یعنی مذکورہ دعائیں تجھ سے ہم اس لئے طلب کرتے ہیں کہ تو ہمارا مولیٰ ہے اور مولیٰ اپنے غلاموں پر شفقت کرتا رہتا ہے اور یہ آئندہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جملوں کیلئے ایک خاص وسیلہ بھی ہے۔ فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ: حرف (فا) برائے تاکید ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی ولایت مومنوں کی نصرت کیلئے لازمی و یقینی ہے۔ یہ کامل اور جامع دعا ہے کیونکہ کافروں پر غلبہ فتنوں سے نجات کیلئے ذریعہ ہے اور دین کی اشاعت اور دنیا کی بہترین زندگی گزارنے کیلئے بھی سبب ہے، جبکہ اس میں جہاد کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس سورۃ میں مخالفین کے ساتھ مناظرہ کرنا قتال کرنا ذکر ہوا ہے اور وہ نصرت الٰہی سے ہی ہوتا ہے اور یہاں نصرت سے غلبہ حاصل کرنا مراد ہے۔ امام ابن کثیرؒ نے معاذ رضی اللہ عنہ سے اس سورۃ کے آخر میں آمین پڑھنا نقل کیا ہے۔ تفسیر ابن جریر 6۔146

اس سورۃ کی خصوصیات: (۱) یہ پہلی سورت ہے جو کہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی ہے اور اس میں یہودیوں کا رد ہے (۲) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اول دور ہجرت میں جن لوگوں نے منافقت کا مظاہرہ کیا تھا ان کی صفتوں کا ذکر اس میں ہے۔ (۳) آدم علیہ السلام کی خلافت ملائکہ کا سجدہ اور آدم علیہ السلام کو تعلیم کی نعمت سے آراستہ کرنا (۴) خلافت کو برقرار رکھنے کیلئے بنی اسرائیل کو خاص کاموں کا حکم اور خاص کاموں سے منع مذکور ہے۔ (۵) بنی اسرائیل پر موسیٰ علیہ السلام کی اطاعت کے ایام میں خاص انعامات کا ذکر (۶) بنی اسرائیل کے ان (قبائح) پچاس برائیوں کا ذکر جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے خلافت اور نبوت ان سے چھین کر بنی اسماعیل علیہ السلام کی طرف منتقل کی (۷) ابراہیم علیہ السلام کی امامت، تعمیر بیت اللہ اور اس کی تعمیر کا خلاصہ (۸) قبلہ بدلنے کا تذکرہ (۹) ان امور کا ذکر جو اخلاقی، سیاسی، انفرادی اور منزلی ہوں (۱۰) طلاق، عدت، رضاعت کا ذکر (۱۱) طالوت و جالوت کا ذکر (۱۲) خرچ کرنے کی مثالوں اور شرطوں کا ذکر (۱۳) حرمت سود (ربو) کا ذکر (۱۴) لین دین کے مسائل جو کہ تقریباً تیس ہیں (۱۵) کثرت کے ساتھ دلائل توحید کا ذکر جو کہ تین طریقوں پر مشتمل ہیں۔ پہلا طریقہ استدلال ہے کہ اعیان کی تربیت مواد یعنی کسی بھی چیز کی تربیت کیلئے بندوبست کرنا۔ دوسرا طریقہ اعیان کی کیفیات پر استدلال۔ تیسرا طریقہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات سے استدلال۔ (۱۶) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر دلائل اور شبہات کے جوابات (۱۷) دعویٰ توحید کو چار تعبیرات کے ساتھ ذکر کیا اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ. لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمِ. اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ۔ (۱۸) آٹھ مثالوں کو ذکر کیا گیا ہے۔ تین مثالیں شروع میں ایک مثال درمیان جبکہ چار مثالیں آخر میں ذکر کی ہیں۔ (۱۹) جوا کھیلنے، شراب نوشی، نکاح اور مسائل حیض (۲۰) جہالت کے مسائل کا رد کیا گیا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

الحمد للہ! میرے علم کی استطاعت کے مطابق سورۃ بقرہ کی تفسیر تکمیل کو پہنچی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ میرے تمام گناہوں کو معاف فرمائے اور اس تفسیر کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطاء فرمائے (آمین)۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اٰیاتھا ۲۰۰ ۳ سُوْرَۃُ اٰلِ عِمْرٰنَ مَدَنِیَّۃٌ ۸۹ رکوعاتھا ۲۰

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خاص اللہ تعالیٰ کے نام کی مدد چاہتے ہیں شروع کرنے میں جو رحمن ورحیم ہے۔

الٓمّٓ ۟ۚ اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۙ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۟ؕ نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ ۟ۙ مِنْ قَبْلُ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ؕ۬ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ؕ وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۟ "اللہ تعالیٰ ہی اس کی حقیقت اور راز کو جانتا ہے۔[1]۔ بندگی کا حقدار صرف اللہ تعالیٰ ہے ہمیشہ زندہ اور نظام دنیا چلانے والا ہے۔[2]۔ جس نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب نازل فرمائی ہے جو سابقہ کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اس نے اس سے پہلے اتارا تھا تورات وانجیل کو۔[3]۔ لوگوں کی ہدایت کیلئے حق وباطل میں فرق کرنے والا (قرآن) بھی اسی نے اتارا ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں یقیناً ان کیلئے سخت ترین عذاب ہے اور اللہ تعالیٰ غالب بدلہ لینے والا ہے"[4]۔

امام قرطبی وآلوسی نے اس سورۃ کے اور نام بھی ذکر کئے ہیں یعنی طیبہ، الزہراء، سانپ زہریلی چیزوں سے پناہ کیلئے امان، مسکین کیلئے خزانہ، معینہ، مجادلہ، سورۃ الاستغفار۔ تیسیر الرحمن میں مفسر مہائمی رحمہ اللہ نے ان ناموں کی وجوہات بیان کی ہیں مشہور نام سورۃ آل عمران ہے کیونکہ اس سورۃ میں عمران کا حال ہے جو مریم علیہا السلام کے والد تھے اور اس کی آل یعنی بیوی اور سالی جو کہ زکریا علیہ السلام کی بیوی تھی اور مریم کی کفالت کنندہ تھی اور زکریا علیہ السلام اور ان کے بیٹے یحییٰ علیہ السلام کے متعلق تفصیل ہے۔ بہتر قول یہ ہے کہ اس سورۃ کا نزول سورہ انفال کے بعد ہوا ہے اس لیے کہ سورۃ انفال میں جنگ بدر کا ذکر ہے جو رمضان المبارک میں ہجرت کے دوسرے سال ہوئی اور اس سورۃ میں جنگ احد کا ذکر ہے جو شوال کے مہینے میں ہجرت کے تیسرے سال ہوئی۔ اس وقت دو بڑے واقعات رونما ہوئے تھے ایک وفد نجران کا مدینہ طیبہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ مناظرہ کیلئے آنا دوسرا واقعہ غزوہ احد کا ہے۔ وفد کے یہ لوگ اس وقت نصرانیت پر پختہ تھے ان میں مشہور بڑے بڑے علماء اور مذہبی رہنما شامل تھے انہوں نے نجران میں دعوت مسیحیت کیلئے ایک کعبہ تعمیر کیا تھا یہ وفد

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ساٹھ افراد پر مشتمل تھا جن کے امیر کا نام عاقب تھا ان کے منتظم کا نام ایہم تھا۔ جب انہوں نے نبی کریم سے مناظرہ میں عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اپنے شبہات پیش کیے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تفصیلی جوابات دیئے جس کا مفصل ذکر مفسر مہائمی نے اپنی تفسیر میں کیا ہے۔ انہوں نے ان دلائل سے انکار کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مباہلہ کی دعوت دی جس کو انہوں نے چالبازی سے ٹال دیا ان ہی کے متعلق کم وبیش ۸۰ آیتیں نازل ہوئیں۔

سورۃ بقرہ کے ساتھ ربط: یہ ربط چند وجوہ سے ہے۔ (۱) بقرہ میں توحید و رسالت پر دلائل و حجت قائم کی گئی تو اس سورۃ میں ان دونوں کے متعلق جو شبہات تھے ان کا ازالہ ہے۔ (۲) بقرہ میں یہودیوں کا رد تھا تو اس سورۃ میں نصاریٰ کا رد ہے۔ (۳) بقرہ میں مقاصد اربعہ یعنی توحید رسالت جہاد و انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر ایک خاص طریقے پر ہوا تو ان ہی چار کا ذکر اس سورۃ میں دوسرے طریقے پر ہو رہا ہے۔ (۴) اس سورۃ میں بقرہ کے بعض امور کو اجمالی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً (۱) وہاں فرمایا تھا وَقُودُهَا النَّاسُ ۔ یہاں پر إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا ۔۔۔ وَأُولَٰئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ ۔ فرمایا ہے (۲) بقرہ میں اہل کتاب کا کفر ذکر ہوا لفظ بَغْيًا تو یہاں پر آیت ۱۹ میں اختلاف بَغْيًا کا ذکر ہے۔ (۳) بقرہ میں زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فرمایا تھا تو یہاں زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ آیت ۱۴ میں ذکر فرمایا ہے۔ (۴) بقرہ میں امامت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر تھا تو اس سورۃ میں آدم علیہ السلام کا چناؤ یعنی اصطفیٰ آدم نوح، آل ابراہیم و آل عمران کا ذکر ہے۔ (۵) بقرہ میں کافروں کیلئے جہنم تیار کیے جانے کا ذکر تھا۔ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ تو اس سورۃ میں جنت کے متعلق فرمایا ہے کہ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ (آیت ۱۳۲)۔ (۶) بقرہ میں ارشاد ہوا تھا کہ قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْنَا ۔ اس سورۃ میں ارشاد ہوا ہے قُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا (آیت ۱۸۴)۔ (۷) بقرہ میں ابراہیم علیہ السلام کا آخری نبی کی بارے میں دعا کا ذکر تھا رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا الخ تو اب اس سورۃ میں ایمان والوں پر اس کی نبوت کا احسان ذکر ہے۔ لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ الخ (آیت ۱۶۴)۔ (۸) بقرہ میں کافروں کا عمل ربوا ذکر ہوا اور مومنین کو ربوا چھوڑنے کا حکم ہوا تو اب اس سورۃ میں ایمان والوں کو ربوا سے منع ذکر ہے (آیت ۱۳۰)۔ (۹) بقرہ میں منافقین کی صفات کا ذکر تھا جو اس وقت ہجرت سے متعلق تھیں اب اس سورۃ میں ان کے ان صفات کا ذکر ہوا ہے جو غزوہ احد سے متعلق ہیں۔ (۱۰) بقرہ کے شروع میں متقین کی صفات کا ذکر ہے تو اس سورۃ کے درمیان آیت ۱۳۴ اور ۱۳۵ میں انکی دو صفات مذکور ہیں۔ (۱۱) سورۃ بقرہ میں تعمیر بیت اللہ کا ذکر گزر رہا ہے تو اس سورۃ میں آیت ۹۶ اور ۹۷ میں اس کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

اولیت یعنی دنیا میں اللہ تعالیٰ کا پہلا گھر ہونا اور حج کا ذکر ہے۔ (۱۲) سورۃ بقرہ میں ان کی خباثتوں کا ذکر ہوا تو اس سورۃ کی آیت
۱۰۰ میں ان کی اطاعت سے منع کیا گیا ہے۔ (۱۳) بقرہ کا اختتام دعاء پر کیا گیا تو اس سورۃ کا اختتام بھی دعاء پر کیا گیا ہے۔ ١١

سورۃ کا بنیادی مضمون: اس سورۃ کا مرکزی مضمون توحید اور نصاریٰ کے شرک کی تردید ہے۔ اور یہ رد دس طریقوں سے کیا گیا ہے۔ (۱) پہلا طریقہ آٹھ آیتوں میں مختلف تعبیرات سے اثبات اور تین بار توحید کی تشریح کی گئی ہے آیت ۲، ۶، ۱۸، ۲۷، ۵۱، ۶۳، ۱۰۹، ۱۲۹ اور ۱۸۹۔ (۲) دفع شبہات نصاریٰ ہے یعنی آل عمران کی بزرگی، بندگی، عاجزی اور بے بسی ذکر کی گئی ہے کہ یہ لوگ بزرگ ضرور تھے مگر معبود نہیں تھے اسی طرح ابراہیم علیہ السلام کی ملت میں شرک کا رد مذکور ہے یہ کل چھ (۶) شبہات ذکر ہونے ان کا ازالہ کیا گیا ہے۔ (۳) راسخین فی العلم کے اقوال کو اثبات توحید پر بطور دلائل نقلیہ ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی عمران علیہ السلام کی بیوی کا قول آیت ۳۵ میں، مریم علیہا السلام کا قول آیت ۳۷ میں، زکریا علیہ السلام کا قول آیت ۳۸ میں ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کا قول آیت ۵۰ میں اور آخری نبی ﷺ کا قول آیت ۶۴ میں ہے اور صحابہ کرام کا قول آیت ۱۸۳ میں ہے۔ (۴) شرک کے بعض اقسام کا رد اس طرح ہے جیسے رد شرک فی العلم آیت ۵، ۲۹، ۴۴، ۱۱۹ اور ۱۵۴ میں ہے۔ رد شرک فی التصرف آیات ۶، ۲۶، ۲۷، ۱۰۹، ۱۲۹، ۱۹۰ اور ۱۸۹ میں ہے۔ رد شرک فی العبادت آیت ۵۱ اور ۶۴ میں ہے۔ (۵) اہل کتاب میں توحید کے منکرین کے قبائح کا تذکرہ آیت ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۵، ۷۷، ۷۸، ۸۶، ۹۴، ۹۸ اور ۹۹۔ (۶) صدق الرسول (یعنی رسول کی صداقت) جنہوں نے توحید کی طرف دعوت دی ہے اور ان مخالفین کے تین اعتراضات شبہات کا جواب بھی دیا گیا ہے۔ پہلا شبہ حلال و حرام سے متعلق ہے۔ آیت ۹۳ میں جبکہ دوسرا بیت اللہ کے متعلق ۹۷ میں ہے۔ اور تیسرا احد میں عارضی شکست (ہزیمت) ہوئی تو اس کے متعلق ہے آخری اعتراض کا جواب تیرہ علتوں کے ذریعے سے یہ واضح کیا گیا کہ احد کی وقتی ہزیمت میں یہ اسباب کارفرما تھے۔
(۷) طریقہ عقلی، نقلی اور وحی دلائل کا ذکر کیا گیا ہے مگر اختصار کے ساتھ آیت ۲، ۳، ۵، ۶، ۱۸، ۲۶ اور ۲۷ میں ہے۔
(۸) طریقہ سورۃ کے آخر میں مؤمنین کی دس صفات کا ذکر ہے کہ یہ اُولُوا الْاَلْبَابِ ہیں۔ (۹) نواں طریقہ منکرین توحید سے براءت ان کے دوستانہ تعلقات سے ممانعت خواہ ظاہری منکر ہو جیسا آیت ۲۸ اور ۱۰۰ میں ہے یا باطنی منکر ہو جیسا کہ آیت ۱۱۸، ۱۴۹ اور ۱۵۶ میں ہے۔ (۱۰) دسواں طریقہ توحید کو ثابت کرنے کے لئے بار بار تکرار اللہ تعالیٰ کے ۳۶ اسماء الحسنیٰ ذکر کیے گئے ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سورۃ کا اجمالی خلاصہ: پہلے توحید کا اثبات اور نصاریٰ کے شکوک وشبہات کا ازالہ ہے ان کا عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق الوہیت کا عقیدہ تھا تو اس پر توحید کے دلائل سے رد کیا گیا پھر نبی آخر الزمان کے ذریعے سے اہل کتاب کو توحید کی دعوت پیش کی گئی ہے اور ان کے (قبائح) خباثتوں کا ذکر ہے اور آخر میں ان کی دوستی سے منع کیا گیا ہے پھر یَاۤ اَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کے ذریعے خطاب ہے جس میں چار قوانین کا بیان ہے جہاد اور متوحدین کو مربوط اور منظم رہنے کے لیے اور جہاد کیلئے بنیادی چار قوانین کا ذکر ہے جو توحید والوں کیلئے لازم ہیں اور ان ہی قوانین پر بدر واحد کی جنگوں کی (تفریع) تشریح کی گئی ہے پھر نفوس کی تطہیر کیلئے (۳۱) آداب وتہذیب مذکور ہے اور واحد میں ہونیوالی شکست پر اعتراضات کے جوابات کا ذکر ہے پھر آخر میں اہل کتاب کو تنبیہات ووعیدات کا ذکر ہے اور اختتام اولوالالباب کے تذکرہ اور ان کی صفات اور دعاء پر کیا ہے۔

تفصیلی خلاصہ: اس سورۃ میں چار حصے ہیں پہلا حصہ آیت ۶۳ تک ہے اس میں نصاریٰ کے شبہات کا رد اور توحید کا اثبات ہے اس حصہ میں تین ابواب ہیں پہلا باب آیت ۱۷ تک ہے اور اس باب میں توحید کا دعویٰ اور پھر اس پر دلائل نقلی عقلی اور وحی کا ذکر ہے۔ اور آیت ۹ تک توحید کی تشریح ہے۔ پھر ان لوگوں کے شبہے کا جواب ہے جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت پر متشابہات سے دلیل لی ہے (نیز یہی طرز عام مشرکین ومبتدعین کا بھی ہے) پھر اس مشکل وقت میں ثابت قدمی کیلئے دعاء ذکر ہے آیت ۹ تک پھر خوف آخرت آیت (۱۰) میں۔ پھر دنیوی عذاب کا ذکر سابقہ جھٹلانے والوں کے لیے آیت (۱۱) اور عبرت کیلئے بدر والوں کو بطور مثال ذکر کیا گیا ہے تکمہ عبرت کیلئے آیت ۱۲ میں پھر دنیا کی ذلت اور آخرت کی طرف رغبت ذکر ہے اور آخرت کی خوشخبری بھی مذکور ہے اور ان صفات کا ذکر آیت (۱۷) میں ہے جن کے ذریعے سے جنت حاصل ہوتی ہے۔

تفسیر 1:1) الٓمّٓ اس کی تشریح سورۃ بقرہ کی ابتداء میں گزری ہے۔ سورۃ بقرہ میں یہ کلمہ قرآن کے اعجاز کے اظہار کے لئے تھا جس میں یہودیوں کو مقابلے کا چیلنج دیا گیا تھا جبکہ یہاں نصاریٰ کے مقابلے کیلئے ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اہل کتاب کے نزدیک حروف مقطعات سے کلام شروع کرنا معروف مسئلہ تھا اس لئے علماء اور مشرکین عوام سب جانتے تھے ورنہ اعتراض کر لیتے۔

تفسیر 2: یہ توحید کا دعویٰ ہے عام مشرکین اور خاص کر اہل کتاب کے مقابلے کا جو نجران سے آئے تھے جن کا عیسیٰ ومریم علیہما السلام کے متعلق الوہیت کا عقیدہ تھا۔ اللہ پہلا قول یہ ہے کہ یہ مبتداء ہے اور نَزَّلَ عَلَیۡكَ الۡكِتٰبَ اس کی خبر ہے اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

درمیان والا جملہ معترضہ یا حالیہ ہے دوسرا قول یہ ہے کہ یہ مبتداء ہے اور لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ اس کی خبر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا نام بطور علَمْ ذکر کرنے سے سننے والوں کے دلوں میں خوف وہیبت پیدا کرنا مقصود ہے۔ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ایسا الٰہ جو اپنے وجود میں کسی کے سہارے کا محتاج نہیں بلکہ قائم بالذات ہے حلول اور اتحاد سے مبرا ہے۔ اس کے ساتھ مریم وعیسیٰ علیہما السلام شریک نہیں ہو سکتے ہیں۔ الْحَيُّ الْقَيُّومُ یہ هُوَ سے بدل یا مبتداء محذوف کیلئے خبر ہے یا لفظ اللہ کیلئے خبر ثانی ہے۔ اس کی تفسیر آیۃ الکرسی میں گزری ہے۔ ان دونوں صفات کو خاص ذکر کیا ہے مقصد یہ ہے کہ الوہیت حقیقی کا تقاضا ہے کہ صفات کمال اسی کا حق ہو اور ان کے صفات جامع کا خاصہ حیات ہے یعنی مستقل زندہ رہنا جس پر ارادہ سمع، بصر وقدرت، کلام موقوف ہے۔ دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ مخلوق کے تمام کمالات اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہیں اور قیومیت کا اصل یہی معنیٰ ہے نہکہ یہ صفت عیسیٰ علیہ السلام میں نہیں ہے کیونکہ وہ موجود نہیں تھے پھر پیدا ہوئے اور بقول نصاریٰ فوت بھی ہوئے یا جیسا ایمان والوں کا عقیدہ ہے کہ ان پر موت آجئگی اور اس میں کمال بالذات نہیں بلکہ جو صفت اس میں ہے وہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے وہ اپنے وجود میں اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے۔

تفسیر 3: یہ توحید کے دعوے کیلئے دلیل ہے یعنی یہ کلام جو توحید پر مبنی ہے نبی اکرم ﷺ نے اپنے پاس سے نہیں بنایا ہے بلکہ اس کو وحی کے ذریعے سے ملا ہے اور نَزَّلَ باب تفعیل سے ہے جو قوت فعل یعنی کیفیت وکمیت (مقدار) پر دلالت کرتا ہے۔ باب افعال صرف تعدیت کیلئے ہے یہاں پر قرآن کریم کیلئے نَزَّلَ تورات اور انجیل کیلئے أَنْزَلَ آیا ہے یہ قرآن کریم کی تقویت کے لیے ہے جو کہ قرآن کی عظمت شان پر دلالت کرتا ہے۔ صاحب کشاف علامہ زمخشری نے إِنْزَالٌ اور تَنْزِيلٌ کے بیچ میں جو مشہور فرق ذکر کیا ہے یعنی (انزال یکبارگی نازل کرنا اور تنزیل تھوڑا تھوڑا کر کے) تو اس کو امام ابن عاشور اور مفسر ابو حیان نے رد کیا ہے۔ الْكِتَابَ اس میں الف لام عہدی یا جنسی ہے لیکن جنس سے مراد فرد کامل ہے جو قرآن ہے۔ اس میں قرآن کریم کے کمال کی طرف اشارہ ہے۔ بِالْحَقِّ (با) ملابست کیلئے ہے یعنی قرآن مجید الفاظ اور معانی کے اعتبار سے حق پر مشتمل ہے۔ امام قرطبی نے فرمایا کہ بِالْحَقِّ نَزَّلَ کے ساتھ متعلق نہیں ہے بلکہ الْكِتَابَ سے حال ہے اور سچائی یا غالب حجت کے معنیٰ میں ہے۔ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ اس کی تفسیر گزری ہے اور یہ الْكِتَابَ سے دوسرا حال ہے۔ مفسر مہائمی نے فرمایا ہے کہ تصدیق سے مراد سابقہ کتابوں کی تعریف اور سچائی کی خبر دینا مقصود ہے اور ابو مسلم نے فرمایا ہے کہ تصدیق سے مراد موافقت ہے یعنی سابقہ انبیاء نے توحید وایمان کی طرف دعوت دی ہے اور شرک سے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

منع کیا ہے اور قرآن بھی اسی عنوان پر مشتمل ہے۔ وَأَنزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ توحید ثابت کرنے کیلئے یہ دلیل نقلی ہے یہ بھی سابقہ کتابوں کی تصدیق ہے۔ التَّوْرَاةَ اس کے بارے میں بھی دو قول ہیں پہلا قول یہ ہے کہ یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے یعنی طورا بمعنی ہدایت اور یہود اس کو سفر طورا کہتے ہیں تو عربی لغت میں منتقل ہوتے وقت اس پر الف لام داخل کیا گیا اور (ط) کو (ت) سے بدلا گیا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ عبرانی زبان کی عربی کے ساتھ موافقت ہے اور یہ وری سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے دو پتھروں کو آپس میں رگڑنا جس سے آگ کی چنگاری نکل جائے یعنی تورات روشنی دینے والی کتاب ہے اسلئے تورات کو سورۃ انبیاء آیت ۴۸ میں ضیاء کہا گیا ہے۔ وَالْإِنجِيلَ: اس کے بارے میں بھی دو قول ہیں پہلا قول یہ ہے کہ یہ یونانی لفظ ہے جنہوں نے اس کو سریانی کہا ہے ان سے غلطی ہوئی ہے اور یونانی زبان میں انکلیون، اوانجیلیوم جس کا معنی اچھی خبر ہے یا انجلیون جس کے معنی فصاحت ہے یہ اس وحی کا نام ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کی طرف کی گئی ہے اور اس کے ساتھیوں نے جمع کی اور بعد میں اس میں تحریف کی گئی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ نجل سے لیا گیا ہے جس کے معنی اصل ہے یا وہ پانی جو زمین سے نکل آتا ہے یا وسعت کے معنی میں ہے اس میں امام قرطبی نے تحقیق کی ہے۔ امام قاسمی نے فرمایا ہے کہ تورات عبرانی زبان میں شریعت کو کہا جاتا ہے جبکہ انجیل یونانی زبان میں خوشخبری کو کہا جاتا ہے انہوں نے کہا ہے کہ یہ قول اہل کتاب کے علماء سے منقول ہے اور درست ہے۔

تفسیر 4: مِن قَبْلُ، یہ اَنزَلَ سے متعلق ہے یا تورات وانجیل سے حال بن رہا ہے۔ مراد اس سے قرآن سے قبل کا زمانہ ہے۔ اس لفظ کو ذکر کرنے میں دو فائدے ہیں پہلا فائدہ یہ ہے کہ قرآن کے نزول کے بعد تورات وانجیل کی ہدایت باقی نہیں رہی، بلکہ وہ سابقہ زمانہ میں ہدایت تھی۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ تورات وانجیل کا نزول قرآن کیلئے ایک مقدمہ تھا اور اصل مقصد قرآن کریم کا نزول تھا۔ هُدًى لِّلنَّاسِ۔ یہ تورات وانجیل کیلئے حال ثانی بن رہا ہے۔

(سوال) سورۃ بنی اسرائیل آیت 2 میں تورات کو صرف بنی اسرائیل کیلئے ہدایت قرار دیا گیا ہے جبکہ یہاں پر لِلنَّاسِ فرمایا ہے؟ (جواب ۱) اس میں الف لام عہدی ہے یعنی صرف یہود ونصاریٰ کیلئے ہدایت ہے۔ (جواب ۲) یہاں مراد استغراق عرفی ہے یعنی بنی اسرائیل کے سوا اگر کسی نے ہدایت حاصل کرنے کی سعی کی ہے تورات وانجیل دونوں کتابوں سے تو ان کو بھی ہدایت ملی ہے البتہ اس لفظ میں اہل قرآن داخل نہیں ہیں سابقہ کتب کے منسوخ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

(جواب ۳) اس سے اصول ایمان کی ہدایت مراد ہے اور اس میں تمام کتب سماوی برابر اور متفق ہیں۔ وَأَنزَلَ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اَلْفُرْقَانَ یہ بھی دلیل نقلی ہے ان صحائف کے لیے جو تورات اور انجیل کے ماسوا نازل ہوئے تھے۔ اس لفظ کی تفسیر سورۃ بقرہ آیت ۵۳ میں گزری ہے۔ اَلْفُرْقَانَ اس میں مختلف اقوال ہیں: امام رازی نے چار اقوال ذکر کئے ہیں پہلا قول یہ ہے کہ اس سے مراد زبور ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد قرآن مجید ہے اور تعظیم شان اور مدح کی وجہ سے دوبارہ اس کو اس صفت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے یہ سبب بھی ہے کہ جب تورات و انجیل والوں نے اگر کسی مسئلہ میں اختلاف کیا ہے تو قرآن مجید نے ان کے حق یا باطل ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ تینوں کتابیں مراد ہیں جو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی کتابیں ہیں۔ امام رازی نے ان تینوں اقوال کو ضعیف قرار دیا ہے اور چوتھا قول بیان کیا ہے اور اس کو افضل (بہتر) قرار دیا ہے یعنی مراد ان نبیوں کے معجزات ہیں جو ان کو کتابوں کے ساتھ دیئے گئے تھے اور ان کتابوں کیلئے وہ معجزات بطور تائید تھے ابن جریر نے پانچواں قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد فصل (جدائی) ہے ان باتوں میں جن میں ان کے فرقوں نے اختلاف کیا تھا خواہ وہ اختلاف عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہو یا دیگر چیزوں میں ہو۔ امام ابن کثیر نے چھٹا قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد وہ براہین، حجتیں، بینات اور واضح دلائل ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حق و باطل میں تمیز کیلئے ہدایت و گمراہی میں فرق کیلئے ذکر کیا ہے۔ مفسر قاسمی نے ساتواں قول ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد میزان ہے جیسا کہ سورۃ حدید آیت ۲۵ میں ہے اور مفسر مہائمی نے آٹھواں قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد دلائل قائم کرنا اور شبہات کا ازالہ کرنا ہے جو سابقہ کتابوں اور اس کتاب میں ہے۔ نواں قول مفسر نیشاپوری نے ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد تمام آسمانی کتابیں ہیں کیونکہ ان کے ذریعے سے حق و باطل میں تمیز ہوتی ہے۔ اس قول کو زمخشری نے بھی نقل کیا ہے۔ امام سمعانی نے دسواں قول نقل کیا ہے کہ ہر وہ کتاب، صحیفہ، معجزہ جس کو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے اور اس کے ذریعے سے حلال و حرام میں فرق ہوتا ہے وہ فرقان ہے۔ تنبیہ: مذکورہ تمام اقوال میں کوئی تضاد نہیں ہے عمومیت کی وجہ سے سب مراد ہو سکتے ہیں البتہ کسی قول پر تصریح ہو جائے تو بہتر ہے میرے نزدیک اگر سابقہ انبیاء کے صحیفوں پر تین وجوہات سے منطبق کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ نیشاپوری، زمخشری اور سمعانی کا قول اس کی تائید میں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تین کتابوں یعنی تورات، انجیل اور قرآن کا ذکر ہوا ہے تو ان الفاظ میں ان صحیفوں کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے زبور کے متعلق امام رازی کا قول ہے کہ اس میں مسائل نہیں تھے صرف فضائل پر مبنی کتاب تھی، لہٰذا حق و باطل میں فرق فضائل کی کتاب سے نہیں ہو سکتا ہے، جبکہ سابقہ صحیفوں میں واضح دلائل احکام اور حق و باطل میں تمیز کیلئے ہدایت تھی جو ان آیتوں میں اشارتاً ثابت ہے سورہ نجم آیت ۳۶،

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۷ ۳ اور سورۃ الملک آیت ۱۸۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ لفظ فرقان لغتاً اس کو شامل ہے اور دیگر اقوال کی تخصیص کیلئے کوئی صحیح حدیث نہیں اور نہ ہی کوئی صریح نص ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ یہ جملہ مستانفہ ہے اس میں مخالفین کو ڈرانا مقصود ہے۔ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ اور الَّذِينَ كَفَرُوا میں مشرکین اور یہود نصاریٰ اور خصوصاً نجران کے نصریٰ داخل ہیں۔ آيَاتِ اللَّهِ سے مراد قرآن مجید ہے یا تحریف سے پہلے تورات و انجیل کی آیتیں ہیں اور تحریف کا کفر بھی اس میں شامل ہے۔ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ سزا عمل کی جنس سے ہوتی ہے یعنی جیسا عمل ویسی سزا۔ چونکہ یہودیوں اہل کتاب کا کفر شدید (سخت) تھا تو عذاب بھی سخت ہوگا۔ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ۔ اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت عزت کا انہوں نے استہزاء کیا تھا اور اس میں شرک کا ارتکاب کیا تھا، لہٰذا ان کیلئے سخت سزا ہے۔ انتقام میں عذاب مراد ہے مگر غضب اور (اعتداء) تجاوز کے ساتھ اور نقمت میں معنی کراہیت اور بدلہ لینا بھی شامل ہے یعنی ان مشرکین نے اللہ تعالیٰ کی توحید میں اسکی عزت کو پامال کرنے کا ارادہ کیا ہے اور شرک کے ساتھ توحید والوں سے بھی نفرت کرتے تھے، تو ان کو اللہ تعالیٰ انتقامی سزا دیتا ہے۔ لفظ ذُو ملکیت پر دلیل ہے یعنی انتقام اس کی ملک اور اختیار میں ہے اس سے اس صفت کا کبھی زوال نہیں ہوتا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ⑤

”یقیناً اللہ تعالیٰ سے زمین و آسمان میں کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے“ [5].

تفسیر 5: یہ توحید کے دعوے کیلئے دلیل نقلی عقلی ہے، اس میں رد شرک فی العلم ہے، اور اس صفت علم کو بطور نفی کیا ہے جیسا کہ سورۃ ابراہیم آیت ۳۸ میں ہے جب یہ صفت اس انداز میں عیسیٰ علیہ السلام میں وہ ثابت نہیں کر سکے جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے کہ نبی اکرم علیہ السلام نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ان سے سوال کیا تھا مگر وہ لوگ جواب دینے سے قاصر ہو کر خاموش ہوئے تھے۔ شیء نکرہ نفی کے سیاق میں عموم کیلئے آتا ہے فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ میں مزید عموم کا ذکر ہے یعنی مکان ذکر کرنے سے مراد عالم سفلی ہے جس میں دریا بھی داخل ہیں۔ فِي السَّمَاءِ سے جنس آسمان مراد ہے یعنی عالم سفلی کے بعد عالم علوی مراد ہے زمین کو اسلئے مقدم کیا کہ اس کے بعض حصے کا بھی علم ان کو دیا گیا ہے انسانوں کا علم آسمانوں سے بالکل متعلق نہیں ہے۔

هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ⑥

”وہ تمہاری صورتوں کو ماؤں کے رحموں میں جس طرح چاہتا ہے بناتا ہے اور اس کے سوا بندگی کا کوئی حقدار نہیں وہ غالب

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

حکمت والا ہے''۔[6]

تفسیر 6: سابقہ آیت میں اللہ تعالیٰ کی صفت اَلْحَیُّ کا بیان کیا تھا اب اس آیت میں اَلْقَیُّوْمُ کا ذکر ہے، جو کہ اثبات توحید کیلئے دوسری دلیل نقلی ہے، یہاں پر قیومیت سے تصویر فی الارحام کو خاص کیا گیا، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بہت بڑی عجیب دلیل ہے۔ اس میں نصاریٰ کا رد بھی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی تصویر اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت (چاہت) کے مطابق جیسی چاہی بنائی اور وہ بھی ماں کے رحم میں لہٰذا وہ الٰہ نہیں ہوسکتا اور چونکہ عیسیٰ علیہ السلام کا والد نہیں تھا اسلئے تصویر فی الصلب نہیں فرمایا اور تصویر فِي الْاَرْحَامِ کی تفسیر ان شاء اللہ سورۃ حج آیت ۵ اور سورۃ مؤمنون آیت ۱۴ کے بعد اور سورۃ زمر آیت ۶ میں آئیگی۔ کَیْفَ یَشَاءُ خوبصورت، بدصورت، کالا اور گورا، بڑے بدن والا چھوٹے بدن والا، ناقص الوجود کامل الوجود، لمبا ٹھگنا وغیرہ۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یہ سابقہ دلائل کیلئے نتیجہ ہے مقام دعویٰ میں ''الوہیت'' ہر قسم کی بندگی کے حقدار کے معنی میں ہے اور نتیجہ میں ''الوہیت'' سے صفت حیات، اور قیومیت کے ساتھ متصف ہونا مراد ہے۔ اور کتابوں کا انزال، اور ہر چیز کے بارے میں علم، اور اسی طرح تصویر فی الارحام بنانا اور دیگر صفات تصرف کے ہیں۔ اَلْعَزِیْزُ اس میں تصرف کے تمام صفات کی طرف اشارہ ہے۔ اَلْحَکِیْمُ اس میں علم کی تمام صفات کی طرف اشارہ ہے اور یہ عقلی دلائل کا خلاصہ ہے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ؔۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

''اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جس نے آپ پر کتاب اتاری ہے، بعض آیتیں اس میں سے واضح مضبوط ہیں جو کہ ساری کتاب کا اصل ہے اور بعض ان میں متشابہ آیتیں ہیں، سو وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ تو متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑتے ہیں۔ فتنہ تلاش کرنے کے لیے اور ان (آیاتوں) کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے جبکہ اس کی اصل حقیقت اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ اور راسخ فی العلم لوگ تو یہی کہتے ہیں کہ ان پر ہم ایمان لا چکے ہیں (کیونکہ) یہ سب ہمارے رب کی جانب سے ہے اور نصیحت تو عقلمند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں''۔[7]

تفسیر 7: سابقہ آیت سے تین طریقوں پر ربط ہے: (ربط ۱) وفد نجران والوں نے قرآن مجید سے عیسیٰ علیہ السلام کی

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

الوہیت پر لفظ کلمۃ اللہ، روح منہ اور اللہ تعالیٰ کیلئے جمع کا صیغہ نحن استعمال ہوا ہے سے استدلال کیا لہٰذا روح منہ سے اللہ تعالیٰ کیلئے، وہ جزء ثابت ہوا صیغہ جمع نحن استعمال سے ابن اللہ ثابت ہوا اور يُحْيِي الْمَوْتٰى سے عیسیٰ علیہ السلام کیلئے تصرف بھی ثابت ہوا لہٰذا وہ الٰہ متصرف ہے لہٰذا تین الٰہ ہوئے یعنی اللہ تعالیٰ، عیسیٰ و مریم علیہما السلام اس شبہ کو ختم کرنے کیلئے یہ آیت نازل ہوئی۔ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں دو قسم کی آیتیں ہیں لہٰذا متشابہات کو اختیار کرتے ہوئے محکمات کو چھوڑنا (اہل زیغ) ان لوگوں کا کام ہے جن کے دلوں میں کجی ہے۔ (ربط ۲) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ سابقہ آیت میں صفت قیومیت کا ذکر تھا جس سے بندوں کی اصلاح پر قیام ثابت ہوتا تو بندوں کی اصلاح کی دو قسمیں ہیں ایک جسمانی اصلاح ہے تو وہ يُصَوِّرُكُمْ میں ذکر کی گئی ہے دوسری روحانی اصلاح ہے جو اس آیت میں مذکور ہے۔ (ربط ۳) تیسرا طریقہ یہ ہے کہ یہ أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ کی تفصیل و تاکید ہے جو علماء میں دو طبقے پیدا ہونے اور استدلال کی تقسیم سے ہوا ہے۔ هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ اس میں دلیل ہے کہ یہ کتاب سحر و کہانت نہیں جو کہ یہ انسانی بنایا گیا کلام ہو اور أَنْزَلَ بھی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے کیونکہ اِنْزَالِ وحی کی مترادف ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے اسلئے أَعْطَاكَ اور آتَاكَ نہیں فرمایا ہے۔ مِنْهُ آيَاتٌ کی ضمیر الْكِتَابَ کی طرف راجع ہے یہ لفظ تقسیم پر دلالت کرتا ہے۔ محکمات اصل لغت میں ”منع اور پختگی“ کے معنیٰ کے لیے آتا ہے یہاں معنیٰ میں اختلاف ہے۔ (۱) امام راغب کا قول ہے کہ محکم وہ ہے جس کے معنی اور الفاظ میں کوئی شبہ نہ ہو۔ (۲) شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ احکام قرآن مجید تین طرح کے احکام ہیں۔ پہلی قسم نزول کے اعتبار سے ہے جو شیطانی القاء کے مقابل ہے تو اس معنی میں فصل، تمیز، فرق تحدید الفاظ کے معنی کے اعتبار سے شیطانی شبہات سے حفاظت مراد ہے جیسا کہ سورۃ حج آیت ۵۲ میں ہے۔ دوسرا معنی وہ احکام جو شرعی نسخ کے مقابل ہوں یعنی غیر منسوخ محکم لہٰذا الْكِتَابُ الْحَكِيمُ میں یہ معنی واضح ہے کہ قرآن مجید کے بعد کوئی ناسخ کتاب نہیں آئیگی۔ تیسرا معنی یہ ہے کہ محکم ہونا معنی اور تاویل میں ہو اور وہ حقیقت کی تمیز ہے جو اس میں مطلوب ہو ایسے طریقے پر جس میں اشتباہ نہ ہو اور یہ متشابہ کے مقابل ہے جیسا کہ مفسر قاسمی نے لکھا ہے۔ (۳) ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ محکمات قرآن مجید کی تین آیتوں میں ہیں سورۃ انعام آیت ۱۵۱، ۱۵۲ اور ۱۵۳ اور سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۲۳ سے ۲۷ تک ہے۔ (۴) مجاہد اور عکرمہ کے قول کے مطابق وہ آیتیں محکم ہے جن میں حلال و حرام کا ذکر ہو۔ (۵) قتادہ اور ضحاک کا قول ہے کہ وہ ناسخ جس پر عمل ہو رہا ہو وہ محکم ہے۔ (۶) ابن عباس رضی اللہ عنہما کے

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

دوسرے قول میں ہے کہ قرآن مجید میں حلال وحرام، ناسخ اور وہ آیاتیں جن میں حدود وفرائض ذکر ہو۔ (۷) جن آیتوں میں تاویل کی گنجائش نہ ہو یہ محمد بن جعفر کا قول ہے۔ (۸) اصول فقہ میں لکھا ہے کہ محکم وہ ہے جس میں کسی قسم کا اخفاء اجمال احتمال نہ ہو یعنی ظاہر نص ہو ظہور کے مرتبہ میں مفسر سے بلند ہو مذکورہ تمام اقوال ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں، اور محکم کے اقسام کی طرف اس میں اشارہ ہے اکثر مفسرین نے محکم سے مراد یہاں پر وہ آیات لی ہیں، جو اپنے معنی اور مراد پر واضح دلالت کریں تو ظاہر نص مفسر اور محکم سب کی طرف اس میں اشارہ ہے۔ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ یہ ما قبل کے لیے صفت ہے۔ سوال: هُنَّ جمع ہے جبکہ أُمُّ مفرد واحد ہے۔ جواب: اس سے مراد ہر ایک ہے یا مجموعہ ایک آیت کی جگہ ہے یا مفرد جمع کی جگہ میں ہے یا أُمُّ اصل کے معنی میں ہے اور اصل تو ایک ہی ہوتا ہے أُمُّ کسی بھی چیز کی اصل بنیاد مرجع یا مجموعہ کو کہا جاتا ہے۔ الْكِتَابِ سے مراد قرآن ہے اور یہ أُمُّ الْكِتَابِ کا غیر ہے جو کہ لوح محفوظ ہے اس کو أُمُّ اسلئے کہا گیا ہے کہ اعتقادات، کی تشریح، آداب اور مواعظ میں اس کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اسی طرح متشابہات میں جن کی تفسیر تاویل (یا تاویل ممدوح ممکن ہو) ان میں محکم آیتوں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ یہ دوسری قسم ہے چونکہ متشابہات محکمات کے مقابل کم اور محکم زیادہ ہیں اسلئے مُتَشَابِهَاتٌ کو مِنْهُ سے اور مُحْكَمَاتٌ کو آخر سے ذکر کیا ہے مُتَشَابِهَاتٌ تشابہ سے لیا گیا ہے۔ لغت میں دو چیزوں کی کیفیت میں اسکی برابری (مماثلت) کو کہا جاتا ہے جس کی وجہ سے دونوں میں تمیز مشکل ہو جو اشتباہ (شک) کا سبب بنے۔ یہ اشتباہ متشابہت من وجہ یعنی بعض جانب سے مشابہت اور "تشابہ" مشابہت کے معنی میں کئی مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ سورۃ بقرہ آیت ۷۰ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا اور آیت ۱۱۸ میں تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ اور آیت ۲۵ میں وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا اور سورۃ انعام آیت ۹۹ میں مُشْتَبِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ اور آیت ۱۴۱ میں مُتَشَابِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ذکر ہے اور سورۃ زمر آیت ۲۳ میں كِتَابًا مُّتَشَابِهًا۔ مذکورہ تمام مقامات میں تشابہ بعض صفات میں مراد ہے یعنی کبھی اشتباہ کے معنی میں آتا ہے جیسا کہ سورۃ نساء آیت ۱۵۷ وَلَٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ سورۃ رعد آیت ۱۶ میں فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ۔ متشابہت کے معنی میں اہل علم کا اختلاف ہے (۱) ابن عاشور کا قول ہے کہ متشابہات مجمل آیتیں ہیں یعنی حروف مقطعات جو سورتوں کے شروع میں ہیں۔ (۲) ابن مسعود وابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ منسوخ کو متشابہ کہتے ہیں۔ (۳) امام اصم کا قول ہے کہ وہ آیتیں مشابہ ہیں جس میں غور وفکر کی ضرورت ہو۔ (۴) امام مالک سے اشہب کی روایت میں ہے کہ وہ متشابہ ہے جس کا علم اللہ تعالیٰ کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ساتھ خاص ہو خفاجی نے اس قول کی نسبت احناف کی طرف کی ہے۔ ''الموافقات'' میں امام شاطبی کا میلان بھی اس طرف ہے۔ (۵) امام رازی کا قول ہے کہ متشابہ وہ ہے جس کی دلالت اپنی مراد پر مخفی ہو۔ اس معنی میں موول اور مجمل بھی اس میں داخل ہیں۔ ابن عاشور نے اس طریقے کی شافعیوں کی طرف نسبت کی ہے۔ (٦) عکرمہ اور مجاہد کا قول ہے کہ متشابہات وہ ہیں جو حلال اور حرام کے ماسوا ہوں جو تصدیق اور حق میں ایک دوسرے کے ساتھ متشابہ ہوں۔ (٧) متشابہ وہ متشابہ جس کے معنی میں اشتباہ والتباس ہو۔ (٨) سمعانی نے فرمایا ہے کہ متشابہات وہ ہیں جو معنی دینے میں مستقل مفید نہ ہوں البتہ استدلال کے محتاج ہو اور محکمات کی طرف ان کو لوٹایا جا سکتا ہو۔ (٩) امام شاطبی نے فرمایا ہے کہ تشابہ دو قسم کا ہے۔ ایک متشابہ وہ ہے جس کا معنی سمجھنے کے لیے کوئی ذریعہ نہ ہو اور یہی حقیقی متشابہ ہے۔ دوسرے نمبر پر اضافی ہے جس کے معنی میں اشتباہ دلیل اور قرینے کی طرف محتاج ہونے کی وجہ سے ہو۔ (١٠) ابن جریر نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے اور اس کو بہتر قرار دیا ہے یعنی متشابہ وہ ہے جس کے علم کی طرف کوئی راستہ نہ ہو جیسا کہ نزول عیسیٰ علیہ السلام کا وقت معین اور طلوع شمس مغرب کی جانب سے اور قیامت کا قیام دنیا کا فنا اور حروف مقطعات بھی اس میں داخل ہیں۔ (١١) یہ تمام امور یقینی ہیں ان پر ایمان لانا فرض ہے لیکن ان کا معین وقت جاننے میں کوئی دنیاوی اور اخروی فائدہ نہیں ہے۔ لہذا ان کا علم صرف اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے۔ اور اسی معنی کا اعتبار کر کے علماء نے اصول فقہ میں اس کو متشابہ کے ان اقسام میں شمار کیا ہے جن کا مرتبہ خفی، مجمل، مشکل کے بعد ہے اور کہا ہے کہ اس کی خفاء کو زائل کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ (١٢) امام ماوردی نے فرمایا ہے کہ محکم وہ ہے جس کا عقل ادراک کر سکتی ہو اور متشابہ وہ ہے جس کا عقل ادراک نہیں کر سکتی ہے جیسا کہ نماز کی رکعتوں کا شمار رمضان المبارک کے روزوں کی تخصیص یعنی خاص معین۔ (١٣) متشابہات سے وہ آیتیں مراد ہیں جو بظاہر معارض (ٹکراتی) ہوں۔ (١٤) متشابہ وہ آیتیں ہیں جو بظاہر عبارت اور معنی میں ایک دوسرے کے ساتھ متشابہ ہوں عبارت میں البتہ ان کے بیچ کچھ فرق ہو۔ ان اقوال میں بہتر امام رازی کا پانچواں قول اور آٹھواں قول سمعانی کا اور دسواں گیارھواں قول امام ابن جریر کا ہے۔ ابن جریر نے یہ قول بھی ذکر کیا ہے کہ تلاوت میں متشابہ اور اس کے معنی میں اختلاف ہو۔ فائدہ (١) امام راغب نے متشابہ کی تعریف اور اقسام ذکر کی ہیں۔ قرآن میں متشابہ کی تعریف یہ ہے کہ غیر کی مشابہت کی وجہ سے اس کی تفسیر مشکل ہو اور تقسیم اس طرح سے ہے کہ محکم، مطلق، متشابہ مطلق، محکم من وجہ، متشابہ من وجہ اور تیسری قسم کی پھر تین قسمیں ہیں۔ متشابہ باعتبار جہت الفاظ فقط اور متشابہ صرف معنی کے اعتبار سے فقط اور دونوں جہتوں سے متشابہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پھر متشابہ من جہۃ الالفاظ کے دو قسمیں ہیں۔(۱) الفاظ مفردہ میں غرابت کی وجہ سے یعنی نا آشنا ہے یا مشترک ہونے کی وجہ سے۔(۲) دوسری قسم جملوں میں متشابہ ہے پھر یہ آخری بھی تین قسم پر مشتمل ہے (۱) کلام میں اختصار کی وجہ سے (۲) کلام میں زیادتی کی وجہ سے (۳) کلام میں تقدیم یا تاخیر کی وجہ سے، متشابہت من حیث جہۃ الالفاظ کی یہ تقسیم تھی۔ اس کی مثالیں امام راغب نے بیان کی ہیں۔ جہت معنی کے اعتبار سے مثال اللہ تعالیٰ کی صفات اور احوال قیامت ہیں اور متشابہ معنی اور الفاظ کے اعتبار سے پانچ قسموں پر مشتمل ہیں۔(۱) باعتبار عموم اور خصوص (۲) باعتبار کیفیت یعنی فرض و مستحب (۳) باعتبار زمانہ یعنی ناسخ و منسوخ (۴) باعتبار مکان اور اسباب نزول جو زمانہ جاہلیت کے لوگوں کے عادات سے متعلق ہوں۔ جن کا علم کسی کو نہ ہو۔(۵) باعتبار شرائط کے یعنی صحت و فساد کے لحاظ سے ہو۔ پھر امام راغب نے فرمایا ہے کہ مذکورہ اقوال جو مفسرین سے نقل ہو گئے ہیں یہ ان تقسیمات سے خارج نہیں بلکہ ان میں سے ہیں۔ پھر انہوں نے فرمایا ہے کہ متشابہات تین طرح کے ہیں۔(۱) پہلی قسم وہ ہے جس کی طرف رسائی کیلئے بندے کے پاس کوئی راستہ نہ ہو جیسا کہ قیامت کا قائم ہونا، زمین سے جانور کا نکل آنا اور اس کی کیفیت وغیرہ (۲) دوسری قسم وہ ہے جس کے جاننے کے لیے انسان کے پاس ذریعہ ہو۔ جیسے غریب اور نامانوس الفاظ جو کہ تفتیش، اجتہاد اور تدبر سے معلوم ہوتے ہیں۔ تیسری قسم ان دونوں کے درمیان ہے جو سابقہ دونوں کے تردد میں واقع ہوا ہے جس کا علم راسخین فی العلم کے ساتھ خاص ہے، اور عام لوگوں کو اس کا علم نہیں ہوتا۔ فائدہ ۲: امام راغب کے قول میں متشابہ کے بعض اسباب معلوم ہو گئے۔ مزید اقسام و اسباب یہ ہیں۔(۱) مشترک لفظ جو لغوی اعتبار سے مختلف معنوں میں مستعمل ہو جیسا کہ اَلْعَیْنُ، اَلْوَجْهُ، معیت اور دعا وغیرہ۔(۲) ایک ہی لفظ میں حقیقی اور مجازی معنی کا احتمال ہو جیسا کہ یَدٌ اپنے حقیقی معنی ہاتھ اور مجازی معنی قدرت اور ''عین'' معنی حقیقی آنکھ، اور مجازی حفاظت وغیرہ، (۳) جس میں لغوی اعتبار سے معنی مشکل ہو جیسا کہ حروف مقطعات سورتوں کے شروع میں مذکور ہیں ان کے وصفیہ لغویہ معانی نہیں ہیں۔ (۴) جس سے کیفیت مراد ہو اگرچہ حقیقی لغوی معنی واضح ہو جیسا کہ استویٰ علی العرش ہے یا جیسا کہ قبر میں انسان کی زندگی عذاب یا راحت، تقدیر کا مسئلہ قضاء وغیرہ جس کے معانی لغوی حقیقی واضح ہیں لیکن کیفیات معلوم نہیں ہیں اس سے تشابہ کی چار قسمیں معلوم ہوئیں۔ اس طرح ابن عاشور نے دس اقسام کا ذکر کیا ہے۔ التحریر و التنویر ص ۱۵۸ ج ۳۔ فائدہ ۳: اسماء و صفات الٰہی متشابہات میں داخل ہیں یا نہیں؟ اس میں سلف کا صحیح قول یہ ہے کہ اس کا معنی ظاہری حقیقی معلوم ہے اس سے انکار کرنا جہالت ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت علم، قدرت، عین، ید،

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وجہ اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وغیرہ۔ تو یہ معنی کے اعتبار سے ہے محکمات میں سے بغیر تاویل تحریف لیکن کیفیات کے اعتبار سے متشابہات میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی کیفیت سے متعلق سوال کرنا بدعت ہے۔ اس میں تمثیل و تشبیہ منع ہے جیسا کہ گزر گیا کہ قبر کے عذاب یا نعمت حیات کی کیفیت، تقدیر وغیرہ میں کیفیت کے بغیر ایمان رکھنا ہے۔ اس قول کو امام آلوسی نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے اور شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے مجموعۃ الفتاویٰ جلد ۵ ص ۲۶ میں سلف صالحین سے یہی موقف نقل کیا ہے اور امام ذہبی نے کتاب مختصر العلو میں امام ابن قیم جوزی نے الصواعق المرسلہ اور ملا علی قاری نے شرح فقہ اکبر ص ۴۴ میں اور ابن کثیر نے تفسیر سورۃ زمر میں اور دیگر بہت سارے علماء محدثین، مفسرین نے سلف صالحین کا یہ قول نقل کیا ہے۔ جس کو جگہ محل کے اعتبار سے ہم نے ذکر کیا ہے لہٰذا اسماء و صفات میں تاویل تو لعین کا عمل ہے یہ ان لوگوں کا عمل ہے جن کے دلوں میں کجی ہے۔ فائدہ ۴: سوال: جب متشابہات بندوں کے علم سے ماوراء ہیں اور بعض لوگوں کو بہت سی تکلیف سے گزرنا پڑتا ہے اور اہل بدعت اس سے غلط عقائد کا استدلال کرتے ہیں تو پھر اس کے کیا فوائد ہیں؟

(جواب) علماء کرام نے متشابہات کے بہت فائدے بیان کیے ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں۔ پہلا فائدہ: اللہ تعالیٰ دنیا میں بندوں کی آزمائش کرتا ہے لہٰذا اہل باطل کیلئے متشابہات میں امتحان ہے تاکہ وہ اپنے عقیدے کیلئے اس سے استدلال کریں اور اہل حق پر یہ امتحان ہے کہ باطل پرستوں کے مقابل جوابات دیں اور قرآن مجید میں فکر کریں تاکہ اظہار حق اور ابطال باطل کر سکیں۔ دوسرا فائدہ: جب قرآن مجید میں محکم اور متشابہ آیتیں ہیں تو انسان تقلید کے اندھیروں سے نکل کر تحقیق واستدلال کرے گا۔ امام رازی نے ذکر کیا ہے کہ قرآن مجید میں متشابہ آیات اور محکم دونوں ہیں متشابہ کی صحیح تفسیر کیلئے محکمات کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور لغت، عربیت اور دیگر علوم اصول کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ چوتھا فائدہ: متشابہات کی وجہ سے حق تک رسائی میں کافی مشکلات پیدا ہوتی ہیں اور اس مشقت پر اجر ہے۔ پانچواں فائدہ: جب متشابہات تک انسان کے علم کی رسائی نہ ہوگی تو اس سے تکبر ختم ہو جائے گا اور یہ جان لے گا کہ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ہر علم والے سے بڑھ کر علم والا ہے یقیناً اللہ تعالیٰ تمام چیزوں پر علیم ہے کوئی بھی ہر چیز کا علم نہیں رکھتا ہے سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے۔

چھٹا فائدہ: سوال: اس آیت سے پتا چلتا ہے کہ بعض آیتیں محکم اور بعض متشابہ ہیں جبکہ سورۃ ہود آیت 1 میں تمام آیتوں کو محکم کہا گیا ہے اور سورۃ یونس آیت 1 میں قرآن کریم کی صفت الْحَكِيمِ ذکر ہوئی ہے جس کے معنی محکم ہے اور سورۃ زمر آیت ۲۳ میں سارے قرآن کو متشابہا فرمایا گیا ہے؟ جواب: کبھی کسی لفظ کے مختلف معانی ہوتے ہیں تو کسی مقام پر ایک معنی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جبکہ دوسرے مقام پر دوسرا معنی مراد ہوتا ہے لہٰذا اس میں تعارض نہیں ہے۔ یہاں پر محکم کا معنی واضح دلائل والا ہے جبکہ حَكِيمٌ اور أُحْكِمَتْ کا معنی ہے حکمتوں سے بھرا ہوا یا پھر معنی یہ ہوگا کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا ہے اور اس کے بعد کوئی کتاب اس کی ناسخ نہیں ہو سکتی ہے تو اس معنی میں سارا قرآن محکم ہے اور سورۃ زمر میں متشابہا کا معنی یہ ہے کہ قرآن کریم کی تمام آیتیں فصاحت، بلاغت اور سچائی میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں لہٰذا اس معنی میں سارا قرآن متشابھا ہے۔ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ جب آیتوں کی دو قسمیں بیان ہوئیں یعنی متشابہ اور محکم تو اب ان کے متعلقین کا ذکر ہوگا۔ محکم آیتوں کا تو هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ میں ذکر ہوا یعنی اس کا تو ایک ہی معنی ہوتا ہے ہر عربی دان اس کا معنی جان لیتا ہے خواہ ایمان لاتا ہے یا نہیں۔ تو اب متشابہ کے ساتھ وابستہ لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے اور وہ دو قسم کے لوگ ہیں ایک ان لوگوں کا گروہ ہے جو راسخین ہیں جبکہ دوسرا گروہ اہل زیغ کا ہے چونکہ یہاں پر اصل مقصد نصاریٰ کا رد ہے جو کہ اہل زیغ ہیں اور ان کو مقدم کیا ہے۔ زیغ اصل میں میلان کو کہا جاتا ہے یعنی حق اور مقصد سے انحراف جیسا کہ مَا زَاغَ الْبَصَرُ (سورۃ النجم آیت 9) میں یہ معنی مراد ہے۔ شرعی اصطلاح میں ٹیڑھا ہونا ہے یعنی استقامت سے دوسری جانب یعنی حق سے باطل کی طرف۔ یہ اصل میں دلوں کی بیماری ہے اس لیے فِي قُلُوبِهِمْ فرمایا ہے اہل زیغ میں یہود، نصاریٰ، مشرکین، خوارج، منافقین، زنادقہ، باطنیہ، تمام مبتدعین شامل ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک گروہ نے حق سے انحراف کیا ہے۔ بقول امام ابوحیان یہ لفظ ان سب کیلئے مشترک ہے اور اس عموم پر (صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4547، صحیح مسلم فی العلم حدیث 2665) کی حدیث دلیل ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو متشابہات میں مشغول ہوتے ہیں تو یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اہل زیغ کہا ہے ان سے بچ جاؤ۔ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ اتباع سے مراد مشغول رہنا بحث مباحثہ کرنا اور اسی کے تعاقب میں لگ جانا ہے یہ معنی قصاص کی آیت فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ میں گزرا ہے مَا تَشَابَهَ لفظ دلیل ہے کہ اس کی اتباع قرآنی آیت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اپنے وصف زیغ کی وجہ سے ہے۔ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ متشابہ کی اتباع میں ان کے دو مقاصد ہوتے ہیں۔ پہلا سبب فتنہ کی تلاش۔ ابْتِغَاء کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بہت کوشش ہوتی ہے کہ فتنہ تک رسائی حاصل کریں۔ یہ دلیل ہے کہ متشابہ میں تدبر تفکر کرنا تاکہ ام الکتاب کے ساتھ برابری ہو جائے منع ہے یہ ممانعت اس صورت میں ہے جب باطل فکر و نظریہ ثابت کرنے کے لئے ہو۔ الْفِتْنَةُ ربیع نے کہا کہ اس سے مراد شرک ہے۔ بقول مجاہد

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس سے مراد جاہلوں پر تلبیس و شبہات پیدا کرنا ہے۔ امام اصم نے فرمایا ہے اس سے مراد فساد، جھگڑا اور قتال ہے۔ اس لیے ان چیزوں سے دین میں اختلاف اور تفریق پیدا ہوتا ہے۔ صاحب اللباب نے کہا ہے کہ بعض کے نزدیک فتنہ سے مراد بدعت اور گمراہی کو دل میں بسالینا ہے۔ زجاج نے کہا ہے کہ اس سے گھرانوں میں فساد برپا کرنا مراد ہے۔ دوسرا سبب وغرض وَ ابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ یہ ان کا مستقل مقصد ہے اس لیے لفظ ابتغاء کو دوبارہ ذکر کیا ہے لفظ تاویل میں دو قول ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ یہ آلَ يَؤُوْلُ سے لیا گیا ہے جس کا معنی رَجَعَ ہے پھر یہ مصدر مفعول یا ظرف کے معنی میں ہے یعنی مرجع اور انجام دوسرا قول یہ ہے کہ یہ اَیالۃ سے لیا گیا ہے۔ جو سیاست (کے معنی میں ہے) تو تاویل کے معنی کسی کلام میں کی مقصد کے لیے ہیرا پھیری کو کہا جاتا ہے۔ باقی تفسیر اور تاویل کا تفصیلی فرق میں نے تنشیط الاذھان میں بیان کیا ہے۔ امام رازی نے فرمایا ہے کہ یہاں تاویل کا مقصد وہ معنی ہے جس پر قرآن وسنت میں کوئی (نص) دلیل نہ ہو جیسا کہ قیامت اور ابوحیان نے فرمایا کہ کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد حقیقی معنی ہے۔ امام ابن کثیر نے فرمایا ہے کہ اس تاویل سے مراد ان کی خواہش کے مطابق تحریف ہے۔ فائدہ: شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے فتاویٰ میں اور مفسر قاسمی رحمہما اللہ نے نقل کیا ہے کہ تاویل تین قسم کی ہے۔ (۱) تاویل کسی چیز کی حقیقت اور اس کا مصداق، جیسا کہ حدیث صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4968 میں ہے کہ رکوع وسجدہ میں قرآن پر عمل کرتے ہوئے یہ پڑھتے تھے۔ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي۔ يَتَأَوَّلُ الْقُرْآنَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ خبروں کا وقوع عین مُخْبَرٌ بِهٖ کی مطابق ہونا جیسا کہ يَوْمَ يَأْتِي تَاوِيْلُهٗ میں ان امور کا آنا جن کا تعلق قیامت واقع ہونے سے ہے یعنی علامات وغیرہ اس کو مرجع اور عاقبت بھی کہتے ہیں اس معنی میں یہ سورۃ یوسف آیت ۶، ۳۶، ۳۷، ۴۴، ۴۵، ۱۰۰، سورۃ کہف آیت ۷۸، ۸۲ میں وارد ہے (۲) دوسری قسم تاویل تفسیر کے معنی میں ہے خواہ ظاہر کے موافق ہو یا نہیں۔ بشرطیکہ صحیح قول سے ثابت ہو ابن جریر کے قول سے بھی یہی مراد ہے جو انہوں نے تفسیر میں نقل کیا ہے ان دونوں کو تاویل محمود کہا جاتا ہے۔ تیسری قسم متاخرین کے کلام میں ہے جیسا کہ متکلمین متصوفین، اصولیین وغیرہ کے عرف میں تاویل کلام کو راجح معنی (حقیقی) سے مرجوح معنی (مجازی) کی طرف پھیر دینا بغیر کسی قرینہ اور صحیح دلیل کے یعنی ہیرا پھیری اس تاویل میں باتوں کی ضرورت ہے۔ (۱) پہلی یہ ہے کہ اس میں مرجوح معنی کا احتمال ہے دوسری بات یہ ہے کہ ظاہر سے اعراض کیلئے کوئی قرینہ اور دلیل ہو اور یہی معنی مراد ہے کہ صفات الٰہی میں متاخرین اور جھمیہ نے کی ہے تاویل کی اس قسم کو مذموم کہا گیا ہے۔ کیونکہ اس سے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تحریف لازم آتی ہے۔ اس آیت میں ابن کثیر اور اکثر مفسرین نے وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ کا یہی معنی مراد لیا ہے۔

فائدہ ۲: متشابہات میں فتنہ پیدا کرنے میں اہل زیغ کی مثالیں یہ ہیں۔ (۱) نجران کے نصاریٰ کا لفظ رُوحٌ مِنْهُ، أُحْيِي الْمَوْتَىٰ اور اللہ تعالیٰ کے متعلق صیغہ جمع سے استدلال یہ متشابہات ہیں انہوں نے ان الفاظ سے عیسیٰ علیہ السلام کیلئے ولدیت جز ہونا اور الوہیت کی صفات سے متصف ہونا ثابت کرنے اور تین معبود یعنی عیسیٰ مریم علیہما السلام اور اللہ تعالیٰ تثلیث کا عقیدہ ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے جبکہ ان کے برعکس راسخین لوگ ان کو محکمات کی طرف لوٹاتے ہیں یعنی محکم حکم موجود ہے کہ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَٰهَيْنِ اثْنَيْنِ اور مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا یہ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے اس لیئے تاویل محمود یہ ہے کہ روح سے مراد روح والا ہے اور مِنْهُ سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور أُحْيِي الْمَوْتَىٰ سے مردے سے یہ کہنا مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندہ ہو جاؤ اور جمع کا صیغہ برائے تعظیم ہے۔ (۲) جاہلوں کا کہنا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نور میں سے ایک جز ہے اور ان کی دلیل اس آیت سے ہے کہ قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ سورۃ مائدہ آیت ۱۵ ان کا کہنا ہے کہ مِنْ برائے تبعیض ہے ان کے رد میں بھی یہی محکمات موجود ہیں یعنی لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ. مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَلَا وَلَدًا سورۃ جن آیت ۳۔ أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ وَلَدٌ وَلَمْ تَكُن لَّهُ صَاحِبَةٌ سورۃ انعام آیت ۱۰۱۔ (جواب) یہ ہے کہ مِنَ اللَّهِ کو مقدم کیا ہے اور نور کو مؤخر کیا ہے جس سے یہ معنی ثابت ہوتا ہے کہ مِنْ سے مراد (جہت) طرف ہے یعنی یہ نور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ (۳) جاہلوں کا قول ہے کہ مردوں کو پکارنا جائز ہے دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ سیدنا ابراھیم علیہ السلام کو مردہ پرندوں کو پکارنے کا حکم ہوا تھا "ادْعُهُنَّ" لہٰذا معلوم ہوا کہ مردوں کو پکارنا درست ہے چونکہ لفظ دعا آواز دینے، اور پکار کے مدد طلب کرنے کے معنی مشترک ہے تو مشرکین نے مدد کا معنی لے لیا۔ اہل شرک نے مدد کا معنی لیا جبکہ محکمات میں غیر اللہ کو مدد کیلئے مَافَوْقَ الْأَسْبَابِ یعنی الوہیت کا عقیدہ رکھتے ہوئے پکارنا شرک اور گمراہی قرار دیا گیا ہے جیسا کہ سورۃ احقاف آیت ۵، سورۃ حج آیت ۱۲، سورۃ فاطر آیت ۱۴ میں ہے جبکہ ادْعُهُنَّ میں دعا سے آواز دینا مقصود ہے جو کہ نبی کا معجزہ ہے اس سے عموم ثابت نہیں ہوتا ہے۔ چوتھی مثال مجسمہ اور مشبہ کی ہے وہ لفظ يَدُ اللَّهِ بَلْ يَدَاهُ اور عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَىٰ وغیرہ سے اللہ تعالیٰ کیلئے جسم ثابت کرتے ہیں جبکہ ان کے رد میں محکم آیتیں موجود ہیں۔ جیسا لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ. فَلَا تَضْرِبُوا لِلَّهِ الْأَمْثَالَ. وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ صحیح عقیدہ یہ ہے کہ یہ امور اللہ تعالیٰ کیلئے حقیقی معنوں میں ثابت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہیں لیکن تمثیل تجسیم تشبیہ کے بغیر ثابت ہیں۔(۵) جہمیہ ان دلائل کا انکار کرتے ہوئے اس کو مجاز اور کنایہ پر محمول کرتے ہیں جبکہ یہ آیتیں محکم اور حقیقی ظاہر معنی پر واردہیں۔ حقیقی معنی چھوڑ دینے اور مجازی معنی لینے کی کوئی دلیل نہیں ہے لہذا ان کی تاویلات حقیقت میں تحریفات ہیں اور یہ لوگ اہل زیغ میں سے ہیں۔(۶) خوارج نے اس آیت سے علی رضی اللہ عنہ کے کافر ہونے پر استدلال کیا ہے کہ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ کیونکہ انہوں نے دو حاکموں کا فیصلہ تسلیم کر لیا تھا اور عموماً ان لوگوں کو کافر قرار دیتے ہیں جو حکم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ نہیں کرتے ہیں اور ان کا استدلال یہ ہے۔ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ جبکہ لفظ حکم مشترک ہے اللہ تعالی اور فیصلہ کرنے والوں کے درمیان اسی طرح بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ مشترک ہے تو دین کے ساتھ انکار اور ویسے چھوڑنے کو۔ یعنی ایک شخص حکم الہی کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس کو عملی جامہ نہیں پہناتا ہے جبکہ محکم آیتیں موجود ہیں بندوں کو حَكَم مقرر کرنے میں اسی طرح محکمات موجود ہیں کہ بغیر انکار کے لوازم سے اعراض کرنے سے کفر ثابت نہیں ہوتا ہے۔ تو یہ مشترک پر استدلال کرتے ہیں۔(۷) اہل تشیع کا استدلال ہے کہ علی رضی اللہ عنہ اور دیگر ائمہ کو بِكُلِّ شَيْءٍ علم حاصل ہوا ہے نیز یہ کہ امامت نبوت سے افضل ہے۔ پہلے عقیدہ کیلئے دلیل پیش کرتے ہیں وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ دوسرے کیلئے دلیل دیتے ہیں إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا حالانکہ لفظ امام مشترک ہے جو لوح محفوظ اور تورات کو بھی شامل ہے اور امامت نبوت کو شامل ہے لیکن وہ تاویل کرتے ہیں کہ یہ علی رضی اللہ عنہ اور دیگر ائمہ کے بارے میں ہے دوسرے کیلئے ان کی تاویل یہ ہے کہ اس سے بھی غیر نبی کی امامت مراد ہے۔ حالانکہ محکم آیتوں میں واضح طور پر موجود ہے کہ علم غیب صرف اللہ تعالی کا خاصہ ہے کسی اور کو یہ صفت حاصل نہیں ہے اور صفت نبوت صفت امامت سے اعلیٰ ہے۔(۸) مقلدین تقلید شخصی کیلئے استدلال کرتے ہیں فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ سوال کو فقط حکم کے ساتھ بغیر دلیل کے خاص کرتے ہیں اور اہل الذکر کو ایک امام کے ساتھ مختص کرتے ہیں جبکہ عدم علم کو خاص کرتے ہیں عدم علم حکم کے ساتھ یعنی مقلد کو اس کے حکم کا علم نہیں ہے حالانکہ یہ تینوں عام ہیں لہذا بغیر کسی خاص دلیل کے خاص کرنا اہل زیغ کا کام ہے۔ جبکہ دوسری جانب واضح دلائل ہیں جن میں اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم ہے اور خصوصاً جب مسئلہ اختلافی ہو تو اللہ اور رسول کی طرف رجوع کا حکم ہے یعنی قرآن و حدیث، سورۃ نساء آیت ۵۹۔(۹) وہ مبتدعین جو انبیاء و شہداء کیلئے قبروں میں حیات دنیاوی ثابت کرتے ہیں اور حیات بھی لوازمات کے ساتھ یعنی سننا، دیکھنا، کھانا پینا اور مدد کرنا مدد کرنے والا وغیرہ اس پر استدلال کرتے ہیں لفظ ''احیاء'' سے جو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سورۃ بقرہ آیت ۱۵۴، سورۃ آل عمران آیت ۱۶۹ جبکہ یہ لفظ عام ہے حیات دنیاوی برزخی اخروی سب کو شامل ہے لہٰذا دنیاوی زندگی کے ساتھ اس کی تخصیص کرنا بلا دلیل یہ اہل زیغ کا طریقہ ہے جبکہ محکمات آیتیں تمام مردوں کے بارے میں موجود ہیں جن سے دنیاوی زندگی کی نفی ہوتی ہے۔ (۱۰) مبتدعین عبادات کے اثبات کے لیے عام آیتوں سے استدلال کرتے ہیں یعنی قضا عمری کیلئے أَقِيمُوا الصَّلَاةَ سے اور نماز جنازہ کے بعد فرض وسنت نماز کے بعد ایک خاص کیفیت پر اجتماعی دعاء کیلئے قرآن کی آیت ادْعُوا رَبَّكُمْ سے استدلال کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ مطلق شرعی ہے مطلق لغوی نہیں ہے اور مطلق شرعی افراد شرعیہ پر محمول کیا جاتا ہے جبکہ دوسری جانب محکمات موجود ہیں جن میں حکم الٰہی ہے کہ شرعی عمل میں رسول کی اتباع شرط ہے جیسا کہ۔ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي سورۃ آل عمران آیت ۱۳۱ اس طرح سے آیتیں اور بھی کثیر مقدار میں ہیں۔ تنبیہ: مذکورہ مثالیں اکثر اس بات پر بناء ہیں کہ متشابہ مشترک ہے جو حقیقت اور مجاز دونوں پر مشتمل ہیں جیسا کہ پہلے مثالیں گزری ہیں لیکن وہ معنی مراد لینا جو محکمات کے ساتھ ٹکراتا ہو اہل زیغ کا طریقہ ہے۔ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ یہ اہل زیغ کا رد ہو رہا ہے کہ ایک طرف وہ علم کے دعویدار ہیں، دوسری جانب ان علوم میں بحث کرنے کو اپنا مشغلہ بنائے ہوئے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے یہاں پر تاویل کا معنی حقیقت یا تفسیر ہے یہی وجہ ہے کہ تاویل کو مستقل ذکر کیا ہے اور ضمیر کو اس کی طرف راجع نہیں کیا ہے۔ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ اس میں دو قول ہیں ایک قول یہ ہے کہ یہ اللہ پر عطف ہے اس وجہ سے لفظ "اللہ" پر وقف نہیں اور يَقُولُونَ مبتداء محذوف کے لیے خبر ہے یا پھر یہ جملہ حالیہ ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وَالرَّاسِخُونَ مبتداء اور یقولون خبر ہے اور جملہ کو جملہ پر عطف کیا ہے لیکن پہلے جملہ میں لفظ اللہ پر وقف لازم ہے۔ پہلا قول عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب، عبداللہ بن عباس، عائشہ رضی اللہ عنہم سے اور حسن بصری، عروۃ، عمر بن عبدالعزیز، امام مالک، کسائی، ابو عبید رحمہم اللہ وغیرہ کا ہے۔ تاویل سے مراد حقیقت ہے اور متشابہ سے مراد وہ ہے جس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے یعنی قیامت کے تفصیلی حالات کا علم۔ تقدیر اور تفصیلی حالات قبر وغیرہ یہ حقیقتیں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں اگرچہ راسخ العلم کیوں نہ ہو۔ دوسرا قول ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد، ربیع، محمد بن جعفر رحمہم اللہ اور اکثر متکلمین کا ہے اور تاویل سے مراد حقیقت یا تفسیر ہے۔ تاویل کا پہلا یا دوسرا معنی مراد ہے اور متشابہ سے وہ اقسام مراد ہیں جن کا ذکر گزر گیا۔ یعنی مشترک جس میں حقیقت اور مجاز دونوں کا امکان ہو۔ رُوحٌ مِنْهُ اللہ تعالیٰ کیلئے جمع کا صیغہ اور اسماء الحسنیٰ کو حقیقی معنی بلکیف یعنی کیفیت کے بغیر آیتوں میں تعارض ناسخ ومنسوخ۔ ابو حیان

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نے پہلے قول کی ترجیح کے لیے بہت سے دلائل ذکر کیے ہیں اور ترجیح دینے کیلئے لطیف وجوہات بھی ذکر کی ہیں۔ ابن عطیہ کا قول ہے کہ محکمات کو راسخین اور غیر راسخین دونوں جانتے ہیں البتہ متشابہات دو قسم کی ہے ایک کا تو علم اللہ تعالٰی کے ساتھ خاص ہے جیسے روح کی حقیقت قیامت کے تفصیلی حالات جبکہ دوسری قسم میں راسخین فی العلم ہی مہارت رکھتے ہیں یعنی دلائل اور قرائن کے ذریعے سے اور متشابہ کو محکمات کی طرف لوٹانے کے ذریعے سے حل کرتے ہیں اور یہ ان ہی کا خاصہ ہے لہذا ان دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ راسخون رسوخ سے لیا گیا ہے یعنی یہ ایسے پختہ علم والے ہیں کہ شبہات سن کر ان کا علم زائل نہیں ہوتا۔ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ عالم اپنے علم پر عمل سے راسخ ہوتا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ راسخ میں چار صفات ضروری ہیں: (۱) وہ تقویٰ جو اس کے اور اللہ تعالٰی کے درمیان ہو۔ (۲) مخلوق میں رہتے ہوئے عاجزی۔ (۳) دنیا سے بے رغبتی۔ (۴) نفس کے ساتھ مجاہدہ کرنا۔ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا ایمان سے اجمالی ایمان مراد ہے اور قول یہاں عقیدہ کے معنی میں ہے۔ پہلے قول کی بنا پر یعنی متشابہ پر ایمان اور اس کی صفت پر ایمان اور دوسرے قول کی بناء پر ان چیزوں پر تفصیلی ایمان جن تک ان کے علم کی رسائی ہوئی ہے اور احتمال یہ ہے کہ ان کا یہ قول ان مسلمانوں کیلئے ہوتا ہے جو علم کی پختگی کو نہیں پہنچے ہیں پھر جب متشابہ پر علم حاصل نہ ہونے کی وجہ سے جو شبہ رہ جاتا ہے کہ یہ اللہ تعالٰی کی جانب سے ہے یا نہیں تو اس کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ ہمارے رب کی جانب سے ہے اور اس قول پر اس شبہ کو ختم کر لیتے ہیں۔ اور كُلٌّ سے محکم اور متشابہ دونوں مراد ہیں۔ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ یہ جملہ راسخون کی تعریف کیلئے اللہ تعالٰی کی طرف سے ہے کہ ان کو یہ مقام اس لیے ملا ہے کہ ان کی عقلیں وھم اور وسوسوں سے صاف ہیں۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ ۝ "(وہ کہتے ہیں) اے ہمارے رب ہمارے دلوں کو ٹیڑھا مت کرنا بعد اس کے تو نے ہمیں ھدایت دی ہے اور اپنی طرف سے ہمیں دے (ایمان اور دین) پر یقیناً تو بخشش دینے والا ہے"[8]۔

تفسیر 8: یہ کلام راسخین فی العلم کا ہے یا بقول امام قرطبی ہمارے لئے رب کی جانب سے تعلیم اور دعا ہے۔ جب سابقہ کلام سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اہل زیغ لوگوں کو فتنہ میں ڈالتے ہیں تو فتنوں سے بچنے کیلئے ہمیں دعاء کی تعلیم دی گئی۔ لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا ازاغہ سے مراد گمراہ کرتا ہے۔ مفسر زجاج نے کہا ہے کہ ہم پر ایسی تکلیفات یعنی عبادات مت لانا جو ہمارے لئے سبب گمراہی یعنی زیغ بن جائے۔ بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا ہدایت سے مراد گمراہی کے مد مقابل ہے یا مراد ایسی ہدایت جس کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وجہ سے محکم و متشابہ میں حق پر گامزن ہو سکے۔ یہ واضح دلیل ہے کہ ہدایت اور گمراہی خلقت کے اعتبار سے دونوں اللہ کی جانب سے ہیں۔ اور یہ اہل سنت کا مذھب ہے اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ دل اللہ تعالیٰ نے ایسے پیدا کیئے ہے کہ اس میں ایمان کی صلاحیت اور میلان کفر ہے۔ لیکن یہ کسی ایک جانب نہیں جاسکتا ہے جب تک اللہ تعالیٰ اس کے لئے اسباب پیدا نہ کرے یعنی گمراہ بنانے کیلئے اسباب گمراہی جس کو خذلان، اِزَاغہ، صَدَف، خَتَمْ، رَیْن، قَسْوَت وغیرہ کہا جاتا ہے۔ اگر اسباب ہدایت ہوں تو اس کو توفیق، ارشاد، ہدایت، تسدید، تثبیت، عصمت کہتے ہیں۔ وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً سابقہ جملے میں دعاء سلبی کا ذکر تھا جو فاسد عقائد سے بچنے کیلئے ضروری تھا اب دعاء ثبوتی کا ذکر ہے۔ ہبہ عطیہ بخشش کو کہا جاتا ہے جو بغیر کسی بدلے کے ملتا ہے۔ مِن لَّدُنكَ اس میں اشارہ ہے کہ ہماری طرف سے کوئی بدلہ اور حیب نہیں ہے۔ رَحْمَةً اس مقام پر اس سے مراد توفیق اور تثبیت ہے جیسا کہ سورۃ کہف آیت ۱۰ میں ہے۔ إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ یہ مذکورہ دعا کیلئے وسیلہ اور مابعد کیلئے علت کی طرح بھی ہے۔

رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ﴿٩﴾ ''اے ہمارے رب تو یقیناً لوگوں کو اس دن کی طرف جمع کرنے والا ہے جس میں کوئی شک نہیں یقیناً اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا'' [9]۔ ع ۲

تفسیر 9: یہ دعا سابقہ دعا کیلئے تکملہ ہے اس میں اشارہ ہے کہ زیغ سے بچ کر ہدایت پر قائم رہنا اور تثبت اختیار کرنا کسی دنیاوی غرض اور مصلحت کے لئے نہیں ہے بلکہ اصل اور عظیم سبب خوف آخرت ہے۔ زجاج نے کہا ہے کہ قیامت کے دن کا اقرار ایک ایسی تاویل ہے جس کا راسخون علم رکھتے ہیں اور متابعت متشابھات کے خلاف ہے۔ جَامِعُ النَّاسِ انسانوں کو روئے زمین پر بسانے پھیلانے کے بعد میدان محشر میں اکٹھا کرے گا۔ لِيَوْمٍ یہ اس دن جزاء کیلئے جمع کرنا ہے یا لام فی کے معنی میں ہے۔ لَّا رَيْبَ فِيهِ اس کی تفسیر سورۃ بقرہ آیت ۲ میں گزری ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ جس طرح قرآن کریم بغیر شک وشبہ ہے اسی طرح وہ دن بھی بلاشک ہے۔ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ یہ کلام اللہ تعالیٰ کی جانب سے برائے تاکید ہے یعنی اس دن جمع ہونے میں کوئی شک نہیں ہونا چاہیئے۔ یا یہ کلام دعا مانگنے والوں کا ہے بطور اِلْتِفَاتْ مِنَ الْخِطَابِ اِلَى الْغَائِبِ۔ اس میں جنت طلب کرنا مقصود ہے جیسا کہ اس سورۃ کی آیت ۱۹۴ میں ذکر ہے۔ سوال: یہاں پر إِنَّ اللَّهَ ذکر ہے جبکہ آیت ۱۹۴ میں إِنَّكَ ذکر ہوا ہے؟۔ جواب ۱: پہلے احتمال پر یہ کلام اللہ تعالیٰ کا ہے وہ کلام (دعا) لوگوں کا تھا۔ جواب ۲: لوگوں کو جمع کرنے اور ان کا حساب لینے کے اعتبار سے یہ اللہ تعالیٰ کیلئے مقام عظمت وجلال ہے اس

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

لیئے لفظ اللہ استعمال کیا ہے جبکہ آیت ۱۹۴ میں تضرع اور انکساری کا مقام ہے اس لیئے وہاں مخاطب صیغہ سے کلام مناسب ہے۔ سوال: اس دعاء میں کسی چیز کا اللہ تعالیٰ سے مطالبہ نہیں ہے تو یہ کس معنیٰ میں دعاء ہے۔ جواب: امام معانیؒ کا قول ہے کہ اس میں دعاء مقدر ہے یعنی ہمیں اہل زیغ سے بچا اور ہم پر رحم کر یا لَا يُخْلِفُ کا جملہ وعدہ کی جگہ قائم ہے جس میں جنت کی دعا ہے۔ میعاد عام ہے جو وعدہ اور وعید دونوں پر مشتمل ہے لیکن نافرمانوں کا وعدہ دیگر نصوص سے بغیر معافی کے مشروط ہے یا پھر یہاں پر میعاد مؤمنین کا ہے کیونکہ وعدہ کی خلاف ورزی قبیح اور قابل مذمت ہے وعید کے برعکس جو سبب مدح وتعریف ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ ۝١٠

"بے شک جو لوگ کافر ہیں ہرگز دور نہیں کر سکیں گے ان سے ان کی اولاد اور مال (اللہ کا عذاب) یہی لوگ جہنم کا ایندھن ہیں"۔[10]

تفسیر 10: اس آیت میں تخویف ہے، اور راسخین کے بعد اہل زیغ کا بیان ہے، چونکہ یہ ان کی ضد ہے اس لیے اس کو عطف نہیں کیا ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا اس میں تین اقوال ہیں (۱) اس میں وفد نجران نصاریٰ کا ذکر ہے ان میں ایک شخص نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ یہ سچا رسول ہے لیکن ایمان لانے میں خوف یہ ہے کہ روم کا بادشاہ ہمیں مال سے نوازتا ہے اگر اظہار ایمان کریں گے تو اس کی بندش ہوگی۔ (۲) یہ کہ بنو نضیر و بنی قریظہ والے اپنے مال اور اولاد پر فخر کرتے تھے تو ان کے متعلق یہ فرمان جاری ہوا۔ (۳) یہ عام ہے تمام کافروں کے لیے اور اس جیسی آیت اس سورۃ میں آیت ۱۱۶، سورۃ مجادلہ ۱۷، سورۃ تبت ۲ میں بھی ہے۔ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ. اغنا کافی ہونے اور ہٹانے کے معنیٰ میں ہے اور یہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہے لیکن اس میں ہٹانے کا معنیٰ بھی ہے تو اس لیئے اس کے ساتھ متعلق بھی ذکر کیا ہے جس کا مقصد ضرر ہٹانا ہے اور اس کی طرف فِعل مِنْ سے متعدی ہوتا ہے۔ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ چونکہ بندے کے دفاع اور حفاظت میں مال کا فائدہ اولاد سے بھی زیادہ ہے اس لیئے مال کا پہلا ذکر کیا ہے اور چونکہ مال کے ذریعے سے عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے فدیہ دیا جاتا ہے اور اولاد کے ذریعے سے نصرت اور امداد ہوتی ہے اس لیئے ان دونوں کو خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ مِنَ اللهِ زمخشری کے نزدیک یہ مِنْ بدل کیلئے ہے لہذا تقدیری عبارت اس طرح ہے۔ مِنْ رَحْمَةِ اللهِ. أَوْ مِنْ طَاعَةِ اللهِ ابن عطیہ کے نزدیک یہ مِنْ ابتداء کیلئے ہے تو پھر عبارت اس طرح ہوگی مِنْ عَذَابِ اللهِ. أَوْ مِنْ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

غَضَبِ اللّٰهِ ابو عبیدہ کے نزدیک عِنْدَ کے معنی میں ہے اور بعض کے نزدیک تبعیض کیلئے ہے۔ وَأُولٰئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ چونکہ ماقبل کلام میں دنیاوی عذاب کی طرف اشارہ تھا تو اس لیئے اس جملے کو اس پر عطف کیا اور یہ آخرت کے عذاب کیلئے وعید ہے۔ اس کی تفسیر سورۃ بقرہ آیت ۲۴ میں گزری ہے۔ امام ابن کثیر اور امام قرطبیؒ نے ابن مبارکؒ کے حوالہ سے روایت نقل کی ہے کہ قرب قیامت ایسے لوگ آئیں گے تلاوت قرآن کے بعد دعویٰ کریں گے کہ ہم سے زیادہ کوئی عالم نہیں ہے یہ لوگ میری امت سے نہیں ہیں اور آگ کا ایندھن ہیں۔ اس روایت کو ابن لہیعہ راوی کی وجہ سے محققین علماء نے ضعف قرار دیا ہے تخریج ابن کثیر۔

كَدَأْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَھُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ⑪

"ان کی حالت مثل فرعونیوں اور وہ لوگ جو ان سے پہلے گزرے ہیں انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا پھر ان کے گناہوں کے سبب اللہ تعالیٰ نے ان کو عذاب دیا اور وہ سخت عذاب دینے والا ہے" [11]۔

تفسیر 11: یہ تخویف دنیاوی کی مثال ہے سابقہ اقوام سے جنہوں نے حق کو جھٹلایا تھا كَدَأْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ اس کا مبتدا مقدر ہے یعنی دَابُهُمْ اس میں اور بھی اقوال ہیں لیکن یہ قول بہتر ہے۔ دَأْبٌ اصل میں عمل میں تکلیف محنت کرنے اور بار بار کام کرنے کو کہا جاتا ہے۔ عرف میں دأب، حال، شان، امر اور عادت کو کہا جاتا ہے۔ تشبیہ کا حاصل یہ ہے کہ ان کو مال و اولاد کا فائدہ نہ دینا مثل فرعونیوں اور دیگر کافر قوموں کے ہے۔ دو وجوہات سے فرعون کی قوم سے آغاز کیا ہے۔ (۱) گزشتہ بیان نصاریٰ کا گزرا ہے اور وہ بنی اسرائیل اور فرعون کے حال سے مکمل باخبر تھے۔ (۲) استحصالی عذاب یعنی جس سے قوم مکمل طور پر ختم ہو یہ فرعونیوں پر ختم ہوا ہے یعنی فرعونیوں کی ہلاکت کے بعد کسی قوم پر اس قسم کا عذاب نہیں آیا ہے اس کی طرف سورۃ قصص آیت ۴۳ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ یہ آل فرعون پر عطف ہے یا پھر یہ مبتداء ہے اور بعد میں اس کی خبر ہے اور ان کا ذکر سورۃ حج آیت ۴۲، ۴۳، ۴۴، سورۃ توبہ آیت ۷۰ اور سورۃ ق آیت ۱۲، ۱۳، ۱۴ میں ہے۔ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا پہلی توجیہ پر كَذَّبُوْا حال ہے یا پھر (استیناف) شروع کلام ہے دوسری توجیہ یہ ہے کہ الَّذِيْنَ کیلئے خبر ہے اور یہ دأب کیلئے تفسیر ہے۔ آیات سے مراد کتابوں میں نازل شدہ آیتیں یا معجزات مراد ہیں۔ فَاَخَذَھُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ۔ أَخَذَ عذاب میں گھیرنے سے کنایہ ہے اور بِذُنُوْبِهِمْ میں باسببیہ ہے یا پھر حال ہے اور یا ملابست کیلئے ہے یعنی وہ گناہوں میں لت پت تھے اور توبہ بھی نہیں کرتے تھے اور عذاب کی قسموں کی تفصیل سورۃ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنکبوت آیت ۴۰ میں مذکور ہے۔ ذُنُوب کو جمع ذکر کیا اس لیئے کہ انہوں نے کفر شرک کے ساتھ دیگر گناہوں کو بھی جمع کیا تھا۔ جس کی تفصیل بعض سورتوں میں بعض قوموں کے ساتھ ذکر ہے۔ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ اس میں ان کے گناہوں کی شدت کی طرف اشارہ ہے اس طرح سورۃ انفال آیت ۵۲ میں کفر ذکر ہوا، تو متصل آیت ۵۴ میں تکذیب ذکر ہوا ہے کفر دل کی اور تکذیب زبان کی بیماری ہے اس لیئے کفر پہلے اور تکذیب بعد میں ذکر ہوا۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۲﴾ "آپ ان لوگوں سے فرما دیجئے جنہوں نے کفر کیا ہے کہ عنقریب تم مغلوب کیئے جاؤ گے اور جہنم کی طرف جمع کیئے جاؤ گے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے"[12]۔

تفسیر 12: یہ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کے ساتھ متعلق ہے اور ان کافروں کے وہم کا جواب ہے۔ وہم ان کا یہ تھا کہ سابقہ قومیں جو تباہ ہوئی ہیں وہ کمزور تھیں اور ہم تو مالی اور جانی دونوں لحاظ سے طاقتور ہیں۔ دوسرا وہم یہ تھا کہ ان قوموں کی ہلاکت کا سبب یہ تھا کہ وہ آسمانی دین کو نہیں مانتے تھے جبکہ ہم یہود و نصاریٰ تو عیسیٰ و موسیٰ علیہما السلام کے پیروکار ہیں لہٰذا ہم غالب ہیں ان دونوں وہموں کا جواب ہوا۔ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ اس سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں کیونکہ سورۃ آل عمران کے نزول تک وہ بظاہر طاقت والے اور غالب تھے۔ سَتُغْلَبُوْنَ یہ پیش گوئی معجزے کے طور پر پوری ہوئی کیونکہ ان کے مضبوط قبیلے بنو نضیر کو مدینہ طیبہ کے قریب سے دورِ نبوی میں جلا وطن کر کے خیبر اور خیبر سے دورِ عمر فاروق میں پھر نکالے گئے اور بنو قریظہ والے بھی آخر مغلوب ہوئے مارے گئے اور لونڈیاں غلام بن گئے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مصداق بنے کہ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا۔ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ یہ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ کا مصداق ہے۔ اِلٰی اپنے معنی پر ہے یا فِی کی معنی میں ہے ان دونوں کو ذکر کرنے میں دنیا و آخرت کے عذاب کی طرف اشارہ ہے۔ وَبِئْسَ الْمِهَادُ۔ مِهَادُ آرام کیلیے تیار کردہ بستر کو کہا جاتا ہے جہنم کو بستر تحکّماً بطور مذاق کہا گیا ہے یعنی ان کی تذلیل کی گئی ہے۔ امام قرطبی نے مجاہد سے نقل کیا ہے کہ اس سے وہ عمل مراد ہے جو انہوں نے اپنے لئے تیار کیا ہے۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۖ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ۚ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾ "یقیناً تمہارے لیئے دو لڑنے والی جماعتوں میں حیرت کی نشانی ہے (ان میں) ایک اللہ تعالیٰ کے راستے میں لڑ رہی تھی اور دوسرا گروہ کافر تھا وہ انہیں اپنی نگاہوں میں دو گنا دیکھ رہے تھے اور اللہ تعالیٰ اپنی مدد سے مضبوط (قوی) کرتا ہے جسے چاہے اور یقیناً اس میں عقل والوں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کیلئے البتہ عبرت ہے"[13]۔

تفسیر 13: یہ سَتُغْلَبُوْنَ کے ساتھ متعلق ہے یہ بطور دلیل اور کافروں کو خطاب ہے۔ قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ یہ کان کیلئے اسم ہے اور تین وجوہات کی بناء پر کانت نہیں فرمایا۔ (۱) یہ مونث مجازی ہے۔ (۲) یہ دلیل اور برہان کے معنی میں ہے۔ (۳) لَكُمْ کی وجہ سے (فصل) جدائی آئی ہے كَانَ اور اس کی اسم کے مابین اور آيَةٌ سے مراد دلیل اور عظیم قدرت الٰہی ہے۔ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۔ لَكُمْ كَانَ کیلئے خبر ہے اور فِي فِئَتَيْنِ محل صفت میں واقع ہے۔ آيَةٌ کیلئے فِئَتَيْنِ خبر ہے اور لَكُمْ كَانَ کے متعلق ہے۔ فِئَتَيْنِ فِئَةٌ کیلئے تثنیہ ہے اور فِئَةٌ اس جماعت کو کہا جاتا ہے جو پریشانی اور تنگی میں پلٹ جانے کا مرکز ہو اور اس سے بالاتفاق مسلمانوں اور کافروں کی جماعتیں مراد ہیں جو غزوہ بدر میں تھیں۔ اِلْتَقَتَا فِئَتَيْنِ کیلئے محل خبر میں صفت واقع ہوا ہے اور اس سے جنگ کیلئے سامنا کرنا مراد ہے۔ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ ۔ فِئَةٌ یہ محذوف مبتداء کے لیے خبر ہے یعنی إِحْدَاهُمَا (دونوں میں سے ایک) یا خبر مقدر ہے یعنی مِنْهُمَا ان جملوں پہ اکتفا ہے یعنی ہر جملہ میں اس چیز کو حذف کیا گیا ہے جو دوسرے یعنی مقابل میں ثابت ہے۔ تو پہلا جملہ میں مُؤْمِنَةٌ مقدر ہے اور دوسرا جملہ میں فِي سَبِيلِ الشَّيْطَانِ مقدر ہے جیسا کہ سورۃ نساء آیت ۷۶ میں ہے۔ يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ اس میں تین توجیہات ہیں۔ (۱) يَرَوْنَ کی ضمیر فاعل راجع ہے مومنین کی طرف اور يَرَوْنَهُمْ اور مِّثْلَيْهِمْ میں جو ضمیر مفعول ہے وہ کافروں کی طرف راجع ہے۔ معنی یہ ہے کہ ایمان والوں کو کافر زیادہ دوچند نظر آ رہے تھے اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی طرف اشارہ ہے کہ اتنی بڑی تعداد کے باوجود مومنین ان پر غالب آئے جیسا کہ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ ۔ حوالہ: سورۃ انفال آیت ۴۴ میں ہے کہ وَإِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ الْتَقَيْتُمْ فِي أَعْيُنِكُمْ قَلِيلًا ۔ اس میں برعکس ہے کافروں کو مومن زیادہ نظر آ رہے تھے۔ یہ الگ الگ حالات پر محمول ہے پہلے ایمان والوں کے امتحان کیلئے کافر زیادہ دکھائے گئے پھر ان کو کم دکھایا تا کہ مسلمان بہادری اور دلیری سے ان پر حملہ آور ہو جائیں۔ هُمْ کی ضمیر کافروں کیطرف راجع ہے اور مِّثْلَيْهِمْ کی ضمیر ایمان والوں کی طرف راجع ہے معنی یہ ہے کافروں کو ایمان والے ڈبل (دوچند) نظر آ رہے تھے کیونکہ کافروں کی تعداد تقریباً ۹۰۰ سو اور مؤمنین کی تعداد ۳۱۳ تھی۔ لہٰذا یہ نظر آنا اصل وقت میں ہے۔ (۳) يَرَوْنَ کی ضمیر کافروں کی طرف راجع ہے اور هُمْ ضمیر مؤمنین کی طرف راجع ہے۔ اور مِّثْلَيْهِمْ ضمیر کافروں کی طرف راجع ہے تو معنی یہ ہو گیا کہ کفار مسلمانوں کو دوچند دیکھ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

رہے تھے تاکہ کافروں پر مسلمانوں کا رعب حاوی ہو جائے یا مسلمانوں کے ساتھ ملائکہ ملنے کی وجہ سے زیادہ نظر آرہے تھے۔ یعنی ملائکہ انسانوں کی شکل میں نظر آرہے تھے۔ سورۃ انفال آیت ۴۴ یعنی ایک حال (تقلیل) کم نظر آنے کا ہے جبکہ دوسری حالت زیادہ نظر آنے کی ہے لہٰذا ان میں تعارض نہیں ہے۔ راجح توجیہہ یہ ہے کہ مؤمنین کم نظر آئے اور کفار زیادہ نظر آئے صاحب اللباب نے اس کے علاوہ بھی توجیہات ذکر کی ہیں مگر یہ تین توجیہات راجح ہیں۔ یعنی پہلی توجیہہ کے مطابق وہ زیادہ تھے بنسبت دوسری توجیہہ کے کیونکہ یہاں اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی قدرت عظیم کا اظہار ہے یعنی مومنین تعداد میں اگرچہ بہت کم تھے اور کفار کی تعداد بہت زیادہ تھی لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت و مدد سے کافروں پر یہ کم تعداد کے باوجود غالب ہوئے اور وہ تعداد و کثرت کے باوجود ذلیل اور مغلوب ہوئے۔ رَأْيَ الْعَيْنِ چونکہ رأی آنکھ سے دیکھنے اور دل سے سمجھنے کے معنی میں مشترک ہے اس لیے معنی کی تعیین کیلئے لفظ العین ذکر کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ آنکھوں کا دیکھنا مراد ہے پھر پہلی اور دوسری توجیہہ کے مطابق صرف آنکھوں کا دیکھنا مراد ہے اگرچہ وہ کم تھے۔ تیسری توجیہہ کے مطابق آنکھوں کا دیکھنا اصل کے ساتھ برابر تھا لیکن اس میں فائدہ یہ ہے کہ کفار کی کثیر تعداد کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کو ذلیل و مغلوب کیا جس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ظاہری اسباب کی کوئی حیثیت نہیں۔ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ یہ واضح دلیل ہے کہ جنگ بدر میں اللہ تعالیٰ نے غیبی مدد کی اگرچہ وہ تعداد میں کم تھے جیسا کہ اسی سورۃ کی آیت ۱۲۳، سورۃ انفال آیت ۱۰، ۲۶ میں ہے۔ يُؤَيِّدُ یہ ید سے لیا گیا ہے اور ید قوت کو کہا جاتا ہے۔ مَنْ يَّشَآءُ سے صرف مؤمنین مراد ہیں اور یہ مشیت رضاء کے مترادف ہے۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ۔ ذٰلِكَ اس میں نصرت کی طرف اشارہ ہے اور کم کو زیادہ دکھانا ہے۔ عبرت اصل میں دلالت کرتی ہے کوئی چیز ایک جگہ سے دوسری جگہ تجاوز کرے کسی چیز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ کیا جائے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک چیز سے استدلال کیا جائے کسی اور ایسی چیز پر جو اس کے ساتھ مشابہ ہو۔ اس کو اتعاظ یعنی وعظ و نصیحت لینا بھی کہا جاتا ہے۔ الْاَبْصَارِ بصر سے لیا گیا ہے آنکھوں سے دیکھنا۔ یعنی جیسے ان دونوں گروہوں کو کسی نے دیکھا ہو۔ یا مراد رویت قلبی ہے جس کو بصیرت کہتے ہیں یعنی صحیح اور سالم عقل والے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۭ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝ "مزین کی گئی ہیں لوگوں کے لیے مرغوب چیزوں کی محبت عورتوں بیٹوں اور جمع کیے ہوئے خزانوں سونا چاندی اور نشان زدہ گھوڑوں، چوپایوں اور کھیتی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میں سے یہ کچھ نفع اٹھانا ہے دنیا کے سامان سے اور اللہ تعالیٰ ہی کے پاس بہترین لوٹنے کی جگہ ہے"[14]۔

تفسیر 14: اس آیت میں دنیا سے بے رغبتی تقویٰ اور آخرت کی فکر دلانا مقصود ہے اور اس کا تعلق لَن تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُم کے ساتھ ہے۔ اور اس میں ایک سوال کا جواب بھی ہے یعنی جب مال اور اولاد نے ان کافروں کو کوئی فائدہ نہیں دیا تو پھر ان کو کیوں جمع کرتے ہیں؟ تو اس آیت میں جواب کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ زُيِّنَ لِلنَّاسِ تزیین کا معنی کسی چیز کو خوبصورت اور حسین دکھانا اور اس کی بدشکلی (بدصورتی) دل اور آنکھوں سے اوجھل کرنا اور صرف زینت کے فائدہ کو ظاہر کرنا۔ لِلنَّاسِ اس سے مراد بقرۃ آیت ۲۱۲ کے قرینہ سے کافر ہیں۔ یا مراد عام ہے کافر ہوں یا فاسق دنیا پرست مسلمان ہوں۔ زُيِّنَ مجہول کا صیغہ ہے قرآن مجید میں اس کا استعمال تین طریقوں سے ہوا ہے۔ (۱) اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت ہوئی ہو جیسا کہ سورۃ انعام آیت ۱۰۸، سورۃ نحل آیت ۴ میں ہے۔ (۲) انسی اور جنی شیطان کی طرف نسبت ہوئی ہو جیسا کہ سورۃ انعام ایت ۴۳، ۱۳۷، سورۃ انفال آیت ۴۸، سورۃ نحل آیت ۶۳، سورۃ عنکبوت آیت ۳۸۔ (۳) مجہول ذکر ہوا ہو جیسا کہ یہاں پر ہوا ہے اور سورۃ بقرۃ آیت ۲۱۲، سورۃ انعام آیت ۱۲۲، سورۃ توبہ آیت ۳۷، سورۃ یونس آیت ۱۲ سورۃ رعد آیت ۳۳، سورۃ فاطر آیت ۸، سورۃ غافر آیت ۳۷، سورۃ محمد آیت ۱۴ اور سورۃ یونس آیت ۱۲ میں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت ہوئی ہو تو معنیٰ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو پیدا کیا ہے اور ان میں بندوں کے امتحان کیلئے لذتیں پیدا کی ہیں کیونکہ ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور شیطان کی طرف نسبت وسوسوں کے اعتبار سے ہے۔ حُبُّ الشَّهَوَاتِ. الشَّهَوَاتِ شھوۃ کی جمع ہے یہ مصدر بمعنیٰ للمفعول ہے یعنی مُشْتَهِيَاتْ یہ بطور مبالغہ ہے اور اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کی طرف نفس مائل ہوتا ہے۔ یہ کبھی جائز امور میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ جنت میں خواہش کی چیزیں ہوں گی سورۃ حٰم، سجدہ آیت ۳۱، سورۃ زخرف آیت ۷۱ لیکن یہاں دنیاوی خواہشات مراد ہیں اور وہ ناجائز ہیں اس لفظ میں مقصد اس سے نفرت دلانا ہے۔ حُبُّ کو اسکی طرف مضاف کیا ہے تو معلوم ہوا کہ محبت اور اشتھی دو الگ چیزیں ہیں شہوت غیر اختیاری ہے جبکہ محبت یہاں پر اختیاری ہے یعنی ایک چیز کو دوسری چیزوں پر ترجیح دینا مقصود ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان ایک چیز سے محبت کرتا ہے لیکن وہ چاہتا یہ ہے کہ اس چیز سے محبت نہ ہو۔ تو یہ محبت غیر اختیاری ہوتی ہے کبھی کسی چیز سے بندہ محبت کرتا ہے اور اُس کی چاہت ہوتی ہے کہ یہ محبت ہمیشہ برقرار رہے۔ یہ محبت اگر خیر کے کاموں میں ہو تو سعادت مندی ہے اگر شر کے امور میں ہو تو بدبختی ہے۔ معلوم ہوا کہ یہاں پر تین مرتبے ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(۱) خواہشات کی چاہت،(۲) محبت اور مذکورہ شہوات کو ترجیح دینا اس کے مقابل ہے،(۳) زینت یعنی اس کا یہ عقیدہ ہو کہ یہ کام بہتر ہے اور اس کی برائی و نقائص اس کی نظروں سے اوجھل ہو۔جس میں یہ تین درجے جمع ہو گئے تو وہ مکمل طور پر آخرت سے غافل ہوتا ہے۔مِنَ النِّسَاۗءِ اس میں اصول شہوات کا ذکر ہے یعنی نساء شہوات کا مجموعہ ہے۔ نیز اس میں امتوں،زمانوں اور سنتوں کا کوئی اختلاف نہیں ہے پہلے خواتین کا ذکر کیا ہے اس لیئے کہ ان کے متعلق مردوں کے نفسوں میں خواہش رکھی گئی ہے یہاں تک کہ مرد پر یہ شوق خواہش بھاری نہیں ہوتی ہے اور مردوں کیلئے عورتیں سب سے بڑا فتنہ ہے اور سبب نقصان و ضرر ہے جیسا کہ حدیث میں ہے مَا تَرَكْتُ بَعْدِي فِتْنَةً أَضَرَّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاۗءِ (میں نے اپنے بعد مردوں کیلئے عورتوں سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں چھوڑا) (صحیح بخاری کتاب النکاح حدیث 5096،صحیح مسلم حدیث 2741،ابن حبان 5970)۔صلہ رحمی،تعلقات ختم کرنے اور حرام مال جمع کرنے کیلئے سبب ہے۔دوسرے نمبر پر وَالْبَنِيْنَ کا ذکر ہوا ہے اس سے طبعی محبت مراد ہے اس میں یہ فتنہ ہے کہ حرام مال جمع کرنے کیلئے سبب ہے اور یہ محبت بنسبت بیٹی کے بیٹے میں زیادہ ہے۔وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ یہ تیسری خواہش کی چیز ہے۔قناطیر قنطار کی جمع ہے جو سو ۱۰۰ رتل کا ہوتا ہے یہ لفظ حقیقت میں لاطینی سریانی یا رومی ہے اس زبان میں کنتال تھا اور عربی میں قنطار ہوا۔زجاج کے نزدیک یہ قنطر سے لیا گیا ہے جس کے معنی باندھنا مضبوط کرنا ہے یا قطر سے لیا گیا ہے جو بہنے کے معنی میں ہے۔قنطار کی مقدار میں بہت اختلاف ہے۔ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت میں ۱۲۰۰۰ ہزار اوقیہ کو قنطار کہا گیا ہے۔ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ۱۲۰۰۰ بارہ ہزار دراھم مذکور ہے۔ایک اور روایت میں ایک ہزار اور دو مثقال ہے اور سیدنا ابو ھریرۃ کی روایت میں بارہ ہزار اوقیہ مراد ہے انس رضی اللہ عنہ سے ہزار دینار ۱۰۰۰ نقل ہے۔ابن المسیب اور قتادہ کی روایت میں ۸۰،۰۰۰ اسی ہزار ذکر ہے مزید اور اقوال بھی وارد ہیں۔ابو عبید اور امام رازی نے فرمایا ہے کہ قنطار ایسا وزن ہے جس کی مقدار معلوم نہیں ہے۔الْمُقَنْطَرَةِ ہر وصف جو موصوف کے ساتھ مادہ میں شریک ہو وہ تاکید کی دلیل ہے۔جیسا ظِلًّا ظَلِيْلًا اس میں بلا تحدید کثرت کی دلیل ہے۔اس لفظ میں اشارہ ہے کہ (مصارف) خیر میں مال صرف نہیں کرتے ہیں بلکہ جمع کر کے خزانہ بناتے ہیں۔مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ یہ قناطیر کی تشریح ہے اور اس کو اس لیئے ذکر کیا ہے کہ اس سے زیور بنتے ہیں نقد رقوم بھی ہر زمانہ و جگہ میں انہی سے بنتی ہیں۔ذھب زوال پر دلالت کرتا ہے اور فضۃ علیحدہ ہونے پر دلالت کرتا ہے تو یہ دونوں زوال اور عدم استقلال پر دلالت کرتے ہیں۔فائدہ مقام محبت میں اولاد کو مال پر مقدم

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

کرنے کی وجہ واضح ہے اس سے اولاد کی محبت مال پر غالب ہے جبکہ مقام فتنہ اور اغناء یعنی کفایت میں مال کو مقدم کیا ہے کیونکہ مال کا فتنہ بنسبت اولاد کے فتنہ سے زیادہ ہے اور مال کے ذریعے سے پہلے دفاع کی کوششیں کی جاتی ہیں جیسا کہ سورۃ انفال آیت ۲۸، سورۃ تغابن آیت ۱۵ اور کفایت مالی اس سورۃ آیت ۱۰، ۱۱۶، سورۃ مجادلہ آیت ۱۷ میں ذکر ہے۔ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ یہ چوتھی چیز ہے یہ نساء (عورتوں) پر عطف ہے لیکن محبت کی ترتیب میں اس کی باری سونے چاندی کے بعد ہے اس لیئے اس کو ان کے بعد ذکر کیا ہے۔ اس میں طبعی محبت کا یہ عالم ہے کہ دور حاضر میں ہر قسم کی اعلیٰ سواریوں کے باوجود حکمران اور مالدار لوگ گھوڑوں کو پالتے ہیں، مقابلے کیلئے گھوڑا گاڑی تانگہ وغیرہ میں استعمال ہوتا ہے۔ سیبویہ کے نزدیک خیل اسم جمع ہے۔ اخفش کے نزدیک جمع تکسیر ہے۔ واحدی کے نزدیک وہ جمع جس کا واحد نہیں، جیسا لفظ قوم۔ نساء، رھط، اَلْمُسَوَّمَةِ اس کے معنی میں اختلاف ہے۔ یہ بعض علماء کے نزدیک تسویم سے ہے یعنی تعلیم کے معنی میں ہے یعنی سدھائے ہوئے گھوڑے۔ بعض کے نزدیک سیما، سُيَّمَةَ سے لیا گیا ہے یعنی علامت جو یا تو ماتھے پر ہوتی ہے یا سارے وجود پر جسکو یعنی کالا سفید ہوتا ہے۔ بعض کے نزدیک یہ سوم سے لیا گیا ہے جس کے معنی چرانا ہے یعنی ریگی میں اشارہ ہے ان کے مالکوں کی بڑی بڑی کھیتیاں ہیں جن میں یہ گھوڑے چرتے اور آزاد پھرتے ہیں۔ گھوڑے اس طرح چرنے سے بہت تندرست قوی صحت مند ہوتے ہیں اور بعض کے نزدیک سیما، سے لیا گیا ہے جس کے معنی حسین خوبصورت اور فربہ ہونا ہے۔ وَالْأَنْعَامِ یہ پانچویں چیز ہے۔ انعام نعم کی جمع ہے اونٹوں، گائیوں، بھیڑ بکریوں کو کہا جاتا ہے اور اس میں بہت فائدے ہیں جو سورۃ نحل آیت ۶۵، ۶۶ میں ہیں ان چوپاؤں سے گاؤں دیہات والے بہت ہی محبت کرتے ہیں یہ مویشیوں کو پالنے والوں کی اصلی متاع ہے البتہ مالدار لوگ مویشیوں کو تماشوں اور بعض فائدوں کیلئے استعمال کرتے ہیں وَالْحَرْثِ یہ مصدر ہے مگر مفعول کے معنی میں ہے اور اس لئے اس کو جمع نہیں کیا ہے اور یہ چھٹی چیز ہے اس سے مراد باغیچے، باغات، سرسبز و شاداب فصلیں ہیں بعض شہریوں کو اور بعض دیہاتیوں کو اچھی لگتی اور پسند ہوتی ہیں۔ امام قرطبی نے فرمایا ہے کہ نساء اور بنون کے بعد چار قسم کے مالوں کا ذکر کیا ہے اور ان میں سے ہر قسم بعض لوگوں کے ساتھ مختص ہے (۱) پہلی قسم سونا و چاندی تاجروں کے ساتھ، (۲) دوسری قسم گھوڑے بادشاہوں اور مالداروں کے ساتھ، (۳) تیسری قسم چوپائے جو دیہاتیوں کا مال و متاع ہیں، (۴) چوتھی قسم زمین و باغات کھیتیاں جو زمینداروں اور باغبانوں کا مال و متاع ہیں۔ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا۔ ذٰلِكَ میں مذکورہ سب کی طرف اشارہ مجموعہ کی تاویل میں ہے۔ متاع اس کا معنی گزر چکا ہے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس میں قلت (کم ہونے) اور فنا ہونے کی طرف اشارہ ہے اس میں چار قسم کے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ (۱) اس پر خود عیش و راحت کرنا اور بخیلی کی وجہ سے کسی اور کو نہ دینا۔ (۲) ضرورت کے وقت اس سے فائدہ نہیں لیتے ہیں اور بے ضرورت اس کو خرچ کرتے ہیں۔ (۳) مباح طریقے سے فائدہ لیتے ہیں لیکن آخرت کے مصالح اور فائدے کی غرض سے خرچ نہیں کرتے ہیں اور یہ تینوں شرعاً اور عرفاً مذموم ہیں اور چوتھی قسم آخرت کے فائدے کیلئے خرچ کرنا ہے جو مفید ہے اور قابل تعریف ہے وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ یہ دنیا کے معاملات کے مقابل آخرت کی ترغیب ہے اَلْمَاٰبِ یہ واپسی رجوع کی جگہ کو کہا جاتا ہے۔ یہاں پر ظرف کے معنی میں ہے یا مصدر کے معنی میں ہے۔ مَاٰب دو قسم کے ہیں ایک بدتر ہے جو کہ جہنم ہے سورۃ نبا آیت ۲۲ میں ہے جبکہ دوسرا بہتر ہے جو کہ جنت ہے یہاں پر اس لیئے حُسْنُ الْمَاٰبِ فرمایا ہے کہ جنت ہے اور حسن یہ ہے کہ اس کیلئے فنا نہیں ہے زوال نہیں ہر وقت شادابی ہے اور کوئی کمی اس میں نہیں ہوگی اور ہمیشہ کیلئے خوشی کا باعث ہے۔

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَیْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِیْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۚ﴿۱۵﴾ "کہہ دیجئے کیا اس سے بہتر چیز کی تمہیں خبر نہ دوں ان لوگوں کیلئے جنہوں نے تقویٰ اپنایا ہے ان کے کیلئے ان کے رب کے پاس باغات ہیں بہتی ہونگی ان کے نیچے نہریں ان میں ہمیشہ رہیں گے اور ان کیلئے پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے رضا مندی ہوگی اللہ اپنے بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے" [15]۔

تفسیر 15: ربط ۱: دنیا سے بے رغبتی کے بعد اب آخرت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔ ربط ۲: پہلے حُسْنُ الْمَاٰبِ ذکر ہوا تو اب اس کی تفصیلات اور مستحقین کا ذکر لفظ قُلْ اہتمام اور ترغیب اِلَى الْاٰخِرَۃ کے لیے ذکر کیا گیا۔ اَؤُنَبِّئُكُمْ میں ہمزہ برائے استفہام ہے جو فعل مضارع صیغہ واحد متکلم پر داخل ہوا ہے اور یہ استفہام تقریری ہے تاکہ اس کلام کو سننے کے بعد سامعین کا شوق پیدا ہو جائے۔ کُمْ مفعول اول اور بِخَیْرٍ مفعول ثانی ہے۔ لازم نہیں ہے کہ اس میں اعلام کا معنی ہو ورنہ پھر تین مفعولوں کی ضرورت ہوگی۔ مِّنْ ذٰلِكُمْ میں اشارہ ہے کہ خیر اسم تفضیل ہے۔ ذٰلِكُمْ میں دنیا کی چیزوں اور فائدوں کی طرف اشارہ ہے جو ذکر ہوئے ہیں۔ مِّنْ ذٰلِكُمْ یہ خیر کیلئے صلہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ سابقہ چیزوں میں خیر تو ہے مگر جنت کی نعمتوں میں بہت زیادہ خیر ہے یا خیر اسم تفضیل نہیں ہے صرف صفت ہے تو اس معنی میں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مَتَاعُ الدُّنْيَا میں کوئی خیر نہیں ہے اس قول کو ابو حیان نے ترجیح دی ہے۔ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا اس میں ایک احتمال یہ ہے کہ یہ خیر سے متعلق ہے۔ عِنْدَ رَبِّهِمْ جنت میں استئنافیہ کلام ہے جو خیر کیلئے بطور بیان ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ خبر مقدم ہے جنت مبتداء ہے۔ یہاں تقویٰ سے مراد شرک وکفر سے بچاؤ ہے یعنی کفر وشرک سے بچنے میں تقویٰ کا پہلا مرتبہ ہے۔ عِنْدَ رَبِّهِمْ یہ جنت سے حال مقدم ہے یا اس کے ساتھ متعلق ہے اور عِنْدَ سے مراد قربت ہے۔ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ جنت کی جمع میں باغات کی کثرت کی طرف اشارہ ہے اور نکرہ میں ان کی نا آشنا اور عجیب حالات اور مناظر کی طرف اشارہ ہے۔ باقی تفسیر سورۃ بقرہ میں گزری ہے۔ اس میں بہت سی بشارتیں ہیں (۱) خیر، (۲) عند ربھم، (۳) جنت، (۴) تجری، (۵) خٰلِدِيْنَ فِيْهَا، (۶) وَأَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ اس کی تفسیر بھی گزر گئی ہے۔ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ یہ ساتویں بشارت ہے پہلے مادی نعمتوں کا ذکر تھا اب روحانی نعمت کا ذکر ہے، اس سے پہلے لفظ لَهُمْ مقدر ہے یا جنت پر عطف ہے اور یہ سابقہ نعمتوں کی بنسبت عظیم نعمت ہے۔ صحیح بخاری کتاب الرقاق حدیث 6549 صحیح مسلم کتاب الجنۃ حدیث 2829 میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جنتیوں سے مخاطب ہوگا کہ ان سب نعمتوں سے بڑی نعمت نہ بتاؤں وہ فرمائیں گے کہ اے اللہ اس سے بہتر اور کون سی نعمت ہوگی؟؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں اپنی رضامندی تم پر نازل کرتا ہوں اور کبھی بھی تم پر ناراض نہیں ہوں گا یہ بشارت سورۃ توبہ آیت ۲۱، ۷۲ اور سورۃ حدید آیت ۲۰ میں بھی ہے اور اس کو مصدر کے صیغے سے نکرہ ذکر کیا جو اس نعمت کی عظمت کی دلیل ہے۔ مِّنَ اللّٰهِ میں مزید تاکید ہے۔ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ۔ عَلِيْمٌ کا معنی بصیر میں لازمی طور پر موجود ہے اس لیئے صلہ میں (با) ذکر کی ہے اور الْعِبَادِ سے الَّذِيْنَ اتَّقَوْا لوگ مراد ہیں اس میں الف لام عہدی ہے یعنی وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی خالص بندگی اختیار کی ہے۔

الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ "وہ لوگ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب یقیناً ہم ایمان لائے ہیں لہذا ہمارے گناہ بخش دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا" [16]۔

تفسیر 16: اس آیت میں ان کی خاص بندگی دعاء کے ساتھ ذکر ہے۔ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ اس میں نصبی رفعی جری تینوں حالتوں کا احتمال ہے۔ مبتداء مقدر کیلئے خبر ہے جو کہ ضمیر (هُمْ) ہے یا پھر مبتداء ہے جس کی خبر مقدر ہے یعنی الَّذِيْنَ الخ يُسْتَجَابُ لَهُمْ یا پھر لفظ أَعْنِيْ یا أَمْدَحُ مقدر ہے یا پھر الْعِبَادِ کیلئے صفت یا بدل ہے۔ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا اس میں پہلا وسیلہ صرف ایمان طلب کرنا ذکر ہے اور اس میں دلیل ہے کہ صحیح ایمان مغفرت کیلئے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سبب ہے جیسا کہ آیت ۱۹۳ میں ہے اور یہ بھی دلیل ہے کہ بہتر وسیلہ انسان کا ایمان ہے اور اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ انسان اپنے گناہوں کی مغفرت کا بہت محتاج ہے۔ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ یہ دوسرا مقصد ہے اور بچنے سے مراد یہ ہے کہ ذرہ برابر بھی آگ میں داخل نہ ہو بلکہ ابتداء سے جنت میں داخل ہو۔ یہ بھی دلیل ہے کہ صرف خالص ایمان ابتداء سے بندے کو جنت میں داخل کرا سکتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اعمال ایمان کا جز بحیثیت رکن مستقل نہیں ہے جیسا کہ خوارج اور معتزلہ کا قول ہے۔

اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾ "وہ صبر کرنے والے سچ بولنے والے حکم کی تکمیل کرنے والے خرچ کرنے والے اور سحری کے وقت استغفار کرنے والے ہیں" [17]۔

تفسیر 17: یہ دنیا میں ایمان والوں کی کامل صفات ہیں اور جنت میں اعلیٰ درجات حاصل کرنے کیلئے سبب ہے ان آیتوں میں بہترین ترتیب ذکر ہے۔ (۱) پہلے تقویٰ جو کہ ہر قسم کفر اور شرک سے بچنا ہے۔ (۲) پھر خالص ایمان والی بندگی ذکر کی ہے۔ (۳) پھر اسی ایمان کو وسیلہ بنایا جو دعاء عاجزی انکساری مغفرت کیلئے سبب ہے۔ (۴) اب کامل ایمان کیلئے مزید صفات کا ذکر ہے۔ الصَّابِرِينَ اس کے اعراب کا محل الَّذِينَ يَقُولُونَ کی طرح ہے۔ پہلے صفت اطاعتوں و تکالیف پر صبر اور حرام سے اجتناب ہے۔ ان صفات میں نماز روزہ کی عبادات داخل ہیں۔ وَالصَّادِقِينَ یہ دوسری صفت ہے صدق عمل قول اور نیت سب مراد ہیں یعنی جھوٹ بولنے سے پرہیز کرتے ہیں عقیدہ کی بات دل کے موافق کرتے ہیں اور عمل میں کامل ہیں۔ نیت میں مخلص ہیں ریا اور طلب دنیا کے متلاشی نہیں ہیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ منافقین کی صفات سے اجتناب کرتے ہیں۔ وَالْقَانِتِينَ یہ تیسری صفت ہے جس کی تفسیر سورۃ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ یہاں پر قنوت سے مراد تمام اعمال میں دوام و استقامت ہے۔ سورۃ زمر آیت نمبر ۹ کے قرینہ سے رات کی عبادت بھی اس میں شامل ہے۔ وَالْمُنفِقِينَ یہ چوتھی صفت ہے پہلے صفات بدنیہ کا ذکر تھا اور یہ صفت عبادت مالیہ کا ذکر ہے۔ انفاق نفلی فرضی سب کو شامل ہے نیز انفاق کی تفسیر بھی بقرہ میں گزر چکی ہے۔ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ یہ پانچویں صفت ہے اور سابقہ صفات کیلئے تکملہ ہے یعنی سابقہ صفات پر اتنا اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے کہ وہ قابل مغفرت ہوں بلکہ تمام عبادات کرتے ہوئے پھر بھی استغفار ضروری ہے تاکہ ان عبادات میں جو کمی کوتاہی رہ جائے یعنی تقصیر کے خلا کو استغفار سے پر کریں۔ اسحار سحر کی جمع ہے۔ بقول زجاج یہ فجر سے پہلے کا وقت ہے یعنی سحری کا وقت جو کہ رات کا چوتھائی حصہ ہے۔ بقول امام راغب فجر کی روشنی اور رات کا اندھیرا جب مل جائیں تو یہ وقت سحر ہے اور بعض کے نزدیک رات کے آخری حصہ سے صبح کی روشنی تک کا وقت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ اس وقت کی تخصیص اس لیئے کی گئی ہے کہ معلوم ہو جائے کہ یہ لوگ رات کی عبادت میں مصروف ہوتے ہیں سحری کے وقت تک اور پھر آخر میں استغفار کرتے ہیں اور یہ بھی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رات کے آخری حصہ میں دنیوی آسمان پر اپنی شان کے مطابق نزول فرماتے ہوئے اپنے بندوں سے فرماتے ہے کوئی ہے مجھ سے مانگنے والا جس کی دعاء قبول کروں ہے کوئی گناہوں کی مغفرت طلب کرنے ولا؟ میں اس کے گناہوں کو معاف کروں۔ صحیح بخاری کتاب التہجد حدیث 1145 فائدہ (۱) سوال: ان صفات کے درمیان واو عطف کیوں ذکر کیا ہے۔ جواب (۱) واؤ کو (تفخیم) یعنی ہر صفت کی عظمت کیلئے ذکر کیا ہے۔ جواب (۲) یہ صفات متفرقہ ہیں بعض انسانوں میں بعض ہوتی ہیں یعنی کسی میں کوئی ایک صفت غالب رہتی ہے کسی میں دوسری صفت اگر چہ مجموعی طور پر کامل ایمان والوں میں یہ صفات اعلیٰ درجے میں ہوتی ہیں البتہ آپس میں ان درجات میں فرق ہے۔ فائدہ (۲) ایمان کی ان علامات اور صفات میں عبادات دل کا صبر زبان کی سچائی اور دیگر اعضاء کی عباوات اور عباوات مالیہ کا ذکر ہوا ہے۔ فائدہ (۳) سوال یہ ہے کہ سورۃ احزاب آیت ۳۵ میں دس (۱۰) صفات مذکور ہیں۔ جواب: یہ مقام نصاریٰ کے متعلق ہے لہٰذا ان میں ایمان اور تقویٰ کے بعد صالحین میں یہ پانچ صفات پائی جاتی ہیں جبکہ سورۃ احزاب میں صحابہ وصحابیات رضوان اللہ علیہم کی صفات کا ذکر ہے ان میں دس (۱۰) صفات مذکور ہیں اس لیے کہ دیگر امتوں کے مقابل وہ بہت بلند صفات وشان والے ہیں۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱۸ النصف

"اللہ تعالیٰ نے گواہی دی ہے کہ اس کے سوا بندگی کا حقدار کوئی نہیں ہے ملائکہ اور اہل علم بھی انصاف (وعدل) کی اس شہادت پر قائم ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں مگر وہی ہے (جو) بہت غالب خوب حکمت والا ہے" [18]۔

تفسیر 18: دوسرے باب کا خلاصہ: یہاں سے آیت ۲۵ تک دوسرا باب ہے۔ اس باب میں پہلے توحید کا دعویٰ اور اس کے دلائل ہیں دلائل وحی، نقلی، عقلی اور نتیجہ ہے آیت ۱۸ میں پھر ان لوگوں کا جواب ہے جو گمراہ لوگوں کی باتوں سے خلاف شریعت دلیل لیتے ہیں پھر ان لوگوں کو مباحثہ کی دعوت دی گئی ہے پھر اسباب عذاب اور آخرت کا خوف باغیوں کو دلایا گیا ہے۔ آیت ۲۲ میں مقلدین باغیوں کے حال کا ذکر ہے اور دو اسباب کی وجہ سے ان کا کتاب اللہ سے اعراض مذکور ہے۔ آیت ۲۳، ۲۴ میں پھر آیت ۲۵ میں تخویف اخروی ہے۔ ربط: اولوا العلم کی صفات ذکر کرنے کے بعد اب ان کی طرف سے توحید پر شہادت کا ذکر ہے کیونکہ شہادت کی قبولیت کیلئے صفات عدل ضروری ہیں پھر ان کی شہادت کی تاکید کیلئے پہلے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اللہ تعالیٰ اور ملائکہ کی شہادت ذکر کی ہے اس میں اشارہ ہے کہ ان علماء کی شہادت اللہ تعالیٰ اور ملائکہ کی شہادت کے ساتھ مساوی ہے۔ شَهِدَ اللّٰهُ مفسرین نے اس مقام پر شاہد کے بہت سارے معانی تحریر کیے ہیں۔ (۱) بمعنی قَالَ یعنی اللہ نے فرمایا۔ (۲) بَیَّنَ بیان کیا۔ (۳) حَکَمَ حکم کیا۔ (۴) اَعْلَمَ خبر دی ہے۔ (۵) فیصلہ کیا ہے۔ (۶) توحید کے مسئلہ متعدد سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے دلائل سمیت بیان کیا ہے اور یہ شہادت اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ الوہیت معبودیت، اختیارات، تصرفات کے معنی میں ہے جو صفات الوہیت کہلاتی ہیں۔ نصاریٰ کا رد ہے کہ اس قسم کی صفات عیسیٰ علیہ السلام میں نہیں ہیں لہٰذا وہ معبود نہیں ہے۔ وَالْمَلٰٓئِكَةُ۔ ملائکہ کی شہادت کو اس لئے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے لا توحید کو وحی کی صورت میں انبیاء علیہم السلام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے لایا ہے جس کا ذکر سورۃ صافات آیت ۴ میں ہے اور یہ سلسلہ ہر زمانہ میں جاری رہا ہے اس سے مراد سورۃ صافات کی آیت مذکورہ کی بناء پر سب ملائکہ ہیں۔ وَالْمَلٰٓئِكَةُ لفظ اللہ پر عطف ہے یا پھر یہ جملہ ہے جس میں شَهِدَ مقدر ہے۔ وَاُولُوا الْعِلْمِ اس سے مراد علماء موحدین ہیں جنہوں نے ہر زمانہ میں توحید کی دعوت دی ہے اور دیتے ہیں۔ انبیاء کرام، صحابہ کرام، اہل الکتاب میں علماء توحید اور وہ تمام مؤمنین جو توحید کی شہادت دیتے ہیں اس میں شامل ہیں۔ سوال اللہ تعالیٰ توحید کا مدعی ہے تو اس کی طرف شہادت کی نسبت کس وجہ سے ہوئی۔ جواب (۱) پہلے شَهِدَ کے کئی معانی گذر گئے ان میں شَهِدَ کا معروف معنی نہیں ہے۔ جواب (۲) شہادت کے معنی اپنے مدعیٰ کو دلائل سے ثابت کرنا ہے لہٰذا یہ معنی دعویٰ کے منافی نہیں ہے۔ سوال اللہ تعالیٰ کی شہادت الگ ہے جبکہ ملائکہ اور علم والوں کی شہادت الگ ہے تو دونوں کو ایک ہی لفظ (شَهِدَ) میں کیسے مراد لیا گیا ہے؟ جواب: جو عموم کے مشترک کے قائل ہیں ان کے نزدیک کوئی اشکال نہیں ہے لیکن شَهِدَ کا معنی جب عام ہے تو یہ ملائکہ اور اولوالعلم کے اقرار کرنے اور دعوت دینے کو حقیقی طور پر شامل ہے۔ فائدہ (۱) امام قرطبی اور صاحب اللباب نے فرمایا ہے کہ یہ آیت علم کی عظمت و شرافت پر واضح دلیل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے علماء کی شہادت ملائکہ اور اپنے ساتھ ذکر کی ہے۔ فائدہ (۲) یہاں پر شہادت اللہ تعالیٰ نے توحید پر ذکر کیا ہے۔ سورۃ انعام آیت ۱۹ میں بھی ہے جبکہ سورۃ نساء آیت ۱۶۶ میں قرآن مجید پر شہادت ذکر کی گئی ہے اور سورۃ منافقین آیت (۱) میں منافقین کے جھوٹ پر شہادت ذکر کی گئی ہے۔ سورۃ نساء آیت ۷۹ میں سورۃ اسراء آیت ۹۶ میں نبی آخر الزمان کی نبوت پر ذکر کی ہے۔ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ یہ لفظ اللہ یا لفظ هُوَ سے حال بن کر آیا ہے اس لیئے یہ منصوب ہے یا تینوں سے حال بنا ہے۔ قیام بالقسط کا معنی لوگوں کا عدل وانصاف سے تدبیر کرنا لیکن

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہ اس وقت معنی ہوگا جب لفظ اللہ یا هُوَ سے حال بنے اگر تینوں سے ہو تو معنی یہ ہے کہ تینوں توحید کی شہادت پر ایسے قائم ہیں کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں لاتے ہیں۔ امام آلوسی نے لکھا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ کے افعال اور تصرفات میں کمال کے بعد ذاتی کمال کا ذکر ہے۔ لفظ قسط قرآن مجید میں ۱۵ مرتبہ آیا ہے ہر جگہ حق اور عدل کے معنی میں اور حقدار کو ادائیگی حق کے معنی میں آیا ہے۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یہاں دوبارہ آنے کی وجوہات یہ ہیں کہ سابقہ کلام میں اللہ تعالیٰ کی تخصیص الوہیت کی وجہ سے ہوئی ہے اور یہاں پر دو صفتوں کی وجہ سے ہوئی ہے۔ (۱) الوہیت اور (۲) عدل کرنا تفسیر کشاف۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ پہلا کلمہ لا الہ الا اللہ الخ اللہ تعالیٰ کی ذات کا ذکر ہے اور دوسری بار ملائکہ اور اولوا العلم کے ساتھ ذکر ہوا لیکن یہ اس بات کی بنا پر ہے کہ وَالْمَلٰٓئِكَةُ سے پہلی مخفی عبارت میں لفظ شہادت مقدر ہو اور یہ توجیہ مرجوح ہے۔ (۳) اس تکرار میں اشارہ ہے کہ اس کلمہ کا ذکر کثرت سے کرنا چاہئے کیونکہ یہ عظیم عبادت ہے۔ (۴) چوتھی وجہ یہ ہے کہ پہلے کلمہ میں صفات تنزیہی اور دوسری میں صفات تمجیدی کی طرف اشارہ ہے یعنی الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ جس میں یہی مقصود ہے۔ (۵) پہلے دعویٰ کے طور پر ذکر کیا تھا اور شہادت ذکر کرنے کے بعد بطور نتیجہ ہے الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ یہ صفات بطور دلیل ذکر ہیں کیونکہ پہلی صفت میں تمام قدرت و تصرف کی صفات کی طرف اشارہ تھا جبکہ دوسری صفت میں اللہ تعالیٰ کے علم کی صفت کی طرف اشارہ ہے۔ ابو حیان۔ فائدہ: لفظ شَهِدَ میں دلیل وحی کی طرف اشارہ ہے اور وَالْمَلٰٓئِكَةُ اور وَاُولُوا الْعِلْمِ میں دلیل نقلی کی طرف اشارہ ہے اور قَآئِمًا بِالْقِسْطِ میں دلیل عقلی کی طرف اشارہ ہے جبکہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ دعویٰ ہے اور دوسرا نتیجہ ہے۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۗ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾ "بلاشبہ اسلام ہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین ہے اور اختلاف نہیں کیا ان لوگوں نے جو کتاب دیئے گئے مگر (صحیح) علم آجانے کے بعد عناد و حسد آپس میں کرتے ہوئے (اختلاف کیا) اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے آجانے کے بعد کفر کرے تو یقیناً اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے" [19]۔

تفسیر 19: (ربط ۱) جب سابقہ آیت میں خاص شہادت کے ساتھ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ کو ثابت کیا تو اب اس کا نام ذکر کیا جا رہا ہے کہ وہ اسلام ہے۔ (ربط ۲) سابقہ آیت میں نصاریٰ کے اشکال کا جواب ذکر ہوا یعنی تشابہات سے استدلال کرنا تو اب ان کو اصل مقصد کی دعوت دی جاتی ہے جو کہ اسلام ہے۔ اِنَّ الدِّيْنَ لفظ دین کی تفسیر سورۃ فاتحہ میں گزری ہے۔ عرف میں دین ان عقائد و اعمال کے مجموعے کا نام ہے جو کسی قوم نے اختیار کیا ہو اور اس نیت سے اس پر عمل پیرا ہو کہ اس کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جزاء ان کو ملے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ صحیح یا غلط ہو یہی وجہ ہے کہ مشرکین کے دین کو بھی دین کہا گیا ہے۔ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ جبکہ شرعی اصطلاح میں وہ عقائد و اعمال جو اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے چن لئے ہوں اور ان کو ذو العقول پر بطور دین لاگو کئے ہو وہ دین کہلاتا ہے۔ الدِّينَ میں الف لام جنسی ہے۔ عِندَ اللهِ یہاں پر عِندَ علم کیلئے نہیں بلکہ قبولیت اور اعتبار کیلئے ہے۔ الْإِسْلَامُ قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ کی شہادت اور ان چیزوں کا اقرار جو وحی کے ذریعے سے اللہ کی طرف سے آئی ہوں یہ اسلام ہے۔ اور یہ وہ دین ہے جس کی تشریح اللہ تعالیٰ نے خود رسولوں کو مبعوث کر کے کی ہے۔ اس کے دوستوں نے اس کی طرف ہر دور میں دعوت دی ہے اس کے سوا کسی دین کو نہ قبول کرتا ہے اور نہ ہی اجر ثواب دیتا ہے۔ ابن جریر۔ لغت میں اسلام انقیاد، طاعت، تسلیم اور متابعت کو کہتے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں ایمان ظاہراً و باطناً انقیاد کو کہا گیا۔ ایمان و اسلام شریعت کے اعتبار سے ایک ہی چیز کے دو نام ہیں جیسا کہ سورۃ ذاریات آیت ۳۵ اور ۳۶ میں ہے کبھی ظاہری اعمال کو اسلام کہا جاتا ہے جیسا کہ سورہ حجرات آیت ۱۴ میں ہے کبھی ایمان صرف دل کی تصدیق کو کہا جاتا ہے اس کا اظہار زبان سے ہوتا ہے اور کبھی کبھار اعمال پر اس کا اطلاق ہوتا ہے یہاں مسند میں مسند الیہ کا حصر ہوا ہے تو حصر کے لزوم سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی دین نہیں مگر صرف اسلام ہے لیکن ادیان تو دنیا میں بہت ہیں البتہ وہ دین جو عِندَ اللهِ معتبر ہے اور رضا الٰہی کا سبب ہے نیز سبب اجر و نجات ہے وہ صرف اسلام ہے سابقہ کلام سے معلوم ہوا ہے کہ تمام نبیوں کا دین وہ ہے جس کو اسلام کہا گیا ہے۔ جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کے دین کو بہت سے آیتوں میں اسلام کہا گیا ہے سورۃ بقرہ آیت ۱۳۲، آل عمران آیت ۶۷۔ یعقوب علیہ السلام اور اس کی اولاد کے دین کو بھی اسلام کہا گیا ہے (بقرہ 133) عیسیٰ علیہ السلام کے حواریین کے دین کو بھی اسلام کہا گیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کے دین کو بھی اسلام کہا گیا ہے سورۃ اعراف آیت ۱۲۶۔ سلیمان علیہ السلام کے دین کو بھی اسلام کہا گیا ہے سورۃ نمل آیت ۳۱ سابقہ اہل حق اہل کتاب کے دین کو بھی اسلام کہا گیا ہے سورۃ قصص آیت ۵۳۔ لوط علیہ السلام کی پیروکاروں کے دین کو بھی اسلام کہا گیا ہے سورۃ ذاریات آیت ۳۶ یہاں پر اسلام سے یہ مراد ہے پھر نزول قرآن کریم کے وقت سے محمد ﷺ کے دین کیلئے یہ نام مختص کیا گیا ہے اور اس جملہ میں نجران کے نصاریٰ کا رد ہے کیونکہ وہ تحریف شدہ دین کو حق دین قرار دے رہے تھے۔ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ۔ یہ ایک مقدر اشکال کا جواب ہے۔ اشکال یہ ہے کہ یہودیوں نے عزیر علیہ السلام اور نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے لئے ابن

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اللہ کہا۔ اور دیگر شرکیات بھی ان میں موجود ہیں یہاں تک کہ ان شرکیات کو اپنی کتابوں میں بھی درج کیا ہے قرآن کریم اور نبی آخر الزمان کے انکار کے بھی مرتکب ہوئے اور اس مقصد کیلئے انہوں نے اپنی کتابوں میں تحریف بھی کی ہے لہذا اگر پسندیدہ دین انکا اسلام ہوتا تو ان کے پیر اور علماء اس سے اعراض نہ کرتے بلکہ مان لیتے جبکہ انہوں نے تو مخالفت کی ہے لہذا اس جملہ میں ان کا جواب ہے کہ ان احبار و رہبان نے مخالفت ضد وعناد کی وجہ سے کی ہے۔ دین اسلام سے مخالفت تحریف کا لکتاب ان کی سرکشی کی وجہ سے ہے جس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ آج بھی بہت سارے جاہلوں کی زبانوں پر یہ باتیں بازگشت کرتی ہیں کہ جن چیزوں کو تم شرک اور بدعت سے تعبیر کرتے ہو ان کو دوسرے پیروں مولویوں نے بڑی بڑی کتابوں میں ثابت کیئے ہے۔ یا تو انہوں نے صحیح کتابوں میں باطل باتیں درج کی ہیں لہذا قرآن وسنت اگر حق ہے تو ان علماء نے کیوں مخالفت کی ہیں۔ تو اس اشکال کا جواب وہی ہے کہ ان کی مخالفت دلیل پر بنا نہیں بلکہ ضد ہٹ دھرمی حسد پر بنا ہے اسی طرح سورۃ بقرہ آیت ۲۱۳ میں اور سورۃ شوریٰ آیت ۱۴، سورۃ جاثیہ آیت ۱۷ میں مذکور ہے۔ الْعِلْمُ سے اسلام کی حقانیت کے واضح دلائل مراد ہیں جو قرآن تورات انجیل میں مذکور ہیں بَغْيًا یہ اخْتَلَفَ کیلئے مفعول له یا الَّذِينَ کیلئے حال ہے۔ بَيْنَهُمْ اس کی دوسری جانب محذوف ہے یعنی وَبَيْنَ أَهْلِ الْحَقِّ چونکہ حق والوں کی طرف سے ضد حسد نہیں ہے اس لیے انکار نہیں کیا۔ یہاں پر مقدر عبارت ہے یعنی نَشَأَ وَبَاضَ بَيْنَهُمْ یعنی ان کے درمیان ضد عناد اس طرح رچ بس گئی کہ گویا پیدا ہوکر انڈے دے دیئے (یہ مبالغہ ہے) ابن عاشور نے اس مقام میں تفصیلی بحث لکھی ہے کہ اختلف کے متعلق کو اس لئے یہاں ذکر نہیں کیا کہ اختلاف کی بہت اقسام ہیں اور یہ ان سب کو شامل ہے۔ پہلی قسم ہر امت کا دوسری امت سے اختلاف ہے یعنی دین کی صحت اور وصف کے اعتبار سے ہے جیسا کہ وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ. دوسری قسم افتراق ہے گروہ بندی کے اعتبار سے دوسری امت کے مقابل جیسا کہ حدیث میں مذکور ہے کہ نصاریٰ میں (۷۱) اکہتر اور یہود میں (۷۲) بہتر فرقے بنے تھے (صحیح ابن حبان 6747، مستدرک حاکم 128، صحیح ترمذی حدیث 264، صحیح ابن ماجہ 3991)۔ تیسری قسم انہوں نے اختلاف دین اسلام کے متعلق آپس میں بغی حسد کی وجہ سے کیا ہے باوجود اسلام کی حقانیت کو جانتے ہوئے ایسا کیا ہے یہاں پر سب اقسام مراد ہیں خصوصا تیسری قسم وَمَن يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ اس میں اشارہ ہے کہ انہوں نے اختلاف اصول دین میں کیا ہے جو کہ کفر ہے یعنی وہ اختلاف آیتوں کے انکار کی وجہ کیلئے مستلزم ہے جو تورات انجیل قرآن

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میں ہے۔فَإِنَّ اللّٰهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ حساب مناقشہ کے معنی میں ہے یا جزاء دینے سے کنایہ ہے۔

فَإِنْ حَآجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۗ وَقُل لِّلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ أَأَسْلَمْتُمْ ۚ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوا ۖ وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ۝ ”پھر اگر آپ سے جھگڑا کریں تو فرما دیجئے کہ میں نے اپنا چہرہ اللہ تعالیٰ کیلئے جھکا دیا ہے اور انہوں نے بھی جنہوں نے میری اتباع کی ہے اور ان لوگوں سے بھی (فرما دیجئے) جو کتاب دیئے گئے اور ان پڑھوں سے (بھی) (کہ) کیا تم اسلام لاتے ہو اگر انہوں نے اسلام قبول کیا تو یقیناً وہ ہدایت پا گئے اگر وہ منہ پھیر دیں تو آپ کے ذمہ صرف (پیغام) پہنچانا ہے اور اللہ اپنے بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے“[20]۔

تفسیر 20: اس آیت میں اختلاف کا نتیجہ ذکر ہے اور مسلمانوں کو مخالفین اسلام سے گفتگو آداب اور طریقہ کلام سکھایا گیا ہے کیونکہ جب وہ اسلام کی مخالفت پر اتر آئیں گے تو مخالفت میں کچھ دلائل بھی بیان کریں گے جبکہ باطل کے پاس دلائل نہیں ہوتے تو لامحالہ وہ جو پیش کریں گے وہ (محاجہ) جھگڑا ہی ہو سکتا ہے اور ضدیوں عنادیوں کا یہی طرز و طریقہ ہوتا ہے۔ فَإِنْ حَآجُّوكَ اس میں ضمیر اخْتَلَفَ الَّذِينَ کی طرف راجع ہے جس سے نجران کے یہود و نصاریٰ مراد ہیں اگرچہ اس کا حکم عام ہے۔ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ اس جملے کی پہلی توجیہ یہ ہے کہ اس میں اپنے دعویٰ کی وضاحت کرنا مراد ہے۔ جس دین کی دعوت دیتا ہوں اس پر میں خود پختہ مضبوط ہوں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی قسم کا شرک نہیں کرتا ہوں جب کہ تم اہل کتاب شرک و کفر کرتے ہو۔ یعنی ہمارے جھگڑے کی بنیاد فروعات نہیں بلکہ اصول ہیں۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ جھگڑے کو ختم کرنے کیلئے یہ فرمایا گیا ہے یعنی جب توحید پر دلائل قائم کیے گئے اور ان کے اشکال کے جوابات بھی ہوئے نیز شبہات بھی دی گئیں اور آخر میں یہ بات بیان ہوئی کہ یہ لوگ ضد و عناد اور حسد پر گامزن ہیں تو اب فرمایا گیا کہ میں تو حق کو تسلیم کرنے والا ہوں باقی اب مرضی تمہاری ہے میری مخالفت کرو یا موافقت۔ باطل پرستوں کے مقابل اہل حق کا یہی طریقہ ہے۔ وَجْهِيَ وجہ سے لیا گیا ہے مراد چہرہ ہے۔ چہرہ تابع کرنے سے مراد ذات کو تابع کرنا ہے۔ امام بغوی نے فرمایا ہے وجہ سے عمل بھی مراد ہو سکتا ہے وَمَنِ اتَّبَعَنِ یہ أَسْلَمْتُ میں (ت) متکلم پر عطف ہے یا مبتداء ہے جس کی خبر مقدر ہے یعنی كَذَٰلِكَ اس کے مصداق اول صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں اور یہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے اعلیٰ درجہ ایمان و اسلام پر واضح دلیل ہے البتہ بعد میں تمام اطاعت کرنے والے اس میں شامل ہیں اور لفظ أَسْلَمْتُ میں اسلام کے تمام

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

اصول وفروع شامل ہیں جو کہ کامل اسلام ہے۔ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ۔ اَسْلَمْتُ میں جو دعویٰ ذکر ہوا ہے اس کی طرف دعوت ہے۔ یعنی دعوت دعویٰ کے بعد دینی چاہیے سابقہ آیتوں میں اہل کتاب سے خطابات تھے اور ان کے اختلاف کا ذکر تھا اس لیے ان کا تذکرہ عام دعوت کیلئے مقدم کیا ہے۔ اس کے بعد عمومی دعوت کے لیے اُمِّيّٖنَ کا ذکر فرمایا ہے۔ اُمِّيّٖنَ ۔ سے مراد مشرکین عرب ہیں کیوں کہ ان کے پاس آسمانی کتاب نہیں تھی اور نہ ہی انہوں نے کتاب کا دعویٰ کیا ہے۔ تو اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے پاس کتاب نہیں ہے یعنی ہندو، سکھ، بدھ مذہب وغیرہ یا پھر ان کو اس لیے اُمِّيّٖنَ کہا گیا کہ کتابت اور قراءت سے وہ قاصر تھے اور اس امت کے ان پڑھ اُمّی لوگ بھی اس میں شامل ہیں۔ ءَاَسْلَمْتُمْ یہاں استفہام طلب کے معنیٰ میں ہے یعنی اسلام قبول کرو۔ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا اسلام کے بعد دو راستے ہیں اسلام قبول کرنا یا انکار تو دونوں حکموں کو بیان کیا۔ اهْتَدَوْا میں اشارہ ہے کہ یعنی اسلام قبول کر لینے کی وجہ سے انسان ہر قسم کی گمراہی سے بچ سکتا ہے۔ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ اس میں جواب مقدر ہے۔ تو فَلَا تَحْزَنْ ۔ پس آپ غمگین نہ ہوں۔ یا فَلَا تَبِعَةَ عَلَيْكَ آپ پر کوئی خسارہ نہیں ہے۔ فَاِنَّمَا مقدر جواب کیلئے علت ہے۔ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ مؤمن اور غیر مؤمن سب بندوں کیلئے عام ہے اور علم کنایہ ہے ہر شخص کو جزا و سزا دینے سے ان کے اعمال کے مناسب ہو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ " بلاشبہ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں اور بغیر کسی جرم شرعی کے نبیوں کو قتل کرتے ہیں اور ان لوگوں کو (بھی قتل کرتے ہیں) جو لوگوں میں انصاف کی بات (کا حکم) کرتے ہیں ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو" [21]۔

تفسیر 21: اس آیت میں وَاِنْ تَوَلَّوْا کی تفسیر ہے یعنی یہود و نصاریٰ نے اسلام سے اعراض کیا ہے اور ان کے لیے تخویف اخروی کا ذکر ہے اور اس اعراض کی دلیل ان کے تین کام ہیں۔ ان کاموں میں سے پہلا کام آیتوں پر کفر ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ آیتوں سے مراد تورات انجیل اور قرآن کی آیتیں ہیں جو توحید اور آخری رسول کی رسالت پر مبنی ہیں انہوں نے اس سے اعراض کیا ہے یہ صفت ان کے اکابرین میں بھی تھی اور اصاغر یعنی بعد والوں میں بھی تھی۔ اس وجہ سے ان کے اس عمل کو فعل مضارع سے ذکر کیا ہے دوسرا عمل ان کا یہ ہے کہ نبیوں کو بلا قصور قتل کرتے ہیں۔ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بِغَيْرِ حَقٍّ سورہ بقرہ میں اس کی تفسیر گزر چکی ہے۔ یہ صفت ان کے بڑوں کی تھی مگر ان کی اولادوں نے اپنے بڑوں کے ان کاموں کی تعریف کرتے ہوئے سراہا اور اُن کاموں کو جائز قرار دیا تو وہ بھی اس جرم میں ان کے ساتھ شمار کیئے گئی اس لیئے اس کو فعل مضارع کے صیغہ سے ذکر کیا ہے۔ سوال یہاں پر حَقٍّ نکرہ ذکر کیا ہے جبکہ سورۃ بقرہ میں اَلْحَقِّ معرفہ ذکر کیا ہے؟ جواب یہاں پر إِنَّ الَّذِينَ۔ الخ۔ اسم موصول ذکر ہوا جو کہ شرط کے معنی کو متضمن ہے اور تضمن عموم کا فائدہ دیتا ہے تو تعمیم کے لیئے نکرہ ذکر کیا گیا ہے۔ جبکہ بقرہ میں آیت معہود خاص افراد کے متعلق ہے اور وہ حق شرعی ہے جس پر انسان کا قتل جائز ہوجاتا ہے اور وہ ان افراد کو معلوم تھا اس لیئے اس کو الف لام کے ساتھ معرفہ ذکر کیا۔ انکا تیسرا کام یہ تھا۔ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ لفظ مِنَ النَّاسِ میں اشارہ ہے کہ یہ انبیاء کے ماسوا لوگ ہیں یعنی دیگر علماء کرام جو حق کی دعوت دیتے تھے۔ قسط سے مراد تو حید اور اسلام ہے اور جب اس میں يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ ذکر ہوا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے قتل کی کوئی دلیل نہیں تھی لہٰذا بِغَيْرِ الْحَقِّ کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کاموں میں ترتیب یہ ہے کہ پہلا دوسرے کیلئے سبب ہے اور دوسرا تیسرے کیلئے سبب ہے اس لیئے سبب کو مسبب پر مقدم کیا ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ سے نقل ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے کا درجہ انبیاء کے قریب ہے۔ سوال النَّبِيِّينَ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سارے نبیوں کو قتل کیا ہے حالانکہ ایسا تو نہیں ہے۔ جواب النَّبِيِّينَ میں الف لام عہدی ہے اور مفسرین نے بعض کے نام بھی ذکر کیئے ہیں۔ ابن عاشور نے لکھا ہے کہ زکریا علیہ السلام اپنے بیٹے کو قتل سے بچارہے تھے تو انہوں نے زکریا علیہ السلام کو بھی قتل کیا کیونکہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کر رہے تھے۔ ارمیاء اور حزقیل علیہما السلام کو اس لئے قتل کیا تھا کہ وہ دونوں قوم کی برائیوں کی تردید کرتے تھے اور اشعیاء علیہ السلام کو آری بلیٹ سے دو ٹکڑے کیا تھا اس لیئے کہ وہ داعیان حق میں سے تھے۔ ابن جریر اور ابن کثیر نے سند کے ساتھ ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ قیامت کے دن سخت عذاب ان لوگوں کو ہوگا جنہوں نے انبیاء اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے والے داعیان حق کو قتل کیا ہو (تفسیر ابن ابی حاتم 162/2، اس کی سند کو شیخ زبیر علی زئی اور دیگر علماء محققین نے ضعیف کہا ہے، تفسیر ابن کثیر مع التخریج 573/1)۔ پھر نبی اکرم علیہ السلام نے اس آیت کی تلاوت کی اور فرمایا اے ابو عبیدہ بنی اسرائیل نے صبح کے وقت (۴۳) تینتالیس نبیوں کو قتل کیا پھر ایک سو ستر افراد نے دعوت حق کا عَلَمْ بلند کیا تو دن کے آخری حصے میں ان سب کو قتل کیا۔ اس لیئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ جب مبتداء موصول شرط

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کیلئے متضمن ہے تو اس کی خبر میں (فا) ذکر کیا۔ سوال: بشارت تو خوشخبری کیلئے آتی ہے جبکہ یہاں پر عذاب کیلئے ذکر ہوئی ہے۔ جواب: اس کو عربی میں تہکم یا تلمیح کہا جاتا ہے یعنی ایک ضد کا اطلاق دوسری ضد پر ہوا ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ ﴿٢٢﴾

"یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا و آخرت میں برباد ہوئے ہیں اور ان کیلئے کوئی مددگار نہیں ہوگا" [22]۔

تفسیر 22: اس آیت میں سابقہ تخویف اخروی کی تاکید ہے۔ اور ایک اشکال کا جواب ہے۔ (اشکال) یہ تھا کہ ان کے مریدین شفعاء و سفارشی متبعین کثرت سے موجود ہیں اور ان کے نیک اعمال بھی ہیں لہٰذا وہ عذاب سے بچ جائیں گے۔ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ انکے اعمال آیتوں کے انکار اور نبیوں کے قتل کرنے کی وجہ سے برباد ہو گئے ہیں اور ان کے مریدین اور سفارشی ان کی مدد نہیں کر سکتے ہیں۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ۔ أُولَٰئِكَ میں سابقہ صفات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے اعمال مذکورہ صفات کی وجہ سے ضائع ہوئے ہیں۔ حَبِطَ اصل میں اونٹوں کی ایک بیماری ہے کہ زیادہ کھانے کی وجہ سے ان کے پیٹ پھول جاتے ہیں مگر سیر نہیں ہوتے یہاں تک کہ مر جاتے ہیں۔ ان کے اعمال کی بربادی کی تشبیہ اونٹوں کی اس حالت کے ساتھ دی ہے۔ دنیا میں اعمال کی بربادی یہ ہے کہ تعریف ملامت میں بدل گئی ثناء لعنت میں اور امن قتل و قید، جبکہ آخرت میں بربادی یہ ہے کہ انکے اعمال آخرت کی نجات کیلئے سبب نہیں بن سکتے۔ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ جمع ذکر کرنے میں فائدہ یہ ہے کہ جب اجتماعی طور پر وہ مدد نہیں کر سکتے تو انفرادی مدد کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ فائدہ: ابوحیان کے بقول جب ان کے تین اعمال کا ذکر فرمایا تو ان پر ترتیب سے عذاب کا نتیجہ بھی مرتب کیا۔ کفر بالآیت پر عذاب کی بشارت اور نبیوں کے قتل پر اعمال ضائع ہونے کا اور اہل حق کے قتل پر مددگاروں کی نصرت سے محرومی کا۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُم مُّعْرِضُونَ ﴿٢٣﴾ "کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب میں سے حصہ دیا گیا وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی طرف بلائے جاتے ہیں تاکہ آپس میں اللہ تعالیٰ کی کتاب پر فیصلہ کریں ان میں سے ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے اور یہ لوگ ہمیشہ اعراض کرنے والے ہیں" [23]۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تفسیر 23: یہ بات گزر گئی کہ ان کے اکابر علماء نے ضد وعناد کی وجہ سے اختلاف کیا تھا اور دین حق کے خلاف کتابیں بھی تصنیف کی تھیں اور یہ مقلدین تھے اب ان کے ناقص العلم طبقے کا ذکر ہے جو کتاب کے کچھ حصے کا علم رکھتے ہیں اور سابقہ علماء کی تقلید کرتے ہیں سابقہ آیت میں انکا حسد وعناد کا ذکر ہوا تو اب ان کے عناد کا (غایہ) انتہا اور دلیل ذکر ہو رہی ہے۔ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ یہ استفہام کثرت تعجب کیلئے ہے۔ أُوتُوا نَصِيبًا اس میں دو احتمال ہیں۔ (۱) پہلا احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد صرف یہود و نصاریٰ ہیں ان کو جنس کتب آسمانی میں سے ایک کتاب دی گئی ہے۔ (۲) دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد یہود و نصاریٰ کے علاوہ اس امت کے وہ لوگ بھی ہیں جو صرف کتاب کو پڑھ سکتے ہیں اور معانی نہیں جانتے یا وہ ناقص مولوی ہیں جو کامل علم نہیں رکھتے۔ یہ قول بہتر ہے اس لیئے کہ أُوتُوا الْكِتَابَ اور أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ میں فرق ہونا چاہئے۔ نیز یہ کہ اکثر مقامات پر قرآن میں یہ ایک دوسرے کے بعد ذکر ہوئے ہیں جیسا کہ سورۃ نساء 44، 46، 40، سورۃ شوریٰ 14 میں دونوں قسمیں مذکور ہے۔ اور ابوحیان نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نَصِيبًا کتاب کے ظاہر اور طرف کے معنیٰ میں ہے کیونکہ وہ ساری کتاب کو نہیں جانتے۔ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ اس سے مراد تورات ہے جو دین ابراہیم علیہ السلام پر مشتمل ہے اور ملت اسلامیہ ہے اس میں زانی کا رجم عقیدہ توحید، نبی آخر الزمان ﷺ کی صفات کا ذکر ہیں یا مراد قرآن مجید ہے جو مذکورہ مسائل پر مشتمل اور تورات وانجیل کیلئے مصدق ہے۔ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اس طرح سورۃ نور آیت ۴۸ میں بھی ہے اور یہ دلیل ہے کہ کتاب اللہ کا مقصد یہی ہے کہ اس پر فیصلے کیئے جائیں۔ ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ ایک فریق کی طرف نسبت اس لیئے کی گئی کہ ان میں بعض افراد نے اسلام قبول کیا جیسا کہ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ اور اس زمانہ میں بھی بعض افراد ایمان لاتے ہیں۔ وَهُم مُّعْرِضُونَ یہ جملہ حال ہو کر سابقہ جملے کیلئے تاکید ہے۔ تَوَلَّىٰ اور اعراض کا معنیٰ ایک ہے یا پھر یہ بیان حال کیلئے ہے یعنی تَوَلَّىٰ داعی سے منہ پھیرنا مراد لیا جائے اور اعراض سے داعی کے بیان کردہ مسئلہ سے اعراض مراد لیا جائے یا تَوَلَّىٰ سے ظاہری بدن پھیرنا اور اعراض سے مراد دل پھیرنا ہے۔ یا تَوَلَّىٰ سے دعوت کے وقت پھرنا ہے اور اعراض سے ہمیشہ اعراض مراد ہے۔ امام قرطبی کا قول ہے کہ جس کو کتاب اللہ کی طرف فیصلے کیلئے بلایا جائے اور وہ اعراض کرے تو اس کو مناسب تنبیہ کرنی چاہئے اور اس آیت میں وہ داخل ہے۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۖ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢٤﴾

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

”یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے کہا ہرگز نہیں چھوئے گی آگ ہمیں مگر گنتی کے چند دن اور ان کو ان کے دین میں دھوکے میں ڈالا (ان باتوں نے) جو ان کے بڑوں نے خود سے بنائی تھی“ [24]۔

تفسیر 24: اس آیت میں منہ پھیرنے اور اعراض کرنے کے دو اسباب مذکور ہیں۔ پہلی علت اور سبب یہ ہے کہ ان کا کہنا ہے کہ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ذٰلِكَ میں تولی اور اعراض کی طرف اشارہ ہے۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ ہم جنتی لوگ ہیں اور آگ میں نہیں جائیں گے اور جن کا یہ عقیدہ ہو تو وہ کتاب اللہ کی طرف نہیں آئیں گے کیونکہ وہ کتاب اللہ کے خلاف کرتے ہوئے اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہیں۔ مفسر زمخشری کا قول ہے کہ جبریہ اور حشویہ ایسے ہیں۔ راقم الحروف کہتا ہے کہ مقلدین کا بھی یہی حال ہے جو تقلید کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں۔ اس جملے کی تفسیر سورۃ بقرہ آیت ۸۰ میں گزر چکی ہے۔ اب دوسری علت کا بیان ہے وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِمْ مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ غرور دھوکے کو کہا جاتا ہے۔ كَانُوا يَفْتَرُونَ کی ضمیر فاعل ان کے اکابر مولویوں کی طرف راجع ہے جنہوں نے بغی حسد ضد کر کے حق سے انکار کیا اور اپنی طرف سے مسئلے گھڑ لئے جس کی وجہ سے انہوں نے شرک، بدعت اور باطل نظریات کیلئے بنیاد ڈال دی۔ بعد والے مولویوں نے ان کی تقلید کی اور ان کو دین قرار دیا یا پھر ضمیر بعد والے مولویوں کی طرف راجع ہے کیونکہ انہوں نے لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اور دیگر غلط قسم کی باتیں بنائیں فِي دِينِهِمْ اس میں اشارہ ہے کہ دین میں مسائل گھڑنا سبب ہلاکت اور دھوکا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ ہم جنتی ہیں اور ہمارے لئے عذاب نہیں ہے اور باطل باتوں کی تقلید کرتے ہیں تو یہ لوگ کتاب وسنت کی اتباع والے نہیں ہیں۔

فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٢٥﴾

”پھر اس وقت کیا حالت ہوگی ان لوگوں کی جب ہم اس دن میں ان کو جمع کریں گے جس کے آنے ہونے میں کوئی شک نہیں اور ہر نفس کو پورا بدلہ دیا جائیگا اس عمل کا جو اس نے کیا ہے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا“ (25)

تفسیر 25: اس آیت میں منکرین کیلئے تخویف اخروی کا ذکر ہے۔ فَكَيْفَ یہ لفظ ان کے حال کے تعجب کیلئے ہے اور یہ استفہام جواب نہیں چاہتا ہے اس میں حَالُهُمْ مقدر ہے۔ إِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ چونکہ اس دن سارے لوگوں کو اکٹھا کیا جائیگا اس لئے اس کو يَوْمُ الْجَمْعِ کہا گیا ہے (لِيَوْمِ الْجَمْعِ سورۃ التغابن آیت 9)۔ یوم سے مطلق وقت مراد ہے اور لَا رَيْبَ سے مراد اس دن کے واقع ہونے میں کوئی شک نہیں ہے اگرچہ بہت سے لوگ اس میں شک کرتے

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

ہیں۔ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ. مَّا كَسَبَتْ سے پہلے لفظ جزاء مقدر ہے اور مَّا كَسَبَتْ عام ہے خیر اور شر دیگر نصوص کے سبب سے ہر ایک کے ساتھ الگ الگ شرط ہے۔ یعنی خیر کا بدلہ پورا دیا جائیگا بشرطیکہ شرک وغیرہ کی وجہ سے ضائع نہ کیا گیا ہو اور فساد کا بدلہ بھی پورا دیا جائیگا۔ بشرطیکہ توبہ کرنے یا فضل الٰہی سے معاف نہ ہوا ہو۔ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ظلم نیک اعمال میں نقصان یعنی اجر میں کمی کے معنی میں ہے اور سیات گناہوں میں اضافہ کے معنی میں ہے لہذا دونوں کو شامل ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۖ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۖ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۖ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۶﴾ "آپ فرما دیجئے! اے اللہ بادشاہی کے مالک جس کو تو چاہے بادشاہی دیتا ہے اور جس سے چاہے تو اسے بادشاہی چھین لیتا ہے تو ہی عزت دیتا ہے جس کو چاہے اور تو ہی ذلت دیتا ہے جس کو چاہے سب بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے یقیناً تو ہر چیز پر خوب قادر ہے" [26]۔

تیسرے باب کا خلاصہ: یہ باب اس آیت سے آیت ۶۳ تک ہے۔ (۱) پہلے توحید کا اثبات ہے جس میں الوہیت کی بارہ (۱۲) صفات مذکور ہیں۔ آیت ۲۶، ۲۷ میں۔ دوم (۲) کافروں کیساتھ دوستی سے ممانعت اور اس پر تخویف ہے۔ ۳۰ تک۔ سوم (۳) اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ترغیب ہے اس لئے کہ اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی دوستی حاصل ہوتی ہے۔ چہارم (۴) نصاریٰ کے اشکالات کا جواب ہے کہ انبیاء بندے تھے یعنی ان کی عبدیت کا ذکر ہے آیت ۳۳ میں اور خصوصاً مریم کی والدہ کے متعلق شبہ اور زکریا علیہ السلام کے متعلق بھی۔ مریم و عیسیٰ علیہما السلام کے متعلق شبہات خصوصاً ان کا عبدیت یعنی بندے ہونے کی ۲۵ صفات کا تفصیلی ذکر ہے اور ان نصاریٰ کا رد ہے جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو الوہیت کا حقدار سمجھا ہے، اور اس کی پیدائش عجیب طریقے سے کی گئی ہے یہ تفصیل آیت نمبر ۵۹ تک ہے۔ پنجم (۵) نصاریٰ کو مباہلے کا چیلنج اور پھر مباہلے سے ان کا فرار، اور دعویٰ توحید پر اختتام ہے۔ ربط (۱): جب انہوں نے قرآن مجید سے اس وجہ سے اعراض کیا کہ اس میں نبوت و بادشاہت کی منتقلی کا ذکر ہوا ہے۔ بنی اسرائیل سے عرب امیوں کی طرف تو ان آیتوں میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ یہ اختیارات و تصرفات اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں لہذا اس میں اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔

ربط ۲: جب عنادیوں کا حال اور ان کو عذاب کی تنبیہ ذکر ہوئی تو اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص دعا کا حکم ہے اور یہ انابت والوں کی علامت ہے۔ ربط (۳): گزشتہ آیتوں میں وفد نجران کا رد کیا گیا اور ان کے اشکالات کا ازالہ ہوا تو اب ان کے باطل

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عقائد کا رد ہو رہا ہے جو انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اپنائے تھے لہٰذا بتایا گیا کہ صفات الوہیت اُس میں نہیں ہیں بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے۔

تفسیر 26: اَللّٰھُمَّ خلیل اور سیبویہ کا قول ہے کہ اَللّٰھُمَّ اصل میں یَااَللّٰہُ ہے۔ (یا) حذف کرنے کے بعد آخر میں اس کی جگہ میم مشدد لایا۔ اور یہ دونوں الف اور یاء کے عوض لائے گئے ہیں۔ لفظ قُلِ میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسا یاد کرنا چاہئے کہ نصاریٰ اور دیگر مشرکین کی تردید ہو جائے۔ اس لیئے مقصود بالنداء ذکر نہیں ہے تا کہ ہر مقصد شرعی کیلئے عام ہو جائے۔ نضر بن شمیل رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ جس نے دعاء میں اَللّٰھُمَّ پڑھ لیا تو گویا اس نے تمام اسماء حسنیٰ کے ذریعے سے دعا مانگی ہے۔ مَالِكَ الْمُلْكِ امام سیبویہ نے کہا ہے کہ یہاں پر ایک حرف نداء مقدر ہے کیونکہ یہ اَللّٰھُمَّ کیلئے صفت نحویہ نہیں ہو سکتی ہے۔ زجاج کے نزدیک صفت نحویہ ہو سکتی ہے۔ مَالِكَ اس کا معنی تمام چیزوں میں اختیار چلانے والا جس طرح ذوات منافع اور ثمرات میں چاہتا ہے۔ اَلْمُلْكِ یہ ملک یعنی اختیارات میں سے ایک قسم ہے یہ اعلیٰ قسم ہے اس لیئے کہ یہ (تصرف) اختیارات کا استعمال بڑی جماعت میں جو نظم کی صورت میں ہے اور حقوق کی رعایت و اقامتِ اور رعایت کے مصالح میں ہے۔ اَلْمُلْكِ اس میں الف لام برائے جنس ہے اور مضاف مقدر ہے یعنی دینا، تقسیم کرنا۔ فراخ اور تنگ کرنا۔ بقول مجاہد مُلْكَ سے نبوت مراد ہے لیکن اس کی تخصیص کی ضرورت نہیں ہے۔ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ بقول ابوحیان مُلْكَ سے مراد سلطان اور غلبہ ہے اور یہ ملکیت کی تفسیر ہے اور مالکیت صفت فعلی ہے دینے اور چھین لینے کے طور پر تَمْلِيْكَ کے بجائے اِيْتَاءُ ذکر کیا ہے کیونکہ تملیک اختیار کو کہا جاتا ہے جبکہ حقیقی ملکیت تو اللہ تعالیٰ کسی کو نہیں دیتا۔ مُلْكِ اس لیئے کہا ہے کہ اس میں اختیار حقیقی نہیں ہے۔ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ نزع اصل میں ایک جسم کو اپنی جگہ سے ہٹانے کو کہا جاتا ہے۔ اور اس کا استعمال صفات اور معانی ہٹانے کے معنی میں ہوتا ہے تو یہاں پر مراد یہ ہے کہ صفت ملک جس سے چاہے چھین لیتا ہے۔ بعض مفسرین نے اس میں تخصیص کی ہے پہلے مَنْ تَشَاءُ سے محمد ﷺ اور اس کی امت مراد ہے اور فارس والے روم، یہود، نصاریٰ اور کافر قریش دوسرے والے مَنْ تَشَاءُ میں مراد ہیں۔ لیکن بہتر قول یہ ہے کہ یہ عام ہے اور مذکورہ لوگ بھی اس میں داخل ہیں۔ نزع میں اشارہ ہے کہ ملک بادشاہت کوئی خوشی سے نہیں چھوڑتا ہے بلکہ اس سے زبردستی چھینا جاتا ہے اور مجبور ہو کر چھوڑتا ہے حدیث میں اس طرح مذکور ہے کہ نِعْمَتِ الْمُرْضِعَةُ وَبِئْسَتِ الْفَاطِمَةُ (صحیح بخاری کتاب الاحکام حدیث 7148) امارت ایک دل عزیز چیز ہے لیکن اس سے چھٹکارے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میں بہت تکلیف و برائی ہے وَتُعِزُّ مَن تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَن تَشَاءُ یہ ملک سے عام ہے کیونکہ اعزاز (عزت) دینا مال و ہیبت رعب دبدبہ دینا ہے۔ دشمنوں پر غلبہ دینا ہے اور دین کی نشر و اشاعت ہے اور ذلت اس کے مقابل ہے۔ آخرت میں اعزاز ابتداء سے جنت میں داخل ہونا ہے اور بڑے بڑے درجات اور مراتب دینا ہے اور آخرت میں ذلت جہنم میں عذاب میدان محشر میں رسوائی اور شفاعت سے محرومی ہے۔ بِيَدِكَ الْخَيْرُ۔ اس میں اعزاز سے بھی زیادہ عموم ہے یعنی ہر قسم خیر منافع فائدے دینا امن دینا تمام حاجتوں کی تکمیل اس میں شامل ہے اور اصل تصرف یہ ہے کہ اپنے ہاتھ سے کیا جائے اس لیے لفظ یَد ذکر کیا ہے۔ یَد کا حقیقی ظاہری معنی مراد ہے بغیر کسی تمثیل، تحریف و تشبیہ کے ہے۔ (سوال) اَلْخَيْرُ کو ذکر کیا اور شر کو نظر انداز کیا؟ (جواب ۱) اس کو اکتفاء کہتے ہیں کہ ایک چیز کو ذکر کیا جائے اور مقابل کو چھوڑا جائے۔ (جواب ۲) قضاء اور تقدیر خیر کیلئے اصل ہے اور شر کیلئے بالواسطہ اور عارضی ہے۔ (جواب ۳) اس قسم کے مقامات میں شر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا بے ادبی ہے دنیا میں مطلق شر نہیں ہے بلکہ مطلق خیر ہے یا شر اور خیر مخلوط ہے مگر غالب خیر ہے۔ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ یہ سابقہ سے عام ہے اور سابقہ اس میں داخل ہے اور ہر خیر و شر کی جزئیات اور اجزاء اس میں شامل ہیں یہ ماقبل کیلئے علت اور دلیل ہے اس لیے عطف نہیں کیا ہے۔

تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ ۖ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۖ وَتَرْزُقُ مَن تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٢٧﴾ "تو داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور تو داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور تو نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور تو نکالتا ہے مردے کو زندہ سے اور تو ہی رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بے حساب" [27]۔

تفسیر 27: اس آیت میں تصرفات عملیہ کا ذکر ہے سابقہ آیت میں امور معقولیہ معنویہ کا ذکر تھا جبکہ اس آیت میں امور محسوسہ کا ذکر ہے۔ تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ یعنی رات سے کچھ حصہ کو گھٹا کر دن میں داخل کر لیتا ہے جس سے دن طویل ہو جاتا ہے اس طرح رات کو بڑھاتا ہے اور اسی طرح اس کے برعکس۔ اس میں اشارہ ہے کہ کبھی کفر و شرک کے اندھیروں کو توحید و ایمان کی روشنی سے ختم کرتا ہے تو کبھی کفر و شرک کے اندھیروں سے توحید و ایمان کی روشنی کو مٹا دیتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے اندھیرے ختم ہوئے اس لیے اس کیفیت کو مقدم کیا ہے۔ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ۔ وَلَجٌ کا معنی داخل کرنا ہے جس کا مقابل اخراج ہے تو اس میں ربط تقابل کا ہے۔ یہ عام ہے بہت حالتیں اس میں شامل ہیں۔ (۱) حیوان کو نطفہ سے نکالنا اور اس کے برعکس جیسا کہ كُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ (۲)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مرغی کو انڈے سے نکالنا اور برعکس انڈے کو مرغی سے نکالنا۔ (۳) مومن کو کافر سے اور اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنٰهُ اور کافر کو مومن سے۔ (۴) پودے کو بنجر زمین سے اور بیج کو زمین سے اور بیج کو ہرے بھرے پودے سے۔ (۵) عالم سے جاہل اور جاہل سے عالم پیدا کرنا۔ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ سابقہ حالات ایجاد کرنے سے متعلق تھے اور اب حالات تربیت کا ذکر ہے کیونکہ تربیت رزق پر بنتی ہے اور چوتھے معنی میں اخراج رزق دینے کے لیے سبب ہے جس کی تفسیر سورۃ بقرہ آیت ۲۱۲ میں گزری ہے۔ فائدہ: پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی سات صفات فعلیہ کا ذکر ہے دوسری میں پانچ کا ذکر ہے اس میں اشارہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام میں ان صفات میں سے کوئی نہیں تو وہ الٰہ کیونکر ہو سکتا ہے؟۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝ "مومن مومنوں (کو چھوڑ کر) کافروں کو دوست نہ بنائیں جو کوئی ایسا کریگا تو اللہ تعالیٰ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوگا مگر یہ کہ تم ان کے (شر سے) بچنا چاہو بچاؤ اور تمہیں اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے" [28]۔

تفسیر 28: ربط ۱: سابقہ آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم ذکر کی گئی جو ایک مسلمان پر فرض ہے اور وہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے تو اب بندوں کے ساتھ تعلق کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم سے جو لوگ منکر ہیں وہ مومنین کے دشمن ہیں۔ ربط ۲: سابقہ عنوان میں نصاریٰ اور مشرکین کا رد کیا گیا تو اب ان کی دوستی سے منع کیا جا رہا ہے۔ لَا يَتَّخِذِ یہ نہی ہے اور دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے مفعول اول الْكَافِرِيْنَ اور مفعول ثانی أَوْلِيَاءَ ہے۔ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ یہ فاعل سے حال بن رہا ہے، اور دُوْنَ تَجَاوُزٍ کے معنی میں ہے یعنی مُتَجَاوِزٌ مِنْ وَلَايَةِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِلَى الْكَافِرِيْنَ اِسْتِقْلَالًا وَ اِشْتِرَاكًا یعنی مومنین کی دوستی سے تجاوز کرتے ہوئے کافروں سے دوستی قائم کرتے ہیں یا دونوں سے دوستی کرتے ہیں مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ میں اشارہ ہے کہ جب مومنین موجود ہیں تو کافروں سے دوستی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

کافروں سے موالات تین قسم کے ہیں (۱) کافروں کے کفر پر راضی ہو کر ان کے کفریہ کاموں میں ان کے ساتھ شرکت بھی کرے اور ان کے کفر کو بھی اچھا سمجھے اور کفر کی وجہ سے ان سے دوستی کرے تو یہ یقینی کفر ہے۔ جب کوئی مومن ایسا جرم کریں تو وہ مرتد ہو جاتا ہے۔ (۲) کفر و شرک میں ان کی مدد کرے ان کے لیے اسباب فراہم کرے اور ساتھ یہ عقیدہ بھی رکھے کہ ان کا یہ دین باطل ہے یہ عقیدہ بھی رکھتے ہوں کہ یہ کفر و شرک ہے اس طرح کرنا باطل ہے۔ یہ کفر نہیں مگر حرام ہونے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے ساتھ ساتھ کفر تک بندے کو پہنچا دیتا ہے۔(۳) کفار اور مشرکین کی عزت کرے ان کے ساتھ میل جول رکھے اور عزت کے طور پر ان کو سلام و قیام کریں تو یہ کام بھی گناہ اور ممنوع ہے۔ امام آلوسی نے فرمایا ہے کہ ہر وہ کام جو عرف میں تعظیم کے لیے استعمال ہوتا ہو یا مسلمانوں کے نزدیک دوستی اور محبت میں شمار ہو یہ کمزوری مسلمانوں کے دلوں میں شکوک پیدا کرتی ہے اور ان کی طرف مسلمانوں کے میلان کا ذریعہ ہے جو کہ منع ہے۔ ملا علی قاری نے مرقاۃ میں لکھا ہے کہ اہل ذمہ کی تعظیم کے لیے کھڑا ہونا اور مجلس میں ان کو برتری دینا (یعنی صدر مجلس و جاسہ) بنانا گناہ ہے۔ اس آیت میں مذکورہ تینوں قسمیں داخل ہیں اگرچہ ان کے مراتب میں فرق ہے۔ ابن عاشور نے آٹھ اقسام بیان کی ہیں اس آیت کا مضمون سورۃ آل عمران آیت ۱۱۸، سورۃ مائدہ آیت ۵۱، سورۃ مجادلہ آیت ۲۲، سورۃ ممتحنہ آیت ۱ میں ذکر ہے۔ سوال: مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ دلالت کرتی ہے کہ مسلمانوں اور کافروں دونوں سے تعلق رکھنا درست ہے۔؟ جواب: جب دُوْنِ کا معنی تجاوز یعنی نظر انداز کرنے سے کیا جائے تو یہ احتمال ساقط ہو گیا۔ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اس میں کافروں سے دوستی نہ رکھنے پر تاکید ہے اور اصل میں کلام اس طرح ہے مِنْ وَلَايَةِ اللّٰهِ وَمِنْ دِيْنِهٖ وَمِنْ حِزْبِهٖ. فِيْ شَيْءٍ یہ لَيْسَ کیلئے خبر ہے اور مِنَ اللّٰهِ حال کی جگہ واقع ہے اور اس جملہ میں اللہ تعالیٰ کی دوستی کی نفی ہے ان لوگوں سے جو کافروں یعنی اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہیں۔ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً یہ استثناء مفرغ ہے جس کا مفعول لہ مقدر ہے یعنی کافروں سے دوستی کسی بھی وجہ سے جائز نہیں ہے مگر یہ کہ تم ان سے شر و فساد سے بچنے کیلئے قول و فعل سے دوستی کرو مگر دل کی نہیں۔ تُقٰىةً میں تین قول ہیں (۱) یہ مصدر و مفعول مطلق ہے اِتِّقَاءً کے معنی میں (۲) یہ مفعول بہ ہے اور تَتَّقُوْا. تَخَافُوْا کے معنی میں ہے اور تُقٰىةً مصدر ہے اُس چیز کے معنی میں ہے جس سے ڈرا جائے۔ (۳) یہ حال مؤکدہ کی بناء پر منصوب ہے یہ جمع ہے یعنی اس حال میں کہ تم ڈرنے والے ہو بہتر معنی یہ ہے کہ ڈرتے رہو (ان کافروں) سے ڈرنا یا جان بچاتے ہوئے ان سے بچانا یعنی جب کسی مؤمن کو کافر گھیر لیتے ہیں جبکہ وہ تنہا ہو تو اگر وہ کسی کفر و شرک کے عمل پر اس کو مجبور کرے تو قتل کے خوف سے ایسا عمل کرنا جائز ہے یہ رخصت ہے عزیمت نہیں اور قرآن مجید کی اس آیت کی مصداق ہے اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ سورۃ نحل آیت ۱۰۶۔ فائدہ ۱: تقیہ۔ یعنی دشمنوں سے نفس عزت و مال کی حفاظت کرنا یہ دو قسم پر ہے۔ (۱) اپنے آپ کو دینی دشمنوں سے بچانا (۲) مال، جائیداد اور کسی دنیاوی منصب کی وجہ سے دشمن ہو (سیاست وغیرہ۔) پہلے کا شرعی حکم یہ ہے کہ اگر مؤمن کسی علاقہ میں اپنے دین کا اظہار قولاً اور عملاً نہیں کر سکتا تو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پھر اس پر اپنے دین کی حفاظت کیلئے ہجرت فرض ہے۔ اور اگر شرعی عذر موجود ہو جیسے خواتین، ضعیف مرد یا معذور بچے وغیرہ جو ہجرت کرنے سے قاصر ہوں اور دین کے اظہار پر غالب گمان یہ ہو کہ اس کو قتل کرتے یا اولاد کو قتل تے یا اس پر کھانا پینا بند کرنے کا اندیشہ ہو تو پھر ایسی صورتحال میں رہنا اور دین کو چھپائے رکھنا درست ہے البتہ ہجرت کی کوشش کریگا اگرچہ حیلے بہانے سے کیوں نہ ہو۔ اگر دشمنوں سے عارضی تکلیفیں پہنچنے کا خوف ہو یعنی کچھ عرصہ کیلئے جیل میں ڈال دیا جائے تھوڑی بہت مار پیٹ تو پھر ایسی کیفیت میں خاموش رہنا اور موافقت کرنا درست نہیں ہے۔ یہ صرف جواز کی صورت ہے ورنہ عزیمت (بہتری) تو اس میں ہے کہ کسی بھی صورت اپنے دین کو نہ چھوڑا جائے اگرچہ قتل ہو جائے جو کہ مرتبہ شہادت ہے اور دوسری قسم کے حکم شرعی میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے ہجرت کو لازم قرار دیا ہے آیت کے اس حکم پر کہ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ: بعض علماء کا قول ہے کہ اگر دینی نقصان نہ ہو تو پھر ہجرت لازم نہیں ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ اگر جان اولاد اور مال کا خوف ہو تو ہجرت لازم ہے۔ البتہ یہ دنیاوی غرض ہے صرف جان و مال اور اولاد بچانے پر اجر نہیں ہے البتہ حالات جواز میں نرم گفتگو سے ان کو خوش رکھنے کیلئے ہدیہ پیش کرنا ان کے سامنے خوشی کا اظہار کرنا بلکہ مدارات میں سے ہے جو بطور تقیہ کے جائز ہے کیونکہ یہ موالات نہیں۔ امام آلوسی نے اس کے جواز میں بہت سی روایات اور آیتوں کو جمع کیا ہے۔

فائدہ ۲: تقیہ کے متعلق خوارج اور اہل تشیع کے متضاد مذاہب ہیں۔ خوارج کے نزدیک کسی بھی صورت میں تقیہ جائز نہیں مال، جان، دین، عزت سب کیلئے کوئی رعایت نہیں ہے۔ خوارج کا قول ہے کہ ایک شخص اگر نماز پڑھتا ہے کوئی چور اس کا مال لے جاتا ہے تو اس کیلئے نماز چھوڑ کر مال کا دفاع جائز نہیں ہے۔ اس کی مزید مثالیں بھی ہیں اہل تشیع کے نزدیک مال جان نفس کے خوف کی وجہ سے تقیہ واجب ہے۔ ان کے نزدیک ایک شخص تقیہ کرتے ہوئے اہل سنت کی عبادتوں میں شریک ہو یعنی روزہ زکوۃ حج وغیرہ میں اگرچہ ان کے نزدیک ان کی نمازیں عبادتیں باطل ہیں۔ نیز ان کی کتب میں مذکور ہے کہ جس نے تقیہ کرتے ہوئے سنی کے پیچھے نماز ادا کی گویا اس نے نبی کے پیچھے نماز ادا کی بلکہ ان کے نزدیک معمولی خوف کے وقت بھی اظہار کفر واجب ہے اور انکا بڑا مقصد اس میں خلافت راشدہ کو باطل کرنا ہے یعنی خلافت صدیق اکبر عمر فاروق، عثمان غنی رضی اللہ عنہم اجمعین۔ اس کی تفصیل ان کی کتابوں میں موجود ہے اور انکے تقیہ کا خلاصہ منافقت ہے جبکہ ان کی کتب میں سے نہج البلاغۃ شرح دراوندی میں تقیہ کے رد پر نصوص موجود ہیں۔ امام آلوسی نے اس مقام پر اسکی تفصیلی بحث کی ہے۔ وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ یہاں پر مضاف مقدر ہے۔ عِقَابَ نَفْسِهِ یعنی اگر تم کافروں سے دوستی کرتے رہو اور دیگر ممنوع کاموں سے باز نہیں آؤ گے تو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تمہیں اللہ تعالیٰ اپنے عذاب سے ڈراتا ہے اور نَفْسَهٗ میں سخت عذاب کی طرف اشارہ ہے۔ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ میں عذاب کی وہ شدت نہیں جو نَفْسَهٗ میں ہے اور لفظ نفس کا اطلاق اللہ تعالیٰ کے لیے حقیقی بلا کسی تشبیہ و تمثیل اور تاویل ہے لہٰذا امام آلوسی نے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے۔ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ سابقہ جملہ میں تخویف دنیاوی جبکہ اس جملہ میں تخویف اخروی ہے۔

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾ ”فرما دیجیے اگر تم چھپاؤ جو تمہارے سینوں میں ہے یا تم اس کو ظاہر کرو اس کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ تو جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب کو جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے“ [29]۔

تفسیر 29: اس آیت میں کافروں سے ظاہری اور خفیہ ہر طرح سے دوستی کرنے پر زجر ہے۔ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ (مَا) عام ہے جس میں کافروں سے موالات بھی داخل ہے۔ صدور سے مراد دل ہیں۔ ذکر محل ہے لیکن مراد حال ہے اور سورۃ الناس آیت ۵ میں ہے کہ دل سینہ میں ہے۔ اَوْ تُبْدُوْهُ تقیہ اور غیر تقیہ دونوں کو شامل ہے۔ اِخْفَاء کو اس لیے مقدم کیا ہے کہ دل میں ان سے موالات دوستی تو ہر حال میں حرام ہے جبکہ ابداء تقیہ کرتے ہوئے جائز ہے جس کا ذکر گزر گیا ہے یعنی بعض اوقات جائز ہے۔ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ اللہ تعالیٰ کا علم جزاء دینے سے کنایہ ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ چھپانے میں کوئی فائدہ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز چھپ نہیں سکتی ہے۔ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ اس کو يَعْلَمْهُ پر عطف نہیں کیا اس لیے کہ یہ مستقل کلام ہے اور یہ ماقبل کیلئے دلیل ہے اور یہ خاص کے بعد عام کا ذکر ہے۔ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ یہ بھی ڈرانے کیلئے ہے اللہ تعالیٰ کا کامل علم و قدرت بہت سے آیتوں میں مذکور ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم اور قدرت ایک ساتھ ہے۔ اس میں اس وہم کو ختم کیا گیا ہے کہ اگر کوئی بے وقوف یہ گمان کرے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر عالم تو ہے مگر ہو سکتا ہے اس کو قدرت حاصل نہ ہو تو جواب ہوا کہ اس کی قدرت بھی کامل اور عام ہے۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚۖ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْۗءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾ ”جس دن ہر نفس حاضر پائے گا جو کچھ اس نے عمل کیا ہے اچھائی میں سے ہو یا برائی سے تو آرزو کریگا کاش کہ میری اور اس برائی کے درمیان بہت دوری ہوتی اور تمہیں اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر شفقت کرنے والا ہے“ [30]۔

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

تفسیر 30: کفار سے دوستی کرنے والوں کیلئے اس میں تخویف اخروی ہے یَوْمَ اس میں اقوال ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ یہ قدیر کے ساتھ متعلق ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ کے متعلق ہے اور عذاب یومٍ مضاف مقدر ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ بعد میں آنے والے مذکور ہے تَوَدُّ کے ساتھ متعلق ہے چونکہ قیامت کے دن اعمال کی حاضری اہم بات ہے اس لیئے اس کو مقدم کیا ہے۔ مفسر زمخشری وغیرہ نے اس قول کو بہتر قرار دیا ہے۔ تَجِدُ وجدان سے ہے ایک مفعول کی طرف متعدی ہے جو کہ مَا عَمِلَتْ ہے اور مُحْضَرًا حال ہے۔ یا تَجِدُ علم کے معنی میں ہے جو دو مفعول چاہتا ہے لہٰذا مُحْضَرًا مفعول ثانی ہے لیکن پہلی توجیہ بہتر ہے۔ مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ اس میں دو احتمالات ہیں۔ (۱) نفس عمل مراد ہے (۲) یا اس کی جزاء مراد ہے۔ مُحْضَرًا اس کے دو معانی ہیں۔ (۱) ان کے اعمال نامہ میں لکھا ہوا ہوگا۔ (۲) مکمل ہوگا کسی قسم کی کمی نہیں ہوگی۔ وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْءٍ اس میں دو احتمال ہیں (۱) یہ سابقہ کلام مَا عَمِلَتْ پر عطف ہے اور مُحْضَرًا یہاں پر مقدر ہے اور یہ سورۃ زلزال کے موافق ہے۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ. (۲) یہ ابتدائی کلام ہے یعنی مبتداء ہے سُوْءٍ عام ہے کافروں سے دوستی بھی اس میں شامل ہے۔ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًا بَعِيْدًا اس میں دو احتمال ہیں (۱) یہ مَا عَمِلَتْ کیلئے خبر ہے (۲) یہ ابتداء سے کلام ہے۔ تَوَدُّ تمنیٰ کے معنی میں ہے اور لَوْ بھی تمنیٰ کیلئے ہے بَيْنَهَا میں ضمیر نفس کی طرف راجع ہے۔ بَيْنَهٗ کی ضمیر میں دو احتمال ہیں۔ (۱) یہ مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْءٍ کی طرف راجع ہے اور وہ مبتداء ہے۔ (۲) یہ یوم کی طرف راجع ہے اور مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْءٍ سابقہ پر عطف ہے تو ضمیر کی ضرورت نہیں رہی۔ اَمَدًا ۔ امام راغب نے فرمایا کہ اَمَدًا اور اَبَدًا معنی میں ایک دوسرے کے قریب ہے البتہ اَبَدًا زمانے کی وہ حد ہے جس کی مقدار معلوم نہ ہو اور اَمَدًا وہ مدت ہے جس کی حد مجہول ہے۔ بعید أطویل مدت مراد ہے یعنی لمبا عرصہ۔ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ پہلے کافروں سے موالات دوستی سے ڈرانا تھا اب اعمال سوء سے ڈرنا ہے۔ یا پھر صرف عمل پر ڈرانے کا ذکر تھا تو اب يَوْمَ الْقِيَامَةِ کی وعید ہے وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ اس میں تمام بندے مراد ہیں اور اللہ تعالیٰ کی شفقت عام ہے۔ ایمان والوں کو برے اعمال اور اس کی سزا سے بچاتا ہے اور کافروں کو دنیا میں مہلت دیتا ہے توبہ کیلئے مواقع دیتا ہے یا پھر العباد سے مراد خاص بندے ہیں جن کو دنیا میں اللہ گناہوں سے ڈراتا ہے یہ شفقت ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے تاکہ وہ گناہوں سے دنیا میں بچ جائیں اور آخرت میں بہت زیادہ بدلہ پا جائے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾ "کہہ دیجئے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو تو اللہ تم سے محبت کریگا اور تمہارے گناہ بھی بخش دیگا اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے" [31]۔

تفسیر 31: ربط (۱) اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے دوستی سے منع اور اس پر وعید کا ذکر ہوا تو اب ترغیب دی جارہی ہے اور اللہ تعالیٰ سے محبت اور اس کا ذریعہ وطریقہ بتایا جارہا ہے۔ ربط (۲) اللہ تعالیٰ کا رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ذکر کیا گیا تو اب رأفت اور محبت کے حصول کیلئے ذریعہ بتایا جاتا ہے۔ ربط (۳) پہلے جب نجران کے نصاریٰ کا رد کیا گیا تو انہوں نے کہا جو طریقہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اپنایا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا ذریعہ محبت ہے تو اس آیت میں جواب ہوا قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ: امام غزالی نے کہا ہے کہ حب عبارت ہے طبیعت کے میلان سے کسی ایسی چیز کی طرف جو لذت دیتی ہو پھر اگر وہ دل میں پختہ ہوجائے تو اس کو عشق کہا جاتا ہے۔ تو حب محسوسات کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ وہ معانی اور صفات جو عقل سے معلوم ہوتی ہوں وران کے علم سے اور ذکر سے لذت حاصل ہوتی ہو تو اس کو بھی حب کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کی حقیقی محبت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اور اس میں تاویل کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت کرنے سے کنایہ ہے۔ اس میں مضاف کے حذف سے معنیٰ کیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت وثواب۔ ازہری کا قول ہے کہ بندے کا اللہ ورسول سے محبت ان کی اطاعت ہے۔ ابوحیان کا قول ہے کہ بندے کی محبت اللہ تعالیٰ سے ان چیزوں کی طرف دل کا میلان ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور اس کو دکھائی ہیں اور اس کی بندگی اخلاص کے ساتھ کرلی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ بندے کا اللہ تعالیٰ سے محبت کا معنیٰ یہ ہے کہ دل سے اس سے محبت کرے اور یہ محبت اطاعت کے ساتھ مربوط ہے بقول وراق۔

تَعْصِي الْاِلٰهَ وَاَنْتَ تُظْهِرُ حُبَّهٗ ـــــ هٰذَا لَعَمْرِيْ فِي الْقِيَاسِ بَدِيْعُ

لَوْ كَانَ حُبُّكَ صَادِقًا لَاَطَعْتَهٗ ـــــ اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ يُّحِبُّ مُطِيْعُ

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہو حالانکہ اس سے محبت کا اظہار بھی کرتے ہو۔ حلفیہ کہتا ہوں کہ یہ عقل سے بعید ہے اگر تیری محبت سچی ہوتی تو اس کی اطاعت کرتے۔ یقیناً محبت کرنے والا جس سے محبت کرتا ہے اس کی اطاعت کرتا ہے۔

فَاتَّبِعُوْنِيْ جب اللہ تعالیٰ سے محبت کا طریقہ اور اس کی رضاء اطاعت اور عبادت میں منحصر ہے اور عبادت کا طریقہ عقل

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے معلوم نہیں ہوتا ہے رسول کی اطاعت سے ہی معلوم ہوتا ہے اس لیئے اللہ تعالیٰ کی محبت کو رسول کی اطاعت میں حصر کیا ہے اور اتباع کسی کے عمل میں پیروی کرنا ہے تو اس میں بہت سارے گمراہ فرقوں کا رد ہے کہ وہ اتباع رسول کے بغیر محبت کے دعوے کرتے ہیں۔ (۱) یہاں سب سے پہلے مشرکین کا رد ہے کہ انہوں نے کہا: مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ (سورۃ زمر آیت ۳)۔ یعنی عبادت میں شرک کرتے ہیں اور دعویٰ یہ ہے کہ یہ ہمارے لئے رب کی عدالت میں وسیلہ ہے۔ ان کا رد ہے کہ وسیلہ شرعیہ تو رسولوں کی اطاعت ہے۔ (۲) منکرین حدیث کا رد ہے ان کا کہنا ہے کہ ہم صرف قرآن کریم کی اطاعت پر مکلف ہیں۔ تو ان کا رد اس طرح ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر عمل کو نبی کریم ﷺ کی اطاعت سے مشروط کیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت کے لئے نبی کی پیروی کو شرط قرار دیا ہے اور اتباع اعمال میں ہوتی ہے جبکہ اعمال تو حدیث سے معلوم ہوتے ہیں۔ (3) صوفیوں پیروں کا رد ہے جو گمراہ ہیں جن کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ تک رسائی شریعت سے نہیں بلکہ طریقت سے ہوتی ہے۔ ان کا بھی اس آیت میں رد ہے کہ اتباع کے بغیر محبت الٰہی حاصل نہیں ہوسکتی ہے اور شریعت تو رسول اکرم کی اتباع ہی کو کہا جاتا ہے کسی اور طریقت کو نہیں۔ (4) مبتدعین پیروں اور مولویوں کا رد ہے وہ عبادات بدعات کے طریقے پر بجالاتے ہیں جیسے پیر ذکر کیلئے حلقے لگاتے ہیں اور اپنے اوپر وجد لاتے ہیں اور رقص و سرود کہتے ہیں اور اس کو تقرب الی اللہ کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ مبتدعین مولوی عملی بدعات کرتے ہیں یعنی قضا عمری، حیلہ اسقاط، اجتماعی دعائیں یعنی فرض نماز و سنتوں اور جنازوں کے بعد اجتماعی دعائیں کرتے ہیں اور اس کو ذریعہ ثواب بھی قرار دیتے ہیں جبکہ اجر و ثواب سنت کی پیروی میں منحصر ہے۔ فائدہ: اس آیت کی تشریح میں مفسرین نے نبی کریم ﷺ کے پیروی کی بارے میں انتہائی اچھے کلمات درج کیئے ہیں۔ (۱) جو رسول اکرم ﷺ کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے اور عمل اس کی سنت کے خلاف کرتا ہے وہ شخص بڑا جھوٹا ہے اللہ تعالیٰ کی کتاب اس کے جھوٹے ہونے پر گواہ ہے۔ تفسیر مدارک وکشاف۔ (۲) امام ابن کثیر نے لکھا ہے کہ یہ آیت حاکم ہے اس شخص پر جو اللہ تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے اور سنت پر اس کی زندگی استوار نہیں ہے۔ اس وقت تک یہ اپنے اس دعوے میں جھوٹا ہے جب تک اپنی زندگی کو سنت پر استوار نہ کرے اور شریعت محمدی ﷺ کا مکمل پابند نہ ہو جائے اور اپنے تمام اقوال و افعال میں اس سے روگردانی نہ کرے۔ (۳) خطیب شربینی نے لکھا ہے کہ جب تم کسی کو دیکھو کہ وہ رب کریم کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے لیکن اس دعویٰ کے باوجود تالیاں بجاتا ہے اور سیٹیاں مارتا ہے تو اس شخص کو اللہ تعالیٰ کا تعارف حاصل نہیں ہے اور نہ ہی وہ یہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کیا چیز ہے۔ يُحْبِبْكُمُ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اَللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ اس میں وضاحت کی جارہی ہے کہ اتباع رسول میں دو اہم فائدے ہیں (۱) اللہ تعالیٰ کی محبت اور پیار (۲) گناہوں کی بخشش یعنی جب انسان اتباع رسول پر گامزن ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا محب بنتا ہے اور محبوبیت ربانی عظیم مرتبہ ہے۔ ایسے بندے کو حبیب اللہ کا لقب ملتا ہے۔ محبت اللہ تعالیٰ کی حقیقی صفت ہے جو بغیر تشبیہ تمثیل تحریف تاویل کے اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت ہے۔ ذُنُوبَ میں چھوٹے بڑے سب گناہ داخل ہیں۔ اتباع رسول کی بعض اقسام پر بڑے اور بعض پر چھوٹے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ یہ سابقہ جملہ کیلئے لَفّ نَشرِ غَیرِ مُرَتَّب کے ساتھ تاکید اور علت ہے۔ غفوریت کی صفت سے گناہوں کو معاف کیا اور رحیمیت کی صفت سے بندوں سے محبت کرلی۔

قُلْ أَطِيعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُولَ ۖ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِينَ ﴿٣٢﴾

”کہہ دیجئے تم اللہ اور رسول کی اطاعت کرو پھر اگر وہ منہ پھیر لیں تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت نہیں کرتا“ [32]۔

تفسیر 32: بقول مفسرین کے یہ منافقین کے سوال کا جواب ہے منافقین نے کہا کہ یہ نبی چاہتا ہے کہ انہیں بھی عیسیٰ علیہ السلام کی طرح معبود بنائیں جائے تو جواب دیا گیا کہ ان کی اطاعت فرض ہے اللہ تعالیٰ کے اطاعت کی ضمن میں الوہیت کے طور پر نہیں بلکہ بطور رسالت کے۔ سوال: اتباع میں صرف نبی کا ذکر ہوا ہے جبکہ اطاعت میں اللہ و رسول دونوں کا ذکر ہے۔ جواب: اتباع تو عمل میں اقتداء کرتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی عملی اقتداء نہیں ہوسکتی ہے وہ رسول کے ساتھ مختص ہے اور اطاعت اکثر قول میں ہوتا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کا قول قرآن مجید ہے اور رسول کا قول احادیث ہیں ان دونوں کا ذکر سورۃ طٰہٰ آیت ۹۰ میں ہے۔ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ. تَوَلَّوْا فعل ماضی یا مضارع ہے (ت) کو حذف کیا گیا ہے اور تولّی سے مراد اللہ و رسول سے کلی اعراض ہے یعنی مکمل منہ پھیرنے کے معنی میں ہے اور یہ حقیقی کفر ہے۔ فَإِنَّ اللّٰهَ کو فَإِنَّهُ کی جگہ ذکر کیا ہے اور الْكَافِرِينَ کو هُمْ کی جگہ ذکر کیا ہے۔ اس میں اہمت تاکید ہے البتہ اگر یہ اعراض فروعی مسائل میں بغیر انکار ہو تو پھر کفر حقیقی نہیں ہے یہاں پر لفظ کَافِرِيْنَ میں وفد نجران کا سخت رد ہے کیونکہ وہ کافر تھے۔

إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرٰهِيمَ وَآلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِينَ ﴿٣٣﴾ ”بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام، نوح ابراہیم اور آل عمران علیہم السلام کو جہان والوں میں سے چن لیا ہے اور ان میں سے بعض بعضوں کی اولاد ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب سننے جاننے والا ہے“ [33]۔

تفسیر 33: ربط ۱: سابقہ آیتوں میں نصاریٰ کا رد کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں اور حکم الٰہی یعنی اطاعت

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

رسول سے گریزاں ہیں جو کہ باطل طریقہ ہے تو اب ان کے عقائد کا تفصیلی رد ہو رہا ہے ان کا عقیدہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام الٰہ اور ابن اللہ ہے۔ رد اسطرح کیا گیا ہے کہ وہ اولاد بشر میں سے ہے جس کی ابتداء آدم علیہ السلام سے ہوتی ہے اور اس وقت آل عمران تک پہنچ گئے تھے ان کی والدہ عمران کی بیٹی تھی اور عیسیٰ علیہ السلام اپنی والدہ مریم سے پیدا ہوئے ہیں لہٰذا یہ سب اللہ تعالیٰ کے عاجز بندے تھے تو عیسیٰ علیہ السلام کس طرح الٰہ یا ابن اللہ ہو سکتا ہے۔ ربط ۲: سابقہ آیت میں نبی آخر الزمان ﷺ کی اطاعت کی فرضیت ذکر ہوئی تو اب سابقہ انبیاء کے اپنے اپنے دور میں اطاعت کی فرضیت ذکر ہو رہی ہے کہ وہ بھی اپنے دور میں اطاعت کیلئے منتخب تھے لہٰذا یہ کوئی نیا مسئلہ نہیں قدیم مسئلہ ہے۔ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى یہ صَفْوٌ سے لیا گیا ہے میل کچیل سے خالی کرنے کو کہا جاتا ہے اصطفیٰ کا معنیٰ ہے کسی چیز کو ہر قسم کے میل سے پاک کرنا اور اختیار کا معنیٰ ہے ترجیح دینا اور اجتبار کا معنیٰ انتخاب کرنا۔ بندوں کا اِصْطِفٰی یا تو پیدائش سے ہوتا ہے کہ کوئی میل عقیدہ و عمل کا اس میں نہ ہو اور کبھی عمل پر ہوتا ہے اگرچہ ابتداء سے نہ ہو قرآن مجید میں اصطفاء سات طریقوں سے ۱۳ مقامات میں آیا ہے۔

(۱) پہلا طریقہ دین کا ہے سورۃ بقرہ آیت ۱۳۲۔ (۲) انبیاء علیہم السلام کا ہے جو اس آیت میں ہے سورۃ نحل آیت ۵۹، سورۃ اعراف آیت ۱۴۴، سورۃ بقرہ آیت ۱۳۰، سورۃ ص آیت ۴۷۔ (۳) مریم کا انتخاب سورۃ آل عمران آیت ۴۲۔ (۴) چوتھا طالوت کا انتخاب سورۃ بقرہ آیت ۲۴۷۔ (۵) قرآن والوں کا انتخاب سورۃ فاطر آیت ۳۲۔ (۶) ملائکہ کا انتخاب سورۃ حج آیت ۷۵۔ (۷) برتری کی صورت میں سورۃ صافات آیت ۱۵۳۔ ہر جگہ اصطفاء اس مقام کی مناسبت سے ہے یہاں نبوت کے انتخاب کا ذکر ہے اور ہر نبی کی الگ الگ خصوصیات ہیں۔ اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ یہ چاروں نبوت کے چناؤ یعنی اصطفاء میں شریک ہیں۔ امام قرطبی نے لکھا ہے کہ ان میں ہر ایک کی اصطفاء پانچ پانچ طریقوں سے ہے۔ (۱) آدم علیہ السلام کا اس طرح ہے کہ (۱) اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے ہاتھ سے بنایا (۲) انہیں اسماء کی تعلیم دی (۳) ملائکہ نے انہیں کو سجدہ کیا (۴) جنت میں بسایا (۵) انسانوں کا باپ بنایا۔ نوح علیہ السلام کا اصطفاء اس طرح ہے کہ (۱) ساری انسانیت کو غرق کرنے کے بعد صرف ان کی اولاد سے دنیا کو بھر دیا جس کی وجہ سے یہ آدم ثانی بنا (۲) طویل عمر سے نوازا (۳) مومنوں کیلئے اس کی دعاء خیر اور کافروں کیلئے بددعا قبول فرمائی (۴) اپنے اہل سمیت کشتی میں بچایا (۵) ان کی شریعت میں بعض احکام کی منسوخیت شروع ہوئی مثلاً بہن، پھوپھی، خالہ سے نکاح کی حرمت ان کی شریعت میں ہوئی۔ ابراہیم علیہ السلام کا اصطفاء ان پانچ طریقوں سے ہیں (۱) انبیاء کے باپ ہونے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کا شرف دیا کیونکہ ان کے بعد جتنے انبیاء آئے ان کی اولاد میں آئے۔ (۲) اللہ تعالیٰ نے خلیل بنایا۔ (۳) دشمنوں کی آگ سے بچایا۔ (۴) لوگوں کیلئے امام بنایا (۵) کلمات کے امتحان میں کامیاب کیا۔ آل عمران کا اصطفاء یہ ہے کہ (۱) ان کی بیوی سے بچے کی نذر دین کی آبیاری کیلئے قبول کی۔ (۲) انہیں مریم جیسی بیٹی جو مردوں سے افضل تھی عطا کی (۳) بغیر کسی مرد کی قربت کے اللہ تعالیٰ نے مریم کو بیٹا دیا۔ (۴) عیسیٰ علیہ السلام کو بڑے بڑے معجزات سے نوازا (۵) ابھی تک اس کو آسمان پر زندہ رکھا ہے۔ آلَ إِبْرَاهِيمَ سے مراد اسماعیل، اسحاق، یعقوب علیہم السلام اور ان کے اسباط اور آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور آل عمران سے مریم اور عیسیٰ علیہما السلام مراد ہے اور عمران کے نام سے معروف دو بندے تھے ایک تو موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے والد جبکہ دوسرے مریم علیہا السلام کے والد۔ یہاں آخری مراد ہے اور بقول بعض مفسرین کے ان دونوں کے درمیان ۱۸۰۰ سال کا فاصلہ ہے۔ عَلَى الْعَالَمِينَ اس سے مراد دیگر مخلوقات کے علاوہ تمام انس و جن تھا۔ ملائکہ کی فضیلت کے بارے میں اختلاف ہے۔

ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٣٤﴾ "نسلاً بعض بعضوں سے پیدا ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب ہر چیز کو سنتا ہے اور ہر چیز پر عالم ہے" [34]۔

تفسیر 34: ذُرِّيَّةً اس میں بھی دو احتمال ہیں یہ آدم علیہ السلام اور اس کی معطوفات میں سے عطف ہے ذُرِّيَّةً کا اطلاق آباء پر بھی ہوتا ہے یہ مفسرین کی ایک جماعت کا قول ہے یا پھر بدل ہے نوح سے اور بعد کی معطوفات میں سے ہے یہ ابو البقاء کا قول ہے۔ یا آل سے بدل ہے یہ زمخشری کا قول ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ آدم سے بدل ہے آدم علیہ السلام سے حال ہے یہ امام راغب کا قول ہے کہ ذُرِّيَّةً کا اطلاق واحد، جمع، اصل، نسل سب پر ہو سکتا ہے اور عورت کو ذراری کہا جاتا ہے اور جرجانی کا قول ہے کہ یہ ذرأ سے لیا گیا ہے والد کو ذرء اس لیئے کہا گیا ہے کہ اولاد اس سے پھیلی ہے۔ بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ اس میں مِن اتصال کیلئے ہے یعنی بعض بعضوں کے ساتھ منسلک ہیں یعنی نبوت میں قرابت میں توحید میں اخلاص میں۔ معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام قرابت ذریت انسانوں اور نبیوں کے ساتھ رکھتا ہے لہٰذا وہ انسان ہے الٰہ اور ابن اللہ نہیں ہے۔ وَاللَّهُ سَمِيعٌ سننے والا ہے بندوں کے اقوال کو اور خصوصاً سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہود و نصاریٰ کے متضاد اقوال کو۔ عَلِيمٌ وہ بندوں کی نیتوں پر عالم ہے خصوصاً یہود و نصاریٰ کے مختلف عقائد پر جو انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق گھڑے ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّىْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِىْ بَطْنِىْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّىْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۵﴾

"جب عمران علیہ السلام کی بیوی نے کہا اے میرے رب بلاشبہ میں نے تیرے لئے نذر مانی ہے جو میرے پیٹ میں ہے آزاد کیا ہوا ہے (دین کے لئے) لہذا مجھ سے قبول فرما یقیناً تو خوب سننے اور جاننے والا ہے" [35]۔

تفسیر 35: ربط: آل عمران کے انتخاب کا اجمالی ذکر ہو گیا ہے جبکہ نصاریٰ آل عمران کی عبادت کرتے تھے لہذا اب اس کی عبدیت و بندگی کا ذکر ہو رہا ہے پہلے مریم علیہا السلام کا تفصیلی ذکر ہوگا پھر عیسیٰ علیہ السلام کا تفصیلی ذکر، جس میں واضح دلیل ہے کہ یہ الٰہ نہیں تھے۔ اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ امام اخفش اور مبرد کے نزدیک اِذْ سے قبل اَلَمْ تَرَ کا لفظ مخفی ہے جو کہ اِذْ میں عامل ہے۔ عمران سے مراد عمران بن ماثان ہے جو مریم علیہ السلام کا والد ہے اور ان کی بیوی حنہ نام سے مشہور تھی، اور حنہ فاقوذا کی بیٹی ہے اور زکریا علیہ السلام نے اس کی بہن سے نکاح کیا تھا جس کا نام ایشاع بنت فاقوذا ہے لہذا یحییٰ علیہ السلام اور مریم علیہا السلام خالہ زاد بہن بھائی ہیں۔ جیسا کہ امام حاکم نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے۔ سوال معراج کی صحیح حدیث موجود ہے (صحیح بخاری فی بدء الخلق والانبیاء حدیث 3207، 3887، صحیح مسلم فی الایمان حدیث 164، 265، ترمذی کتاب التفسیر حدیث 3346) کہ دوسرے آسمان پر عیسیٰ اور یحییٰ علیہما السلام کو نبی اکرم ﷺ نے دیکھا اور وہ دونوں خالہ زاد بھائی تھے جبکہ سابقہ تاریخ تو اس حدیث کے خلاف ہے۔ جواب (۱) اعتبار حدیث کا ہے تاریخ کا نہیں خصوصاً جب تاریخ حدیث کے خلاف ہو۔ جواب (۲) اس حدیث میں مجازی معنیٰ ہے کیونکہ مریم علیہا السلام یحییٰ علیہ السلام کی خالہ کی بیٹی ہے اور عیسیٰ علیہ السلام یحییٰ علیہ السلام کے خالہ کی بیٹی کا بیٹا ہے لیکن مجازاً خالہ کی بیٹی کا بیٹا بھی خالہ کا بیٹا کہلاتا ہے۔ جواب (۳) امام آلوسیؒ نے لکھا ہے کہ ایشاع حنہ کی اخیافی بہن تھی یعنی ماں شریک بہن تھی والد سوتیلا تھا اور مریم علیہا السلام کی باپ شریک بہن تھی۔ یعنی عمران علیہ السلام نے پہلا نکاح حنہ کی والدہ سے کیا تو ایشاع پیدا ہوئی پھر حنہ سے نکاح کیا جو کہ سوتیلی بیٹی تھی اور ان کی شریعت میں یہ نکاح جائز تھا پھر اس سے مریم پیدا ہوئی۔ اس طریقے سے دونوں روایتوں میں تطبیق ہو جائے گی۔ رَبِّ اِنِّىْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِىْ بَطْنِىْ مُحَرَّرًا یہ واقعہ آل عمران کی عبدیت کی دلیل ہے اس لیئے لفظ رب ذکر کیا ہے اور نذر میں لفظ اللہ کو مختص کرنا دلیل ہے کہ ان کی شریعت میں بھی غیر اللہ کی نذر ناجائز تھی۔ یہ بھی نصاریٰ کا رد ہے کیونکہ وہ (غیر اللہ) عیسیٰ علیہ السلام کے نام پر نذریں دیتے ہیں۔ نذر کا معنیٰ یہ ہے کہ انسان اپنے اوپر وہ کام لازم کرے جو اس کے ذمے نہیں ہے خواہ مشروط یا غیر مشروط ہو۔ مَا فِىْ بَطْنِىْ یہ دلیل ہے کہ اس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وقت یہ عمران علیہ السلام سے حاملہ ہوئی تھی اور اتفاقاً وہ فوت ہوا تھا۔ مُحَرَّرًا اس کے ارادے کی وجہ سے انہوں نے مذکر صیغہ استعمال کیا اس لیئے کہ ان کا ارادہ تھا کہ لڑکا نذر کرونگی تاکہ بیت المقدس کی خدمت کرے اور اس وقت نذر کیلئے لڑکے منتخب ہوتے تھے اور لڑکیوں کی نذر مسجد کی خدمت کیلئے مناسب نہیں تھی اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے بیٹے کی طلب دلی سکون یا دنیاوی مقصد کیلئے نہیں کی تھی کیونکہ عمران کی وفات کے بعد دین کی خدمت کیلئے ان کے گھرانہ میں کوئی نہیں تھا اس لیئے انہوں نے لڑکا طلب کیا۔ (سوال) اولاد تو ان کی ملکیت نہیں ہے تو پھر حدیث کے مطابق تو یہ نذر درست نہیں ہوئی۔ جیسا کہ لَا نَذْرَ رَقَبَةً لَا يَمْلِكُ ابْنُ آدَمَ (ابوداؤد 3313، ترمذی 1181، احمد 2/190، سلسلة الصحيحة 2184) (جواب ۱) ان کی شریعت میں اس قسم کی نذر جائز تھی کہ بیت المقدس اور دین کی خدمت کیلئے بیٹوں کو نذر کرتے اور ملکیت رقبی اس میں شرط نہیں تھی۔ (جواب ۲) یا مراد حکما ہے یعنی اس زمانہ میں اگر کسی نے اولاد کے متعلق نذر مانی ہو کہ اولاد کو دین کیلئے وقف کرونگا پھر اتفاقاً وہ اولاد بالغ ہو کر دین کی خدمت میں مصروف ہو جائے مُحَرَّرًا دنیا کی مصروفیات سے بالکل آزاد یا خالص بیت المقدس کی خدمت کیلئے وقف ہو۔ یعنی تعلیم بھی درسگاہ میں حاصل کرے گا اور مدرسین کی خدمت بھی کرے گا کیونکہ بیت المقدس دین کی درسگاہ تھی۔ فَتَقَبَّلْ مِنِّي تَقَبَّلْ کا معنی کسی چیز کو رضا کے طور پر قبول کر لینا۔ اس میں اشارہ ہے کہ نیک بندے عمل صالح بھی کرتے ہیں اور اس کی قبولیت کے محتاج بھی ہیں۔ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ میری عاجزی انکساری دعاء و آواز کو سنتا ہے اور میری نیت پر علیم ہے اور یہ صفات آخر میں ذکر کرنا قبولیت دعاء کیلئے وسیلہ ہے۔

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝ "پھر جب اس نے جنا تو کہا اے میرے رب وہ تو میں نے لڑکی جنی ہے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو اس نے جنا اور نہیں تھا وہ لڑکا (جو اس نے طلب کیا تھا) مانند اس لڑکی کے (جو انہیں کو دی گئی) اور بے شک میں نے اس کا نام مریم رکھا اور میں اس کے لیے اور اس کی اولاد کے لئے تیری پناہ مانگتی ہوں شیطان مردود سے" [36]۔

تفسیر 36: فَلَمَّا وَضَعَتْهَا (ھا) ضمیر معنی کے اعتبار سے لفظ (ما) کی طرف راجع ہے۔ یا پھر نسمۃ یا نفس یا مولودۃ کے اعتبار سے راجع ہے اور یہ مفسرین کے اقوال کا خلاصہ ہے۔ قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ یہ جملہ خبریہ اخبار کیلئے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نہیں بلکہ یہ جملہ مقصد حاصل نہ ہونے کی وجہ سے حسرت وافسوس کے لئے ہے، یا بطور عذر ہے ایسی اولاد کی پیدائش پر جو بیت المقدس کی خدمت کی صلاحیت نہیں رکھتی ہو۔ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ اس قراءت میں یہ صیغہ مؤنث غائب کا ہے لہٰذا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جملہ معترضہ ہے اور اس میں اشارہ اس بچی کی قدر ومنزلت کی طرف اور اشارہ ہے کہ اس بچی کی شان بہت اعلیٰ ہے کہ یہ اور اس کا بیٹا عالمین کیلئے آیۃ عظیم الشان نشانی ہوگی جبکہ ان کی والدہ کو یہ بات معلوم نہیں تھی لہٰذا انہیں تسلی اور اطمینان دیا گیا۔ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ یہ بھی جملہ معترضہ ہے سابقہ جملہ کی طرح ہے اور اس میں ان کی قدر ومنزلت کا ذکر ہے جیسا کہ سابقہ کلام میں گزر گیا ہے ذَكَرٌ اور أُنْثَىٰ میں الف لام عہدی ہے یعنی وہ نر اولاد جو اس عورت نے طلب کی تھی وہ نہیں ہے اس لڑکی کی طرح جو انہیں کو دی گئی ہے بلکہ وہ لڑکی اس سے شان کے اعتبار سے بہت بڑی ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ کلام اس خاتون کا ہے کہ انہوں نے لڑکی جننے پر افسوس کیا یعنی لڑکی تو لڑکے جیسا نہیں ہوسکتا ہے، لڑکا جس کمال سے مسجد کی خدمت کرسکتا ہے ویسے لڑکی نہیں کرسکتی لیکن اس توجیہ میں قلب مکان لازم آرہا ہے۔ یعنی لَيْسَتِ الْأُنْثَىٰ كَالذَّكَرِ لیکن یہ توجیہ ضعیف ہے وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ یہ إِنِّي وَضَعْتُهَا پر عطف ہے اور درمیان میں دو جملے معترضہ ہیں۔ صاحب اللباب کا قول ہے کہ یہ دلیل ہے کہ عمران فوت ہوگیا تھا ورنہ عادتاً اکثر نام رکھنا والد کا کام ہے۔ امام قرطبی اور دیگر مفسرین کا قول ہے کہ ان کی زبان میں مریم عابدہ کو کہا جاتا تھا۔ ابن کثیر نے کہا ہے کہ یہ دلیل ہے کہ ولادت والے دن ہی بچے کا نام رکھنا چاہئے ساتویں دن سے تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ. یہ واضح دلیل ہے کہ آل عمران شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ کے محتاج ہیں اور خصوصاً عیسیٰ علیہ السلام جو کہ اسکا بیٹا ہے۔ یہ نصاریٰ کا واضح رد ہے۔ نیز اس دعاء میں ضمناً مریم علیہا السلام کی طویل عمر اور اولاد کی پیدائش کی دعاء ہے۔ الرَّجِيمِ پتھروں سے مارنے کو رجم کہا جاتا ہے اور اس میں گالی گلوچ لعنت وغیرہ شامل ہے اس میں لعنت شیطان پر مراد ہے۔ شیطان سے ابلیس اور اس کی تمام سرکش اولاد مراد ہے۔ بخاری ومسلم کی روایت جو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ہر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو شیطان اس کو مس طعن کرتا ہے (صحیح بخاری کتاب التفسیر آل عمران حدیث 4548، صحیح مسلم حدیث 2658 باب القدر) جس سے وہ چیخ اٹھتا ہے سوائے مریم اور اس کے بیٹے عیسیٰ علیہما السلام کے پھر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت کی۔ سوال: اس میں تو عیسیٰ اور مریم علیہما السلام کی فضیلت ہمارے نبی پر ثابت ہوتی ہے۔ (جواب ۱) اس کو فضیلت جزوی کہا جاتا ہے جبکہ فضیلت کلی تو سارے انبیاء پر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حاصل ہے۔ (جواب ۴) عام نصوص جو ہمارے نبی کی فضیلت میں ہیں اس کے ضمن میں یہ بھی شامل ہے۔ سوال ۴: معتزلہ کا قول ہے کہ یہ مجاز پر محمول ہے اور مَسّ الشیطان سے گمراہ کرنے پر قدرت مراد ہے۔ جواب: جب تک حقیقی معنیٰ مراد لینا ممکن ہو تو مجاز کی طرف جانا جائز نہیں ہے جبکہ یہاں پر حقیقت ممکن ہے۔ امام قرطبی کا قول ہے کہ نَخْسٌ اور طَعْنٌ سے اضلال اور اغوا برائے گمراہی لازم نہیں آتی ہے۔ سوال: اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ نَخْسٌ اور طَعْنٌ پیدائش کے بعد متصل تھا لیکن مریم اور عیسیٰ علیہما السلام اس دعاء کی وجہ سے بچ گئے جب کہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مریم پیدا ہوئی اور نام رکھ دیا گیا پھر اس کیلئے یہ دعاء مانگی لہٰذا اس کا بچنا اس دعاء کے سبب سے نہیں ہوا کیونکہ سبب سے مسبب بعد میں ہوتا ہے۔ جواب ۱: امام آلوسی نے کہا ہے کہ اُعِیذُ استمرار کیلئے ہے استقبال کیلئے نہیں ہے البتہ زمانہ ماضی بھی اس میں شامل ہے۔ جواب ۲: مسببات شرعیہ میں مسبباب کا اسباب سے پہلے ہونا جائز ہے۔ اس کے علاوہ بھی محدثین نے دیگر جوابات تحریر کیے ہیں۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَّاَنۡۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيۡهَا زَكَرِيَّا الۡمِحۡرَابَ ۙ وَجَدَ عِنۡدَهَا رِزۡقًا ۚ قَالَ يٰمَرۡيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتۡ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرۡزُقُ مَنۡ يَّشَآءُ بِغَيۡرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

"پھر قبول کیا اس کے رب نے اچھی قبولیت کے ساتھ اور اس کی پرورش کی تو اچھی پرورش کے ساتھ، اور اس نے اس کا کفیل زکریا علیہ السلام کو بنایا جب بھی داخل ہوتے اس کے پاس عبادت خانے میں تو پاتے اس کے پاس کچھ کھانے کی چیزیں تو انہوں نے کہا اے مریم تیرے پاس یہ کہاں سے آئی ہیں اس نے کہا اللہ تعالیٰ کے پاس سے آئی ہیں اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے بغیر حساب کے رزق دیتا ہے" (37)

تفسیر 37: یہ سابقہ دعاء پر (تفریع) تشریح ہے معلوم ہوا کہ دعاء جلد قبول ہوئی اور یہ ان کی کرامات میں سے ہے، فَتَقَبَّلَهَا یہ مجرد (قَبِلَ) کے معنی میں ہے لیکن تفعّل کا صیغہ فاعل کے اس فعل کے اہتمام کی دلیل ہے کہ انہوں نے اس دعاء کی طلب میں بہت ہی اہتمام کیا ہے اور اس میں دیگر لوگوں کی بنسبت اظہار قبولیت کی طرف اشارہ ہے اور قبولیت کا معنیٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس لڑکی پر راضی ہو بجائے اس لڑکے کے جو وہ مانگ رہی تھی۔ صاحب اللباب اور قرطبی نے فرمایا کہ نیک لوگوں کے راستے پر چلایا اور حسن بصریؒ کا قول ہے کہ رات دن میں کسی بھی وقت اس کو تکلیف نہیں دی۔ سوال: بِقَبُولٍ حَسَنٍ کی جگہ یوں کیوں نہیں فرمایا بِتَقَبُّلٍ حَسَنٍ؟ جواب: تَقَبُّلٍ میں ایک مبالغہ تو ہے اور دوسرا تکلف کا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

معنی ہے جب کہ قَبُولٍ حَسَنٍ میں تَكَلُّف کا معنی نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کیلئے کوئی کام مشکل نہیں۔بِقَبُولٍ حَسَنٍ اس میں (با) زائد ہے یعنی قَبُولاً ہے یا (با) اصلی ہے اور قبول نام ہے اس چیز کا جس کے ذریعے دوسری چیز کو قبول کیا جاتا ہے۔وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا اس میں بہت سے اقوال ہیں پہلا قول یہ ہے کہ ایک دن میں اس طرح بڑی ہوتی نشوونما پاتی جتنی باقی بچے سال میں پاتے ہیں۔دوسرا قول یہ ہے کہ ان کے بدن کو بغیر کمی زیادتی کے برابر کیا۔تیسرا قول یہ ہے کہ اس کے خلق اور خلق میں بہتر پرورش کی یعنی اطاعت عفت میں اس کو پروان چڑھایا اور ان کی اس طرح عجیب پرورش میں اشارہ ہے کہ ان پر آنے والے احوال بھی خلاف عادت ہوں گے۔وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا کفالہ حقیقت میں کسی کے ضامن بن جانے کو کہا جاتا ہے اور پیوست کرنے ملانے اور لینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔اس کفالت میں بھی مریم علیہا السلام کی فضیلت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ نبی کی تربیت و محبت میں بہترین تربیت کے نتائج آسکتے ہیں اور آیت ۴۴ میں اس کا طریقہ ذکر ہے۔نیز واؤ ترتیب کے لئے نہیں ہے کیونکہ انبات اور کفالت ایک ساتھ ہوئی ہے۔زکریا علیہ السلام اس وقت نبی تھے،اور ان کی اہلیہ مریم کی پھوپھی یا بہن ہے لیکن پہلا قول بہتر ہے جیسا کہ پہلے گزر گیا ہے۔كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ:الْمِحْرَابَ یہ مفعول فیہ یا مفعول بہ ہے۔محراب میں مختلف اقوال ہیں:ابوعبیدہ کا قول ہے کہ اشرف مجالس مراد ہیں۔ابن علاء کا قول ہے کہ (قصر) بنگلہ کو کہا جاتا ہے۔اصمعی کا قول ہے کہ بالا خانے کو کہا جاتا ہے۔مبرد کا قول ہے کہ وہ جگہ جہاں سیڑھی سے چڑھا جاتا ہے۔ابن عاشور نے کہا کہ وہ عبادت خانہ جو خلوت کی عبادت کیلئے بنایا جاتا ہے اور یہ مسجد کے علاوہ ہوتا ہے اور اکثر بلندی پر بنایا جاتا ہے جیسا کہ سورۃ سبا،آیت ۱۳ میں ہے۔بعض نے کہا ہے کہ یہ حرب سے ہے یعنی یہ عبادت گاہ شیطان سے جنگ کرنے کی جگہ ہے اس سے مراد یہ محرابیں نہیں جو مساجد میں بنائی جاتی ہیں۔یہ تو ولید ابن عبد الملک اور عمر بن عبد العزیز کے زمانہ خلافت میں مسجد نبوی میں پہلی مرتبہ تعمیر کی گئی تھی۔مفسر آلوسی نے لکھا ہے کہ ائمہ کرام کی ایک جماعت نے ان محرابوں میں نماز کو مکروہ قرار دیا ہے اور اس بارے میں علی رضی اللہ عنہ اور ابراہیم نخعی کا بھی یہ فتویٰ ہے جس کو مصنف ابن ابی شیبہ نے نقل کیا ہے کہ یہ ان بدعات میں سے ہے جو صحابہ کے ابتدائی دور میں نہیں تھیں۔ابو موسیٰ جہنی رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت خیر پر ہوگی جب تک نصاریٰ کے مذابح کی طرح مساجد میں مذابح نہیں بنائے گی اور ابن ابی الجعد کی روایت میں ہے کہ صحابہ کرام کہا کرتے تھے کہ قیامت کی علامات میں یہ بھی ہے کہ مساجد میں مذابح بن جائیں گے۔ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نے فرمایا کہ ان مذابح سے اپنے آپ کو بچاؤ ان روایات میں مذابح سے مراد محاریب ہیں (صحیح الجامع الصغیر 120 الفر المستطاب ص 478)۔ اس باب میں بہت سی روایات ہیں۔ امام سیوطی نے اس پر مستقل رسالہ لکھا ہے۔ ان روایات کی صحت وضعف کا مجھے علم نہیں۔ البتہ بہتر قول میرے نزدیک یہ ہے کہ یہ محاریب بدعت للدین یعنی فی الوسائل ہے اور جبکہ نصوص کے ذریعے بدعت فی الدین حرام ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ محراب دین میں داخل نہیں ہے لیکن اس کے ذریعے قبلہ کی سمت، مسجد کی سنٹر یعنی وسط معلوم ہوتا ہے۔ لہذا قبلہ کی سمت صف کا درمیان معلوم کرنا دین ہے۔ لہذا یہ محراب بنانا بدعت للدین ہوا فی الدین نہیں۔ البتہ اس کو اگر کوئی دین کا حصہ بنائے اور اس پر بے ضرورت اسراف کے طور پر رقم لگائے جیسا کہ ہمارے اس دور میں ہورہا ہے تو پھر یہ گناہ ہے اور امام کا محراب میں کھڑا ہونا لازم قرار دیا جائے تو پھر یہ بدعت ہے اور اس آیت سے معروف محرابوں کے بنانے کیلئے استدلال کرنا جہل ہے۔ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا۔ رزقاً نکرہ ہے جس کے دو سبب ہیں۔ پہلا سبب یہ ہے سردی کے موسم میں ان کے پاس گرمی کا رزق (پھل) ہوتا تھا۔ دوسرا سبب ابو حیان نے ذکر کیا ہے کہ مریم کے کمرے میں آنے کیلئے کوئی راستہ نہیں تھا سوائے اس راستہ کے جو زکریا علیہ السلام کے آنے جانے کا تھا لہذا جب نہ کوئی اور راستہ نہ ہی کوئی لانے والا ہو تو یہ تعجب والی بات تھی۔ قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّى لَكِ هَذَا: انّٰی یعنی کہاں سے یا کس کیفیت سے یہ رزق تیرے پاس پہنچا ہے۔ یہ انبیاء سے علم غیب کی نفی کی دلیل ہے کیونکہ ظاہری اسباب نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے پوچھا، قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وہ کہنے لگی اس کا ظاہری سبب مجھے معلوم نہیں اور جب کسی چیز کا ظاہری سبب معلوم نہ ہو تو نیک لوگ اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور یہ قول بہتر ہے۔ سوال: زکریا علیہ السلام تو ہر صورت میں سیدنا مریم سے علم اور مرتبہ میں افضل ہے انہیں یہ جواب کیوں معلوم نہیں تھا؟۔ جواب: زکریا علیہ السلام کا تعجب ظاہری اسباب کے نہ ہونے پر تھا، اور مریم علیہا السلام نے ظاہری اسباب پر علم نہ ہونے کی وجہ سے نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی ہے چنانچہ جس کو ظاہری اسباب معلوم نہ ہوں وہ اللہ تعالیٰ کا حوالہ دیتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مریم کے پاس زکریا علیہا السلام سے زیادہ علم تھا۔ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ اس میں دو احتمال ہیں (۱) پہلا احتمال یہ ہے کہ یہ مریم علیہا السلام کا قول ہے اور یہ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ کیلئے تاکید ہے۔ (۲) دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے جو کہ عموم کیلئے ہے بغیر حساب کا معنیٰ ہے يَرْزُقُهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ یعنی ایسے طریقے سے رزق دینا ہے جو اس کے گمان میں بھی نہ ہو۔ فائدہ ۱: اس آیت کے تحت مفسر ابو حیان، آلوسی، صاحب اللباب، ابن کثیر، خطیب

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

شربینی اور دیگر مفسرین نے لکھا ہے کہ اس میں کرامات اولیاء کے ثبوت کی دلیل ہے کہ بغیر اسباب کے خرق عادت کے طور پر مریم کو رزق عطا کیا گیا، اور کسی چیز کا وجود میں آنا عادت سے خلاف طریقے پر اصطلاح شریعت میں اولیاء کرام کے لئے کرامت ہے۔ صاحب اللباب نے بطور استدلال پانچ طریقے درج کیے ہیں ان میں مشہور طریقہ یہ ہے کہ جب یہ خرق عادت کام یا تو زکریا علیہ السلام کا معجزہ ہو سکتا ہے یا مریم علیہا السلام کی کرامت لیکن اس کا معجزہ ہونا نہیں انہیں اس کا علم نہیں تھا اس لئے تو فرمایا کہ اَنّٰی لَكِ هٰذَا تو معلوم ہوا کہ یہ مریم علیہا السلام کی کرامت ہے اور خرق عادت طریقے پر یحییٰ وعیسیٰ علیہما السلام کی پیدائش کیلئے مقدمہ ہے۔ چونکہ معتزلہ کرامات کے منکر ہیں اس لیئے صاحب اللباب نے اس مقام پر ان کے شبہات کے جوابات دیئے ہیں۔ فائدہ ۲: اہل سنت والجماعت کے نزدیک کرامات اولیاء حق ہیں اس لیئے کہ یہ نصوص قرآن کریم واحادیث صحیحہ سے ثابت ہیں۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ کوئی خلاف عادت کام کسی ایسے انسان کے ہاتھ سے صادر ہو جو اللہ کا ولی ہو، اور ولایت کا وہ معنی مراد ہوگا جو سورۃ یونس آیت ۶۳ میں مذکور ہے اور اس کی حکمت شرح فقہ اکبر میں شیخ سہروردی سے منقول ہے کہ ایسے کاموں کی وجہ سے اس کا اللہ تعالیٰ پر یقین بڑھ جاتا ہے اور اس میں دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ اور خواہشات سے اجتناب میں اضافہ ہوتا ہے کرامت کے متعلق بطور عقیدہ کے مندرجہ ذیل چند امور شرط ہے۔ (۱) اس شخص پر شرعی امور میں کوئی الزام واعتراض ثابت نہ ہو۔ یعنی متقی پرہیز گار ایمان والا شخص ہو کیونکہ اس قسم خرق عادت کام بے دین شخص سے بھی بطور جادو یا بطور استدراج ثابت ہوتے ہیں اس کو کرامت نہیں کہا جا سکتا ہے۔ خطیب شربینی نے سورۃ یونس کی تفسیر میں لکھا ہے کہ فَكُلُّ مَنْ كَانَ لِلشَّرْعِ عَلَيْهِ اِعْتِرَاضٌ فَهُوَ مَغْرُوْرٌ مُخَادِعٌ یعنی ہر وہ شخص جس پر شریعت کا اعتراض ہو وہ مغرور دھوکا باز شخص ہے۔ (۲) کرامات میں اختیار ولی کا نہیں ہوتا اس میں اختیار اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے البتہ اس ولی کے اعزاز کیلئے اللہ تعالیٰ اپنے فضل کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ فتوح الغیب میں عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ نے اور فتاوی رشیدیہ اور دیگر کتب میں لکھا ہے۔ اس پر نصوص قرآن میں بھی مذکور ہیں بلکہ کرامت ولی کو معلوم بھی نہیں ہوتی جیسا کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کھانے میں اضافے کا واقعہ کرامات میں سے ہے (صحیح بخاری فی الصلوۃ حدیث 601، صحیح مسلم فی الاطعمۃ حدیث 2057، ابو داؤد فی الایمان والنذور حدیث 3270) جس کے تحت امام نووی نے یہ تشریح کی ہے اس کی مثال اس خط کی ہے جو قلم سے صادر ہوتا ہے لیکن قلم کا اس میں اختیار نہیں ہوتا یعنی فاعل کاتب ہوتا ہے۔ (۳) ولی اللہ اس کو چھپانے کی کوشش کریگا اس سے کبھی لوگ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دھوکے میں مبتلا نہ ہو جائیں جیسا کہ امام ابن قیم نے مدارج السالکین جلد ۳ ص ۴۰۵ میں اور ملا علی قاری نے مرقات شرح مشکوۃ ج ۱ ص ۲۷۰ میں لکھا ہے۔ یَجِبُ عَلَى الْوَلِيِّ اِخْفَاءُ كَرَامَةِ ولی پر کرامت کو مخفی رکھنا لازم ہے۔ (۴) الوہیت کے کام کو ولی کی کرامت قرار دینا جائز نہیں اس لیئے شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ لَا كَرَامَةَ لِي اَنْ اَكُوْنَ فِي شَيْءٍ مِنْ تَدْبِيْرِهٖ وَ تَعَارِيْفِهٖ۔ الفتح الربانی ص ۱۵۸۔ میری ایسی کوئی کرامت نہیں جس سے میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ تصرفات و تدبیرات میں شریک ہو جاؤں۔ (۵) جو امور ولی کی وفات کے بعد ظاہر ہو جائیں تو وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور حفاظت ہیں جیسا کہ عاصم رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے دشمنوں سے بچایا اور نجاشی کی قبر میں روشنی کا نظر آنا اس کو مجازاً کرامات کہا گیا ہے۔ اس مسئلے میں کچھ تفصیل میں نے العبیان میں لکھی ہے وہاں ملاحظہ کیجیے۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾

"اس وجہ سے زکریا علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا مانگی فرمایا اے میرے رب مجھے اپنی طرف سے پاک اولاد عطا فرما یقیناً تو ہی دعا سننے والا ہے" [38]۔

تفسیر 38: یہاں سے زکریا علیہ السلام کا واقعہ ذکر ہو رہا ہے اور اس واقعہ میں بڑا مقصد زکریا علیہ السلام کی عبدیت (بندہ ہونا) ثابت کرنا ہے کہ وہ اگرچہ نبی تھے مگر وہ اللہ تعالیٰ کے محتاج بندوں میں سے تھے اس لیئے کہ اس نے اولاد اللہ تعالیٰ سے طلب کی اور اس میں نصاریٰ کا رد ہے ان کا خیال تھا کہ زکریا علیہ السلام نے مریم کی کفالت کی ہے لہٰذا ہو سکتا ہے اس عمل کے سبب اس میں صفت الوہیت پیدا ہوئی ہو جبکہ دیگر مشرکین کا باطل عقیدہ یہ ہے کہ عبادت و ریاضت سے صفات الوہیت حاصل ہوتی ہیں، جس کو ان کی زبان میں فنافی اللہ "وحدت الوجود" کہتے ہیں جبکہ یہ باطل عقیدہ ہے۔ هُنَالِكَ یہ لفظ کبھی مکان کیلئے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ. دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا کبھی زمانے کیلئے مستعمل ہوتا ہے هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ یہاں پر دونوں معنی صحیح ہے۔ یعنی وہ جگہ جہاں زکریا علیہ السلام کی محراب تھی اور وہاں مریم کی تربیت کرتے تھے جس کیلئے بعد والی آیت دلیل ہے۔ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ یا اس وقت جب مریم کے پاس رزق دیکھا۔ امام سیوطی نے اتقان میں لکھا ہے کہ اس جگہ هُنَالِكَ مِنْ ثَمَّ کے معنی میں ہے (اس وجہ سے) امام ابو حیان اور بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ دعا کیلئے بندے کو چاہئے کہ مبارک جگہ اور وقت کا انتخاب کرے، جیسا کہ ملتزم مقام ابراہیم اور دیگر مقامات یا اوقات میں سے رات کا آخری حصہ فرض نماز کے بعد، روزہ کھولتے وقت وغیرہ لیکن مکان و زمان

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کیلئے دلیل شرعی ضروری ہے۔ سوال: قبر پرستوں نے اس واقعہ سے دلیل لی ہے کہ زکریا علیہ السلام نے مریم کے دربار میں دعا طلب کی تو قبول ہوئی لہٰذا بزرگوں کی قبروں کے پاس دعائیں اچھے طریقے سے قبول ہوتی ہیں؟؟ جواب: یہ استدلال جہل پر قائم ہے اس لیئے کہ یہ دربار زکریا علیہ السلام کا تھا مریم تو اس کی تربیت کے تحت پرورش پا رہی تھی لہٰذا یہ دربار ومحراب مریم کا نہیں بلکہ زکریا علیہ السلام کی عبادت گاہ تھی، نیز صریح نصوص سے ثابت ہے کہ انبیاء کرام کے درجات اولیاء کرام کے درجات سے اعلیٰ ہیں۔ (تنبیہ) عام مفسرین نے لکھا ہے کہ جب زکریا علیہ السلام نے بے موسم پھل مریم علیہا السلام کے پاس پالیے تو اس وقت ان کی توجہ پیدا ہوئی کہ اللہ تو بے موسم اولاد بھی دے سکتا ہے۔ اس وجہ سے دعا مانگی۔ اس توجیہ پر سوال ہوتا ہے کہ زکریا علیہ السلام پہلے سے قدرت الٰہی پر عالم تھا تو کیوں دعا نہیں مانگی؟۔

جواب ۱: علم تھا مگر مشاہدے سے علم اور بڑھ گیا اور مشاہدہ مریم علیہا السلام کے پاس بے موسم رزق کا پالینا تھا جو اس دعا کی توجہ کیلئے سبب بنا۔ جواب ۲: بہتر بات یہ ہے کہ صرف بے موسم رزق کی وجہ سے دعا نہیں مانگی بلکہ زکریا علیہ السلام ضعیف ہو گئے تھے، اور عمران کی بھی نر اولاد پیدا نہیں ہوئے، تو زکریا علیہ السلام کو تشویش ہوئی کہ دین الٰہی کی دعوت وتبلیغ کا کام ہمارے بعد کون کرے گا اس لئے دعا کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے اور یہ توجیہ تین وجوہات سے بہتر ہے۔ (۱) پہلی وجہ یہ ہے کہ سورۃ مریم آیت نمبر ۶ میں ضرورت کا ذکر موجود ہے۔ یَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ اور مفسرین کا اتفاق ہے کہ مراد دین کی وراثت ہے۔ (۲) دوسری توجیہ یہ ہے کہ بے موسم رزق دیکھنے سے نر اولاد طلب کرنے کی کوئی خاص مناسبت نہیں ہے انسان کی اور بھی ضروریات ہیں پھر وہ کیوں طلب نہیں کیں۔ (۳) تیسری توجیہ امام سیوطی نے لکھی ہے کہ هُنَالِكَ مِنْ ثَمَّ کے معنی میں ہے یعنی سابقہ حالات کی وجہ سے اور ان حالات میں مریم کی پیدائش بھی ہے جو اولاد عمران میں پیدا ہوئی یعنی لڑکی پیدا ہوئی اور دعوت دین کیلئے مکمل صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔ دَعَا زَكَرِيَّا قَالَ رَبِّ هَبْ لِي بعد والا جملہ سابقہ جملے کی تشریح ہے۔ دعا اور ہبہ یعنی بخشش اس جگہ استعمال ہوتا ہے جہاں پر مانگنے والے کے پاس دینے کیلئے کچھ بھی نہ ہو اور یہ انتہائی عاجزی کی دلیل ہے مِن لَّدُنكَ یعنی خالص تیری قدرت سے ہوگا یہ هِبَہ کیلئے تاکید ہے یعنی والدین کی جانب سے عادتی اسباب بھی نہیں ہیں کیونکہ وہ دونوں عمر ولادت سے نکل گئے ہیں۔ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً لفظ ذُرِّيَّةً اسم جنس ہے ایک اور زیادہ سب کیلئے استعمال ہوتا ہے اور وَلِيًّا کے قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ولد مراد ہے جیسا کہ سورۃ مریم میں ہے۔ لفظ ذریت میں اس بچے کے بہت فائدوں کی طرف اشارہ ہے۔ طَيِّبَةً بقول امام قرطبی،

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

صالح اور مبارک اور سالم دین اور سالم بدن والا۔ ابوحیان نے فرمایا کہ دین میں مرتبہ نبوت تک پہنچنے والا اور سورۃ مریم آیت ۶ میں لفظ رَضِيًّا اس کی دلیل ہے۔ إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ۔ یہ تخصیص دعا کیلئے علت اور دلیل ہے اور اللہ تعالیٰ کے نام سے دعا کرنا قبولیت کیلئے وسیلہ ہے۔ سَمِيعُ یہاں قبولیت کے معنی میں ہے۔ ابوحیان نے فرمایا کہ زکریا علیہ السلام کی یہ دعا سورۃ مریم میں طویل ہے اور سورۃ انبیاء میں اختصار کے ساتھ ہے اور یہاں درمیانی ہے۔

فَنَادَتْهُ الْمَلَٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَىٰ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّٰلِحِينَ ﴿٣٩﴾ "تو ملائکہ نے ان کو آواز دی جب کہ وہ حجرے میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے یقیناً تجھے اللہ تعالیٰ یحییٰ کی خوشخبری دے رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کلمہ (عیسیٰ) کی تصدیق کرنے والا ہوگا نفس پر بہت ضبط کرنے والا سردار نبی ہوگا اور صالحین میں سے ہوگا" [39]۔

تفسیر 39: اس آیت میں زکریا علیہ السلام کی دعا کی قبولیت کا ذکر ہے جبکہ سورۃ انبیاء آیت ۹۰ میں قبولیت کی تعبیر کا ذکر ہے جو نوح ایوب اور یونس علیہم السلام کے واقعات میں یہ تعبیر ذکر ہوئی ہے اور سورۃ مریم آیت ۷ میں صرف نداء کی تفسیر مذکور تھا، کیونکہ وہاں زکریا علیہ السلام کی خفی دعا کا ذکر تھا تو اللہ تعالیٰ نے بہت ہی اخفاء کیا یعنی نداء کو حذف کیا گیا چونکہ اس واقعہ کو ذکر کرنے میں یہ پہلی سورۃ ہے اس لیئے یہاں پر ملائکہ کی نداء، تعبیر اور دونوں کی تفسیر ذکر کی ہے۔ فَنَادَتْهُ الْمَلَٰٓئِكَةُ اس سے مراد جنس ملائکہ ہے یعنی جبرائیل علیہ السلام اور اس کے مطیع دیگر ملائک جو اس کے ساتھ تھے ان کی وجہ سے جمع ذکر کیا گیا اور جنس کے اعتبار سے سورۃ مریم میں مفرد ذکر کیا ہے اور نداء (ن) کے زیر یا پیش کے ساتھ اس بلند آواز کو کہا جاتا ہے جو یا تو فریاد یا خوشخبری کیلئے ہو۔ وَهُوَ قَآئِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ: صلوۃ میں دو احتمال ہیں۔ (۱) نماز کے معنی میں ہے اور دلیل ہے کہ نمازی کو بوقت ضرورت آواز دی جاسکتی ہے۔ (۲) یا دعا کے معنی میں ہے تو یہ دلیل ہے کہ کھڑے ہو کر دعا کرنا جائز ہے اور یہ دلیل ہے کہ عبادت گاہ میں دعا کرنی چاہیے باقی محراب کا معنی گزرا ہے۔ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَىٰ یہ نداء کی تفسیر ہے اور اسکا نام اللہ تعالیٰ نے تجویز کیا ہے۔ مفسرین کے بقول پانچ نبیوں کے نام اللہ تعالیٰ نے خود رکھے ہیں یعنی یحییٰ، عیسیٰ، اسحاق، یعقوب، محمد علیہم السلام۔ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللَّهِ کلمہ سے مراد تورات، انجیل اور دیگر کتب ہیں جو ان سے قبل نازل ہوئی ہیں۔ کلمہ سے جمع مراد ہے یا اس سے عیسیٰ علیہ السلام مراد ہے اور انہیں کلمہ اس لیئے کہا گیا ہے کہ اس کو باپ کے بغیر کلمہ کن سے پیدا کیا گیا ہے یا کلمہ سے مراد مریم علیہا السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عیسیٰ علیہ السلام کی خوشخبری ہے یحییٰ علیہ السلام نے اس بشارت اور عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کی ہے جو نصاریٰ کی انجیل میں اب بھی مذکور ہے۔ وَسَيِّدًا اس لفظ کے معنی میں بہت سے اقوال ہیں۔ کریم، فقیہ، عالم جس پر غصہ غالب نہ ہو۔ سردار جس کی اتباع کی جاتی ہو اچھے اخلاق والا اللہ تعالیٰ کا مطیع، متقی بے حسد انسان، رب کے دیئے ہوئے پر قناعت کرنے والا، سخی اور صابر یہ معانی صاحب اللباب نے نقل کئے ہیں۔ یہ دلیل ہے کہ نیک صالح انسان کو سید کہنا درست ہے۔ جیسا کہ حسن اور سعد رضی اللہ عنہما کیلئے لفظ سید استعمال ہوا ہے البتہ ہمارے نبی کیلئے سیدنا یا سیدی صفت بالاتفاق جائز ہے مگر یہ تعریف کسی کافر ظالم کیلئے درست نہیں ہے، ابوحیان۔ وَحَصُورًا اس کے بھی زیادہ معانی ہیں۔ رازدار انسان، وہ انسان جس میں عورتوں کے پاس آنے کی چاہت نہ ہو، پاکدامن انسان ہر قسم کے گناہ بے حیائی بدکاری سے پاک ہو۔ آخری قول بہتر ہے وَنَبِيًّا۔ سَيِّدًا میں اشارہ ہے کہ لوگوں کے مصالح دین اور دنیا میں اچھی رہنمائی کرنے والا ہے اور حصورا میں کامل زہد مراد ہے ان دونوں صفات کا مجموعہ نبوت ہے اس لئے نَبِيًّا کو بعد میں ذکر کیا۔ وَمِنَ الصَّالِحِينَ یہ مستقل صفت ہے اس سے کامل صلاحیت والا مراد ہے یعنی دنیا میں صلاحیت کامل اور آخرت میں صالحین کی جماعت میں ہوگا۔ اس مرتبہ کیلئے انبیاء کرام محتاج تھے جیسا کہ سلیمان علیہ السلام کی دعا میں سورۃ نمل آیت ۱۹ میں ذکر ہے۔

قَالَ رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَأَتِي عَاقِرٌ ۖ قَالَ كَذَٰلِكَ اللَّهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ ﴿٤٠﴾

"(زکریا علیہ السلام نے) فرمایا اے میرے رب کس طرح میرا لڑکا ہوگا جبکہ مجھے بڑھاپا پہنچ چکا ہے بیوی میری بانجھ ہے (ملک نے) کہا اسی طرح کرتا ہے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے" [40]۔

تفسیر 40: یہ زکریا علیہ السلام کی دوسری دعا ہے اور مقصد اللہ تعالیٰ کی عجیب قدرت کا اظہار ہے۔ جو کہ سوال و جواب کے طرز پر ہے۔ سوال: جب انہوں نے دعا مانگی اور قبولیت کا جواب بھی ملا تو پھر پوچھنے کا کیا فائدہ؟۔

جواب ۱: یہاں پر أَنَّىٰ كَيْفَ کی معنی میں ہے جو کہ کیفیت کیلئے ہے یعنی اسی بڑھاپے میں اولاد ہوگی یا ہمیں جوانی دی جائیگی اور اسی عورت سے ہوگی یا کسی اور خاتون سے ہوگی تو جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اسی بیوی سے اسی بڑھاپے میں اولاد ہوگی اور اسی حالت میں اولاد پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کیلئے کوئی مشکل نہیں۔ جواب ۲: یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و عظمت کا اظہار ہے ایسی حالت زیادہ خوشی سے بھی ہوتی ہے۔ مفسرین نے مزید جوابات بھی ذکر کیے ہیں لیکن وہ انبیاء کی شان کے مناسب نہیں ہیں۔ غُلَامٌ اس کا مادہ غلمت یا اغتلام سے لیا گیا ہے جس کا معنی نکاح کی طلب ہے لہٰذا اغلام نوجوان کو کہا جاتا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جبکہ بچے کو مجازاً اور تَفَاؤُلاً کہا جاتا ہے۔ وَقَدْ بَلَغَتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ایسے حالات میں دونوں طرفوں کے پہنچنے کو بلوغ کہا جاتا ہے یعنی مجھے بڑھاپا پہنچا یا میں بڑھاپے میں پہنچا ہوا اس لیئے سورۃ مریم میں وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا یعنی دونوں طرح سے استعمال جائز ہے۔ بقول مفسرین کے زکریا علیہ السلام اس وقت ۱۲۰ یا ۹۲ سال تک پہنچ گئے تھے۔ وَامْرَأَتِي عَاقِرٌ یہ جملہ حالیہ ہے امرأۃ اس لیئے فرمایا کہ یہ مقام حمل اور ولادت ہے جو کہ عورت کی صفت ہے۔ عَاقِرٌ یہ عقر سے لیا گیا ہے اور عقر قتل کو کہا جاتا ہے جیسا کہ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ اور کسی چیز کی اصل کو کہا جاتا ہے، امام قرطبی نے فرمایا ہے عَاقِرٌ سے مراد ریت کا وہ ٹیلہ جس پر کوئی پودے گھاس وغیرہ نہ اُگے اور اصطلاح میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کی اولاد نہیں ہوتی ہو خواہ مرد ہو یا عورت جس کو عقیم بھی کہا جاتا ہے۔ جبکہ یہ مرد اور عورت کے مشترک صفات میں سے ہے اسی لیئے خاتون کیلئے بھی عاقر استعمال ہوتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس وقت ان کی عمر ۹۸ سال تھی۔ سوال: بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ یہ جملہ فعلیہ ہے اور امْرَأَتِي عَاقِرٌ جملہ اسمیہ ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟۔ جواب: كِبَرٌ صفات عارضہ میں سے ہے کچھ کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیئے جملہ فعلیہ استعمال کرنا مناسب ہے اور عاقر حالت (مستمرہ) ایک مستقل حالت ہے تو اس کیلئے جملہ اسمیہ مناسب ہے۔ سوال: سورۃ مریم میں سیدنا زکریا علیہ السلام نے اپنی اھلیہ کے بانجھ پن کا ذکر پہلے کیا ہے۔ جبکہ اپنی بوڑھاپے کا بعد میں اور اس سورت میں اس کے برعکس ایسا کیوں ہے؟؟ یعنی وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا۔ **جواب:** سورۃ مریم میں ابتداء سے زکریا علیہ السلام نے اپنے بڑھاپے کا ذکر کیا ہے اور بعد میں بیوی کا بانجھ پن ذکر کیا ہے لہذا دوسری دعا میں بانجھ پن کو بڑھاپے پر مقدم کیا ہے تاکہ آیتوں کے فاصلہ کی رعایت ہوسکے نیز مقام تعظیم میں بانجھ پن ذکر کرنے میں بہت بڑا سبب ہے اس لئے اس کو پہلے ذکر کیا ہے۔ اور یہاں تو زکریا علیہ السلام کا پہلے دعا میں كِبَرٌ بڑھاپا ذکر نہیں ہے تو دوسری دعا میں پہلے اپنا ذکر کرلیا اور پھر بیوی کا۔ تنبیہ: ابوحیان نے ماتریدی سے نقل کیا ہے کہ تعبیرات میں اختلافات اس لئے ہے کہ یہ حکایت ہے اور حکایات میں معانی کی رعایت ہوتی ہے الفاظ کی نہیں۔ قَالَ كَذَٰلِكَ اللَّهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ۔ قَالَ کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے جو رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ میں مذکور ہے یا اس سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہے كَذَٰلِكَ اس طرح کام اللہ تعالیٰ کرتا ہے جیسا کہ یہ کام ہے۔ (تفسیر ابوحیان)۔ یا مبتدا مقدر ہے أَنْتُمَا كَذَٰلِكَ یعنی تم دونوں اسی طرح رہوں گے۔ ابن عطیہ مَا يَشَاءُ اللہ تعالیٰ کے تصرفات اور اختیار کا عام ہونا مقصود ہے اس میں بچے کی پیدائش اور ماں باپ کا بڑھاپا بھی شامل ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ۝ ”کہا (زکریا علیہ السلام نے) اے میرے رب میرے لئے کوئی نشانی بنا دے فرمایا (اللہ تعالیٰ نے) تیری نشانی یہ ہے کہ تو لوگوں سے تین دن کلام نہیں کر سکے گا مگر اشارے سے اور اپنے رب کو کثرت سے یاد کر اور صبح شام تسبیح پڑھ“ [41]۔ ع

تفسیر 41: بچے کی ولادت کا طریقہ سوال جواب کی صورت میں ذکر کرنے کے بعد اب ولادت کیلئے علامت نشانی طلب کر رہا ہے۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ زکریا علیہ السلام کو شک ہوا تھا کہ یہ کلام اور خوشخبری اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے اس لیئے انہوں نے علامات طلب کیں لیکن ان کا یہ قول انبیاء علیہم السلام کی شان کے خلاف ہے اور انبیاء کرام پر وحی یعنی کلام الٰہی میں کوئی التباس (شک) نہیں آتا ہے۔ اور انکا یہ قول اسرائیلیات میں سے ہے جو انجیل لوقا میں ذکر ہے اور محققین مفسرین نے لکھا ہے کہ نشانی طلب کرنا خوشخبری کی تسلی میں اضافہ اور مزید اطمینان میں زیادت کیلئے ہے کیونکہ شدت سے انتظار کے بعد جب نعمت آتی ہے تو وہ بہت لذیذ اور قیمتی ہوتی ہے۔ اٰيَةً سے مراد وہ علامات ہیں جو ان کی اھلیہ کے حاملہ ہونے پر دلالت کر رہے ہیں۔ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اس میں مفسرین کے دو اقوال ہیں۔ (۱) زبان کا بند ہونا بے اختیار تھا یعنی ان کی زبان بند ہو گئی جبکہ ذکر الٰہی اس زبان پر جاری تھا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عظیم معجزہ تھا کیونکہ گفتگو کیلئے زبان کا بند ہونا اور ذکر الٰہی کیلئے درست ہونے میں حکمت یہ تھی کہ انعام ملنے اور نزول کے وقت ساری توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف رہے اور ادائیگی شکر کیلئے یہ بہت بہتر طریقہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ زبان جس پر کلام جاری تھا اور حرکت میں تھی وہ لوگوں کی باتوں سے بند ہو کر ساکت ہوئی جبکہ وہ خاتون زکریا علیہ السلام کی بیوی جو اولاد پیدا کرنے سے قاصر تھی اولاد پیدا کرنے کیلئے تیار اور قابل ہوئی اس کو ضد پر ضد کی نشانی کہتے ہیں۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ زبان کی یہ بندش اللہ تعالیٰ کے امر سے ہوئی جو کہ بنی اسرائیل میں ایک قسم روزہ رکھنے کی عبادت تھی لہٰذا تین دن کلام سے اختیاراً زکریا علیہ السلام کی زبان بند ہونا علامت تھی کہ تین دن بعد بچے کی ولادت ہو گی اور یہ بھی نعمت پر شکر الٰہی ادا کرنے کا بہترین طریقہ تھا، اس میں پہلا قول بہتر ہے کیونکہ سورۃ مریم میں ثَلٰثَ لَيَالٍ مذکور ہے اور ظاہر یہ ہے کہ رات کو روزہ نہیں ہوتا ہے۔ لفظ ایام عرف میں رات کو بھی شامل ہے یعنی تین دن اور رات زبان بند تھی۔ سوال: یہاں لفظ اَيَّامٍ اور سورۃ مریم آیت ۱۰ میں لفظ لَيَالٍ ہے اس میں کیا حکمت ہے۔ جواب: وہ سورت اس سورت سے پہلے

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

نازل ہوئی ہے۔ اور رات دن سے پہلے آتی ہے اس لیے وہاں رات ذکر کی گئی ہے اور یہاں پر دن۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ حکم رات کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ دن بھی اس میں شامل ہے۔ اِلَّا رَمْزًا اس میں دو قول ہیں: (۱) رمز کلام کی جنس میں سے نہیں ہے لہٰذا یہ استثناء منقطع ہے۔ (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ رمز خفی آواز ہے جو کلام میں داخل ہے لہٰذا استثناء متصل ہے آخری قول بہتر ہے کیونکہ فقہاء نے لکھا ہے کہ باب قسم میں رمز کلام کے حکم میں داخل ہے۔ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ذکر دل سے اور تسبیح زبان سے یا ذکر عام ہے اور تسبیح سے مراد نماز ہے۔ کثیرا مقدر موصوف کیلئے صفت ہے۔ یعنی ذِكْرًا كَثِيْرًا یا زَمَانًا كَثِيْرًا اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عام ذکر کیلئے کوئی تعداد اور وقت نہیں ہے۔ کثیر کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) تعداد کے اعتبار سے اور زیادہ وقت کے اعتبار سے۔ (۲) کثرت معنوی ہے یعنی اخلاص تصحیح نیت اور سنت طریقہ مراد ہے کیونکہ سنت اور اخلاص نہ ہو تو کثرت کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ بِالْعَشِيِّ بقول زمخشری زوال سے غروب آفتاب تک وقت کو عشی کہتے ہیں۔ واحدی کا قول ہے کہ یہ عشیۃ کی جمع ہے دن کے آخر کو کہا جاتا ہے جس میں ظہر وعصر شامل ہیں۔ امام راغب اصفہانی کا قول ہے کہ مغرب وعشاء بھی اس میں داخل ہیں۔ وَالْاِبْكَارِ یہ فجر سے اشراق تک کا وقت ہے۔ اکثر مفسرین کے نزدیک یہ رات اور دن کے دونوں طرفوں کا بیان ہے لیکن اس سے مراد ہمیشگی ہے جیسا کہ سورۃ مریم آیت ۶۲ میں ہے۔ امام راغب کے قول کے مطابق عشی کی تفسیر میں پانچ نمازیں اشارۃً داخل ہیں۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾

"اور یاد کرو جب ملائکہ نے کہا اے مریم بلاشبہ تجھے اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے اور تجھے پاک کیا ہے اور دنیا جہاں کی عورتوں پر برگزیدہ کیا ہے" [42]۔

تفسیر 42: جب مریم علیہا السلام کی ولادت وتربیت کا ذکر ہو گیا۔ تو درمیان میں بطور جملہ معترضہ زکریا علیہ السلام کا ذکر کیا گیا تاکہ اس میں ان کی عبدیت بندگی کا اظہار ہو سکے تو اب پھر مریم کے حالات کی طرف رجوع کیا گیا ہے اور یہ ان کی بلوغت کے بعد کا دور ہے۔ اور اس میں یہود کا رد ہے کیونکہ وہ مریم علیہا السلام کی طرف فاحشہ کی نسبت کرتے تھے۔ وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ۔ امام قرطبی، امام ابن حزم، ابن عاشور نے لکھا ہے کہ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مریم نبیہ تھی ان کی دلیل ملائکہ کا کلام، اللہ تعالیٰ کا (اصْطَفٰى) چننا۔ اللہ تعالیٰ کے کلمات کی تصدیق وغیرہ ہے۔ جبکہ اکثر اہل علم ومفسرین کا موقف ہے کہ یہ صفات اور خطابات نبوت کو مستلزم نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو کرامات کے طور پر ملائکہ نے خطاب کیا ہے جیسا کہ موسیٰ علیہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

السلام کی والدہ سے ملائکہ نے خطاب کیا تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا اس کلام میں بھی یہ بات واضح ہے کہ ارسال سے مراد نبوت ہے جو (رجال) مردوں کا خاصہ ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کا اعلیٰ مرتبہ رسالت سورۃ مائدہ میں مذکور ہے اور مریم کا اعلیٰ مرتبہ صدیقیت ذکر کیا گیا ہے جس میں اصل مقصد یہودیوں کا رد ہے نیز اگر مریم نبیہ ہوتی تو وہاں اس کی صفت نبوت کا ذکر ہوتا لیکن ایسا نہیں ہے۔ الْمَلَآئِكَةُ اس سے صرف جبرائیل مراد ہے جیسا کہ سورۃ مریم میں واضح ہے البتہ دیگر ملائکہ کے ساتھ ہونے میں احتمال ہے۔ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَاكِ اس اصْطَفَا میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل ہیں یعنی قبولیت و تربیت، زکریا علیہ السلام کی کفالت، شیطان کے چھونے سے حفاظت، عجیب طریقہ سے رزق کی رسائی جس کا تذکرہ گذر چکا ہے۔ وَطَهَّرَكِ اس پاکی سے کفر، گناہوں، حیض و نفاس، مرد کے حفاظت، سے برے اعمال و اخلاق سے بچاؤ مراد ہے۔ وَاصْطَفَاكِ عَلَىٰ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ پہلا چناؤ یعنی (اصْطَفَا) ذاتی ہے اور یہ نسبتی ہے اس میں دو قول ہیں۔ (۱) ساری کائنات کی عورتوں پر برتری و فضیلت ہے یہ ان علماء کا قول ہے جو ان کی نبوت کے بھی قائل ہیں۔ (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ یہ چناؤ ان کے مستقبل کے اعتبار سے تھا یعنی بغیر مرد چھونے سے (ولد) بیٹا پیدا ہونا اس میں انہیں مطمئن کرنا اور آئندہ کیلئے پیش گوئی تھی اور ان کی ذہنی تیاری تھی عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کیلئے اور یہ بھی ساری کائنات کی عورتوں پر جزوی فضیلت ہے کیونکہ کسی بھی عورت کے لئے ایسی فضیلت ثابت نہیں ہے۔ لیکن اس میں سب پر فضیلت ثابت نہیں ہوتی ہے البتہ جزوی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ فائدہ! بعض عورتوں کی فضیلت مختلف احادیث میں آئی ہیں۔ (صحیح بخاری کتاب الانبیاء حدیث 3432، صحیح مسلم کتاب فضائل صحابہ حدیث 2430) ہشام بن عروہ کی سند سے مروی ہے کہ مریم بنت عمران، خدیجہ بنت خویلد اور ترمذی میں انس رضی اللہ عنہ کی سند سے ہے کہ ساری کائنات کی عورتوں پر باعتبار فضیلت مریم، خدیجہ، فاطمہ رضی اللہ عنھن اور ابن کثیر میں انس رضی اللہ عنہ کی سند سے ہے کہ کائنات کی خواتین میں افضل چار ہیں یعنی مریم، آسیہ، خدیجہ اور فاطمہ رضی اللہ عنھن ہیں۔ بخاری کی ایک اور روایت میں ہے کہ کائنات کی خواتین میں تین خواتین کامل و افضل ہیں مریم، آسیہ، خدیجہ اور عائشہ کی فضیلت خواتین پر اس طرح ہے کہ جیسے سارے کھانوں پر سرید کو فضیلت حاصل ہے۔ درمنثور میں اما سیوطی رحمہ اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ دنیا کی عورتوں کی سرداری کرنے والی مریم، فاطمہ، خدیجہ، اور آسیہ ہیں۔ (صحیح ترمذی کتاب المناقب حدیث 3878، حاکم 157/3، ابن حبان 7003، شیخ البانی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے) یہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

روایت کنز العمال جلد ۱۲ ص ۱۴۳ میں بھی ہے۔ صاحب اللباب اور قرطبی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔ اس روایت سے ترتیب بھی واضح ہوئی ہے امام قرطبی نے اس ترتیب کو ترجیح دی ہے اور بعض علماء نے اس میں (توقف) یعنی ان چاروں کو فضیلت حاصل ہے لیکن ایک دوسرے پر ترجیح قطعاً ثابت نہیں ہے۔

يٰمَرْيَمُ اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِىْ وَارْكَعِىْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

"اے مریم اپنے رب کی فرمانبرداری کر اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر" [43]۔

تفسیر 43: ربط ۱: جب مریم علیہا السلام کی برتری اور عظمت شان کا ذکر ہو گیا تو اب وہم دور کرنے کے لئے ان کی عبدیت کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ ربط ۲: پہلے یہودیوں کا رد کیا گیا تو اب نصاریٰ کا رد ہو رہا ہے اور دوبارہ یَا مَرْیَمُ اس لیے فرمایا کہ اہمیت واضح ہو جائے۔ اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ اس میں ہر قسم بندگی شامل ہے جو تمام اطاعتوں قیام صلوٰۃ رکوع پر مشتمل ہو۔ وَاسْجُدِىْ وَارْكَعِىْ یہ تخصیص تعمیم کے بعد ہے یعنی پہلے عام اطاعت کا ذکر ہوا تو اب خاص اطاعت کا ذکر ہے۔

سوال: سجدہ پہلے اور رکوع بعد میں ذکر کیا ہے۔ جواب ۱: اللہ تعالیٰ کی عبادات میں سجدہ بہت ہی اہم جز ہے تو اس کی اہمیت وعظمت کی وجہ سے اس کو مقدم کیا ہے۔ جواب ۲: اس سے مراد نماز ہے جو کہ ذکر جز کا اور مراد کل کے اصول میں سے ہے اور اس میں انفرادی نماز مراد ہے اور رکوع سے مراد اجتماعی نماز ہے جو ذکر جز کا اور مراد کامل نماز ہے۔ جواب ۳: واؤ برائے ترتیب نہیں ہے بلکہ عطف اور جمع کرنے کیلئے آتا ہے البتہ سابقہ حکمتیں مناسب ہیں جو بیان ہوئی ہیں۔ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (مع) میں دو قول ہیں۔ (۱) پہلا قول یہ ہے کہ اس سے معیت اقتداء مراد ہے جو باجماعت نماز میں ہوتی ہے۔ (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ (مع) میں اشتراکیت کی صفت ہے یعنی ان کی طرح نماز پڑھے۔ سوال: مع الراکعات کیوں نہیں فرمایا؟۔ جواب ۱: مفسر دمشقی نے لکھا ہے کہ عورت کا مرد کی اقتداء میں نماز ادا کرنا پردہ کے اہتمام کے ساتھ افضل ہے بجائے اس کے کہ مرد عورت کی اقتداء کرے۔ جواب ۲: مریم علیہا السلام دعوت، اور کلمات الٰہی کی تصدیق میں سیدنا مریم کی ہمت مردوں کی طرح تھی، اور مردوں کی جگہ خدمت دین کیلئے قبول کی گئی تو اس مناسبت سے یہاں پر مذکر کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۭ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَھُمْ اَيُّھُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۠ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾ "یہ غیب کی بعض خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں اور آپ ان کے پاس حاضر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نہیں تھے جو وہ اپنے قلموں کو ڈال رہے تھے کہ کون مریم کی کفالت کریگا اور آپ ان کے پاس حاضر نہیں تھے جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے" [44]۔

تفسیر 44: یہ درمیان میں نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی بیان کرنے کیلئے بطور جملہ معترضہ ذکر کیا ہے ورنہ خطابات مریم جاری ہیں ذٰلِكَ اس میں زکریا علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام مریم اور ان کی ماں کے واقعات کی طرف اشارہ ہے۔ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ. مِنْ برائے تبعیض ہے کیونکہ چند واقعات ذکر ہیں۔ أَنْبَاءِ نَبَاء کی جمع ہے عظیم خبر کو کہا جاتا ہے۔ أَنْبَاءِ کا معنیٰ ہے غائب چیز کی خبر دینا الْغَيْبِ مصدر ہے اور فاعل کے معنیٰ میں ہے یعنی اے نبی وہ خبریں جو آپ کے علم سے غائب تھیں کیونکہ آپ نے کوئی کتاب نہیں پڑھی اور قرآن کریم سننے والوں کے علم سے بھی غائب تھیں کیونکہ یہ باتیں یہود و نصاریٰ چھپاتے تھے۔ یہود اس لیئے چھپاتے تھے کہ اس میں زکریا اور مریم کی عظمت ثابت تھی اور وہ دونوں ان کے نزدیک نعوذ باللہ ان عظمتوں کے قابل نہیں تھے، اور نصاریٰ اس لیئے چھپاتے تھے کہ اس میں ان کی بندگی اور محتاج ہونے کا ذکر ہے جبکہ یہ لوگ انہیں معبود مانتے تھے، نُوحِيهِ إِلَيْكَ امام قرطبی نے لکھا ہے کہ لغت میں وحی مخفی طریقے سے خبر (اطلاع) دینے کو کہا جاتا ہے اور ابن فارس سے نقل کیا ہے کہ وحی، اشارہ، کتابت، رسالت، اور ہر وہ چیز جو کسی کی طرف حصول علم کیلئے سونپی جائے۔ اور سرعت کے معنیٰ کو بھی متضمن ہے۔ مادہ وحی قرآن مجید میں ۷۸ مرتبہ آیا ہے اور مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ (۱) اولیاء اللہ کی طرف الہام جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو کیا گیا سورۃ قصص آیت ۷، سورۃ طٰہٰ آیت ۳۸ حواریوں کو الہام ہوا سورۃ مائدہ آیت ۱۱۱۔ (۲) اشارہ کرنے کے معنیٰ میں سورۃ مریم آیت ۱۱۔ (۳) فطری تعلیم کے معنیٰ میں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی جاتی ہے جیسا کہ سورۃ نحل آیت ۶۸ میں ہے۔ (۴) (حکم) امر کے معنیٰ میں سورۃ زلزال آیت ۵، حٰم سجدہ ۱۲۔ (۵) وسوسہ کے معنیٰ میں سورۃ انعام آیت ۱۱۲، ۱۲۱۔ (۶) ملائک کی طرف وحی کرنا سورۃ انعام آیت ۱۲۔ (۷) ارھاص یعنی نبوت سے پہلے کی وحی سورۃ یوسف آیت ۱۵۔ (۸) نبوت اور رسالت کی وحی مگر ملائک کے بغیر یعنی بلا واسطہ کلام الٰہی جیسا کہ سورۃ شوریٰ آیت ۵۱ میں ہے۔

(۹) نبوت اور رسالت کی وحی جو بواسطہ ملک جبرائیل ہوتا ہے اس کی نسبت جبرئیل کی طرف ہوتی ہے۔ سورۃ شوریٰ آیت ۵۱۔

(۱۰) نبوت اور رسالت کی وحی جس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے اور یہ تو قرآن کریم میں کثرت سے ذکر ہے۔ اس آیت میں یہ آخری قسم مراد ہے۔ نُوحِيهِ اس میں ضمیر (ہ) الغیب کی طرف راجع ہے اس قول کو صاحب اللباب نے پسند

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کیا ہے اس وجہ سے فعل مضارع استعمال ہوا ہے تاکہ دیگر مغیبات بھی اس میں شامل ہو جائیں۔ امام قرطبی نے فرمایا ہے کہ یہ ذٰلِكَ کی طرف راجع ہے۔ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ اس میں ان واقعات کے غیب ہونے کی تاکید ہے اور بعض جاہلوں کے اشکالات ختم کرنا مقصود ہے جیسا کہ اس دور کے بعض اہل شرک کا عقیدہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ پیدائش سے قبل بھی ہر جگہ حاضر تھے اور پیدائش اور وفات کے بعد بھی ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں جبکہ یہ عقیدہ باطل ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس جملے میں ان عقائد کی تردید کی ہے۔ صاحب اللباب نے لکھا ہے کہ اس جملہ بیان کرنے میں نفی کے ساتھ ساتھ منکرین نبوت کا تمسخر بھی کیا گیا ہے کیونکہ جب یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ پڑھنے سے قاصر (ان پڑھ) ہیں اور کسی سے (شاگردی) پڑھا سیکھا بھی نہیں اور اس موقعہ پر موجود بھی نہیں تھے تو یقیناً انہیں اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے یہ واقعات بتائے ہیں۔ بلا شبہ یہ اس کی نبوت کی دلیل ہے اس جیسا مضمون سورۃ یوسف ۱۰۲، سورۃ قصص آیت ۴۴، ۴۵، ۴۶ میں بھی ہے۔ اور اس کو ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے۔ کہ ان واقعات کو یہود نے چھپایا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس نبی کے ذریعے سے بیان فرمایا۔ اور یہ صفت اس نبی کی سورۃ مائدہ آیت ۱۵ میں اس طرح ہے کہ يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِّمَّا كُنتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ یعنی یہ وہ کچھ بیان کرتا ہے جو تم نے کتاب میں سے چھپایا ہے أَقْلَامَهُمْ ۔ ابن جریر نے عکرمہ سے نقل کیا ہے کہ وہ قلمیں مراد ہیں جن پر انہوں نے تورات لکھی تھی، ازلام (تیروں سے قسمت معلوم کرنا) مراد نہیں ہے۔ جیسا کہ ابو مسلم نے کہا ہے کہ جاہلیت والوں کا طریقہ تھا اس روایت میں ہے کہ انہوں نے جاری پانی میں قلمیں ڈال دیں اور ان کا کہنا یہ تھا کہ جس کا قلم پانی میں ٹھہر جائے یعنی کھڑا رہے یا مخالف سمت چل پڑے تو وہ مریم کا کفیل بنے گا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ طریقہ وحی کے ذریعے سے ان کو معلوم ہوا تھا۔ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ یہ مبتداء، اور خبر فعل مقدر کیلئے نصب کی جگہ میں ہے جو کہ يَقُولُونَ بِالْيَعْلَمُوا ہے وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ بہتر یہ ہے کہ اس جھگڑے اور مباحثہ سے مراد یہ ہے کہ ہر ایک کی یہ رغبت و خواہش تھی کہ مریم کی کفالت میں کرو۔ کیونکہ ان کے امام کی بیٹی تھی اور عجیب طریقے سے پیدا ہوئی تھی۔ فیصلہ پہلے ذکر ہوا ہے اس لیے فیصلے کو اختصام پر مقدم کیا اَلْاَهَمُّ فَالْاَقْدَمُ کے اصول سے اور اختصام مباحثہ متوخر کیا جو کہ غیر اہم ہے اس قانون کے تحت کہ تَقْدِيمُ الْأَهَمِّ عَلَى الْأَهَمِّ اس آیت کے تفسیر میں قرطبی نے قرعہ اندازی کا مسئلہ تفصیل سے لکھا ہے اور امام بخاری نے عنوان بَابُ الْقُرْعَةِ فِي الْمُشْكِلَاتِ (حدیث 2687) میں اس آیت کو دلیل میں ذکر کیا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿٤٥﴾ "جس وقت کہا ملائک نے اے مریم (علیہا السلام) یقیناً تجھے اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے ایک کلمے کی خوشخبری دیتا ہے اس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا دنیا میں بڑے مرتبے والا اور آخرت میں (اللہ تعالیٰ) کے مقرب بندوں میں سے ہوگا" [45]۔

تفسیر 45: إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ یہاں سے عیسیٰ علیہ السلام کی عبدیت کا تفصیل سے ذکر ہو رہا ہے۔ اس کیلئے پچیس وجوہات ذکر کی جارہی ہیں یہ ابتداء سے کلام ہے یا پھر إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ آیت ۴۲ سے بدل ہے اور درمیان میں جملہ معترضہ ہے اور سبب ترتیب یہ ہے کہ آیت ۴۲ میں مریم کو بشارت دی گئی۔ چناؤ، پاکی اور عبادت کا حکم ہوا جو ایک تمہید اور مقدمہ تھا ایک (عجیب) خرق عادت کام کیلئے اور بشارت تھی ایسے ولد کی پیدائش کی جو مرد کے چھونے کے بغیر پیدا ہوگا۔ الْمَلٰٓئِكَةُ اس سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہے دلیل سورۃ مریم آیت 17 جبکہ یہ جمع ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس وقت مزید ملائکہ اس کے ساتھ موجود ہوں إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ اس آیت میں عیسیٰ علیہ السلام (عبدیت) بندہ ہونے کی چھ وجوہات ذکر ہیں۔ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اس سے مراد عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ جو بعد والے کلام سے واضح ہے اور کلمہ سے تعبیر اس لئے اس کو اللہ تعالیٰ نے لفظ "کُنْ" سے بغیر باپ کے واسطہ کی پیدا فرمایا۔ بقول قتادہ عیسیٰ علیہ السلام کا وعدہ تورات میں ذکر تھا تو اس کو اس وجہ سے کلمہ کہا گیا ہے یا اس لیئے کہ وہ ہر وقت کلمہ توحید کی دعوت دیتے تھے۔ یا اس سے مراد خوشخبری ہے جو انہوں نے مریم علیہا السلام کو دی تھی۔ مِّنْهُ مِن ابتدائے غایہ کیلئے ہے یعنی یہ کلمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صادر ہوا ہے (اللباب)۔ اِسْمُهُ اس میں (ہ) کی ضمیر کلمہ کی طرف راجع ہے اور چونکہ کلمہ معنی کی لحاظ سے مذکر ہے جو کہ ولد ہے اور اسم عام ہے، ذاتی نام، لقب، صفت اور کنیت سب کو شامل ہے، اور یہ تینوں بعد میں ذکر ہوئے ہیں۔ المسیح لقب ہے۔ عیسیٰ اسم علم ہے ابن مریم کنیت ہے لفظ مسیح میں دو معنی ہیں۔ یا دو صورتیں: (۱) یہ عبرانی لفظ ہے جو عربی میں منتقل ہوا ہے یا پھر عربی لفظ ہے جب عربی لفظ مانا جائے تو پھر اس میں بھی دو طریقے ہیں۔ (۱) فعیل کے وزن پر ہے اور بمعنی مفعول ہے۔ (۲) یہ فعیل بمعنی فاعل ہے۔ پہلے قول کی بناء پر یہ مسیحا ہے یعنی بابرکت دوسرے قول کی بناء پر مسیح ہے جو بمعنی ممسوح ہے تو پھر اس میں امام ابوحیان اور قرطبی نے (۷) وجوہات ذکر کی ہیں۔ (۱) برکت کے ساتھ مسح کیا ہوا۔ (۲) یا خاص تیل سے مسح کیا ہوا۔ (۳) گناہوں سے پاک کیا ہوا۔ (۴) جبرائیل امین نے اپنے پر سے مسح کیا ہے۔ (۵) پاؤں کے تلوے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہموار یعنی برابر تھے عام انسانوں کی طرح نہیں تھے۔(۶) زینت کے ساتھ مسح کیا ہوا ہے۔(۷) ماں کی گندگی سے پاک کیا ہوا یعنی دیگر بچوں کی طرح نہیں تھے جن کی ماؤں کو حیض نفاس آتا ہے، اس کی ماں اس سے پاک تھی۔ اور تیسرے قول کی بناء پر جب مسیح فاعل کے معنی میں ہو تو پانچ وجوہ ہیں (۱) آفت زدہ کو اپنے ہاتھ سے مسح کر لیتے تو وہ تندرست ہو جاتا تھا۔(۲) زمین کی مسافتوں کو طے کرنے والے تھے۔(۳) سیاحت کرنے والے تھے۔(۴) صدیق تھے۔(۵) بادشاہ تھے لقب کو اس لیے مقدم کیا کہ بقول مفسر ابن انباری وہ اسم علم سے زیادہ مشہور تھا یعنی عیسیٰ سے زیادہ مشہور مسیح تھا۔ اور دجال کو بھی مسیح کہا جاتا ہے اس لئے کہ اس کی ایک آنکھ مسخ کی ہوئی ہے عیسیٰ کو عبرانی زبان میں السیوع یا یسوع کہا جاتا ہے اور عربی زبان میں عاس یعوس سے ماخوذ ہے، سیاست اور انتظام کرنے کے ہیں تو دونوں ایک دوسرے کے موافق ہوئے۔ ابن مریم۔ یہ اسم کنیت ہے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے والد نہیں تھے تو ماں کی طرف نسبت میں مشہور ہے۔ اور یہ صرف سیدنا عیسیٰ کی خصوصیت ہے۔

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٤٦﴾

"وہ لوگوں سے اپنے گہوارے میں اور ادھیڑ عمر میں باتیں کرے گا اور وہ نیک لوگوں میں سے ہوگا" [46]۔

تفسیر 46: اس آیت میں ان کی عبودیت کے تین دلائل ذکر ہے جس کا تعلق زمانے سے ہے اور یہ بطور خرق عادت ہے وَيُكَلِّمُ النَّاسَ یہ وَجِيْهًا پر عطف ہے (فِي الْمَهْدِ) اس کلام کا ذکر سورۃ مریم آیت ۳۰ سے ۳۲ تک ہے وہاں ان کی تیرہ (۱۳) حالتیں ذکر ہیں جو اس کے بندے ہونے پر واضح دلیل ہے۔ فَمَهْدٌ قرآن مجید میں یہ مادہ (۱۶) مرتبہ ذکر ہوا ہے جو آرام گاہ کی تیاری پر دلالت کرتا ہے یہ لفظ جہنم کیلئے بطور استہزاء (۹) مرتبہ اور زمین کے لئے (۴) مرتبہ جنت کی صفت میں (۱) مرتبہ دنیا کے مال و دولت کیلئے (۲) مرتبہ جبکہ عیسیٰ علیہ السلام کیلئے تین مرتبہ ذکر ہوا ہے۔ عرف عام میں مھد بچے کی آرام گاہ کو کہا جاتا ہے جب عمر رضاعت میں ہو (تفسیر قرطبی و ابوحیان)۔ جبکہ صاحب اللباب کا قول ہے کہ بچے کی تربیت گاہ کو کہا جاتا ہے جس میں اس بچے کی تربیت ہو رہی ہو۔ یہ ظرف مکان یا مصدر ہے لہٰذا بچے کیلئے پہلا مھد والدہ کی گود ہے۔ جیسا کہ سورۃ مریم میں ہے فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا۔ بچے کے جھولے اور آرام کے بستر پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ کم سنی میں تین بچوں نے کلام کیا ہے عیسیٰ ابن مریم ابن جریج اور صاحب جبار نے (صحیح بخاری کتاب احادیث الانبیاء حدیث 3436 صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ حدیث 2550)۔ [redacted] اس عمر میں تو ہر شخص

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کلام کر سکتا ہے تو پھر اس میں کیا حکمت ہے؟ جواب نمبر 1: امام ابن جریر نے فرمایا ہے کہ اس میں دلیل ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام ایک عمر سے دوسری عمر میں منتقل ہونگے اور یہ اس کے الٰہ ہونے کی تردید کیلئے ذکر کیا ہے کیونکہ الٰہ پر زمانے سے کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ جواب نمبر 2: ابو العباس، حسین بن الفضل اور ابن زید سے منقول ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام كَهۡلًا کی عمر میں آسمان سے نزول فرمائیں گے اور دین سے متعلق لوگوں سے کلام کریں گے۔ اس کے متعلق صحیح احادیث وارد ہیں کہ وہ نزول کے بعد دجال کو قتل کریں گے ان روایتوں کو تفسیر قرطبی، ابن کثیر، رازی، ابوحیان، صاحب اللباب، آلوسی، خطیب شربینی، ابوسعود اور بیضاوی سب نے ذکر کیا ہے۔ وَمِنَ الصّٰلِحِيۡنَ امام ابن کثیر نے فرمایا کہ اس کے قول و فعل میں صلاحیت ہوگی یعنی صحیح علم اور صالح عمل کا مالک ہوگا اور اولاد میں صلاحیت مطلوب ہوتی ہے جیسا کہ سورۃ اعراف ۱۹۰، آل عمران ۳۹، صافات ۱۰۰ اور ۱۱۲ میں بھی ہے۔

قَالَتۡ رَبِّ اَنّٰى يَكُوۡنُ لِىۡ وَلَدٌ وَّلَمۡ يَمۡسَسۡنِىۡ بَشَرٌ ‌ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخۡلُقُ مَا يَشَآءُ‌ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمۡرًا فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ۝ "مریم کہنے لگی کس طرح میرا لڑکا ہوگا میرے رب مجھے تو کسی بشر نے چھوا تک نہیں۔ کہا ملائک نے اسی طرح اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جب کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کیلئے صرف اتنا کہہ دیتا ہے کہ ہوجا تو وہ ہوجاتا ہے"۔ [47]۔

تفسیر 47: قَالَتۡ رَبِّ جب مریم علیہا السلام سے کہا گیا کہ تجھے تیرا رب بیٹا دینے والا ہے تو انہوں نے اللہ سے کلام شروع کیا "صفت رَبِّ" کے ذریعے۔ امام ابوحیان اور زمخشری نے کہا ہے کہ جن لوگوں نے کہا کہ مریم نے جبرئیل علیہ السلام کو رب بمعنی سیدی آواز دی ہے تو انہوں نے غلطی کی ہے خطاب اصل میں رب حقیقی ہی سے ہے۔ اَنّٰى يَكُوۡنُ لِىۡ وَلَدٌ برائے تعجب ہے مگر عادت کے اعتبار سے قدرت الٰہی کے اعتبار سے نہیں اور یہ تعجب تاکید کے لئے ہے، کہ وَلَمۡ يَمۡسَسۡنِىۡ بَشَرٌ یعنی مجھے کسی مرد نے بصورت نکاح اور نہ ہی بصورت زنا ہاتھ لگایا ہے تو بغیر ملاپ مرد کے کس طرح میری اولاد ہوگی یہ تو خلاف عادت ہے۔ یا اَنّٰى كَيۡفَ کے معنی میں ہے جیسا کہ زکریا علیہ السلام کے واقعہ میں گزرا ہے یعنی شادی ہوگی میری یا قدرت الٰہی سے پیدا ہوگی۔ بَشَرٌ اس لفظ میں عورت مرد واحد تثنیہ جمع مفرد سب برابر ہیں۔ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخۡلُقُ مَا يَشَآءُ یعنی "اَنۡتِ كَذٰلِكِ" تو اسی طرح بغیر شادی اور بغیر مرد چھونے کے ہوگا۔ يَخۡلُقُ زکریا علیہ السلام کے واقعہ میں فرمایا تھا يَفۡعَلُ اور یہاں پر يَخۡلُقُ فرمایا اسلئے کہ وہ واقعہ عام عادت کے زیادہ خلاف نہیں تھا جبکہ یہ واقعہ عام عادت سے بہت ہی زیادہ دور ہے۔ اِذَا قَضٰۤى اَمۡرًا فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ اس جملہ کی تفسیر سورۃ بقرہ میں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

گزر چکی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا ارادہ کسی سبب کا محتاج نہیں۔ فَیَکُوۡنُ میں ضمیر مقدر ہے جو مبتداء ہے۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿٤٨﴾

"اور وہ اسے کتاب وسنت تورات وانجیل کی تعلیم دیگا" [48]۔

تفسیر 48: اس آیت میں عیسیٰ علیہ السلام کی مزید ٦ صفات (عبدیت) بندگی کی مذکور ہیں یعنی وہ معجزات میں اللہ کے اذن اور اجازت کے محتاج ہیں۔ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ یہ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ پر عطف ہے اور یہ دیگر اقوال سے بہتر قول ہے۔ انبیاء کرام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی تعلیم دی جاتی ہے۔ اَلْكِتَابَ اس میں مختلف اقوال ہیں: (۱) خط کتابت یعنی تحریر یا دیگر نازل شدہ کتابیں جو اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں۔ اَلْكِتَابَ میں الف لام جنسی ہے یعنی تورات انجیل جبکہ عطف یہاں پر برائے تفسیر ہے۔ سنت سے مراد انبیاء کا طریقہ ہے درست صحیح اقوال و افعال مراد ہیں" البحر المحیط" یا مراد قرآن وحدیث ہے جو کہ نزول عیسیٰ علیہ السلام کے بعد آخری دور میں (ان دونوں پر عیسیٰ علیہ السلام فیصلے کریں گے جیسا کہ صحیح مسلم باب الایمان حدیث 155 میں ہے) جواہر القرآن للشیخ غلام اللہ خان رحمہ اللہ اس میں عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی طرف اشارہ ہے جبکہ اس وقت انجیل بھی نہیں اتری تھی۔ یہ پیش گوئی مریم علیہا السلام کو دی گئی۔

وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْىِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِىْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٤٩﴾ "اور اسے بنی اسرائیل کی طرف رسول بنائے گا وہ کہے گا بلاشبہ میں تمہارے رب کی طرف سے یقینی نشانی لیکر آیا ہوں بیشک تمہارے لئے گارے سے پرندے کی مانند بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے پرندے کی مانند ہو جاتا ہے اور میں مادرزاد نابیناؤں اور برص کے مریض کو ٹھیک کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے مردوں کو زندہ کرتا ہوں اور تمہیں اس چیز کی خبر دیتا ہوں جو تم کھاتے ہو اور اس کی بھی جو اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو۔ یقیناً اس میں تمہارے لئے بہت بڑی نشانی ہے بشرطیکہ تم مومن ہو" [49]۔

تفسیر 49: وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ۔ وَرَسُوْلًا کے منصوب ہونے میں اسباب ہیں۔ (۱) اس سے پہلے فعل مقدر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے یعنی وَيَجْعَلُهٗ رَسُوْلًا۔ (۲) يُعَلِّمُهٗ کی ضمیر سے حال بن رہا ہے (۳) یہاں پر أَرْسَلْتُ لفظ مخفی ہے لیکن پہلا قول بہتر ہے اور یہ آیت دلیل ہے کہ عیسٰی علیہ السلام تمام بنی اسرائیل کی طرف نبی بن کر آئے جیسا کہ سورۃ صف آیت ۶ میں ہے۔ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُمْ یہاں سے مُسْتَقِيمٌ تک دو اقوال ہیں۔ (۱) پہلا قول یہ ہے کہ رَسُوْلًا سے متعلق ہے اور (با) اس میں مخفی ہے اور یہ مریم علیہا السلام کے خطاب میں شامل ہے۔ (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ یہاں پر ادماج ہوا ہے یعنی رَسُوْلًا پر کلام ختم ہوا ہے اور یہ کلمات مخفی ہیں کہ عیسٰی علیہ السلام پیدا ہوئے پھر آپ کو وحی ہوئی اور بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے جیسا کہ سورۃ مریم میں ہے اور پھر انہوں نے فرمایا کہ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُمْ بِآيَةٍ اس سے مراد وہ تمام معجزات ہیں جو بعد میں ذکر ہیں یعنی آيَةٍ مفرد ہے لیکن بمعنی جمع ہے۔ أَنِّي أَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّينِ یہ أَنِّي سے آيَةٍ یا سابقہ أَنِّي سے بدل ہے۔ أَخْلُقُ تصویر کے معنی میں ہے (یعنی شکل بنانا) سورۃ مومنون آیت ۱۴ میں مذکور ہے۔ (لَكُمْ) میں لام اجلیہ ہے یعنی تمہارے ایمان کے حصول کیلئے۔ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ۔ امام اخفش کا قول ہے کہ یہ کاف اسم ہے جس کا معنی مثل ہے دیگر نحویوں کا قول ہے کہ یہ حرف ہے اور مقدر مفعول کیلئے صفت ہے یعنی هَيْئَةً مِثْلَ هَيْئَةِ الطَّيْرِ۔ پہلا قول بہتر ہے اسلئے کہ فَأَنْفُخُ فِيهِ میں ضمیر کاف کی طرف راجع ہے اور وہ باعتبار لفظ مذکر ہے، اور سورۃ مائدہ آیت ۱۱۰ میں مؤنث کی ضمیر مذکور ہے اسلئے هَيْئَةٍ پر دلالت کرتی ہے۔ فَيَكُونُ طَيْرًا مفسرین نے لکھا ہے کہ بنی اسرائیل نے اس سے کہا کہ ہمارے لئے (خفاش) چمگادڑ بنانا اسلئے کہ وہ ایک عجیب وغریب خلقت والا ہے وہ اڑتا بھی ہے جبکہ اس کے پر نہیں ہوتے وہ پرندہ ان کے سامنے تو اڑ جاتا لیکن ان کی آنکھوں سے غائب ہوتے ہی زمین پر گر جاتا (البحر المحیط)۔ بِإِذْنِ اللّٰهِ یہ أَخْلُقُ سے متعلق ہے۔ بنانا، پھونک مارنا اور پرندہ بن جانا اور اس کا اڑنا سب اللہ تعالیٰ کے اذن سے تھا۔ اس سے استدلال نہیں ہوسکتا ہے کہ بت بنانا یا تصویر بنانا جائز ہے کیونکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی خاص اجازت تھی اسلئے سورۃ مائدہ آیت ۱۱۰ میں تخلیق کے ساتھ اذن اللہ مذکور ہے۔ سوال: یہاں پر أَخْلُقُ کے ساتھ اذن اللہ ذکر نہیں کیا؟ جواب: سورۃ مائدہ میں عیسٰی علیہ السلام پر میدان محشر میں احسانات ذکر کرنا مقصود ہے اسلئے وہاں نعمتوں کے ساتھ لفظ اذن کو بار بار دہرایا ہے جبکہ یہاں پر صرف معجزات کی پیش گوئی ہے جو عیسٰی علیہ السلام نے کی ہے اسلئے صرف ایک مرتبہ اذن اللہ کہا جو أَخْلُقُ سے متعلق ہے۔ وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللّٰهِ براءت اس چیز سے نجات کو کہا جاتا ہے جو ناپسندیدہ ہو۔ الْأَكْمَهَ کے معنی میں بہت اقوال ہیں لیکن بہتر قول یہ ہے کہ مراد وہ شخص ہے جو ماں سے نابینا پیدا ہو جائے اس کی نظر بالکل

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بند ہو۔ بقول زمخشری ہماری امت میں تفسیر کا راوی قتادہ رحمہ اللہ ایسے ہی پیدا ہوا تھا۔ وَالْأَبْرَصَ اس سے برص کی بیماری مراد ہے۔ ابن عاشور کا قول ہے کہ یہ چمڑے کی بیماری جس سے سفید دھبے چمڑے میں نظر آتے ہیں اگر یہ چمڑے کے اندر ہوں تو برص ورنہ اس کا نام بہق ہے یعنی صرف چمڑے میں ہو تو بہق اور گوشت تک گیا ہو تو برص ہے لہٰذا بعض حکیم اس کا علاج کرتے ہیں اگر وہ ختم ہو تو یہ بہق ہے اور ختم نہ ہو تو یہ برص ہے کیونکہ برص کا علاج نہیں ہوتا ہے۔ تنبیہ اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے میں رسولوں کو وہ معجزات دیئے ہیں جو اس زمانہ کے مناسب ہوں جیسا کہ صالح علیہ السلام کی قوم پتھر سے چیزیں بناتی تھی تو اللہ تعالیٰ نے صالح علیہ السلام کو پتھر سے اونٹنی نکال کر دی تاکہ قوم مقابلے سے عاجز ہو جائے۔ یوسف علیہ السلام کے زمانے میں خوابوں کی تعبیر بتانے کی شہرت تھی تو اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو خوابوں کی تعبیر کا علم عطا فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام کے دور میں جادو کا زور تھا تو موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے لاٹھی سے اژدھا بڑا (سانپ) بنایا جس کے مقابلے سے قوم کے تمام جادوگر عاجز آنے اور عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں طب کا چرچا تھا تو عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایسا معجزہ عطا فرمایا کہ حکیم ان کے مقابلہ سے عاجز آ گئے۔ اس لئے کہ اَکْمَہَ اور اَبْرَصَ کے علاج سے لوگ عاجز تھے مردے اور مُردے میں کوئی جان نہیں ڈال سکتا ہے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں فصاحت و بلاغت کی شہرت تھی تو ہمارے نبی کو وہ کتاب عطا کی گئی جس کے مقابلے سے تمام فصیح و بلیغ عاجز آ گئے (ابن کثیر)۔ وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ احیاء سے مراد اس کے ذرات جمع کر کے اس میں روح پھونک دینا نہیں کیونکہ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے یعنی یہ اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے البتہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے کسی بندے کو زندہ کرنے کیلئے دعا مانگتے تو اللہ تعالیٰ اس کو زندہ کر دیتا اور یہ دعا بھی اللہ تعالیٰ کے حکم پر موقوف تھی، کیونکہ لفظ باذن اللہ ان سب کو شامل ہے۔ وَأُنَبِّئُكُم بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ یہ بھی معجزہ ہے جو غیب کے متعلق سچی خبر ہے یعنی وہ پیش گوئی جو سچائی پر مبنی ہو اور یہ بھی معجزہ کہلاتا ہے۔ جس کی دلیل یہ کلام ہے کہ قَدْ جِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ اور بعد والا کلام بھی ہے۔ اس طرح معجزہ یوسف علیہ السلام کا ذکر ہوا ہے (سورۃ یوسف آیت ۳۷) اور اس طرح کے معجزات ہمارے نبی کے تو ان گنت ہیں۔ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ یہ جملہ عیسیٰ علیہ السلام کا کلام میں داخل ہے یا اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اس میں تاکید ہے کہ گزشتہ معجزات اللہ تعالیٰ کی توحید اور نبی آخر الزمان کی صداقت کے دلائل ہیں۔ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ اس کو شرط کے ساتھ اس لیے معلق کیا ہے کہ لَآيَةً سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو سبب منافع ہو لہٰذا منافع وہی لینگے جن میں ایمان ہوگا یا پھر ان بمعنی اِذْ ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فائدہ: مذکورہ معجزات کو فعل مضارع کے ساتھ ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عیسیٰ علیہ السلام سے بار بار صادر ہوئے ہیں۔ نیز جب أَخْلُقُ لَكُم میں اعجاز بنسبت أُبْرِئُ الْأَكْمَهَ زیادہ ہے اسلئے پہلے کے ساتھ باذن اللہ کہا ہے اور دوسرے کو اس پر قیاس کیا ہے۔ اسی طرح وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ میں اعجاز بنسبت أُنَبِّئُكُم زیادہ ہے تو پہلے کے ساتھ باذن اللہ فرمایا ہے اور دوسرے کو قیاساً چھوڑا ہے۔ کلام میں اختصار اور بلاغت کیلئے ایسا کیا گیا ہے۔

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ ۚ وَجِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿٥٠﴾ " (اور میں آیا ہوں تمہارے پاس مجھ سے پہلے نازل شدہ) تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں اور تاکہ میں تمہارے لئے بعض وہ چیزیں حلال کر دوں جو تمہارے اوپر حرام کر دی گئی تھی، اور تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے نشانی لیکر آیا ہوں لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو" [50]۔

تفسیر 50: اس آیت میں تین طریقوں سے عیسیٰ علیہ السلام کی عبدیت ثابت کی اور تین طریقوں سے نبی آخر الزمان کی رسالت کی صداقت ثابت کی ہے۔ وَمُصَدِّقًا یہ رَسُولًا پر عطف ہے یا "جِئْتُكُم" لفظ مقدر ہے اور سابقہ کلام کے معنی پر عطف ہے یعنی انجیل کے نزول سے پہلے تورات پر مکمل عمل کرنے والے تھے، جبکہ انجیل کے نزول کے بعد اس کے بعض احکام منسوخ ہو گئے تھے البتہ تصدیق کے اعتبار سے باقی رہ گیا تھا۔ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ یہ وَمُصَدِّقًا کے معنی پر عطف ہے کیونکہ لِأُصَدِّقَ کے معنی میں ہے اور حلال کرنے کی نسبت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف رسالت کی وجہ سے ہوئی ہے ورنہ وہ اپنی طرف سے حلال وحرام کرنے کا اختیار نہیں رکھتے ہیں۔ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ اس میں مفسرین کے دو قول ہیں (۱) پہلا قول یہ ہے کہ تورات میں بعض چیزیں بنی اسرائیل پر حرام کی گئی تھیں وہ منسوخ ہو کر انجیل میں پھر حلال کر دیئے گئیں، اور ان چیزوں کی حرمت کا سبب ان کا گناہ تھا جیسا کہ اونٹ، بطخ، شتر مرغ اور چربی کی بعض اقسام جس کی تفصیل سورۃ انعام آیت ۱۴۶ میں مذکور ہے۔ سوال: مُصَدِّقًا سے پتا چلتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام پوری تورات پر عمل پیرا تھے جبکہ اس جملے میں اس کی رد ہے؟ جواب: یہ بات گزر گئی کہ تصدیق کے یہاں دو معنی ہیں اس میں اس اعتراض کا جواب موجود ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کو بنی اسرائیل کے فاسق مولویوں اور پیروں نے بغیر کسی دلیل کے ان پر حرام کیا تھا۔ ان چیزوں کی حلت کو عیسیٰ علیہ السلام نے بیان کیا اور انہوں نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا تھا عیسیٰ علیہ السلام نے حلال قرار دیا۔ اس پر اعتراض آتا ہے کہ اس میں لفظ مُحِلّ ذکر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کرنا چاہئے تھا اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات لفظ بعض کل کے معنی میں آتا ہے۔ جواب ۲: انہوں نے دو قسم کی چیزوں کو حرام کیا تھا بعض دلیل سے اور بعض بغیر دلیل کے لہٰذا آخری قسم کو بعض کہا جائیگا۔ وَجِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ بقول ابوحیان یہ جملہ دو وجوہات سے بطور تاسیس ہے پہلی یہ وجہ ہے کہ پہلا بِآيَةٍ سے مراد معجزات ہیں جو ذکر ہوئے ہیں اور یہاں معجزات سے مراد بعدوالا جملہ ہے کہ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ دوسری توجیہ یہ ہے کہ پہلے بِآيَةٍ سے مراد معجزات ہیں اور اس بِآيَةٍ سے مراد انجیل ہے جو اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کی ہے اور فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ میں انجیل کے مضمون کا خلاصہ ہے۔ پہلے جملے میں توحید ثابت کرنا اور شرک کی تمام اقسام کا رد ہے۔ وَأَطِيعُونِ صدق رسول و اتباع رسول مراد ہے اور یہ دونوں جملے تمام نبیوں سے منقول ہیں جیسا کہ سورۃ شعراء آیت ۱۰۸، ۱۱۰ میں نوح علیہ السلام سے سورۃ نوح آیت ۳ میں نوح علیہ السلام سے اور سورۃ شعراء آیت ۱۲۶، ۱۳۱ میں ہود علیہ السلام سے اور اسی سورۃ میں آیت ۱۴۴ اور ۱۵۰ میں صالح علیہ السلام سے آیت ۱۶۳ میں لوط علیہ السلام سے اور آیت ۱۷۹ میں شعیب علیہ السلام سے اور سورۃ زخرف آیت ۶۳ میں عیسیٰ علیہ السلام سے، سورۃ تغابن آیت ۱۶ میں آخری نبی ﷺ سے لہٰذا دعوت توحید و اتباع رسول تمام نبیوں کا اجماعی مسئلہ ہے۔

إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۗ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿٥١﴾

”یقیناً اللہ تعالیٰ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی پس خاص اسی کی بندگی کرو یہ سیدھی راہ ہے“ [51]۔

تفسیر 51: اس کو عطف کے بغیر اس لیئے ذکر کیا ہے کہ یہ فَاتَّقُوا اللَّهَ کیلئے علت ہے اس میں عیسیٰ علیہ السلام کی بندگی کی ایک وجہ بھی مذکور ہے اور نصاریٰ کا بالکل واضح رد ہے جو انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اِلٰہ بنایا تھا اور اِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ میں توحید ربوبیت کا ذکر ہے اور توحید عبودیت (الوہیت) فَاعْبُدُوهُ میں مذکور ہے اس طرح جملہ عیسیٰ علیہ السلام سے سورۃ مریم آیت ۳۶ اور سورۃ زخرف آیت ۶۴ میں منقول ہے اور اسی طرح سورۃ مائدہ آیت ۱۱۷ میں ہے اور فَاعْبُدُوهُ میں تفریع ہے سابقہ جملہ پر یعنی توحید ربوبیت سے توحید عبودیت لازمی طور پر ثابت ہوگی اور توحید عبودیت سے ربوبیت لازمی طور پر ثابت ہوگی۔ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ اس میں سابقہ جملے کی مجموعے کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی توحید ربوبیت اور الوہیت صِرَاطِ مُسْتَقِيم میں مضمر ہے۔

فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ ۖ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ آمَنَّا بِاللَّهِ

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿٥٢﴾ "جب محسوس کیا عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے کفر تو فرمایا کون ہے جو اللہ تعالیٰ کے دین کیلئے میرا مددگار ہے حواریوں نے کہا ہم اللہ تعالیٰ کے دین کے مددگار ہیں ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں گواہ رہو کہ ہم اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں" [52]

تفسیر 52: سابقہ آیتوں میں عیسیٰ علیہ السلام کی بندگی اور رسالت کا ذکر ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول ہیں اب ان کی اور ان کے ساتھیوں کے مجاہدے کا ذکر ہو رہا ہے کہ انہوں نے توحید وسنت کیلئے بہت بڑے مجاہدے کیے ہیں اور اس لیے کلام کی ابتداء (فا) سے کی ہے فَلَمَّآ اَحَسَّ یعنی ان کی دعوت کے بعد بنی اسرائیل میں دو گروہ بن گئے ایک گروہ نے مکمل حمایت کی اور دوسرے گروہ نے مخالفت پر کمر کس لی واضح دشمنی شروع کر لی۔ دشمنی والا گروہ مشہور ہوا یہود کے نام سے جبکہ دوسری جماعت نصاریٰ کے نام سے معروف ہوئی۔ اَحَسَّ حواس کے ذریعے سے علم حاصل ہونا مراد ہے یعنی آنکھوں سے ان کی دشمنی والی حرکتوں کو دیکھا اور ان سے دشمنی پر مبنی باتوں کو سنا اس لیئے فرمایا کہ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ یعنی یہاں نصرت سے تعاون کرنا اور ساتھ دینا ہے۔ بقول امام مجاہدؒ اس مقام پر نصرت سے مراد اللہ تعالیٰ کے دین کیلئے تعاون ہے (ابن کثیر) مطلب یہ ہے کہ کوئی ہے جو دین کیلئے میرا ساتھی بنے۔ یہ بندوں کا دین کیلئے ایک دوسرے کی نصرت کرنا ہے تاکہ توحید وسنت کی دعوت کو پھیلایا جائے اور قوم کے شر سے بھی بچا جائے۔ اور ایسی نصرت اور مدد کی آرزو لوط علیہ السلام نے کی تھی۔ لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّۃً اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ۔ اِلَی اللّٰہِ میں اِلٰی کا معنی بقول امام فراء (مع) ہے یعنی اپنی نصرت کو اللہ تعالیٰ کی نصرت کے ساتھ شامل کریں۔ زمخشری نے کہا کہ اِلٰی کا متعلق مخفی ہے یعنی ذَاهِبًا اِلَی اللّٰہِ اور بقول حسن بصری اِلٰی بمعنی (فِیْ) ہے یعنی فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اور فارسی نے کہا کہ اِلٰی لام کے معنی میں ہے (اللباب)۔ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ یہ حواری کی جمع ہے اور اس میں دو اقوال ہیں ایک قول یہ ہے کہ یہ حور سے لیا گیا ہے یعنی مخلص ہر قسم میل کچیل سے پاک اور سفید کو بھی کہتے ہیں اس وجہ سے کپڑے دھونے کو بھی کہتے ہیں جبکہ عرف میں مخلص مددگار کو کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے زبیر رضی اللہ عنہ کیلئے فرمایا تھا اِنَّ لِکُلِّ نَبِیٍّ حَوَارِیًّا وَّحَوَارِیَّ الزُّبَیْرُ۔ صحیح بخاری کتاب الجہاد، عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کو حواری اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ کپڑے دھویا کرتے تھے یا سخت ترین وقت میں عیسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دیا یعنی ان کے دل ہر قسم کے حسد وعناد سے پاک تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ حواری حَارَ یَحُوْرُ سے لیا گیا ہے یعنی رجع کے معنی میں ہے یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ مضاف مقدر ہے یعنی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

أَنصَارُ نَبِيِّهِ وَدِينِهِ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ یہ امت کا اپنے نبی کی نصرت کی تفسیر ہے یا ماقبل کیلئے علت ہے اس لیئے کہ نصرت دین کیلئے ایمان باللہ کا سبب ہے۔ مُسْلِمُونَ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا دین بھی اسلام تھا جب اسلام کا ذکر ایمان کے ساتھ اکٹھا ہو جائے تو معنی یہ ہوتا ہے کہ ہم دل کے ایمان کا اظہار زبان، اعضاء جہاد اور علم و نصرت سے کرتے ہیں

رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ "اے ہمارے رب اس چیز پر جو تو نے نازل کی ہے ایمان لائے اور ہم نے رسول کی اتباع کی پس تو ہمیں (توحید و سنت کے) گواہوں میں سے لکھ لے"[53]۔

تفسیر 53: اسلام و ایمان کے اقرار کے بعد اب وہ اللہ تعالیٰ کیلئے تضرع و عاجزی کا اظہار کر رہے ہیں۔ رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا أَنزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُولَ: رسول سے مراد عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ ایمان اور اتباع رسول کو بطور وسیلہ ذکر کیا اور ان کی دعا یہ ہے فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ اس سے مراد امت محمدیہ ﷺ ہے جیسا کہ سورۃ بقرہ آیت ۱۴۳ یا انبیاء کرام یا پھر تمام اہل توحید اور نبیوں کے پیروکار مراد ہیں اس میں نجران کے نصاریٰ کا تفصیلی رد ہے یعنی تمہارے بڑوں نے آخری امت میں شمولیت کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعائیں کی تھیں جبکہ تم یعنی موجودہ نصاریٰ اپنے بڑوں کے بھی مخالف ہو۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ "انہوں نے (ان کے قتل کی) تدبیر کی اور اللہ تعالیٰ نے (بھی اس کو بچانے کی) تدبیر کی اور اللہ سب تدبیر کرنے والوں سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے" [54]۔

تفسیر 54: لغت میں مکر ستر پوشی (چھپانے) کو کہا جاتا ہے اور احتیال وخداع (دھوکے) کو بھی کہا جا سکتا ہے۔ اور ہر خفیہ تدبیر کو بھی کہا جاتا ہے۔ مکر دو قسم کا ہوتا ہے پہلی قسم محمود ہے جس کے ذریعے اچھے کام کا ارادہ کیا جائے جیسا کہ اللہ کی صفت میں ذکر کر دیا جائے۔ دوسری قسم مذموم جس کے ذریعے کسی برے کام کا ارادہ کیا جائے جیسا کہ بندوں کے متعلق مذکور ہے۔ مکر کا مادہ قرآن مجید میں 43 مرتبہ مذکور ہے۔ اور کئی معنوں میں مستعمل ہے۔ (1) خفیہ میٹنگ جو کسی پر تہمت لگانے، فساد کرنے کیلئے کی جائے جیسا کہ سورۃ یوسف آیت 31، سورۃ اعراف آیت 123 میں ہے۔ (2) شرک اور گمراہی کی طرف دعوت دینے کو بھی مکر کہا گیا ہے سورۃ نوح آیت 22 اور سورۃ سباء آیت 32۔ (3) بددعا کو بھی مکر کہا گیا ہے سورۃ فاطر آیت 42۔ (4) اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر طعن وتشنیع کرنا یہ بھی مکر ہے سورۃ یونس آیت 21۔ (5) گناہوں کو بھی مکر کہا گیا ہے سورۃ نحل آیت 45 اور سورۃ یونس آیت 21۔ (6) کسی کو ضرر دینے کیلئے خفیہ میٹنگ کرنے کو جس میں تکلیف دینا مقصود ہو مکر کہا گیا ہے جیسا کہ سورۃ یوسف آیت 2، 10 میں ہے اس معنی میں بہت زیادہ مستعمل ہے۔ (7) اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت جو کہ عذاب کی خفیہ تدبیر مراد ہے سورۃ اعراف آیت 99۔ خفیہ تدبیر بچنے کیلئے سورۃ نمل آیت 50 میں اور اس آیت میں بھی یہ معنی ہے تو یہاں پر معنی یہ ہے کہ انہوں نے خفیہ میٹنگ کی تاکہ عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر ڈالیں یا قتل کرنے کیلئے کوئی چال چلائیں۔ یہ توجیہ قرطبی اور ابن کثیر وغیرہ نے بیان کی ہیں یا انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام پر طعن وتشنیع کی اور ان کی تکذیب کی اور انہیں کو مفسد اور کاذب کہا اس قسم کی شکایات بادشاہ کو پہنچا دیں یا اس کے مقابل گمراہی کی دعوت شروع کی اور لوگوں کو اس کے خلاف ابھارتے رہے۔ یہ سب معانی درست ہیں البتہ پہلا معنی بہتر ہے۔ وَمَكَرَ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کو بچانے کیلئے خفیہ تدبیر کی اور انہیں آسمانوں پر اٹھایا جیسا کہ بعد والی آیت میں ذکر ہے۔ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ اس طرح نبی آخر الزمان ﷺ کے متعلق سورۃ انفال آیت 30 میں مذکور ہے کہ مشرکین مکہ کے شر سے اللہ تعالیٰ نے ان کو محفوظ کیا۔ امام قرطبی نے فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے صفتی ناموں میں سے ہے اسلئے اس کا استعمال دعاؤں میں مذکور ہے۔ اَللّٰهُمَّ اُمْكُرْ لِيْ وَلَا تَمْكُرْ عَلَيَّ یہ دعا نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے لہٰذا کہنے والا اس طرح کہہ سکتا ہے کہ يَا خَيْرَ الْمَاكِرِيْنَ اُمْكُرْ لِيْ۔ (صحیح جامع الصغیر حدیث 3485، مشکوۃ 2488، سلسلۃ الصحیحۃ 556، صحیح ابن ماجہ 3830، صحیح ترمذی 3551، صحیح ابوداؤد 1510)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

إِذْ قَالَ اللَّهُ يَٰعِيسَىٰٓ إِنِّى مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ وَجَاعِلُ ٱلَّذِينَ ٱتَّبَعُوكَ فَوْقَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوٓا۟ إِلَىٰ يَوْمِ ٱلْقِيَٰمَةِ ۖ ثُمَّ إِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿٥٥﴾

"اور جب فرمایا اللہ تعالیٰ نے اے عیسیٰ میں تمہیں پورا پورا لینے والا ہوں اور تمہیں اپنی طرف اُٹھانے والا ہوں اور تجھے ان لوگوں سے پاک کرنے والا ہوں جنہوں نے کفر کیا ہے اور جن لوگوں نے تیری اتباع کی ہے ان لوگوں پر قیامت تک غالب کرنے والا ہوں جنہوں نے کفر کیا ہے پھر میری ہی طرف تم نے لوٹ کر آنا ہے پھر میں ان باتوں میں تمہارے درمیان فیصلہ کروں گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے" [55]۔

تفسیر 55: اس آیت میں اس خفیہ تدبیر (مکر اللہ) کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو دشمنوں کے سولی چڑھانے اور قتل سے بچانے کیلئے کیا تھا۔ يَٰعِيسَىٰٓ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے لئے چار خوشخبریوں کا ذکر ہے اس خطاب میں تسلی اور اطمینان ہے اور چونکہ یہاں پر عیسیٰ علیہ السلام کی حفاظت مقصود ہے اسلئے ابن مریم نہیں فرمایا بلکہ جہاں اس کی اہمیت بیٹے ہونے اور الوہیت کا رد ہوتا ہے تو وہاں پر ابن مریم کا ذکر ہوتا ہے۔ پہلی بشارت إِنِّى مُتَوَفِّيكَ اس میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں (1) تیری عمر پوری کرنے والا ہوں۔ (2) تمہیں موت دینے والا ہوں پھر اس میں بھی تین قول ہیں۔ وہب کا قول ہے کہ تین ساعات کیلئے موت دی پھر زندہ کیا اور پھر آسمانوں پر لے گیا۔ محمد بن اسحاق کا قول ہے کہ سات ساعات کیلئے موت دی تھی، پھر زندہ کر کے آسمانوں پر اُٹھایا۔ ربیع کا قول ہے کہ سلا کر آسمان پر اُٹھایا۔ چوتھا قول مُتَوَفِّيكَ میں یہ ہے کہ شہوات انسانی سے تجھے پاک کر کے آسمانوں پر اٹھاتا ہوں۔ اور ملائکہ جیسی زندگی دیتے ہوئے آسمانوں پر ملائکہ کے ساتھ زندہ رکھتا ہوں۔ پانچواں قول یہ ہے کہ بدن اور روح سمیت تجھے پورا آسمانوں پر اٹھاتا ہوں۔ چھٹا قول یہ ہے کہ تجھے دنیا سے اس طرح اُٹھاتا ہوں کہ تیرا اثر فوت شدہ شخص کی طرح باقی نہ رہے۔ ساتواں قول یہ ہے کہ تیرے اعمال کو مکمل کرتا ہوں۔ ان اقوال کو صاحب اللباب اور البحر المحیط نے نقل کیئے ہے لیکن اس میں صحیح قول یہ ہے کہ تجھے پورا قبض کرتے ہیں یعنی بدن اور روح کے ساتھ اور دنیا سے بغیر موت تجھے اُٹھا کر آسمانوں پر منتقل کرتے ہیں اس کی تحقیق بعد میں ذکر ہوگی۔ دوسری بشارت وَرَافِعُكَ إِلَىَّ رفع کے معنی حقیقی کسی چیز کو نیچے سے اُوپر کی طرف اُٹھانا ہے اور صحیح حدیث میں آیا ہے کہ نبی آخر الزمان ﷺ معراج کی رات سیدنا عیسیٰ علیہ السلام سے ملاقات دوسرے آسمان پر کی ہے (متفق علیہ)۔ إِلَىَّ یہاں پر حقیقی معنی میں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا اُوپر ہونا واضح دلائل سے ثابت ہے۔ سلف صالحین کا موقف ہے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کہ اللہ تعالیٰ کیلئے صفات (فوق) علو، استوی علی العرش حقیقی معانوں میں ثابت ہے اس میں تاویل و تحریف، تشبیہ، تمثیل منع ہے۔ رَافِعُكَ ماقبل پر عطف تفسیر کے ساتھ عطف ہے۔ یعنی توفی کی کیفیت نینداور موت جیسی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کی طرف اٹھایا ہے۔ فائدہ: رفع کا مادہ قرآن مجید میں 29 مرتبہ آیا ہے جس میں 12 مقامات پر درجات کی بلندی کیلئے آیا ہے معنی مجازی میں اور ان میں سے اکثر مقامات پر لفظ درجات مذکور ہے جیسا کہ سورۃ بقرہ آیت 253 سورۃ انعام آیت 165 یا کسی قرینہ (نشانی) سے پتا چلتا ہے کہ مراد درجہ ہے جیسا کہ سورۃ اعراف آیت 176, سورۃ الشراح آیت 4 میں ہے جبکہ باقی 17 مقامات پر حقیقی معنی میں ہے ان میں سے ایک یہ مقام جبکہ دوسرا سورۃ نساء آیت 158 ہے۔ جو لوگ یہاں رفع سے مراد مقام عزت لیتے ہیں وہ غلطی پر ہے۔ امام قرطبی وابن کثیر نے ضحاک کی روایت سے عیسیٰ علیہ السلام کا واقعہ نقل کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تو عیسیٰ علیہ السلام 12 ساتھیوں سمیت ایک مکان میں جمع ہوئے یہودیوں نے چار ہزار (4000) افراد پر مشتمل لشکر لے کر اس مکان کا گھیراؤ کیا۔ دوسری روایت میں ہے کہ یہودیوں نے اس کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا کرتے ہوئے بادشاہ سے شکایت کی کہ یہ تمہاری بادشاہت کے خلاف فساد پھیلاتا ہے اس سلسلے میں انہوں نے جھوٹی شہادتیں پیش کیں یہاں تک کہ بادشاہ نے اس کو جیل میں ڈال دیا اور پھر پھانسی کا حکم دیا جب پھانسی کا منصوبہ تیار ہوا تو عیسیٰ علیہ السلام نے ساتھیوں سے کہا کہ تم میں سے کوئی میری جگہ قربانی دینے کیلئے تیار ہے تاکہ وہ میرا ہم شکل ہو اور جنت میں اعلیٰ درجہ پر فائز ہوگا اور جنت میں میرے ساتھ ہوگا ان میں سے ایک شخص نے اپنے آپ کو اس قربانی کیلئے پیش کیا وہ عیسیٰ علیہ السلام کے ہم شکل بنے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس کمرے کی چھت کو کھول کر عیسیٰ علیہ السلام کو جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے سے آسمانوں پر اٹھایا اور یہودیوں نے کمرے میں داخل ہوکر اس ہم شکل حواری کو قتل کر ڈالا پھر جب افراد کی گنتی ہوئی تو ایک شخص غائب ثابت ہوا یہودیوں میں اختلاف ہوا کہ وہ قتل ہوا ہے یا نہیں یعنی ایک تو مارا گیا تو ایک شخص اور کہاں غائب ہو گیا؟ اس شبہ کی طرف سورۃ نساء آیت 157 میں اشارہ کیا گیا ہے۔ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا اس میں آسمانوں پر اٹھانے کا فائدہ اور تیسری بشارت کا ذکر ہے یعنی آپ کو آسمانوں پر اٹھا کر کافروں کی خباثتوں اور گندگیوں سے بچا لیا ہے، اور آپ تک پہنچنے کا ان کو کوئی راستہ میسر نہیں ہوگا اور ان کی اذیتوں اور قتل سے آپ کو محفوظ کریں گے۔ وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ یہ ماقبل پر عطف ہے اور چوتھی بشارت ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کو اس کی اُمت کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بارے میں دی گئی ہے۔ اتَّبَعُوكَ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو توحید وسنت ایمان میں ان کی پیروی کرتے رہے ان کی امت میں سے ہوں یا بعد کے امت میں سے جمہور مفسرین کے مطابق۔ فَوْقَ سے درجات، کرامات، مراتب، دلائل و حجتیں مراد ہیں۔ اور بعض مفسرین کا قول ہے کہ اتَّبَعُوكَ سے مراد نصاریٰ ہیں جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے کا دعویٰ کیا تھا اگرچہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا اور الٰہ قرار دیا ہو لیکن وہ اوپر ہے اقتدار میں یہود کے مقابل یعنی بادشاہت اور حکمرانی کے حقدار ہیں۔ جیسا ابھی عالم میں یہی حال ہے بعض کا قول ہے کہ اس سے یہ آخری امت مراد ہے اور جَاعِلُ کلام مستقل ہے یہ خطاب اس امت کو ہے لیکن یہ قول بعید ہے۔ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ اختلافات عام ہیں عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہوں یا عام دینی اختلاف ہو اس میں اشارہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر اُٹھانے کے بعد بہت اختلافات پیدا ہوئے تھے اور نصاریٰ میں بہت فرقے پیدا ہو گئے تھے۔ فائدہ: حیات عیسیٰ علیہ السلام، رفع عیسیٰ علیہ السلام اور پھر آسمان سے نزول عیسیٰ علیہ السلام قیامت سے پہلے۔ اس میں تفصیل۔ پہلی بحث: اس میں کئی ابحاث ہیں لوگوں کے اختلاف کا ذکر ہے یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب کے ذریعے سے پھانسی کر کے قتل کیا گیا ہے اور پھر کچھ دن صلیب پر لٹکے رہے اور پھر دفن کر دیئے گئے یہ لوگ ان کی نبوت اور حیات سے بالکل منکر ہیں یہ لوگ تو بلا شبہ کافر ہیں۔ نصاریٰ کا عقیدہ اور قول یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھا کر قتل کر دیئے گئے تھے، اور پھر دفنا دیئے گئے تھے ایک دن یا تین دن کے بعد قبر سے نکالے گئے اور پھر زندہ آسمان پر اٹھا لیے گئے تھے، یہ قول بھی باطل ہے ان دونوں اقوال کا اللہ تعالیٰ نے رد کرتے ہوئے فرمایا وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ سورۃ نساء آیت 157۔ مسلمانوں کا قول اور عقیدہ یہ ہے کہ انہوں نے نہ تو اس کو قتل کیا ہے نہ ہی پھانسی دی ہے بلکہ سابقہ کلام میں قول وہب، قول ابن اسحاق اور قول ربیع اور جمہور مفسرین کا قول بھی گزرا ہے البتہ قرب قیامتِ میں ان کا دوبارہ نزول امتی کی حیثیت سے ہوگا نبی بن کر نہیں آئیں گے۔ اور امتی کی حیثیت سے پھر وفات پائیں گے۔ امام قرطبی نے فرمایا کہ صحیح قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بغیر نیند اور موت کے آسمانوں پر چڑھایا ہے ابن زید اور حسن بصریؒ کا بھی یہ قول ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ضحاک کا بھی یہی قول ہے، طبری نے بھی پسند کیا ہے۔ اس عقیدے کی مخالفت کرنے والے ہمیں سلف اور خلف میں نظر نہیں آئے صرف مُتَوَفِّيكَ کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ قریب کے زمانے میں مرزا غلام احمد اور منکرین حدیث پرویزیوں نے اس کا انکار کیا ہے کہ وہ آسمانوں پر اٹھایا گیا۔ اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

زندہ ہے اس سلسلے میں ان کے مختلف شبہات ہیں جن کے جوابات بعد میں ذکر ہونگے۔ دوسری بحث: حیات عیسیٰ علیہ السلام کہ وہ زندہ ہیں آسمانوں میں ہیں قرب قیامت دنیا کی طرف اُتریں گے اس عقیدہ پر دلائل بہت ہیں پہلی دلیل یہ لفظ ہے مَكَرَ اللّٰهُ انہوں نے ان کے قتل کی تدبیر کی جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بچانے کی تدبیر کی اگر دشمن اس کو قتل کر لیتے تو اللہ تعالیٰ کی تدبیر کا کیا معنی ہوگا۔ دوسری دلیل وَرَافِعُكَ اِلَيَّ اور بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ۔ رفع سے حقیقی رفع مراد ہے جیسا کہ تفصیل گزر گئی اور اِلَيَّ وَاِلَيْهِ بھی حقیقی معنوں میں ہے لہٰذا آسمانوں پر اُٹھانا مراد ہے۔ تیسری دلیل لفظ بَلْ ہے کیونکہ لفظ بَلْ منفی ضد کو ثابت کرنے کیلئے ہوتا ہے یعنی انہوں نے قتل بھی نہیں کیا اور سولی بھی نہیں چڑھایا بلکہ اللہ نے اپنی طرف آسمانوں پر زندہ اُٹھایا۔ نوٹ: یہود و نصاریٰ میں عیسیٰ علیہ السلام کی طبعی موت کا کوئی قائل نہیں۔ چوتھی دلیل: سورۃ نساء آیت 159 میں ہے جس کی تفسیر میں امام ابن جریر و ابن کثیر نے بہت سارے تابعین کے اقوال ذکر کئے ہیں انہوں نے کہا ہیں کہ راجح اور صحیح قول یہ ہے کہ نزول عیسیٰ علیہ السلام کے بعد اہل کتاب میں سے جو بھی باقی رہے گا وہ عیسیٰ علیہ السلام پر لازمی ایمان لائے گا۔ اور اس بارے میں متواتر احادیث موجود ہیں۔ ابن کثیر نے صحیح بخاری کتاب الانبیاء سے ابو ہریرہ کی روایت نقل کی ہے کہ نزول فرمائینگے تمہارے درمیان ابن مریم الخ پھر ابو ہریرہ نے فرمایا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ قرآن میں اس کی دلیل کونسی آیت میں ہے تو یہ آیت پڑھو وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ سورۃ النساء آیت 159۔ صحیح بخاری کتاب المظالم حدیث 2476 صحیح مسلم کتاب الایمان 155 اور مسند احمد 2_240 سے بھی یہ حدیث اس آیت سمیت نقل کی گئی ہے۔ پانچویں دلیل: وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ سورۃ زخرف آیت 61 ہے مفسرین نے فرمایا ہے اَنَّهٗ میں ضمیر عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہے یعنی انکا نزول آسمانوں سے قیامت کی علامت ہے امام ابن کثیر نے ابو ہریرہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہم، ابوالعالیہ، ابو مالک، حسن بصریؒ، قتادہ، ضحاک رحمہم اللہ وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ اس میں ضمیر عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہے کہ وہ قرب قیامت میں نزول فرمائینگے اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ ضمیر کو قرآن کی طرف راجع کرنا بعید ہے اس قول کو امام ابن جریر نے مختلف اسانید سے ابن عباس رضی اللہ عنہ، ابن زید، حسن بصریؒ، مجاہد، قتادہ، سدی، ضحاک رحمہم اللہ سے نقل کیا ہے۔ چھٹی دلیل: ''كَهْلًا'' کی تفسیر میں گزر گئی ہے کہ صاحب اللباب نے لکھا ہے کہ حسین بن الفضل سے سوال کیا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر قرآن مجید میں ہے؟ تو انہوں نے فرمایا ہاں پھر اُس نے وَكَهْلًا تلاوت کی۔ ابن جریر نے بھی ابو زید سے ''كَهْلًا'' کی تفسیر میں اس طرح نقل کیا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ ساتویں دلیل: امام ابن کثیر نے عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی احادیث کی دس سے زیادہ اسانید نقل کی ہیں۔ امام ترمذی نے کہا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے نزول اور قتل دجال سے متعلق روایتیں مندرجہ ذیل صحابہ کرام سے نقل ہیں عمران بن حصین، نافع بن عیینہ، ابو برزۃ اسلمی، حذیفۃ بن اسید، ابو ہریرہ، کیسان، عثمان بن ابی العاص، جابر، ابوامامہ، ابن مسعود، ابن عمرو، سمرہ بن جندب، نواس بن سمعان، عمرو بن عوف، حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہم اجمعین۔ ابن کثیر، ابن جریر، ابن عطیہ اور ابوحیان کا قول ہے کہ نزول عیسیٰ علیہ السلام کی احادیث متواتر ہیں اور ہم نے بھی (توضیح الحجۃ) کتاب میں نوے (90) روایتیں جمع کی ہیں۔ آٹھویں دلیل: امام آلوسی نے مرفوع نقل کی ہے کہ إِنَّ عِيسَىٰ لَمْ يَمُتْ وَإِنَّهُ رَاجِعٌ إِلَيْكُمْ قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ

(تفسیر طبری ص 455 روایت 733 در منثور ص 225 اس روایت میں ابوجعفر راوی کو اکثر محدثین نے ضعیف کہا ہے)

نویں دلیل: امت میں سلف و خلف محدثین کا اجماع ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں۔ اس اجماع کو ابن حجر نے تلخیص الحبیر میں جبکہ مفسر جامع البیان اور امام شوکانی نے حجج الکرامۃ ص 324 میں ذکر کیا ہے کہ یہ مجموعی دلائل اور خصوصاً حدیث متواتر اس بات کی دلیل قطعی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نزول فرمائیں گے اور یہ مسئلہ قطعی الثبوت ہے جن علماء نے اس کو ظنی کہا ہے انہوں نے غلطی کی ہے۔ تیسری بحث: اس حیات عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق مضمون میں شکوک وشبہات کرنے والوں کے جوابات ہیں۔ پہلا شبہ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ متوفی صرف موت کو کہا جاتا ہے لہذا معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو گئے ہیں۔ اس کا جواب کئی وجوہات سے دیا جا سکتا ہے۔ (1) توفی کا معنی ہے کسی چیز کو مکمل طور پر لینا جبکہ یہ حقیقی معنی ہے اور موت پر مجازاً استعمال ہوا ہے کیونکہ جب روح لی جاتی ہے تو بدن میں حواس کام چھوڑ دیتے ہیں تو وہ بھی مثل مردے کے ہو جاتا ہے لہذا اس طرح ہوتا ہے جیسا پورا لیا جائے لیکن جب حقیقت موجود ہو تو مجاز کی طرف جانے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے یہ ایک مسلّم اور کامل قانون ہے۔ تنبیہ: و ف ی کا مادہ قرآن پاک میں 66 مرتبہ مختلف طریقوں سے آیا ہے اپنی ذمہ داری پوری ادا کرنا، جزا پورا دینا، پورا حساب کرنا، عہد پورا کرنا، ناپ تول نذر پوری دینا، کسی کی روح لینا، کسی کو سلانا، سورۃ انعام آیت 60 سورۃ زمر آیت اور پورا قبض کرنا۔ ابن منظور نے کہا ہے کہ توفیت المال، کا معنی ہے کہ پورا مال لیا جائے، یہاں پر آخری معنی مراد ہے۔ امام قرطبی، ابن جریر، ابن کثیر، کبیر نے اس قول کو راجح قرار دیا ہے۔ امام رازی نے کہا ہے کہ یہ جنس ہے جس کے نیچے بہت انواع ہیں۔ اس میں موت کا معنی بھی داخل ہے جس میں آسمان پر اٹھانے کا معنی بھی ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہاں پر رَافِعُكَ کی وجہ سے مُتَوَفِّي کا معنی پورا لینا ہے۔ امام خازن اور رازی نے کہا ہے کہ جب نصاریٰ نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی روح آسمانوں پر اُٹھائی گئی اور بدن (ناسوت) زمین میں رہ گیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ (إِنِّي مُتَوَفِّيكَ) میں نے اس کا جسم اور روح دونوں قبض کر کے اُٹھائے ہیں۔ محمد طاہر الفتنی نے لکھا ہے کہ کبھی کبھار وفات قبض کے معنی میں آتا ہے لیکن موت کے بغیر اور مُتَوَفِّيكَ کا معنی ہے کہ تیرے وجود کو زمین سے ختم کرتا ہوں۔ مجمع البحار جلد 5 ص 99۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ابن جریر، خازن، ابن کثیر نے ربیع سے نقل کیا ہے کہ یہاں توفی سے مراد نیند ہے جس کا قرینہ سورۃ انعام آیت 60 میں ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ توفی تو موت کے معنی میں ہے مگر یہ تو اسم فاعل ہے امام فراء اور ضحاک نے کہا ہے کہ عبارت میں تقدیم اور تاخیر ہے یعنی ابھی آپ کو اُٹھا ئینگے اور نزول کے بعد فوت کرینگے اور تفسیر کبیر میں ہے کہ قرآن مجید میں تقدیم و تاخیر بہت جگہ ہوئی ہے جیسا کہ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي۔ چوتھی وجہ ابن اسحاق اور وہب کے قول کے مطابق تین یا سات ساعات کیلئے موت دی گئی تھی، اور پھر دنیاوی حیات دیکر آسمانوں پر اُٹھالیا بعد والی وجوہ اگرچہ ضعیف ہیں مگر ان کے نقل کرنے میں ثابت کرنا مقصود ہے کہ اگر کسی نے توفی کا معنی موت سے کیا ہے تو وہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر حیات کے منکر نہیں ہیں اگرچہ راجح قول وہی ہے جو پہلے ذکر ہوا ہے۔ تیسرا شبہ امام بخاریؒ نے مُتَوَفِّيكَ کا معنی مُمِيتُكَ سے کیا ہے یعنی تجھے موت دیتا ہوں۔ اس کا جواب مختلف طریقوں سے ہے۔

پہلا جواب: اس کو امام بخاری نے بغیر سند کے ذکر کیا ہے جبکہ عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کو صحیح اسانید سے نقل کیا ہے لہٰذا موقوف روایت اور وہ بھی بلا سند مرفوع متصل متواتر روایتوں کے مقابل نہیں ہو سکتی ہے۔ دوسرا جواب: یہ ہے کہ ابن جریر نے اس موقوف روایت کی سند نقل کی ہے جس کے اندر علی بن ابی طلحہ راوی ضعیف ہے۔ محدثین کے نزدیک منکر الحدیث ہے اور انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرسلاً روایت نقل کی ہے اس پر تفصیلی کلام میزان الاعتدال جلد 2 ص 227, تقریب ص 184 تہذیب ص 340 ج 7۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ مُتَوَفِّيكَ یہ حیات کے منافی نہیں ہے جیسا کہ گزشتہ تفسیر میں گزرا ہے۔ تیسرا شبہ: امام ابن کثیر نے سورۃ آل عمران آیت 81 میں روایت نقل کی ہے لَوْ كَانَ مُوسَى وَعِيسَى حَيَّيْنِ مَا وَسِعَهُمَا إِلَّا اتِّبَاعِي اس کا جواب کئی وجوہ سے دیا گیا ہے۔ (1) اس کی سند ہی نہیں ہے لہٰذا بے سند روایت ناقابل قبول ہے جبکہ ابن کثیر میں متواتر صحیح احادیث عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق مذکور ہیں کہ وہ آسمانوں پر ہیں اور جب زمین پر نزول فرمائینگے تو کتاب و سنت پر عمل پیرا ہونگے۔ فَأَمَّكُمْ بِكِتَابِ رَبِّكُمْ تَبَارَكَ وَتَعَالَى

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وَسُنَّةَ نَبِيِّكُمْ (صحیح بخاری کتاب الانبیاء حدیث 3449، صحیح مسلم باب الایمان 155)۔ چوتھا شبہ: جامع العتبیہ میں امام مالک کا قول مذکور ہے کہ مَاتَ عیسیٰ علیہ السلام وَهُوَ ابْنُ ثَلَاثٍ وَّ ثَلَاثِيْنَ سَنَةً۔ جواب یہ کتاب امام مالک کی تصنیف نہیں ہے بلکہ قرطبی نامی فقیہہ اندلسی شخص کی ہے اور یہ بے سند قول ہے۔ پانچواں شبہ: نزول عیسیٰ علیہ السلام سے مراد پیدائش ہے کہ ان کی مثل وشبیہ پیدا ہوگی اور نزول سے مراد اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا ۔ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ پیدائش مراد ہے یعنی اس جیسا شخص پیدا ہوگا یہ تاویل مرزا غلام احمد کی ہے مگر یہ تاویل بھی باطل ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق يَنْزِلُ فِيْكُمْ آیا ہے جبکہ یہ صیغہ مجرد ہے اور مجرد تو پیدائش کے معنی میں کبھی نہیں آیا اور جو مقامات انہوں نے بطور دلیل پیش کیے ہیں وہ انزال فعل مزید ہے وہ تو اس پیدائش کے معنی میں آتا ہے جو تدبیرات سماویہ سے ہو تیز کسی حدیث میں لفظ مثل ذکر نہیں ہوا ہے لہذا یہ تو حدیث میں تحریف ہے۔ چھٹا شبہ: نزول عیسیٰ علیہ السلام سے تو ختم نبوت کے عقیدہ پر ضرب پڑتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام تبع اُمتی بن کر اتریں گے وصف نبوت کے ساتھ نہیں آئیں گے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا لَمَا وَسِعَهُ اِلَّا اتِّبَاعِيْ احمد 3 / 387 دارمی 441 شعب الایمان 177 شیخ البانی نے اس روایت کو حسن کہا ہے۔ خَتْمِ نُبُوَّت کا معنی یہ ہے کہ کوئی نئی نبوت لیکر تشریعی یا غیر تشریعی نبی نہیں آئے گا۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿56﴾

"پس وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا انہیں دنیا و آخرت میں سخت ترین عذاب دوں گا اور ان کیلئے کوئی مددگار نہیں ہوگا" (56)

تفسیر 56: اس آیت میں قیامت کے دن واقع ہونے والے فیصلے کا ذکر ہے اور کفر کرنے والوں کیلئے تخویف دنیاوی و آخروی ہے جو کہ عام بھی ہے اور خصوصاً منکرین عیسیٰ علیہ السلام کے لئے شَدِيْدًا یعنی کیفیت سخت ہے یا مقدار زیادہ اور مدت ہمیشہ کیلئے ہے۔ فِي الدُّنْيَا قیدی بنانا، جزیہ لینا، قتل کرنا اور دنیا میں عذاب کی دیگر شکلیں مراد ہے۔ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ان کی جماعتیں، شرکاء، پیر دکار ان کی کچھ بھی مدد نہیں کر سکیں گے۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿57﴾

"البتہ وہ لوگ جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کیے پس ان کو پورا دیگا ان کا اجر اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتا" (57)

تفسیر 57: اس آیت میں خوشخبری ہے فَيُوَفِّيْهِمْ ۔ تَوَفِّيْ کامل اجر دینا مقصود ہے جس میں کوئی کمی نہ ہو۔ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ اس میں ایک اشکال کا جواب ہے۔ اشکال یہ تھا کہ دنیا میں کافروں کو اللہ تعالیٰ نے مال، اولاد، عیش، طویل عمر وعزوں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے نوازا ہے کیا یہ محبت کی دلیل نہیں ہے۔ جواب دیا گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں ہے بلکہ یہ استدراج اور مہلت ہے۔

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ۵۸

"یہ واقعات جو نشانیوں میں سے اور حکمت والے ذکر میں سے ہیں آپ کو بیان کرتے ہیں" [58]

تفسیر 58: اس آیت میں نبی کریم ﷺ کو خطاب ہے اور بطور جملہ معترضہ ان کی سچائی کا ذکر ہے۔ ذٰلِكَ زکریا و مریم علیہما السلام سے پہلے واقعات کی طرف اشارہ ہے۔ نَتْلُوْهُ تلاوت کی نسبت اللہ کیلئے حقیقتاً ہے اور یہ بھی دلیل ہے کہ الفاظ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ مِنَ الْاٰيٰتِ من تبعیض کیلئے ہے کیونکہ آیتیں تو صرف یہ نہیں ہیں جو بیان ہوئی ہیں بلکہ اور بھی ہیں۔ آیات سے مراد قرآنی آیتیں، معجزات اور عجیب کام خرق عادت امور زکریا و مریم علیہما السلام کے واقعات جو ہمارے نبی کیلئے معجزہ ہے۔ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ اس سے مراد قرآن ہے کیونکہ اس میں عقیدہ و اعمال کا ذکر ہے حکیم محکم مضبوط کے معنی میں یا حکمتوں سے بھرا ہوا ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ یہ حکیم ذات نے نازل کیا ہے یا ذکر حکیم سے لوح محفوظ مراد ہے جس میں سارا قرآن موجود ہے۔

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۵۹ "عیسیٰ علیہ السلام کی مثال آدم علیہ السلام کی مثال کی مانند ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے بنایا پھر اسے فرمایا کہ ہو جا تو وہ ایک (انسان) ہو گیا یہ آپ کے رب کی طرف سے حق ہے لہٰذا آپ شک کرنے والوں میں سے مت ہونا" [59]۔

تفسیر 59: یہ نصاریٰ کے ایک شبہ کا جواب ہے انہوں نے کہا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے ہیں لہٰذا یہ اللہ تعالیٰ کے بیٹا اور الٰہ ہیں۔ ان کا یہ کہنا بڑا ظلم ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ اور یہ ان دونوں آیتوں میں ربط بھی ہوا۔ تو جواب دیا گیا ہے کہ اگر والد نہ ہونا سبب الوہیت ہو تو پھر تو آدم علیہ السلام الوہیت الٰہی کے زیادہ حقدار ہے کیونکہ نہ تو آدم علیہ السلام کا باپ تھا اور نہ ہی ماں۔ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى۔ مَثَلَ کا معنی شان، حال اور صفت ہے۔ عِنْدَ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم و تقدیر میں ہے۔ كَمَثَلِ اٰدَمَ یہ تشبیہ ایک عجیب چیز کی ہے۔ دوسری (اعجب) زیادہ تعجب خیز چیز کے ساتھ یعنی تشبیہ صرف بعض وجوہ میں کافی ہوتی ہے اگرچہ درمیان مشبہ اور مشبہ بہ میں فرق جہت ہو یہاں تشبیہ اس میں ہے کہ آدم علیہ السلام کا بھی باپ نہیں تھا۔ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ حرف کاف میں جو تشبیہ دی گئی تھی یہ اس کی تفسیر ہے۔ خَلَقَ کا معنی انشاء (بنانا) یا شکل تیار کرنا یا تقدیر (اندازہ) کرنا ہے۔ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فَيَكُوْنُ۔ سوال: آدم علیہ السلام کا مٹی سے پیدا کرنا لفظ کن کے بعد ہے تو لفظ ثُمَّ کیوں استعمال کیا ہے؟ جواب (1): ثُمَّ تعقیب ذکری کیلئے ہے اور قرآن پاک میں اس کا استعمال بہت زیادہ ہے ان میں سے ایک مقام سورۃ بلد آیت 17 ہے۔ جواب (2): امام راغب نے فرمایا ہے کہ پہلے اس کو مٹی سے شکل وصورت عطاء کی پھر کچھ مدت کے بعد اسے فرمایا کُنْ (انسان ناطق) ہوجاؤ تو اسی طرح ہوگیا۔ اس میں ثُمَّ اپنے معنی میں ہے۔ سوال: یہاں پر فعل ماضی مناسب تھا یعنی فَکَانَ ہونا چاہیے تھا۔ امام بقاعی کا قول ہے کہ یہ فعل مضارع ماضی کے معنی میں ہے لیکن فعل مضارع میں ماضی کی حالات کی حکایت ہوتی ہے اور اس میں تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا لفظ کُنْ سے مستقبل کے زمانہ میں بھی مرادیں مکمل ہوتی ہے للہذا یہ ماضی کے ساتھ خاص نہیں ہے۔

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝

"یہ بیان آپ کے رب کی جانب سے حق ہے للہذا آپ شک کرنے والے گروہ میں سے مت ہونا" [60]۔

تفسیر 60: یہ مخفی مبتداء کی خبر ہے یعنی هٰذَا الْحَقُّ اس میں عیسیٰ علیہ السلام کے حالات کی طرف اشارہ ہے یعنی ان کی تفصیلات وغیرہ اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہودیوں کا قول حق نہیں اور نہ ہی نصاریٰ کا۔ یا عیسیٰ علیہ السلام کی مثال جو آدم علیہ السلام کے ساتھ دی گئی ہے وہ حق ہے۔ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ یہ خطاب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ سے کیا ہے مگر مراد امت ہے کہ یہود ونصاریٰ کے مختلف اقوال کی وجہ سے اس حق سے اعراض اور شک مت کریں۔ فائدہ: کعبہ کے متعلق یہود ونصاریٰ اور مشرکین نے جو اختلاف کیا تھا وہ ضد وعناد پر مبنی تھا اس لیے وہاں تاکید فرمائی کہ فَلَا تَكُوْنَنَّ جبکہ یہاں پر اختلاف یہود کی ضد وعناد پر اور نصاریٰ کے جہل پر مبنی ہے اس لیے زیادہ تاکید کی ضرورت نہیں تھی تو فَلَا تَكُنْ فرمایا۔

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝ "پس جو بھی علم آجانے کے بعد تجھ سے جھگڑے تو فرمادیجئے کہ آؤ اپنی اپنی فرزندوں کو اور اپنی اپنی عورتوں کو اور اپنی اپنی جانوں کو بلا کر اب سے گڑگڑا کر التجا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کے لعنت کریں" [61]۔

تفسیر 61: دلائل بیان کرنے اور مناظرہ اور نصاریٰ کے شبہات رد کرنے کے بعد اب انہیں مباہلہ کی دعوت دی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جارہے ہیں تاکہ اس حق کا اظہار ہو جائے جو سابقہ آیت میں لفظ اَلْحَقُّ میں ذکر ہوا ہے۔ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ محاجہ صرف جھگڑا کرنا ہے کیونکہ سابقہ بیان کے بعد اب ان کے پاس کوئی صحیح دلیل باقی نہیں رہی۔ فِيْهِ میں ضمیر عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت رسالت عبدیت کی طرف راجع ہے یعنی وہ بندہ نبی و رسول ہیں۔ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ علم سے مراد قرآن کریم ہے یعنی قرآن کریم سے ثابت ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام بشر، نبی و رسول ہیں۔ ابن اللہ اور الٰہ قطعاً نہیں ہے۔ فَقُلْ تَعَالَوْا امام دمشقی نے (اللباب) میں لکھا ہے کہ یہ عُلُو سے لیا گیا ہے بلند مکان کی طرف دعوت کو کہا جاتا ہے پھر اس میں وسعت کی گئی لہٰذا ہر بلند و عالی شان کی طرف دعوت میں استعمال ہوتا ہے۔ نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ انسان کو اولاد سے محبت بہت زیادہ ہوتی ہے اور تکلیف والی جگہ سے اولاد کو بچاتا ہے لہٰذا مباہلہ میں ان کی حاضری اس بات کی دلیل ہے کہ یہ انسان اپنے مقصد میں یقین پر پختگی سے قائم ہے۔ مستدرک حاکم (ترمذی حدیث 2999) اور ابوداؤد طیالسی میں روایت ہے کہ نبی اکرم علیہ السلام نے فاطمہ، حسن، حسین اور علی رضی اللہ عنہم کو حاضر کیا تھا اس میں دلیل ہے کہ بیٹی کی اولاد اور داماد بھی اولاد میں داخل ہیں۔ وَنِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ اس میں بیویاں بیٹیاں داخل ہیں انسان بیٹوں کے بعد بیٹیوں اور بیویوں کو بچانا چاہتا ہے اور ان کا بچاؤ لازمی طور پر کرتا ہے لہٰذا ان کو حاضر کرنا بھی اپنے دعوے پر یقین کی علامت ہے۔ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ سے مراد ساتھی اور ہم جنس ہیں کیونکہ قرآن مجید میں ہم جنس کیلئے اس کا استعمال بہت مقامات پر ہوا ہے لہٰذا اس میں علی رضی اللہ عنہ بھی داخل ہے یا اس سے نبی اکرم علیہ السلام کی ذات مراد ہے اور عرف سے اپنے آپ کو آواز دینا ثابت ہے، ابوحیان نے لکھا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حسن، حسین، فاطمہ اور علی رضی اللہ عنہم کو نصاریٰ سے مباہلہ کا ارادہ کرنے سے پہلے لیکر آئے تھے جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے۔ اگر نصاریٰ دعوت مباہلہ قبول کرتے تو مومنین اپنے بیٹوں اور خواتین سب کو حاضر کرتے۔ اس میں دو اقوال ہیں (1) دعاء میں عاجزی، انکساری اور اخلاص کا اظہار کرنا، دعا ہو یا بددعا ہو۔ (2) ہلاکت اور لعنت کی دعا، بُهْلَةٌ لعنت کو کہا جاتا ہے۔ اِبْتِهَالٌ اکثر بددعاء میں استعمال ہوتا ہے کبھی کبھار دعا میں بھی استعمال ہوتا ہے اور یہاں پر باب افتعال تَفَاعُلٌ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ مشہور معنی کے اعتبار سے جو کہ دعاء شر ہے یہ اس کی تفسیر ہے اور دوسرے معنی کے اعتبار سے یہ بددعاء کو خاص کرنے کیلئے ہے۔ فائدہ 1: مفسرین نے اس آیت کے ضمن میں وفد نجران کا واقعہ تفصیل سے ذکر کیا ہے جنہوں نے مباہلہ سے انکار کرتے ہوئے جان چھڑانے کا راستہ اختیار کیا۔ یہ وفد 60 افراد پر مشتمل تھا جن کا سردار عاقب تھا جبکہ حرید

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

14 سردار بھی اس قافلے میں موجود تھے۔ اس سورۃ کی (80) سے زیادہ آیتیں ان کے متعلق نازل ہوئی تھیں لہٰذا ان کا مباہلہ سے انکار رسول ﷺ کی سچائی پر واضح دلیل ہے۔ فائدہ 2: مفسر آلوسی نے لکھا ہے کہ مباہلہ کرنا اب بھی جائز ہے دلیل یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک شخص سے اختلاف ہوا تو اس کو مباہلہ کی دعوت دی اور حجر اسود کی طرف منہ کیا اور ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور اس آیت کی تلاوت کی امام حاکم نے بھی اس کو مستدرک میں نقل کیا ہے۔ اسی طرح مفسر قاسمی نے بھی لکھا ہے کہ جب کوئی شخص شرعی مسئلہ سے انکار کرتا ہو تو اس کے ساتھ مباہلہ کرنا جائز ہے پھر انہوں نے مباہلہ شرعی کیلئے شروط ذکر کی ہیں یعنی جب کسی شرعی مسئلہ میں ضد وعناد واقع ہو جائے تو اس میں مباہلہ ہو سکتا ہے اس کیلئے اہم شرط یہ ہے کہ (1) فریق مخالف پر پہلے حجت قائم کی جائے گی۔ (2) پھر ان کے شبہات کا ازالہ کیا جائے گا۔ (3) پھر نصیحت کی جائیگی اگر نہیں مانے گا تو اسے مباہلہ کی دعوت دی جائیگی۔ میں کہتا ہوں کہ اس سورۃ کے گذشتہ مضمون جس میں عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق نصاریٰ کا رد کیا گیا تھا پھر ان کے شکوک وشبہات کا ازالہ کیا گیا پھر نصیحتیں تنبیہات (ڈرایا جانے) کا ذکر کیا گیا پھر اس آیت کی ابتداء میں حرف (فا) لایا گیا جو مذکورہ شرطوں کی دلیل ہے۔ امام ابن قیم الجوزی نے منکرین اسماء وصفات کو مباہلہ کا چیلنج دیا تھا کہ حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان مباہلہ کرینگے لیکن جہمیہ وغیرہ جو تاویل کرنے والے ہیں انہوں نے اس دعوت کو قبول نہیں کیا اور مباہلہ سے راہِ فرار اختیار کی۔ اس کو قصیدہ نونیہ کی ابتداء میں ذکر کیا ہے۔ نیز ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اوزاعی نے فروعی مسائل میں مباہلہ کرنے کی دعوت دی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ ان فرعی مسائل میں ہے کہ صحیح حدیث میں ثابت ہوں اور فریق مخالف عناد وحسد کی وجہ سے انکار پر مصر ہو۔ فائدہ 3: اہل تشیع نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ تمام نبیوں سے افضل اور آخری نبی کے برابر ہیں ان کا استدلال اس طرح ہے أَنْفُسَنَا میں نبی کا نفس تو مراد نہیں ہے کیونکہ اپنے نفس کو کوئی دعوت نہیں دیتا ہے لہٰذا صحیح مسلم کی حدیث سے ثابت ہوا ہے کہ علی کے نفس کو نبی نے اپنا نفس قرار دیا اور نبی تو تمام نبیوں سے افضل ہے لہٰذا علی رضی اللہ عنہ تمام نبیوں سے افضل ہوا اور صحابہ کرام پر بھی فضیلت حاصل ہوئی۔ اس کا تفصیلی جواب امام رازی وآلوسی نے لکھا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نفس سے نبی کی ذات مراد ہے اور عرب کہتے ہیں کہ دَعَوْتُ نَفْسِي إِلَى كَذَا اور نبی کی ذات اگر مراد نہ ہو تو تمام صحابہ کرام مراد ہیں کیونکہ أَنْفُسَ کا اطلاق ہم جنس پر ہوتا ہے لہٰذا اس سے علی کی تخصیص ثابت نہیں ہوتا۔ نیز اگر کہا جائے کہ علی کو نبی نے حاضر کیا تھا جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی اکرم نے ان کو بیٹے کے مقام سے حاضر کیا تھا کیونکہ داماد بمقام بیٹا ہوتا ہے جبکہ نبی بذات خود حاضر تھے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا اللَّهُ ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٦٢﴾ "یقیناً یہ بیان سچا ہے اور کوئی بندگی (عبادت) کا لائق سوائے اللہ تعالیٰ کے نہیں ہے اور بلاشبہ وہی خوب غالب نہایت حکمت والا ہے" [62]

تفسیر 62: یہ ماقبل کے بیان کی تشریح اور تاکید ہے جس میں نتیجہ بھی ذکر ہے ہٰذَا میں عیسیٰ علیہ السلام کے تفصیلی حالات کی طرف اشارہ ہے۔ اَلْقَصَصُ یہ مصدر ہے جس کا معنی ہے نقش قدم پر چلنا جیسا کہ سورۃ کہف آیت 64 میں مذکور ہے۔ عرف میں پے در پے واقعات بیان کرنے کو کہا جاتا ہے۔ اَلْحَقُّ اس میں یہود و نصاریٰ کے بیان کا رد ہے کہ وہ باطل اور جھوٹ بول رہے ہیں۔ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ جب سابقہ بیان میں عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ان کے عقائد کی تردید ہوئی خصوصاً عقیدہ، ولدیت اور الوہیت پر تو اب اس پر عطف عام واستغراق کے طور پر ہو رہا ہے۔ مِنْ برائے استغراق ہے تو اس میں ہر اس شخص کا رد ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو صفات الوہیت میں شریک ٹھہراتا ہو۔ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ اس میں مدعیٰ پر دلیل کو عطف کیا ہے عَزِیْزٌ اور حَکِیْمٌ میں صفات الوہیت کا خلاصہ ہے۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِالْمُفْسِدِينَ ﴿٦٣﴾ "پس اگر یہ لوگ پھر گئے تو اللہ تعالیٰ فسادیوں کو جانتا ہے" [63]۔ ع

تفسیر 63: یہ تخویف ہے۔ تَوَلَّوْا۔ اَلْقَصَصُ: اَلْحَقُّ یعنی ان وضاحتوں کے بعد منہ پھیرنا مراد ہے یا مباہلہ سے منہ پھیرنا مراد ہے۔ تَوَلّٰی فعل ماضی غائب ہے یا فعل مضارع مخاطب ہے اور (تا) حذف کیا گیا ہے۔ فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ بِالْمُفْسِدِیْنَ اس میں عذاب کا سبب ذکر ہو رہا ہے کہ فساد کرنا سبب عذاب ہے اور اللہ تعالیٰ کا علیم ہونا عذاب دینے سے کنایہ ہے۔ بِالْمُفْسِدِیْنَ میں اشارہ ہے کہ مناظرہ ومباہلہ سے منہ پھیرتے ہیں ضد وعناد کرتے ہیں اور لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں تو یہ فساد ہے۔ اللباب میں ہے کہ مفسدین وہ لوگ ہیں جو غیر اللہ کی بندگی کرتے ہیں اسلئے بعد میں رد شرک فی العبادت کیا گیا ہے۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ ۚ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿٦٤﴾ "اے اہل کتاب آؤ ایسے کلمے کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے (اور وہ یہ ہے) کہ ہم عبادت نہیں کرینگے مگر ایک اللہ کی اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائینگے اور رب نہ بنائیں ہمارے بعض بعض کو اللہ تعالیٰ کے سوا پھر اگر وہ اس سے روگردانی کریں تو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تم کہو کہ گواہ رہو (اس بات پر) کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں" [64]۔

تفسیر 64: اس آیت سے 101 آیت تک اس سورۃ کا دوسرا حصہ ہے اور مقصد اس حصے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق کا اثبات ہے، آخری رسول کے منکرین کے چودہ خباثتیں ذکر کرنے کے ساتھ اور ساتھ ساتھ ان کے اعتراضات کے جوابات ہیں۔ اہل کتاب یہود ونصاریٰ کیلئے حق کی طرف دعوت ہے۔ ان کی چودہ (14) خباثتوں اور چار اشکالات کے جوابات بھی 93، 70، 65، اور 96 میں ذکر ہے اس آیت میں ان کیلئے دعوت توحید ہے اور اشارہ ہے کہ ان میں تین قسم کا شرک موجود ہے۔ (1) شرک فی العبادت، (2) حلول کا عقیدہ، (3) شرک فی الربوبیت جو شریعت وطاعت کے معنیٰ میں ہے اور یہ بڑی خباثت ہیں۔ ربط: سابقہ آیت میں ان کے شبہات کا رد کیا گیا اور ان کے مباہلے سے فرار کا ذکر ہوا تو اب ان کو خالص توحید کی دعوت دی جاتی ہے۔ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ خطاب نصاریٰ کو ہے کیوں کہ سابقہ کلام کے ذریعے بھی ان سے خطاب تھا جبکہ امام ابن کثیر نے فرمایا ہے کہ یہ خطاب عام ہے صَابِئِيْنَ یہود اور اس امت کے لوگ بھی اس میں شامل ہیں۔ اِلٰى كَلِمَةٍ یہ جملہ مفیدہ ہے اور بعد والا جملہ اس کی تفسیر ہے لہٰذا یہ مفرد نہیں ہے کہ جیسا نحویوں نے کہا۔ سَوَآءٍ یہ مُسْتَوِيَةٍ اور عَدْلٍ ہے۔ ابن عطیہ کا قول ہے کہ یہ عام مشہور معنیٰ میں ہے یعنی ہم اور تم چھوٹے اور بڑے سب اس میں برابر کے شریک ہیں یا مطلب یہ ہے کہ تمہارے دین میں بھی یہی بات ہے اور ہمارے دین میں بھی۔ امام قاسمی نے فرمایا کہ اس کلمہ میں اعتدال یہ ہے کہ شرک اور تعطیل سے پاک ہے یعنی صفات الٰہی میں عدل پر قائم ہے اور رسولوں میں بھی عدل وانصاف ہے یعنی تمام رسولوں پر ایمان ہے۔ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ اس میں رد شرک فی العبادت ہے کیونکہ نصاریٰ عیسیٰ و مریم علیہما السلام کی عبادت کرتے ہیں۔ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا اس میں مطلق شرک کا رد ہے اور عقیدہ حلول کا بھی رد ہے اور اس کلام میں شَيْئًا مفعول مطلق ہے۔ شَيْئًا مِنَ الْاِشْرَاكِ کسی چیز میں بھی کوئی چیز اللہ تعالیٰ کی شریک نہیں ہو سکتی۔ بقول ابن کثیر کوئی وثن، صلیب، صنم، طاغوت، آگ اور نہ کوئی اور چیز کیونکہ شَيْئًا نکرہ ہے اور جب نکرہ سیاق نفی میں آ جائے تو زیادہ عموم پر دلالت کرتا ہے۔ سوال: جب اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ اس میں شرک کا رد ہے تو دوسرا جملہ کس مقصد کیلئے ذکر کیا ہے؟ جواب (1): پہلے جملے میں رد صرف شرک فی العبادت پر تھا جبکہ دوسرے جملے میں شرک کی تمام اقسام کا رد ہوا ہے۔ جواب (2): نصاریٰ کا کہنا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام میں حلول کیا ہے اسلئے اس کی عبادت تو عین اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے تو اس جملے میں جواب ہوا کہ یہ عقیدہ شرک کو مستلزم ہے کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنایا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ یہ شرک کی تیسری قسم پر رد ہے جس کو شِرْكٌ فِي الْإِطَاعَةِ وَ التَّشْرِيْعِ وَالْحُكْمِ کہا جاتا ہے اسی طرح سورۃ توبہ آیت 31 اور آیت 80 میں مذکور ہے اور یہاں ربوبیت سے مراد تصرف ہے احکام بنانے اور اس میں حلال وحرام کرنے اور اختیارات استعمال کرنے اور معصیت میں انکی اطاعت وغیرہ جیسا کہ مفسرین نے ابن جریج سے نقل کیا ہے اور بے دلیل بات ماننے کو بھی معصیت کہتے ہیں جیسا کہ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی روایت میں مذکور ہے کہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ سے فرمایا کہ ہم نے مولویوں اور پیروں کی عبادت نہیں کی ہے۔ جواب میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا انہوں نے تمھارے لئے جو کچھ حلال اور حرام کیا تھا تم نے اس کو بے دلیل نہیں مانا۔ (صحیح ترمذی کتاب التفسیر 3095)۔ امام قرطبی وطبری نے لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے مولویوں اور پیروں کو حلال وحرام میں رب کے مرتبے پر فائز کیا تھا اور وہ ان کے سامنے سجدہ بھی کرتے تھے۔ امام قرطبی نے لکھا ہے کہ اس میں دلیل ہے کہ وہ استحسان جو کتاب وسنت سے ثابت نہ ہو تو وہ باطل ہے اس میں ان لوگوں کا بھی رد ہے جو کسی امام کی تقلید کرتے ہوئے حرام وحلال میں بلا دلیل شرعی ان کے اقوال قبول کرتے ہیں۔ امام قرطبی نے اس میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تقدیرات میں ذکر کیا ہے جو انہوں نے بغیر شرعی دلیل کے بنائی ہیں۔ اکثر مقلدین نے عشر فی الحشر میں امام صاحب کے قول کی طرف نسبت کرتے ہوئے مسائل گھڑ لئے ہیں۔ اس میں روافض (اہل تشیع) کا بھی رد ہے۔ وہ اس مسئلہ میں امام کی تقلید کو واجب مانتے ہیں۔ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِأَنَّا مُسْلِمُوْنَ اگر وہ مسئلہ توحید میں موافقت سے انکار کریں تو تم انصاف کرو اور ان سے کہو ہمارے لئے گواہی دو کہ ہم تو مسلم ہیں یعنی اسلام پر عمل پیرا ہیں اور تم کفر کے مرتکب ہو۔ اس میں ان پر (تعریض) رد کیا گیا ہے کہ انہوں نے اسلام سے منہ پھیرا اور لفظ اَلْمُسْلِمُوْنَ میں دلیل ہے کہ یہ اسلام کی دعوت ہے اور اسلام تمام انبیاء کا دین ہے اور حدیث میں ہے کہ نبی اکرم علیہ السلام نے ہرقل بادشاہ کو خط میں لکھا تھا کہ اِنِّيْ أَدْعُوْكَ بِدِعَايَةِ الْإِسْلَامِ اور اس آیت کو تحریر کیا تھا لیکن اس نے آخرت پر دنیا کو ترجیح دی۔ (صحیح بخاری کتاب بدا الوحی حدیث 7)

يَا أَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَاجُّوْنَ فِيْٓ إِبْرٰهِيْمَ وَمَآ أُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْإِنْجِيْلُ إِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٦٥﴾

"اہل کتاب تم کیوں جھگڑتے ہو ابراہیم علیہ السلام کے متعلق جبکہ نہیں نازل ہوئی تورات وانجیل مگر اس کے بعد کیا تم عقل نہیں رکھتے" [65]۔

تفسیر 65: اس آیت میں ان کی دوسری خباثت کا ذکر ہو رہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی یا نصرانی تھے اور ان کو دعوت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دی گئی ہے کہ اس جھوٹے دعوے سے باز آ جاؤ۔ ان کے رد کا خلاصہ یہ ہے۔ تورات اور انجیل جو ابراہیم علیہ السلام سے بہت بعد میں نازل ہوئی ہیں اس میں یہودیت اور نصرانیت کا ذکر ہے لہٰذا وہ یہودیت اور نصرانیت جس کو تم لوگوں نے تورات، انجیل کے بہت بعد ایجاد کیا ہے اس کی طرف ابراہیم علیہ السلام کو منسوب کرنا تو نرا جھوٹ ہے۔ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ ۔ لِمَ میں استفہام انکاری ہے اور محاجہ سے مراد بے دلیل جھگڑا ہے۔ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَ الْاِنْجِیْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ یہ جملہ ماقبل سے حال بنا ہے اور مورخین نے دو قول تحریر کئے ہیں۔ (1) ابراہیم، موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام کے درمیان (2000) دو ہزار سال کا فاصلہ ہے۔ (2) ایک ہزار چھ سو تیس (1630) سال کا فاصلہ ہے۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ یعنی یہ بات تو عقل کے بھی خلاف ہے کہ پہلے آنے والے شخص کی نسبت بنائے گئے بعد والے دین کی طرف کی جائے۔

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِیْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِیْمَا لَیْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۶۶ "سنو تم وہی لوگ تو ہو کہ جھگڑا کیا تم نے اس بات میں جس کا کچھ تمہیں علم تھا اب تم اس بات کے متعلق کیوں جھگڑتے ہو جس کا تمہیں کچھ بھی علم نہیں اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے" [66]۔

تفسیر 66: یہ بھی ان کے باطل دعوے کا رد ہے۔ هٰٓاَنْتُمْ مبتداء ہے حَاجَجْتُمْ خبر اور درمیان میں هٰٓؤُلَآءِ ان کی ذلت و اہانت کیلئے ہے اور (یا) اس میں مقدر ہے۔ یا پھر هٰٓاَنْتُمْ مبتداء اور هٰٓاَنْتُمْ خبر ہے۔ فِیْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ اس سے مراد ان کا دین ہے جو ان کی کتابوں میں مذکور ہے اور ان کو اس دین کے بارے میں معلومات بھی ہیں جس میں عیسیٰ علیہ السلام کے حالات کا ذکر ہے جبکہ وہ اس سے انکار کرتے ہیں اور اس میں جھگڑتے ہیں یا مراد محمد ﷺ کے وہ حالات و صفات ہے جو ان کی کتابوں میں مذکور ہیں لیکن یہ لوگ انکار پر مصر ہیں۔ فِیْمَا لَیْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ اس سے ابراہیم علیہ السلام کے حالات مراد ہیں۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی یا نصرانی تھے جبکہ یہ دعویٰ تو بالکل بے علمی پر بنا ہے اور بے دلیل بات اور جھگڑا ہے اور اس میں ان کی تذلیل میں اضافہ ہے کہ معلوم بات میں جھگڑا بری بات ہے تو بے علمی کے باوجود جھگڑا تو بہت ہی بدتر ہے امام قرطبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس میں اس جدال سے منع ہے جس کی تحقیق ان کو حاصل نہ ہو۔ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ یہ تاکید ہے ان کی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں بے علمی کے لئے ان کا دعویٰ بے دلیل ہے اور حق بیان کرنے کیلئے ترغیب ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کے علم پر بنا ہے۔

مَا كَانَ اِبْرٰهِیْمُ یَهُوْدِیًّا وَّ لَا نَصْرَانِیًّا وَّ لٰكِنْ كَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝۶۷

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

"ابراہیم علیہ السلام یہودی اور نصرانی نہیں تھے بلکہ وہ سچے پکے تابع موحد تھے اور وہ مشرکین میں سے بھی نہیں تھے" (67)

تفسیر 67: یہ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ کی تشریح ہے اور یہودیوں کا صریح اور واضح رد ہے یعنی ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ان کا جو دعویٰ تھا اس کی تردید زوردار انداز میں کی گئی۔ صاحب اللباب، ابن عطیہ اور ابوحیان نے لکھا ہے کہ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ میں یہود و نصاریٰ کا رد ہے کہ وہ مشرک ہیں اس کی مزید تفصیل سورۃ بقرہ آیت 135 میں گزر چکی ہے۔

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۸﴾

"بلاشبہ ابراہیم علیہ السلام کے قریب تر وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس کی اتباع کی یہ نبی اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور اللہ تعالیٰ مومنوں کا دوست ہے" [68]۔

تفسیر 68: اس آیت بھی میں یہود و نصاریٰ کا رد ہے مگر سابقہ تین آیتوں کے نتیجے کے طور پر یعنی جب ابراہیم علیہ السلام یہودی و نصرانی نہیں تھے تو ان لوگوں کو ان کی طرف اپنی نسبت کا حق نہیں ہے۔ اَوْلٰى ان کی طرف نسبت کرنا لائق کے معنی میں ہے یا اقرب کے معنی میں ہے یعنی بہت قریب نسبت کرنے میں ابراہیم علیہ السلام کو۔ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ یہ عام ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ ہو یا موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کا دور ہو یا فترت وحی کا دور ہو۔ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یہ تخصیص بعد التعمیم ہے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی شرافت اور عظمت کے اظہار کے لئے۔ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ ولی مددگار، دوست، نصرت دینے والے، توفیق دینے والے۔ ایمان والوں کو الْمُؤْمِنِيْنَ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے داخل ہیں۔

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾ "اہل کتاب میں ایک گروہ کی چاہت ہے کہ وہ تمہیں گمراہ کردے اور وہ نہیں گمراہ کرتے ہیں مگر اپنی ہی جانوں کو اور ان کا شعور نہیں ہے" [69]

تفسیر 69: اس آیت میں ان کی تیسری خباثت کا ذکر ہو رہا ہے یعنی سابقہ باطل دعویٰ کہ (ابراہیم علیہ السلام یہودی یا نصرانی تھے) لوگوں کو گمراہ کرنے کیلئے کرتے ہیں۔ سورۃ بقرۃ آیت 109 میں گزرا ہے کہ لوگوں کو دین حق سے مرتد کرنے کیلئے آخری نبی پر اعتراضات کرتے ہیں لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کیلئے وہ ایسا کرتے تھے۔ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اس میں مِّنْ برائے تبعیض ہے جس کیلئے قرینہ طَّآئِفَةٌ ہے یعنی اہل کتاب میں سے فاسق لوگ ہیں۔ وَدَّتْ یہ تمنا کے معنی میں ہے اس کے ساتھ لو مصدریہ استعمال ہوتا ہے جبکہ أَحَبَّ کے ساتھ لو استعمال نہیں ہوتا ہے۔ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ:

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اضلال گمراہ کرنے مرتد کرنے دونوں کو شامل ہے۔ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ دوسروں کو گمراہ کرنے کی کوشش میں یہ خود گمراہ ہوتے ہیں اگرچہ ان کی دعوت سے لوگ مرتد ہوں یا نہ ہوں کیونکہ کسی کو کفر کا کلمہ سکھایا یا عمل کفر کی ترغیب دی تو ایسا شخص کافر ہو جاتا ہے۔ یا اضلال سے مراد ناامید ہونا ہے کیونکہ یہ کوشش کرتے ہیں مومنوں کو گمراہ کرنے کی جبکہ وہ مانتے نہیں ہیں تو پھر یہ لوگ ناامید اور خسارہ اٹھانے والے ہو جاتے ہیں۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَأَنتُمْ تَشْهَدُونَ ۝

"اے اہل کتاب تم کیوں اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو" [70]۔

تفسیر 70: اس آیت میں ان کی چوتھی خباثت ذکر ہو رہی اور دعوت دی جا رہی ہے زجر کے طریقے پر۔ بِآيَاتِ اللَّهِ اس سے مراد تورات و انجیل ہے اور کفر سے مراد یہ ہے کہ مذکورہ کتابوں میں یہ بات مذکور تھی کہ ابراہیم علیہ السلام یکسو موحد مسلمان، حنیف اور دین حق کے پرستار تھے اور دین حق اسلام ہے اور آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم برحق ہیں اور ان کی بارے میں بشارت اور ان کی صفات بھی ان کتابوں میں پڑھ چکے تھے۔ لیکن پھر بھی انہوں نے ان تمام باتوں سے انکار کیا تو یہ تورات اور انجیل کا انکار ہے اگرچہ یہ کہتے ہیں کہ ہم ان تمام کتابوں کو مانتے ہیں۔ وَأَنتُمْ تَشْهَدُونَ شہادت سے مراد تورات و انجیل کا علم ہے کہ وہ حق ہے۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ "اے اہل کتاب کیوں تم حق و باطل کو (لوگوں پر باطل شبہات کے ذریعے سے) خلط ملط کرتے ہو اور تم حق کو چھپاتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو" [71]۔

تفسیر 71: اس آیت میں ان کی پانچویں خباثت کا ذکر ہو رہا ہے اور ان کو دعوت بطور ڈانٹ و تنبیہ ہے اور تلبیس و کتمان کی تفسیر آیت 42 سورۃ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ فائدہ: سورۃ بقرہ آیت 41 اور 42 میں کفر سے منع کتمان اور تلبیس کرنے سے منع کیا گیا تھا لیکن وہ باز نہیں آئے تو اس سورۃ میں ان کو زجر کیا گیا۔ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ یعنی تورات و انجیل سے تمہیں یہ شہادت حاصل ہوئی کہ حق اور باطل کیا ہے اور چونکہ شہادت سے علم حاصل ہوتا ہے تو پہلی آیت میں تَشْهَدُونَ اور یہاں پر تَعْلَمُونَ فرمایا۔

وَقَالَت طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ "اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے (اپنے لوگوں سے) کہا کہ دن کے شروع میں اس چیز پر ایمان کا اظہار

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کرو جو نازل کی گئی ان لوگوں پر جو ایمان لائے ہیں اور اس دن کے آخری حصے میں کفر کرو شاید کہ وہ (مسلمان بھی) پھر جائیں" [72]۔

تفسیر 72: اس آیت میں انکی چھٹی خباثت کا ذکر ہو رہا ہے یعنی منافقت کرتے ہوئے حیلہ بازی کرنا تاکہ جو لوگ مسلمان ہوئے ہیں وہ دین سے مرتد ہو جائیں۔ طَّآئِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ اس سے مراد ان کے بڑے علماء ہیں جبکہ طائفہ کا اطلاق پوری جماعت اور فرد واحد پر بھی ہوتا ہے اور اس میں مَا مُوْرُ لَهُمْ مخفی ہے یعنی بڑے علماء نے چھوٹوں سے یہ بات کہی تھی۔ اٰمِنُوْا سے مراد صرف زبان سے ایمان کا اظہار ہے۔ بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اس سے پورا قرآن یا بعض مسائل مراد ہیں جیسا کہ کعبہ کی طرف نماز میں منہ کرنا ہے۔ وَجْهَ النَّهَارِ یہ اٰمِنُوْا کیلئے ظرف ہے۔ وَجْهَ ہر چیز کے اگلے حصے (چہرے) کو کہا جاتا ہے۔ یہاں مراد دن کی ابتداء یا زوال سے قبل کا وقت ہے۔ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ ضمیر دن کی طرف راجع ہے اور آخر سے مراد عصر کا وقت ہے۔ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ضمیر تمام مؤمنین یا صرف ان مسلمانوں کی طرف راجع ہے جو تازہ ایمان لائے تھے ان کی یہ حیلہ بازی اپنے غلط گمان پر بنا تھی یعنی ان کا خیال تھا کہ صحابہ کرام کا ایمان تقلید پر بنا ہے اور تقلید تو شک آنے سے زائل و باطل ہوتی ہے لیکن چونکہ ان کا ایمان یقین اور علم پر بنا تھا جو شکوک و شبہات سے زائل نہیں ہوتا ہے۔

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَاۗجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿73﴾ "اور تم تصدیق مت کرو مگر اس کا جو تمہارے دین کا پیروکار ہو فرما دیجئے بلاشبہ ہدایت تو اللہ تعالیٰ ہی کی ہدایت ہے کہ دی جا سکتی ہے اس کی مثل جو تم دیئے گئے ہو یا یہ کہ وہ جھگڑیں گے تم سے تمہارے رب کے پاس فرما دیجئے بیشک فضل تمہارے رب کے ہاتھ میں ہے وہ دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اللہ تعالیٰ وسعت والا خوب جاننے والا ہے" [73]۔

تفسیر 73: اس آیت میں ان کی ساتویں خباثت کا ذکر ہو رہا ہے یعنی ضد اور حسد کی وجہ سے باطل دین کی وصیت کرنا یہ آیت سابقہ آیت کی تکمیل ہے اور اٰمِنُوْا پر عطف ہے جو قالت کے تحت ہے۔ ان کے بڑوں نے اپنے چھوٹوں کو یا خصوصاً ان لوگوں کو جن کو دن کی ابتداء میں اظہار ایمان کا حکم دیا تھا۔ امام قرطبی اور صاحب اللباب نے کہا ہے کہ اس سورۃ میں یہ بہت مشکل آیت ہے وجہ یہ ہے کہ اس میں اشکالات زیادہ ہیں یعنی توجیہات اور احتمالات زیادہ ہونے کی وجہ سے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مشکل ہے۔ (1) ابن عطیہ کا قول ہے کہ وَلَا تُؤْمِنُوْا کے متعلق مفسرین کا اجماع ہے کہ یہ یہودیوں کے بڑوں کا اپنے چھوٹوں کو خطاب ہے جبکہ امام قرطبی کا قول ہے کہ یہ قول ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تاکہ ان کے دل مضبوط ہو جائیں ان دونوں میں پہلا قول بہتر ہے۔ (2) وَلَا تُؤْمِنُوْا میں ایمان تصدیق کے معنی میں ہے یعنی ایمان شرعی ہے۔ لِمَنْ میں ما زائد ہے اور لام اس کا صلہ ہے یا ایمان بمعنی اظہار ایمان ہے جو دن کی ابتداء میں اظہار ہے۔ اٰمِنُوْا سابقہ آیت میں مذکور ہے۔ (3) مستثنیٰ منہ الا سے قبل مخفی مراد ہے یعنی لَا تُؤْمِنُوْا اِلَّا حَدٍ یا پھر اَنْ یُّؤْتٰٓی اَحَدٌ ہے اور مستثنیٰ کو مقدم کیا ہے مگر یہ قول ضعیف ہے کیونکہ مستثنیٰ مقدم ہو اور کلام میں اتنا فاصلہ ہو تو یہ بلیغ کلام کے خلاف ہے۔ لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ اس میں دو احتمال ہیں (1) اس سے مراد بنی اسرائیل کے انبیاء اور علماء ہیں یعنی بنی اسرائیل کے بغیر کسی کی نبوت یا علم کی تصدیق مت کرو اور نہ ہی اس بات کو مانو (2) جو سابقہ بنی اسرائیل تھے اور اب مسلمان ہو چکے ہیں ان کے سامنے ابتداء میں ایمان کا اظہار کرو اور دن کے آخری حصے میں کفر کرو تو وہ ساتھی اسلام سے پلٹ آئینگے۔ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى اس میں بھی دو احتمال ہیں (1) یہ ان کے اس قول کا جواب ہے کہ لَا تُؤْمِنُوْا الخ یعنی انہوں نے ہدایت کو اپنی قوم میں محصر سمجھا ہے جبکہ ہدایت اللہ تعالیٰ کے دین میں منحصر ہے۔ اَلْهُدٰى سے مراد صحیح دین ہے۔ هُدَى اللّٰهِ سے مراد وہ دین ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن سمیت اپنی کتابوں میں نازل فرمایا ہے (2) یہ جملہ معترضہ ہے اور لَا تُؤْمِنُوْا اس کے مفعول اَنْ یُّؤْتٰٓی الخ کے درمیان ہے۔ هُدَى اللّٰهِ اس میں بھی دو احتمال ہیں (1) هُدَى اللّٰهِ اِنَّ کیلئے خبر ہے (2) هُدَى اللّٰهِ اَلْهُدٰى سے بدل ہے اور خبر بعد میں ہے۔ اَنْ یُّؤْتٰٓی اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ اس میں پانچ احتمالات ہیں (1) یہ پہلے والے لَا تُؤْمِنُوْا کیلئے مفعول ہے (2) یہ مخفی لَا تُؤْمِنُوْا کیلئے مفعول ہے یعنی یہودیوں نے اپنے چھوٹوں سے کہا کہ نبوت و رسالت کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کرنا کہ ہمارے علاوہ کسی اور کو دی جائیگی یعنی آخری نبی و دین مت مانو (3) یہاں ہمزہ استفہامیہ مقدر ہے جو قاری ابن کثیر قاری ابن محیصن قاری حمید کی قراءت میں موجود ہے یعنی اَنْ یُّؤْتٰٓی اور یہ بھی یہودیوں کے قول میں داخل ہے کہ قَالُوْٓا اَنْ یُّؤْتٰٓی اور یہ استفہام انکاری ہے (4) هُدَى اللّٰهِ اَلْهُدٰى سے بدل ہے اور اَنْ یُّؤْتٰٓی۔ اِنَّ الْهُدٰى کیلئے خبر ہے (5) اِنَّ سے قبل لام تعلیل مقدر ہے لہٰذا عبارت مقدر اس طرح سے ہے قُلْتُمْ مَا قُلْتُمْ وَدَبَّرْتُمْ مَا دَبَّرْتُمْ لِاَنْ یُّؤْتٰٓی اَحَدٌ الخ یُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ الخ اس میں بھی احتمالات ہیں وہ یُّؤْتٰٓی پر عطف ہے اور اِنَّ کے تحت داخل ہے لہٰذا اس میں دو احتمالات ہیں جو اَنْ یُّؤْتٰٓی میں گزر گئے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہیں۔ أَوْ برائے عطف ہے البتہ پانچویں احتمال میں إلی أَنْ کے معنی میں ہے یا پھر أَلَّا أَنْ ہے۔ یُحَاجُّوْ كُمْ میں دوسرا احتمال ہے۔ مُحَاجہ سے مراد حجت میں غالب ہونا ہے۔ عِنْدَ رَبِّكُمْ میں دو احتمال ہیں (1) دنیا میں حکم شرعی حجت قائم کر کے تم پر غالب ہو جائیں گے اور تم مغلوب ہو جاؤ گے (2) یا مراد قیامت میں عدالت ربانی ہے۔ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ اس میں پہلا احتمال یہ ہے کہ جب اَنْ يُّؤْتٰی کو مستقل کلام مانا جائے تو یہ اس کا جواب ہے (2) جب اَنْ يُّؤْتٰی کو سابقہ کلام کا جز حصہ مانا جائے تو پھر یہ مسلمانوں کو تسلی دینے کیلئے مستقل کلام ہے یہاں تک تقریباً 24 احتمال ذکر ہوئے اس کے علاوہ بھی مفسرین نے لکھے ہیں۔ ان تمام میں بہتر قول یہ ہے کہ لَا تُؤْمِنُوْا آخر تک یہودیوں کا کلام ہے جو بڑوں نے چھوٹوں کو آئندہ نسلوں کو گمراہ کرنے کیلئے کیا ہے اور قُلْ اِنَّ الْهُدٰی اس کا جواب ہے اَنْ يُّؤْتٰی الخ ان کا دوسرا مستقل قول ہے جو بڑوں نے ان سے کیا ہے اور قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ اس کا جواب ہے۔

يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ "اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جس کو چاہے خاص کر لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے" [74]

تفسیر 74: یہ آیت بھی یہودیوں کے جواب میں ہے اور فضل سے مراد دین کا علم اور درست عمل کی توفیق اور رحمت سے مراد وحی اور رسالت ہے اور جب فضل میں کچھ عموم ہے اور رحمت رسالت کے معنی میں خاص ہے۔ اس لئے اَلْفَضْلُ کے ساتھ يَخْتَصُّ نہیں فرمایا۔ وَاسِعٌ عموم کیلئے ذکر کیا ہے اور جب رحمت سے خاص نبی مراد لیا جائے تو پھر اس کو فضل عظیم کہا جاتا ہے تو یہ بھی مطلق فضل نہیں بلکہ خاص ہے۔

وَمِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْھُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَاۗىِٕمًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ "اہل کتاب میں سے بعض وہ ہیں کہ اگر آپ ان کے پاس ڈھیر (سونا چاندی) خزانہ امانت رکھیں تو وہ آپ کو ادا کریں گے اور بعض ان میں سے وہ ہیں اگر آپ ان کے پاس ایک دینار امانت رکھیں تو وہ آپ کو ادا نہیں کریں گے مگر جب تک آپ ان کے سر پر مسلسل کھڑے نہ رہیں یہ بسبب اس کے کہ انہوں نے کہا کہ اُمیوں (عربوں) کے بارے میں ہم پر کوئی گناہ نہیں اور وہ اللہ تعالیٰ پر جانتے ہوئے جھوٹ بولتے ہیں" [75]۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تفسیر 75: اس آیت میں ان کی آٹھویں خباثت کا ذکر ہو رہا ہے گذشتہ آیت میں دین کے بارے میں ان کی خیانت کا ذکر تھا اب مال کے بارے میں ان کی خیانت کا ذکر ہو رہا ہے۔ اور اس میں ان کی دو قسموں کا بھی ذکر ہے (1) ایک امانت دار (2) دوسرا خائن۔ پہلی قسم مَّنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لَّا يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ. قِنطَارٌ سے زیادہ مال مراد ہے یعنی زیادہ مال میں امانت داری کرتے ہیں تو کم مال میں تو بدرجہ اولیٰ امانت داری کا مظاہرہ کریں گے۔ قِنطَارٌ کے معنی میں اختلاف ہے (1) 1200 اوقیہ ہے یعنی 40 درہم کی مقدار کو کہتے ہیں (2) دوسرا قول یہ ہے کہ بیل کے چمڑے کو بھر دیا جائے (3) تیسرا قول یہ ہے کہ دس لاکھ دینار یا دس لاکھ روپیہ ہے تفصیل آیت 14 میں ذکر ہوئی ہے۔ دوسری قسم وَمِنْهُمْ مَّنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لَّا يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ اس سے مراد تھوڑا مال ہے جب تھوڑے مال میں خیانت کرتے ہیں تو زیادہ میں تو ضرور کریں گے۔ دینار و قنطار میں (با) فی کے معنی میں ہے۔ یا علیٰ کے معنی میں ہے کیونکہ امن کے صلہ میں علیٰ بہت استعمال ہوتا ہے۔ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا یہ استثنیٰ مفرغ ہے تقدیری عبارت اس طرح ہے۔ لَا يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ فِي جَمِيعِ الْمُدَدِ وَالْأَزْمِنَةِ إِلَّا فِي مُدَّةِ دَوَامِكَ قَائِمًا عَلَيْهِ ساری مدت میں تمہیں ادا نہیں کریں گے مگر اس وقت جب تم اس کے سر پر مسلسل کھڑے ہو جاؤ لفظ مَا مصدریہ ہے اور عَلَيْهِ قَائِمًا سے متعلق ہے اور یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ قیام سے مراد مسلسل مطالبہ اور جھگڑا کرنا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ قرضدار سے مطالبہ کرنا اور اس کا تعاقب کرنا درست ہے یعنی لوگوں کے شرم و ندامت سے شرما کر دیں گے مگر اللہ تعالیٰ کے خوف سے نہیں دیں گے۔ فائدہ 1: امانت سے مراد عام ہے کوئی چیز حوالہ کی ہوئی ہو قرض یا لین دین، خرید و فروخت میں بقایا جات کی صورت میں ہو اجارہ وغیرہ ہو۔ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ یہ خیانت کی علت ذکر ہوئی ہے اور اشارہ ہے کہ انہوں نے اس خیانت کو حلال جانا تھا اور حرام کو حلال تصور کرنا کافروں کی روش ہے۔ فِي الْأُمِّيِّينَ یعنی عام لوگوں کے مال لینے میں غیر کتابی لوگوں کا مال مراد ہے۔ سَبِيلٌ سے مراد عذاب، گناہ یا ضمان ہے۔ فائدہ 2: مفسرین نے اس (استحلال) حلال جاننے کی بہت وجوہات ذکر کی ہیں (1) پہلا طریقہ: اپنے مخالفین سے سخت تعصب کی وجہ سے ان کے مال کو حلال قرار دیتے ہیں یعنی ایک طریقہ سے ان کا مال لینا جائز مانتے ہیں۔ (2) دوسرا طریقہ: ہم (ابناء اللہ) ہیں یعنی اللہ کی اولاد کی مانند ہیں لہذا مالکوں کو غلاموں کا مال ہر طرح لینا حلال ہے۔ (3) تیسرا طریقہ: یہودیوں کا مذہب یہ ہے کہ جو ایک دین سے دوسرے دین میں منتقل ہو جائے تو وہ مرتد ہے خواہ باطل سے حق کی طرف گیا ہو لہذا ان کا مال لینا جائز ہے۔ اس امت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میں اب بھی اس قسم کے معتقدین ہیں کہ مختلف طریقوں سے عوام کے مال کو حلال تصور کرتے ہیں بعض تو عوام کو اپنی فصل و کھیتی قرار دیتے ہیں اور حامیوں کے مال کو حلال قرار دیتے ہوئے مال غنیمت کہتے ہیں۔ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ اس میں علت یعنی حلال قرار دینے کی دلیل بیان ہو رہی ہے انہوں نے تورات کا حوالہ دیا کہ اس میں حلال قرار دیا گیا ہے لیکن ان کا یہ کہنا جھوٹ پر مبنی تھا۔ مقولہ ہے کہ (عذر گناہ بدتر از گناہ)۔ وَهُمْ يَعْلَمُونَ وہ جانتے ہیں کہ خیانت گناہ ہے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر افتراء (جھوٹ) ہے۔

بَلَىٰ مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ﴿٧٦﴾ "کیوں نہیں جس نے اللہ سے ڈر کر اپنے وعدے کی پاسداری کی تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں سے محبت کرتا ہے" [76]۔

تفسیر 76: دو قسم کے گروہوں کا ذکر کرنے کے بعد اب پہلی قسم امانت دار کیلئے بشارت بیان ہو رہی ہے اور ان کی دو صفتوں کا بیان ہے (1) عہد کی پاسداری (2) تقویٰ اختیار کرنا اور یہ دونوں امانت داری کے اسباب ہیں۔ بَلَىٰ یہ جواب اس کلام کا ہے کہ لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ یعنی حقیقت اس طرح نہیں ہے بلکہ گناہ کا وبال ان پر یقینی ہے یعنی ان کا یہ کہنا غلط ہے کہ اس گناہ پر ان کا کوئی مواخذہ اور پکڑ نہیں ہوگی۔ اس قول کے مطابق اس مقام پر وقف ہے اور مَنْ أَوْفَىٰ نیا کلام ہے۔ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ میں ضمیر مَنْ کی طرف راجع ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے یعنی مال اور دین الٰہی میں خیانت نہیں کرتے اور اہل کتاب کا سب سے عظیم وفی یہ ہے کہ قرآن کریم اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں۔ وَاتَّقَىٰ اپنے آپ کو افتراء عَلَى اللَّهِ اور خیانت سے بچا لے اور اپنی کتاب میں تحریف، کتمان اور تلبیس سے اپنے آپ کو بچائے یعنی اس آیت سے قبل جو خیانتیں اہل کتاب کی گزری ہیں ان سب سے بچ جائیں۔ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ یہاں پر (هُمْ) ضمیر کے بجائے اسم ظاہر الْمُتَّقِينَ ذکر کیا ہے جس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف محبت کا سبب تقویٰ ہے کتابی شخص میں ہو یا غیر کتابی میں۔

إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٧٧﴾ "یقیناً وہ لوگ جو (دنیا) کے تھوڑے سے عوض کو اللہ تعالیٰ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے خرید لیتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کا آخرت میں (اجر کا) کوئی حصہ نہیں ہے نہ تو ان سے اللہ تعالیٰ کلام کرے گا اور نہ ہی ان کی طرف قیامت کے دن (نظر رحمت) سے دیکھے گا اور نہ ہی انہیں (گناہوں) سے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

پاک کرے گا اور ان کیلئے دردناک عذاب ہوگا" [77]۔

تفسیر 77: اس آیت میں دوسرے گروہ کیلئے (جنہوں نے خیانت کی ہے) خوف آخرت کا ذکر ہے اور اس میں ان کی صفات کا تقابل مذکور ہے۔ سابقہ آیت میں عہد کی پاسداری اور تقویٰ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی ذکر کیا گیا ہے تو اس آیت میں عہد شکنی اور حرام مال کا حصول ذکر ہو رہا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ یہاں پر بھی عَهْدِ اللّٰهِ عام ہے جس میں قرآن و آخری نبی پر ایمان لانا اور ان احکام پر جو تورات و انجیل یا قرآن میں مذکور ہیں۔ اشتراء سے مراد یہ ہے کہ اس میں تحریف کرتے ہیں باطل تاویل کرتے ہوئے حکموں کو بدل ڈالتے ہیں مخالفت اور کتمان بھی کرتے ہیں اور سب ہی حصول دنیا کیلئے ہے یا دنیا میں ناموری، اقتدار کیلئے یا رشوت اور دیگر حرام طریقوں سے مال لیتے ہیں۔ وَاَیْمَانِهِمْ یہ تعمیم کے بعد تخصیص ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نام پر قسم کھانا عہد الٰہی میں داخل ہے اس میں وہ قسمیں بھی داخل ہیں جو نبی آخر الزمان کے آنے سے قبل وہ کہا کرتے تھے کہ جب وہ آئینگے تو ان پر ہم ایمان لائینگے اور نصرت بھی کرینگے جیسا کہ یَسْتَفْتِحُوْنَ کی تفسیر میں گزرا ہے۔ اس طرح مشرکین کی قسمیں کہ ہم نبی آخر الزمان پر ایمان لائینگے اور آیتوں کو مانیں گے جیسا کہ سورۃ انعام آیت 109 اور 157 میں اور سورۃ فاطر آیت 42 میں ہے۔ اس طرح سامان کی خرید و فروخت کے وقت جھوٹی قسمیں اسلئے کھانا تاکہ سامان بک جائے یعنی خریدنے والے کو قسموں سے دھوکا دینا جیسا کہ امام مسلم نے کتاب الایمان حدیث 106، ابوداؤد کتاب اللباس حدیث 4087، نسائی کتاب الزکوٰۃ حدیث 2564، ترمذی کتاب البیوع حدیث 1211 میں اور امام بخاری نے کتاب التوحید اور کتاب الایمان والنذور میں تفصیل ذکر کی ہے حدیث 6676۔ ثَمَنًا قَلِیْلًا اس کی تفسیر گزر چکی ہے اور اس قسم کے لوگوں کی پانچ سزائیں مذکور ہیں۔ (1) اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الدُّنْیَا۔ خَلَاقَ سے مراد ثواب اور خیر کا حصہ ہے اس سزا میں دو مرتبے ہیں (1) اس کا اشتراء درجہ کفر تک پہنچا ہو یعنی اصول ایمان ضائع ہو گئے ہوں تو اس کا تمام اعمال (حبط) برباد ہیں لہٰذا اس کا کوئی اجر نہیں ہے (2) دوسرا یہ کہ جس کا اشتراء کر چکے ہو اس کے اجر سے آخرت میں محروم ہوں گے کیونکہ دنیا کی اُجرت سے آخرت کا اجر ضائع ہوتا ہے۔ دوسری سزا: وَلَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ سورۃ بقرہ آیت 174 میں بھی ایسا گزرا ہے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے خوشی کا کلام نہیں کریگا (طبری) یا اللہ تعالیٰ اس سے ملائکہ کے ذریعے سے کلام کریگا اور اس کے ذریعے سے اس کا حساب لیگا یا پھر یہ ناراضی ہونے سے کنایہ ہے۔ تیسری سزا: وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ نظر نہ کرنے سے مراد بطور اعراض ہے یا بطور

شفقت ورحمت ہے۔ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ۔ لَا یُکَلِّمُهُمۡ اور وَلَا یَنۡظُرُ دونوں کیلئے ظرف ہے۔ چوتھی سزا: وَلَا یُزَکِّیۡهِمۡ ان کی ثناء وتعریف نہیں ہوگی بلند مرتبوں سے محروم ہونگے سزا کے باوجود گناہوں کے آثار زائل نہیں ہوں گے۔ پانچویں سزا: وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ مذکورہ پانچ سزاؤں کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے پانچ گناہوں کا ارتکاب کیا تھا (1) عہد شکنی، (2) اس کی مقابل دنیا کو پسند کرنا، (3) جھوٹی قسمیں کھانا، (4) اللہ تعالیٰ کے نام کی توہین، (5) دھوکا دینا ان جرموں کے اعتبار سے مناسب سزاؤں کا ذکر ہوا ہے۔ سورۃ بقرہ آیت 174 میں بھی اس طرح گزرا ہے البتہ وہاں پر چار گناہوں کی چار سزاؤں کا ذکر تھا یعنی (1) حق چھپانا، (2) دنیا کو آخرت پر ترجیح دینا، (3) حرام کھانا، (4) حرام کو حلال قرار دینا۔ وہاں ان کے مناسب سزاؤں کا ذکر تھا۔

وَاِنَّ مِنۡهُمۡ لَفَرِیۡقًا یَّلۡوٗنَ اَلۡسِنَتَهُمۡ بِالۡکِتٰبِ لِتَحۡسَبُوۡهُ مِنَ الۡکِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الۡکِتٰبِ ۚ وَیَقُوۡلُوۡنَ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ۚ وَیَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰهِ الۡکَذِبَ وَهُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۸﴾ "بلاشبہ ان میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اپنی زبانیں اللہ تعالیٰ کی کتاب پر مروڑتے ہیں تاکہ آپ گمان کریں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں سے ہے حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں سے نہیں ہے اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نہیں ہے وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولتے ہیں جبکہ وہ جانتے ہیں" [78]۔

تفسیر 78: اس آیت میں ان کی نویں خباثت کا ذکر ہورہا ہے اور عہد شکنی کی کیفیت بیان ہورہی ہے کہ اِفۡتِرَاءٌ عَلَی اللّٰهِ بطور تحریف کرتے تھے جب سابقہ صفات اور ان صفات کی آپس میں پوری مطابقت ہے تو اسلئے اس آیت کو اس پر عطف کیا ہے۔ وَاِنَّ مِنۡهُمۡ لَفَرِیۡقًا یَّلۡوٗنَ اَلۡسِنَتَهُمۡ بِالۡکِتٰبِ: یَلۡوٗنَ لَوٰی یَلۡوِیۡ سے لیا گیا ہے اور یَلۡئُوۡنَ کی واؤ کو ہمزہ سے بدلہ گیا ہے لَیّٗ اصل میں کسی چیز کو ٹیڑھا کرنا ہے جبکہ وہ سیدھی ہو۔ یہ بِالۡکِتٰبِ حال ہے۔ نَاطِقَةٌ بِالۡکِتٰبِ تحتی عبارت کے ساتھ یا پھر متعلق ہے یَلۡوٗنَ کے ساتھ جس کی عبارت ایسی ہوگی۔ یَلۡوُوۡنَ بِقِرَاْءَةِ الۡکِتَابِ۔ کتاب کے ساتھ زبان ٹیڑھی کرنا کئی طریقوں سے ہے (1) پہلا طریقہ: تورات یا انجیل پڑھنے کا ارادہ کرتے تو اعراب میں اس طریقے سے ہیر پھیری کرتے تھے اور عبارت کی تبدیلی کے ساتھ معنی بھی بدل دیتے سننے والا یہ گمان کرتا کہ یہ عبارت کتاب اللہ کی ہے۔ اور یہ بھی تحریف کی ایک قسم ہے۔ اس کی مثال انجیل میں یہ ہے کہ عبارت اس طرح تھی وَلَّدَ اللّٰهُ عیسیٰ پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو تو انہوں نے بغیر تشدید کے پڑھنا شروع کرکے اللہ تعالیٰ کیلئے نعوذ باللہ ولدیت ثابت کرنے

کی ناپاک کوشش کی (2) دوسری مثال لفظ رَاعِنَا ہے سورۃ نساء آیت 46 میں اس کی تفصیل ہے۔ لَيًّۢا بِاَلْسِنَتِهِمْ یعنی رَاعِنَا یا رَاعِیْنَا الف کو کھینچ لیتے تھے ہماری اس امت میں اس کی مثال یہ ہے کہ قرآن مجید میں سورۃ کہف آخری آیت میں معنوی تحریف کرتے ہوئے بدعقیدہ لوگ حرف اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ میں لفظ (مَا) کو نافیہ بناتے ہیں تاکہ نبی کی بشریت کو ختم کریں دوسرا طریقہ تورات پڑھتے وقت ہمارے نبی کی صفات تبدیل کرنے کیلئے عبارت اپنی بناتے اور بتانا یہ چاہتے کہ یہ تورات میں ہے حالانکہ وہ عبارت مصنوعی بناوٹی ہوتی۔ ہماری اس امت میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں مولوی بدعت وشرک ثابت کرنے کیلئے عبارتیں اپنی کتابوں کی پڑھتے ہیں اور عوام کو باور کراتے ہیں کہ گویا وہ قرآن یا حدیث سناتے ہیں۔ امام رازی نے اس کو تَكَلُّف وَ تَشَدُّق سے تعبیر کیا ہے (3) تیسرا طریقہ: وہ آیتیں جو ثبوت نبوت کیلئے تھیں بجائے اس کے کہ اس پر پوری نظر ڈالتے اور مان لیتے مگر وہ شکوک وشبہات پیدا کر کے لوگوں کو التباس میں ہتلا کرتے ہیں۔ انکا کہنا تھا کہ ان آیتوں کا یہی معنیٰ ہے جو ہم کرتے ہیں۔ امام رازی نے مثال پیش کی ہے کہ ہمارے زمانے میں جب کوئی حق پرست دلیل میں آیت پیش کرتا ہے تو مخالف آیات قرآنی پر شبہات پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مراد وہ صحیح ہے جو ہم لیتے ہیں جیسا کہ رد شرک پر آیات وبدعت پر آیات اور صفات الٰہی وغیرہ پر جو معانی ہم بتائینگے وہی درست ہیں۔ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ ضمیر (ہ) اس محرف کتاب کی طرف راجع ہے یَلْوٗنَ اس پر دلیل ہے یا بِالْكِتٰبِ سے مراد بِشِبْهِ الْكِتَابِ ہے۔ لِتَحْسَبُوْهُ میں جو ضمیر ہے وہ شبہ کی طرف راجع ہے۔ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اس جملے اور ماقبل جملے کا فرق ایسا ہے کہ: پہلی وجہ: يَلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ غلط عبارت پڑھنے سے تحریف کرتے تھے اور اس جملے میں غلط نسبت کی وجہ سے تحریف کرتے تھے یعنی عبارت اپنی طرف سے بنا کر کہتے قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى دوسری وجہ: پہلی اَلْكِتَابِ سے مراد تورات ہے اور یہاں اس مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ سے دیگر کتب سماوی مراد ہیں جن کے غلط حوالے دیتے تھے۔ تیسری وجہ: مسئلے کا ثبوت صرف قرآن مجید کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ حدیث صحیح سے بھی حکم شرعی ثابت ہوتا ہے اجماع سے بھی ثابت ہوتا ہے اس امت میں آج بھی یہ بیماریاں موجود ہیں۔ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ یہ ماقبل پر عطف تفسیر ہے یعنی مذکورہ دونوں طریقوں میں ان کا کام اِفْتِرَاءُ عَلَى اللّٰهِ اور یہ عظیم گناہ ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ

كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُونَ ﴿٧٩﴾ "کسی ایسے بندے کیلئے مناسب نہیں جسے اللہ نے حکمت ونبوت سے سرفراز کیا ہو پھر وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میری بندگی کرو بلکہ وہ تو کہے گا کہ تم سب رب کے بندے بن جاؤ بسبب اس کے کہ تم کتاب سکھاتے ہوں اور خود بھی پڑھتے ہوں" [79]۔

تفسیر 79: اس آیت میں انکی دسویں خباثت کا ذکر ہو رہا ہے اور ان کے شبہے کا جواب بھی ہے انکا شبہ عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کے اثبات کا تھا اور جواب ہے کہ الوہیت اور بشریت دونوں متضاد چیزیں ہیں اور پہلی آیت کے ساتھ مناسبت یہ ہے کہ وہاں پر وعید تھی کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہیں تو اب یہ ذکر ہے کہ یہ لوگ انبیاء کرام پر بھی جھوٹ باندھتے ہیں۔ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ بشر تمام بنی آدم کو کہا جاتا ہے یہ اسم جنس ہے واحد اور جمع دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے یہاں مراد نزول کے سبب کے اعتبار سے عیسیٰ علیہ السلام ہے اس وجہ سے کہ نصاریٰ کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا ہے کہ میری اور میری ماں کی عبادت کرو میں تمہاری نجات کا ذمہ دار ہوں اور قیامت میں اس کے متعلق سوال اور جواب کرنا یہ سورۃ مائدہ 114 میں مذکور ہے یا اس سے مراد محمد ﷺ ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عطاء کی ایک روایت کی بناء پر کہ ایک یہودی اور نصرانی نے کہا کہ "اے محمد ﷺ آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی عبادت کریں اور آپ کو رب بنالیں تو آپ نے فرمایا معاذ اللہ کہ میں غیر اللہ کی عبادت کا حکم دوں"۔ اسی طرح اس میں ان صحابہ کرام کی اصلاح بھی مقصود ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں اجازت دیں کہ ہم آپ کو بطور احترام سجدہ کریں تو نبی کریم نے منع کرتے ہوئے فرمایا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَأَكْرِمُوا أَخَاكُمْ (احمد 76/6 شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو ضعیف کہا ہے۔ مشکوۃ کتاب النکاح حدیث 3206 ارواء الغلیل 58/7) یہ تمام مصداقات ابوحیان اور صاحب اللباب اور قرطبی وغیرہ نے ذکر کیے ہیں اور بشر کے عموم کے اعتبار سے اس میں وہ تمام بندے داخل ہیں جن کی صفات بعد میں ثابت ہیں یعنی انبیاء علیہم السلام نے تو الوہیت کا دعویٰ بالکل نہیں کیا ہے اور باقی بندوں کو بھی اس سے منع کیا ہے۔ فائدہ: امام ابوحیان نے کہا ہے کہ مَا كَانَ کا استعمال دو طریقوں سے ہے پہلی قسم عقل کے اعتبار سے نفی کرنا اور یہ نفی تام ہے جیسا کہ یہ آیت ہے مَا كَانَ لَكُمْ أَن تُنبِتُوا شَجَرَهَا (نمل آیت 6)، وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَن تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ (آلعمران آیت 145) اور دوسری قسم کی نفی مناسب جاننے کے اعتبار سے ہے۔ یعنی مَا كَانَ لِابْنِ أَبِي قُحَافَةَ أَن يَتَقَدَّمَ فَيُصَلِّيَ بَيْنَ يَدَيْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صحیح بخاری کتاب الایمان حدیث 52 صحیح مسلم کتاب المساقات حدیث 1599 اور مثل کہنا

ہوں کہ مَا کَانَ کا لفظ قرآن میں 71 مرتبہ آیا ہے اور اس کا استعمال چھ 6 معنوں میں ہوا ہے پہلی معنی امکان کی نفی ہے کہ یہ کام نہیں ہوسکتا ہے ممکن نہیں ہے۔ جیسا کہ آل عمران، 145 یونس، 100 رعد، 38 ابراہیم، 11 نمل 60 قصص 8 6 غافر، 78 اور شوریٰ آیت 51۔ دوسرا لَا یَنْبَغِیْ اور لَا یَجُوْزُ کے معنی میں (مناسب نہیں ہے) جیسا کہ سورۃ آل عمران 6 نساء 92 انفال 67 توبہ، 122، 120، 113 یوسف، 38 فرقان 18 اور احزاب، 36، 52۔ تیسرا (مَا) موصولہ ہے جیسا کہ سورۃ انعام 136 میں، چوتھا عدم قبولیت کے معنی میں جیسا کہ سورۃ توبہ آیت 17 میں ہے۔ پانچواں اشارت کے طور پر خبر دینے کے معنی میں ایک تفسیر کے مطابق جو سورۃ بقرۃ آیت 114 میں ہے۔ چھٹا وجود کی نفی کرنا اللہ تعالیٰ کی صفت کے اعتبار سے اس کا استعمال زیادہ ہوتا ہے جیسا کہ سورۃ بقرۃ 143، آل عمران، 179 انفال 33 اور مخلوق کی صفت میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ سورۃ بقرۃ 135 آل عمران 67 اور یونس 19 میں ہے اور قرآن کی صفت میں بھی استعمال ہوتا ہے سورۃ یونس 37 میں اور اس آیت کریمہ میں وجود کی نفی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اخبار کے طور پر ہے یعنی ایک انسان میں یہ صفتیں متضاد نہیں ہوتی ہیں (نبوت اور شرک کی طرف دعوت دینا) یا لَا یَنْبَغِیْ اور لَا یَجُوْزُ کے معنی میں ہے یعنی ایک بشر نبی کیلئے شرک کی طرف دعوت جائز اور مناسب نہیں ہے۔ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ اس سے مراد قرآن یا انجیل ہے اور تورات کو بھی کہا جاتا ہے وَالْحُكْمَ اس سے مراد علم اور دین کا فہم ہے یا احکام ہیں کہ اس کی تعبیر سنت اور حدیث سے ہوسکتی ہے وَالنُّبُوَّةَ رسالت کو بھی کہا جاتا ہے اَنْ یُّؤْتِیَهُ، كَانَ کا اسم ہے اور بَشَرٍ اس کے لئے خبر ہے جو پہلے آئی ہے تاکید یُّؤْتِیَهُ اور یَقُوْلَ کی ضمیر اسکی طرف لوٹ جائے۔ اور ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ یہ یُّؤْتِیَهُ پر عطف ہے اور اس کو عطف لازم کہا جاتا ہے اسلئے کہ اس معطوف کے ذکر کرنے کے بغیر معنی صحیح نہیں بن سکتا ہے اور اس میں مقصود اس معطوف کی نفی ہے یعنی ایسا بشر تو ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کتاب اور سنت اور نبوت دی ہو لیکن یہ قول اس کی طرف سے لوگوں کو نہیں کہا جاسکتا ہے کہ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ بعض مفسرین نے لفظ عباد اور عبید کے استعمال میں بہت فرق ذکر کیا ہے اس اعتبار سے عباد کا لفظ عزت اور اکرام کے مقام میں استعمال ہوتا ہے اور عبید کا لفظ تحقیر (حقارت) کیلئے استعمال ہوتا ہے لیکن اس پر امام ابوحیان نے اعتراض کیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ان میں فرق یہ ہے کہ لفظ عباد عبد کیلئے جمع قیاسی ہے اور عبید کا لفظ جمع غیر قیاسی ہے اور دونوں کا مدلول ایک ہی ہے اور لفظ عبید آیتوں کے آخر میں فاصلوں کی موافقت کیلئے ذکر کیا گیا ہے اور دوسرا فرق یہ ہے کہ لفظ عباد ملائکہ و انسانوں اور جنوں اور صالحین اور غیر صالحین سب کیلئے استعمال ہوتا ہے

اور عبید کا لفظ انسانوں اور (مکلفین) جنوں کیلئے خاص ہے اور یہاں پر عبدیت سے مراد تَعَبُّدْ ہے عبدیت ملکیت سے ہے اور لفظ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اس پر دلالت کرتا ہے وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ یہ ربانی کی جمع ہے اور اس میں دو قول ہیں۔ پہلا قول امام سیبویہ کا ہے انہوں نے کہا ہے کہ نسبت رب کی طرف ہے اس میں الف نون مبالغے کیلئے اضافی ہیں اور نسبت کے مقام میں یہ زائد استعمال ہوتا ہے تو اس کا معنی رب کی طرف منسوب ہے یعنی اس کی ربوبیت پر عالم ہے اور اس کی اطاعت پر ہمیشگی کرتا ہے اس کا معنی اللہ والا شخص ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ ربانی کا لفظ اس کیلئے خاص ہے جو رب کا علم جانتا ہو باقی علم والوں کو نہیں کہا جا سکتا ہے۔ دوسرا قول امام مبرد کا ہے یہ ربان کی جمع ہے خبیر کے مُعَلِّم کے معنی میں ہے جو انتظام کرنے والا ہو اور لوگوں کے دینی کاموں کو خوب جانتا ہو اور مفسرین نے اس میں بہت سے اقوال نقل کیئے ہیں۔ پہلا قول علی اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کا ہے کہ اس سے مراد علماء وفقہاء اور علم پر عمل کرنے والے ہیں۔ دوسرا قول قتادہ کا ہے کہ مراد علماء اور حکماء ہیں تیسرا قول سعید بن جبیر کا ہے کہ مراد باعمل عالم ہے اور باقی لوگوں کو تعلیم دینے والا ہے۔ امام بخاری نے کہا ہے کہ وہ لوگ جو مسائل کے جزئیات میں کلیات اور قواعد کے علم سے پہلے لوگوں کی تربیت کرتے ہیں (تاکہ لوگ اس پر عمل کریں) اور باقی اقوال بھی ہیں لیکن بہتر یہ ہے کہ بعد میں اس کیلئے تفسیر ذکر کی گئی ہے ربانیت کے سبب کو ذکر کرنے کے طور پر جو بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ۔ تُعَلِّمُوْنَ خود سیکھنے کے معنی میں ہے اور تَدْرُسُوْنَ باقی لوگوں کو درس دینے کے معنی میں ہے یا اس کے برخلاف اور یہ بہتر ہے پہلی صفت ربانیت کے امتیاز کیلئے ہے اسی وجہ سے اسکو پہلے ذکر کیا خلاصہ یہ ہے کہ کتاب اللہ کی تمام تعلیم کیساتھ ربانیت حاصل ہوتی ہے اور سورۃ مائدہ 44 میں ذکر ہے کہ ربانیت وہ ہے جو اللہ کی کتاب پر فیصلے کرتے ہیں اور اس کتاب کو سیکھتے ہیں اور اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ فائدہ (1): یہ آیت دلیل ہے کہ ایک صاحب کتاب نبی کیلئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی عبادت کی طرف دعوت دے تو پھر باقی کسی مؤمن کیلئے بدرجہ اولیٰ جائز نہیں ہے۔ (حسن بصری) فائدہ (2): اس آیت میں دلیل ہے کہ دین کے علم کا حصول ضروری ہے اور اس پر عمل کرنا باقی لوگوں کو اس کی تعلیم دینا اور کتاب اللہ کی درس تدریس یہ بلند مرتبہ ہے اسی سے ربانیت حاصل ہوتی ہے۔ (قاسمی) فائدہ (3): یہ آیت دلیل ہے کہ عبدیت کی اضافت، غیر اللہ کے نام کی طرف جائز نہیں ہے تو عبدالنبی اور عبدالرسول وغیرہ ناموں کا رکھنا بھی جائز نہیں ہے اگر اس سے مراد عبدیت کے معنی میں ہو تو واضح شرک ہے اور اگر خدمتگار اور غلام کے معنی میں ہو تو پھر بھی شرک کی آمیزش ہے۔

وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا ۗ أَيَأْمُرُكُم بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ ﴿٨٠﴾

"اور نہیں تمہیں حکم دیتا ہے یہ کہ تم بنالو ملائک اور نبیوں کو رب کیا وہ تمہیں کفر کا حکم دے گا جبکہ تم مسلمان ہو" (80)۔

تفسیر 80: یہ بھی ماقبل کیلئے تاکید ہے اور بیان میں ترقی ہے یعنی جب عبدیت کی طرف دعوت نہیں ہے تو اسی طرح ملائک اور انبیاء علیہم السلام کی ربوبیت کی طرف بھی دعوت نہیں دیتے ہیں۔ وَلَا يَأْمُرَكُمْ یہ يَقُولَ پر عطف ہے لَا کے تکرار کیساتھ تاکید کیلئے لایا ہے اور لَا يَأْمُرَكُمْ میں ضمیر یا تو اس بشر کی طرف ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف یہ ضمیر راجع ہے اور امر سے مراد اجازت دینا ہے اور اس معنی میں وہ حدیث بھی ہے لَوْ كُنْتُ آمُرُ أَنْ يَسْجُدَ أَحَدٌ لِأَحَدٍ لَأَمَرْتُ الْمَرْأَةَ أَنْ تَسْجُدَ زَوْجَهَا (ارواء الغلیل 1998، 5294، ترغیب 1717، احمد 1998-5295، طبرانی 5116، مشکوٰۃ حدیث 3191 وقال شیخ البانی رحمہ اللہ حدیث صحیح لشواہدہ یہاں پر بھی امر سے مراد نفس اجازت دینا ہے۔ أَرْبَابًا رب کی جمع ہے یہاں عام معنی مراد ہے تصرف کرنے والا عالم میں تکوینی اور تشریعی حکم کے ذریعے سے تدبیر چلانے والا یا خاص معنی مراد ہے یعنی معبود۔ أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ یہ دلیل ہے کہ غیر اللہ چاہے وہ ملائک ہوں یا انبیاء ہوں یا بت وغیرہ ان کو خاص اور عام معنی کیساتھ رب ماننا کفر اور اسلام سے مرتد ہونا ہے۔ قاعدہ: ابوحیان نے کہا ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ کفر ملت واحدہ ہے کیونکہ جنہوں نے ملائک کو ارباب سمجھا ہے وہ صابئین اور بت پرست ہیں اور جنہوں نے انبیاء کو رب سمجھا وہ یہود و نصاریٰ اور مجوس ہیں اور ان سب کیلئے کفر کا نام رکھا گیا ہے۔

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنصُرُنَّهُ ۚ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي ۖ قَالُوا أَقْرَرْنَا ۚ قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُم مِّنَ الشَّاهِدِينَ ﴿٨١﴾ "اور جب لیا اللہ تعالیٰ نے پختہ وعدہ نبیوں سے جو میں نے دی تمہیں کتاب اور سنت پھر آئے تمہارے پاس رسول جو تصدیق کرنے والا ہے اس کی جو تمہارے پاس ہے ضرور تم اس پر ایمان لاؤ گے اور ضرور تم اس کی مدد کرو گے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا تم نے اس کا اقرار کرلیا اور تم نے قبول کیا میرا وعدہ انہوں نے کہا ہم اقرار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا پس تم گواہ ہو جاؤ اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہی دینے والوں میں سے ہوں" [81]۔

تفسیر 81: اس آیت میں اگلی گیارہویں خباثت کی طرف اشارہ ہے اشارے کا مقصد بعد میں آنے والی آیت ہے اور یہ

آیت تمہید ہے یعنی اس آخری نبی ﷺ کے بارے میں تمام سابقین انبیاء سے وعدہ لیا گیا ہے کہ اسکی تصدیق کرنی ہے اور اگر اس کا زمانہ پالیا تو اس نبی کا ساتھ دینا ہے اور اپنی امتوں کو بھی یہ وصیت کرنی ہے لیکن یہود و نصاریٰ نے اس نبی ﷺ کی بعثت کے بعد اس کا انکار کیا ہے اور پہلی آیت کیساتھ اسکا ربط یہ ہے کہ انہوں نے اپنے انکار کا سبب یہ بتایا کہ یہ نبی چاہتا ہے کہ ہم اس کی عبادت کریں تو اللہ تعالیٰ نے پہلے انکی اس بات کا رد کیا کہ یہ جھوٹے ہیں تو اب اس نبی ﷺ کی سچائی ذکر کی جارہی ہے۔ وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لفظ اِذْ کے متعلق تین اقوال ہیں پہلا قول یہ خطاب نبی ﷺ کو ہے اور لفظ اُذْكُرْ لَهُمْ (انکو یاد دلاؤ) یہ مخفی عبارت ہے۔ دوسرا قول اُذْكُرُوْا اکا لفظ مخفی ہے اور یہود و نصاریٰ سے خطاب ہے۔ تیسرا قول یہ قَالَ ءَأَقْرَرْتُمْ کیساتھ متعلق ہے اسی طرح اس میثاق کے بارے میں مفسرین کے تین اقوال ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ یہ میثاق تمام سابقین انبیاء سے لیا گیا ہے اور محمد ﷺ کیساتھ خاص ہے اور رسول سے مراد آخری رسول ہے اور یہ قول سیدنا علی، ابن عباس رضی اللہ عنہم سے منقول ہے دوسرا قول اس میں یہ ہے کہ اس سے مراد بعد میں آنے والا ہر رسول ہے کہ پہلے ہر رسول سے ان کے بارے میں میثاق لیا گیا ہے اور یہ قول طاؤس اور حسن بصری رحمہم اللہ سے منقول ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس کے درمیان منافات نہیں ہے کیونکہ دوسرا قول پہلے قول کو مستلزم ہے اور یہ ابن کثیر نے ذکر کیا ہے کہ لَوْ كَانَ مُوسَىٰ حَيًّا لَمَا وَسِعَهُ إِلَّا اتِّبَاعِي (احمد 3/387، دارمی 441، بیہقی فی الشعب قال الالبانی حسن عندی مشکوۃ مع التعلیق الالبانی حدیث 175) اور دوسری حدیث بھی ذکر کی ہے کہ لَوْ كَانَ مُوسَىٰ وَ عِيسَىٰ حَيَّيْنِ لَمَا وَسِعَهُمَا لیکن یہ حدیث بغیر سند کے ہے اس کا اعتبار نہیں ہے اس کا جواب مُتَوَفِّيكَ کی تفسیر میں ہم نے ذکر کیا ہے اسی طرح اس میثاق کی کیفیت میں بھی اقوال ہیں پہلا قول یہ ہے کہ ہر نبی کو اس کے زمانے میں اللہ نے وحی کی تھی کہ آخری رسول کی تصدیق اور مدد کرنی ہے یہاں پر اللہ تعالیٰ نے ان سب کو النَّبِيِّينَ لفظ میں جمع کیا ہے تو الف لام عہدی ہے محمد ﷺ سے پہلے تمام انبیاء مراد ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ عالم ارواح میں جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے اولاد کو پیدا کیا تو تین وعدے ان سے لئے ایک وعدہ سب سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے بارے میں جیسا کہ سورۃ اعراف آیت 172 میں مذکور ہے۔ دوسرا وعدہ آخری نبی ﷺ سمیت تمام انبیاء سے دعوت کے بارے میں وعدہ لیا اور یہ سورۃ احزاب آیت 7 میں مذکور ہے اور تیسرا وعدہ آخری رسول ﷺ کے علاوہ پہلے تمام انبیاء سے آخری رسول کی تصدیق کے بارے میں اور وہ وعدہ اس آیت میں مذکور ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ پہلی کتابوں میں اس نبی کی صفات مذکور ہیں تو جب آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان صفات کے ساتھ برابر ہونے جو پہلی کتابوں میں تھی، تو یہ بھی میثاق کی طرح ہو گیا اس میں پہلا قول بہتر ہے اسی طرح اس میثاق کے متعلقین کے بارے میں بھی تین اقوال ہیں پہلا قول یہ ہے کہ یہ میثاق انبیاء کے ساتھ خاص ہے دوسرا قول یہ ہے کہ ذکر نبیوں کا ہے اور اس سے مراد انکی امتیں ہیں اس میں پہلا قول دوسرے کے لئے مستلزم ہے اور دونوں بہتر ہیں۔ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ لام جواب قسم کی تاکید کیلئے ہے اور قسم لفظ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ میں اشارتاً مذکور ہے لفظ مَا میں بہت اقوال ہیں یہ کہ مَا شرطیہ ہے اور مِّنْ اور وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ اور اٰتَيْتُكُمْ پر عطف ہے اور لَتُؤْمِنُنَّ شرط کا جواب ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ امام سیبویہ نے اپنے استاد خلیل سے اس کے بارے میں سوال کیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ: مَا الَّذِيْ کی طرح ہے اور لام نفس کی تاکید کیلئے ہے مبتدا ہے اور مِنْ زَائِدٌ الَّذِيْ کیلئے خبر ہے اور تیسرا قول ابوعلی فارسی ہے کہ مَا موصولہ ہے مِنْ كِتَابٍ مَا کا بیان ہے اور ثُمَّ جَآءَكُمْ اس پر عطف ہے چوتھا قول یہ ہے کہ مَا موصولہ ہے اور پوشیدہ فعل کیلئے مفعول ہے۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لِتُبَلِّغُنَّ النَّاسَ مَا اٰتَيْتُكُمْ اور مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ اس کا بیان ہے۔ پانچواں قول کہ مَا مَهْمَا کے معنی میں ہے اور ظرف کے معنی میں ہے کتاب سے مراد ہر نبی کی وحی جلی ہے اور حکمت سے مراد ہر نبی کی وحی خفی یعنی سنت ہے۔ سوال: ہر نبی کو کتاب نہیں دی گئی ہے؟ جواب: کتاب عام ہے جو اس پر نازل کی گئی ہے یا پہلے نبی سے رہ چکی ہو اور بعد والے کو اس کتاب کے بارے میں حکم دیا گیا ہو۔ اسی وجہ سے اَنْزَلْتُ عَلَيْكُمْ نہیں کہا ہے بلکہ اٰتَيْتُكُمْ کہا ہے۔ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ سوال: رسول تو انبیاء کے پاس نہیں آتے؟ جواب: مراد یہ ہے کہ اگر تمہارے زمانے میں بالفرض آجائیں یا تمہاری امتوں کے پاس آئیں۔ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ یہ صفت دلیل ہے کہ اس سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے کیونکہ ان کی یہ صفت بہت سی آیتوں میں مذکور ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ذکر ہے وہ تورات کیساتھ خاص لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ ایمان اور تصدیق زمانے کی یک جہتی چاہتا ہے یعنی پہلے انبیاء اس بات کے مکلف تھے کہ آخری رسول پر ایمان لاتا ہے اور اس کی رسالت اور ختم نبوت کو مانیں گے وَلَتَنْصُرُنَّهٗ نصرت کی بہت سی قسمیں ہیں۔ پہلے یہ کہ اپنے وجود کے ذریعے سے اس کے زمانے میں جہاد اور غزوات میں اس کا ساتھ دینا دوسری یہ کہ اپنی امتوں کو تاکیدی حکم دے کہ آخری نبی کی مدد کرو گے اور اس کی مخالفت نہیں کرنی ہے۔ تیسری یہ کہ اسکی تصدیق علامات اور نشانیاں اپنی امتوں کو ذکر کرنی ہیں تاکہ اس میں تحریف نہ کریں۔

فائدہ: امام ابن کثیر نے البدایۃ والنھایۃ میں اور باقی اہل علم نے لکھا ہے کہ یہ دلیل ہے کہ خضر علیہ السلام پہلے فوت ہوئے ہیں اس وجہ سے کہ اگر رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں زندہ ہوتے تو غزوہ بدر اور احزاب وغیرہ میں ضرور موجود ہوتے لیکن صحابہ کرام میں سے کسی نے بھی نہیں کہا ہے کہ ہم نے کسی ایک جہاد میں خضر علیہ السلام کو دیکھا ہے حالانکہ وہ بشر تھا آنکھوں سے ضرور نظر آتا۔ ہاں عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہے لیکن وہ آسمان میں ہے اور آسمان سے اترنا اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ قَالَ کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے اور استفہام اس میں تقریر اور امر کے معنی میں ہے تا کہ زبان کے ساتھ اس میثاق پر اقرار کرو جیسا کہ دل میں تم تصدیق کرتے ہو۔ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ. اَخَذْ قبول کرنے کے معنی میں ہے۔ ذٰلِكُمْ یہ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ اور وَلَتَنْصُرُنَّہٗ کی طرف اشارہ ہے اِصْرٌ لغت میں باندھنے کو کہا جاتا ہے اور اس سے مراد وہ عہد ہے جو مضبوطی سے باندھ لیا جائے اور اَخَذْ سے مراد امت کے لوگوں سے یہ وعدہ لینا ہے۔ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا یہ لفظ پہلے اور دوسرے دونوں جملوں کے جواب کو شامل ہے اسی وجہ سے صرف نعم نہیں کہا ہے تو معنی یہ ہوا کہ اس پر ایمان لانے کیساتھ اقرار کرتے ہیں اور اس کی مدد کرتے ہیں اور اِصْر کو بھی قبول کیا ہے لیکن پہلا دوسرے کیلئے مستلزم ہے اسی وجہ سے دوسرے کو حذف کیا قَالَ فَاشْهَدُوْا اس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ امتوں کو یہ بیان کرو شہادت بیان کے معنی میں ہے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ اقرار کے وقت ایک دوسرے پر گواہ بن جائیں تو شہادت گواہی کے معنی میں ہے۔ تیسرا معنی یہ ہے کہ علم اور اقرار کے ساتھ اپنے آپ پر گواہی دینا یا یہ خطاب ملائکہ سے ہے کہ اس میثاق کے لینے پر گواہ بن جاؤ۔ وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ یہ جملہ حالیہ ہے یا تاکید کیلئے استیناف ہے۔ فائدہ: ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ امام اعظم ہے چاہے جس زمانے میں بھی ہو اور انکی اطاعت تمام انبیاء کی اطاعت پر مقدم ہے اسی وجہ سے معراج کی رات تمام انبیاء کا امام تھا اور قیامت کے دن سب سے پہلے شفاعت کرنے والا ہوگا۔

فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾ "جس نے اسکے بعد (اس رسول سے) منہ پھیر لیا پس وہی لوگ نافرمان ہیں"[82]۔

تفسیر 82: اس میں یہودیوں اور نصاریٰ کا رد ہے کہ انہوں نے اس رسول کا انکار کیا ہے فَمَنْ تَوَلّٰى جو اس رسول پر ایمان لانے اور انکی مدد کرنے سے اعراض کرے بَعْدَ ذٰلِكَ اس میثاق اور اقرار کے بعد یا پہلے رسولوں کی شہادت کے بعد فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ فسق کامل مراد ہے اور وہ کفر اور نافرمانی ہے۔

أَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾

"کیا اللہ کے دین کے علاوہ تلاش کرتے ہیں یہ لوگ دوسرا دین اور اسی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتے ہیں جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے خوشی کیساتھ اور ناراضی کیساتھ اور اسی کی طرف سب لوٹائے جائینگے" [83]

تفسیر 83: یہ زجر فَمَنْ تَوَلّٰى اور الْفٰسِقُوْنَ کیساتھ متعلق ہے اور فاء سے پہلے معطوف علیہ مخفی مراد ہے أَيَتَوَلَّوْنَ وَيَفْسُقُوْنَ۔ فَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ۔ یعنی اس نبی کے ایمان سے منہ پھیرنا اور نافرمانی کرنا یہ مستلزم ہے دوسرے دین طلب کرنے کو۔ دِيْنِ اللّٰهِ دین کی اضافت اللہ کی طرف اس وجہ سے ہے کہ اس نے اس دین کو بنایا اور مقرر کیا ہے۔ يَبْغُوْنَ طلب کرنے سے مراد اسکو دین ماننا اور اس کی عبادت کرنی ہے اور طلب کو اس وجہ سے ذکر کیا کہ ہر وقت اس کے متعلق مباحثے کرتے ہیں۔ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا یہ جملہ اپنے ماقبل سے حال ہے۔ اَسْلَمَ استسلام انقیاد اور فرمانبرداری کرنے کے معنی میں ہے، اعتقاد اقرار اور عمل کرنے کے اعتبار سے یا اللہ کے حکم کی طرف خضوع اور عاجزی کرنے کے معنی میں ہے طَوْعًا تابع ہونا، اور خوشی کیساتھ حکم ماننا اور آسانی کیساتھ اور كَرْهًا مجبوری اور تکلیف کے ساتھ حکم ماننا اور اس میں بہت سارے اقوال ہیں۔ پہلا قول حسن بصری سے مروی ہے کہ طَوْعًا تمام آسمانوں والے ہیں اور زمین والے بعض طَوْعًا اور بعض كَرْهًا ہے قتل اور قید کرنے کے خوف سے۔ دوسرا قول مجاہد کا ہے کہ مومنین طَوْعًا منقاد ہیں اور کافروں کے سائے كَرْهًا منقاد (تابع) ہیں جیسا کہ سورۃ رعد 15 میں ہے۔ تیسرا قول امام شعبی کا ہے کہ كَرْهًا سختی میں مشرکین کی دعا ہے جیسا کہ سورۃ عنکبوت 65 میں ہے۔ چوتھا قول امام کلبی کا ہے کہ طَوْعًا وہ لوگ ہیں جو اسلام پر پیدا ہوئے ہو اور كَرْهًا وہ ہیں جنہوں نے زبردستی اسلام قبول کیا ہے۔ پانچواں قول امام رازی نے کہا ہے کہ تمام مسلمانوں میں یہ دو صفتیں ہیں یعنی مسلمان خوشی کیساتھ امور دینیہ کے تابع ہیں اور فقیری بیماریوں اور موت کے كَرْهًا تابع ہیں اور کافر ہر حال میں كَرْهًا منقاد تابع ہیں۔ چھٹا قول زمخشری نے کہا ہے کہ طوعا وہ لوگ ہیں جنہوں نے دلیلوں اور حجتوں کیطرف دیکھا ہے اور اسلام قبول کیا ہے اور كَرْهًا وہ لوگ ہیں جو قتل کے خوف سے یا نزع کے وقت ایمان لائے۔ ساتواں قول امام ابوحیان نے نقل کیا ہے کہ اسلم سے مراد اللہ تعالیٰ کی خالقیت کا اقرار کرنا ہے اگرچہ شرک فی العبادت اس میں ہو تو جس نے شرک چھوڑ دیا یہ طَوْعًا ہے اور جس نے خالقیت کے اقرار کے باوجود شرک کیا تو یہ كَرْهًا ہے۔ آٹھواں قول عکرمہ کا ہے کہ جس نے جھگڑے اور حجت کی ضرورت کے بغیر ایمان لایا تو یہ طَوْعًا

ہے اور جو حجت کیساتھ مجبور ہو گیا یہ کَرْھًا ہے۔ وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ اس میں آخرت کے خوف کی طرف اشارہ ہے کہ طَوْعًا اور کَرْھًا دونوں صفتوں والوں کا رجوع اللہ کی طرف ہے اور وہ اسکے مناسب جزا اور سزا دے گا۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ "کہہ دیجئے ہم ایمان لائے اللہ تعالی پر اور اس کتاب پر جو نازل کی گئی ہے ہم پر اور جو نازل کیا گیا ہے ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام اور اس کی اولاد پر اور ان کتابوں پر جو دی گئی ہیں موسیٰ علیہ السلام کو اور عیسیٰ علیہ السلام اور باقی پیغمبروں کو اپنے رب کیطرف سے ہم جدائی نہیں ڈالتے ہیں (ایمان لانے میں) ان میں سے کسی ایک میں اور ہم خاص اللہ کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں" [84]۔

تفسیر 84: جب پہلی آیت میں وعید اور زجر ذکر ہوا ان لوگوں کو جو اللہ تعالی کے دین کے علاوہ دوسرا دین چاہتے ہیں تو اس آیت میں یہود و نصاریٰ کے مقابلے میں اللہ تعالی کے دین کی دعوت اور تفصیل کا ذکر ہے۔ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ یہ امر نبی ﷺ کو ہے اس لیے کہ وہ بھی شرعی ایمان اور اسکے اظہار کا مکلف ہے اور اسی طرح جب نبی ﷺ کو انبیاء کے ساتھ میثاق لینے کیلئے خاص کیا گیا تو اس وجہ سے اس آیت میں دعوت کیساتھ خاص کیا گیا ہے اور اس آیت کی تفسیر سورۃ بقرہ 136 میں گزر چکی ہے لیکن دو وجوہات سے فرق ہے۔ پہلی وجہ یہاں اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ اور وہاں وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ مذکور ہے اسکی حکمت یہ ہے کہ اس سورۃ میں نبی کو خطاب ہے اور نبی کو خطاب اوپر کی طرف سے بغیر واسطے کے نازل ہوتا ہے تو اسکے ساتھ علیٰ مناسب ہے اور سورۃ بقرہ میں خطاب امت کو تھا اور انکو خطابات نبی ﷺ کے واسطے سے پہنچتے ہیں تو اس کے ساتھ لفظ الیٰ مناسب تھا (امام راغب) اور دوسری حکمت یہ ہے کہ اُنْزِلَ عَلَيْهِ وہاں ذکر ہوتا ہے جہاں منزل علیہ کو تبلیغ کا حکم ہو تو اس میں وجوب کا معنی ہے اور اس پر علیٰ کا لفظ دلالت کرتا ہے اور یہ انبیاء کے حال کے مناسب ہے اور اُنْزِلَ اِلَيْهِ وہاں ذکر ہوتا ہے جو مُنَزَّلٌ اِلَيْهِ کیساتھ خاص ہوتا ہے اور یہ امت کے حال کے مناسب ہے اور اس فرق کی تائید سورۃ عنکبوت 15 اور سورۃ نحل 44 میں ہے اگرچہ یہ فرق ہمیشہ نہیں ہوتے ہیں کبھی نبی کیساتھ الیٰ اور امت کیساتھ علیٰ بھی ذکر ہوتا ہے جیسا کہ بقرہ 45 اور آل عمران 72 میں ہے۔ فرق کی دوسری وجہ یہ ہے کہ سورۃ بقرہ میں وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ اور اس آیت میں وَالنَّبِيُّوْنَ مذکور ہے حکمت یہ ہے کہ سورۃ بقرہ

میں خطاب عام تھا اور اہل کتاب کے سوال کا جواب تھا اور انکے ساتھ اور تفصیل مناسب ہے اور اس سورۃ میں خطاب خاص ہے اور صرف دین الٰہی کا اظہار مقصود ہے تو اس میں اختصار مناسب ہے۔ فائدہ: امام رازی نے فرمایا ہے کہ انبیاء اور کتب پر ایمان لانے کیلئے اللہ پر ایمان لانا اصل بنیاد ہے اسلئے اس کو مقدم کیا ہے پھر محمد ﷺ اور باقی انبیاء پر ایمان لانا یہ موقوف علیہ ہے باقی انبیاء اور انکی کتابوں پر ایمان لانے کیلئے پھر اسکے بعد ان انبیاء کا ذکر کیا کہ اہل کتاب نے انکا وجود اپنے زمانے میں تسلیم کیا تھا اگر چہ انکی نبوت میں اختلاف کیا تھا اور پھر موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام اور انکی کتابوں کا ذکر اس وجہ سے کیا کہ اہل کتاب انکی نبوت کو مانتے تھے باوجود اس کے کہ انکا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اختلاف تھا۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿85﴾ "اور جس نے اسلام کے علاوہ دوسرا دین تلاش کیا پس ہرگز قبول نہیں کیا جائیگا اس سے اور وہ آخرت میں نقصان والوں میں سے ہوگا" [85]۔

تفسیر 85: جب پہلی آیت میں اسلام کا تفصیلی ذکر ہوا تو اس آیت میں دین اسلام کو دوسرے دین کے ساتھ بدلنے پر وعید اور آخرت کا خوف ہے۔ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ ابتغاء طلب کرنے پر دلالت کرتا ہے زیادہ بحث اور کوشش کرنے کے باوجود لیکن انکی یہ کوشش باطل طریقے سے ہے یعنی ضد اور عناد کیساتھ ہے غَيْرَ الْاِسْلَامِ اسلام سے مراد توحید کا دین ہے یا اس سے مراد نبی ﷺ کی خاص شریعت ہے اور یہاں ایمان اور اسلام مترادف (ہم معنی) ہے اور دِيْنًا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور غَيْرَ الْاِسْلَامِ حال ہے یا بدل ہے یا تمیز لفظ غیر سے بطور تمیز یا بطور تفسیر ہے اور تفسیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ غیر اسلام کو طلب کرنا دو طرح سے ہے پہلی قسم یہ ہے کہ اس غیر کو دین نہیں کہا جا سکتا ہے جس کی مخالفت کا سبب صرف جہل اور غفلت ہو۔ دوسری قسم یہ ہے کہ اس غیر کو دین کہا جاتا ہے اسلام کے مقابلے میں ہے جیسا کہ یہود و نصاریٰ اسلام کی مخالفت کو دین کہتے ہیں اسی طرح مبتدع اسلام کے خلاف (عقیدہ عمل اور قول) کو دین کہتا ہے فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ قبولیت اس معنیٰ میں ہے جو اللہ کے نزدیک صحیح ہو تو عدم قبولیت یہ ہے کہ اس کے ساتھ اسلام کے احکام دنیا میں مرتب نہیں ہوتے ہو اور آخرت میں نجات حاصل نہیں ہوتی ہے۔ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ: خسران سے مراد آخرت میں ثواب اور جنت سے محروم ہونا ہے اور جہنم میں ہمیشہ کیلئے داخل ہونا ہے۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿86﴾ "کیسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے گا اس قوم کو جنہوں نے کفر کیا اپنے ایمان کے بعد اور گواہی

دی انہوں نے کہ بیشک رسول حق ہے اور آئے انکے پاس واضح دلائل اور اللہ تعالیٰ ہدایت (کی توفیق) نہیں دیتا ہے ظالم (عنادی) قوم کو" [86]۔

تفسیر 86: اس آیت میں علامت ہے کہ ان کے اعمال مردود ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے محروم ہونا ہے اور اس آیت میں اہل کتاب کی بارہویں خباثت ذکر کی ہے وہ یہ ہے کہ نبی ﷺ کی بعثت سے پہلے یہ لوگ نبی ﷺ کا اقرار کرتے تھے لیکن بعثت کے بعد ان کا انکار کرلیا۔ کَیْفَ حالات کے سوال کیلئے آتا ہے لیکن یہاں تعجب یا انکار کیلئے ہے یَہْدِی اللّٰہُ سے مراد ہدایت کی توفیق دینا ہے اس لیے کہ ہدایت دکھانا دلیلوں کیساتھ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے کَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِہِمْ ان اہل کتاب کی تصدیق کی طرف اشارہ ہے جو انہوں نے نبی ﷺ کی بعثت سے پہلے کی تھی اس دلیل کیساتھ یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سورۃ بقرۃ 89۔ اور کفر سے مراد اس کی بعثت کے بعد انکار کرنا ہے اور آیت کے الفاظ میں ہر مرتد شخص شامل ہے۔ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ اس میں تین اقوال ہیں پہلا یہ کہ اِیْمَانِہِمْ پر عطف ہے خاص کو عام پر عطف کیا ہے یا ایمان سے مراد دل کی تصدیق ہے اور شہادت اقرار کے معنی میں ہے اور اِیْمَانِہِمْ میں فعلی معنی (ایمان لانا) مراد ہے تو اس پر فعل کا عطف کرنا صحیح ہے۔ دوسرا قول یہ کفروا فاعل کیلئے حال ہے۔ تیسرا قول یہ کفروا پر عطف ہے اور واؤ ترتیب کیلئے نہیں ہے اور الرَّسُوْلَ میں الف لام عہدی ہے یعنی محمد رسول اللہ ﷺ یہ وَّجَآءَهُمُ الْبَیِّنٰتُ شَهِدُوْٓا پر عطف تاکید کیلئے ہے یعنی انکی شہادت تقلیداً نہیں ہے بلکہ واضح دلائل کے بعد ہے۔ وَاللّٰہُ لَا یَہْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ظلم سے مراد ضد اور عناد کرنا جو کہ ہدایت سے محروم ہونے کا سبب ہے اور آیت کے آخر میں یہ جملہ اس وجہ سے ذکر کیا تاکہ عنادی قسم کے کافروں کی طرف اشارہ کیا جائے اسلئے کہ باقی کافروں کو تو ہدایت مل سکتی ہے۔

اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَیْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ﴿٨٧﴾ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۚ لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ ﴿٨٨﴾ "یہی لوگ ہیں ان کا بدلہ یہ ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت ہے اور ملائکہ اور تمام لوگوں کی لعنت ہے ہمیشہ رہیں گے اس میں نہ کم کیا جائے گا ان سے عذاب کو اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی" [87]۔

تفسیر 87 یہ ان ظالموں کے لئے تخویف اخروی ہے جن کا ذکر پہلے ہوگیا اُولٰٓئِكَ مبتدا ہے اور جَزَآؤُهُمْ اس کا بدل اشتمال ہے یا دوسرا مبتدا ہے اور اَنَّ عَلَیْهِمْ خبر ہے ایسا سورۃ بقرۃ 161 میں گزر چکا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ یہاں پر جَزَآءُهُمْ کا لفظ ذکر نہیں کیا ہے فرق کی وجہ یہ ہے کہ سورۃ بقرۃ میں انکا ذکر ہے جو کفر پر فوت ہوجائیں تو ان کا بدلہ ایسے

ہوگا اس وجہ سے اس کے بعد توبہ کا ذکر ہوا ہے فِيهَا ضمیر لعنت کی طرف راجع ہے اس وجہ سے یہ لوگ کسی بھی حال میں لعنت سے خالی نہیں ہوں گے یا لعنت سے مراد جہنم کا عذاب ہے باقی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۗ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾

"مگر وہ لوگ جنہوں نے اس کے بعد توبہ کی اور اپنے اعمال کی اصلاح کی پس بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے" [89]

تفسیر 89: یہ دنیا میں توبہ کرنے کی طرف ترغیب ہے اِلَّا استثناء متصل ہے یہ اشارہ ہے کہ عنادی شخص بھی جب عناد چھوڑ دے اور حق کی طرف رجوع کرلے تو توبہ کرتا ہے اور اس کی توبہ قبول ہوتی ہے لیکن یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو ختم القلب کے مرتبے کو نہیں پہنچے ہوتے ہیں اور یہ دونوں قسمیں عنادیوں میں امام قاسمی نے قاشانی سے نقل کی ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ﴿۹۰﴾ "بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اپنے ایمان لانے کے بعد پھر زیادہ ہوگئے کفر میں ہرگز انکی توبہ کو قبول نہیں کیا جائے گا اور یہی لوگ گمراہ ہیں" [90]۔

تفسیر 90: جب پہلے توبہ کا ذکر ہوگیا تو اب ذکر ہورہا ہے کہ توبہ قبولیت کے اوقات میں کرنی چاہئے جو موت کے نزع کے لمحات سے پہلے ہو اس آیت میں ان لوگوں کیلئے خوف اور وعید ہے جنہوں نے صحیح توبہ نہیں کی ہے ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا اس سے مراد موت تک کفر پر ہمیشگی کرنا ہے لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ان کی توبہ سے مراد موت کے لمحات میں توبہ کرنا ہے یعنی جب سانس حلق تک پہنچ جائے ایسا ہی سورۃ نساء 18 میں بھی ہے اور یہ قول حسن قتادہ اور عطاء سے مروی ہے اور ایسا حدیث میں مذکور ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغَرْغِرْ

(ابن حبان 628، ابن ماجہ 4253، کتاب الزهد، احمد 2/132، ترمذی 3537 احمد 6160 حاکم 2/257 ترمذی نے حسن حاکم نے صحیح قرار دیا ہے) اور اس کو حشرجہ اور معاینہ بھی کہا جاتا ہے یا مراد یہ ہے کہ انکی توبہ بھی نہیں تو قبول کیسے ہوگی وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ اس سے مراد گمراہی کا کامل درجہ ہے اسلئے کہ یہ موصوف ہے کفر اور زیادت کفر کے ساتھ باوجود اس کے کہ انہوں نے توبہ بھی نہیں کی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ۭ اُولٰٓئِكَ

لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ﴿٩١﴾ ع "بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور حالت کفر میں فوت ہو گئے پس ان
میں سے کسی ایک سے زمین بھر سونا بطور فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا یہ لوگ جن کیلئے دردناک عذاب ہے اور نہیں ہوگا ان
کیلئے کوئی مددگار" [91]۔

تفسیر 91: انسان کے اختیار میں گناہ کے معاف کرنے کے دو طریقے ہیں پہلا یہ کہ وقت پر معافی مانگی جائے اور توبہ کی جائے تو یہ توبہ قبول ہے لیکن جب توبہ وقت پر نہ کی جائے جیسا کہ موت کے لمحات کے وقت توبہ کرنی ہے تو فرمایا کہ یہ توبہ قبول نہیں ہوگی دوسرا طریقہ یہ ہے کہ فدیہ ادا کرے اور وہ قبول کیا جائے تو اس آیت میں اس کی نفی ذکر کی ہے إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ یعنی موت تک کسی قسم کی توبہ نہیں کی اور کفر کی حالت میں مر گئے۔ فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا، مِلْءُ بھرنے کی مقدار کو کہا جاتا ہے یعنی اتنی مقدار میں زمین بھر جائے، ذَهَبًا، مِلْءُ کیلئے تمیز بطور تفسیر ہے سوال: جب إِنَّ کا اسم موصول ہو تو خبر کے معنی میں فَا داخل ہوتی ہے تو اس آیت میں بھی خبر میں فَا کو داخل کیا ہے اور پہلی آیت میں فَا داخل نہیں کی ہے۔ جواب: پہلی آیت میں کفر کا صلہ اور زیادت کفر اور توبہ کا قبول نہ ہونا اس وقت مرتب ہوگا جب زیادت فی الکفر کا معنی موت علی الکفر ہو جائے لیکن یہ صریح نہیں ہے اور اس آیت میں موت کفر میں صراحتاً ذکر ہے اور یہ فدیہ کے قبول نہ کرنے کا سبب ہے اور یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے جب حکم وصف پر مرتب ہو جاتا ہے تو وہ وصف سبب کیلئے ضرور لازم ہوگا بلکہ موصول پر اس کی تعبیر کبھی باقی دیگر مقاصد کیلئے بھی آتی ہے وَلَوِ افْتَدَىٰ بِهِ اہل عرب کا قول ہے کہ ایسا واو جو شرط (وصلیہ) کیساتھ ہو تو یہ دوسری شرط کا تقاضا کرتا ہے جو اس سے مراد ہوتی ہے اور اس میں حکم پوشیدہ پہلے سے موجود ہوگا اور امام ابوحیان نے کہا ہے کہ وَلَو تنبیہ کرنے کیلئے آتا ہے جیسا کہ ماقبل کی انتہا کے طور پر آیا ہے اور مابعد میں اس بات کی صراحت ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ ماقبل میں داخل نہیں ہے جیسا کہ رُدُّوا السَّائِلَ وَلَوْ جَاءَ عَلَى فَرَسٍ (رواہ مالک امام ابن عبدالبر نے اس کی سند کو کمزور قرار دیا ہے التمہید 294/5 میں اور جیسے اَکْرِمْ زیداً اور اسی طرح وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ (النساء 135) اور أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ (بقرہ 170) تو اب سوال یہ ہے کہ اس آیت میں تو ایسا ہے اس لئے کہ زمین بھر سونا فدیے میں دینا اس سے بڑھ کر افضل کوئی مال نہیں ہے جس میں فدیے کا قبول نہ ہونا اولی طور پر معلوم ہو جائے (اسکا جواب کئی طریقوں سے ہے) جواب (1) عبارت میں الفاظ مقدر ہیں کہ فَلَن يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِم وَلَوِ افْتَدَىٰ بِمِلْءِ الْأَرْضِ ذَهَبًا یعنی جب زمین بھر

سونے کا فدیہ قبول نہیں ہوگا تو ویسے فدیہ تو اولی طور پر قبول نہیں ہوگا۔ جواب (2) عبارت میں الفاظ مقدر ہیں یعنی وَلَوِ افْتَدٰى بِمِثْلِهِ مَعَهٗ یعنی مِلْءُ الْاَرْضِ کی طرح اور بھی سونا اس کے ساتھ ہو جائے تب بھی قبول نہیں ہوگا۔

جواب (3) عبارت میں الفاظ پوشیدہ ہیں فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا تَصَدُّقًا وَ تَبَرُّعًا وَلَوِ افْتَدٰى بِهٖ یعنی فدیہ کے طور پر قبول نہیں ہوگا تو صدقے کے طور پر بطور اولیٰ قبول نہیں ہوگا (یہ جوابات زمخشری نے ذکر کیے ہیں) جواب (4) واو زائد ہے یہ جواب قرطبی نے ذکر کیا ہے۔ جواب (5) ابن عطیہ نے زجاج سے نقل کیا ہے کہ عبارت میں پوشیدہ الفاظ ایسے ہیں فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ اِنْفَاقُهٗ فِى الدُّنْيَا وَلَوْ اَنْفَقَ مِلْءَ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَلَوِ افْتَدٰى بِهٖ فِى الْاٰخِرَةِ لَمْ يُقْبَلْ مِنْهُ یعنی اگر یہ زمین بھر سونا آخرت میں دے تو وہ قبول نہیں ہوگا تو دنیا میں اگر یہ خود یا اس کی طرف سے کوئی خیرات وغیرہ کرے تو یہ بطور اولیٰ قبول نہیں ہوگا۔ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ اس عذاب کو دور کرنے یا اس کو آسان کرنے کیلئے کوئی بھی مددگار نہیں ہوگا اور مِنْ استغراق کیلئے آیا ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۚ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿٩٢﴾ "ہر گز تم نہیں پہنچ سکتے ہو نیکی کو یہاں تک کہ تم خرچ کرو اس سے جو تم پسند کرتے ہو اور جو بھی تم خرچ کرتے ہو کسی چیز سے پس بیشک اللہ تعالیٰ اس کو جاننے والا ہے" [92]۔

تفسیر 92: اس آیت میں سوال کا جواب ہے سوال یہ ہے کہ جب انسان زمین بھر سونا خرچ کرتا ہے تو ہونا تو یہ چاہئے کہ قبول ہو جائے اسلئے کہ یہ بڑا صدقہ ہے تو اس آیت میں جواب یہ ہے کہ یہ اس وجہ سے قبول نہیں ہے کہ اس میں قبولیت کی شرط نہیں ہے جو کہ محبوب چیز کا خرچ کرنا ہے کیونکہ آخرت میں یہ مال اس کا محبوب نہیں ہے۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ. تَنَالُوا نیل سے لیا گیا ہے ایک چیز کو حاصل کرنے کے معنی میں ہے اور بِرّ کی تفسیر سورۃ بقرہ 177 میں گزر چکی ہے یہاں پر ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور مجاہد کی روایت کے مطابق جنت کے معنی میں ہے اور مقاتل نے کہا ہے کہ بِرّ تقویٰ کے معنی میں ہے اور بعض نے کہا ہے کہ بِرّ اللہ تعالیٰ کا اکرام اور عزت دینا ہے اور فضل کرنا ہے یہ قول ابوبکر وراق کا ہے۔ مِمَّا تُحِبُّوْنَ. مِنْ تبعیض کیلئے ہے اور محبت سے مراد کسی چیز کیساتھ دل کا تعلق ہے یہاں تک کہ اسکا خرچ کرنا اسکے نفس پر مشکل ہوتا ہے اور محبوب مال سے مراد وہ مال ہے کہ جو انسان کو اپنی ذات کیلئے پسند ہوتا ہے اور اسکو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کر لیتا ہے اور صحابہ کرام نے اس پر عمل کیا ہے جیسا کہ طلحہ رضی اللہ عنہ نے باغ بیر حاوقف کیا ہے یہ حدیث بخاری مسلم اور

امام احمد نے نقل کی ہے (صحیح بخاری کتاب الزکوۃ حدیث 1461 و صحیح مسلم کتاب الزکوۃ حدیث 998، احمد 141/3) اور عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اس حصے کو جو اس کو خیبر میں ملا تھا اس کو اللہ کے راستے میں وقف کیا تھا یہ بھی بخاری مسلم نے نقل کیا ہے (صحیح بخاری کتاب الشروط حدیث 2737، صحیح مسلم حدیث 1632، ابن ماجہ کتاب الصدقات حدیث 2397) اس طرح صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں اور بھی بہت روایات ہیں اسی طرح محبوب سے مراد وہ ہے جو حالتِ حیات میں ہو اس لئے کہ موت پر ہر انسان اپنے مال سے ناامید ہوتا ہے اسی طرح محبوب وہ ہے جو قیمتی ہے بہتر اور اصل مال ہے یہ قول امام ابوحیان اور صاحب اللباب نے ذکر کیا ہے اور بیضاوی اور صاحب فتح البیان نے کہا ہے کہ مَا تُحِبُّوْنَ عام ہے مال ہو جان بدن اور روح سب کیلئے ہے یہ تمام توحید اور سنت اور حصول علم کے اور جہاد کیلئے خرچ کئے جائیں۔ سوال سورۃ بقرہ 177 میں بِرّ کے حصول کیلئے 10 امور ذکر ہوئے ہیں اور یہاں پر ایک عمل ذکر ہے جواب مَا تُحِبُّوْنَ کی آخری تفسیر کے اعتبار سے وہ دس امور مَا تُحِبُّوْنَ میں داخل ہیں۔ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ یہ جزا ہے شرط پوشیدہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں بدلہ دے گا اور جزا کی علت بھی ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر علم رکھتا ہے۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۳﴾ "سب کھانے کی چیزیں (جو یہودیوں پر حرام کی تھیں) حلال تھیں بنی اسرائیل کیلئے مگر وہ جو حرام کیا تھا یعقوب علیہ السلام نے اپنے نفس پر تورات کے نازل ہونے سے پہلے آپ کہہ دیجئے لے آؤ تورات کو پس پڑھ کر سناؤ اس کو اگر تم سچے ہو" [93]۔

تفسیر 93: اس آیت کا ربط سابقہ آیت کیساتھ اس اعتبار سے ہے کہ پہلی آیت میں محبوب چیز کو خرچ کرنے کی ترغیب تھی تو اب اس کی مثال ذکر کی کہ یعقوب علیہ السلام نے بیماری سے شفاء حاصل کرنے کیلئے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے صحت دی تو میں محبوب کھانے پینے کو اپنے آپ پر حرام کروں گا تو اونٹنی کے دودھ اور گوشت کو اپنے آپ پر حرام کیا۔ یہ حدیث مسند احمد میں ذکر ہے اور امام ابن کثیر نے اس کو روایت کیا ہے (احمد 278/1، طبرانی 130/2، شیخ شعیب ارناوط اور زبیر علی زئی نے اس کو حسن کہا ہے، الموسوعۃ الحدیثیہ 2014) (ابوحیان)۔ دوسرا ربط اس اعتبار سے ہے کہ پہلی آیت میں نبی ﷺ کا صدق ذکر ہوا اور ان منکرین کو وعید اور خوف تھا تو اب ان شبہات کے جوابات ذکر کیے جو یہود اور نصاریٰ نبی ﷺ پر کرتے تھے اور ان ربطوں کو صاحب اللباب اور ابن کثیر نے بھی ذکر کیا ہے۔ كُلُّ الطَّعَامِ اس

آیت میں ان کے ایک شبہے کا جواب ہے اور وہ شبہ یہ ہے کہ یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کرتے تھے کہ آپ ملت ابراہیم کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ اس کے دین میں اونٹ کا گوشت حرام تھا اور آپ کے دین میں حلال ہے تو آپ حلال اور حرام میں اس کے مخالف ہیں اسی طرح یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نسخ کا اعتراض کیا کرتے تھے تو اس آیت میں اس نسخ کو بھی ثابت کیا کہ اونٹ کا گوشت پہلے حلال تھا اور یعقوب علیہ السلام نے اس کو حرام کیا تو ان کو یہ شبہ ہوا کہ اونٹ کا گوشت آدم علیہ السلام کے وقت سے حرام تھا اور یہ لوگ تورات کا حوالہ دیا کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کو رد کیا اور ان سے کہا کہ تورات لے آؤ جس پر ان لوگوں کو شرمندگی ہوئی۔ الطَّعَامِ مطعوم کے معنی میں ہے اور یہ ہر اس چیز کیلئے عام ہے جو کھائی جاتی ہے طعام کی جو تخصیص احناف نے گندم کیساتھ کی ہے تو یہ ضعیف ہے اور کُلُّ الطَّعَامِ سے مراد تمام کھانے نہیں ہیں اسلئے کہ مردار اور خنزیر اور بہتا ہوا خون اور جس پر اللہ کے علاوہ کسی اور کا نام لیا جائے یہ تو تمام دینوں میں حرام تھے تو یہاں پر مراد مطعومات ہیں کہ یہودی قرآن کے نزول کے وقت ملت ابراہیم کے دین میں اس کی حرمت کا دعویٰ کرتے تھے یعنی انہوں نے اپنی طرف سے بے دلیل حرام کیا ہے اور اس کو تحریمات لِغَیْرِ اللّٰہِ کہا جاتا ہے (اسکو امام ابوحیان نے قفال سے نقل کیا ہے اور اسی طرح تفسیر مواہب الرحمان میں ذکر ہے)۔ کَانَ حِلًّا لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ حِلًّا مصدر ہے مذکر مونث مفرد تثنیہ اور جمع سب اس میں ایک جیسے ہیں۔ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِیْلُ عَلٰی نَفْسِہٖ اس استثنیٰ میں دو اقوال ہیں پہلا قول یہ ہے کہ یہ استثنیٰ منقطع ہے یعنی یعقوب علیہ السلام نے صرف اپنے اوپر حرام کیا تھا اور بنی اسرائیل پر حرام نہیں تھا۔ دوسرا قول استثنا متصل ہے یعنی یعقوب علیہ السلام کی تحریم کی وجہ سے وہ بنی اسرائیل پر بھی حرام ہوگیا لیکن پہلا قول میرے نزدیک بہتر ہے اسلئے کہ یعقوب علیہ السلام نے اپنے اوپر جو حرام کیا تھا اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ اونٹنی کا گوشت اور دودھ تھا اور اونٹ تو بنی اسرائیل پر تورات سے پہلے حرام نہیں تھے بلکہ ان کی سرکشی اور ظلم کی وجہ سے بعد میں حرام کئے گئے جیسا کہ سورۃ انعام 146 ورۃ نساء 160 اور سورۃ نحل 118 میں ہے۔ مَا حَرَّمَ وہ چیز جو انہوں نے اپنے اوپر حرام کی تھی تو اتفاقی قول یہ ہے کہ وہ گوشت اور دودھ اونٹنیوں کا تھا اور سدی کا ایک قول یہ ہے کہ وہ گوشت کی عروق یعنی (رگیں) تھیں اور ان کی حرمت کے سبب میں اختلاف ہے پہلا قول وہ ہے جو پہلے گزر چکا ہے جو اس اعتبار سے تھا کہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی کیلئے نذر مانی تھی اور یہ انکے دین میں جائز تھا کہ نذر میں اپنے اوپر محبوب چیز کو حرام کردے۔ دوسرا قول ضحاک کا تھا جو امام ابن مبارک کی سند سے مروی ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو عرق النساء بیماری تھی تو طبیبوں نے ان سے کہا تھا کہ اونٹ کے گوشت

سے پرہیز کرو تو اس نے اپنے او پر وہ بند کر دیا۔ سوال: تحریم اور تحلیل میں اللہ تعالیٰ کا اذن (اجازت) شرط ہے اور اس پر بہت سارے دلائل دلالت کرتے ہیں تو یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر اس کو کس طرح حرام کیا؟۔ جواب (1) یہاں پر تحریم لغوی معنی میں ہے یعنی منع کرنا اور اس معنی میں قرآن کریم میں بھی استعمال ہے جیسا کہ سورۃ قصص 12 اور سورۃ تحریم 1 تو پہلے اس سے منع کرنا یا تو نذر کی وجہ سے تھا اور ان کے دین میں یہ جائز تھا یا پرہیز کے طور پر تھا۔ جواب (2) یہ تحریم شرعی تھا یعقوب علیہ السلام کے اجتہاد کی وجہ سے اور انبیاء کا اجتہاد بھی شرعی دلیل ہے جب اللہ تعالیٰ اس کو برقرار رکھے۔ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ یہ حِلًّا کے ساتھ متعلق ہے اور یہ فصل کسائی کے نزدیک جائز ہے یا حَرَّمَ کیساتھ متعلق ہے قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَا۔ بنی اسرائیل اس شبہ میں تورات کو دلیل میں پیش کرتے تو اسی وجہ سے ان کو تورات لے آنے اور پڑھنے کا حکم دیا گیا لیکن ان کو تورات حاضر نہیں کی گئی۔

فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾

"پس اس کے بعد جس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا پس یہی لوگ ظالم ہیں" [94]۔

تفسیر 94: اس آیت میں ان کیلئے وعید ہے جب انہوں نے اس بات کو ثابت کرنے کیلئے تورات کو حاضر نہیں کیا تو ان کا جھوٹ ظاہر ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کا حوالہ دینا یہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنا ہے مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ یہ افتریٰ کیساتھ متعلق ہے پہلی بات کی وضاحت کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے یا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی اس بات کا ثبوت تورات میں نہیں ہے۔ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ظلم سے مراد ظلم کامل کا درجہ ہے اس لئے کہ حصرِ اِفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ میں کیا ہے۔

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۗ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۗ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۵﴾ "آپ کہہ دیجئے سچ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے پس تم اتباع کرو ابراہیم علیہ السلام کے دین کی جو توحید پر سختی سے قائم تھا اور نہیں تھا وہ مشرکوں میں سے" [95]۔

تفسیر 95: اس میں پہلی آیت کے ساتھ تقابل ہے یعنی یہ اہل کتاب اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے ہر وقت اور ہر بات کیلئے عام ہے اور پہلی آیت کا مضمون بھی اس میں داخل ہے یعنی یہ تمام کھانے (خوراک) بنی اسرائیل کیلئے حلال تھے ان پر حرمت ان کی سرکشی کے بعد آئی ہے فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ یہ اصل میں محمد ﷺ کی اتباع کی طرف دعوت ہے اس لئے کہ محمد ﷺ تمام اصول اور فروع میں ملت ابراہیم کیساتھ

موافق ہے وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ یہ پہلے اہل کتاب پر اعتراض ہے کہ وہ مشرک ہو چکے ہیں۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٦﴾ "بیشک سب سے پہلا گھر جو لوگوں کیلئے رکھا گیا ہے وہ ہے جو مکہ میں ہے، بہت برکت والا اور تمام لوگوں کیلئے ہدایت ہے" [96]۔

تفسیر 96: (ربط 1) اس آیت میں یہود و نصاریٰ کے دوسرے شبہے کا رد ہے جو انہوں نے نبی ﷺ پر کیا تھا ان کا کہنا تھا کہ ہمارا قبلہ بیت المقدس آپ کے قبلہ سے پہلے ہے اور افضل ہے اور یہ قبلہ آپ کے قبلے کی وجہ سے منسوخ نہیں ہے (اس لئے کہ یہ لوگ نسخ کا انکار کرتے تھے)۔ (ربط 2) اسی طرح اس آیت میں یہود و نصاریٰ کا دوسرا رد ہے کہ وہ لوگ ملت ابراہیمیہ کا دعویٰ کرتے تھے حالانکہ کعبہ کے حج کا حکم ملت ابراہیمیہ میں داخل ہے اور یہ لوگ اس کا انکار کرتے ہیں ان آیتوں میں کعبے کی آٹھ فضیلتیں ذکر ہیں۔ پہلی اور دوسری یہ ہے اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ اس اولیت میں دو قول ہیں پہلا قول یہ ہے کہ یہ اولیت مطلقہ ہے اور یہ قول امام مجاہد اور قتادہ سے قرطبی نے نقل کیا ہے یعنی آسمانوں اور زمین کی پیدائش کیساتھ یہ گھر ملائکہ نے اللہ تعالیٰ کے امر سے بنایا ہے پھر آدم علیہ السلام نے بنایا پھر شیث علیہ السلام نے بنایا پھر ابراہیم علیہ السلام نے پھر عمالقہ پھر بنو جرہم پھر قصی پر قریشیوں نے نبی ﷺ کی بعثت سے پہلے پھر عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پھر حجاج بن یوسف نے اسی طرح تاریخ مکہ اور روح المعانی نے بھی لکھا ہے اور باقی مفسرین نے بھی نقل کیا ہے اور اولیت مطلقہ پر دلیل بخاری مسلم اور احمد کی حدیث ہے (صحیح بخاری کتاب الانبیاء حدیث 3366، صحیح مسلم کتاب المساجد حدیث 520، ابن ماجہ کتاب المساجد 753) جو ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس نے نبی ﷺ سے پوچھا کہ کونسی مسجد پہلے بنائی گئی ہے تو اس پر آپ ﷺ نے فرمایا مسجد حرام پھر مسجد اقصیٰ اور ان کے درمیان چالیس سال کا فاصلہ ہے تو اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بنانے سے مراد ملائکہ کی تعمیر ہے اسلئے کہ ابراہیم علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کے بنانے کے درمیان تو ہزار سال سے زیادہ فاصلہ ہے اور سورۃ بقرہ 127 اور حج 26 میں ابراہیم علیہ السلام کے بناء کا ذکر ہے تو مراد یہ ہے کہ اس کے زمانے سے پہلے اس طرح ویران ہو گیا تھا کہ اس کی بنیاد بھی غائب ہو گئی تھی ابراہیم علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے بنیادیں ظاہر کر دیں اور بنیادوں پر تعمیر کر کے حج کا اعلان فرمایا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ اولیت مقیدہ ہے یعنی قبلہ مقرر کرنے کے اعتبار سے یہ پہلا گھر ہے اگرچہ اس سے پہلے کمرے بنائے گئے تھے تو وضع میں جو پہلا قول ہے اس سے مراد آباد کرنا ہے اور دوسرے قول کی بناء پر اس سے مراد جگہ اور عبادت کا قبلہ اور طواف کرنا ہے۔ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ

بَکّہ اور مکہ کے بارے میں دو قول ہیں پہلا قول یہ ہے کہ بَکَّۃَ کی باء میم کے بدلے میں ہے اور دونوں کا مصداق ایک ہی ہے یہ قول مجاہد اور ضحاک کا ہے دوسرا قول یہ ہے کہ اس کے مصداقات میں فرق ہے اور اس کی دو وجوہات میں پہلی یہ ہے کہ بکہ صرف بیت اللہ کی جگہ کو کہا جاتا ہے اور مکہ پورے شہر کو کہا جاتا ہے یہ قول امام مالک سے منقول ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مسجد حرام کو کہا جاتا ہے اور مکہ پورے حرم کو کہا جاتا ہے اور بَکَّۃَ اور مَکَّۃُ کے درمیان لغوی معنیٰ اور وجہ تسمیہ کے اعتبار سے بہت ساری وجوہات سے فرق ہیں لفظ بکّہ میں دو وجوہات ہیں پہلی وجہ بکّہ بک سے لیا گیا ہے ازدحام کے معنی میں (یعنی رش لگانا، بھیڑ) تو کعبہ پر بھی طواف کے وقت ازدحام اور (رش) ہوتا ہے دوسری وجہ بک گردنوں کے توڑنے کو کہا جاتا ہے تو کعبہ میں بھی جو ظلم کیساتھ الحاد کرے تو اس کی گردن اللہ تعالیٰ توڑ دیتا ہے اور ابن زبیر سے روایت منقول ہے کہ جو جبار کعبہ کے بارے میں بری نیت سے ارادہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی گردن توڑتا ہے اور لفظ مکہ میں تین وجوہات ہیں پہلی وجہ مکہ مک سے لیا گیا ہے اور مک لغت میں پانی کے کم ہونے کو کہا جاتا ہے اور وہاں پر پانی بہت کم ہے دوسری وجہ مک ہڈی سے مغز (گودھا) نکالتا ہے تو وہاں پر بھی مشقت اور تکلیف کی وجہ سے انسان کے پاؤں کے گودے سوکھ جاتے ہیں۔ تیسری وجہ مک ہلاک کرنے اور کم کرنے کو کہا جاتا ہے تو مکہ بھی ظالموں کو ہلاک کرتا ہے۔ مُبٰرَكًا اس میں تیسری فضیلت ذکر ہے اور اس کی برکات زیادہ ہیں جیسا کہ کم عمل سے بہت زیادہ ثواب حاصل ہوتا ہے۔ حج، عمرہ، طواف اور اعتکاف سے گناہ معاف ہوتے ہیں ہر قسم کے رزق اور پھل وہاں آتے ہیں طواف کرنے اعتکاف کرنے اور رکوع سجدہ کرنے والوں سے خالی نہیں ہوتا ہے اور دن رات کے ہر وقت میں ہر طرف سے اس کی طرف نماز پڑھنے والے موجود ہوتے ہیں۔ وَّهُدًى یہ چوتھی فضیلت ہے اس صفت میں مصدر کا اطلاق (وَّهُدًى) مبالغہ کے طور پر ہوا ہے اور اس ہدایت کی بہت ساری وجوہات ہیں جیسا کہ قبلہ ہونا، رحمت، صلاح، توحید اور صدق رسول اللہ ﷺ پر دلالت، جنت تک پہنچانے والا، ہر نماز میں اس کی طرف توجہ کرنے کی وجہ سے لِّلْعٰلَمِیْنَ اس میں اشارہ ہے کہ ابتداء سے کعبہ تمام انبیاء اور ان کی امتوں کیلئے قبلہ اور حج کا مقام تھا۔

فِیْهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ ۚ۬ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اس میں واضح نشانیاں ہیں اور مقام ابراہیم ہے اور جو شخص اس میں داخل ہوگیا وہ امن والا ہوگا۔ وہ اللہ کیلئے (ان) لوگوں (پر حج کرنا فرض ہے) اس کی جو طاقت رکھے اور جس نے کفر کیا

پس بیشک اللہ تعالیٰ تمام جہانوں سے بے پرواہ ہے" [97]۔

تفسیر 97: فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ یہ مُبٰرَکًا اور ھُدًی کیلئے تفسیر کے مرتبے میں ہے اس وجہ سے بغیر عطف کے ذکر ہے اور اس میں پانچویں فضیلت ذکر ہے۔ فِيهِ میں ضمیر بیت کی طرف راجع ہے لیکن اس ظرف میں توسع کیا گیا ہے تو بیت اللہ اور پورا حرم اس میں داخل ہے اور مفسر ابو حیان اور آلوسی نے اس میں بہت امور ذکر کیئے ہیں جیسا کہ حجر اسود، زمزم، حطیم لوگوں کے دلوں میں اس کی تعظیم اور ہیبت، فیل کا واقعہ، اس سے جبابرہ کو روکنا ہر زمانے میں سیلابوں سے بچانا، اس میں وحشی پرندوں اور درندوں سے امن ہے اور جب اس کے ہر رکن (کونے) میں جب بارش ہوجائے تو اس علاقے کی ہر طرف میں فراخی ہوتی ہے۔ سال بھر بارشیں ہوتی ہیں مثلاً جب رکن یمانی کی طرف بارش ہوجائے تو یمن کے پورے علاقے میں سال بھر فراوانی ہوتی ہے اور جب بارش تمام کونوں پر ہوجائے تو باقی تمام ارد گرد کے شہروں میں سال بھر فراوانی ہوتی ہے اور اس کے قریب دعائیں قبول ہوتی ہیں اور جو اس میں الحاد کرے اس پر جلدی عذاب آتا ہے اور جس نے یہ کہا کہ اس کے اوپر پرندے اور کبوتر نہیں اُڑتے ہیں تو اس بات کو ابن عطیہ اور آلوسی نے رد کیا ہے اور یہ حقیقت کے بھی خلاف ہے۔ مَقَامُ إِبْرَاهِيمَ اس سے پہلے خبر پوشیدہ ہے یعنی مِنْهَا ان نشانیوں میں سے بعض سے مراد مقام ابراہیم ہے یعنی وہ پتھر جس پر ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر کے وقت کھڑے ہوتے تھے اور اس میں ان کے قدموں کے نشان بن گئے تھے اور کافی زمانے تک وہ نشان باقی رہ گئے تھے اور یہ چھٹی فضیلت ہے اسی وجہ سے اس کی تخصیص کی ہے کہ یہ بہت ساری نشانیوں پر مشتمل ہے جیسا کہ سخت پتھر میں قدم کی نشانیاں اور اس میں ٹخنے ایڑھیوں تک اس کے قدموں کا گھس جانا اور دشمنوں سے اس کو محفوظ رکھنا اور امام ابن عطیہ نے کہا ہے کہ یہ نشانی بڑی نشانیوں میں سے اس وجہ سے ہے کہ یہ کافروں پر حجت ہے اس لئے کہ ان کو یہ نظر آرہی تھا اور اس کی وجہ سے لوگوں کو دین ابراہیمی یاد آتا ہے اور اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ مقام ابراہیم پورا بیت اللہ اور ارد گرد کی جگہیں ہیں اس لئے کہ اس نے دعاء اور نماز پڑھتے اور حج کے باقی طریقوں میں صفا اور مروہ مزدلفہ اور منیٰ اور عرفات میں وقوف کیا ہے۔ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا اس میں ساتویں فضیلت ذکر ہے ضمیر مقام ابراہیم کی طرف راجع ہے حرم مکہ کے معنی میں ہے یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے یا اَلَّذِي بِبَكَّةَ یا اَلْبَيْتَ کی طرف راجع ہے اور لفظ مَنْ اگرچہ ذوی العقول کیلئے ہے لیکن اس میں وحشی پرندے، درندے بلکہ حرم کے تمام پودے اور درخت بھی داخل ہیں کہ ان سے کسی قسم کا تعرض نہیں ہوگا یعنی ان کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکے گا۔ آمِنًا

سے مراد ذا اٰمِنٍ (امن والا) اور امن میں مفسرین کے تین اقوال ہیں پہلا قول یہ ہے کہ اس سے مراد دنیاوی امن ہے یعنی قصاص اور باقی سزاؤں سے بھی بچ جائینگے حسن بصریؒ سے روایت منقول ہے کہ جاہلیت کے دور میں ایک شخص قتل کر لیتا پھر حرم میں داخل ہو جاتا تو مقتول کا بیٹا بھی یہ نہیں چاہتا کہ اس سے بدلہ لے اور اسی طرح کی روایات ابن عمر، ابن عباس اور عمر رضی اللہ عنہم سے آلوسی وغیرہ نے نقل کی ہیں اور اس بات پر اجماع ہے کہ جو حرم میں قتل کر لے تو اس سے حرم میں قصاص لیا جائیگا اسی طرح دیگر قصاص بھی حرم میں لیئے جا سکتے ہیں۔ ہاں اس بات میں اختلاف ہے کہ حرم سے باہر جس پر قصاص واجب ہو جائے اور پھر حرم میں پناہ حاصل کرے تو امام شافعی رحمہ اللہ کے قول کی بناء پر ان سے حرم میں قصاص لینا جائز ہے اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے قول کے مطابق اس سے حرم میں قصاص نہیں لیا جا سکتا ہے بلکہ کھانا پینا اور اس کے ساتھ تجارت، خرید و فروخت اور باتیں بند کر دی جائیں گی تا کہ یہ حرم سے نکلنے پر مجبور ہو جائے اور دلائل کی تفصیلات باقی کتابوں میں ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ اخروی امن ہے یعنی جو حرم میں داخل ہو جائے (حج عمرے اور صحیح عقیدے کے ارادے سے) تو جہنم کی آگ سے امن میں ہوگا۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے دنیاوی اخروی دونوں امن مراد ہیں اور اس قسم کی آیتیں سورۃ بقرۃ 125-126، سورۃ قصص 57، سورۃ ابراہیم 35 اور سورۃ قریش 4 میں ہیں۔ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا اس میں بیت اللہ کی آٹھویں فضیلت کا ذکر ہے اور اس جملے میں حج کی فرضیت کیلئے بہت تاکیدات ہیں پہلا لفظ لِلّٰهِ ہے یہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے اس میں شرک جلی اور خفی نہیں ہوتا ہے ریا کاری شہرت تجارت اور میلے بنانا مقصد نہیں ہوگا اور قرطبی نے کہا ہے کہ لام بطور ایجاب اور الزام ہے دوسرا لفظ عَلَى ہے جو غلبہ اور مضبوطی پر دلالت کرتا ہے وجوب کی اور تاکید پر دلالت کرتا ہے تیسرا لفظ النَّاسِ ہے یہ لفظ عموم کیلئے ہے اگرچہ اس سے مراد خاص لوگ ہیں، چوتھا لفظ مَنِ اسْتَطَاعَ ہے یہ النَّاسِ کا بدل ہے تو تکرار تاکید پر دلالت کرتا ہے اور ساتھ میں اجمال کے بعد تفصیل ہے۔ پانچواں وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِينَ اس میں اشارہ ہے کہ حج چھوڑنا کافروں کیساتھ مشابہت ہے اور انکار کرنا تو عین کفر ہے۔ چھٹا غَنِيٌّ میں اشارہ ہے کہ ایسا انسان اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت سے محروم ہے اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ حِجُّ الْبَيْتِ حا کے زیر اور زبر کیساتھ دو لغتیں ہیں اور زیر کیساتھ سیبویہ کے نزدیک مصدر ہے جیسا کہ زبر کیساتھ بھی مصدر ہے اور اس میں مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہے جو الْبَيْتِ ہے مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا یہ دلیل ہے کہ استطاعت حج کے وجوب کیلئے شرط ہے چاہے فوری طور پر ہو یا بعد میں ہو

اس شرط کیساتھ کہ اس سے فوت نہ ہو جائے اور استطاعت کیلئے اسلام اور بلوغ اور آزاد ہونا شرط ہے اور سَبِیۡل سے مراد راستے کا زادراہ اور سواری ہے اور یہ قول امام قرطبی نے عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم اور باقی تابعین اور امام شافعی اور امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ سے نقل کیا ہے اور ابن کثیر نے عکرمہ سے نقل کیا ہے اور سبیل بدن کی صحت کو کہا جاتا ہے اور امام قرطبی نے ائمہ کے اقوال تفصیلاً ذکر کئے ہیں وہ ملاحظہ کیے جائیں ۔وَمَنۡ كَفَرَ امام ابن کثیر نے ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد سے نقل کیا ہے کہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو فرضیت حج کے منکر ہیں اور حسن بصری نے اس کو ظاہر پر محمول کیا ہے فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الۡعٰلَمِیۡنَ جب بیت اللہ کے بارے میں هُدًى لِّلۡعٰلَمِیۡنَ کہا گیا تو اس کے چھوڑنے کے ساتھ اس وجہ سے پورے عالم کا ذکر کیا اور اس میں باریک اشارہ ہے کہ بیت اللہ کے آباد رہنے کے ساتھ ساری دنیا کا آباد رہنا منسلک ہے کہ جب تک کعبہ موجود ہے اور اس کا احترام جاری ہو تو یہ دنیا آباد ہوگی جیسا کہ اس پر بعض روایات دلالت کرتی ہیں تو جب کعبہ کو خراب کر لیا جائے تو اللہ تعالیٰ خود عالم کو فنا کرنے کے ذریعے سے غنا ظاہر کرے گا۔

قُلۡ یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَكۡفُرُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِیۡدٌ عَلٰی مَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۸﴾ "آپ کہہ دیجئے اے اہل کتاب کیوں تم اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر کفر کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ گواہ ہے اس پر جو تم عمل کرتے ہو" [98]۔

تفسیر 98: اس آیت میں اہل کتاب کیلئے وعید اور پہلی آیت کیساتھ مناسبت یہ ہے کہ اس میں کہا گیا ہے کہ اور فِیۡهِ اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ اور اہل کتاب نے ان آیتوں کا انکار کیا ہے اور بیت اللہ کا حج نہیں مانتے ہیں تو اب انکو وعید دینا مقصود ہے۔ اسی طرح پہلی آیتوں میں شبہات کے جوابات سے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی ثابت ہوئی لیکن یہود و نصاریٰ پھر بھی اس سے انکار کرتے ہیں تو ان کے لئے وعید ذکر کی ۔لِمَ تَكۡفُرُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ آیات اللہ سے مراد کعبہ کی اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ ہیں یہ لوگ اسکا علم رکھتے تھے یا آیتوں سے مراد توراۃ اور انجیل ہے جو آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی پر دلالت کرتی ہیں اور یہ لوگ اس کا علم رکھتے ہیں یا آیت اللہ سے مراد قرآن کریم ہے کہ اس میں حج کی فرضیت کا ذکر ہے اور یہ قول ابو حیان نے ذکر کیا ہے اور بعد والی توجیہ کیساتھ تکرار کا وہم ختم ہوا کیونکہ آیت 70 میں بھی اسی طرح وعید ذکر ہے لیکن وہاں پر تورات اور انجیل کی آیتیں مراد تھیں کہ یہ لوگ اس کے علم کے باوجود اس پر کفر کرتے تو ان سے یہ بات کہی گئی تھی وَاَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ اور یہاں پر مراد قرآن کریم ہے اور اس پر ان کا تفصیلی علم نہیں تھا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاللّٰهُ شَهِیۡدٌ عَلٰی مَا تَعۡمَلُوۡنَ اس جملے میں سخت وعید اور تنبیہ ہے ۔آلوسی نے کہا ہے کہ شہید عالم اور اطلاع رکھنے کے معنی میں ہے اسی طرح

ابوحیان نے بھی کہا ہے کہ جب شہید اللہ کی صفت میں ہو تو اس سے مراد عالم ہے اور یہ مبالغہ کا صیغہ ہے۔

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۝ "آپ کہہ دیجئے اے اہل کتاب کیوں تم روکتے ہو اللہ کے راستے سے اس شخص کو جو ایمان لائے تم تلاش کرتے ہو اس راستے کیلئے ٹیڑھا پن اور ہو تم گواہ اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ بے خبر ان کاموں سے جو تم کرتے ہو" [99]۔

تفسیر 99: جب پہلی آیت میں ان کے کفر اور گمراہی پر وعید تھی تو اب باقی لوگوں کو گمراہ کرنے پر وعید ہے اس کو ضال مُضِلْ کہا جاتا ہے۔ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ. صَدَّ لازمی اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے لیکن یہاں پر تعدی ہے اس لیے کہ (مَنْ اٰمَنَ) مفعول ذکر کیا ہے اور سبیل اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کا دین اور شرع ہے اور اس میں قرآن، سنت، ایمان اور توحید داخل ہیں امام راغب نے مفردات میں کہا ہے کہ جس آیت کے شروع میں قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ ہو تو اس میں پہلے وعید مراد ہوتی ہے پھر دلالت کرتا ہے اور جس آیت میں بغیر قل کے یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ ذکر ہو تو اس میں دعوت مراد ہوتی ہے اگرچہ وعید پر بھی دلالت کرتا ہے مَنْ اٰمَنَ . تَصُدُّوْنَ کیلئے مفعول ہے چاہے اہل کتاب میں سے ہو یا غیر ہو۔ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا هَا کی ضمیر سبیل اللہ کی طرف راجع ہے اور قرطبی نے فرمایا کہ اس میں لام پوشیدہ ہے یعنی لَهَا (تلاش کرتے ہو طلب کرتے ہو اور کوشش کرتے ہو تم اس راستے میں کجی تلاش کرنے کی) عِوَجًا عین کے زیر کیساتھ ہے یہ معنوی ٹیڑھے پن پر دلالت کرتا ہے یعنی دین میں اور قول عمل اور اخلاقیات میں جو کہ فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے اور عین کے زبر کیساتھ جو محسوسات کیلئے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ دیوار اور ٹیڑھا درخت اور اس کی تفسیر میں تین اقوال ہیں۔ پہلا قول لوگوں کے دلوں میں سبیل اللہ کے بارے میں شکوک وشبہات ڈالتے ہیں تا کہ یہ لوگ مرتد ہو جائیں۔
دوسرا قول یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو اعتراض کی وجہ سے اور لوگوں کو اس راستے سے پھیرنے کی وجہ سے تھکا دیتے ہو۔ (تفسیر ابوحیان کشاف) تیسرا قول یہ ہے کہ تَبْغُوْنَ بغی سے ہے دشمنی اور ظلم کے معنی میں ہے یعنی تم اس راستے پر ظلم کرتے ہو اس اعتبار سے کہ تم اس سے ٹیڑھے چل رہے ہو (مفسر صاحب اللباب اور ابوحیان) اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ تم اس ٹیڑھے راستے کو تلاش کرتے ہو یعنی تم سبیل اللہ کو غلط صورت میں پیش کرتے ہو (یا تم ٹیڑھے راستے پر چلتے ہو) اور دعویٰ کرتے ہو کہ ہم سیدھے راستے پر ہیں (صاحب اللباب)۔ وَّ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ اس میں چار اقوال ہیں پہلا یہ کہ تم اس بات کا علم رکھتے ہو کہ تورات میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا دین اسلام ہے۔ دوسرا قول تم اس بات کا علم رکھتے ہو کہ صَدٌّ عَنْ

سَبِيْلِ اللهِ حرام اور کفر ہے۔ تیسرا قول تم نے آخری نبی ﷺ کے معجزات کا مشاہدہ کیا ہے (دیکھے ہیں)۔ چوتھا قول تم اپنی امت میں شہادت دینے والے ہو یعنی تم پر اعتماد ہوسکتا ہے تو کیوں (صَدَّ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ) کے گناہ کا ارتکاب کرتے ہو۔ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ گزشتہ آیت میں ان کا کفر صریح ذکر تھا تو اس کے ساتھ صفت شہید مناسب تھی اور اس آیت میں ان کے پوشیدہ شبہات کی طرف اشارہ ہے تو اس کے ساتھ تختی میں یہ جملہ مناسب ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ۝ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ۭ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ "اے ایمان والو اگر تم تابعداری کرو ایک جماعت کی ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی ہے وہ تمہیں تمہارے ایمان کے بعد کافر بنا دینگے [100]۔ اور تم کیسے کفر کروگے اور حال یہ ہے کہ تم پر اللہ کی آیتیں تلاوت کی جاتی ہے اور تم میں اسکا رسول بھی ہے اور جس نے مضبوطی سے تھاما اللہ تعالی کے دین کو تو ان کو یقینا اللہ تعالی کے راستے کی طرف ہدایت دی جائیگی [101]"۔

تفسیر 100 جب اس آیت تک اہل کتاب کی خباثتوں کا ذکر ہوگیا اور خاص کر اس بات کا کہ یہ لوگ حق کے راستے سے منع کرتے ہیں تو اب مومنوں کو ان خباثتوں سے بچنے کیلئے آداب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ پہلا ادب یہ ہے کہ ان کی اطاعت سے اپنے آپ کو بچاؤ تاکہ تمہیں مرتد نہ بنائیں اور کفر کے کام تم میں پیدا نہ ہوجائیں۔ اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ران شک کا لفظ ہے یہ دلالت کرتا ہے کہ ایمان والے تو یہ کام نہیں کرتے ہیں لیکن ان کو تنبیہ دینا مقصود ہے فریقًا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ يَرُدُّوْكُمْ یہاں پر رد صَيّرَ کے معنی میں ہے تو دو مفعول چاہتا ہے تو كٰفِرِيْنَ دوسرا مفعول ہے یا كٰفِرِيْنَ حال اور قید ہے۔ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ بہت زیادہ قباحت کیلئے ہے۔

تفسیر 101 پہلی آیت میں اہل کتاب کی اطاعت سے ڈرایا گیا ہے جو کہ کفر کا سبب ہے اب اصحاب کرام اور ان کے پیروکاروں کو ان سے دور رہنے کی تلقین کی جاتی ہے اور ان اسباب کا ذکر ہے جو ان سے دور رہنے کا سبب ہے جو کہ تلاوت درس قرآن کریم رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی اور ایمان والوں میں اس کی سنت کا وجود ہے اور یہ دلیل ہے کہ صحابہ

کرام کو مرتد ہونے سے بچایا گیا ہے۔ کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ یہ استفہام تعجید کیلئے ہے وَاَنْتُمْ تُتْلٰی عَلَیْکُمْ اٰیٰتُ اللّٰهِ مجہول کا صیغہ عموم پر دلالت کرتا ہے اور اس سے مراد قرآن کریم کی دعوت درس و تدریس ہے کیونکہ آیت اللہ سے مراد قرآن کریم ہے۔ امام آلوسی نے فرمایا کہ یہ مجہول کا صیغہ دونوں (کتاب اور سنت) کے استقلال پر دلالت کرتا ہے اور اشارہ ہے کہ جو بھی قرآن کی دعوت دیتے ہیں تو یہ ہدایت کیلئے کافی ہے۔ وَفِیْکُمْ رَسُوْلُهٗ نبی ﷺ کی حیات کے وقت اس کی ذات کا وجود مراد تھا اور اس کی وفات کے بعد اس کی سنت مراد ہے اس وجہ سے رسول کا لفظ ذکر کیا ہے جو اس کی رسالت کے وصف پر دلالت کرتا ہے اگر ذات کی تخصیص مراد ہوتی تو اس طرح فرما دیتا۔ وَفِیْکُمْ مُحَمَّدٌ (ﷺ) تو یہ ان گمراہوں کیلئے دلیل نہیں بن سکتی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد (ہر جگہ) حاضر ناظر سمجھتے ہیں اور امام قرطبی نے فرمایا ہے کہ آیت میں وہ لوگ داخل ہیں جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا ہے کیونکہ اس کی سنت اس کے دیکھنے کے قائم مقام ہے اور اسی طرح زجاج سے بھی منقول ہے اور ابن عطیہ نے کہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور آثار امت میں اس کے حاضر ہونے کے قائم مقام ہیں اور اسی طرح آلوسی نے بھی کہا ہے۔ وَمَنْ یَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ عَصَمْ لغت میں منع کرنے اور بچانے کو کہا جاتا ہے جیسا کہ عرب کہتے ہیں عَصَمَ الطَّعَامَ (منع کیا کھانے کو) اور عصام اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے مشکیزہ کو باندھا جاتا ہے وَمَنْ یَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ میں دو قول ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ اس میں مضاف پوشیدہ ہے یعنی بِدِیْنِ اللّٰهِ جو کہ قرآن اور سنت ہے اور اعتصام تَمَسُّك کے معنی میں ہے یعنی دلیل پکڑنا اتباع اور عمل کرنا اور یہ جملہ وَاَنْتُمْ تُتْلٰی عَلَیْکُمْ پر عطف ہے اور حال کے مقام میں ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ اعتصام سے مراد اہل کتاب کے درمیان شرور و شبہات ڈالنے کے وقت پناہ حاصل کرنا ہے تاکہ اس کو دفع کیا جائے اس توجیہ کیساتھ یہ اِنْ تُطِیْعُوْا کے مضمون کیلئے نتیجہ ہے فَقَدْ هُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو تھامنے میں یقینی طور پر ہدایت کا سبب ہے یہ پہلے قول پر بناء ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف التجاء کرنا لوگوں کے فساد کو دور کرنے کیلئے یہ عین ہدایت ہے اور یہ دوسرے قول پر بناء ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ "اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرو

جاؤ جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور نہ تم مرنا مگر اس حال میں کہ تم فرمانبردار ہو" [102]۔

تفسیر 102: اس آیت سے سورۃ کا تیسرا حصہ شروع ہے اس میں چار اصول ایمان کی مضبوطی کیلئے اور ایمان والوں کی جماعت کو تفرق سے محفوظ کرنے کیلئے ذکر کیئے ہیں اور اس کو آداب بھی کہا جاتا ہے۔ پہلی اصل اور ادب کامل ایمان اور اسلام پر موت تک مضبوطی سے رہنا ہے اور اس کو نفوس کی اصلاح بھی کہا جاتا ہے اور یہ 102 میں ذکر ہے۔ دوسری اصل اور ادب اعتصام بالکتاب والسنۃ کے ذریعے سے اتحاد قائم رکھنا ہے اور اس کو جماعت کے افراد کی اصلاح کہا جاتا ہے یہ 103 میں ہے تیسری اصل اور ادب اسلام کی نشر و اشاعت کیلئے کتاب اور سنت کی طرف دعوت دینا اور اس کو اصلاح اجانب کہا جاتا ہے اور اس کے بعد دعوت کے فائدے ذکر کر رہا ہے جیسا کہ فلاح 104 میں اور چہروں کی سفیدی 107 میں اور خیریت (بہتر ہونا) 110 میں ہے اور پھر گمراہ اہل کتاب کی صفات اور صالحین کی صفات کے درمیان تقابل ہے جو دعوت دینے والے ہیں اور ہر ایک کی دس دس صفات ذکر کر رہا ہے پھر گمراہ لوگوں کیلئے خوف اور وعید ہے 116 اور 117 میں۔ چوتھی اصل اور ادب منافقوں کی دوستی اور راز دار بننے سے پرہیز کرنا ہے اور اس کی دس علتیں اور اسباب ذکر کیے ہیں 118 سے 120 تک پھر ان اصول کی تشریح ہے جو کہ بدر اور احد کے واقعہ کو ذکر کرنے کے طور پر ہے اور آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شرک فی التصرف کا رد ہے اور 129 میں توحید کا ذکر ہے۔ پچھلی آیت کیساتھ ربط یہ ہے جب ایمان والوں کیلئے خوف ذکر ہوا کہ اہل کتاب کے وسوسوں سے گمراہ نہ ہو جائیں تو اب ان کی مضبوطی کے لئے آداب ذکر کر رہا ہے اس آیت میں کامل تقوی، ایمان اور اسلام پر موت تک ہمیشہ رہنے کے آداب ہیں۔ حَقَّ تُقٰتِهٖ اس میں موصوف کی طرف اضافت ہے یعنی اَلْاِتِّقَاءِ الْحَقِّ اور حق کی اضافت مصدر کی طرف کرنا یہ کمال پر دلالت کرتا ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ حق کے بارے میں کسی کی ملامت کا خوف نہیں کرتے ہیں اور انصاف پر قائم رہتے ہیں اور اپنی زبان کنٹرول میں رکھتے ہیں اور ہر قسم کے گناہ سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ اس کی تفسیر ہے اور اس معنی پر یہ منسوخ نہیں ہے اور یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہما اور طاؤس سے منقول ہے اور اس معنی میں توحید کی تمام اقسام پر عقیدہ رکھنا بھی داخل ہے (سراج المنیر)۔ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ اس طرح سورۃ بقرہ 132 میں گزر چکا ہے یعنی عقیدہ اور عمل میں اسلام پر ہر وقت پابند رہنا یہاں تک کہ تم پر ایمان اور اسلام کی حالت میں موت آجائے۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۗءً فَاَلَّفَ بَيْنَ

قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ "اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامو اور تم گروہ گروہ نہ بننا اور یاد کرو اللہ کی نعمتوں کو جو تم پر کی ہیں جب تم
دشمن تھے تو محبت تمہارے دلوں میں ڈال دی پس تم اس کی نعمت کی وجہ سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے گڑھے کے
کنارے پر تھے پس اللہ نے تمہیں بچالیا اس طرح تمہارے لئے اللہ اپنی آیتوں کو بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پالو" [103]

تفسیر 103: اس آیت میں دوسرا اصل اور ادب ذکر ہے اور پہلے کے ساتھ مناسبت یہ ہے کہ کامل تقوی اور اس پر ہیشگی اسلام کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے جس کا سبب اعتصام بحبل اللہ ہے اور تفرق سے منع کرنا ہے اور اس کے دو فائدے ذکر کر رہا ہے پہلا فائدہ دنیاوی ہے جو کہ آپس میں محبت الفت پیدا کرتا ہے اور دشمنی کا ختم ہونا ہے۔ دوسرا فائدہ اخروی ہے جو کہ آگ کے عذاب سے بچنا ہے وَاعْتَصِمُوْا یہ اِتَّقُوا اللّٰهَ پر عطف ہے تو ایمان والوں کو خطاب ہے اور عصمت کا معنی پہلے ذکر ہوا ہے۔ بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا حبل اللہ کے مصداق میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں عہد، قرآن، دین، اطاعت، توبہ، مومنوں کی جماعت، توحید اور اسلام پر اخلاص سے عمل یہ اقوال ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں اور ابوسعید خدری عبداللہ بن مسعود اور زید بن ارقم رضی اللہ عنہم کی روایت میں مذکور ہے کہ حبل اللہ سے مراد قرآن ہے (ابوحیان، صاحب اللباب) اور زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی روایت امام مسلم نے نقل کی ہے (صحیح مسلم 123/7، هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ. حَبْلٌ مَّمْدُوْدٌ مِّنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ، احمد 4473/14/3، جامع الصغیر 12، ابن حبان حدیث 1545، سلسلۃ الصحیحۃ 500/660، حبل اللہ نور المبین ابن حبان 1545، اسنادہ صحیح علی شرط مسلم، وکذا احمد 327/2، حبل ممدود من السماء الی الارض، احمد 14/3، زید بن ارقم، تارک فیکم ثقلین، وھو حبل اللہ، صحیح مسلم 123/7 وان تعتصموا بحبل اللہ جامع الصغیر صحیح حدیث 12، 4473 حبل ممدود)۔ حبل اصل میں اس سبب کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعے سے مقصد تک رسائی ہوتی ہے اور عام عرف میں رسی کو کہا جاتا ہے اور یہاں پر بطور تشبیہ یا بطور استعارہ استعمال ہوا ہے یعنی جیسے رسی کے ذریعے سے انسان نیچے جگہ اور کنویں سے اوپر چڑھتا ہے اور زمین سے بلند جگہ کی طرف بھی اس کے ذریعے سے چڑھا جا سکتا ہے مختلف لکڑیاں ایندھن اور سامان وغیرہ کو گٹھے میں باندھا جاتا ہے تو اسی طرح قرآن کے اعتصام کی وجہ سے بھی انسان ذلت اور جہالت سے باہر نکلتا ہے اور بلند درجوں کو پہنچ سکتا ہے اور متفرق اور مختلف لوگ اس کے ذریعے سے متفق اور متحد بن جاتے ہیں۔ جَمِيْعًا یہ فاعل کا حال ہے وَاعْتَصِمُوْا سے مجتمعین کے معنی میں ہے اور یہ لفظ حبل اللہ کے بعد ذکر کیا ہے اس میں اشارہ

ہے کہ اعتصام بحبل اللہ کے ذریعے سے اتفاق اور اتحاد حاصل ہوتا ہے۔ وَلَا تَفَرَّقُوْا اس میں دین حق میں اختلاف کرنے سے منع ہے اور ہر اس بدعت سے جو تفرق کا سبب بنتا ہے یعنی قرآن اور سنت کے چھوڑنے سے جو اختلاف اور فرقہ بندی پیدا ہوتی ہے تو وہ تفرق مراد ہے جبکہ وہ منع ہے اسی وجہ سے یہ فروع اور مجتہدین کے اختلاف کو شامل نہیں ہے اور اس کے ساتھ اجتہاد کی نفی نہیں ہوسکتی ہے۔ جیسا کہ امام قرطبی نے فرمایا ہے اور اس طرح کا اجتہادی اختلاف صحابہ کرام میں بھی موجود تھا لیکن یہ اختلاف فساد کا سبب نہیں ہے اور نہ ہی اس کو فساد کا سبب بنانا چاہئے لیکن جو حدیث یہاں پر امام قرطبی نے لکھی ہے اور لوگوں کی زبان پر ہے کہ (اِخْتِلَافُ اُمَّتِیْ رَحْمَۃٌ) تو یہ سند کے اعتبار سے ثابت نہیں ہے۔ امام مناوی نے فیض القدیر ج 1، ص 212 میں کہا ہے کہ امام سبکی نے کہا ہے کہ یہ محدثین کے نزدیک معروف نہیں ہے اور مجھے اس کی کسی سند کے بارے میں بھی خبر نہیں ہے نہ صحیح نہ ضعیف نہ موضوع اور امام سیوطی نے جامع صغیر میں بغیر سند کے ذکر کی ہے اور عراقی نے کہا ہے کہ امام بیہقی نے یہ حدیث مدخل میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سند سے نقل کی ہے لیکن اس کی سند بھی ضعیف ہے۔ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اس میں عمل کرنے کی طرف ترغیب ہے جو کہ تقویٰ اور اعتصام بحبل اللہ کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے اور یہ دنیاوی اور اخروی نعمت ہے۔ دنیاوی نعمت یہ ہے کہ اوس اور خزرج (جو انصار کے دو قبیلے تھے) کی دشمنی کو ختم کیا ہے جو ان کے درمیان ایک مقتول کی وجہ سے 120 سال تک دشمنی اور اختلاف تھا لیکن اسلام قبول کرنے کی وجہ سے وہ دشمنی ختم ہوگئی اور اس کی باقی تفصیل صاحب اللباب نے ذکر کی ہے۔ نِعْمَةَ سے مراد اسلام یا قرآن ہے یا دشمنی کے بعد الفت پیدا کرنا ہے جیسا کہ بعد میں ذکر ہے۔ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا اور اسی طرح سورۃ انفال 63 میں بھی ہے اَصْبَحْتُمْ صباح ہونے کو کہتے ہیں اور صِرْتُمْ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس لفظ میں اشارہ ہے کہ دشمنی کی مثال اندھیری رات کی طرح ہے اور پیار محبت صبح کی روشنی کی طرح ہے۔ اِخْوَانًا اور اُخْوَةٌ دونوں اَخٌ کیلئے جمع ہے بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ اخوان دینی بھائیوں کیلئے استعمال ہوتا ہے اور اخوت نسبی بھائیوں کیلئے ہے لیکن یہ اکثری قاعدہ ہے ہمیشہ کیلئے نہیں ہے اور اس اخوت کے بہت سارے قصے انصار میں مشہور ہیں اس میں سے ایک روایت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی ہے کہ بکری کا ایک سر (بھنا ہوا تھا) وہ انصار کے سات گھروں میں بھیجا گیا تھا ایک گھر سے دوسرے گھر کو اس کی وجہ سے ایثار اور احتیاج دیتے یہاں تک کہ پہلے گھر والوں تک واپس پہنچ گیا۔ یہ روایت امام قرطبی نے بلا سند نقل کیا ہے بِنِعْمَتِهٖٓ اس لفظ کو دو مرتبہ ذکر کیا اس لئے کہ پہلی

نعمت سے مراد دشمنی دور کرنا ہے اور دوسرے سے الفت اور اخوت پیدا کرنا مراد ہے یا پہلے سے اسلام مراد ہے اور دوسرے سے مراد قرآن ہے۔ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا اس میں اخروی نعمت کا ذکر کر رہا ہے کہ اسلام اور قرآن کی وجہ سے جہنم کی آگ سے بچ جائینگے۔ شَفَا طرف اور کنارے کو کہا جاتا ہے مِنْهَا ضمیر حُفْرَةٌ یا نار کی طرف راجع ہے یا شفا کی طرف راجع ہے۔ مضاف الیہ مونث کے اعتبار سے اور اس عبارت میں تشبیہ مراد ہے یعنی کفر اور شرک کی وجہ سے تم اس طرح تھے جیسا کہ انسان آگ کے گڑھے کے کنارے کے پاس کھڑا ہوتا ہے قریب ہے کہ اس میں گر جائے لیکن اس کا کوئی دوست آجاتا ہے اور اس طرف سے اس کو بچا لے جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی وجہ سے تمہیں جہنم کی آگ سے بچائے رکھا۔ انقاذ اس کو کہا جاتا ہے کہ کوئی چیز کسی کے ہاتھ سے اور قبضے سے چھڑائی ہو تو اس آیت میں بچانے میں بہت تاکید اور مبالغہ ہے كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ آیات سے مراد قرآن ہے اور اس سورۃ کی گزشتہ آیتیں ہیں اور اشارہ ہے کہ اس قرآن کا بیان ایسی ترتیب سے ذکر ہوا جو کہ ہدایت پانے کا سبب ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

"اور تم میں سے ایک جماعت ہونی چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دے اور نیکی کا حکم کرے اور برائی سے منع کرے اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں" [104]۔

تفسیر 104: یہ ماقبل آیت پر عطف ہے اور مومنوں کو خطاب ہے اور تیسری اصل اور ادب کا ذکر ہے باقی لوگوں مشرکین، کافر، منافقین اور فاسقین کی اصلاح کیلئے ہے۔ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ اس مِنْ میں دو اقوال ہیں پہلا قول یہ ہے کہ یہ تبعیض یعنی بعض کیلئے ہے یعنی تم میں سے بعض اور یہ قول ضحاک اور طبری کا ہے اور امام قرطبی نے اس کو پسند کیا ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ دعوت الی الخیر وہ لوگ کر سکتے ہیں جو خیر اور معروف اور منکر کا علم رکھتے ہیں اور اسی طرح اس کے طریقے کو بھی جانتے ہوں اور سختی اور نرمی کی جگہوں میں فرق بھی کر سکتے ہوں تو اس سے مراد علماء ہیں (ابوحیان) اور اس قول پر سورۃ یونس کی آیت 108 دلالت کرتی ہے اس میں لفظ بصیرت علم کے معنی میں ہے اس قول کی بناء پر دعوت فرض کفایہ ہے اور ہر زمانے اور علاقے میں اس کے مصداق اہل علم ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مِنْ بیان کیلئے ہے اور یہ قول زجاج کا ہے یعنی دعوت ہر مکلف پر فرض ہے ہاتھ سے زبان یا دل سے لہٰذا یہ امر عام ہے لیکن بعض لوگوں کے فعل سے ساقط ہوتا ہے کہ ہر مسلمان اور مومن پر دعوت فرض ہے اور جس نے ایک مسئلے کا علم حاصل کیا ہے تو اس پر اس کی دعوت فرض ہے اور جس نے

زیادہ علم حاصل کیا تو اس پر اس کی دعوت فرض ہے لیکن اگر کسی علاقے میں زیادہ علماء ہوں تو اس پر فرض کفایہ ہے اور جس علاقے میں ایک ہی حق پرست عالم ہو تو اس پر دعوت دینا فرض ہے۔ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ امام ابن کثیر نے ابن مردویہ کی روایت ابو جعفر باقر سے مرفوع نقل کی ہے کہ خیر سے مراد قرآن اور سنت کی اتباع ہے اور اسلام اور اللہ کی اطاعت پر عمل اور جہاد بھی اس میں داخل ہے اور یہ اقوال امام ابو حیان نے ذکر کیے ہیں۔ وَ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ زمخشری نے کہا ہے یہ خاص کی عطف عام پر ہے اسلئے کہ خیر عام ہے منکر کے ترک اور ہر خیر کو شامل ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ یہ عطف تفسیر ہے اسلئے کہ خیر کا لفظ معروف اور منکر کے بغیر دوسرا مصداق نہیں رکھتا ہے تو یہ تفصیل تاکید کیلئے بعد اجمال ہے معروف شریعت میں ہر اس قول اور فعل کو کہا جاتا ہے جس کا شرع میں حسن (ثواب) ثابت ہو تو توحید فرائض اعمال مندوب سب کو شامل ہے اور منکر ہر اس قول اور فعل کو کہا جاتا ہے جس کی شرع میں (برائی) ثابت ہو اسی طرح معروف وہ چیز ہے جو کتاب اور سنت کیساتھ موافق ہے اور منکر ہر وہ چیز ہے جو کتاب اور سنت کے خلاف ہو تو معروف میں پہلے توحید اور ایمان داخل ہے اور منکر میں پہلے کفر اور شرک داخل ہے امام ابن الجوزی نے زاد المسیر میں ابو العالیہ سے جو روایت نقل کی ہے کہ معروف توحید ہے اور منکر شرک ہے یہ تخصیص کے طور پر نہیں ہے بلکہ دونوں میں پہلے مصداق کا ذکر ہے۔

فائدہ: قرآن کریم میں اکثر مقام پر امر بالمعروف کیساتھ نہی عن المنکر کو ایک ساتھ ذکر کیا ہے جیسا کہ اس سورۃ 110,114 سورۃ اعراف 157 سورۃ توبہ 67,71,112 سورۃ حج 41 اور سورۃ لقمان 21 میں تو معلوم ہوا کہ ایک قسم پر اکتفاء کرنا یعنی صرف امر بالمعروف کرنا یا صرف نہی عن المنکر کرنا یہ دعوت کا ناقص عمل ہے اور اس میں زیادہ اہم نہی عن المنکر ہے اسلئے کہ اس کے چھوڑنے پر اللہ تعالیٰ نے سخت وعید ذکر کی ہے جیسا کہ سورۃ مائدہ 63 اور 79 میں ہے۔

وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ فلاح سے مراد یہ ہے کہ ان کو ان کے عملوں کا اجر اور جنہوں نے ان کی دعوت کی اتباع کی ہے ان کے اعمال کا بدلہ بھی ملے گا اور اس کو اجر غیر ممنون کہا جاتا ہے اور وہ جنت کیساتھ خاص ہے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝١٠٥

"اور نہ تم ان لوگوں کی طرح ہونا جو گروہ گروہ بن گئے اور انہوں نے اختلاف کیا اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح دلائل آئے اور ان ہی لوگوں کیلئے بہت بڑا عذاب ہے" [105]۔

تفسیر 105: اس آیت میں اشارہ ہے کہ دعوت کے چھوڑنے کی وجہ سے تفرق اور اختلاف پیدا ہوتا ہے اور عذاب عظیم ملتا

ہے تو یہ برا اثر ہے جو ترک دعوت پر مرتب ہوتا ہے اور فلاح کے مقابل ہے اور آیت میں یہود اور نصاریٰ کی تشبیہ سے نہی ہے کہ انہوں نے دعوت کو ترک کیا تو ان میں بہت سارے فرقے پیدا ہوگئے۔ وَلَا تَكُونُوا یہ وَلْتَكُن مِّنكُمْ پر عطف ہے كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا امام ابوحیان نے کہا ہے کہ یہ ماقبل کی تفصیل ہے یعنی وَلْتَكُن مِّنكُمْ یہ وَاعْتَصِمُوا کی تفصیل ہے اور وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ یہ لَا تَفَرَّقُوا کیلئے تفصیل ہے۔ ابن عباس اور حسن رضی اللہ عنہما اور حسن بصری سے منقول ہے کہ اس سے مراد یہود اور نصاریٰ ہیں اسلئے کہ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ پہلے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) اپنے دین میں 72 فرقے بن گئے تھے اور یہ امت 73 فرقوں میں تقسیم ہوگی (صحیح ترمذی حدیث 2640، حاکم 128/1، ابن حبان 6747، صحیح ابن ماجہ 3991) اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد اس امت کے بدعتی اور حروریہ گروہ (خوارج) ہیں لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ لوگ بطور تشبیہ اس آیت میں داخل ہیں یا اخبار بالغیب (پیشگوئی) کے طور پر۔ اس لئے کہ قرآن کے نزول کے وقت یہ لوگ موجود نہیں تھے اور تفرق اور اختلاف کے درمیان فرق تین وجوہات یا اعتبار سے ہے: پہلی وجہ یہ ہے کہ تفرق اصول میں ہوتا ہے اور اختلاف فروع میں ہوتا ہے۔ دوسری وجہ تفرق اصول میں ہوتی ہے۔ اختلاف تحزب، فرقہ بندی اور تعصب کا نام ہے۔ تیسری وجہ تفرق کتاب اور سنت کو چھوڑنا ہے اور اختلاف کتاب اور سنت سے اختلاف کرنا ہے صاحب اللباب نے چوتھا فرق ذکر کیا ہے کہ تفرق والے وہ لوگ ہیں جو نصوص شرعیہ کی باطل تاویلات کرتے ہیں اور اختلاف یہ ہے کہ ہر ایک اپنے مذہب کی نصرت کرتا ہے لیکن پہلی وجہ میں جب فروع کا اختلاف، اصولی اختلاف پر مرتب ہو تو یہ قبیح امر ہے صحابہ کرام اور مجتہدین کے درمیان فروع کا اختلاف تھا وہ اس میں داخل نہیں ہے۔ یہاں پر زیادہ تفصیل قاسمی نے اپنی کتاب اور امام آلوسی نے لکھی ہے۔ مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک وہ آیتیں مراد ہیں جو پہلی ملتوں پر نازل ہوئی ہیں اور تورات انجیل اور قرآن اس میں داخل ہے۔ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ یہ دلیل ہے کہ تفرق اور اختلاف گناہ کبیرہ ہے اور کبھی کبھی کفر تک پہنچ جاتا ہے۔

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿١٠٦﴾ "جس دن سفید ہونگے بعض چہرے اور کالے ہوگئے بعض چہرے۔ پس وہ لوگ جن کے چہرے کالے ہوجائینگے (کہا جائیگا ان سے) کیا تم نے کفر کیا اپنے ایمان کے بعد پس چکھو لو عذاب کو بسبب اس کے کہ تم

نے کفر کیا" [106]۔

تفسیر 106: یہ عذاب عظیم کے ساتھ متعلق ہے اور اس کے لئے مفعول فیہ ہے یا وَاذْکُرْ کا لفظ اس میں پوشیدہ ہے اور اس میں یہ ذکر کر رہا ہے کہ تفرق سے بچنا اور دعوت دینا سفید چہروں کا نتیجہ ہے اور دعوت کو چھوڑنا اور تفرق پیدا کرنا یہ کالے چہروں کا نتیجہ ہے۔ یَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ صحیح بات یہ ہے کہ سفیدی سے کالے ہونے کا معنی ظاہری حقیقی ہے اور اس طرح سورۃ یونس 26، سورۃ زمر 6 ورۃ قیامہ 22 اور سورۃ عبس 38 میں ہے اور یہ قیامت کے دن ہوگا لیکن مفسرین کے اس مقام کے تعین کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ پہلا قول یہ قبروں سے اُٹھنے کے وقت ہوگا دوسرا قول یہ اعمال کو تولنے کے وقت ہوگا۔ تیسرا قول اعمال نامے کے سنانے کے وقت ہوگا۔ چوتھا قول یہ اس وقت ہوگا جب وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ کہا جائے گا۔ پانچواں قول جب کہا جائیگا کہ ہر شخص اپنے معبود کے ساتھ چلا جائے تو یہ اس وقت ہوگا اور چہروں کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ پہلا قول ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم کا ہے جو مرفوع حدیث میں وارد ہے کہ اہل سنت کے چہرے سفید ہوجائینگے اور اہل بدعت کے چہرے کالے ہوجائینگے۔ امام قرطبی نے فرمایا کہ یہ حدیث منکر ہے اور موقوف حدیث ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی ہے۔ موقوف روایت میں ہے جب انہوں نے دمشق کی دیوار پر خوارج باغیوں کے سر لٹکے ہوئے دیکھے تو انہوں نے فرمایا کِلَابُ النَّارِ شَرُّ قَتْلٰى تَحْتَ اَدِيْمِ السَّمَآءِ خَيْرُ قَتْلٰى مَنْ قَتَلُوْهُ (جہنم کے کتے ہیں) یہ لوگ آسمان کے نیچے آگ کے بدترین قتیل (قتل کئے گئے) ہیں وہ بہترین لوگ ہیں جنہوں نے ان کو قتل کیا ہے۔ پھر اس آیت کی تلاوت کی یَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ (امام ترمذی نے فرمایا ہے یہ حدیث حسن ہے، ترمذی حدیث 3000، صحیح ابن ماجہ 176)۔ دوسرا قول عطاء کا ہے کہ مہاجرین انصار کے چہرے سفید ہوجائینگے اور بنوقریظہ اور بنونضیر کے چہرے کالے ہوجائینگے۔ تیسرا قول ابی بن کعب کا ہے کہ اس سے مراد کافر ہیں اس کی دلیل بعد والے جملے ہیں اور یہ قول منافقین مرتدین اور یہود نصاریٰ اور ان بدعتیوں کیلئے جن کی بدعت کفر تک پہنچی ہے ان سب کیلئے ہے اور امام قرطبی نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کو تبدیل کیا یا اللہ تعالیٰ کے دین میں بدعت پیدا کردی وہ چیز جو دین میں نہیں ہے تو اس کو حوض کوثر سے دھتکارا جائیگا اور ان کے چہرے کالے ہونگے اور اس میں داخل ہے جو مسلمانوں کے عقیدے کے مخالف ہوجائے جیسا کہ خوارج، روافض اور معتزلہ اور ظالم لوگ اور کبائر گناہوں کا کھل کر ارتکاب کرنے والے اور خواہش پرست اور بدعتی لوگ ان تمام کے بارے میں خوف ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ اس آیت میں داخل

ہیں اگرچہ آگ میں وہی لوگ ہمیشہ رہیں گے جو کافر اور منکر ہونگے۔ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ اس میں ایک گروہ کیلئے آخرت کا خوف ہے اور یہ تفصیل دونوں فرقوں کیلئے ہے جو بطریقہ لف نشر غیر مرتب ہے ترتیب بدلنے کی وجہ یہ ہے کہ سفید چہروں والے افضل ہیں تو پہلے ان کا ذکر کیا ان کی شرافت کی وجہ سے تو پھر کالے چہرے والوں کو پہلے ذکر کیا مقصد ان کے حال سے ڈرانا ہے اور دوسرا قانون یہ ہے کہ پہلے ضرر سے نجات حاصل کرنا لازم ہے تو پھر فائدے حاصل کرنا۔ فَاَمَّا یہ شرط ہے اور جزا اس کا مخفی ہے یعنی فَيُقَالُ لَهُمْ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ اس خطاب میں اختلاف ہے سبب اس کی یہ ہے کہ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ میں بھی اختلاف ہے اگر اس سے مراد مبتدعین ہیں ایسی بدعت کیساتھ کہ وہ کفر تک پہنچاتی ہو تو خطاب انہی مبتدعین میں سے ہے اور اگر اس سے مراد بنو قریظہ بنو نضیر (یہودی) ہوں تو وہ لوگ نبی ﷺ کی بعثت سے پہلے ایمان رکھتے تھے لیکن جب نبی ﷺ کو بھیجا گیا تو انہوں نے کفر کیا تو خطاب ان یہودیوں سے ہے اور اگر اس سے مراد عام کافر ہوں تو ہر کافر فطرت اسلام پر پیدا کیا گیا ہے بعد میں کفر کو اختیار کیا ہے تو یہ خطاب ان سے بھی صحیح ہے اور اگر اس سے مراد منافقین ہوں تو منافق نے تو زبان پر ایمان کا اظہار کیا ہے اور دل سے کفر کیا ہے تو اس کو بھی یہ خطاب درست ہے اور اگر مرتدین مراد ہو جائیں تو یہ خطاب تو واضح ہے اس طرح کی تفصیل امام ابوحیان نے ذکر کی ہے۔ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ذوق کو بطور استعارہ ذکر کیا ہے اشارہ ہے کہ عذاب کا ذائقہ کڑوا ہے اور یہ لوگ اس کے کڑوا پن کو خوب جان لینگے۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

"اور وہ لوگ کہ جن کے چہرے سفید ہو جائینگے تو یہ لوگ اللہ کی رحمت میں ہونگے وہ اس میں ہمیشہ کیلئے رہیں گے" [107]

تفسیر 107: اس میں دوسرے گروہ کو آخرت کی بشارت ہے فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ فی میں اشارہ ہے کہ ان کے لئے رحمت ہر طرف (جانب) سے ہوگی اسلئے اس کو ظرف قرار دیا ہے اور رحمت کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف کی ہے اس کی رحمت کی عظمت کی طرف اشارہ ہے اور اشارہ ہے کہ جنت میں داخل ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کیساتھ ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رحمت سے مراد جنت ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝

"یہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جنہیں ہم حق کیساتھ تم پر پڑھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ لوگوں پر ظلم کا ارادہ نہیں کرنے والا" [108]۔

تفسیر 108: اس آیت میں سچائی رسول اللہ ﷺ کا ذکر ہے اور سوال کا جواب ہے جو پہلے مضمون سے پیدا ہوتا ہے

یعنی جب یہ کہا گیا کہ لوگوں کے چہرے کالے ہونگے تو ہو سکتا ہے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے کہا ہو اس لئے کہ یہ تو ظلم ہے اور اللہ تعالیٰ تو ظلم نہیں کرتا ہے تو حاصلِ جواب یہ ہے کہ یہ آیتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق کے بیان کیلئے ہیں نبی کریم نے اپنی طرف سے نہیں بنائی ہیں اور مجرموں کو سزا دینا ظلم نہیں بلکہ عدل ہے۔ تِلْكَ اٰيٰتُ اللهِ. تِلْكَ پہلے مکمل مضمون کی طرف اشارہ ہے خصوصاً عذاب عظیم کی طرف اور فرقہ بندی والوں اور قیامت کے ان کافروں کے چہرے کالے کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ تلاوت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا حقیقت ہے باقی صفات الٰہیہ کی طرح بغیر تمثیل اور تشبیہ اور بغیر تحریف اور تاویل کے ہیں۔ بِالْحَقِّ حق سچ کے معنی میں ہے اور امام ابن کثیر نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد دنیا اور آخرت کے احوال کا کشف (ظاہر کرنا) مراد ہے۔ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ اس میں مبالغہ ہے یعنی جب ظلم کا ارادہ نہیں کرتا ہے تو ظلم کرنا تو اس کی شان سے بہت بعید ہے ظلم سے یہاں پر مصدری معنی مراد ہے اور لِّلْعٰلَمِيْنَ اس کے ساتھ متعلق ہے اور نکرہ کو عموم کیلئے نفی کے مقام میں ذکر کیا ہے یعنی کسی بھی شخص پر کسی بھی ظلم کا ارادہ نہیں کرتا ہے اور معتزلہ نے کہا ہے کہ ظُلْمًا اسم مصدر ہے یعنی بندے جو گناہ کرتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے ارادے کے بغیر کرتے ہیں بندے اس کے خود خالق ہیں اور یہ قول باطل ہے اسلئے کہ اس صورت میں مِنَ الْعَالَمِيْنَ کہنا چاہیے تھا۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۱۰۹ "اور خاص اللہ تعالیٰ کیلئے اختیار ہے ان چیزوں کا جو آسمانوں میں ہیں اور ان کا جو زمین میں ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف تمام کاموں کا لوٹ کر جانا ہے" [109]۔ ع

تفسیر 109: اس آیت میں عملت کا ذکر ہے وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا کیلئے یعنی ظلم وہ لوگ کرتے ہیں جو قدرت عام اور وسیع نہیں رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کیلئے تو دنیا اور آخرت میں کشادہ قدرت اور تصرف ہے تو وہ ظلم کرنے سے غنی (بے پروا) ہے اسی طرح اس آیت میں رسول کی سچائی کے بعد توحید کا دعویٰ ہے یعنی تمام بادشاہی اور تصرفات اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں تو وہ حاجت روا اور بندگی کا حقدار ہے اور ان دونوں توجیہات کی طرف امام قرطبی نے اشارہ کیا ہے۔ وَلِلّٰهِ میں لام ملک، عبدیت اور تصرف کیلئے ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ وَلَوْ اٰمَنَ اَھْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّھُمْ ۭ مِنْھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۱۱۰ "تم بہترامت ہو لوگوں کیلئے نکالے گئے ہو نگی

کا حکم دو گے اور برائی سے منع کرو گے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ گے اور اگر ایمان لے آئیں اہل کتاب تو یہ ضرور ان کے لئے بہتر ہوتا بعض ان میں سے مؤمن ہیں اور زیادہ ان میں سے نافرمان ہیں"[110]۔

تفسیر 110: یہ آیت وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ کیساتھ متعلق ہے اور درمیان میں جملے معترضے ہیں اور اس میں دعوت دینے پر بہت ترغیب اور تیزی دینا مقصود ہے اور خیریت کے وصف کیساتھ دعوت کا فائدہ ذکر کر رہا ہے یعنی دعوت اللہ تعالیٰ کے نزدیک خیریت (بہتری) کا سبب ہے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ یہ خطاب پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ہے اور پھر ان کے پیروکاروں کیلئے قیامت تک صفت دعوت کیساتھ شامل ہے كَانَ اور لفظ كُنْتُمْ میں تین اقوال ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ کان فعل ناقص ہے اور خیر امۃ خبر ہے اور یہ كَانَ دوام کی نسبت کیلئے ہے جیسا کہ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا اَوْ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا ۔ دوسرا قول یہ ہے کہ کانَ ناقص ہے اور اپنے معنی (ماضی کے انقطاع) کیساتھ ہے یعنی كُنْتُمْ فِي اللَّوْحِ الْمَحْفُوْظِ اَوْ فِيْ عِلْمِ اللّٰهِ اَوْ فِي الْكُتُبِ السَّابِقَةِ (تم تقدیر کی کتاب یا اللہ تعالیٰ کے علم میں یا پہلی کتابوں میں تھے)۔ تیسرا قول یہ ہے کہ کانَ زائد ہے كُنْتُمْ کے معنی میں ہے اور یہ قول فراء کا ہے اس میں پہلا قول بہتر ہے۔ خَيْرَ اسم تفضیل ہے نکرہ کی طرف مضاف ہے اور وہ جمع کے معنی میں ہے یعنی بہت ساری امتیں۔ اُخْرِجَتْ اخراج سے مراد ظہور اور پھیل جانا ہے اور اخراج کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ یہ امت دعوت کی وجہ سے ظاہر اور مشہور ہے لِلنَّاسِ خیر کیساتھ یا اُخْرِجَتْ کیساتھ متعلق ہے اور لام انتفاع کیلئے ہے۔ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ یہ صفت ہے شرط کے معنی میں ہے یا خیر کیلئے علت ہے اور مجاہد نے کہا ہے کہ اِذْ یہاں پر پوشیدہ ہے تو معلوم ہو گیا کہ خیریت (بہتری) کا سبب امر بالمعروف اور نھی عن المنکر ہے۔ امام قرطبی نے کہا ہے کہ جب اس امت میں کوئی یہ کام چھوڑ دیتے ہیں تو یہ لوگ برائی اور مذمت کے قابل ہوتے ہیں اور یہ ان کی ہلاکت کیلئے سبب ہوگا۔ امام آلوسی نے کہا ہے کہ معروف تمام اطاعات کو اور منکر تمام معصیات کو کہتے ہیں اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل ہے کہ بڑا معروف توحید کا کلمہ ہے اور بڑا منکر تکذیب (شرک) کرنا ہے۔ امام ابن کثیر نے اس امت کی فضیلت کیلئے اس آیت کی تفسیر میں تقریباً 27 احادیث ذکر کی ہیں۔ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ایمان سے مراد کامل ایمان ہے یعنی ایمان شرعی۔ سوال: ایمان تو دعوت پر مقدم ہے تو یہاں پر بعد میں کیوں ذکر کیا ہے؟ جواب (1): یہاں پر مقصد باقی امتوں سے بہتری کا سبب ہے اور ایمان کے وصف میں سب شریک ہیں لیکن اس امت کی خصوصیت کثرت دعوت ہے اس وجہ سے دعوت کو پہلے ذکر کیا ہے۔ جواب (2): اس سے مراد موت تک ایمان پر دوام

اور ہمیشگی کرنا ہے اور اس کا سبب دعوت دینا ہے اور یہ مؤثر کے بعد اثر کا ذکر ہے۔ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ یہاں پر ایمان سے مراد اس امت کی طرح ایمان ہے یعنی اس ایمان شرعی کیساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ملایا جائے تو یہ لوگ بھی خیریت کی صفت میں داخل ہو جائینگے اور اس معنی کیساتھ یہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ کیساتھ ربط رکھتا ہے اور اس میں اہل کتاب کو دعوت دینا مقصد ہے ان کی خباثات کو ذکر کرنے کے بعد جو پہلے گزر چکی ہیں لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ یہاں پر خیر تفضیلی مراد ہے یعنی اس ایمان کے فائدے انکو دنیا اور آخرت میں حاصل ہو جائینگے اور جو ان کا ایمان ہے (ایمان غیر شرعی) تو اس کے فائدے صرف دنیا میں ہیں کہ مال اور مرتبے اور برتری کا حاصل ہونا یہ صرف اس کے ساتھ دنیا میں حاصل ہوتے ہیں اور آخرت میں ہلاکت ہے۔ یا خَيْرٌ فِي نَفْسِهٖ مراد ہے تفضیلی معنی اس میں نہیں ہے اس لئے کہ کفر میں کوئی خیر نہیں ہے۔ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ یہاں سے اہل کتاب کو دو قسموں میں تقسیم کر رہا ہے اور ہر قسم کی دس دس حالتیں ذکر کر رہا ہے۔ الْفٰسِقُوْنَ مومنوں کے مقابلے میں كٰفِرُوْنَ کے معنی میں ہے جب ان کا کفر ضد اور عناد کے سبب سے تھا تو اس وجہ سے الْفٰسِقُوْنَ ذکر کیا۔

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّاۤ اَذًى ؕ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۫ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ "ہرگز یہ لوگ ضرر نہیں دے سکتے ہیں تمہیں مگر منہ سے برا بھلا کہنا اور اگر وہ تمہارے ساتھ لڑے تو وہ تم سے پیٹھ کے بل پھر جائیں گے پھر ان کی مدد نہیں کی جائے گی" [111]۔

تفسیر 111: اس آیت میں فاسق اہل کتاب کے تین احوال ذکر کر رہا ہے اور یہ تینوں پیشنگوئیاں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کیلئے سچ کر دکھائیں اور آیت یہودیوں کے بارے میں ہے۔ اِلَّاۤ اَذًى زبان سے ضرر کے کلمات کو اَذًى کہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ پر طعن کرنا اور کلمات شرکیہ اور مومنوں پر بہتان باندھنا برا بھلا کہنا سَبّ اور شَتم (گالی گلوچ) کرنا یہ بھی ضرر ہے اس وجہ سے یہ استثناء متصل ہے۔ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ یعنی تمہارے ساتھ جبن (بزدلی) کی وجہ سے قتال نہیں کر سکتے ہیں اَدْبَار کہا ہے ظہور نہیں کہا ہے اسلئے کہ اس لفظ میں ان کی بہت توہین اور بے عزتی ہے۔ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ یعنی قتال کے وقت یا بغیر قتال کے بھی ان کے ساتھ مدد نہیں کی جائے گی اور یہ اِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ میں داخل نہیں ہے کیونکہ ان کی عدم نصرت قتال کی شرط کیساتھ مشروط نہیں ہے بلکہ عام اوقات کو شامل ہے اور ثُمَّ یہاں پر تعقیب ذکری کیلئے ہے۔

ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ اَيۡنَ مَا ثُقِفُوۡۤا اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الۡمَسۡكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَانُوۡا يَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقۡتُلُوۡنَ الۡاَنۡۢبِيَآءَ بِغَيۡرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوۡا يَعۡتَدُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾ "مسلط کردی گئی ان پر ذلت جہاں پر بھی وہ پائے جائیں مگر جو مضبوطی سے تھامے اللہ تعالیٰ کی رسی کو اور لوگوں (مومنوں) کی رسی کو اور پلٹ آئے یہ لوگ غضب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور ڈالی گئی ہے ان پر فقیری اس لئے کہ یقیناً وہ کفر کرتے تھے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کیساتھ اور قتل کرتے تھے انبیاء کو بغیر جرم شرعی کے یہ اس سبب سے کہ یہ لوگ نافرمانی کرتے تھے اور یہ لوگ حد سے تجاوز کرنے والے تھے" [112]۔

تفسیر 112: اس آیت میں ان کی 7 حالتوں کا ذکر ہے ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ یہ ضرب سکہ پر مہر لگانے سے کنایہ ہے جیسا کہ وہ مہر اس میں پیوست اور مضبوط ہوتی ہے کسی چیز کے ذریعے سے بھی جدا نہیں ہوتی اسی طرح ذلت بھی ان کے ساتھ مضبوط اور پیوست ہے ذلت کا مصداق اہل اسلام کے غلبے کے وقت جزیہ لینا ہے اسی طرح جنگ میں ان سے مال غنیمت میں حاصل کرنا اور ان کو قید کرنا اور ان کے نفسوں میں بھی بخل کی صورت میں ذلت ہے اور باقی دیگر برے اخلاق بھی ہیں۔ اَيۡنَ مَا ثُقِفُوۡۤا یہ مکان کی تعمیم کیلئے ہے ثقف ان کو پالینے اور قدرت رکھنے کے معنی میں ہے یعنی میدان جنگ میں ہو یا کسی اور جگہ میں اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ حبل اللہ اور حبل الناس سے مراد وعدے کا عہد ہے جس کے ذریعے سے ان کو مال اور عزت اور دین کی حفاظت حاصل ہوتی ہے لیکن جزیے سے نجات حاصل نہیں ہوتی ہے وہ ذلت ان پر باقی رہے گی یا حبل اللہ سے مراد اسلام اور حبل الناس سے مراد مومنوں کی راہ کی اتباع ہے تو ایسے وقت میں یہ لوگ ہر قسم کی ذلت سے بچ جائیںگے (تفسیر آلوسی)۔ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ اس کی تفسیر سورہ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الۡمَسۡكَنَةُ یعنی یہ لوگ اپنا حال فقیری اور مسکینی کا ظاہر کرتے ہے اگرچہ مالدار ہوتے ہیں اور یہ بخل اور دنیا کے حرص اور ناشکری کی وجہ سے ہے۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَانُوۡا يَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اس میں غضب اور مسکینی کے اسباب کا ذکر ہے اس کی تفسیر سورۃ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ فائدہ: اس طرح سورۃ بقرہ 61 میں گزر چکا ہے اور دونوں آیتوں کے درمیان کئی وجوہات سے فرق ہے پہلی وجہ یہ ہے کہ وہاں پر ذلت اور مسکینی کو اکٹھے ذکر کیا ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ وہاں پر مسکنت کو غضب سے پہلے ذکر کیا گیا ہے تیسری وجہ یہ ہے کہ وہاں پر النبیین ذکر کیا ہے اور یہاں پر الانبیاء ذکر کیا ہے فرق کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہاں پر موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں نزول قرآن سے پہلے یہودیوں کی حالت کا ذکر تھا جبکہ یہاں پر اِلَّا

بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ استثناء ذکر کیا ہے اور یہاں پر قرآن کے نزول کے وقت انکا حال ذکر کر رہا ہے پہلے فرق کی تفصیل یہ ہے کہ وہاں پر تینوں کے اسباب مشترک تھے تو اکٹھے ذکر کیے اور یہاں پر ذلت کا سبب آخری رسول اور قرآن پر ایمان نہ لانا ہے جس کیلئے قرینہ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ اور غضب اور مسکنت کے اسباب بعد میں ذکر ہیں دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سورۃ میں پہلے اعتصام بحبل اللہ ذکر کیا ہے تو اہل کتاب کو اس کی ترغیب دی کہ تم ذلت سے اعتصام کے ذریعے سے بچ جاؤ اور سورۃ بقرۃ میں اس کا ذکر نہیں ہوا ہے اور تیسرے فرق کی وجہ یہ ہے کہ سورۃ بقرۃ میں ذلت اور مسکنت کا سبب اللہ تعالیٰ کی نعمت کو تبدیل کرنا مراد تھا تو مسکنت سے مراد وہ حال ہے جو ان زمینداروں پر ظاہر ہوتا ہے جو دین کا لحاظ نہیں رکھتے ہیں اور یہاں پر مسکنت دنیا کی حرص اور بخل اور ناشکری کی وجہ سے مراد ہے۔ چوتھے فرق کی وجہ یہ ہے کہ اَلنَّبِيّٖنَ قرآن کریم نے تمام انبیاء کیلئے ذکر کیا ہے جیسا کہ سورۃ مریم 18 احزاب 40 اور زمر 69 میں ہے اور الانبیاء کو صرف بنی اسرائیل کے انبیاء کیلئے ذکر کیا ہے قتل کے وصف کیساتھ جیسا کہ سورۃ بقرۃ 91 سورۃ آل عمران 181، 112 اور سورۃ نساء 155 یا قتل کے وصف کے بغیر جیسا کہ سورۃ مائدہ 20 میں۔ تو سورۃ بقرۃ میں مقصد اہل کتاب کی خباثتوں کو ذکر کرنا تھا تو وہاں پر ایسا لفظ ذکر کیا جو زیادہ کثرت پر دلالت کرتا ہے اور یہاں پر صرف ان کے برے حال کا ذکر کرنا مقصد ہے تو وہ لفظ لایا جو ان کے ساتھ خاص ہے۔ (وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِحُكْمِ كَلَامِهٖ)

لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

"اہل کتاب میں سے برابر نہیں ہے ایک گروہ جو دین پر قائم ہے اور اللہ کی کتاب کی آیتیں رات کو تلاوت کرتے ہیں اور رات کے اوقات میں سجدے کرتے ہیں" [113]۔

تفسیر 113: ان تین آیتوں میں اہل کتاب کی دوسری قسم کا ذکر ہے پہلے ان کو مؤمنین کہا اور ان کی مدح کے بھی دس حالات ذکر کر رہا ہے اس آیت میں ان میں سے تین ذکر کیئے ہیں۔ لَيْسُوْا سَوَآءً یہ مستقل جملہ ہے اس میں رد ہے ان لوگوں کا جو اہل کتاب کو برا سمجھتے ہیں (جنہوں نے آخری نبی پر ایمان لایا) جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ جب عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھیوں نے اسلام قبول کرلیا تو باقی یہودیوں نے کہا کہ یہ شر پسند لوگ ہیں اسلئے کہ انہوں نے بڑوں کا دین چھوڑا ہے ان کے جواب کا خلاصہ (مؤمنوں میں جنہوں نے آخری نبی پر ایمان لایا ہے) ان میں خیر کی تمام صفات ہیں لہٰذا ان کو سابقہ اہل کتاب کی طرح مت سمجھو۔ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اس میں دونوں جماعتوں کے

درمیان فرق کرنے کی تفصیل ہے اور صاحب اللباب نے کہا ہے کہ ان اہل کتاب میں پہلے دین والے اور مسلمان بھی داخل ہیں اس کی دلیل مسند احمد کی حدیث ہے (احمد 396/1، ابن ابی حاتم 1226، ابویعلیٰ 5306، اس کی سند حسن ہے، اس کی تائید صحیح بخاری کتاب المواقیت الصلوٰۃ حدیث 566، صحیح مسلم حدیث 638 سے ہوتی ہے) کہ نبی ﷺ نے ایک رات عشاء کی نماز میں تاخیر کی اور پھر گھر سے نکل آئے اور لوگ نماز کے انتظار میں تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا ادیان والوں میں سے کوئی اس طرح نہیں ہے تمہارے علاوہ جو اللہ تعالیٰ کو اس وقت میں یاد کرتا ہو اور یہ آیت پڑھ کر سنائی۔ ابو حیان نے کہا ہے کہ اہل کتاب سے مراد قرآن والے ہیں کہ باقی اہل کتاب ان کے ساتھ برابر نہیں ہیں۔ قَآئِمَةٌ یا مُتسقِیمَةٌ علیٰ کِتَابِ اَللّٰہِ وَحُدُوْدِہٖ (اللہ تعالیٰ کی کتاب اور احکام پر قائم ہوتے ہیں) نمازوں میں قیام کرنے کے معنی میں ہے۔ یَتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰہِ اٰنَآءَ الَّیْلِ، اٰنَآءَ رات کے اوقات کے معنی میں ہے شام کے وقت سے صبح کی نماز تک تمام اوقات شامل ہیں اور یہ فرائض کے علاوہ تقسیم کے طور پر ہے۔ کوئی رات کے شروع میں قرآن کی تلاوت کرتا ہے اور کوئی درمیان اور کوئی آخر میں اور اس سے مراد نماز میں قرآن کو پڑھ کر سنانا ہے یہ اشارہ ہے کہ رات کی نماز میں اہم مقصد قرآن پڑھنا ہے اور جب رات کی نماز کا اس طرح اہتمام کرتے ہیں تو دن کو تو ضرور کرتے ہیں اس وجہ سے دن کا ذکر نہیں کیا ہے۔ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ یعنی قرآن کے پڑھنے کے بعد یہ لوگ سجدہ کرتے ہیں نماز کا سجدہ یا تلاوت کا سجدہ یا سجدے سے مراد نماز ہے جزء کا ذکر ہے لیکن مراد اس سے کل ہے یا سجدے سے مراد خشوع وخضوع اور ہر وقت میں اللہ تعالیٰ کا حکم ماننا ہے تو اس آیت میں دو توجیہات ہیں۔ پہلی توجیہہ، یہ الگ الگ صفتیں ہیں یعنی دین پر استقامت اور قرآن پڑھنا اور نماز پڑھنا۔ دوسری توجیہہ، یہ ہے کہ ایک صفت ہے یعنی نماز میں قیام کرتے ہیں اور اس میں قرآن پڑھتے ہیں اور پھر سجدہ کرتے ہیں قیام اور سجود کا ذکر اس وجہ سے کیا کہ یہ دونوں رات کی نماز میں طویل ہوتے ہیں اور اسی طرح سورۃ زمر میں ہے۔

يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ "ایمان لاتے ہیں یہ لوگ اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر اور نیکی کا حکم کرتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں اور نیکی کے کاموں میں کوشش کرتے ہیں اور یہی لوگ نیک لوگوں میں سے ہیں" [114]۔

تفسیر 114: اس آیت میں ان کی مزید چھ صفات کا ذکر کر رہا ہے۔ پہلے ان صفات کا ذکر کیا جو یہودیوں میں موجود تھیں

اب ان صفات کا ذکر کر رہا ہے کہ ان کے ذریعے سے اہل حق اور اہل باطل کے درمیان امتیاز آتا ہے اسلئے کہ ان صفات کو اہل کتاب نے چھوڑ دیا تھا اور مشترک صفتیں پہلے ذکر ہوتی ہیں اور جن صفتوں سے امتیاز آتا ہے وہ بعد میں ذکر ہوتی ہیں۔ اس لئے ایمان اور امر بالمعروف اور نھی عن المنکر کو پہلی صفتوں کے بعد ذکر کیا ہے۔ يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ایمان سے مراد شرعی ایمان ہے جیسا کہ صحابہ کرام کے ایمان تھے جبکہ یہود و نصاریٰ میں ایسا ایمان نہیں تھا۔ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ اس میں بھی یہود و نصاریٰ پر تنقید ہے اسلئے کہ انہوں نے دعوت حق کا کام چھوڑ دیا تھا بلکہ اس کے خلاف عمل کرتے تھے (منکر کی طرف دعوت دیتے اور نیک کاموں سے منع کرتے تھے)۔ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ یہ صفت جامع ہے تمام خیر کی صفات پر مشتمل ہے چاہے نفس کیساتھ اس کا تعلق ہو یا نہ ہو اور خیر میں مُسَارَعتُ نیکیوں میں بہت رغبت کرنے پر دلالت کرتی ہے اور اس میں بھی یہودیوں پر تعریض ہے کہ وہ شر کے کاموں میں کوشش کرتے ہیں۔ مسارعت اصل میں بہت اہم کام کو دوسرے کام پر مقدم کرنے کو کہا جاتا ہے جیسا کہ فرض عین اور فرض کفایہ کے درمیان تعارض آ جائے تو فرض عین کو مقدم کرینگے یا کسی فرض اور سنت کے عمل کے درمیان تعارض آ جائے تو فرض عمل کو مقدم کرینگے امر بالمعروف اور نھی عن المنکر کے بعد اس صفت کو اس وجہ سے ذکر کیا ہے کہ امر بالمعروف اور نھی عن المنکر میں اَلْاَهَمُّ فَالْاَهَمُّ اور اور مرتبوں کا لحاظ کر رہا ہے اور یہ مدح کی صفت ہے اور جو عجلت ہے تو وہ غیر ضروری کام کو ضروری کام پر مقدم کرنا ہے اور یہ برائی کی صفت ہے۔ وَأُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ صلاح کی صفت میں اسلام پر زیادتی ہے اس وجہ سے انبیاء علیہم السلام کی دعاء اور صفت میں یہ وصف ذکر ہے جیسا سورۃ نمل 19 میں سلیمان علیہ السلام کی دعا اور اس طرح کی صفت سورۃ بقرۃ 130 اور سورۃ الانبیاء 72 اور 85 میں بھی ہے۔

وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ "اور وہ جو بھی نیکی کی کاموں میں سے کرتے ہیں وہ پس ہرگز اس کے ثواب سے محروم نہیں ہونگے اور اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے" [115]۔

تفسیر 115: اس آیت میں بشارت ہے اور گزشتہ صفتوں میں سے ان کی بڑی صفت کا ذکر ہے۔ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ یہ ضمیر اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ کی طرف راجع ہے۔ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ یہاں پر کفر سے مراد عمل کے ثواب سے محروم ہونا ہے اور اس معنی کی وجہ سے یہ دونوں مفعولوں کی طرف متعدی کیا گیا ہے اگرچہ کفر مشہور معنی کے ساتھ ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ اگرچہ اللہ تعالیٰ کا علم عام ہے لیکن متقین کیساتھ اس کی تخصیص ترغیب کے طور پر ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْــًٔا ؕ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ "بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے ہرگز دور نہیں کر سکیں گے ان سے ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کچھ بھی اور یہی لوگ آگ والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے" [116]۔

تفسیر 116: یہ بشارت کے بعد آخرت کا خوف ہے جب لَيْسُوْا سَوَآءً میں فریقین کو اشارہ تھا اور ایک گروہ کا ذکر مِنْهُمْ اُمَّةٌ کیساتھ کیا تو اب دوسرا فریق ان کے مقابل ذکر کر رہا ہے۔ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْــًٔا اس طرح اس سورۃ کی آیت 10 میں بھی گزر چکا ہے تکرار کی وجہ یہ ہے کہ وہاں پر کافر نصاریٰ کا رد کیا گیا تھا اور یہاں کا یہودی کافروں پر رد ہے اور دونوں گروہ مالدار تھے ان کی اولاد اور پیروکار کثرت سے تھے جن پر وہ فخر کرتے تھے لیکن آیت تمام کافروں کیلئے عام ہے۔

مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ "مثال اس چیز کی جو خرچ کرتے ہیں یہ لوگ اس دنیا کی زندگی کیلئے، تیز ہوا کی طرح ہے جس میں سردی اور اولے ہوں جو پہنچے اُس قوم کی فصل کو جنہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے پس اُسے تباہ کر دے اور ظلم نہیں کیا ان پر اللہ تعالیٰ نے لیکن وہ اپنے نفسوں پر خود ظلم کرتے ہیں" [117]۔

تفسیر 117: یہ سوال کا جواب ہے سوال یہ تھا کہ یہ کافر لوگ کبھی کبھی دنیا کے صحیح مصارف میں مال خرچ کرتے ہیں تو وہ ان کو فائدہ کیوں نہیں دیتا جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ ان کے ظلم کی وجہ سے برباد ہو رہا ہے اور اس کیلئے مثال ذکر کی ہے۔ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اس میں دو توجیہات ہیں پہلی یہ کہ انفاق سے مراد کفر اور شرک کے باوجود صحیح مصارف میں خرچ کرنا ہے اور فی ظرفیت کیلئے ہے اور یہ قید واقعی ہے۔ اسلئے کہ ہر انفاق صرف دنیا میں ہوتا ہے دوسری یہ کہ انفاق سے مراد صرف دنیا کی ترقی کیلئے خرچ کرنا ہے جیسا کہ دنیا کے اقتدار اور حصول کیلئے بار بار اور نمود شہرت کیلئے کہ لوگ دنیا میں تعریفیں کریں یا وہ جو یہودی عوام اپنے مولویوں پر خرچ کرتے اور وہ حق کو چھپایا کرتے تھے تو یہ انفاق اللہ تعالیٰ کی رضاء کیلئے نہیں ہے لہٰذا یہ برباد ہے اور فی یہاں پر اجلیہ ہے یعنی دنیاوی زندگی کیلئے خرچ کرتے تھا۔ كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ خیر کے معنی میں دو اقوال ہیں پہلا قول اکثر اہل لغت اور ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ سے مروی ہے کہ سخت سردی

جو فصلوں کو جلانے والی ہو یا اولے اور دوسرا قول ابن الانباری نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے نقل کیا ہے کہ صِرٌّ آگ یا گرم ہوا کے معنی میں ہے جو فصل کو جلا دیتا ہے۔ اَصَابَتۡ یہ رِیۡحٍ کی صفت ہے ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ یہ ضمیر یں اَلَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ کی طرف راجع ہیں اور قوم کیلئے صفت ہے یعنی ایسی قوم جس نے ظلم کیا ہے اس صفت میں اشارہ ہے کہ دنیا کا عذاب ہوا وغیرہ کیساتھ ان لوگوں پر آتا ہے جنہوں نے کفر اور شرک کیا ہوتا ہے یا باقی کبیرہ گناہ کئے ہوں اور دوسری توجیہ کیساتھ ظلم لغوی کے معنی کا بھی احتمال رکھتا ہے۔ انہوں نے فصل کو بے موسم بویا تھا اس وجہ سے تباہ ہوگئی۔ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ اس میں اشارہ ہے کہ دنیا اور آخرت کا عذاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظلم نہیں ہے بلکہ عدل ہے وَلٰكِنۡ اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ ہر گناہ کرنے والا اپنے لئے ثواب اور برکت کا حصہ کم کر دیتا ہے اس وجہ سے کہا گیا کہ اس شخص نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے۔ فائدہ: جہاں پر بھی ظلم پر دوام یا صرف کفر اور شرک مراد ہوتا ہے تو وہاں پر كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ ذکر ہوتا ہے جیسا کہ سورۃ بقرۃ 57 سورۃ اعراف 160 اور 177 توبہ 70 نحل 33 اور 118 عنکبوت 110 میں، روم 9 میں اور جہاں مطلق ظلم مراد ہوتا ہے تو وہاں کانوا کا ذکر نہیں کرتا ہے جیسا کہ اس آیت میں سورۃ یونس 44 میں ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا بِطَانَةً مِّنۡ دُوۡنِكُمۡ لَا يَاۡلُوۡنَكُمۡ خَبَالًا ؕ وَدُّوۡا مَا عَنِتُّمۡ ۚ قَدۡ بَدَتِ الۡبَغۡضَآءُ مِنۡ اَفۡوَاهِهِمۡ ۖۚ وَمَا تُخۡفِىۡ صُدُوۡرُهُمۡ اَكۡبَرُ ؕ قَدۡ بَيَّنَّا لَـكُمُ الۡاٰيٰتِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۱۸﴾

"اے ایمان والو تم اپنا دلی دوست ایمان والوں کے سوا کسی اور کو نہ بناؤ۔ دوسرے لوگ تمہاری تباہی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے وہ تو چاہتے ہیں کہ تم دکھ میں پڑو۔ انکی عداوت تو خود ان کی زبان سے بھی ظاہر ہو چکی ہے اور جو ان کے سینوں میں پوشیدہ ہے وہ بہت زیادہ ہے ہم نے تمہارے لئے آیتیں بیان کر دیں (ان کی دشمنی کی) اگر تم عقلمند ہو" [118]۔

تفسیر 118: اس آیت میں چوتھی اصل اور ادب ذکر کر رہا ہے اور اس میں مقصد ایمان والوں کے گھروں میں فساد اور اختلاف پیدا کرنے سے حفاظت ہے۔ (ربط) جب یہودیوں کی خباثات کو ذکر کر لیا اور ان کے اعمال کی ہلاکت بیان ہوگئی اب انہی خباثات سے بچنے کیلئے ان کی دوستی سے منع ذکر کر رہا ہے اور امام قرطبی نے فرمایا کہ یہ اِنۡ تُطِيۡعُوۡا فَرِيۡقًا کیساتھ متعلق ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا بِطَانَةً. بِطَانَةً اس خاص دوست کو کہا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ راز کی بات ہو سکتی ہے۔ امام قرطبی نے کہا ہے کہ اس آیت میں کافر، یہودیوں اور باقی اہل اھواء (بدعتیوں) کی دوستی سے منع ہے۔ سوال: بِطَانَةً نفس کے سیاق میں نکرہ ہے جو عموم چاہتا ہے حالانکہ ممتحنہ کی آیت 8 میں بعض کافروں کیساتھ تعلق

رکھنے کا جواز ذکر ہے؟ جواب: اس آیت میں تولیٰ کا ذکر ہے اس سے مراد دنیاوی تعلق ہے اور یہاں پر بِطَانَةً سے مراد یہ ہے کہ اپنے پوشیدہ رازوں کو ان کے سامنے مت ظاہر کرو اس وجہ سے عمر رضی اللہ عنہ نے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو تنبیہ کی تھی جب اس نے ایک نصرانی کو اپنا کاتب بنایا تھا اسلئے کہ خطوط میں راز کی باتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ امام قرطبی نے فرمایا کہ افسوس آج کے زمانے کے مسلمانوں پر کہ بہت اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کو کاتبین اور امانتدار (خزانچی) مقرر کئے ہوئے ہیں۔ مِّنْ دُوْنِكُمْ یہ بِطَانَةً کیلئے صفت ہے دُوْنَ (سوی) یا ادنیٰ کے معنی میں ہے اور اس سے مراد تمام کافر منافقین اور مبتدعین ہیں آج کے زمانے کی بعض جماعتوں پر افسوس ہے کہ تعصب اور ضد کی وجہ سے اپنی جماعت کے علاوہ دوسرے گروہ کے مسلمانوں کے ساتھ بھی تعلق نہیں رکھتے ہیں اور دلیل میں یہ آیت پیش کرتے ہیں جبکہ یہ عین تحریف ہے۔

اس کے بعد اس نہی کیلئے دس علتیں ذکر کر رہا ہے۔ پہلی علت: لَا يَأْلُوْنَكُمْ خَبَالًا۔ اِلْوٌ کوتاہی کرنے کو کہا جاتا ہے اکثر ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے اور کبھی دو مفعولوں کی طرف تو خَبَالًا یا تو دوسرے قول کی بناء پر مفعول ثانی ہے یا حرف جر محذوف ہے یعنی فِي الْخَبَالِ خبال لغت میں ایسی بیماری اور سستی ہے جو کسی انسان یا حیوان میں آجائے تو اس میں فساد پیدا کرتا ہے اور فساد کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ سورۃ توبہ 42 میں ہے تو معنیٰ یہ ہے کہ یہ لوگ تمہارے فساد میں کچھ کمی بھی نہیں کرتے یعنی تمہارے درمیان فساد پیدا کرتے ہیں یا تمہارے درمیان اختلاف اور دشمنی پیدا کرتے ہیں یا باقی بدنی اور مالی نقصانات کے بارے میں کوشش کرتے ہیں۔ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ دوسری علت ہے مَا مصدریہ ہے اور عَنِتٌ سخت مشقت کو کہا جاتا ہے پہلے جملے اور دوسرے میں فرق یہ ہے کہ پہلے تو یہ لوگ تمہارے دین کے بگاڑنے میں کوتاہی نہیں کرتے ہیں اور جب اس سے عاجز آجاتے ہیں تو کوشش کرتے ہیں کہ تمہیں بڑی دنیاوی تکلیف میں مبتلا کردیں یا یہ کہ تمہارے فساد میں کوشش کرتے ہیں اور جب ایسا نہیں کرتے ہیں تو دل میں اس کی تمنا کرتے ہیں۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ یہ تیسری علت ہے بغضاء اور بغض اصل میں دل کی صفت ہے لیکن ان کی زبان سے یہ کلمات کہنا یہ ان کے بغض کی علامت ہے۔ سوال: منافقین تو منہ سے مؤمنین کیساتھ بغض کا اظہار نہیں کرسکتے ہیں؟ جواب 1: سخت بغض کی وجہ سے کبھی بے اختیار دشمنی کے کلمات ان کے منہ سے ظاہر ہوجاتے ہیں۔ جواب 2: قتادہ سے روایت ہے کہ یہ ظاہر کرنا ان کا آپس میں مراد ہے کہ گھروں میں مومنوں کی غیبتیں کرتے ہیں اور ان پر تہمتیں لگاتے ہیں (آلوسی ابوحیان) سوال: اَفْوَاهِهِمْ کہا اَلْسِنَتِهِمْ کیوں نہیں کہا ہے؟ جواب: اس میں ان کی اور قباحت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ ایسی باتوں پر رخسار پھیر کر منہ کھولتے ہیں

اور اس کو حدیث میں تَرٰثَارُوْنَ مُتَشَدِّقُوْنَ کہا گیا ہے ترمذی اس حدیث کو شیخ البانیؒ نے صحیح کہا ہے الجامع الصغیر 2194 (قرطبی)۔ وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ یہ چوتھی علت ہے اس سے مراد ان کے دلوں کا حسد اور بغض مراد ہے وہ بہت بڑا ہے کیونکہ اس میں قتل کے ارادے ہیں اور ایمان والوں کو ذلیل کرنے کے ارادے ہیں اسی طرح دلوں کا بغض انکا ہمیشہ ہے اور منہ کا کبھی کبھی تو اس وجہ سے اکبر ہے۔ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ الآیت سے مراد ایمان والوں کیساتھ اخلاص کرنے کی اور منافقت چھوڑنے کی دلیلیں ہیں یا اس سے مراد ان کی دشمنی کی علامات ہیں۔ تَعَقُّل سے مراد دوست اور دشمن کے درمیان فرق کرنے میں فکر کرنا ہے اور ان کی علامات میں فکر کرنا ہے۔

هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۖ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۭ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝119

"خبردار تم اے مومنو یہی لوگ ہو محبت (خیر خواہی) کرتے ہو ان سے اور وہ محبت نہیں کرتے ہیں تم سے یہ لوگ کہتے ہیں ہم ایمان لائے ہیں اور جب علیحدہ ہوجاتے ہیں تمہاری (ترقی) کی وجہ سے، اپنی انگلیوں کے سروں کو غصے کی وجہ سے کاٹتے ہیں۔ آپ کہہ دیجیے مر جاؤ تم اپنے غصے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہارے سینوں کے رازوں کو جاننے والا ہے" [119]۔

تفسیر 119: اس آیت میں چار علتوں کا ذکر ہے اور یہ منافقین کیساتھ خاص ہے۔ هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ بہتر قول یہ ہے کہ هَا تنبیہ کیلئے ہے اور اَنْتُمْ مبتداء ہے اور اُولَآءِ خبر اول ہے اور تُحِبُّوْنَهُمْ خبر ثانی ہے اور مومنوں کو خطاب بطور تنبیہ ہے ڈانٹ کے طور پر نہیں ہے اس وجہ سے کہ ڈانٹنے کی جگہ میں ذکر هٰٓؤُلَآءِ ہوتا ہے جیسا کہ سورۃ بقرۃ 85 اور آل عمران 66 میں اور یہاں پر صرف اُولَآءِ ذکر کیا ہے۔ تُحِبُّوْنَهُمْ محبت سے مراد ان کی خیر خواہی کرنا ہے یہ قول ابو العالیہ اور اصم کی ہے یا محبت مراد ہے اس سبب سے کہ انہوں نے اسلام کا اظہار کیا تھا۔ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ یہ اس وجہ سے کہ ان کے دلوں میں کفر اور نفاق پڑا ہے۔ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ الکتب سے مراد قرآن ہے اور كُلِّهٖ میں اشارہ ہے کہ تمہارے نزدیک قرآن میں کسی قسم کا شک نہیں ہے اور یہ لوگ قرآن کا بعض حصہ مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے ہیں جیسا کہ كُلَّمَآ اَضَاۗءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ڎ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا میں اشارہ ہے یا الکتب سے مراد مطلق آسمانی کتابیں ہیں یعنی تم توراۃ انجیل اور قرآن اور تمام الٰہی کتابیں مانتے ہو اور یہ لوگ صرف اپنی کتاب مانتے ہیں اور اس میں بھی بعض حصہ پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض پر نہیں رکھتے ہیں جیسا کہ يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَاۗءَهٗ اور اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ

وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ میں اشارہ ہے کہ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا یہ قول ان کے نفاق اور دھوکے پر بنا ہے اس وجہ سے یہاں پر ایمان کا متعلق ذکر نہیں کیا ہے۔ یعنی مُؤْمَنٌ بِهٖ ذکر نہیں ہے۔ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ. عَضٌّ دانتوں کے ذریعے سے کاٹنا ہے اَنَامِل یہ اَنْمِلَةٌ کی جمع ہے انگلیوں کے سروں کو کہا جاتا ہے غیظ تحت غضب کو کہا جاتا ہے اور کاٹنا کنایہ ہے کہ زیادہ غضب کی وجہ سے انگلی منہ میں رکھ لیتے ہیں تو جب غصہ زیادہ ہوجاتا ہے تو اچانک اس انگلی پر دانت پیوست کر لیتے ہیں یا یہ نادم ہونے سے کنایہ ہے جیسا کہ سورۃ فرقان 27 میں ہے یعنی جب مومنوں کی طرف سے ان کو غنیمت میں کوئی حصہ نہیں ملتا ہے تو یہ لوگ اپنے محروم ہونے پر شرمندہ ہوجاتے ہیں۔ عَلَيْكُمْ. عَضُّوْا کیساتھ متعلق ہے یعنی تمہاری ترقی پر غضب ناک ہوتے ہیں یا متعلق ہے پوشیدہ لفظ (حَنِقِيْنَ عَلَيْكُمْ) زیادہ خفا ہونے والے ہیں تم پر۔ امام قرطبی نے فرمایا ہے کہ یہ صفت اس زمانے کے بہت سارے بدعتیوں میں موجود ہے۔ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ امام ابن جریر اور بہت سارے مفسرین نے کہا ہے کہ یہ بددعاء ہے ان کے سامنے یا ان کے پیٹھ پیچھے اور ایسے لوگوں کو بددعا کردینا جائز ہے یا یہ امر جملہ خبریہ کے معنی میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ دین حق کو مزید ترقی اور غلبہ دے گا تمہاری موت سے پہلے تک تو آخر اسی غصے میں فوت ہوجاؤگے اور اللہ تعالیٰ تمہارے اس غصے کی کوئی پروا نہیں کرتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ یہ قُلْ کے تحت داخل ہے یا مستقل جملہ ہے سوال کا جواب ہے کہ جب یہ کہا گیا کہ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ. وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ اور مِنَ الْغَيْظِ تو یہ تینوں چیزیں تو سینے میں پوشیدہ ہیں تو ان کا ذکر کیسے کیا گیا جواب کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سینوں کے تمام رازوں پر علم رکھتا ہے۔ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ بذات صاحب کے معنی میں ہے یہاں پر موصوف پوشیدہ ہے یعنی بِالْمُضْمَرَاتِ ذَوَاتِ الصُّدُوْرِ یعنی وہ پوشیدہ پوشیدہ تر راز جو انسان کے دل میں ہیں اور قول اور عمل سے ظاہر نہیں ہوئے ہوں اور یہ اصل میں غیب کیلئے ایک مصداق ہے اللہ تعالیٰ کے علم غیب کے مسئلہ کے بارے میں ہے اسلئے کہ جو بات کسی اور کیلئے ہونٹوں سے نکل جائے تو وہ مخلوق کے علم میں داخل ہوجاتی ہے تو اس سے کبھی کبھی شیاطین کو بھی خبر ہوجاتی ہے یعنی شیاطین سن لیتے ہیں اور کاہن تک پہنچا دیتے ہیں تو کاہن اس بات کی خبر دے دیتا ہے تو یہاں پر اس طرح نہیں کہا جاسکتا ہے کہ یہ کاہن غیب کا علم رکھتا ہے اور یہ جملہ قرآن کریم میں بارہ مرتبہ ذکر ہے اور اس کی دوسری تفسیر سورۃ عنکبوت 10 اور سورۃ غافر 19 میں ہے۔

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ

شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿١٢٠﴾ "اگر تمہیں اچھائی پہنچے تو وہ ناخوش ہوتے ہیں اور اگر تمہیں تکلیف پریشانی پہنچے تو وہ خوش ہوتے ہیں اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو ضرر نہیں دیں گی تمہیں ان کی چالیں کچھ بھی۔ بیشک اللہ تعالیٰ ان اعمال پر جو یہ لوگ کرتے ہیں علم وقدرت کے ساتھ احاطہ کیے ہوا ہے" [120]۔

تفسیر 120: اس آیت میں لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً کیلئے باقی دو علتوں کا ذکر کر رہا ہے تَمْسَسْكُمْ. مَسّ سے لیا گیا ہے مَسّ اصل میں ہاتھ پہنچانے کو کہا جاتا ہے پھر ہر چیز کیلئے استعمال ہوتا ہے چاہے محسوس ہو یا معنوی ہو خیر یا شر ہو کبھی خیر کیلئے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ یہ آیت اور معارج 21 اور سورۃ انعام 17 میں اکثر شر میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ آلعمران 140 یونس 12 اور کبھی شریک استعمال ہوتا ہے جیسا کہ بقرۃ 214 اور اعراف 95 میں ہے ہر جگہ کمی پر دلالت کرتا ہے۔ حَسَنَةٌ سے مراد دنیا کا فائدہ اور خوشی ہے جیسا کہ بدن، صحت، مال کی فراخی، دشمن پر غلبہ وغیرہ۔ صاحب اللباب نے ابوالعباس سے نقل کیا ہے کہ حَسَنَةٌ قرآن کریم میں پانچ طریقوں پر استعمال ہوا ہے۔ پہلا کامیابی کے معنی میں جیسا کہ اس آیت میں، دوسرا توحید کے معنی میں سورۃ انعام 160 یں تیسرا فراخی اور وسعت کے معنی میں سورۃ نساء 78 چوتھا عذاب سے عافیت کے معنی میں سورۃ رعد 6 اس میں دوسرا معنی توحید کو قبول کرنا بھی ہے، پانچواں قول معروف کے معنی میں سورۃ رعد 22 وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا. سَيِّئَةٌ یہ حَسَنَةٌ کے مقابل ہے اور یہ بھی پانچ معنوں پر مشتمل ہے۔ شکست کے معنی میں جیسا کہ اس آیت میں، دوسرا شرک کے معنی میں جیسا کہ سورۃ انعام 160 میں، تیسرا قحط کے معنی میں سورۃ نساء 78 اور اعراف 131 میں، چوتھا عذاب کے معنی میں سورۃ رعد 6 پانچواں بری بات کے معنی میں سورۃ رعد 22۔ [illegible] حَسَنَةٌ کیساتھ لفظ مَسّ ذکر کیا ہے جو کمی پر دلالت کرتا ہے تو اس میں زیادہ حسد اور بغض کی طرف اشارہ ہے یعنی تھوڑی خوشی کیساتھ جو مومن (ایمان والے) خوشی کا اظہار کرتے ہیں بطور تحدیث نعمت کے تو جب دشمنوں تک خبر پہنچ جاتی ہے تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں اور تکلیف جب کم ہوتی ہے تو مومن اس پر صبر کرتا ہے تو دشمن سے پوشیدہ ہوتا ہے لیکن جب تکلیف زیادہ ہو تو دشمن کو بھی پتا چل جاتا ہے تو انہیں خوشی ہوتی ہے۔ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا صبر سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر کرنا ان گزرے ہوئے آداب میں اور اس سختی پر جو تمہیں پہنچتی ہے اور تقویٰ سے مراد حرام چیزوں سے اپنے آپ کو بچانا ہے اور اسی طرح منافقین کافروں کی دوستی سے بھی۔ لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا یہ قراءت ضاد کے پیش اور راء کیساتھ ہے تو یہ جواب شرط نہیں ہے بلکہ جواب شرط پر دلالت کرنے والا ہے یا اس میں فاء پوشیدہ ہے۔ كَيْدُهُمْ امام راغب نے کہا ہے کہ کید ایک قسم کا حیلہ ہے کبھی مدح پر استعمال

ہوتا ہے اور کبھی ذم (برائی) میں لیکن اکثر برائی میں استعمال ہوتا ہے مدح کے مقام پر جیسا کہ سورۃ انبیآء 57 اور اعراف 183 میں ہے اور ذم کے مقام میں سورۃ یوسف 5 اور نساء 75 میں اور آیت کا مقصد یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے اوامر کو ادا کرنے پر صبر کرے اور منہیات سے تقویٰ اختیار کرے تو ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہوتا ہے تو چال چلانے والوں کی چال ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ۔ يَعْمَلُوْنَ سے مراد کفر اور نفاق کے اعمال اور مومنوں کیساتھ دشمنی ہے اور ان کے مخالف چال چلانا ہے اور اللہ تعالیٰ کا احاطہ علم اور قدرت کیساتھ ہے اور اس میں خوف کا معنی موجود ہے۔

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۟

اور جب صبح سویرے نکلے آپ اپنے گھر سے تیار کر رہے تھے آپ ایمان والوں کیلئے بیٹھنے کی جگہ (مورچے) جنگ کرنے کیلئے۔ اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے [121]۔

[تفسیر 121: اس آیت کی پچھلی آیت کے ساتھ ربط کی کئی وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ پہلے قوانین اور آداب ذکر ہو گئے اب اس پر ثبوتاً اور سلباً نتیجہ ذکر کر رہا ہے یعنی ان اصول پر پابندی کی وجہ سے بدر میں غلبہ اور نصرت الہیہ حاصل ہوئی اور ان اصولوں پر پابندی نہ کرنے کی وجہ سے احد میں نقصان پیدا ہوا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جب یہ فرمایا وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا تو یہ دونوں بدر میں نصرت الہیہ کے سبب بن گئے اور ان دونوں کی وجہ سے احد میں مومنوں پر آزمائش آئی اسلئے کہ اس وقت میں رسول اللہ ﷺ کے حکم ماننے میں سستی اور نافرمانی کی گئی۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ جب منافقین کی دوستی سے منع کیا گیا اور اس کی بعض علتیں ذکر ہو گئیں تو اب اس کی بڑی علت ذکر ہے جو منافقین کا غزوہ احد کے موقعہ پر ایمان والوں کے ساتھ چھوڑ کر واپسی تھی۔ وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ یہ اُحد کیساتھ متعلق ہے یعنی نبی ﷺ جمعے کے دن پہلے وقت میں عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر سے مسجد نبوی کی طرف نکل گئے تاکہ صحابہ کرام کیساتھ غزوہ احد کے بارے میں مشورہ کریں تو بعض نے یہ رائے پیش کی کہ گاؤں میں بیٹھے رہیں گے اور اگر مشرکین آئے تو مدینہ میں ان کے ساتھ مقابلہ کرینگے اور بعض لوگوں نے یہ مشورہ دیا کہ ان کی جنگ کیلئے مدینے سے باہر نکلتے ہیں تو بعد والی بات پر عمل کیا گیا لہٰذا جمعہ کی نماز کے بعد اُحد کی طرف روانہ ہوئے تو اس طرح سے اس آیت اور حدیث میں تطبیق آئی کیونکہ آیت میں ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ گھر سے باہر نکلے ہیں اور حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ جمعے کی نماز کے بعد نکلے ہیں۔ ابن جریر نے بھی یہ سوال اور جواب ذکر کیا ہے اور یہ قول بہتر ہے۔ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ۔ تُبَوِّئُ جگہ تیار کرنے اور مقرر کرنے کے معنی میں ہے۔ مَقَاعِدَ مقعد

کی جمع ہے بیٹھنے کی جگہ کو کہا جاتا ہے اور اس سے مراد صحابہ کرام کو جہاد کیلئے تقسیم کرنا تھا تو عام صحابہ کرام کی صفوں کو نماز کی صفوں کی طرح بنایا اور اُحد کی طرف ان کی پیٹھ کردی گئی اور عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ پچاس ساتھیوں کیساتھ ایک مورچے پر مقرر کیا گیا جس کو جبل الرمات کہا جاتا ہے تو یہ مقاعد جنگ کے مورچے کی طرح ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے لشکر کے امیر (جرنیل) کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری ادا کردی اس نے اپنی ذمہ داری میں کوئی کمی نہیں کیا ہے لہذا اُحد کی (ہزیمت) شکست اس کی وجہ سے نہیں ہوئی ہے۔ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ جب یہ قول، باتوں، مشورہ اور نیتوں پر بنا تھا تو یہ دونوں صفتیں اس کے ساتھ مناسب ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ۗ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ "جب ارادہ کیا تم میں سے دو جماعتوں نے کہ یہ کمزوری ظاہر کریں اور اللہ تعالیٰ ان دونوں کا مددگار تھا اور خاص اللہ تعالیٰ پر چاہئے کہ توکل کریں ایمان والے" [122]

تفسیر 122: یہ بھی اُحد کے واقعہ سے متعلق ہے اور اشارہ ہے کہ اُحد کے واقعہ میں اوس اور خزرج کے قبیلوں کی طرف سے کچھ نقصان بھی نہیں ہوا ہے (وہ انصار کی دو قومیں ہیں)۔ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ جب پہلی چیز انسان کے دل میں بے اختیار گزر جائے تو اس کو خاطر کہا جاتا ہے لیکن جب تھوڑی مضبوط ہوجائے تو اس کو حدیثِ نفس کہا جاتا ہے اور اگر مضبوط ہوجائے تو اُسے ھم کہا جاتا ہے اور یہ سب غیر اختیاری ہیں اور جب زیادہ مضبوط ہوجاتی ہے تو پھر اس کو عزم کہا جاتا ہے اور یہ اختیاری ہوتا ہے اور صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ گناہ کے ھَمّ سے گناہ لازم نہیں آتا ہے تو معلوم ہوا کہ ان دو گروہوں کے دلوں میں صرف گناہ کا ھَمّ خیال آیا تھا اور وہ گناہ نہیں تھا صحیح بخاری کتاب العتق حدیث 2528 صحیح مسلم کتاب الایمان حدیث 127۔ طَّآئِفَتٰنِ اس سے مراد خزرج میں سے بنوسلمہ قبیلہ اور اوس سے بنو حارثہ قبیلہ ہے اور یہ لوگ احد کے لشکر میں دو طرفوں میں مقرر تھے۔ یعنی (دائیں) اور (بائیں) طرف اور اس کو لشکر کے جناحان (دو پر) کہا جاتا ہے جب عبداللہ بن اُبی (منافق) اُحد کے لشکر کے تیسرے حصے سمیت راہ سے واپس ہوگئے اسلئے کہ نبی کریم ﷺ نے اس کی رائے پر عمل نہیں کیا تو اس وقت بنوسلمہ اور بنو حارثہ کے دلوں میں بھی یہ بات آئی کہ ہم بھی اس غزوے سے واپس مدینے کی طرف چلے جائیں۔ اَنْ تَفْشَلَا فَشَلْ (تخبین) بزدلی اور کمزور ہونے کو کہا جاتا ہے اور یہ اکثر خوف سے پیدا ہوتا ہے تو پھر دشمن سے لڑائی نہیں کرسکتے۔ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ، وَلِيٌّ حافظ اور ناصر کے معنی میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو پھسلنے سے

بچالیا اوران کے دلوں کو مضبوط کرلیا اور یہ کلمہ ان کے لئے بڑی بشارت اور صفت تھی۔ اسی وجہ سے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم اس آیت کے نزول سے کچھ خفا نہیں تھے اس لئے کہ لفظ وَلِيُّهُمَا ہمارے لئے بہت بڑی صفت ہے۔ وَعَلَى اللهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ اس جملے میں علاج کرنے کی طرف اشارہ ہے فَشَلْ کو دور کرنے کیلئے اور اللہ تعالیٰ کی ولایت کے حصول کیلئے سبب ہے جو کہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا ہے عَلَى اللهِ کو تخصیص کیلئے مقدم کیا ہے اور فَلْيَتَوَكَّلِ میں فاء پوشیدہ شرط پر دلالت کرتا ہے معنیٰ یہ ہے کہ اگر تم پر کام سخت ہوجائے تو اللہ تعالیٰ پر توکل کرو۔

فائدہ (1): توکل کا مادہ قرآن کریم میں مختلف طریقوں سے ستر 70 مرتبہ ذکر ہے، پہلا طریقہ اللہ تعالیٰ کیساتھ تخصیص ہے۔ 27 جگہوں میں بطور اخبار جیسا کہ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ توبہ 12 ، علی اللہ توکلنا اعراف، 89 عليه يتوكل المتوكلون زمر 38 امر غائب کے طور پر جیسے کے آل عمران 160 میں ہے اور امر مخاطب کے طور پر جیسا کہ آلعمران 159۔ دوسرا طریقہ اللہ تعالیٰ کی صفت (وکیل) اثبات کے طور پر 15 مرتبہ اور نفی کے طور پر نبی ﷺ سے خصوصاً اور غیراللہ سے عموماً انعام 107، 66، اسراء 86، 68، اور تیسرا طریقہ ایمان والوں کی صفت کے طور پر ہے انفال 2، نحل 99-42 چوتھا طریقہ کفایت یعنی اللہ تعالیٰ کی وکالت کافی ہے احزاب 3 نساء 81،109،132،171 اور پانچواں طریقہ غیر اللہ کی وکالت سے نہی اسراء 2۔ چھٹا طریقہ ترغیب کیساتھ آلعمران 159۔ ساتواں طریقہ ایمان والوں اور اسلام کے تقاضے کے طور پر مائدہ 33، یونس 84۔ فائدہ (2): وکالت کسی دوسرے کو کام حوالے کرنا ہے اور کبھی حفظ کو بھی کہا جاتا ہے اور عرف میں اس چیز کو سونپنا ہے کہ اس کی اچھی تدبیر اور تصرف پر اعتماد کیا جاسکتا ہو اور ابن فارس نے کہا ہے کہ وکالت عجز کا اظہار ہے اور کسی دوسرے پر اعتماد کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا حقیقتاً اس پر اعتماد کرنا اور یقین کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ضرور پورا ہوتا ہے اور نبی ﷺ کی سنت میں اسباب کے ذریعے سے اتباع میں کوشش کرتے ہیں لیکن اس شرط پر کہ اسباب پر اعتماد نہیں ہیں بلکہ مسبب الاسباب کی طرف نظر کرتے ہیں اور امام فراء نے مَعَالِمُ التَّنْزِيْلِ میں کہا ہے کہ توکل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو اپنے لئے مددگار نہیں بناتے ہیں اور رزق کیلئے کسی اور کو اختیار مند نہیں سمجھتے ہیں اور اپنے عمل کیلئے کسی اور کو حاضر نہیں جانتے اور سہل بن عبداللہ تستری سے روایت ہے کہ جو کہتا ہے کہ توکل اسباب چھوڑنے کو کہا جاتا ہے تو اس شخص نے نبی ﷺ کی سنت پر اعتراض کردیا اسلئے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے اسباب کی طرف ترغیب دی ہے اور یہ توکل عام مؤمنوں سے مطلوب ہے تو جو لوگ اسباب بالذات مؤثر سمجھتے ہیں اور

اسباب بنانے والے کی طرف نظر نہیں کرتے تو وہ دھری اور مشرک ہیں اور خواص کا توکل یہ ہے کہ اسباب کے باوجود اسباب کی طرف کچھ نظر نہیں کرتے ہیں بلکہ صرف اللہ تعالی پر اعتماد کلی کرتے ہیں تو یہ توکل انبیاء علیہم السلام اور صدیقین کا ہے اور غزوہ تبوک میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے واقعے کی دلیل ہے کہ اسنے اپنے گھر میں کوئی سبب نہیں چھوڑا تھا یعنی گھر کا سارا سامان جہاد کیلئے لے آیا تھا اور کہا تھا کہ میں نے گھر میں صرف اللہ تعالی اور رسول اللہ ﷺ کی محبت چھوڑی ہے اور اس تقسیم کی طرف امام بخاری نے بھی اشارہ کیا ہے۔ (ترمذی حدیث 3684 دارمی ابوداود کتاب الذکوۃ حدیث 1678 قال الشیخ الالبانی حسن)

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ "اور تحقیق مدد کی ہے تمہارے ساتھ اللہ تعالی نے جنگ بدر میں حالانکہ تم کم اور کمزور تھے پس تم اللہ تعالی سے ڈورتا کہ تم شکر ادا کرو" [123]

تفسیر 123: ان آیتوں میں غزوہ بدر کا ذکر ہے ایک قسم کا ربط پہلے کیساتھ ذکر ہوا ہے اور دوسرا ربط وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ کیساتھ یہ ہے کہ توکل علی اللہ کے نتیجے میں جنگ بدر میں نصرت اور فتح حاصل ہوئی ہے اور اس مناسبت کی وجہ سے عطف کیا ہے۔ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ غزوہ بدر اسلام میں وہ پہلا غزوہ ہے جو سترہویں رمضان جمعہ کے دن ہجرت کے اٹھارہ مہینے بعد واقع ہوا ہے یعنی اُحد کے واقعہ سے تقریباً ایک سال پہلے اور اس کی تفصیلات سورۃ انفال میں ذکر ہیں اور نصرت اس میں بہت سارے طریقوں سے واقع ہوئی ہے یعنی ملائک کے بھیجنے اور کافروں کے دلوں میں رعب ڈالنے کے ذریعے سے اور کافروں کی آنکھوں میں کنکریاں پھینکنا اور نعاس (اونگھ) بھیجنا اور بارش برسانا اور غنیمت حاصل کرنا۔ بدر پانی کے (کنواں) کا نام ہے اور امام شعبی نے کہا ہے کہ پانی کا یہ کنواں جھینہ قبیلے کے ایک شخص کا تھا جس کا نام بدر تھا تو مکان اس کے نام پر مُسمّٰی کیا گیا اور بعض نے کہا ہے کہ یہ بدر کے کنویں کا پانی (چودھویں کے چاند) کی طرح صاف تھا اور بدر میں (با) فِیْ کے معنی میں ہے۔ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ یہ جملہ حالیہ ہے اَذِلَّةٌ ذلیل کی جمع ہے جمع قلت میں سے ان کی زیادہ قلت کی طرف اشارہ ہے۔ سوال: سورۃ منافقوں 8 میں ہے کہ مومنوں کیلئے عزت ہے تو یہاں پر ذلت کا کیا معنی ہے؟ جواب: اس سے مراد تعداد کا کم ہونا ہے (کہ تین سو تیرہ آدمی تھے) اور اسلحہ مال اور سواری کی کمی تھی اور یہ سورۃ انفال میں ذکر ہے مؤرخین نے فرمایا ہے کہ صحابہ کرام کیساتھ ایک خچر تھا اور اونٹوں پر باری باری سوار ہوتے اور 77 مہاجرین افراد تھے دو سو چھتیس (236) افراد انصار تھے۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ اس سے مراد عام تقوی ہے اور خصوصاً نبی کریم ﷺ کیساتھ میدان جہاد میں ڈٹے رہنا۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ پہلی نعمت سے شکر مراد ہے یا آنے والے وقت میں نعمت

کا زیادہ ہونا مراد ہے جو کہ شکر کا سبب ہے اور یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا شرعی تقویٰ کے طور پر ہے صرف شکر اور حمد کے الفاظ مراد نہیں ہیں۔

إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَن يَكْفِيَكُمْ أَن يُمِدَّكُمْ رَبُّكُم بِثَلَاثَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُنزَلِينَ ﴿١٢٤﴾ "اور جب فرمایا آپ نے ایمان والوں سے کیا کافی نہیں ہے تمہارے لئے کہ زیادہ کرے گا تمہیں تمہارا رب تین ہزار ملائکہ سے جو نازل کئے گئے ہونگے" [124]۔

تفسیر 124: یہ محققین مفسرین کے نزدیک غزوہ بدر کے ساتھ متعلق ہے اور إِذْ تَقُولُ نَصَرَكُمُ کیساتھ متعلق ہے اور بعض مفسرین نے اُحد کیساتھ متعلق قرار دیا ہے اور ان کے دلائل سے جوابات تفصیل کیساتھ ابوحیان اور صاحب اللباب نے ذکر کئے ہیں۔ لِلْمُؤْمِنِينَ سے مراد غزوہ بدر کے مجاہدین ہیں۔ أَلَن يَكْفِيَكُمْ أَن يُمِدَّكُمْ رَبُّكُم بِثَلَاثَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ حرف استفہام نفی پر داخل ہے تو اس میں دو قول ہیں۔ پہلا قول ابوحیان کا ہے کہ یہ استفہام انکاری ہے یعنی ایمان والوں کے ضعف کی وجہ سے ملائکہ کی اصل تعداد پر اکتفاء نہیں کیا گیا لہذا یہ لوگ نصرت سے نا اُمیدی کرنے والوں کی طرح اور بلیٰ کیساتھ جواب ملا یعنی یہ مدد کافی ہے اور اس کو کافی سمجھا اور دوسرا قول ابن عطیہ کا ہے کہ یہ استفہام تقریری ہے یعنی ان کے عقیدہ کے مطابق تعداد مدد کیلئے کافی ہے اور بلیٰ کا لفظ متکلم (اللہ تعالیٰ) کی طرف سے جواب اس امداد کے اثبات اور تاکید کیلئے ہے یہ بعد والا قول بہتر ہے۔ بِثَلَاثَةِ آلَافٍ پہلے تو ہزار ملائکہ کا وعدہ ہوا تھا جیسا کہ سورۃ انفال 9 میں ہے پھر دو ہزار اور پھر یہ تین ہزار ہو گئے پھر دو ہزار اور یہ پھر پانچ ہزار ہو گئے اس کو إِدْخَالُ النَّاقِصِ فِي الزَّائِدِ (کم تعداد کو زیادہ تعداد میں داخل کرنا) کہا جاتا ہے اور یہ قول بہتر ہے۔ مُنزَلِينَ صفت یا حال ہے اور بہتر قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہزار ملائکہ کو اتارا تھا اور انہوں نے قتال بھی کیا تھا پھر یہ بات مشہور ہوگئی کہ کرز بن جابر نے مشرکین کی مدد کیلئے تین ہزار اور پھر پانچ ہزار افراد بھیجے ہیں اس پر ایمان والے غمزدہ ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت اور بعد والی آیت کے ذریعے سے مؤمنوں کو تسلی دی لیکن مشرکین کی اور مدد نہیں آئی تھی تو باقی ملائکہ کے بھیجنے کا سبب ہی ختم ہوا۔

بَلَىٰ ۚ إِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُم مِّن فَوْرِهِمْ هَٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُم بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ ﴿١٢٥﴾

"البتہ اگر تم نے صبر کر لیا اور تقویٰ اختیار کر لیا اور آئیں یہ لوگ تمہارے پاس اپنے جوش سے یہ ہے زیادہ کرے گا تمہیں تمہارا رب پانچ ہزار ملائکہ (کی مدد) سے کہ جنگ کے نشانے لگائے ہوئے ہونگے" [125]۔

تفسیر 125: بَلٰی یہ ایجاب ہے اس نفی کیلئے جو اَلَنْ یَّکْفِیَکُمْ میں ہے اس کی بحث پہلے گزر چکی ہے۔ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا یہاں پر صبر سے مراد دشمن کے مقابلے میں میدان قتال میں ڈٹے رہنا ہے اور تقویٰ سے مراد اپنے آپ کو بزدلی اور ناشکری سے بچانا ہے۔ وَیَاْتُوْکُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ. فَوْرِ اصل میں ہنڈیا کے اُبلنے کو کہتے ہیں اور یہ سرعت اور جلد بازی کرنے کیلئے بھی ہوسکتا ہے اور کبھی غضب اور غصے کو بھی کہا جاتا ہے لیکن یہاں پر فَوْرِ سے مراد مشرکین کا فوراً اور بہت جلدی آنا ہے یا غصے اور جوش میں آنا ہے اور ان مشرکین کا غضب بدر میں شکست کھانے کیوجہ سے پیدا ہوا تھا اور ھٰذا کا لفظ سرعت کی تاکید کیلئے ہے نزدیک ہونے کیلئے اور یہ شرط اس وجہ سے لگائی کہ ایسے وقت میں مدد کے آنے کی بہت ضرورت ہوتی ہے اور جب بعد والی شرط موجود نہ ہو تو مدد بھیجنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ یُمْدِدْکُمْ رَبُّکُمْ یہ شرط کی جزا ہے۔ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ. مُسَوِّمِيْنَ سوم یا سامہ سے لیا گیا ہے یعنی اپنی جانوں اور سواریوں پر نشانیاں لگانے والے ہونگے۔ ایک روایت میں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کی زرد پگڑی تھی اور باقی کی سفید پگڑیاں تھیں (ابن کثیر) اور دوسری روایت میں ہے کہ سب کی زرد پگڑیاں تھیں اور کندھوں کے درمیان شملے لٹکائے تھے۔ امام قرطبی نے فرمایا ہے کہ یہ اس وجہ سے کہ زبیر رضی اللہ عنہ کی اس دن زرد پگڑی تھی اور خچریں کالے اور گھوڑے سفید رنگ کی تھیں یعنی مقداد رضی اللہ عنہ کی خچر کے ساتھ موافق تھا وہ بھی کالا اور سفید رنگ والا تھا یا یہ سوم سے لیا گیا ہے بھیجے گئے کے معنی میں یعنی یہ لوگ اپنے گھوڑے کو دشمن کے مقابلے کیلئے بھیجے۔

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۭ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۙ﴿126﴾

"اور نہیں بنایا (یہ نزول ملائک کا) اللہ تعالیٰ نے مگر خوشخبری ہے تمہارے لئے اور تاکہ مضبوط ہوجائیں تمہارے دل اس کے ساتھ اور نہیں ہے مدد مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کہ غالب حکمت والا ہے" [126]۔

تفسیر 126: اس آیت میں ملائک کے بھیجنے کی حکمتیں ذکر کررہا ہے اور دو سوالوں کے جواب بھی ہیں۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ملائک کے بھیجنے کے بغیر مدد کرسکتا تھا تو معلوم ہوا کہ ملائک بھی مدد کرسکتے ہیں تو یہ دلیل بن گئی کہ غیر اللہ سے مدد مانگنا جائز ہے جواب ہوا ہے کہ۔ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ ضمیر امداد کی طرف راجع ہے ملائک کے بھیجنے کے ذریعے سے جو یُمِدَّکُمْ اور وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُکُمْ بِهٖ یہ استثناء مفرغ ہے اور یا بُشْریٰ مصدر یا اسم مصدر ہے وہ چیز جو خوشی کا اثر ظاہری بدن یعنی چہرے میں ظاہر کرے یہ پہلے اطلاع ملنے کے ساتھ خاص نہیں ہے جیسا کہ یہ صفت قرآن کے بارے

میں ہے کہ ہر وقت ایمان والوں کیلئے خوشی کا سبب ہے۔ وَلِتَطْمَئِنَّ پہلا قول یہ ہے کہ بُشْرٰی کے معنی پر عطف ہے تو بُشْرٰی ظاہر کی صفت ہے اور اطمینان پیدا کرنا دل کی صفت ہے۔ سوال: معطوف علیہ میں لام کیوں داخل کیا؟ جواب: معطوف کے نصب کیلئے (بغیر لام کے) فاعل کا ایک ہونا شرط ہے اور یہاں پر جَعَلَ کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے اور تَطْمَئِنَّ کا فاعل قلوب ہے اسی وجہ سے عطف کو جائز کرنے کیلئے لام اس میں داخل کر دیا ہے اور امام رازی نے فرمایا ہے کہ امداد میں دو مطلوبات ہیں پہلا دلوں میں خوشی داخل کرنا یہ لفظ بُشْرٰی میں ہے اور دوسرا مطلوب اس سے بڑا ہے جو کہ اطمینان کا حصول ہے بزدلی کے ختم کرنے کیلئے تو یہ بڑا مقصد ہے اس وجہ سے اس کیلئے مستقل لام داخل کر دیا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ پوشیدہ فاعل کیساتھ متعلق ہے یعنی فَعَلَ ذٰلِكَ لِتَطْمَئِنَّ۔ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ یہاں پر نصرت سے مراد غلبہ اور فتح دینا ہے یہ اسباب پر بنا نہیں ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ حصر قرار دیا العزیز عزت سے لیا گیا ہے غلبہ کے معنی میں ہے تو اس جگہ کیساتھ مناسب ہے اور الحکیم میں اشارہ ہے کہ کبھی مدد کرتا ہے اور کبھی نہیں کرتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت پر بنا ہے۔ فائدہ: اس قسم کی آیتیں سورۃ انفال 9 اور 10 بھی ہیں لیکن چند وجوہات کیساتھ فرق ہے پہلا یہ کہ وہاں پر مردفین کہا ہے اور یہاں پر مُنْزَلِيْنَ اور مُسَوِّمِيْنَ ہے دوسرا یہاں پر بُشْرٰی کیساتھ لَكُمْ ذکر ہے اور وہاں نہیں ہے تیسرا یہاں پر بِہٖ لفظ بعد میں لایا ہے اور سورۃ انفال میں پہلے ذکر ہے چوتھا یہاں پر الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ صفت کے طور پر ذکر ہے اور وہاں پر جملہ مستانفہ کے طور پر ذکر کیا ہے اس کی حکمتیں یہ ہیں پہلے فرق کی وجہ یہ ہے کہ ایک ہزار ملائکہ تو نازل ہو گئے لیکن پیچھے اوروں کے بھیجنے کی خبر تھی اور ارداف پیچھے والوں پر دلالت کرتا ہے۔ دوسرے فرق کی وجہ یہ ہے کہ سورۃ انفال میں قصے کا اصل ذکر ہے اور اس سورۃ میں اس کے مقصد کی تکمیل ہے تو اصل کیساتھ اختصار مناسب ہوتا ہے تو لَكُمْ ذکر نہیں کیا ہے۔ تیسرے فرق کی وجہ یہ ہے کہ یہاں پر خطاب لَكُمْ ذکر ہوا ہے تو قُلُوْبُكُمْ میں خطاب اس کے ساتھ متصل مناسب ہے اور اس سورۃ میں خطاب ذکر نہیں تھا تو بہٖ کو پہلے لایا ہے۔ چوتھے فرق کی وجہ یہ ہے کہ جب ادھر مکرر خطاب ہو گیا تو اس میں تسلی کے الفاظ (جو الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ہے) جلدی ذکر کرنا مناسب ہے اور وہاں پر خطاب تاکید کا نہیں تھا تو جملہ مستانفہ کے ذریعے سے تاخیر سے ذکر کیا۔ (واللہ اعلم بحکم کتابہ)

لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ ”تا کہ کاٹ لے ایک ٹکڑا ان لوگوں میں سے جنہوں نے کفر کیا یا انکو ذلیل کرے پس وہ واپس نا امیدی کرتے ہوئے پلٹ جائیں“ [127]۔

تفسیر 127: گزشتہ حکمتیں مومنوں کی ذات کیساتھ تعلق رکھتی ہیں اور اس آیت میں حکمتیں دشمنوں کیساتھ تعلق رکھتی ہیں اور مومنوں کیلئے بالواسطہ بشارت ہے۔ لِيَقْطَعَ یہ نَصَرَ كُمُ اللهُ یا مَا النَّصْرُ یا جَعَلَ یا يُمْدِدْ كُمْ کیساتھ متعلق ہے یا اس کا متعلق پوشیدہ ہے یعنی اَمَدَّ كُمْ وَنَصَرَ كُمْ لِيَقْطَعَ قطع ہلاک کرنے یا گرانے کے معنی میں ہے۔ طَرَفًا جماعت، گروہ اور ٹکڑا مراد ہے یہ ستر افراد کافر تھے جو بدر میں قتل کئے گئے ہیں اس لفظ میں ایک اشارہ ہے کہ تمام کافر کفر میں ایک ہیں اور یہ ان میں سے ایک طرف اور ایک گروہ ہے اور ان کی طرف اشارہ ہے سورۃ رعد آیت نمبر 41 (نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا) میں دوسرا اشارہ ہے کہ کسی جماعت میں اس وقت تک اندر داخل نہیں ہوسکتا جب تک ان کے افراد قتل نہ ہوں۔ أَوْ يَكْبِتَهُمْ۔ كَبت میں بہت اقوال ہیں شکست لعنت اوندھے منہ گرانا شرمادینا غصہ کرنا ذلیل کرنا۔ أَوْ کا لفظ تنویع کیلئے ہے یعنی ایک قسم کو قطع کردیا اور ایک قسم کو ذلیل اور مغلوب کردیا یا أَوْ واو کے معنی میں ہے اور یہاں پر تمام کافروں کی طرف ضمیر راجع ہے اس وجہ سے یہ واقعہ تمام کافروں کی ذلت کا سبب ہے اور قطع خاص ہے ایک جماعت کیساتھ تو اس کے ساتھ طرفاً ذکر کیا۔ فَيَنْقَلِبُوا خَائِبِينَ يَكْبِتَهُمْ کی تشریح ہے خیبت وہ نا امیدی اور محرومی ہے جو توقع اور امید کے بعد پیدا ہوتی ہے اور یہ عام ہے چاہے توقع کے بعد ہو یا اس سے پہلے تو خَيْبَتْ کا مقابل ظَفَرْ ہے اور اس کا مقابل رَجَاءْ ہے یہاں پر خیبت ذکر کیا اس وجہ سے کہ جنگ بدر میں کافروں کی اپنے غلبے کیلئے بڑی امیدیں تھیں جن کی طرف سورۃ انفال 47 میں اشارہ ہے۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ ﴿١٢٨﴾ "آپ کے لئے ان کاموں میں سے کچھ اختیار نہیں ہے یا تو اللہ تعالیٰ ان پر ایمان کی توفیق کی ساتھ مہربانی کرے گا یا ان کو عذاب دے گا بیشک یہ لوگ ظالم ہیں [128]"

تفسیر 128: یہ اُحد کے واقعہ کیساتھ متعلق ہے اور درمیان میں بدر کا واقعہ جملہ معترضہ کے طور پر ہے اور اس کے سبب میں اختلاف ہے پہلی روایت یہ ہے کہ غزوہ اُحد میں عتبہ بن ابی وقاص نے نبی ﷺ کا سر مبارک زخمی کیا اور رباعی دانت کو شہید کیا اور اپنے چہرہ مبارک سے خون صاف کر رہے تھے اور فرما رہے تھے (كَيْفَ يُفْلِحُ قَوْمٌ خَضَبُوا وَجْهَ نَبِيِّهِمْ بِالدَّمِ وَهُوَ يَدْعُوهُمْ إِلَى رَبِّهِمْ) کس طرح کامیاب ہوگی وہ قوم جنہوں نے خون سے رنگ دیا اپنے نبی کا چہرہ مبارک اور وہ ان کو ان کے رب کی طرف دعوت دیتا ہے (صحیح بخاری حدیث 4076، صحیح مسلم مسند بزار حدیث

6590، صحیح ابن ماجہ 4027)۔ دوسری روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے معین اشخاص پر لعنت فرمائی ہے (ابو سفیان، حارث بن ہاشم، صفوان بن امیہ) تو یہ آیت نازل ہوئی۔ تیسری روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے بئر معونہ کے واقعہ میں خاص قبیلوں پر لعنت کی رِعْل ذَکْوَان اور عُصَیَّة تھے بئر معونہ کے واقعہ میں یہ آیت نازل ہوئی اور ان دونوں روایتوں میں ثابت ہے کہ نبی ﷺ یہ دعائیں دوسری رکعت کے رکوع کے بعد صبح کی نماز میں پڑھتے تھے اور اس کو قنوت نازلہ کہا جاتا ہے تو ان تمام کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی کہ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4560 صحیح ترمذی کتاب التفسیر حدیث 3004 یعنی ان لوگوں کی توبہ یا عذاب کا اختیار آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے یا ان کی گمراہی اور ہدایت کا اختیار آپ کو نہیں ہے یا امداد کرنے کا اختیار آپ کے پاس نہیں ہے یا عام مراد ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے کاموں اور تصرفات میں آپ کو اختیار نہیں تو یہ نبی ﷺ سے شرک فی التصرف کا رد ہے اور ان لوگوں کا رد ہے جو نبی ﷺ کو مختار کل قرار دیتے ہیں۔ سوال: وہ امر کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں نبی ﷺ کو منع کیا ہے اگر وہ اللہ تعالیٰ کے امر کیساتھ ہے تو اس سے منع کیسے ہوا اور اگر اللہ تعالیٰ کے امر کے بغیر ہو تو پھر اس آیت وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى کیساتھ مخالفت لازم آتی ہے؟ جواب (1): ایک شخص کے منع کرنے سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ وہ شخص اس کام میں ضرور مشغول ہوگا۔ یہاں پر بھی صحیح بات یہ ہے کہ نبی ﷺ نے یہ کام نہیں کیا ہے صرف غم اور غصہ ظاہر کیا ہے اور اس کام کا ارادہ کیا تو یہ روایات ارادے کی تاویل پر محمول کی جائیں گی (لیکن احادیث کے ظاہر سے یہ تاویل بعید ہے)۔

جواب (2): نبی ﷺ نے اس کام کی اجازت اللہ تعالیٰ سے طلب کی تو اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کر دیا (لیکن یہ جواب بھی احادیث کے ظاہر کیخلاف ہے) یہ سوال وجواب صاحب اللباب نے ذکر کئے ہیں۔ جواب (3): نبی ﷺ نے یہ اپنے اجتہاد سے کیا ہے اور ایسے حال میں نبی کا اجتہاد کرنا جائز اور واقع ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس جملے کیساتھ اس کو منسوخ کیا۔ سوال: نزول کے سبب میں بخاری اور مسلم کی حدیث دلالت کرتی ہے کہ قنوت پڑھنا منسوخ ہے حالانکہ اس کے بعد بھی نبی ﷺ اور سلف صالحین نے قنوت نازلہ پڑھی ہے۔ جواب (1): اس قنوت میں اشخاص کے ناموں اور قبیلوں کی تخصیص ہے تو وہ تخصیص منسوخ ہوگئی اور عموم کے طور پر (لفظ مشرکین، کافرین، یہودی ونصاریٰ اور ہنود وغیرہ) کہنا سنت ہے۔ جواب (2): ابن عاشور نے کہا ہے کہ یہ قول بہت غریب ہے بعض اس آیت کے بارے میں نسخ کا قول پیش کرتے ہیں اور ابن عطیہ سے نقل کیا ہے کہ یہ ضعیف قول ہے اور حدیث بخاری کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد قنوت خاصہ کو کمال ادب پر عمل کرنے کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا (اس جواب کا انداز پہلے جواب کی طرح ہے)۔

اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اس میں اقوال ہیں پہلا قول کہ یہ اَوْ اِلٰی اَنْ یا اِلَّا اَنْ کے معنی میں ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ لِيَقْطَعَ اور يَكْبِتَهُمْ پر عطف ہے کہ یہ نصرت الٰہیہ کی علتیں ہیں اور لَيْسَ لَكَ یہ درمیان جملہ معترضہ ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ الْاَمْرِ یا شَیْءٌ پر ہے یہ بھی اسم جنس کی تاویل میں ہے لیکن پہلا قول بہتر ہے اور يَتُوْبَ سے مراد بعض کو توبہ کی توفیق دینا ہے جیسا کہ ابوسفیان اور حارث بن ہشام کو اسلام کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ اس سے مراد دنیاوی یا اخروی عذاب ان لوگوں کیلئے ہے جو کفر سے توبہ نہیں کرتے ہیں۔ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ یہ يُعَذِّبَهُمْ کیلئے علت ہے اور ظلم سے مراد کفر اور شرک پر مضبوط رہنا ہے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾

"اور خاص اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں وہ چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور وہ چیزیں جو زمین میں ہیں معاف کرتا ہے جس کو چاہے اور عذاب دیتا ہے جس کو چاہے اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے" [129]۔

تفسیر 129: یہ پہلی آیت کی تاکید ہے وہاں پر نبی ﷺ کی جانب سے نفی ذکر کی تو یہاں پر توحید فی التصرف کے اثبات کیلئے ذکر کر رہا ہے۔ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ لام کا حرف مِلْك اور مُلْك اور عبدیت کا ہے اور پہلے لانا تخصیص پر دلالت کرتا ہے اور (مَا) کا لفظ ذوی العقول اور غیر ذوی العقول کیلئے عام ہے۔ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ اس جملے میں تصرف کی تعمیم کے بعد اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادے کی تعمیم ذکر ہے اور یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بندے کی اطاعت پر جنت اور مغفرت دینا واجب نہیں ہے اور بندے کی معصیت کی وجہ سے عذاب دینا واجب نہیں ہے لیکن قانون الٰہی یہ ہے کہ ملائکہ اور انبیاء علیہم السلام کو بالکل عذاب نہیں دیتا اور مومنوں کو ہمیشہ عذاب نہیں دیتا اور مشرکوں اور کافروں کو معاف نہیں کرتا۔ وَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ اس جملے کا ذکر رحمت کی جانب پر دلالت کرتا ہے جو کہ غضب پر غالب ہے۔

یہاں سے آخر سورۃ تک چوتھا حصہ ہے اس حصے میں تین ابواب ہیں پہلا باب آیت 180 تک ہے ۔اس باب میں ان اوصاف وآداب کا ذکر ہے جس کے ذریعے سے مستقبل میں ہزیمت (شکست) سے بچا جاسکے (اس کو امور تہذیب الاخلاق کہتے ہیں) یہ امور تقریباً 31 ہیں۔ان میں سے چھ (6) اوامر ہیں جو ان آیتوں میں ہیں آیت 130 میں اِتَّقُوا اللّٰہَ آیت 131 میں اِتَّقُوا النَّارَ آیت 132 میں أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ آیت 133 میں سَارِعُوْا آیت 166 میں فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ آیت 175 خَافُوْنِ اور چھ نواہی (ممنوعات) ہیں جن کا ذکر ان آیات میں ہیں لَا تَأْكُلُوا الرِّبٰوا آیت 130 ،لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا آیت 149 ،اِنْ تُطِيْعُوْا (اس سے مراد نہی ہے) آیت 149 ،لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا 156 ،فَلَا تَخَافُوْهُمْ آیت 175 ،اور اس میں (19) انیس صفات واخلاق ذکر ہوئے ہیں ۔چار صفات آیت 134 میں ہیں تین صفات آیت 135 میں اور آیت 144 میں وفات النبی ﷺ کا عقیدہ ذکر ہے اپنی طبعی موت سے وفات آیت 145 میں ہے چار صفات آیت 146 میں ہیں اور سبقت کرنے والوں کی دعا آیت 147 میں ہے۔ نبی کریم ﷺ کی صفات پر ایمان آیت 161 میں ہے جبکہ اللہ تعالی کا احسان تسلیم کرنا آیت 164 میں ہے اور عظمت شہداء کا عقیدہ آیت 169 میں ہے۔ اللہ اور رسول ﷺ کا حکم فوری ماننے کا ذکر آیت 172 میں ہے اور صحابہ کرام کے اقوال کی پیروی کرنا آیت 173 میں مذکور ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ اس باب میں منافقین کے ایک شبہ کا جواب ہے ان کا شبہ اُحد کی شکست سے متعلق تھا اس کا جواب تیرہ (13) علتوں (اسباب) سے دیا گیا ہے آیت 141,140، 142، 143، 152، 165، 166، اور 167 میں ۔تیسری بات یہ ہے کہ اس میں منافقین کی صفات کا ذکر ہے آیت 154، 167 اور 168 ۔چوتھی بات اس میں رسول اللہ ﷺ کی عظمت شان کا ذکر ہے آیت، 159، 161 اور 164 اور شہداء کرام کی عظمت شان آیت 169، 170 اور 171 میں ہے۔ اور وہ صحابہ کرام جو غازی اور زخمی ہو کر پلٹ آئے تھے۔ ان کی شان آیت 172. 173 اور 174 میں ہے۔ پانچویں بات آیت 178، 179 میں سوالات کے جوابات ذکر ہیں اور بخیل قسم کے لوگوں کو آیت 180 میں زجر وتنبیہ کی گئی ہے۔ (ربط) ابن عطیہ نے اس کے ربط میں سکوت کیا ہے جبکہ ابوحیان نے فرمایا ہے کہ اس کا ربط کئی وجوہ سے ہیں (1) یہ لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ سے متعلق ہے چونکہ یہود سود کا معاملہ کثرت سے کرتے ہیں تو اس آیت میں منع کیا گیا تاکہ یہود اور منافقین سے دوستی اور تعلق کا سبب نہ بنے۔ (2) جب نصرت کا وعدہ ذکر کیا گیا تو اب اس وعدے کے حصول کیلئے آدب کا ذکر ہے اور اس میں اہم آداب یہ

ہیں کہ سود سے اجتناب کرو۔ امام قرطبی نے فرمایا ہے کہ اگر تم سود نہیں چھوڑ و گے تو شکست اور قتل تمہارا مقدر ہوگا۔ (3) جب یہ بات ذکر ہوئی کہ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ الخ تو اب یہ بتایا جاتا ہے کہ تمہیں اپنے مالوں میں اختیارات نہیں ہیں بلکہ اذن الٰہی ضروری ہے لہٰذا سود میں مال صرف کرنا منع ہے۔ (4) امام قاسمی اور امام بقاعی نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ عمرو بن اقیش رضی اللہ عنہ کی دور جہالت میں لوگوں پر سود کی رقم باقی تھی تو وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس رقم کو وصول کرلے سے قبل ایمان لے آئیں لہٰذا مدینۃ الرسول میں آکر آواز دی کہ میرے چچازاد بھائی کہاں ہیں؟ تو بتایا گیا کہ وہ تو اُحد میں ہیں پھر کہا فلاں فلاں شخص کہاں ہے؟ کہا گیا وہ بھی اُحد میں ہے۔ انہوں نے اپنا جنگی لباس پہن کر گھوڑے پر سوار ہوکر احد کا رخ کیا جب وہاں پہنچے تو مسلمانوں نے کہا کہ ہمارے قریب نہیں آنا۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں مسلمان ہوا ہوں تو پھر قتال میں مصروف ہوئے یہاں تک کہ زخمی ہوئے اور بالآخر زخموں کی تاب نہ لاسکے حتی کہ شہید ہوگئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو جنت عطا کی (حدیث 2537 ابوداؤد کتاب الجہاد باب فِيمَنْ يُسْلِمُ وَ يُقْتَلُ مَكَانَهُ) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ یہ وہ شخص ہے کہ جس نے نماز نہیں پڑھی مگر جنت میں داخل ہوگیا لہٰذا اس مناسبت سے یہاں ربوا سے منع ذکر ہوا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾

"اے ایمان والو دگنا چوگنا سود مت کھاؤ اور تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو تا کہ فلاح پاؤ [130]۔

تفسیر 130: سود سے اجتناب ایمان کا تقاضا ہے اس لئے ایمان کو مقدم یعنی يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے شروع کیا گیا ہے۔ فائدہ: سورۃ بقرہ میں سود کی آیتیں اس کے بعد نازل ہوئی ہیں جیسا کہ امام بخاری نے فرمایا ہے کہ نزول میں وہ قرآن کی آخری آیتیں ہیں اس لئے یہاں پر دگنے چوگنے کی قید لگائی ہے جبکہ وہاں سود سے مطلق منع فرمایا ہے "اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً" یہ قید مزید اظہار نفرت (قباحت) کیلئے لگائی ہے۔ ان لوگوں کے سود دینے کا طریقہ یہ تھا کہ جیسے دس روپیہ کسی کو وقت مقرر کرکے دیتے اب اگر وہ مقررہ وقت پر رقم ادا نہیں کرتا تو مزید دس روپیہ بڑھا دیتے اور اس ترتیب سے بڑھاتے رہتے یہاں تک کہ سود اصل رقم سے دگنا ہوجاتا۔ اضعاف ضُعْف کی جمع قلت ہے اور ضعف (مماثل) برابر (مساوی) کو کہا جاتا ہے لہٰذا دس کا دگنا بیس (20) ہے تین گنا اضعاف چالیس (40) ہیں۔ مُّضٰعَفَةً یعنی جیسے جیسے قرض کی مدت بڑھتی ہے تو سود خود رقم بڑھاتا جاتا ہے لہٰذا اضعاف سے مراد مال بڑھانا ہے اور مُّضٰعَفَةً سے مراد وقت بڑھانا ہے۔ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ چونکہ سود

کی بنیاد نفس کا لالچ ہے اور اس کا علاج صرف تقویٰ میں ہے اور سود دیگر حرام خوری کیلئے دروازہ ہے اس لئے فرمایا کہ تقویٰ ہی سبب فلاح ہے۔

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيٓ أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِينَ ﴿١٣١﴾

"اور (حرام سے اجتناب کرتے ہوئے) جہنم کی اس آگ سے بچ جاؤ جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے" [131]۔

تفسیر 131: حرام کو حلال قرار دینے سے اجتناب کرو یہ تقویٰ ہے ورنہ تو یہ سبب کفر ہے اس لیئے لِلْکٰفِرِیْنَ فرمایا گیا ہے۔ النَّارَ میں دو قول ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ الف لام اس میں جنسی ہے یعنی ایسی آگ نہیں ہے جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے یعنی اس سے کم ہے۔ اگرچہ اسی کی ایک قسم ہے دوسرا قول یہ ہے کہ یہ الف لام عہدی ہے یعنی وہ آگ جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے وہی سود خوروں کیلئے بھی ہے اس قول کے مطابق سود خوروں کیلئے یہ سخت وعید ہے۔ مفسر قاسمی نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ قرآن مجید میں وعید کے اعتبار سے یہ آیت بہت سخت ہے اس لیئے کہ ایمان والوں کو کافروں کی سزا سنائی گئی ہے۔

وَأَطِيعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿١٣٢﴾

"اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے" [132]۔

تفسیر 132: یہ سابقہ آیت کے مقابل ہے اس میں عذاب کا سبب ذکر ہوا ہے جبکہ اس آیت میں رحمت کا سبب (عذاب سے بچنا) ذکر کیا ہے جو کہ تمام احکامات میں اور خاص کر ربوا کے احکامات میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ سود کی تفصیل سنت رسول ﷺ سے سیکھ لو اور اس کی پیروی کرو۔

وَسَارِعُوٓا إِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ ﴿١٣٣﴾

"اپنے رب کی مغفرت اور جنت کی طرف جلدی کرو جس کی (چوڑائی اور وسعت) آسمانوں اور زمینوں سے زیادہ ہے اور متقین کیلئے تیار کی گئی ہے" [133]۔

تفسیر 133: اطاعت کے حکم کے بعد اب جلدی کرنے کا حکم ہے کہ اس اطاعت کے فائدے جلدی سمیٹو (مسارعت کا معنیٰ گزر چکا ہے) وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ یعنی سَارِعُوْا اِلٰی اَسْبَابِ الْجَنَّۃِ وَالْمَغْفِرَۃِ اس میں بہت سے اقوال ہیں: (1) سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس سے مراد اخلاص ہے (2) سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا قول

ہے کہ اس سے فرائض کی ادائیگی مراد ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اس سے مراد اسلام ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ مراد باجماعت تکبیر اولی کے ساتھ نماز ہے۔ یہ قول مکحول رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ مراد اطاعت ہے عکرمہ کا قول ہے کہ اس سے مراد توبہ ہے ابوالعالیہ کا قول ہے کہ اس سے مراد ہجرت ہے ضحاک کا قول ہے کہ اس سے مراد جہاد ہے۔ یمان کے نزدیک پانچ نمازیں مراد ہیں۔ بقول مقاتل اعمال صالح مراد ہیں لیکن یہ تخصیص کے ساتھ مراد نہیں ہے بلکہ اللہ ورسول ﷺ کی اطاعت اور تقویٰ (جو پہلے گزر چکے ہیں) ان تمام امور کو شامل ہے۔ مَغۡفِرَةٍ کے ساتھ مِّن رَّبِّكُمۡ عظمت کیلئے ذکر کیا ہے چونکہ اجر وثواب سے پہلے مغفرت ہونی چاہئے اس لیئے اس کو پہلے ذکر کیا ہے یعنی مغفرت کو جنت پر مقدم کیا ہے۔ وَجَنَّةٍ اس سے مراد جنس جنت ہے اس لیئے جمع ذکر نہیں کیا۔ عَرۡضُهَا ٱلسَّمَٰوَٰتُ وَٱلۡأَرۡضُ عرض چوڑائی کو کہا جاتا ہے جو لمبائی کے مقابل ہوتی ہے اور لمبائی ہمیشہ چوڑائی سے زیادہ ہوتی ہے لہذا جب چوڑائی آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہے تو لمبائی کا تو ہم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ بقول امام قرطبی یہ جمہور کا قول ہے یا پھر چوڑائی کسی چیز کی وسعت کو کہا جاتا ہے اور آسمان وزمین مثل قبہ کے ہے اور اس کی لمبائی چوڑائی برابر ہوتی ہے (ابن کثیر) ٱلسَّمَٰوَٰتُ وَٱلۡأَرۡضُ سورۃ حدید آیت 21 سے پتا چلتا ہے کہ یہاں مضاف مقدر ہے یعنی آسمانوں وزمینوں کے مثل۔ اس میں دو قول ہیں: (1) پہلا قول ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا گیا ہے کہ سات آسمانوں اور زمینوں کو کپڑے کے ٹکڑے کی طرح آپس میں جوڑا جائے اور ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر چوڑائی بنائی جائے تو یہ جنتوں کی چوڑائی ہے اور یہ تشبیہ حقیقی ہے۔ (2) دوسرا قول یہ ہے کہ تشبیہ تمثیلی اور مجازی ہے یعنی انسانوں کے علم میں بڑی چیزیں زمین وآسمان ہیں تو اسی طرح آسمانوں اور زمینوں کی طرح جنت بھی وسیع ہے۔ سوال: امام قرطبیؒ نے سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ یہ ساتوں زمین وآسمان اللہ تعالیٰ کی کرسی کی (بنسبت) ایسے ہیں جیسا کہ ایک روپیہ یعنی دینار یا درہم کو بہت بڑے صحرا میں ڈال دیا جائے اور کرسی بھی عرش کے مقابل ایسی جیسے لوہے کی ایک کڑی صحرا میں ڈال دی جائے اور صحیح بخاری کتاب بدء الخلق حدیث 3251 میں ہے کہ گھوڑا سوار جنت کے ایک درخت کے سائے میں (100) سو سال سفر کرے تو سایہ ختم نہیں ہوگا اس طرح سے اور احادیث اس مضمون میں آتی ہیں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جنتیں تو آسمانوں اور زمینوں سے بہت بڑی ہیں؟ جواب: جب چوڑائی، لمبائی کے بالمقابل مراد لی جائے تو یہ سوال باقی نہیں رہتا ہے اور جب تشبیہ مجازی وتمثیلی ہو تو تب بھی یہ سوال ختم ہو جاتا ہے کیونکہ جنت کی اندرونی وسعت یا

کرسی اور عرش کی چوڑائی انسانوں کی نظر سے اوجھل ہے۔ سوال: سورۃ نجم آیت 15 میں جنت سدرۃ المنتہیٰ کے پاس ثابت کی گئی ہے اور حدیث معراج میں ثابت ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ ساتویں آسمان پر ہے تو جنت اس میں کس طرح آسکتی ہے جبکہ جنت تو بہت وسیع ہے؟ جواب (1): اس پر اللہ تعالیٰ قادر ہے جس طرح ہماری چھوٹی سی آنکھ میں اللہ تعالیٰ آسمانوں کو زمینوں اور پہاڑوں کو سمو دیتا ہے جبکہ آنکھیں ان سے کروڑوں درجہ چھوٹی ہیں لہٰذا یہ اس کیلئے کوئی مشکل اور نامانوس بات نہیں ہے۔ جواب (2): جنت کو اللہ تعالیٰ نے سمیٹ رکھا ہے اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جنتوں کو پھیلا دے گا۔ ابن فورک نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن پہلے والے جواب کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو ابن کثیر قرطبی، ابن عطیہ اور ابن جریر نے نقل کی ہے کہ ہرقل بادشاہ نے ایک قاصد کے ذریعے سے خط بھیجا جس کو سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھ کر سنایا خط کا عنوان یہ تھا کہ جس جنت کی طرف آپ ہمیں دعوت دیتے ہیں اس کی وسعت آسمانوں و زمینوں سے زیادہ ہے تو سوال ہے کہ جہنم کی آگ کہاں ہوگی؟۔ جواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا یا سبحان اللہ جب دن آتا ہے تو رات کہاں جاتی ہے اس روایت کو شیخ شعیب ارناووط نے ضعیف کہا ہے الموسوعۃ الحدیثیۃ 15655 فی تخریج ابن کثیر۔ اور اسی طرح جواب عمر رضی اللہ عنہ نے یہودیوں کے سوال کا دیا تھا۔ ابن کثیر نے فرمایا ہے کہ اس میں دو احتمال ہیں: (1) ایک احتمال یہ ہے کہ جب ہم رات میں رہتے ہیں تو دن نظر نہیں آتا ہے جبکہ دن موجود ہوتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے اور اسی طرح دن کے ہوتے ہوئے رات ہوتی ہے تو مطلب یہ نہیں کہ موجود نہیں ہے اسی طرح جہنم کی آگ وہاں ہوگی جہاں اللہ تعالیٰ چاہے گا بزار فی کشف الاستار 2196، مستدرک حاکم 1،36 صحیح ابن حبان حدیث 103 مجمع الزوائد 6،327 اس روایت کو حاکم نے علی شرط شیخین کہا ہے شیخ زبیر نے صحیح اور علامہ ہیثمی نے فرمایا اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں (2) دوسرا احتمال یہ ہے کہ دنیا میں رات ایک جانب ہوتی ہے اور دن دوسری جانب اسی طرح جنت اعلیٰ علیین میں عرش کے نیچے ہے جس کی چوڑائی آسمانوں و زمینوں کی مانند ہے اور جہنم اسفل سافلین زمینوں سے نیچے ہے اس قول کو امام رازی نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے سورۃ اعراف آیت 50 میں بھی اشارہ ہے إِنْ أَفِيضُوا عَلَيْنَا مِنَ الْمَاءِ۔ واللہ اعلم۔ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ لفظ (اعدا) اور فعل ماضی اس بات کی دلیل ہے کہ جنت پیدا کی گئی ہے۔ اس طرح سورۃ حدید آیت 21 میں ہے البتہ کچھ وجوہات سے دونوں میں فرق ہے: (1) یہاں سَارِعُوا فرمایا اور وہاں بغیر عطف سَابِقُوا فرمایا ہے۔ (2) یہاں مضاف نہیں ہے اور وہاں عطف کے ساتھ حرف تشبیہ بھی ہے

یعنی (کعرض) (3) یہاں أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ہے اور وہاں أُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ہے۔ دونوں میں وجہ فرق یہ ہے کہ پہلے اوامر ذکر ہو گئے یعنی اِتَّقُوْا اَطِيْعُوْا تو اس کی مناسبت سے عطف کرتے ہوئے فرمایا وَسَارِعُوْا نیز یہاں منافقین اور یہود کی عادت سے بچنا مقصود ہے اور بچنے کے لیے سرعت کا استعمال ہوتا ہے اسی طرح یہاں متقین کا ذکر ہے اور ان میں مراتب کا تفاوت نہیں ہوتا کیونکہ وہ ایمان کا اعلیٰ مرتبہ ہے جبکہ سورۃ حدید میں معطوف علیہ بھی نہیں ہے اور یہود اور منافقین کا ذکر بھی نہیں ہے اور سورۃ حدید میں مؤمنین کا ذکر ہے اور ان میں مختلف درجات ہوتے ہیں تو وہاں سَابِقُوْا مناسب ہے۔ دوسرا فرق، چونکہ یہاں تقویٰ وجلدی (مسارعت و تقویٰ) کی وجہ سے بہت ترغیب مقصود ہے اس لیے حرف تشبیہ اور مضاف کو مبالغہ کیلئے حذف کیا گیا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ یہاں اَوَامِرْ وَنَوَاهِيْ یعنی حکم اور منع مراد ہے اس لیے ان کا پورا لحاظ و تکمیل متقی ہی کر سکتے ہیں جبکہ سورۃ حدید میں صرف اہل ایمان کیلئے احکام مذکور ہیں تا کہ منافقین سے امتیاز ہو جائے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا ذکر آیت 7 میں ہوا ہے لہٰذا اس کے ساتھ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ مناسب تھا۔ (واللہ اعلم)

الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

"وہ لوگ جو خوشی اور تنگی میں خرچ کرنے والے ہیں اور لوگوں کو معاف کرنے والے اور غصے کو پی جانے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ (اس طرح) احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے" [134]۔

تفسیر 134: اس آیت میں متقیوں کی تقسیم کا ذکر ہو رہا ہے پہلی قسم اعلیٰ متقین کی ہے جن کی چار صفات ذکر کی گئی ہیں پہلی صفت الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ اس جملے میں چار اقوال ہیں: (1) خوشی اور ناراضی مراد ہے (2) حالات کی تنگی اور وسعت مراد ہے۔ (3) ایسا خرچ جس پر انسانی طبیعت و فطرت خوش ہوتی ہے یا طبیعت پر بھاری ہو۔ (4) صحت اور مرض مراد ہیں۔ (5) اور یہ خرچ عام ہے فرض، نفل اور مستحب سب کو شامل ہے نیز یہ انفاق دعوت اور جہاد میں خرچ کرنے اور حقداروں کو ان کے حقوق لوٹانے کو بھی شامل ہے۔ اس عمومیت میں اشارہ ہے کہ کسی بھی حال میں مالی حقوق سے کبھی نہیں کتراتے ہیں، تنگی و فراخی ہر حال میں مال خرچ کرتے ہیں اور یہ سخاوت نفس کی دلیل ہے۔ دوسری صفت متقیوں کی ہے وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ كَظْمٌ کا معنی مشکیزے کا منہ بند کرنا ہے جب وہ بھرا ہوا ہو۔ غیظ کسی ناپسندیدہ چیز کو دیکھ کر طیش میں آجانا۔ امام قرطبی نے فرمایا ہے کہ كَظْمُ الْغَيْظِ کا معنی ہے قدرت و طاقت رکھنے کے

باوجود غصے کو پی جانا۔ غیض اور غضب میں فرق یہ ہے کہ غضب میں غیر اختیاری طور پر انسان کے چہرے پر آثار ظاہر ہوتے ہیں جبکہ غیظ کے آثار صرف دل پر ہوتے ہیں اور غضب کے ساتھ انتقام کا اثر شامل ہوتا ہے جبکہ غیظ میں انتقام لینے کا ارادہ نہیں ہوتا ہے نیز غیظ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں ہوتی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی طرف غضب کی نسبت اس کی شان کے مناسب ہوتی ہے۔ اس طرح صفت سورۃ شوریٰ آیت 37 میں ذکر ہوئی ہے اس میں اشارہ ہے کہ مؤمن کو غیرت نفس کی وجہ سے غصہ آتا ہے مگر اچھے اخلاق کی وجہ سے صبر واستقامت سے کام لیتا ہے اپنا غصہ جاری کرنے کی طاقت کے باوجود در گزر سے کام لیتا ہے۔ تیسری صفت، وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ اگر کوئی ان کے ساتھ مال، جان، عزت میں ظلم یا زیادتی کر لیتا ہے یا کسی نوکر خادم سے کوئی غلطی ہوتی ہے تو ان سے درگزر سے کام لیتے ہیں یہ صفت حقیقت میں سابقہ صفت کی تکمیل ہے یعنی اگر کہا جائے کہ ہوسکتا ہے ایک مرتبہ غصہ پی گیا مگر پھر طیش اور غصہ میں آ گیا ہو تو جواب ہوا کہ (كَظِمُ غَيْظِ) غصہ پی لینے کے بعد معاف کر دیتا ہے تو پھر غصہ نہیں کرتا ہے۔ اس صفت کا تذکرہ اور عظمت سورۃ شوریٰ آیت 40 سورۃ بقرہ 237 سورۃ نساء آیت 149 سورۃ تغابن آیت 14 سورۃ نور آیت 22 میں بھی ہے اور اس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے سورۃ آل عمران آیت 159 سورۃ مائدہ آیت 13 سورۃ بقرۃ آیت 45 سورۃ الاعراف آیت ، 199 میں ان آیتوں میں اس صفت کی عظمت کی واضح دلیل ہے۔ چوتھی صفت، وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ احسان سے مراد جرم کے بعد معاف کرنا اور درگزر کرنا ہے اور یہ ایک مستقل صفت ہے یہ واقعہ بھی اس کی دلیل ہے۔ سیدنا علی ابن حسین رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ ان کی لونڈی انہیں وضو کرا رہی تھی اتفاقاً اس کے ہاتھ سے پانی کا لوٹا چھوٹ گیا جس سے ان کا سر زخمی ہوا تو لونڈی نے فوراً وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ تلاوت کی تو انہوں نے کہا میں نے غصہ پی لیا پھر اس نے کہا وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ انہوں نے کہا کہ میں نے تجھے معاف کیا ہے پھر اس نے یہ جملہ تلاوت کیا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ تو اس نے فرمایا جا تجھے میں نے اللہ کی رضا کیلئے معاف کیا اور آزاد بھی کیا۔ اس واقعہ کو امام آلوسی نے نقل کیا ہے اور امام قرطبی نے میمون بن مہران کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ فائدہ 1: پہلے والی صفت کو صیغہ مضارع سے ذکر کیا تھا وجہ یہ ہے کہ اس کی ضرورت بار بار آتی ہے اور بعد والی صفات کو استمرار مسلسل ہونے کی وجہ سے صیغہ اسم فاعل سے ذکر کیا ہے۔ فائدہ 2: امام آلوسی اور قاسمی نے ذکر کیا ہے کہ یہ صفات سود خوروں کے مقابل ہیں کیونکہ مؤمنین کی صفات ان کے خلاف ہیں یعنی سود والے مالوں کو بڑھاتے ہیں اور ایمان والے مال اللہ تعالیٰ کی رضا میں خرچ کرتے ہیں۔ سود خور، مسکینوں اور

قرضداروں پر ظلم، غصہ و زیادتی کرتے ہیں اور ایمان والے غصہ پی کر معافی درگزر اور احسان کرتے ہیں اور واقعہ احد سے ساتھ بھی مناسبت ہے کہ احد میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو گئے چچا حمزہ رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام کافروں کے ہاتھوں شہید ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جنہوں نے احد کا مورچہ چھوڑا اور بعض میدان جنگ چھوڑ گئے تو ان خطاؤں پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو اخلاق حسنہ کی ترغیب دی اور یہ واقعہ احد کیلئے تمہید بھی ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ڞ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿135﴾ ”وہ لوگ جو اپنے نفسوں پر کوئی برائی یا ظلم کر بیٹھتے ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا کون گناہوں کو بخشتا ہے اور وہ اپنے کئے ہوئے گناہوں پر جانتے ہوئے اصرار (ہمیشگی) نہیں کرتے ہیں“ [135]۔

تفسیر 135: اس آیت میں دوسری قسم کے متقیوں کا بیان ہے اور ان کی تین صفات کا ذکر ہے۔ امام قرطبی نے فرمایا ہے کہ تقویٰ میں سابقہ متقین لوگوں سے یہ کم ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کی وجہ سے ان کے ساتھ ملا کر ذکر کیا ہے۔ ان کی پہلی صفت: وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ ۔ فَاحِشَةً: نفس پر ظلم کے متعلق فرق کئی طرح ہے پہلا یہ کہ فَاحِشَةً کبیرہ گناہ ہے۔ ظلم، صغیرہ گناہ ہے۔ (2) فاحشہ زنا ہے اور ظلم اس سے کم گناہ ہے یعنی نظر بد کسی غیر محرم کو دیکھنا یا ہاتھ لگانا مراد ہے۔ (3) فَاحِشَةً: سارے گناہ ہیں اور ظلم بغیر دلیل و حجت عمل کو کہا جاتا ہے یہ تمام اقوال ایک دوسرے کے قریب ہیں لہذا تخصیص کی ضرورت نہیں ہے۔ ذَكَرُوا اللّٰهَ ذکر قلبی کا معنیٰ ہے حساب کے دن کو یاد رکھنا یعنی قیامت کی حاضری قبر کا عذاب سوال و جواب اور یہ فکر ہر وقت دامن گیر ہو کہ اللہ کے سامنے پیشی ہو گی اللہ تعالیٰ کا عفو، احسان، مغفرت اور درگزر بھی یاد ہو۔ زبان کا ذکر یہ ہے کہ استغفار کے الفاظ زبان پر جاری رکھے لیکن صرف زبان کو حرکت دینا ذکر نہیں ہے جب تک دل ساتھ نہ دیتا ہو۔ دوسری صفت یہ ہے کہ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ امام قرطبی نے فرمایا ہے کہ ہر وہ دعاء یا کلمہ جس میں استغفار یعنی مغفرت کا لفظ ہو وہ استغفار ہے جس طرح حدیث میں ہے اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ۔ (ترمذی حدیث 3577 شیخ البانی نے اس کو صحیح کہا ہے مشکوٰۃ حدیث 2292، اور سید الاستغفار کا پڑھنا تو بہت ہی اچھا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ دل بھی زبان کے ساتھ شریک ہو۔ معاشرے میں جاری وہ رسمی ذکر مراد نہیں ہے کہ گناہ میں مصروف ہو اور ہاتھ میں تسبیح کے دانے پروانے کرتے ہوں اور

زبان پر ورد (ذکر) بھی جاری ہو لیکن کام گناہ کا کر رہا ہو یا زبان میں تو بہ ہو اور دل غافل ہو یہ تو استہزاء اور مذاق ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَلَا تَتَّخِذُوٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا (سورۃ بقرہ: 231) یعنی اللہ کی آیتوں کو مذاق مت بناؤ۔ وَ مَنۡ يَّغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ اِلَّا اللّٰهُ بقول ابن عطیہ یہ جملہ معترضہ ہے اور اس میں نفوس کو ترغیب دینا مقصود ہے تاکہ ان کا صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ استغفار کا تعلق ہو اور عفو و درگزر کی اللہ تعالیٰ سے اُمید پیدا ہو (مَن) استفہام انکاری ہے لہٰذا کلام میں نفی کا معنی پیدا ہوا اس لیے مستثنیٰ کو مرفوع (پیش) کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ وَلَمۡ يُصِرُّوۡا عَلٰى مَا فَعَلُوۡا یہ ان کی تیسری صفت کا ذکر ہے ابن عطیہ نے فرمایا ہے کہ اصرار کا معنی ہے کسی عمل پر ہمیشگی کا قصداً ارادہ کرنا اور باندھنے کو بھی کہا جاتا ہے۔ بقول صاحب لباب کسی چیز پر مضبوطی سے قائم رہنا۔ بقول قتادہ قدم بقدم گناہ کے راستے پر چلنا اور خوف الٰہی کو بالائے طاق رکھنا اور بقول سدی گناہ کرتے رہنا اور استغفار کا اہتمام ترک کرنا جو سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے دن میں ستر مرتبہ گناہ کا ارتکاب کرنے والا (مُصِر) ہمیشگی والا نہیں ہے بشرطیکہ استغفار کرتا رہے۔ داؤد کتاب الصلوٰۃ حدیث 1514 شیخ البانی نے اس روایت کو ضعیف کہا ہے: وَ هُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ علم کا متعلق عام ہے یعنی جانتا ہے کہ یہ گناہ ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مغفرت کرنے والا ہے معاف کرتا ہے اور درگزر کرتا ہے۔ امام ابو حیان کا قول ہے کہ ان آیتوں سے مومنوں کے تین طبقے ثابت ہوئے: (1) مُتَّقِيۡنَ (2) تَآئِبِيۡنَ (3) مُصِرِّيۡنَ۔ پہلے دونوں سے جنت کا وعدہ ہے اور تیسرے طبقے کا حال پوشیدہ ہے اور امام آلوسی نے امام ترمذی سے روایت نقل کی ہے کہ اس آیت کے نزول پر ابلیس نے اپنے ساتھیوں کو بلا کر چیخ ماری اور اپنے سر پر مٹی ڈال کر اپنے آپ کو بددعا دی اس کے لشکری جمع ہو کر پوچھنے لگے کیا بات ہے ابلیس نے کہا یہ آیت نازل ہوئی ہے لشکریوں نے جواب میں کہا کہ ہم ان پر خواہشات کے دروازے کھول دیں گے اور وہ استغفار نہیں کریں گے بلکہ خواہش نفسی کو دین قرار دے کر راہ نجات تصور کریں گے اس پر ابلیس خوش ہوا مسند ابو یعلیٰ 136 مجمع الزوائد 207/10 اس حدیث کو عثمان بن مطر اور عبد الغفور بن عبد العزیز الواسطی کی وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ غور و فکر کرے کہ سابقہ تین اقسام میں سے وہ کونسی قسم میں سے ہے اور اپنے حال پر رحم کرتے ہوئے اپنے آپ کو خواہش پرستی سے بہت دور رکھے۔

اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَجَنّٰتٌ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ‌ؕ وَنِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِيۡنَ ؕ‏ ﴿۱۳۶﴾

"یہ لوگ ہیں جن کیلئے اپنے رب کی طرف سے بدلہ بخشش ہے اور باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان میں وہ

ہمیشہ رہیں گے اور عمل کرنے والوں کا کیا ہی اچھا بدلہ ہے" [136]۔

تفسیر 136: سابقہ دو قسم مؤمنین کیلئے اس میں آخرت کی بشارت ہے۔ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ تو بہ میں دو چیزیں مطلوب ہوتی ہیں: پہلی چیز عذاب سے امن اور بچاؤ، لہٰذا وہ اس عبارت میں ذکر ہے اور دوسری چیز اجر اور ثواب حاصل کرنا ہے تو اس کیلئے فرمایا وَ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ عاملین میں الف لام عہدی ہے یعنی سابقہ دونوں آیتوں پر عمل پیرا ہونے والے۔ جزا کے بعد لفظ اَجر' میں بہت تاکید ہے اور حصول جنت کی ترغیب ہے کیونکہ اس میں اشارہ ہے کہ یہ عمل کرنے والا مزدور کی طرح ہے اور مزدور کو اجرت دینا صفت عدل وانصاف ہے اور یہ صفت اللہ تعالیٰ کیلئے ہی زیبا ہے۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ ﴿۱۳۷﴾

"یقیناً تم سے پہلے کئی واقعات گزر چکے ہیں لہٰذا تم زمین میں سیر کرکے دیکھ لو جھٹلانے والوں کا کیسا انجام ہوا" [137]۔

تفسیر 137: صفات تقویٰ پر بشارت دینے کے بعد اب جھٹلانے والوں کے انجام کے ذریعے سے ڈرانا مقصود ہے تا کہ ان کی صفات سے بچا جا سکے۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ۔ خَلَوْا: اصل میں خلوت تنہائی کو کہا جاتا ہے اور گزر جانے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے یہاں گزرنے کے معنی میں ہے۔ سُنَنٌ اس طریقے کو کہا جاتا ہے جو انسان نے مستقل اپنایا ہو اور یہ سُنَّةٌ کی جمع ہے بقول امام قرطبی سیدھے راستے کو بھی کہا جاتا ہے وہ راستہ جس کی پیروی ہوتی ہے خواہ شر کا ہو یا خیر کا اس لیئے سُنَّةٌ حَسَنَةٌ وَسُنَّةٌ سَیِّئَةٌ دونوں استعمال ہوتے ہیں۔ امت کو بھی کہا جاتا ہے اور سُنَنٌ اَمْثَالٌ۔ مثالوں کو بھی کہا گیا ہے۔ بقول زجاج یہاں مضاف مقدر ہے یعنی اہل سنن اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں مراد سنن الہلاک ہے کیونکہ (مُكَذِّبِیْنَ) جھٹلانے والے جملے اس کی دلیل ہے یعنی مراد یہ ہے کہ ان کی ہلاکت کے طریقے اور عذاب کے نمونے آپ نے نہیں دیکھے۔ فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ اس میں (فَا) کو مقدر شرط کی وجہ سے ذکر کیا ہے یعنی اِنْ شَكَكْتُمْ فَسِیْرُوْا اگر تمہیں شک ہو تو سیر کرکے دیکھ لو۔ سیر اور گھومنا دو قسم پر ہیں: (1) قدموں کے ذریعے سے چلنا۔ (2) ان کی تاریخ کو مستند کتابوں کے ذریعے سے پڑھنا۔ فَانْظُرُوْا عبرت کیلئے نظر ڈالنا مراد ہے۔ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ كَیْفَ میں سبب ہلاکت اور ہلاکت کے طریقے دونوں مراد ہیں۔

هٰذَا بَیَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۳۸﴾ "یہ (قرآن) لوگوں کیلئے ہدایت اور وضاحت اور (متقین) پرہیز

کاروں کیلئے نصیحت ہے" [138]۔

تفسیر 138: سابقہ آیت میں جھٹلانے والوں کے حال سے ترغیب دی گئی ہے تو اب قرآن مجید کی طرف ترغیب دی جاتی ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ ایسی برائی سے بچاؤ کیلئے قرآن مجید کی طرف رجوع کی ضرورت ہے۔ ھذا حسن بصری رحمہ اللہ وغیرہ کا قول ہے کہ یہ قرآن کریم یا جھٹلانے والی اقوام کی طرف اشارہ ہے اس آیت میں قرآن مجید کی تین صفات مذکور ہیں: (1) بیان، ہدایت وگمراہی کے راستوں کا بیان چونکہ یہ عام ہے اسلئے لِّلنَّاسِ فرمایا۔ (2) هُدًى یعنی رہنمائی حاصل کرنے سے مقصد تک پہنچانا۔ (3) گمراہی سے نجات کیلئے مَوْعِظَةٌ ذکر کیا ہے۔ آخری دونوں صفات متقیوں کے ساتھ خاص ہیں اس لیئے لِّلْمُتَّقِينَ فرمایا ہے۔ یہ صفات کتاب میں مذکور تمام صفات کمال کو جامع ہیں۔

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٣٩﴾

"نہ تم غم کھاؤ اور نہ ہی تم ہمت ہارو اور تم ہی غالب رہو گے بشرطیکہ تم مومن ہو" [139]۔

تفسیر 139: یہ سابقہ آیت کے مضمون پر عطف ہے یعنی لِتَهْتَدُوا۔ أَوْ تَتَّعِظُوا بِالْقُرْآنِ وَلَا تَهِنُوا قرآن مجید کے ذریعے سے ہدایت ونصیحت حاصل کرو اور سستی مت کرو اس میں آداب کا ذکر ہے نیز مقصود تسلی دینا ہے۔ وَهْنٌ کا معنی کسی سبب سے کمزوری ہے جیسا کہ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّي (سورۃ مریم آیت 4) نرمی کو بھی کہا جاتا ہے۔ ابن عطیہ کے بقول یہ جنگ کیلئے مستعمل ہے جب انسان حق پر لڑ رہا ہو۔ تو حصول حق کیلئے ساری قوتوں کو استعمال کرنا پڑتا ہے اور یہ بہترین اخلاق میں سے ہے اور حدیث میں جو نرمی شفقت کا ذکر آیا ہے کہ اَلْمُؤْمِنُوْنَ هَيِّنُوْنَ لَيِّنُوْنَ یہ روایت کئی کتب میں وارد ہے البتہ مذکورہ لفظوں کے ساتھ شعب الایمان للبیہقی حدیث 8129 میں مذکور ہے سلسلۃ الصحیحۃ 936 صحیح الجامع 6669 ایمان والے لئے ضعف ظاہر کرنے والے لئے نرمی کرنے والے ہوں گے تو یہ راضی ہونے کی حالت میں یعنی ایمان والوں کا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ یہ معاملہ ہے اور یہاں دشمن سے بہادری شجاعت کو بزدلی شکست بے ہمتی میں بدلنا مراد ہے نیز یقین کو شکست اور اُمید کو نا اُمیدی میں بدلنا ہے یہ سب منع ہے۔ ابن عاشور کا قول ہے کہ وہن اور حزن نفس کی دو کیفیتوں کا نام ہے جو غیر اختیاری طور پر عقیدے کی نا اُمیدی سے پیدا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے دشمن سے لڑنے کی ہمت نہیں ہوتی ہے ان دونوں سے منع اصل میں ان کے اسباب سے منع ہے۔ دنیا سے محبت اور موت سے خوف بھی وھن میں سے ہے جیسا کہ حدیث حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ احمد حدیث 8713 (حسن) ہے سورۃ محمد آیت 35 میں

وھن سے منع ذکر ہے اور سابقہ صالحین لوگوں سے وہن کی نفی کی گئی ہے سورۃ آل عمران آیت 146۔ یہاں مراد یہ ہے کہ احد میں جو تکلیفیں پہنچی ہیں ان مصیبتوں کی وجہ سے کمزوری اور سستی مت دکھاؤ۔ وَلَا تَحْزَنُوْا حزن اصل میں فوت ہونے والی چیز پر افسوس کرنا ہے یعنی ساتھیوں کی شہادت اور مال غنیمت ہاتھ سے نکل جانے پر غمگین مت ہونا۔ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ۔ عُلُوّ سے مجازی علو مراد ہے یعنی دنیا میں دشمنوں پر غلبہ چاہے میدان جنگ میں ہو یا میدان دلائل میں ہو اور آخرت میں جنت میں اعلیٰ درجات مراد ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے اس میں امت محمدیہ کی عظمت ثابت ہوتی ہے کیونکہ اس طرح خطاب موسیٰ علیہ السلام سے کیا گیا ہے اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى (سورۃ طٰہٰ آیت 68) جبکہ وہ نبی ہیں اور یہاں یہ خطاب اس امت کو ہے یعنی اول مخاطب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں اور بعد میں دیگر امتی۔ اس میں واؤ عطف کیلئے ہے لہٰذا یہ بشارت ہے یا حال ہے مگر بطور علت یعنی وھن اور حزن مت کرو کیونکہ تم غالب ہو اور غالب لوگ اس طرح نہیں کرتے ہیں۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ اِنْ شرطیہ ہے یا بمعنی اِذْ ہے یہ بلندی کامل ایمان کی وجہ سے ہے امام قرطبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس وجہ سے احد کے واقعے کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کو ذلت اور ہزیمت نہیں ہوئی۔ ایمان سے کامل مکمل شرعی ایمان مراد ہے جو کافروں پر غلبہ حاصل کرنے کا سبب ہے یا پھر اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر یقین اور ان کی تصدیق ہے کہ وہ تمہیں غلبہ عطا کرے گا اس پر اعتماد و یقین کرو۔

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ۭ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُھَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاۗءَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ "اگر تم کو کوئی زخم پہنچ گئے ہیں (تو صبر کرو) یقیناً اس طرح زخم اس (کافر) قوم کو بھی پہنچا ہے اور یہ تو دن ہے لوگوں کے درمیان ہم بدلتے رہتے ہیں تا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جان لے جو ایمان لائے اور تا کہ بنائے بعض تم میں سے شہید اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتا ہے" [140]۔

تفسیر 140: اس آیت سے آیت 177 تک غزوۂ احد کا تذکرہ ہے اور اس میں منافقین کے اس اعتراض و شبہ کا جواب ہے کہ اگر رسول سچے ہوتے تو اُحد میں شکست نہ اٹھاتے۔ تو اس آیت کے پہلے اور دوسرے جملے میں ایمان والوں کو تسلی اور اطمینان دیا گیا ہے اور تیسرے اور چوتھے جملے میں سبب (علت) شکست کا ذکر ہے۔ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ۔ مَسّ سے اصابت یعنی پہنچنا مراد ہے لیکن دنیا کے مصائب آخرت کے مقابل میں بہت کم ہیں اس لیئے اس کو مَسّ کہا گیا ہے۔ امام راغب نے فرمایا کہ (قَرْح) جب (ق) کے فتح زبر کے ساتھ پڑھا جائے تو مراد بیرونی زخم ہوتا ہے تلوار وغیرہ کا زخم

اور جب (ق) کے ضمہ پیش کے ساتھ پڑھا جائے تو مراد اندرونی زخم ہوتا ہے جیسا دانہ پھنسی وغیرہ۔ یہاں حقیقی معنی مراد ہے یعنی احد میں بعض صحابہ کرام شہید بھی ہوئے اور زخمی بھی یا مجازی معنی مراد ہے یعنی اُحد کی شکست مثل زخم ہے۔ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ یہ مخفی جزا کی دلیل ہے یعنی فَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَلَا تَشُكُّوْا فِیْ نَصْرِ اللهِ یعنی کمزوری اور سستی مت دکھاؤ اور اللہ تعالیٰ کی مدد میں شک بھی نہیں کرنا۔ اَلْقَوْمَ اس سے مشرکین مکہ مراد ہیں جو بدر میں مارے گئے تھے۔ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ اس سے مراد جنگ بدر میں مارے ہوئے مشرکین مکہ ہیں یعنی ستر (70) کو قتل اور ستر (70) کو قیدی بنالیا تھا جیسا کہ آیت 165 میں اس کا ذکر آرہا ہے یا مراد وہ 20 سے کچھ اوپر کافر ہیں جو اُحد میں مارے گئے تھے۔ مِّثْلُهٗ اس سے عدد میں برابری مراد نہیں ہے بلکہ فقط تکلیف اور موت میں برابری مراد ہے۔ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ اس میں ایمان والوں کو تسلی دینا مقصود ہے کہ یہ (اُحد میں شکست) عذاب نہیں بلکہ دنوں کا بدلنا ہے یعنی مداوۃ ہے۔ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ اس میں جنگ بدر و اُحد کی طرف اشارہ ہے جن کی طرف سابقہ جملے میں بھی اشارہ ہوا ہے۔ مُدَاوَلَةٌ کسی چیز کو ایک سے دوسرے کی طرف نقل کرنا ہے اور نمبروار آنے کو بھی کہا جاتا ہے۔ اس مقام میں معنی یہ ہے کہ ایک حال پر ہمیشہ اللہ تعالیٰ نہیں چھوڑتا ہے بلکہ کبھی خوشی اور کبھی غم یعنی بدر میں کافروں پر بطور عذاب مشکلات لانا تو مسلمانوں پر ادب کیلئے اور گناہوں کے کفارے کے لئے اُحد میں امتحان لایا۔ وَلِيَعْلَمَ اللهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یہ کلی علت ہے اور واو برائے عطف ہے جو مخفی (مقدر) معطوف علیہ پر عطف ہوا ہے اور وہ نُدَاوِلُهَا کیلئے معلول ہے یعنی لِتَكُوْنَ كَيْتَ۔ وَكَيْتَ من الحِكَمِ وَلِيَعْلَمَ یا واؤ کے بعد فعل مقدر ہے یعنی فعل ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ۔ ابو حیان نے فرمایا ہے کہ یہ طریقہ مختصر اور بہتر ہے اور ابن عطیہ نے بھی پسند کیا ہے۔ سوال: سلف صالحین کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام کلیات و جزئیات پر ان کے پیدا کرنے سے پہلے عالم ہے جس پر قرآن مجید کی آیتیں دلیل ہیں اور یہاں فعل مضارع دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو واقع ہونے کے بعد علم حاصل ہوتا ہے ایسی آیتیں درج ذیل ہیں آیت 142 سورۃ کہف آیت 12 سورۃ بقرہ آیت 143 سورۃ عنکبوت آیت 3 اور سورۃ محمد آیت 31 وغیرہ؟ جواب: جب یہ بات قرآن مجید کی واضح آیتوں میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ جزیات و کلیات پر ان کی پیدائش سے قبل علم رکھتا ہے تو سلف سے ان آیاتوں کے متعلق تاویلات منقول ہیں یعنی یہ علم کا اطلاق ہے اس کے لازم پر جو تمیز اور ظہور ہے یعنی اللہ تعالیٰ الگ اور ظاہر کرے۔ ابن عطیہ کے بقول اس انسان کے وجود میں ایمان کو ظاہر کرنا جس کے متعلق پہلے سے اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ وہ ایمان لائے گا۔ مفسرین نے اور بھی تاویلات ذکر کی ہیں جو

سب ان کی طرف راجع ہیں۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ علم یہاں معرفت کے معنی میں ہے جو ایک مفعول چاہتا ہے اور الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے کامل ایمان مراد ہے یا علم اپنے معنی پر ہے اور دوسرا مفعول مقدر ہے یعنی الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُتَمَيِّزِيْنَ بِسَبَبِ صَبْرِهِمْ وَثَبَاتِهِمْ عَلَى الْاِيْمَانِ مِنَ الْمُنَافِقِيْنَ تا کہ صابر اور مضبوط ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ منافقین سے الگ کرے۔ وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ یہ دوسری علت ہے اور اس سے شہادت فی سبیل اللہ مراد ہے جیسا کہ احد میں صحابہ کرام شہید ہوئے جن کو فضائل و اکرام سے اللہ نے نوازا۔ صاحب اللباب کا قول ہے کہ شہید کو چار وجوہات سے شہید کہتے ہیں: (1) ان کی ارواح دار السلام میں حاضر ہوگئی ہیں۔ (2) اللہ تعالیٰ اور ملائکہ نے ان کے بارے میں جنت کی شہادت دی ہے اور شہید بمعنی مشہود ہے۔ (3) بروز قیامت انبیاء اور صدیقین کیساتھ شہداء بھی لوگوں کے لئے شہادت دیں گے۔ (4) شہید ہونے کے بعد فوراً جنت میں حاضر کئے جاتے ہیں یہ معنی پہلے والے معنی کے قریب ہے۔ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ یہ بطور جملہ معترضہ ہے جو کہ سوال کا جواب ہے سوال یہ تھا کہ کافروں کو اللہ تعالیٰ نے احد میں غلبہ دیا جس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ان سے محبت ہے؟ جواب یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہیں جن میں کچھ ذکر ہوئی ہیں تو یہ محبت کی دلیل نہیں ہے۔ الظّٰلِمِيْنَ سے منافقین اور مشرک دونوں مراد ہوسکتے ہیں مشرک تو ہے ظالم البتہ منافقین میں یہ صلاحیت نہیں تھی کہ وہ شہید ہوجاتے اس لیئے وہ راستے سے پلٹ آئے۔

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۱﴾

"تا کہ پاک صاف کردے اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اور کافروں کو مٹادے" [141]۔

تفسیر 141: اس آیت میں مزید دو علتوں کا ذکر ہے وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: تمحیص کا معنی ہے ہر قسم کے میل کچیل اور عیب سے پاک کرنا۔ نیز محص اور فحص میں فرق یہ ہے کہ متصل چیز سے پاک کرنے کو محص کہتے ہیں اور منفصل چیز سے پاک کرنے کو فحص کہتے ہیں یہاں گناہوں سے پاک کرنا مراد ہے یا امتحان کرنا مراد ہے۔ وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ محق لغت میں نقصان ہلاکت (کسی چیز کو جڑ سے نکال کر ختم کرنا) ہے جس کو استحصال کہا جاتا ہے ان دونوں علتوں کو جمع کیا اس لیئے کہ یہ دونوں ازالہ کے معنی میں مشترک ہیں یعنی محص میں آثار کا ازالہ ہے یعنی ان کے اعمال وغیرہ اور محق میں ان کی ذات کا ازالہ ہے اور دونوں کا تعلق نُدَاوِلُهَا سے ہے یعنی کبھی مسلمان مغلوب ہوجاتے ہیں تو ان کے گناہ جھڑ جاتے ہیں اور کبھی کافروں پر مداولہ آتا ہے تو ان کی جڑیں کاٹی جاتی ہیں۔ الْكٰفِرِيْنَ سے مراد وہ کافر ہیں جو احد کی جنگ میں حالت

کفر میں مارے گئے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ۝

"کیا تم نے گمان کیا ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تک تم میں سے ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے نہیں جانا جنہوں نے جہاد کیا اور نہ ہی صبر کرنے والوں کو" [142]۔

تفسیر 142: یہ بھی علت ہے لیکن اس کو الگ طریقے سے ذکر کیا ہے اس لیئے کہ حصول جنت اعلیٰ مقصد ہے اَمْ یہ بَلْ کے معنی میں ہے۔ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ اس میں بغیر مشقت وعذاب ابتداء سے جنت میں داخل ہونا مراد ہے۔ وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ ۔ امام سیبویہ کا قول ہے (لَمَّا) نفی میں استعمال ہوتا ہے جو زمانہ حال تک ہو اور مستقبل کی اس میں امید ہو اور اللہ تعالیٰ کے علم کی نفی سے مراد یہ ہے کہ وہ چیز وجود میں بھی نہیں آئی ہے یا پھر يَعْلَمُ يَظْهَرُ وَيُمَيِّزُ کے معنی میں ہے اور خطاب ان افراد کو ہے جو جنگ احد میں میدان سے چلے گئے تھے تو گویا ان کا خیال تھا کہ فریضہ جہاد کی ادائیگی اور صبر کئے بغیر وہ جنت میں چلے جائیں گے۔ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ اس میں (اَنْ) مقدر ہے یعنی جہاد اور صبر کو جمع کرنا مراد ہے۔ الصّٰبِرِيْنَ صَبَرَ کو صیغہ اسم سے ذکر کیا ہے اس میں اشارہ ہے کہ صبر کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے جہاد کو فعل کے ساتھ ذکر کیا ہے اس لیئے کہ جہاد (قتال) کبھی کبھی ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۖ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۝ "بلاشبہ تم (شہادت) موت کی آرزو کر رہے تھے اس سے پہلے کہ تم اس سے دوچار ہو پھر یقیناً تم نے اس کا مشاہدہ کیا جبکہ تم دیکھ رہے تھے" [143]۔ ع 5

تفسیر 143: اس آیت میں بھی ایک علت کا ذکر ہے یعنی تم شہادت طلب کر رہے تھے وہ تمہیں مل گئی۔ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ حدیث سے ثابت ہے کہ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے اور فضائل اصحاب بدر سن رہے تھے ان کی تمنا تھی کہ ہم بھی میدان جنگ و جہاد میں شریک ہوں ان میں سے بعضوں نے تو انتہائی شجاعت کا مظاہرہ کیا جیسے اُحد میں سیدنا انس بن نضر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا اور بعضوں نے میدان سے واپسی اختیار کی تھی تو اس آیت میں تَغْلِيْبًا خطاب ہے یعنی حکماً شہداء کو بھی ہے اور زندہ رہنے والوں کو بھی ہے شہداء کیلئے تسلی اور زندہ رہنے والوں کیلئے ڈانٹ اور تنبیہ ہے۔ سوال: صحیح بخاری کتاب المرضیٰ حدیث 5673 میں موت کی تمنا کی ممانعت آئی ہے خواہ دل میں ہو یا زبان سے؟ جواب (1): یہاں موت سے شہادت مراد ہے صبر و استقامت کے ساتھ اور شہادت کی آرزو شرعاً جائز

ہے (قرطبی) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیٰ صحیح بخاری باب التَّمَنّٰی الشَّھَادَۃِ حدیث 2797 یعنی شہادت کی دعا مانگی ہے۔ جواب (2): صاحب اللباب نے کہا ہے کہ اس سے اسباب موت مراد ہے جو کہ جہاد ہے۔ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ موت یا دشمن کی طرف ضمیر راجع ہے کیونکہ لقاء دو بندوں کے درمیان استعمال ہوتا ہے۔ فَقَدْ رَاَیْتُمُوْهُ یہاں رؤیت سے مراد آنکھوں سے دیکھنا ہو تو ایک مفعول چاہئے گا اور اگر دیکھنے سے مراد علم ہو تو پھر ایک مفعول مقدر ہو گا یعنی حاضراً اور اس سے موت کے سبب کو دیکھنا مراد ہے جو کہ جہاد ہے۔ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ امام اخفش کے بقول یہ جملہ تاکید کیلئے ہے یعنی سابقہ جملہ میں دیکھنے سے مراد آنکھوں کا دیکھنا ہے تو اس کا مفعول بھی سبب موت ہے اور زجاج کے بقول اس تاکید سے مراد یہ ہے کہ تمہاری آنکھوں میں کوئی بیماری ونقصان نہ تھا۔ ابن الانباری نے کہا ہے کہ رؤیت سے مراد ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہونا ہے اور نظر سے مراد آنکھوں سے دیکھنا ہے یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور شہداء کو نظر سے دیکھنا مراد ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ یَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَیْهِ فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰهَ شَیْــٴًـا ؕ وَسَیَجْزِی اللّٰهُ الشّٰكِرِیْنَ ﴿۱۴۴﴾

"نہیں ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم مگر رسول اس سے پہلے کئی رسول گزر چکے ہیں کیا اگر وہ فوت ہو جائے یا شہید ہو جائے یا قتل کیا جائے تو کیا تم (اپنے دین) سے ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے اور جو کوئی ایڑیوں پر پھر جائے تو اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں دے سکتا اور اللہ تعالیٰ عنقریب شکر کرنے والوں کو بدلہ دے گا" [144]۔

تفسیر 144: (ربط 1) سابقہ دو آیتوں میں مختلف اسباب کی وجہ سے زواجر تھے، پہلا سبب جہاد چھوڑنا اور بے صبری کرنا دوسرا سبب شہادت کی تمنا کرنا۔ اب اس آیت میں تیسرے سبب کا ذکر ہے یعنی وفات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر سن کر میدان قتال سے پلٹ جانا۔ (ربط 2) سابقہ آیت میں صحابہ کرام کی موت کا ذکر تھا تو اب اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کا ذکر ہے کہ ان کی موت پر دین مت چھوڑنا۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ مفسرین نے عبداللہ بن قمیہ کا واقعہ ذکر کیا ہے کہ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سر اور چہرہ مبارک زخمی کیا تھا اور پتھر مارنے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید ہو گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو کر گر گئے پھر طلحہ رضی اللہ عنہ کے سہارے سے ایک پتھر پر چڑھ گئے دلائل النبوۃ 3،248 عبداللہ بن قمیہ نے پھر حملہ کیا تو مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے دفاع کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا جس پر اس نے یا ابلیس نے آواز بلند کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قتل ہو گئے اس وجہ سے صحابہ کرام میدان جنگ سے منتشر ہو گئے۔ نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ اے اللہ کے بندو میری طرف آؤ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اس میں اللہ تعالیٰ نے انکے اس گمان کو رد کیا ہے کہ وہ فوت نہیں ہوں گے اور اس پر ان کی ہیبت کا ازالہ بھی ہے جو نبی کی وفات کی خبر سننے پر طاری ہوئی تھی۔ وَمَا میں (مَا) نافیہ ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی نام ہے جو کہ عبداللہ کا بیٹا ہے اور دادا کا نام عبدالمطلب ہے دادا نے یہ نام تجویز کیا تھا جب ان سے سوال کیا گیا کہ یہ نام تو تمہارے اکابر میں سے کسی کا نہیں تھا تو کیوں اس کو تجویز کیا انہوں نے کہا اُمید ہے کہ یہ لوگوں کے نزدیک قابل تعریف ہوگا۔ یہ وزن محمد اور تحمید کثرت تعریف پر دلالت کرتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صفات بشریت میں درجہ کمال کے حقدار ہوں گے۔ تفسیر اللباب میں ہے کہ اہل لغت کا قول ہے کہ مخلوق میں جس شخص کے اندر کامل صفات اور جامع صفات ہوں گی اسے محمد کہا جا سکتا ہے۔ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ یہ جملہ یا محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت ہے یا جملہ مستانفہ ہے اگر اول مراد لیا جائے تو اس کو قصر قلب کہا جاتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر کسی کا یہ خیال ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر یہ امت ختم ہو جائے گی تو اس کا یہ خیال عبث ہے اس لیئے کہ سابقہ انبیاء کرام دنیا سے چلے گئے مگر ان کی امتیں دنیا میں ختم نہیں ہوئیں تو اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات یا شہادت پر یہ اُمت اور ملت بھی ختم نہیں ہوگی اور جملہ مستانفہ قرار دینے پر اس کو قصر افراد کہا جاتا ہے تو معنیٰ یہ ہے کہ اگر یہ گمان کیا جائے کہ یہ نبی قتل اور موت سے بچ جائے گا تو اس خیال اور سوچ کی اللہ تعالیٰ نے تردید کی اور فرمایا کہ یہ رسول ہے الٰہ نہیں ہے کہ قتل اور موت سے بچ جائے گا اور جملہ مستانفہ بطور استدلال ہے کہ سابقہ انبیاء میں بعض قتل ہوئے اور بعض طبعی موت سے دنیا سے رخصت ہوئے ہیں۔ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ہمزہ استفہام انکاری کیلئے ہے اور (فَا) مخفی جملہ پر عطف کیلئے ہے یعنی اَتُؤْمِنُوْنَ بِهٖ مُدَّةَ حَيَاتِهٖ فَاِنْ مَاتَ ارْتَدَدْتُمْ۔ کیا اس پر حالت حیات میں ایمان لاؤ گے اور جب وہ قتل یا فوت ہو جائے تو تم مرتد ہو جاؤ گے۔ اِنْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ پس پشت جانے کو کہا جاتا ہے یہ مرتد ہونے یا پیچھے جانے سے کنایہ ہے۔ سوال: صحابہ کرام تو مرتد نہیں ہوئے تو پھر اس کا کیا معنی ہے؟۔ جواب 1: ہمزہ برائے انکار اور اِنْ دلالت کرتا ہے کہ صحابہ کرام میں کوئی مرتد نہیں ہوا لہٰذا تنبیہ ہے۔ جواب 2: اس سے مراد میدان جنگ سے پلٹ جانا ہے جو احد میں ہوا ہے۔ سوال: آیتوں میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کا ذکر ہے لہٰذا اس کو قتل نہیں کیا جائیگا تو پھر قتل کیوں ذکر کیا گیا ہے؟ جواب: یہ قضیہ شرطیہ ہے جزئین کا وجود ہی لازم نہیں البتہ صدق ملازمہ چاہتا ہے۔ سوال: اَوْ قُتِلَ اَوْ برائے شک ہے اللہ تعالیٰ پر تو شک محال ہے۔ جواب: یہ اَوْ برائے شک نہیں ہے

بلکہ دو شخصوں کی برابری کیلئے ہے یعنی ان کی موت یا قتل دونوں میں سے کسی ایک۔ پر اس کا دین ختم نہیں ہوگا اور قتل اس لئے ذکر کیا گیا کہ احد میں آپ کے قتل کا جھوٹا پروپیگنڈا ہوا تھا۔ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا نکرہ جب نفی کے سیاق میں ہو تو وہ برائے عموم ہوتا ہے یعنی کوئی ضرر نہیں دے سکتا ہے کم اور نہ ہی زیادہ علبتہ اپنی دنیا و آخرت کو برباد کردے گا۔ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ یہاں شکر سے وفات النبی کے بعد دین پر استقامت اور صبر ہے۔ امام ابن عطیہ نے فرمایا کہ ان کے دل میں نبی کی وفات سے کوئی شک وشبہ پیدا نہیں ہوتا ہے۔ ابن جریر نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق شاکرین کے امیر ہیں اور اللہ تعالیٰ کے امین بھی ہیں وفات النبی کا واقعہ جو بعد میں ذکر ہوگا اس کی دلیل ہے۔ فائدہ 1: مفسرین نے یہاں صحیح بخاری کتاب المغازی باب مَرَضِ النَّبِيِّ وَوَفَاتِهِ حدیث 4453 سے وہ واقعہ نقل کیا ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ فوت ہوئے بقول قرطبی حیرت و پریشانی سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ چھپ گئے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی زبان بند ہو گئی تھی، سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے وفات رسول سے انکار کیا۔ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ مدینہ سے باہر مقام سخ میں تھے جہاں ان کا مکان وزمین تھی اطلاع ملنے پر تشریف لیکر آگئے۔ پہلے عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں گئے نبی اکرم ﷺ کے چہرہ انور سے کپڑا ہٹا کر موت کا یقین کیا پھر رونے لگے اور ماتھے پر بوسہ دیا۔ فرمایا اللہ تعالیٰ تمہیں دو دفعہ موت نہیں دے گا ایک مقررہ وقت والی موت تھی جو تجھ پر آگئی پھر مسجد نبوی میں داخل ہو کر منبر رسول پر تشریف لے گئے اور لوگوں سے مخاطب ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا: مَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَإِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَّا يَمُوْتُ وَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَإِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ: جو شخص اللہ تعالیٰ کی بندگی پر قائم تھا وہ بندگی جاری رکھے کیونکہ اللہ تعالیٰ موت سے مبرا ہے اور جو محمد ﷺ کی بندگی کرتا تھا تو وہ جان لے کہ یقیناً وہ فوت ہو چکے ہیں۔ پھر اس آیت کریمہ کی تلاوت فرمائی۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کہنے لگے گویا کہ یہ آیت میں نے آج تلاوت کی ہے جب لوگ مسجد سے جانے لگے تو زبانوں پر یہ آیت جاری تھی مدینے کی گلیوں میں اس کی تلاوت جاری ہوئی یعنی سارے لوگوں کی توجہ اس بات کی طرف ہوئی جبکہ یہ آیت پہلے سے پڑھ رہے تھے اس سے معلوم ہوا کہ بعض اوقات کوئی آیت وحدیث یا مسئلہ کتاب میں انسان پڑھتا ہے لیکن اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور اس وجہ سے اس پر عمل پیرا بھی نہیں ہوتا۔ یہ آیت و حدیث سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا خطبہ میں پڑھنا واضح دلیل ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوئے ہیں لہٰذا جو لوگ پھر بھی وفات النبی کا عقیدہ نہیں رکھتے ہیں وہ قرآن وحدیث واجماع صحابہ وامت کے منکر ہیں۔ فائدہ 2: مرزا

قادیانی نے قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ سے دلیل لی ہے کہ رسول فوت ہو چکے ہیں وہ خلت سے موت کا معنی لیتا ہے اور الرسل میں الف لام برائے استغراق مانتا ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ عیسٰی علیہ السلام فوت ہوئے ہیں؟۔ جواب: الف لام استغراقی ہے لیکن خلت گزر جانے کے معنی میں خواہ موت کے ذریعے سے ہو یا صرف زمانے کے لحاظ سے ہو عام ہے موت کے ساتھ مقید نہیں اگر موت ہی مراد ہوتی تو لفظ ماتت استعمال کیا جاتا۔ لفظ خلا کی تفسیر سورۃ بقرۃ آیت 14 میں گزری ہے۔ قرآن وحدیث میں موت کے معنی میں کسی جگہ استعمال نہیں ہوا ہے اگر موت کا معنی لیا بھی جائے تو عیسٰی علیہ السلام کی حیات قطعی دلائل سے ثابت ہے جس کا ذکر اس سورۃ میں گزر گیا ہے البتہ خضر اور الیاس علیہما السلام کی حیات پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كِتَابًا مُؤَجَّلًا ۗ وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا ۚ وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ ﴿145﴾ "کسی نفس کیلئے (یہ ممکن نہیں) کہ اللہ تعالٰی کے حکم کے بغیر وہ مرجائے لکھا ہے اس نے ایک وقت مقرر جو کوئی دنیا کا بدلہ چاہتا ہے ہم اس میں سے دے دیتے ہیں اور جو آخرت کا بدلہ چاہتا ہے تو ہم اس کو آخرت کا بدلہ دیتے ہیں اور شکر گزاروں کو ہم عنقریب بدلہ دیں گے" [145]۔

تفسیر 145: ربط (1) سابقہ آیت میں میدان جنگ سے بھاگنے کا ذکر ہوا تو اب جہاد کی ترغیب دی جارہی ہے کہ جنگ سے موت کے خوف کی وجہ سے مت بھاگو اس لیئے کہ موت وقت مقرر پر واقع ہوگی۔ (ربط 2) پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کی طرف اشارہ کیا گیا تو اب امت کو تسلی دی جارہی ہے کہ وفات النبی اس کی مرضی پر نہیں ہے وہ بِإِذْنِ اللَّهِ ہے لہٰذا ان کی موت پر دین مت چھوڑ نا نیز اس میں ادب ہے کہ موت کو وقت مقرر پر سمجھو۔ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ یہ خبر مقدم ہے أَنْ تَمُوتَ اسم مئوخر ہے۔ اس میں اس بات کی نفی کی جاتی ہے کہ عقلاً اور عادتاً کسی نفس کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ فوت ہو جائے جب تک اللہ تعالٰی نہ چاہے۔ نفس اور موت عام ہے نبی کی موت ہو یا کسی عام شخص کی اسی طرح عام موت ہو یا شہادت ہو اس لئے جو قتل کیا جائے وہ بھی اپنے وقت مقررہ پر مرتا ہے۔ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ اللہ تعالٰی کی مشیت چاہت ہے یا ملک الموت کو اجازت دینا مراد ہے۔ كِتَابًا مُؤَجَّلًا کتاب قضا کے یا لکھنے کے معنی میں ہے یعنی لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ کتاباً مفعول مطلق ہے مقدر فعل کیلئے كَتَبَ اللَّهُ كِتَابًا مُؤَجَّلًا: مقرر کیا ہوا ہے جو نہ تو متوخر ہو سکتا ہے اور نہ ہی مقدم۔ وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا اس میں لوگوں کی تقسیم ہے کہ دنیا میں بعض لوگ دنیاوی فکر رکھتے ہیں اور بعض اخروی اور اس میں ان صحابہ کرام کی طرف اشارہ ہے کہ بعض نے مال غنیمت اپنایا اور مورچہ چھوڑ کر نیچے اتر آئے اور

بعض نے آخرت کو ترجیح دیتے ہوئے مورچے میں جام شہادت نوش کیا۔ یُرِدْ کا متعلق مقدر ہے یعنی بِعَمَلِهٖ چاہے دین کا عمل ہو یعنی قتال فی سبیل اللہ عبادت اور جہاد یا دنیاوی عمل ہو یعنی تجارت میں منافع وغیرہ یُرِدْ میں نیت مراد ہے لیکن نیت کی خرابی کی وجہ سے آخرت کے اجر سے لوگ محروم ہوتے ہیں۔ مندرجہ ذیل آیتوں کا مطالعہ کریں سورۃ شوریٰ 20 سورۃ ہود 14 سورۃ اسراء 18۔ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا یہاں پر بھی بِعَمَلِهٖ مقدر ہے اور مراد دینی اعمال ہیں یعنی جہاد تلاوت قرآن اور دیگر عبادات، سورۃ بنی اسرائیل 19 اور سورۃ شوریٰ 20۔ اس کے ذریعے سے وہ دنیاوی بدلے سے محروم نہیں ہوگا جس کی طرف اس جملے میں اشارہ کیا گیا ہے۔ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ اس میں شکر سے مراد آخرت کی نیت ہے اور جزاء سے دنیا وآخرت دونوں کا بدلہ مراد ہے سیدنا ابوبکر کی خصوصیت: سابقہ آیت میں شکر کی نسبت اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ ذکر ہوئی ہے اس لیئے اسمیں زیادہ عظمت اور لذت جزاء کی طرف اشارہ ہے اور یہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مقام ہے اور یہاں متکلم کے صیغہ سے ذکر ہوا ہے اس لیئے کہ یہاں عام صحابہ کرام مراد ہیں جو کہ درجے میں ان سے کم ہیں۔ متکلم صیغہ سے ذکر کرنا سبب لذت ہے لیکن اسم ذات سے کم ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ "کتنے ہی نبی تھے جن کے ساتھ مل کر بہت سے اللہ والے اللہ تعالیٰ کے راستے میں لڑے (مگر) اللہ تعالیٰ کے راستے میں پہنچنے والی (مصیبتوں) کی وجہ سے وہ سست نہیں ہوئے اور نہ ہی کمزور پڑے اور نہ ہی (سرنگوں ہوکر) دبے اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے" [146]۔

تفسیر 146: اس آیت میں اصحاب اُحد کیلئے تنبیہ اور وہن ضعف سے اجتناب کا حکم ہے اور صبر و استقامت اور سابقہ انبیاء اور ان کے ساتھیوں کی طرح ثابت قدم رہنے کی تلقین ہے تاکہ آئندہ شکست سے بچ سکیں اور مزید آداب بھی ذکر کیے گئے ہیں وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ ۔ كَاَيِّنْ کا لفظ کاف تشبیہ اور اَيٍّ سے مرکب ہے اور اس ترکیب میں کثرت کا معنی مراد ہے جیسا کہ کم خبریہ میں ہے۔ وقف میں نون کو حذف کرنا چاہیئے تھا لیکن صحابہ کرام نے اس کو مصحف عثمانی میں لکھا ہے اور ابو حیان کے نزدیک یہ مستقل کلمہ ہے جو تکثیر کیلئے بنایا گیا ہے۔ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ اس عبارت میں بہت سی وجوہ ہیں پہلا قول (1) قتل میں ضمیر نبی کی طرف راجع ہے یا كَاَيِّنْ کی طرف۔ كَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ مبتدا ہے اور قٰتَلَ خبر ہے اور مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ جملہ حالیہ ہے۔ دوسرا قول (2) قٰتَلَ نبی کیلئے صفت ہے اور مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ خبر ہے۔ (3) تیسرا قول یہ

ہے کہ قاتل نبی کیلئے صفت ہے۔ خبر مقدر ہے۔ كَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قُتِلَ مضیٰ اور مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ حال ہے۔ چوتھا قول (4) رِبِّيُّوْنَ قَاتَلَ کیلئے فاعل ہے اور سارا جملہ مل کر كَاَيِّنْ کیلئے خبر ہے لیکن اس میں راجح قول پہلے والا ہے اس لیئے کہ وہ اُحد کے حال کے مساوی ہے کیونکہ نبی اکرم ﷺ وہاں تنہا رہ گئے تھے اور فَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ کے مناسب ہے۔ یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہما سے طبری وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ رِبِّيُّوْنَ میں مختلف اقوال ہیں۔ (1) اخفش کا قول ہے کہ رِبِّيٌّ کی جمع ہے اور رب کی طرف منسوب ہے اور را کا کسرہ تبدیلی نسبت کی وجہ سے ہے۔ (2) یہ رِبِّيَّةٌ کی جمع ہے جس کا معنی ہے جماعۃ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما مجاہد، عکرمہ کا قول ہے کہ جماعت کثیرۃ مراد ہے۔ حسن کا قول ہے کہ علماء اور اتقیاء مراد ہیں۔ زید کا قول ہے کہ رِبِّيُّوْنَ سے اتباع کرنے والے اور رَبَّانِيُّوْنَ سے حکام مراد ہیں اور بقول سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہزاروں لوگ مراد ہیں۔ جملے کا خلاصہ یہ ہے کہ بہت سے انبیاء کرام نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں قتال کیا اور ان کے پیروکاروں نے ان کا ساتھ دیا اور میدان جنگ سے فرار اختیار نہیں کیا بلکہ اقتداء و پیروی پر قائم رہے۔ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ وَهَنٌ: بزدلی اور کمزوری کے معنی میں ہے۔ لِمَا میں (مَا) موصولہ ہے یا مصدریہ ہے اور ماصَابَهُمْ میں قتل نبی اور اس کے ساتھیوں کی طرف اشارہ ہے۔ وَمَا ضَعُفُوْا ضعف اصل میں قوت کے نقصان کو کہا جاتا ہے۔ اور رائی، عقل وغیرہ کی کمزوری میں بھی استعمال ہوتا ہے یہاں پر ہمت کی کمزوری ہے یعنی مراد شہادتوں زخموں کو دیکھ کر بے ہمت نہیں ہوئے۔ وَمَا اسْتَكَانُوْا: اس میں عاجزی کرنا تابع ہونا دشمن سے صلح کرنا یا مرتد ہونا مراد ہے۔ اس آیت میں تین درجے ذکر ہوئے ہیں۔ اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف تَنَزُّل ہوا ہے اس لیئے کہ وَهَن دشمن کے غلبہ کے خوف سے یا دنیا کی محبت کی وجہ سے جہاد چھوڑنے کو کہتے ہیں اور ضعف دلوں میں شکوک و شبہات کے پیدا ہونے کی وجہ سے اور ایمان کے کمزوری کی وجہ سے جہاد کو چھوڑنا ہے اور استکانۃ کا معنی ہے دشمن کے تابع ہو کر ان کے دین میں مل جانا لہذا مجاہدین کو چاہیے کہ اس قسم کی صفتوں سے اجتناب کریں اور یہ اجتناب فرض ہے اور اسکا علاج صبر ہے اس لیئے فرمایا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ان حالتوں سے بچنا صبر ہے یا جہاد کی تمام تکالیف پر صبر کرنا ان مذکورہ تینوں حالات سے حفاظت کا ذریعہ ہے۔

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ "نہیں تھا ان کا قول مگر یہی کہ انہوں نے کہا اے ہمارے رب ہمیں ہمارے کام میں زیادتی اور ہمارے گناہ بخش دے اور ہمارے قدموں کو ثابت رکھ اور کافر قوم کے خلاف پر ہماری مدد فرما" [147]۔

تفسیر 147: اس آیت میں ربیون کی سابقہ صفات کے ساتھ مزید صفات کا ذکر ہے کہ (تضرع) عاجزی اور اپنے قصور کا اعتراف اللہ تعالیٰ کیلئے خاص کرتے ہیں اور تمام مجاہدین کو ایسی دعاؤں کی تعلیم ذکر ہے۔ وَ مَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا ۔ قَوْلَهُمْ خبر مقدم ہے اور اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا اسم موخر ہے۔ پہلے قول سے دعاء مراد ہے یہ حصر اضافی ہے یعنی انہوں نے تمہاری طرح مضطرب الفاظ نہیں کہے ہیں۔ جیسا کہ بعض نے کہا کہ ابوسفیان سے امن طلب کرو کسی نے کہا دین سے پھر جاؤ بعض نے کہا جنگ کیلئے مجبور کیے گئے ہیں بعض نے کہا اللہ تعالیٰ سے التجا کرو۔ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِيْۤ اَمْرِنَا ۔ ذُنُوْب سے چھوٹے گناہ مراد ہیں۔ اِسْرَاف سے بڑے گناہ مراد ہیں یا ذُنُوْب سے عام گناہ مراد ہیں اور اسراف سے نبی کی اطاعت سے تجاوز مراد ہے۔ اس مقام میں اس کی تخصیص اس لیئے کی گئی ہے کہ اُحد میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فرمان سے حکم عدولی کی گئی تھی جس کا ذکر بعد میں آرہا ہے۔ وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ چونکہ گناہوں کے سبب سے جہاد سے روگردانی سستی اور نصرت الٰہی کی بندش آئی تھی تو سب سے پہلے دعاء مغفرت کو ذکر کیا ہے تثبیت اور نصرت بعد میں ذکر کی ہے۔ قرطبی نے فرمایا کہ انسان پر لازم ہے کہ وہ دعائیں پڑھے جو کتاب وسنت سے ثابت ہوں اور دیگر دعاؤں کو چھوڑ دے اس لیئے کہ وہ دعائیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کیلئے پسند کی ہیں اور دعاء کی کیفیات بھی بتائی ہیں لہٰذا لفظوں اور نہ ہی کیفیات کی مخالفت کرنی چاہئے۔

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَ حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۴۸ ع "چنانچہ انہیں اللہ تعالیٰ نے دنیا کا ثواب اور اچھا بدلہ آخرت کا دیا اور اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے" [148]۔

تفسیر 148: اس آیت میں دعاء کی قبولیت کا ذکر ہے دعاء میں پہلے مغفرت کا ذکر ہوا تھا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا بعد میں دنیا کی طلب ہے نصرت اور تثبیت قبولیت میں دونوں کا ذکر ہے مگر مانگی گئی ترتیب سے ہٹ کر ہے یعنی لف نشر غیر مرتب کے ساتھ قبولیت ہوئی۔ یعنی پہلے ثَوَابَ الدُّنْيَا ذکر کیا اور دوسرے نمبر پر حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ قبولیت دعاء میں دنیا کو اس لیئے مقدم کیا کہ یہ وجود میں پہلے ہے اور آخرت بعد میں ہے اور دعاء میں آخرت اس لیئے پہلے ذکر ہے کہ اللہ والوں کے نزدیک آخرت اہم ہے۔ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا دنیا کے ثواب میں نصرت الٰہی دشمن کے شکست، بہادری کا نام کمانا اور دیگر فائدے یعنی زیادت ایمان وغیرہ داخل ہے۔ فَاٰتٰىهُمُ فعل ماضی مضارع کے معنی میں ہے یہ بطور وعدہ ہے۔ وَ حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ آخرت کا اجر سب سے حسین ہے اس لیئے اس کے ساتھ حسن ذکر کیا اور دنیا میں

تو بدلے کے ساتھ تکلیف بھی ہوتی ہے اس لیئے اس کے ساتھ حسن ذکر نہیں کیا ہے۔ فائدہ: سابقہ آیت میں ارادہ ذکر ہوا تھا تو اس کے ساتھ اِیۡتَائِ یعنی دینا کے ساتھ ذکر کیا تھا جو کہ تبعیض کی دلیل ہے اور یہاں تو مجاہدہ تَضَرُّع اور طلب ذکر ہے تو یہاں پر مِنۡ ذکر نہیں کیا ہے۔ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ احسان کا وہی معنیٰ ہے جو حدیث جبرئیل میں ذکر ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو گویا کہ تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو اگر یہ کیفیت نہ ہو تو کم از کم یہ کیفیت ضرور ہونی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دیکھ رہا ہے (متفق علیہ) اس کو اخلاص بھی کہا جاتا ہے یہ قبولیت عبادت کیلئے شرط ہے اور دعا بھی عبادت میں داخل ہے۔

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تُطِيۡعُوا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يَرُدُّوۡكُمۡ عَلٰٓى اَعۡقَابِكُمۡ فَتَنۡقَلِبُوۡا خٰسِرِيۡنَ ۝١٤٩

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو اگر تم ان لوگوں کی اطاعت کرو گے جنہوں نے کفر کیا ہے تو وہ تمہیں تمہاری ایڑیوں پر (کفر) کی طرف لوٹا دیں گے پھر تم خسارہ کے ساتھ لوٹو گے" [149]۔

تفسیر 149: (ربط) مجاہدین کی اچھی صفات کی طرف ترغیب دینے کے بعد اب تحذیر کا ذکر ہے کہ دشمنوں کی صفات اپنانے سے بچ جاؤ اور یہ بھی شکست سے بچنے کیلئے ذریعہ ہے۔ يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تُطِيۡعُوا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا اس میں عام کافروں کی صفات اور خصوصاً جنگ اُحد میں شریک ہونے والے کفار اور منافقین کی صفات کا ذکر ہے جنہوں نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ یہ نبی حق پر نہیں ہے ورنہ اُحد میں شکست نہ اُٹھاتا لہٰذا اپنے دین سے پلٹ جاؤ اور آیت کے عموم سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی کافر کی کوئی بات نہیں ماننی چاہئے۔ ابو حیان کا قول ہے کہ اجماع اور نصوص کے اشارے سے ثابت ہے کہ راستے کی نشاندہی کرنے والا اور ایسی رائے دینے والا جو مصلحت پر مبنی ہو اور مصلحت واضح ہو اور وہ عورت جو مسلمان خاوند کو مشورہ دیتی ہے اگرچہ وہ اہل کتاب میں سے ہو یہ مستثنیٰ ہے يَرُدُّوۡكُمۡ عَلٰٓى اَعۡقَابِكُمۡ اس سے مراد اسلام سے مرتد ہونا ہے۔ فَتَنۡقَلِبُوۡا خٰسِرِيۡنَ اس میں دنیا و آخرت کا نقصان دونوں شامل ہے دنیاوی نقصان یہ ہے کہ دشمن کے تابع ہو جاؤ گے، ذلت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گے اور محتاج رہو گے، یہ دنیاوی ذلت ہے اور آخرت کا خسارہ یہ ہے کہ اپنے مستقل اجر سے محرومی اور ہمیشہ کے عذاب کے حقدار ہو گے۔ لفظ انقلاب میں اشارہ ہے کہ دین اسلام میں جو دنیا و آخرت کی عزت ہے وہ کفر کی وجہ سے بالکلیہ ختم ہو جاتی ہے۔

بَلِ اللّٰهُ مَوۡلٰٮكُمۡ‌ۚ وَهُوَ خَيۡرُ النّٰصِرِيۡنَ ۝١٥٠

"بلکہ اللہ تعالیٰ تمہارا کارساز ہے اور وہ سب سے بہترین مددگار ہے" [150]۔

تفسیر 150: اس آیت میں ثابت قدمی اور تسلی دینا مقصود ہے اور لفظ بَلِ اللّٰہُ میں پہلے سے اعراض ذکر ہو رہا ہے کہ یہ کافر کسی بھی حال میں دوستی کے لائق نہیں ہیں اس لیئے کہ ان میں صفت ولایت نہیں ہے اور صفت ولایت اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے۔ مَوْلٰىكُمْ متولیٰ اور ناصر کے معنی میں ہے جو محافظ بھی ہے۔ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِينَ: اللہ تعالیٰ کے بہتر مددگار ہونے کی کئی وجوہات ہیں؟ (1) اللہ کی مدد کے بعد کسی اور کی مدد کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے۔ (2) اللہ کی نصرت دنیا و آخرت دونوں میں ہے۔ (3) اللہ کا علم وقدرت عام ہے بندے کی حاجت اور زمانہ نصرت پر پورا علم وقدرت رکھتا ہے۔

سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا ۚ وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ۚ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِينَ ۝ ''عنقریب ان لوگوں کے دلوں میں ہم رعب ڈال دیں گے جنہوں نے کفر کیا ہے بسبب اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان چیزوں کو شریک ٹھہرانے جن کے شریک ہونے پر اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور انکا ٹھکانا آگ ہے اور وہ ظالموں کیلیے برا ٹھکانا ہے'' [151]۔

تفسیر 151: اس آیت میں نصرت الٰہی کے ایک طریقے کا ذکر ہے اور نصرت کی تنبیہ کیلیے صیغہ جمع متکلم کا ذکر ہے یعنی سَنُلْقِي القاء کا استعمال اجساد میں ہوتا ہے یہاں بطور مجاز کثرت کیلیے استعمال کیا گیا ہے۔ الرُّعْبَ اصل میں بھر جانے کو کہا جاتا ہے اور عرف میں اس خوف کو کہا جاتا ہے جس کی ہیبت سے دل بھر جائے۔ یہ وعدہ اُحد میں پورا ہوا چنانچہ کفار اُحد میں جنگ میں غلبہ حاصل کرنے کے باوجود اس رعب کے سبب سے میدان سے واپس پلٹ گئے پھر راستے سے لوٹ آنے کی کوششیں کیں مگر بے ہمت ہو کر پھر پلٹ گئے۔ یہ وعدہ مستقبل کیلیے بھی تھا کیونکہ اُحد کے بعد ہر جنگ میں کافر مغلوب ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو غلبہ دیا ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ یہ وعدہ آج بھی موجود ہے کہ کافروں کے دلوں میں خوف اسلام ہے اس لیئے وہ ہر وقت دین اسلام کو کمزور کرنے کی کوشش میں ہیں۔ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللّٰهِ (بَا) سببیہ ہے اور (مَا) مصدریہ ہے۔ شرک ہر اعتبار سے سبب رعب ہے اس لیئے کہ مشرک مخلوق سے ڈرتا ہے اور اس سے مدد و نصرت طلب کرتا ہے جو انتہائی بے عقلی کا مظاہرہ ہے تو مجاہدین سے ضرور خوفزدہ ہوتا ہے مشرک آخرت سے غافل ہوتا ہے جس کی وجہ سے موت سے نفرت اور دنیا کو پسند کرتا ہے اس لیئے مجاہد کے مقابلے سے گھبراتا ہے۔ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا۔ بِهِ کا مضاف مقدر ہے یعنی بِإِشْرَاكِهِ وَبِعِبَادَتِهِ سلطان برھان وحجت کے معنی میں ہے۔ نازل ہونے کی نفی کی گئی مطلب یہ ہے کہ اس کی کوئی دلیل نہیں چونکہ عقیدہ ثابت کرنے یا اس پر حکم لگانے کیلیے دلیل مُنَزَّلْ (آسمانی) ہونی چاہیے اس لیئے انزال کی نفی کی

گئی کہ شرک پر کوئی دلیل نہیں۔ امام قرطبی نے فرمایا ہے کہ تمام ملتوں اور ادیان میں بتوں اور غیر اللہ کی عبادت ثابت نہیں اور عقل کے بھی خلاف ہے۔ فائدہ (1): امام آلوسی نے لکھا ہے کہ یہ دلیل ہے کہ توحید کے باب میں دلیل آسمانی درکار ہے کسی کی آراء اور خواہشات باطلہ کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ابوحیان نے فرمایا ہے کہ اس میں رد تقلید ہے کیونکہ مقلد کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی ہے۔ صاحب اللباب نے لکھا ہے کہ یہ آیت تقلید کے فاسد ہونے پر دلیل ہے کیونکہ شرک پر کوئی دلیل نہیں ہے تو باطل ہے اسی طرح ہر قول جس پر دلیل نہیں ہے وہ باطل ہے۔ ابوسعود اور امام رازی کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ شرک کے باطل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے ثبوت پر دلیل نہیں ہے تو اسی طرح تقلید بھی باطل ہے اس لیئے کہ اس پر بھی دلیل نہیں ہے۔ فائدہ (2): قرآن مجید نے مشرکین اور شرک کی مذمت کی ہے اور ان کے رد میں عدم انزال کو دلیل کے طور پر ذکر کیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ باب عقیدہ میں اعتبار نازل شدہ دلیل کا ہے وحی جلی ہو یا خفی ہو۔ مندرجہ ذیل مقامات مطالعہ کریں۔ سورۃ اعراف آیت 33 اور 71 سورۃ الانعام آیت 81 سورۃ حج آیت 71 سورۃ نجم آیت 23 سورۃ روم آیت 35 سورۃ سباء آیت 44 سورۃ فاطر آیت 40 سورۃ احقاف آیت 4 مذکورہ تمام مقامات پر مشرکین سے آسمانی دلیل کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۔ مَاْوٰى اس مقام کو کہا جاتا ہے جس کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور یہ دنیاوی عذاب کے بعد اخروی عذاب کا ذکر ہے۔ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ۔ مَثْوٰى قیام کی جگہ کو کہا جاتا ہے لیکن جب بے اختیار ہو اس میں ترتیب وجودی ہے یعنی پہلے انسان ایک جگہ کی طرف رجوع کرتا ہے پھر اس میں قیام اختیار کرتا ہے۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

"یقیناً اللہ تعالیٰ نے سچا کر دکھایا اپنا وعدہ جب تم ان کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے کاٹ رہے تھے یہاں تک کہ تم پست ہمت ہو گئے اور آپس میں تم نے حکم رسول میں اختلاف کیا بعد اس کے کہ تمکو دکھلا یا وہ جسے تم پسند کر رہے تھے بعض تم میں سے دنیا کا ارادہ کر رہے تھے اور بعض تم میں سے آخرت کا ارادہ کرتے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے ان کافروں سے پھیر دیا تاکہ وہ تمہیں آزمائے اور یقیناً اس نے تمہیں معاف کیا اور اللہ مومنوں پر بڑے فضل والا ہے" [152]۔

تفسیر 152: (ربط) گزشتہ آیت میں نصرت الٰہی کا وعدہ ذکر ہوا ہے تو اس آیت میں سوال جواب ہو رہے ہیں۔ منافقین

نے سوال کیا تھا کہ اُحد میں اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد کیوں نہیں کی تو جواب دیا گیا کہ ابتداء میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہوا لیکن بعد میں تین اسباب ایسے پیدا ہوئے جو سبب شکست ہے۔ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ۔ صدق کبھی متعدی بالذات ہوتا ہے دوسرے مفعول کی طرف جیسا کہ یہاں پر ہے اور کبھی متعدی بواسطہ (فی) ہوتا ہے یہاں پر کمال اور وفی کے معنی کو متضمن ہے اس لیئے فِیْ کو حذف کیا ہے۔ وعدہ سے مراد ملائک بھیجنا اور نصرت کرنا ہے لیکن اس کے لئے دو شرطوں کو ذکر کیا جو آیت 120 اور 125 میں گزر چکے ہیں۔ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ۔ حَسّ یعنی قتل سے حس ختم کرنا مراد ہے اور جڑ سے ختم کرنا بذریعہ قتل مراد ہے۔ اِذْنِ سے توفیق الٰہی یا قضا فیصلہ مراد ہے۔ صدق سے تکمیل وعدہ مراد ہے کہ مسلمانوں نے مشرکین کے 22 افراد پہلے ہی مرحلے میں قتل کئے اور باقی بھاگ کھڑے ہوئے ان کی عورتیں لباس پنڈلیوں سے اٹھا کر پہاڑوں میں دوڑ رہی تھیں ان کی پنڈلیوں پر زیور آویزاں تھے اور بہت ساری غنیمت صحابہ کرام سمیٹ رہے تھے جیسا کہ صحیح بخاری باب غزوۂ اُحد میں ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ ۔ حَتّٰى اِلٰی کے معنی میں ہے یہ تَحُسُّوْنَهُمْ یا صَدَقَكُمْ کے ساتھ متعلق ہے یا محذوف کے ساتھ متعلق ہے یعنی دَامَ لَكُمْ ذٰلِكَ اِلٰی وَقْتِ الْفَشَلِ اس میں اِذَا وقتیہ مصدریہ یا ابتدائیہ ہے اور اذا شرطیہ ہے فَشِلَ معنی ہمت کی کمزوری ہے اور بزدلی نامردی کا معنی شان صحابہ کے ساتھ مناسب نہیں ہے۔ حدیث صحیح بخاری کتاب المغازی حدیث 4043 ابوداؤد کتاب الجهاد حدیث 2662 میں تفصیلی واقعہ آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس افراد کو عبداللہ بن جبیر کی امارت میں مقرر کیا تھا اور ان کو اس بات کی تاکید کی تھی کہ اُحد پہاڑ اور مدینے کے درمیان جو ٹیلہ واقع ہے اس پر پہرا دیتے رہو اور اس مقام کو نہیں چھوڑنا چاہے تم دیکھو کہ دشمن مغلوب ہوا ہو یا دیکھو کہ غالب ہو لیکن اس مورچہ کو نہیں چھوڑنا اور ہماری مدد کیلئے بھی نہیں اترنا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمان غالب آگئے اور مال غنیمت کو جمع کرنے میں مصروف ہیں تو انہوں نے آپس میں اختلاف کیا بعض نے کہا کہ ہم بھی اتر جاتے ہیں اور بعض نے کہا کہ نہیں اُتریں گے جب تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حکم ثانی نہیں دیں گے تو ان میں سے 40 افراد اُتر گئے اور عبداللہ بن جبیر سمیت 10 افراد مورچہ میں رہ گئے جب خالد بن ولید (جو اس وقت کفار میں تھے) کو معلوم ہوا کہ اس مورچہ سے لوگ اُتر گئے ہیں تو اُحد کی پشت سے حملہ کیا مورچے میں موجود 10 افراد کو امیر سمیت شہید کیا اور ابوسفیان کو آواز دی کہ پلٹ آؤ لشکر لے کر وہ بھی مسلمانوں پر پلٹ آیا مسلمانوں کو درمیان میں گھیر لیا اور انتہائی سخت جنگ ہوئی صحابہ کرام میں سے 70 ستر افراد شہید ہوئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو گئے مال غنیمت ہاتھ سے نکل گیا اس کا تذکرہ اس آیت

اور آئندہ آیات میں کیا گیا ہے۔ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ اختلاف سے مراد نبی کے حکم سے روگردانی ہے کہ انہوں نے اترنے سے منع کیا تھا کہ یہیں رہو جب تک حکم ثانی نہ دوں یا مراد صحابہ کرام کا اختلاف ہے جو غنیمت کیلئے اُترنے میں اختلاف کیا تھا۔ عَصَيْتُمْ سے مراد اس مقام سے اُترنا تھا۔ عصیان نافرمانی کو کہا جاتا ہے جس سے منع کیا گیا ہو۔ مِّنْ بَعْدِ مَا أَرَاكُمْ مَّا تُحِبُّونَ یہ فَشِلْتُمْ اور بعد والے دونوں فعلوں سے متعلق ہے۔ ابوحیان نے کہا مَّا تُحِبُّونَ سے غلبہ اور مال غنیمت مراد ہے اور قرطبی نے کہا کہ کافروں پر غلبہ مراد ہے نیز مسلمانوں کی پسندیدہ چیز فتح و نصرت ہے جو سورۃ صف آیت 13 میں مذکور ہے جو اس آیت کی تفسیر ہے۔ إِذَا فَشِلْتُمْ میں جب إِذَا کو شرطیہ مانا جائے تو اس کی جزاء مقدر ہے جو اُمْتُحِنْتُمْ ہے یعنی تم امتحان میں ڈالے گئے ہو بعض علماء کا قول ہے کہ وَتَنَازَعْتُمْ میں واو زائد ہے جو إِذَا کے جواب میں آ سکتا ہے لیکن پہلا قول بہتر ہے۔ مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے مورچہ مال غنیمت کے ارادے کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا۔ وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنے امیر عبداللہ بن جبیر کے ساتھ مورچے میں شہید ہو گئے اور ان کی یہ شہادت اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ہوئی کہ انہوں نے ان کو مورچہ چھوڑنے سے منع کیا تھا۔ فائدہ: دنیا کی محبت معصیت کا سبب ہے لیکن مَّا تُحِبُّونَ سے مراد فتح و نصرت ہے جو مال غنیمت کیلئے سبب ہے جب کہ یہ محبت معاصی کیلئے سبب نہیں ہے۔ دنیا کے مال کا ارادہ جائز ہے لیکن جہاد کے وقت مناسب نہیں تھا تو یہاں پر بعض صحابہ کرام کا ارادہ ذکر ہوا دنیا کی محبت ذکر نہیں ہے جو کہ صحابہ کرام کی عظمت شان کی واضح دلیل ہے۔ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ یہ مقدر جزاء پر عطف ہے جو کہ اُمْتُحِنْتُمْ ہے۔ عَنْهُمْ کی ضمیر کافروں کی طرف راجع ہے یعنی کافروں سے مقابلے سے تمہیں پھیر دیا۔ لِيَبْتَلِيَكُمْ ابتلاء سے مراد مصیبتوں پر صبر اور میدان جنگ میں ثابت قدمی ہے یا مراد یہ ہے کہ ساتھیوں کی شہادتوں اور زخمی ہونے کی وجہ سے امتحان ہے۔ وَلَقَدْ عَفَا عَنكُمْ یعنی عَصَيْتُمْ میں جس عصیان کی طرف اشارہ تھا وہ معاف ہوا نیز لام اور قد بہت تاکید پر دلالت کرتے ہیں اور اس میں صحابہ کرام کی عظمت شان ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی معافی کا اعلان قرآن کریم میں کیا ہے۔ مفسر قاسمی کا قول ہے کہ ظاہراً ان صحابہ کرام کا توبہ کرنا ثابت نہیں ہے اور توبہ کئے بغیر اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کیا اور سلف صالحین کا یہ قول ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے تو گناہ کبیرہ بھی بغیر توبہ معاف کر دیتا ہے البتہ شرک اور کفر معاف نہیں کرتا ہے۔ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ یہاں فَضْلٍ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس نافرمانی کی وجہ سے ان کو سخت عذاب نہیں دیا جس سے ان کی

جڑیں ختم ہو جائیں۔ لفظ مُّؤْمِنِيْنَ میں اشارہ ہے کہ درگزر اور معافی کا سبب ایمان ہے۔ ابن عطیہ نے حسن سے نقل کیا ہے کہ یہ صحابہ کرام کفار سے لڑنے کیلئے بے تاب تھے جبکہ ان کو ایک چیز سے منع کیا گیا تو انہوں نے اس ممانعت کو ضائع کیا جس پر ان کو سخت غم میں مبتلا کیا گیا لیکن دور حاضر میں تو لوگ گناہ کبیرہ کرتے ہیں اور بڑے فسق و فجور کے مرتکب ہو کر بھی بے پروا پھرتے ہیں عنقریب یہ لوگ جان لیں گے۔

اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿153﴾

"اور جب تم (مدینے کی طرف) چلے جا رہے تھے اور تم کسی کی طرف مڑ کر نہیں دیکھ رہے تھے، اور رسول ﷺ تمہیں پچھلی جماعت میں (کھڑے ہوئے) پکار رہے تھے پھر اس نے تمہیں بدلے میں غم پر غم دیا تا کہ تم غم نہ کھاؤ اس پر جو تم سے فوت ہوا ہے اور نہ ہی (اس تکلیف پر) جو تمہیں پہنچی ہے اور اللہ تعالیٰ جو تم عمل کرتے ہو اس پر خوب خبردار ہے" [153]۔

تفسیر 153: اس آیت میں ان کے ایک اور عصیان اور نافرمانی کا ذکر ہے جو کہ میدان جنگ سے پسپا ہونا تھا اور اس کے ساتھ کیفیت سزا کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اِذْ تُصْعِدُوْنَ یہ صَرَفَكُمْ سے متعلق ہے۔ تُصْعِدُوْنَ (ت) کے پیش کے ساتھ اِصْعَادٌ سے لیا گیا ہے جس کے معنی زمین کے میدانوں اور وادیوں میں چلنا ہے (قرطبی) یا صعید سے لیا گیا ہے جو زمین کی پشت کو کہا جاتا ہے لہٰذا زمین پر چلنے کو (صعید) کہتے ہیں یہ ابو حاتم کا قول ہے اور فراء کے بقول طویل سفر شروع کرنے کو بھی اصعاد کہتے ہیں اور صعود بلندی پر چڑھنے کو بھی کہتے ہیں۔ ابن عطیہ نے پہلے والے قول کو ترجیح دی ہے۔ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ۔ تَلْوٗنَ گردن موڑنے کے معنی میں ہے مقصد یہ ہے کہ دوڑنے کی وجہ سے تم کسی کی طرف التفات ہی نہیں کر رہے تھے یہ مبالغہ ہے کہ مڑ کر بھی نہیں دیکھ رہے تھے وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ۔ الرَّسُوْلُ میں الف لام برائے عہد ہے یعنی محمد ﷺ آواز لگا رہے تھے اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ مَنْ يَّكِرَّ فَلَهُ الْجَنَّةَ اے اللہ کے بندو! میری طرف آؤ اور جو بھی دوبارہ حملہ کرے گا اس کیلئے جنت کی خوشخبری ہے۔ اُخْرٰىكُمْ وہ جماعت ہے جو لشکر میں آخری سرے پر ہوتی ہے جس کو ساقہ کہا جاتا ہے لہٰذا اُخْرٰى مُتَاَخِّرٌ کے معنی میں ہے۔ اس سے رسول ﷺ کی شجاعت کی طرف اشارہ ہے کہ لشکر سے پیچھے کھڑے ہو کر آواز لگا رہے تھے جو کہ عظیم شجاعت کی بات ہے۔ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ اَثَابَ کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے۔ غَمًّا کو بمعنی بدلہ مجازاً ثواب قرار دیا یعنی اگر فرار نہ ہوتے تو یہ ثواب ہوتا۔ بِغَمٍّ (مَا)

مصاحبت کیلئے ہے جو مع کے معنی میں ہے اور اس سے مراد پریشانیوں اور غموں کی کثرت ہے اور اُحد کی شکست، مال غنیمت کا ہاتھ سے نکل جانا صحابہ کرام کی شہادت اور زخمی ہونا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کی خبر اور زخمی ہونا اور خالد بن ولید و ابو سفیان کے لشکر کا غلبہ یہ سارے غم جمع ہوگئے یا باء سبب کے لئے ہے تو پہلے غم سے مراد وہ جنس مصائب ہیں جو ذکر ہوئے اور دوسرے غم (سبب) سے مراد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کی مخالفت کی وجہ سے رسول علیہ السلام کا غم پہنچانا تھا۔ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا اس لام کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ (1) پہلا قول: یہ لام اَثَابَكُمْ کے ساتھ متعلق ہے اور لام زائد ہے کیونکہ مصیبتوں کے پہنچنے سے غم حاصل ہوتے ہیں نفی نہیں ہوتی ہے۔ (2) دوسرا قول: یہ (عفا) سے متعلق ہے کیونکہ عفو سے مومن کے تمام غم ختم ہوجاتے ہیں۔ درمیان میں واسطے زیادہ ہیں لہٰذا یہ ضعیف ہے۔ (3) تیسرا قول: یہ اَثَابَكُمْ سے متعلق ہے اور لام زیادہ نہیں ہے البتہ تَحْزَنُوْا آئندہ حزن غم دور ہونے کیلئے ہے یعنی بہت ساری پریشانیوں مصیبتوں کے عادی ہوجاؤ گے تو آئندہ کی پریشانیوں اور مصیبتوں کے آنے پر استقامت کروگے۔ (4) چوتھا قول: یہ متعلق ہے اَثَابَكُمْ کے اور لام زائد نہیں ہے البتہ غَمًّا سے مراد صرف نبی کی موت کی خبر سننا ہے یعنی اس پروپیگنڈا سے تمہارے سارے غم ختم ہوگئے کیونکہ صحابہ کرام پر سارے غموں سے بھاری غم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تھی اور یہ اس میں حکمت تھی کہ بڑی مصیبت سے چھوٹی مصیبتیں ختم ہوجاتی ہیں۔ عَلٰى مَا فَاتَكُمْ اس سے غنیمت مراد ہے۔ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ اس سے مراد قتل اور شکست ہے۔ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ اس جملے میں ڈانٹ و تنبیہ ہے کہ رسول کی نافرمانی سے بچتے رہنا اور میدان جنگ سے فرار اختیار کرنے سے بچو۔

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ "پھر اس غم کے بعد اس نے تم میں سے کچھ لوگوں پر امن بخشنے والی اونگھ طاری کردی اور کچھ لوگ ایسے تھے جنہیں صرف اپنی جانوں کی فکر پڑی ہوئی تھی وہ اللہ کے ساتھ ناحق جاہلیت کا گمان

کررہے تھے وہ کہتے تھے کہ ہمارے لئے امداد میں سے کچھ حصہ ہے کہہ دیجئے امداد سب کی سب اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے وہ اپنے دلوں میں اس بات کو چھپاتے ہیں جو تمہیں ظاہر نہیں کرتے وہ کہتے ہیں کہ اگر ہمارے پاس کوئی اختیار ہوتا تو (ہمارے رشتہ دار) قتل نہ کئے جاتے آپ فرما دیجئے اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن لوگوں پر قتل ہونا لکھ دیا گیا تھا ضرور نکل جاتے اپنی قتل گاہوں کی طرف تاکہ اللہ تعالیٰ تمہیں آزمائے جو تمہارے سینوں میں ہے اور صاف کرے ان وسوسوں کو جو تمہارے دلوں میں ہے اور اللہ تعالیٰ سینوں کے راز خوب جانتا ہے" [154]۔

تفسیر 154: اس آیت میں مؤمنین کیلئے تسلی اور منافقین کیلئے (ڈانٹ) ہے اور آیت کی خصوصیت یہ ہے کہ تمام حروف ہجاء اس میں الف سے ی تک موجود ہیں ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ یہ اَثَابَكُمْ پر عطف ہے اور فاعل کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے اَنْزَلَ کی تعبیر سے اس لیئے ذکر کی ہے تاکہ رحمت پر دلالت کرے اس لیئے کہ یہ صیغہ اکثر رحمت کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ اَمَنَةً اَمْنٌ اور اَمَنَةً میں فرق یہ ہے کہ اَمَنَةً اس جگہ استعمال ہوتا ہے جہاں خوف ختم ہو جائے لیکن خوف کا سبب باقی ہو اور یہ مقام کرامت ہے اور اَمْنٌ میں خوف وامکان خوف دونوں کا خاتمہ ہوتا ہے۔ نُّعَاسًا یہ بدل اشتمال یا عطف بیان ہے۔ نُّعَاس اس معمولی نیند کو کہا جاتا ہے جس کا اثر سر میں محسوس ہو اس طرح حالات جنگ بدر میں بھی پیش آئے تھے جن کا ذکر سورۃ انفال آیت 11 میں ہے۔ سوال: سورۃ انفال میں النُّعَاس پہلے ذکر کیا ہے اور یہاں بعد میں ذکر کیا ہے؟ جواب: بدر میں غم کم تھا اس لیئے غم کے علاج کو پہلے ذکر کیا اور حکمت بعد میں ذکر کی جو کہ اَمَنَةً ہے اور احد میں غم زیادہ تھا اس لیئے ان غموں کا ازالہ (اَمَنَةً) پہلے ذکر کیا اور علاج بعد میں ذکر کیا جو کہ النُّعَاس ہے۔ يَّغْشٰى طَآىِٕفَةً مِّنْكُمْ کی ضمیر نُّعَاس کی طرف راجع ہے اور اس سے مراد وہ تمام مؤمنین ہیں جو احد میں شریک تھے اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ نیند سے انسان کی طبیعت میں خوشی آتی ہے اور غم بھول جاتا ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ یہ نبی ﷺ کا معجزہ ہے اور معجزہ دیکھنے سے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ (صحیح بخاری کتاب المغازی حدیث 4068،4562 میں ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جنگی صف میں کھڑے ہونے کے باوجود میرے ہاتھ سے تلوار گررہی تھی اور میں پھر اٹھالیتا تھا۔ ترمذی کتاب التفسیر حدیث 3018 کی روایت میں ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ میں نے جب سر اٹھایا تو کسی کو نہیں دیکھا مگر ہر ایک شخص کا سر خود (جنگی ٹوپی) کے نیچے (نُّعَاس) نیند سے جھکا ہوا تھا۔ وَطَآىِٕفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ اس طَآىِٕفَةٌ سے منافقین مراد ہیں اور ان کی پانچ بری (قبیح) صفات کا ذکر ہے اَهَمَّتْهُمْ

اِهْمَامٌ کا معنیٰ ہے غم میں گرانا یعنی وہ اپنے نفسوں کے غم میں ڈوبے ہوئے تھے کہ ہم قتل سے بچ جائیں جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے قتل اور دین اسلام پر کافروں کا غالب ہونا اس کی کوئی فکر وہ نہیں کرتے تھے۔ أَهَمَّ کا دوسرا معنیٰ دلوں میں وسوسہ پیدا ہونا ہے کہ دین اسلام کو چھوڑ دو۔ يَظُنُّونَ بِاللهِ غَيْرَ الْحَقِّ یہ کلام استنافی ہے اور سوال کا جواب ہے سوال یہ تھا کہ انہوں نے اپنے نفسوں کو کیوں (هَمّ) میں ڈالدیا تو جواب یہ ہے کہ ناحق گمان کی وجہ سے انہوں نے ایسا کیا۔ غَيْرَ الْحَقِّ۔ يَظُنُّونَ کیلئے مفعول یا مفعول مطلق کے حکم میں ہے ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ یہ بدل ہے غَيْرَ الْحَقِّ سے یا مفعول مطلق ہے الْجَاهِلِيَّةِ یہ مقدر موصوف کیلئے صفت ہے جو کہ اَلْمِلَّةِ الْجَاهِلِيَّةِ یا اَلْفِرْقَةِ الْجَاهِلِيَّةِ ہے اور اس سے مراد ظاہر کافر ہیں اور ان کا ناحق گمان یہ تھا کہ اس نبی اور اس کے دین کو اللہ تعالیٰ جلدی ختم کرے گا یا یہ کہ اس نبی اور صحابہ کی اللہ تعالیٰ کوئی مدد نہیں کرے گا اس طرح سورۃ فتح آیت 6 اور 12 میں ہے اور امام قاسمی نے اس کی کئی صورتیں تحریر کی ہیں۔ يَقُولُونَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ یہ جملہ يَظُنُّونَ کیلئے تفسیر ہے یا جملہ مستانفہ ہے جس میں ظَنّ کی تفصیل اور بیان ہے۔ هَلْ استفہام انکاری کیلئے ہے اور امر سے مراد نصرت اور غلبہ ہے ان کا مقصد اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر طعن کرنا تھا۔ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلّٰهِ۔ یعنی نصرت اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے وہ اسے حقدار یعنی مؤمنین کو مناسب وقت پر دیتا ہے۔ يُخْفُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُونَ لَكَ اس سے مراد وہ ظن ہے جس کا ذکر گزر گیا یا مراد کفر نفاق و شکوک ہیں جو خوف کی وجہ سے ظاہر نہیں کرتے۔ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا یہ جملہ استنافیہ ہے جس میں سوال کا جواب ہے یعنی وہ کونسی بات ہے جس کو وہ ظاہر نہیں کرتے تو جواب یہ ہے کہ انکا یہ قول ان کے آپس میں تھا اور یہ بات بھی وہ ایسے کرتے تھے اگر ظاہر کرتے تو مسلمانوں پر انکا کفریہ عقیدہ ظاہر ہو جاتا۔ یہاں امر سے مراد اختیار ہے کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ اُحد میں ہم مجبور کر کے لائے گئے ہیں یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری بات نہیں مانی ورنہ ہم تو مدینہ سے باہر جنگ کیلئے جانے پر تیار نہیں تھے اگر ہماری بات مانی جاتی تو ہمارے ساتھی یعنی صحابہ کرام قتل نہ ہوتے یعنی قتل صحابہ کیلئے مدینہ سے نکل جانا سبب ہے اور یہ کلمہ (لَوْ) منافقین کا شیوہ اور علامت ہے وہ تقدیر کے مقابل لفظ (اگر یوں ہوتا) استعمال کرتے ہیں اس لیئے صحیح مسلم فی القدر حدیث 2052 میں اس لفظ سے منع آیا ہے۔ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلٰى مَضَاجِعِهِمْ کا معنیٰ ہے باہر نکل جانا یعنی جہاد کے علاوہ کسی اور سبب سے گھروں سے نکل جاتے۔ كُتِبَ سے مراد تقدیر میں لکھنا ہے جو اللہ تعالیٰ کا علم سابق کہلاتا ہے۔

اَلْقَتْلُ سے مراد مقتول ہونا ہے اور مَضَاجِعِهِمْ مَضْجَعٌ کی جمع ہے یعنی آرام کیلئے اور نیند سونے وغیرہ کیلئے زمین پر گرنے اور ٹیک لگانے کی جگہ اور یہاں مراد قتل کئے ہوئے مقتولوں کے گرنے کی جگہ ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ صحابہ کرام شہادتوں کے بعد نعمتوں جنتوں میں اپنی آرام گاہوں میں ہیں جیسے انسان اپنے بستر پر آرام کرتا ہے۔ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ یہ مقدر عبارت پر عطف ہے یعنی یَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرَهٗ وَلِيَبْتَلِيَ یا مقدر فعل کیلئے علت ہے یعنی فَعَلَ اللّٰهُ هٰذِهِ الْاُمُوْرَ لِيَبْتَلِيَ۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ لِكَيْلَا تَحْزَنُوْا پر عطف ہے اور درمیان میں معترضہ جملے ہیں اور ابتلاء سے مراد اظہار ہے۔ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ سے مراد خفیہ راز ہے جو ان کے دلوں میں تھے لہٰذا یہ خطاب منافقین کو ہے وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ تمحیص صفائی کے معنی میں ہے یعنی ہر قسم کی گندگی میل کچیل سے پاک کرنا۔ یہ خطاب ایمان والوں سے ہے۔ صُدُوْرِ (صدر) کی جمع سینہ کو کہا جاتا ہے جو دل کی جگہ ہے اور باطنی احساس پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جس سے مراد اخلاق اور راز ہیں۔ قلوب قلب کی جمع ہے اور اعتقاد پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اخلاق کے ساتھ لفظ ابتلاء اور عقائد کے ساتھ لفظ تمحیص مناسب تھا۔ اس طرح پہلے کا تعلق منافقین اور دوسرے کا مؤمنین سے ہے۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ یعنی ابتلاء اور تمحیص اس لیئے نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کا علم حاصل ہو بلکہ وہ تو دلوں کے راز بھی جانتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۵۵﴾ "یقیناً وہ لوگ جو تم سے اس دن پھر گئے تھے جب دو جماعتیں باہم ملی تھیں۔ یقیناً ان کو شیطان نے ان کی بعض کوتاہیوں (جو انہوں نے کیں) کیوجہ سے پھسلا دیا تھا یقیناً اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کیا۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا بردبار ہے" [155]۔ ع

تفسیر 155: اس آیت میں شکست معنوی کا ذکر ہے جب انہوں نے دشمن کو پیٹھ دکھائی مدینے کی طرف جانے والے ہوں یا پہاڑ پر چڑھنے والے ہوں۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ صرف بارہ (12) افراد میدان جنگ میں رہ گئے تھے صحیح بخاری کتاب الجہاد حدیث 3039۔ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ۔ اِسْتَزَلَّ، زَلَّ سے لیا گیا ہے پھسل جانے کو کہا جاتا ہے جو کہ شکست سے کنایہ ہے اور اس میں (س) اور (ت) برائے تاکید ہیں یعنی شیطان نے ان کو پھسلانے کیلئے مکمل کوششیں کی ہیں۔ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا اس سے مراد اس مورچے کو چھوڑنا ہے جس کے چھوڑنے سے ان کو منع کیا گیا تھا اور دیگر غلطیاں بھی تھیں جو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں اور اس

میں اشارہ ہے ایک گناہ دوسرے گناہ پر بندے کو اُبھارتا ہے اور بعض الفاظ میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو تمام گناہوں کی سزا نہیں دیتا بلکہ اکثر معاف کر دیتا ہے اور گناہوں سے دنیا کے مصائب میں بندے کو مبتلا کر دیتا ہے تو وہ معاف ہو جاتے ہیں۔ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ جو عفو آیت 152 میں ہے وہ مورچہ چھوڑنے کی وجہ سے ہے اور یہ عفو میدان قتال چھوڑنے کی وجہ سے ہے۔ یہ وہ جملہ ہے جس کو ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک عراقی کے جواب میں فرمایا تھا جب اس نے سیدنا عثمان کی شان میں طعن کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ تو احد میں میدان سے فرار ہوا تھا تو اس نے جواب میں فرمایا کہ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ اللہ تعالیٰ نے تو ان کو معاف کیا ہے اور تم معاف نہیں کرتے ہو۔ (صحیح بخاری کتاب فضائل اصحاب النبی حدیث 3699)۔ اور یہ صحابہ کرام کی عظمت شان کی دلیل ہے کہ ان کی غلطیوں پر درگزر میں اللہ تعالیٰ نے بڑی تاکیدات اور زوردار انداز میں آیتیں نازل کی ہیں اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ : یہ جملہ ماقبل عفو اکیلئے بطور علت ہے۔ غفور ہے گناہوں کو معاف کرتا ہے اور حلیم ہے جلد عذاب نہیں دیتا ہے یہ دونوں صفات ایمان والوں کیلئے ہیں یا عفو میں اشارہ ہے مؤمنوں کے حالات کی طرف کہ ان کو معاف کیا اور حلیم میں اشارہ حالات منافقین کی طرف کہ ان کا گناہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوگا کیونکہ ان کا کفر یہ عقیدہ مخفی ہے لہٰذا عفو اور مغفرت ان کیلئے نہیں ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾ "اے لوگو جو ایمان لائے ہو ان لوگوں کی مانند مت ہو جاؤ جنہوں نے کفر کیا اور انہوں نے اپنے (نسبی) بھائیوں کے بارے میں کہا جب وہ سفر میں یا جہاد میں تھے اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ وہ مرتے اور نہ ہی وہ قتل کئے جاتے تاکہ (اللہ تعالیٰ ان کے اس فاسد خیال) کو ان کے دلوں میں ارمان بنادے اور اللہ تعالیٰ ہی مارتا اور زندہ کرتا ہے اور جو تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ خوب دیکھنے والا ہے" [156]۔

تفسیر 156 : (ربط 1) سابقہ آیت میں ایمان والوں پر احسان کا ذکر کیا گیا تو اب ان کو کفار اور منافقین کی عادتوں اور عقائد و الفاظ میں ان کی مشابہت سے روکا جا رہا ہے تاکہ پھر کسی گناہ میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ (ربط 2) گزشتہ آیت میں انکا یہ قول ذکر کیا گیا ہے کہ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا تو اب اس سے ملتا جلتا ایک اور قول ذکر کیا جاتا ہے اور دونوں کی مشابہت سے ایمان والوں کو روکا گیا ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا

یہ ایمان والوں کو شکست سے بچنے کیلئے تعلیم دی جاتی ہے۔ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اس سے تمام کافر مراد ہیں اور منافق اس میں سب سے پہلے شامل ہیں کیونکہ سیاقِ آیت میں داخل ہیں اور بقول سمعانی اس سے مراد منافقین ہیں۔ اس میں قول اور عقائد دونوں میں مشابہت سے منع کیا گیا ہے کیونکہ پہلے یہ بات گزر گئی ہے کہ (لَوْ) کلمہ تقدیر کے مقابل پڑھنا منع ہے (صحیح مسلم)۔ وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ لفظ كَفَرُوْا کے بعد اس جملے کو ذکر کرنے میں اشارہ ہے انہوں نے یہ قول بطور ہمدردی یا بھائی چارے نہیں کہا ہے بلکہ بسبب کفر کہا ہے۔ اِخْوَانِهِمْ اس سے اخوت نسبی مراد ہے کیونکہ منافقین اور شہداء احد اکثر خزرج قبیلے سے تھے اور یہ کہنے والے منافقین تھے۔ اگر ضَرَبُوْا اور غُزًّى سے منافقین مراد لئے جائیں تو پھر یہ اخوت عقیدے اور نسب دونوں میں مراد ہے۔ سوال: اِذَا تو زمانہ مستقبل کیلئے آتا ہے اور قَالُوْا فعل ماضی ہے تو اِذَا اس کیلئے ظرف کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟ جواب (1): ابن عطیہ نے فرمایا ہے کہ الَّذِيْنَ مبہم ہے جو ماضی اور مستقبل دونوں کو شامل ہے لہٰذا یہ قول عام ہے، ماضی اور مستقبل دونوں میں اس طرح عمل کرنے والوں کو شامل ہے جواب (2): ابوحیان نے فرمایا ہے کہ یہاں پر اِذَا حِيْنَ کے معنی میں ہے لہٰذا اس کا استعمال ماضی کیلئے درست ہے۔ جواب (3): زمخشری نے فرمایا ہے کہ یہ حِيْنَ تَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ کے معنی میں ہے۔ ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ ضَرَبَ اصل میں کسی چیز کو دوسری چیز پر مارنا ہے پھر اس کا استعمال سفر میں بھی ہوتا ہے یعنی قدموں کو زمین پر رکھنا یا مارنا۔ یہاں تجارت کیلئے سفر مراد ہے خواہ تری میں ہو یا خشکی میں ہو۔ اَوْ كَانُوْا غُزًّى: یہ غازی کی جمع ہے غزا اور سفر میں عموم خصوص مِنْ وَجْهٍ کی نسبت ہے۔ یعنی سفر بغیر غزا کے اور غزا بغیر سفر کے اور سفر غزا کیلئے تینوں حالتیں موجود ہو سکتی ہیں اس وجہ سے دونوں حالتوں کا ذکر ہے اور مَاتُوْا اور قُتِلُوْا اس کے بعد مقدر ہے۔ لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا ۔ كَوْنُ سے مراد اقامت ہے یعنی بیٹھے رہتے سفر و غزا میں نہ جاتے تو نہ مرتے۔ مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا امام ابوحیان نے فرمایا ہے کہ یہ قول ان کا انتہائی جہالت پر مبنی ہے کیونکہ جاہل لوگ بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ سفر میں بھی موت آتی ہے۔ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اس لام میں دو قول ہیں: (1) یہ لام برائے تعلیل ہے اور ذٰلِكَ میں ان کے قول اور اعتقاد کی طرف اشارہ ہے اور اس کا متعلق مقدر ہے یعنی اَوْقَعَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ لِيَجْعَلَ یا لَا تَكُوْنُوْا مِثْلَهُمْ لِيَجْعَلَ ۔ یعنی ان کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ان کو جہاد سے منع کریں لیکن جب یہ کسی بھی صورت میں جہاد سے نہیں رکے تو یہ قول ان کے لئے ایک حسرت و افسوس باقی رہے گا (2) دوسرا قول یہ ہے کہ یہ لام برائے صیرورت اور عاقبت ہے اور قَالُوْا کے ساتھ متعلق

ہے اور ذٰلِكَ میں ان کے اس قول کی طرف اشارہ ہے اور جب ان کا وہ قول پورا نہ ہوا تو وہ قول ان پر ندامت و حسرت رہا۔ (حسرت) کا معنی ہے وہ چیز جو بندے کے ہاتھ سے نکل جائے اور واپسی پر اس کو قدرت حاصل نہ ہو۔ یا لام برائے صیرورت ہے اور حسرت سے مراد اس قول کی بناء پر قیامت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے شرمندگی ہے۔ وَاللّٰهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ یہ ان کے اس قول کا رد ہے کہ موت سفر اور حضر سے منسلک نہیں ہے کبھی مسافر غازی زندہ پلٹ آتا ہے اور مقیم غیر مسافر اپنے گھر میں فوت ہو جاتا ہے لہٰذا یہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ: سوال: تفسیر تو قول کی ہو رہی ہے اس کے ساتھ لفظ عمل مناسب تھا؟ جواب: ان کے قول کا مطلب عمل کرنا تھا یعنی خود بھی جہاد سے کنی کتراتے پس و پیش کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی جہاد سے منع کرتے ہیں تو اس کی مناسبت سے فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے عمل کو دیکھتا ہے۔

وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ﴿١٥٧﴾ "البتہ اگر تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل کیے گئے یا (اپنی طبعی موت) مر گئے تو البتہ اللہ تعالیٰ کی بخشش اور رحمت اس سے بہت بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں [157]"۔

تفسیر 157: سابقہ آیت میں یہ بات گزر گئی ہے کہ منافقین لوگوں کو جہاد سے مختلف اقوال کے ذریعے سے منع کرتے ہیں تو اس آیت میں ترغیب جہاد کا ذکر ہے۔ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ لام میں دلیل ہے کہ یہاں قسم مقدر ہے اور قسم تاکید پر دلالت کرتا ہے اور لَمَغْفِرَةٌ جواب قسم ہے۔ أَوْ مُتُّمْ اس سے طبعی موت مراد ہے جہاد میں ہو یا غیر جہاد میں مرض وغیرہ کی وجہ سے۔ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ إن کی جزا مقدر ہے جو کہ لَيَغْفِرُونَ لَكُمْ ہے لَمَغْفِرَةٌ جزاء پر دلالت کرتا ہے۔ مَغْفِرَةٌ نکرہ ہے جو کم مغفرت پر دلالت کرتا ہے اسی طرح رحمت بھی جبکہ رحمت کے بعد مِنَ اللّٰهِ مقدر مراد ہے۔ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ یعنی گھروں اور بستیوں میں دنیا کا مال و آرام حاصل کرنے کیلئے رہ جاتے ہیں تو اس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مغفرت بہت بہتر ہے۔

وَلَئِنْ مُّتُّمْ أَوْ قُتِلْتُمْ لَإِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُونَ ﴿١٥٨﴾

"اگر تم فوت ہو گئے یا قتل کیے گئے تو ضرور اللہ تعالیٰ کی طرف جمع کیے جاؤ گے" [158]۔

تفسیر 158: وَلَئِنْ مُّتُّمْ أَوْ قُتِلْتُمْ لَإِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُونَ اس میں موت اور آخرت کی یاددہانی ہے۔ تو آیت کا مقصد یہ ہے کہ موت کا آنا ہر حال میں ہے تو جہاد میں قتل ہو یا طبعی موت ہو اور اللہ کی راہ میں قتل بہتر ہے جو آخرت میں سبب

رحمت و مغفرت ہے۔ اس آیت میں تکرار نہیں ہے بلکہ الگ فائدہ ہے۔ فائدہ: 1 پہلی آیت 156 میں مَاتُوْا کو قتل سے مقدم کیا ہے اس لیئے کہ عام موت جو سفر کی وجہ سے ہو اس کا ذکر ہو گیا اور سبب قتل غزوہ کی ہے جو بعد میں ذکر ہے جبکہ آیت 157 میں قتل کو موت پر مقدم کیا ہے جس کے دو اسباب ہیں (1) قتال کے وقت موت اکثر قتل کے سبب سے واقع ہوتی ہے اور عام موت جہاد میں بہت کم واقع ہوتی ہے۔ (2) دوسری وجہ یہ ہے کہ عام موت کی بنسبت قتل فی سبیل اللہ اہم ہے اس لیئے اہم کو مقدم کیا ہے۔ اور اس آیت 158 میں موت کو قتل پر مقدم کیا ہے اس لیئے کہ عام موت زیادہ واقع ہوتی ہے۔ فائدہ: 2 امام رازی نے کہا ہے کہ عبادت کرنے والے تین قسم کے لوگ ہیں: (1) وہ لوگ جو گناہوں کی مغفرت کیلئے عمل کرتے ہیں: (2) وہ لوگ جو عبادت اجر و ثواب کی نیت سے بجالاتے ہیں: (3) وہ لوگ جو عبادت کرتے ہیں دیدار الٰہی کیلئے لہذا تینوں کی طرف دونوں آیتوں میں اشارہ ہوا ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿١٥٩﴾ "پھر آپ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سبب سے ان کیلئے نرم ہو گئے اور اگر آپ تند خو سخت دل ہوتے تو ضرور آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے لہذا آپ ان کو معاف کر دیں ان کیلئے بخشش مانگیں اور ان سے معاملے میں مشورہ کریں پھر جب آپ (کسی کام کا) پختہ ارادہ کر لیں تو اللہ تعالیٰ پر (توکل) بھروسا کریں یقیناً اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔" [159]۔

تفسیر 159: (ربط) یہ بات سابقہ آیتوں سے معلوم ہوئی کہ میدان چھوڑنے والوں اور خاص مقام پر مورچہ چھوڑنے والوں اور منافقین کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاف کیا اور ان سے نرمی برتی تو اب اس عفو اور نرمی کا سبب بیان ہوتا ہے۔ نیز سابقہ آیت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کا ذکر ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجاہدین اور شہداء پر کیئے تھے، تو اب خاص رحمت کا ذکر ہو رہا ہے جو آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہے جو نرم اخلاق والے ہیں اور اس آیت میں عظمت شان رسالت بھی ذکر ہے اور ساتھیوں کی غلطیوں کوتاہیوں کے باوجود درگزر کا تذکرہ ہے۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ (با) سببیہ ہے جو لِنْتَ کے ساتھ متعلق ہے۔ (مَا) برائے تاکید ہے۔ رحمت کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وجہ سے آپ صحابہ کرام کے لئے نرم گوشہ ہیں لہذا صحابہ کرام پر یہ انعام و احسان اللہ تعالیٰ کا ہے یا یہ رحمت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ ان کو استقامت سے نوازا ہے اور ان کے دل کو مضبوط رکھا ہے اور اچھے اخلاق و عادات سے آپ کو منور کیا ہے جن

کی بدولت آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کیلئے نرم ہوئے۔ لِنۡتَ صیغہ فعل ماضی میں دلیل ہے کہ یہ اچھائیاں آپ ﷺ میں مستقل تھیں۔ لَهُمۡ تمام مسلمانوں کیلئے ہے البتہ اصحاب اُحد پہلے مصداق ہیں۔ وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ یہ بطور استدلال ہے جس سے سختی کی نفی کر کے نبی کریم ﷺ کی نرمی ثابت کرنا مقصود ہے۔ فَظًّا معنی بدزبان سخت گو۔ غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ سے دل کی سختی مراد ہے جو جلدی ناراض ہوتا ہو پھر راضی جلدی نہیں ہوتا ہو اور یہ فَظٌّ کیلئے سبب ہے۔ لیکن فَظٌّ ظاہری صفت ہے اس لیئے اس کو پہلے ذکر کیا ہے: لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ اِنۡفِضَاض کا معنیٰ ہے الگ الگ ہوتا اور نفرت کرتے رہنا۔ مِنۡ حَوۡلِكَ یہ مبالغہ کیلئے ہے یعنی تم تتر بتر، منتشر ہو جاتے لیکن نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ میں کسی نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نفرت نہیں کی جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ مذکورہ صفات کے پوری طرح حامل ہیں اور مفسرین نے لکھا ہے کہ ہر مؤمن کو چاہیئے کہ نبی کریم ﷺ کی اطاعت میں مذکورہ اخلاق کو اختیار کرے۔ فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ یہ لِنۡتَ کیلئے تفریع ہے یعنی نرم اخلاق درج ذیل تین کاموں کو مستلزم ہے: (1) معاف کرنا ان حقوق کو جو نبی کریم ﷺ سے متعلق ہیں: (2) وَاسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ ان حقوق میں جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ وَشَاوِرۡهُمۡ فِي الۡاَمۡرِ عفو اور استغفار کے بعد اس کو ذکر کرنے میں اشارہ ہے کہ عفو اور درگزر کے بعد یہ شوریٰ کے اہل لوگ ہیں۔ شَاوِرۡ۔ شَوۡرٌ سے لیا گیا ہے کسی جانور کو دوڑانا تا کہ معلوم ہو سکے کہ تیز رفتار ہے یا نہیں یا کسی چیز کو اس کی مناسب جگہ سے اُٹھانا ہے۔ مشاورت میں عالم عاقل کی تجربہ کاری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے رائے لینا مقصود ہوتا ہے: اَلۡاَمۡرِ اس سے شریعت سازی مراد نہیں بلکہ اہم امور پر رائے دینا مراد ہے کیونکہ شریعت میں وحی موجود ہے نیز اس سے مسلمان کے مفادات اور جنگی معاملات میں مشاورت مراد ہے۔ امام قرطبیؒ نے ابن خویز منداد سے نقل کیا ہے کہ علاقے کے والیوں اور گورنروں وغیرہ پر فرض ہے دینی امور میں علماء سے اور جنگی امور میں فوج کے سربراہان سے اور دیگر معاشرتی مسائل میں عام بڑے تجربہ کار لوگوں سے مشورے کرتے رہیں اور وزراء وغیرہ سے آبادیوں، تعمیرات وغیرہ کیلئے مشورے کریں۔ حسن بصری کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپنے نبی کو مشورے کا جو حکم دیا ہے وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کی دل جوئی اور الفت کی وجہ سے دیا ہے اور تا کہ امت کے باقی لوگ آپ کی پیروی کریں ورنہ نبی ہر اعتبار سے کامل عقل والا ہوتا ہے اور یہ (مشاورت) مؤمنین کی صفت ہے: وَالَّذِيۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِرَبِّهِمۡ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ يُنۡفِقُوۡنَ (سورۃ شوریٰ آیت 38) اس طرح دودھ چھڑانے کے متعلق فرمایا ہے کہ فَاِنۡ

اَرَادَا فِصَالاً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا۔ امام قرطبیؒ نے مشورہ کے عنوان میں بہت ہی تفصیل ذکر کی ہے۔ فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ۔ یعنی جب کسی کام کے متعلق مشورہ کرنے کے بعد آپ مطمئن ہو جائیں تو عمل کر لے سے قبل صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پر توکل کریں اس لیئے کہ وہ کاموں کی مصلحت پر عالم ہے اور قادر بھی ہے توکل سے مراد اس کام کی تکمیل کا اعتماد اور یقین کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس کو پورا کرے گی: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَوَكِّلِيۡنَ چونکہ توکل ایمان کی سچائی اللہ کی طرف احتیاج کے عقیدے اور اس سے بے نیاز نہ ہونے کی علامت ہے اس لیے لائق محبت ہے۔

اِنۡ يَّنۡصُرۡكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمۡ ۚ وَاِنۡ يَّخۡذُلۡكُمۡ فَمَنۡ ذَا الَّذِىۡ يَنۡصُرُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِهٖ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۝ "اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا اور اگر وہ تمہیں (بے مدد) چھوڑ دے تو وہ کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کرے گا اور چاہیے کہ مؤمن اللہ ہی پر توکل کریں" [160]۔

تفسیر 160: (ربط 1) جب سابقہ آیت میں نصرت الٰہی کی کچھ علامات (بہترین اخلاق والے پیغمبر کی بعثت کے ذریعے سے رحمت الٰہی) کا تذکرہ ہوا تو نصرت الٰہی کا فائدہ اور عدم نصرت کا نقصان ذکر ہو رہا ہے۔ (ربط 2) سابقہ آیت میں توکل علی اللہ کا حکم تھا اور متوکلین کی تعریف کی گئی تھی تو اب صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کی علت ذکر ہو رہی ہے۔ اِنۡ يَّنۡصُرۡكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمۡ یہ جملہ بظاہر خبریہ شرطیہ ہے مگر مقصد اس میں انشاء ہے۔ یعنی نصرت الٰہی کے اسباب حاصل کرو جن میں سے عظیم سبب آخری نبی ﷺ کی نصرت واطاعت ہے اور اب اسباب کے فقدان سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ اول کی مثال غزوہ بدر ہے اور دوم کی مثال غزوہ اُحد ہے۔ فَلَا غَالِبَ لَكُمۡ اس میں عموم کے طریقے پر غالب کی نفی کی گئی ہے اس لیئے لَا تُغۡلَبُوۡا نہیں فرمایا۔ سوال: نصرت الٰہی سے تو غلبہ حاصل ہوتا ہے تو یہ تو اس طرح ہے جیسے کہا جائے کہ اگر اللہ تم کو غالب کر دے پھر تم پر کوئی غالب نہیں ہو سکتا پھر اس کلام میں تو خاص فائدہ نہیں؟ جواب: اس میں نصرت کا ارادہ مراد ہے جیسا کہ اِنۡ يُّرِدۡكَ بِخَيۡرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضۡلِهٖ (سورۃ یونس آیت 107)۔ غلبہ کے صلہ میں علیٰ آتا ہے یہاں لام ذکر ہے وجہ یہ ہے کہ غالب، مغلوب کرنے کے معنی کو مُتَضَمِّنۡ ہے اور اس کے ساتھ لام مناسب ہے یعنی ایسی کوئی ذات نہیں جو تمہیں مغلوبیت دے۔ تم سے اللہ تعالیٰ کی نصرت روکنے والی کوئی ذات نہیں۔ وَاِنۡ يَّخۡذُلۡكُمۡ۔ خِذۡلَانٌ مدد چھوڑنے کے معنی میں ہے۔ فَمَنۡ ذَا الَّذِىۡ يَنۡصُرُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِهٖ۔ مَنۡ استفہام انکاری کیلئے ہے یعنی کوئی

مددگار نہیں ہے: فَلَا نَاصِرٌ لَكُمْ اس لیئے نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بے مدد کبھی نہیں چھوڑتا ہے اس لیئے شفقت کا کلمہ ارشاد فرمایا۔ مِّنْ بَعْدِهٖ میں ضمیر خِذْلَانٍ کی طرف راجع ہے جو يَخْذُلْكُمْ میں ضمنًا موجود ہے موجود ہے۔ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ یہ بطور نتیجہ ذکر ہے کیونکہ تَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ بطور دعویٰ مذکور تھا۔ اب اس دعویٰ کی طرف ترغیب ہے: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ میں پھر اس پر نتیجہ مرتب کیا ہے۔ اصول یہ ہے کہ جب دعویٰ دلیل سے ثابت ہوجائے تو نتیجہ میں اور تاکید ذکر کی جاتی ہے اس لیئے یہاں پر عَلَى اللّٰهِ پہلے ذکر کیا اَلْمُؤْمِنُوْنَ میں اشارہ ہے کہ توکل کی بنیاد ایمان پر ہوتی ہے۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ۭ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَھُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿١٦١﴾

”نبی کی یہ شان نہیں کہ خیانت کرے اور جو خیانت کرے گا وہ قیامت کے دن خیانت کی ہوئی چیز سمیت حاضر ہو جائے گا پھر ہر شخص کو اس کمائی کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور کسی پر کچھ ظلم نہ ہوگا“ [161]۔

تفسیر 161: (ربط 1) امام ابن عاشورؒ نے لکھا ہے کہ سابقہ آیت میں نصرت الٰہی کا ذکر ہوا ہے اس کیلیئے ضروری ہے کہ خود بھی خیانت سے اجتناب کرے اور نبی پر خیانت کے الزام سے اجتناب کرے۔ (ربط 2) گزشتہ آیت میں نبی کریم ﷺ کی شان کا اخلاقی اعتبار سے ذکر ہوا ہے اب صفت سلبی کا ذکر ہو رہا ہے کہ وہ ہر قسم کی خیانت سے پاک ہیں۔ خیانت مالی ہو یا وحی الٰہی میں خیانت ہو۔ (امام ترمذی رحمہم اللہ اور امام ابوداؤد کتاب الخراج حدیث 2945)۔ شیخ البانی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اُحد کے ساتھ اس کی مناسبت اس طرح ذکر کی ہے کہ وہ چالیس (40) افراد جو اُحد کی جنگ میں مورچہ چھوڑ گئے تھے انہوں نے یہ خیال کیا کہ ایسا نہ ہو کہ مال غنیمت میں ہمیں نظر انداز کردیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے نبی کی عصمت بیان کی۔ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ۔ وَمَا كَانَ نفی میں مبالغہ پیدا کرنے کیلیئے یہ حصر برائے انکار ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تخصیص اس لیئے کی گئی کہ جب مالک و سپہ سالار کیلیئے خیانت جائز نہیں تو دیگر لشکریوں کیلیئے تو بدرجہ اولیٰ حرام ہے اور دوسری وجہ یہ بھی ہے جیسا کہ مفسرین نے آیت کے سبب نزول میں ذکر کیا ہے کہ یہ آیت نبی آخر الزمان کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ يَّغُلَّ غلول سے ہے لغت میں غلول چوری اور بندش کے معنیٰ میں ہے۔ عرف شریعت میں مال غنیمت میں خیانت اور غیر کے مال میں مطلق خیانت کو بھی کہا جاتا ہے اس جملہ میں اُمتیوں کو خطاب ہے کہ اس نبی ﷺ کی شان خیانت سے منزہ ہے لہٰذا اس کی طرف نسبت بھی نہیں کرنا۔ اس میں دوسری قراءت کی مناسبت بھی ہے یعنی مَا

كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ. نیز امام آلوسیؒ، امام قرطبیؒ اور امام ابن کثیرؒ نے اس میں کسی سے وحی اور علم کو یا کتاب کو (مستحقین سے منع) کرنا بھی شامل کیا ہے۔ وَ مَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اس میں خیانت کی قباحت اور اس کا گناہ کبیرہ ثابت کرنا مقصود ہے يَاْتِ بِمَا غَلَّ اس میں (بِا) مصاحبت کیلئے ہے یعنی جب میدان قیامت میں آئے گا تو وہ خیانت کی ہوئی چیز لیکر حاضر ہوگا جیسا کہ جس نے اونٹ، گائے، بکری، دنبہ میں کوئی جانور بطور خیانت حاصل کیا ہو تو وہ جانور اس خائن کے کندھے پر آواز لگاتا ہوا میدان محشر میں آئے گا۔ (صحیح بخاری کتاب الھبۃ حدیث 2597 صحیح مسلم فی الامارۃ حدیث 1832)۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس نے یہاں اعمال کئے ہوں گے تو ان اعمال کو قیامت کے دن خیانت شدہ اموال کی شکل میں حاضر کیا جائے گا، واضح رہے کہ احادیث میں اس اس طرح کی تمثیل موت اور دیگر اعمال کیلئے بھی آئی ہے۔ بعض معتزلہ نے اس کی تاویلات کی ہیں جو کہ غلط ہیں۔ امام قرطبی اور رازی نے لکھا ہے کہ جب تک حقیقی معنیٰ ہوسکتا ہو مجاز کی طرف جانا درست نہیں اور یہ طریقہ عرب کے بھی خلاف ہے۔ امام ابن کثیر نے خیانت کی قباحت کے متعلق سولہ (16) احادیث نقل کی ہیں اور امام قرطبی نے اقوال العلماء نقل کئے ہیں مالِ خیانت کو جلانے وغیرہ کی تفصیل وہاں پڑھ لیں۔ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ پہلے جملے میں میدان محشر میں ذلت اور رسوائی کا ذکر تھا اب اجمالی طور پر دیگر سزاؤں کا ذکر ہوتا ہے لفظ ثُمَّ میں اشارہ ہے کہ رسوائی و ذلت کا یہ دورانیہ طویل ہوگا۔ مَا كَسَبَتْ میں خیانت داخل ہے۔ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ حال ہے جو تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ کیلئے تاکید ہے۔

اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾ "کیا جس نے رضائے الٰہی کی پیروی کی اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی میں لوٹ آیا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ پلٹنے کی بری جگہ ہے" [162]۔

تفسیر 162: اس آیت میں خیانت کی مزید قباحت ذکر ہورہی ہے اس لئے کہ خیانت اللہ کی ناراضگی کا سبب ہے نیز یہ آیت تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ کی تفصیل ہے۔ اَفَمَنِ اتَّبَعَ استفہام نفی کے معنیٰ میں ہے اور اس آیت میں دونوں صفات والوں کے تقابل کا ذکر ہے۔ اتَّبَعَ کوشش کرنے کے معنیٰ میں ہے یعنی تطلّبَ اتباع میں سعی کرنا۔ رِضْوَانَ اللّٰهِ اس میں مضاف مخفی ہے یعنی اللہ کی رضامندی کا سبب۔ اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے مراد عدم غلول (خیانت) نہ کرنا ہے امام زجاج کے ایک قول کے مطابق اتباع رسول مراد ہے اور دوسرے قول کے مطابق جہاد مراد ہے۔ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ

یہاں پر بھی اسباب سَخَطٍ مراد ہے سَخَطٍ کا معنی بہت غضب اور ناراضگی ہے عذاب شامل ہو یا نہیں۔ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ اس کے مقابل مَأْوٰهُ الْجَنَّةُ مخفی ہے۔ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ۔ مَصِيْرُ ظرف مکان یا مصدر ہے مصیر اور مرجع میں فرق یہ ہے کہ مصیر میں معنی ہے ایک حال سے دوسرے حال میں منتقل ہونا یعنی دنیا میں مزے کرتے رہے آخرت میں جہنم کے عذاب میں ہوں گے اور مرجع کا معنی ہے سابقہ حالات کی طرف پلٹنا خواہ اس میں تغیر تبدیلی ہو یا نہ ہو۔

هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ "اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ مختلف درجات والے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو دیکھنے والا ہے جو وہ کر رہے ہیں" [163]۔

تفسیر 163: اس آیت میں اجمالی تقابل ہے۔ هُمْ یہ ضمیر رضائے الٰہی کے متلاشی اور غضب میں مبتلا سب کی طرف راجع ہے اور یہ جملہ اَفَمَنِ اتَّبَعَ کے جواب کے مرتبہ میں ہے جبکہ (لا) مقدر ہے۔ دَرَجٰتٌ یہ جملہ بطور مبالغہ ہے یعنی یہ آپس میں اس طرح متفاوت ہیں جس طرح درجات میں تفاوت اور فرق ہوتا ہے۔ لفظ ذُوْا لَهُمْ مقدر ہے۔ دَرَجٰتٌ مطلق درجات کو کہا جاتا ہے لہذا جہنم والوں کے مرتبوں پر اطلاق ہو سکتا ہے یا جہنم والوں کیلئے لفظ درکات مقدر ہے یا پھر آیت جنت والوں کے ساتھ خاص ہے جو رضائے الٰہی کے متلاشی لوگ ہیں۔ عِنْدَ اللّٰهِ یعنی حُكْمُ اللّٰهِ یا عِلْمُ اللّٰهِ۔ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ۔ بَصِيْرٌ علیم کے بجائے مستقل صفت ہے اس میں دیکھنے کا معنی بھی موجود ہے۔ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ان کے اعمال اور درجات اس میں شامل ہیں۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾ "بلاشبہ یقیناً ایمان والوں پر اللہ تعالیٰ نے احسان کیا جب ان ہی میں سے ایک رسول کو بھیجا (وہ) ان پر اس کی آیتیں تلاوت کرتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب (قرآن وسنت) وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اس سے پہلے وہ یقینی گمراہی میں تھے" [164]۔

تفسیر 164: (ربط 1) سابقہ آیت میں فریقین کا ذکر ہوا ہے جن میں ایک اہل رضوان اور دوسرا اہل غضب وسخط ہے اب ان کی تفصیل کا ذکر ہے پہلا حال ایمان رضوان والوں کا ہے دوسرا حال منافقین کا بیان ہو رہا ہے۔ یعنی اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ یہ اہل سخط کا ذکر ہے۔ (ربط 2) نبی اکرم ﷺ کی صفات ذکر ہوئیں آپ کے اخلاق حسنہ، عدم غلول اور رضائے الٰہی کی صفت کا بیان ہوا تو اب ایمان والوں کو اس کی پیروی کیلئے ترغیب دی جاتی ہے جو نعمت احسان ربانی ہے اس

میں اشارہ ہے کہ ایسے نبی کو میدان جہاد میں چھوڑنا کسی حال میں درست نہیں۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ۔ مَنَّ احسان ظاہر کرنا اور نعمتوں کو کسی پر گنوانا انسانوں کیلئے مذموم اور گناہ کا عمل ہے جس سے ثواب باطل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تذکیر اور شکر کی ترغیب کے لیے محمود ہے جبکہ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے اعمال و افعال میں فرق ہوتا ہے۔ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سے اس وقت کے مؤمنین یا مطلق مؤمنین مراد ہیں اور مومنوں کو اس لئے خاص کیا ہے کہ انہوں نے ہی اصل فائدہ رسول کی اطاعت کی وجہ سے حاصل کیا ہے۔ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ اس سے مراد ہم جنس ہے جیسا کہ سورۃ توبہ آیت 128 میں ہے۔ یعنی بشر ہم جنس ہے۔ فائدہ (1): بشر ہونے کی وجہ سے ان کیلئے آپ سے علم و ہدایت حاصل کرنا آسان ہے کیونکہ ہم جنسوں کے درمیان وحشت طبعی اور نفرت نہیں ہوتی۔ فائدہ: 2 احسان جتلانے کی پہلی وجہ یہ ہے کہ بشر کے اعتبار سے ان جیسا ہے لیکن بشریت سے بلند معجزات دکھانے سے رسول برحق ثابت ہوئے اگر مؤمنین سے مراد صرف عرب ہوں تو احسان جتلانے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی وجہ سے عرب اقوام عالم میں باعزت ٹھہریں اور مِّنْ اَنْفُسِهِمْ میں اشارہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا تمام عربی خاندانوں میں نسبی رشتہ ہے سوائے بنو تغلب قبیلہ کے کیونکہ وہ نصاریٰ تھے لہٰذا ہمارے نبی ﷺ کو ان کی نسبی شراکت سے اللہ تعالیٰ نے محفوظ کیا ہے۔ فائدہ: 3 امام آلوسیؒ نے لکھا ہے کہ شیخ ولی الدین عراقی سے سوال ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے عربی ہونے اور بشر ہونے کا علم و معرفت فرض عین ہے یا کفایہ ہے؟ تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ صحت ایمان کیلئے یہ (فرض عین) جاننا شرط ہے لہٰذا اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ رسول اور نبی ﷺ ہے مگر نہیں جانتا کہ وہ بشر ہے یا ملائک (نور) یا جنات میں سے ہیں اور یہ بھی نہیں جانتا ہو کہ عرب میں سے تھے یا عجم میں سے تھے تو اس شخص کے کفر میں شک نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس نے قرآن مجید کی تکذیب کی ہے۔ نیز اس آیت میں آپ کی تین صفات ذاتیہ ذکر ہوئی ہیں۔ فِيْهِمْ اس میں عربیت کی طرف اشارہ ہے۔ رَسُوْلًا میں رسالت کا ذکر ہے اور مِّنْ اَنْفُسِهِمْ میں آپ کی بشریت کا ذکر ہے۔ باقی تفصیل سورۃ بقرہ (آیت 129) کی تفسیر میں گزر رہی ہے وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ اس کا مضاف الیہ مقدر ہے یعنی قَبْلَ بَعْثَتِهٖ۔ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ اس جملے میں آپ کی نعمت بعثت کی تکمیل کا بیان ہے یعنی آپ کی رسالت جہنم سے نجات و گمراہی سے بچاؤ کیلئے سبب ہے۔ مُّبِيْنٍ اس میں اشارہ ہے کہ انہوں نے شرک اور مظالم کا ارتکاب کیا ہے جو کہ واضح گمراہی ہے۔

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ

قَدِيْرٌ﴿165﴾ " (کیا بات ہے) کہ جب تمہیں ایک ایسی تکلیف پہنچی کہ تم اس جیسی دگنی کفار کو پہلے پہنچا چکے تھے تو تم نے کہا کہ کہاں سے یہ مصیبت آئی فرما دیجئے تمہارے ہی نفسوں سے ہے یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر خوب قادر ہے" [165]۔

تفسیر 165: (ربط 1) جب مؤمنوں پر احسان کا ذکر ہوا بعثت آخری نبی ﷺ کے ذریعے تو منافقین نے اعتراض کیا کہ عجیب احسان ہے اُحد میں ان کی موجودگی میں بہت بڑا نقصان ہوا تو ایمان والوں نے غیر اختیاری طور پر یہ خیال کیا کہ رسول ﷺ کے ہوتے ہوئے یہ مصیبت ہمیں کیوں پہنچی۔ (ربط 2) سابقہ کلام میں منافقین کے ایک اعتراض کا جواب دیا گیا جو انہوں نے ذات رسول ﷺ پر کیا تھا تو اب ان کے ایک اور اعتراض کا جواب اور اس میں اُحد کی شکست کے تین اسباب کو آئندہ تین آیتوں میں بیان کیا گیا ہے: اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ ہمزہ استفہام انکاری کے لئے ہے اور ان کے آئندہ آنے والے قول پر زجر (ڈانٹ) ہے یا بقول امام ابن عطیہ تقریری ہے کیونکہ یہ بات انہوں نے کہی ہے اس کلام میں معطوف علیہ مخفی ہے یعنی أَفَعَلْتُمْ كَذَا وَقُلْتُمْ حِيْنَئِذٍ كَذَا۔ مُّصِيْبَةٌ اس میں نبی کریم ﷺ کا زخمی ہونا ستر صحابہ کرام کی شہادت نیز مال غنیمت کا ہاتھ سے نکل جانا سب شامل ہے۔ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا یہ جملہ مُّصِيْبَةٌ کیلئے صفت ہے یا حال ہے۔ اس سے مال غنیمت کا حصول مراد ہے۔ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا یہ مقام استفہام ہے اور یہ خطاب ایمان والوں کو ہو رہا ہے ان کے تعجب کے سبب سے جیسا کہ اَمْ حَسِبْتُمْ میں ان سے کلام ہوا ہے کیونکہ اُحد کے دن مصیبت ایمان والوں کو ہی پہنچی تھی یا منافقین کو خطاب ہے کیونکہ وہ ایمان والوں میں اپنے آپ کو شمار کرتے تھے یہ قول بہتر ہے۔ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ اس میں تین باتیں مراد ہیں (1) آپ لوگوں نے مرکزی مورچہ خالی کیا نبی ﷺ کی نافرمانی کی، میدان جنگ سے فرار اختیار کیا۔ (2) تم لوگوں نے جہاد کیلئے مدینہ سے اُحد کی طرف آنا پسند کیا تھا۔ (3) ترمذی کی روایت میں ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب فدیہ لینا پسند کیا تو ان سے کہا گیا کہ اس کے بدلے ستر صحابہ کرام کی شہادت ہوگی۔ (ترمذی کتاب السیر حدیث 1579 حاکم 140.3 نسائی فی الکبریٰ حدیث 8662)۔ امام حاکم نے شرط شیخین پر قرار دیا ہے اور امام ذہبی نے موافقت کی ہے شیخ البانیؒ نے اس روایت کو صحیح کہا ہے ارواء الغلیل حدیث 48 اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرنے پر قادر ہے لیکن مذکورہ اسباب کی وجہ سے مدد نہیں کی مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ اس میں اسباب کی طرف اشارہ ہے جو جبریہ فرقے کا رد ہے اور قدرت میں قدریہ فرقے کا رد ہوا ہے۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿166﴾

"اور جو کچھ تمہیں پہنچا جس دن دو جماعتیں ملی تھیں تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا اور تا کہ مومنوں کو جان لے" [166]۔

تفسیر 166: اس آیت میں مزید دو علتوں کا ذکر ہے پہلی علت عام ہے فَبِاِذْنِ اللّٰهِ یعنی ہر خیر وشر اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے۔ دوسری علت مؤمنین کیساتھ خاص ہے یعنی وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ کیونکہ مصیبت مؤمنین ومنافقین میں اظہار امتیاز کیلئے ہے اسطرح پہلے بھی گزرا ہے۔ سوال: مَآ اَصَابَكُمْ میں ما شرطیہ ہے لیکن اس کی خبر پر (فاء) اس وقت داخل ہوتی ہے جب فعل مستقبل یعنی مضارع ہو جبکہ اَصَابَكُمْ فعل ماضی ہے؟۔ جواب: امام ابن عطیہ کا قول ہے کہ (فاء) ایسے وقت میں داخل ہوسکتی ہے جب جزاء شرط کیلئے سبب ہو لہٰذا ترتیب عبارت یہاں اصل میں اس طرح سے ہے۔ وَمَآ اَذِنَ اللّٰهُ فِيْهِ فَهُوَ الَّذِيْٓ اَصَابَكُمْ: لیکن اصابت نفس پر اہم ہونے کی وجہ سے مقدم کیا گیا ہے۔ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ سے بقول ابن عباس رضی اللہ عنہ قضاء وتقدیر مراد ہے وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ یہ اذن اللہ کے معنی پر عطف ہے جو عطف سبب کا مسبب پر ہے۔

وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ۭ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ۭ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ﴿۱۶۷﴾ "اور تا کہ ان لوگوں کو جان لے جنہوں نے منافقت کی اور ان سے کہا گیا کہ آؤ اللہ تعالیٰ کے راستے میں لڑو یا پھر تم (دشمن) کو دفع کرو تو انہوں نے کہا کہ اگر ہم لڑائی جانتے تو ضرور تمہارے ساتھ لڑائی کو چلتے وہ اس دن بنسبت ایمان کے کفر کے زیادہ قریب تھے وہ اپنے مونہوں سے کہتے جو ان کے دلوں میں نہیں تھا اور جو وہ چھپاتے ہیں اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے" [167]۔

تفسیر 167: اس آیت میں آخری علت کا ذکر ہے اور منافقین کی چار برائیاں مذکور ہیں۔ پہلی صفت نَافَقُوْا یعنی بظاہر اسلام کا اظہار اور مخفی طور پر کفر دل میں رکھنا مراد ہے۔ دوسری صفت یہ ہے وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یہ جملہ صفت پر عطف ہے جو خاص کا عام پر عطف ہے یا ایک چیز کی علامت کو اس چیز پر عطف کیا ہے۔ تَعَالَوْا اس میں بلند عمل کی طرف دعوت ہے اور قَاتِلُوْا جواب امر ہے یعنی قتال کیلئے آؤ۔ اور قیل میں قائل کہنے والا نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کرام ہیں۔ اَوِ ادْفَعُوْا او برائے تخییر ہے مراد یہ ہے کہ اگر تمہارے دلوں میں اسلام کی محبت ہو تو آؤ قتال کیلئے اگر دین کی محبت نہیں ہے تو کم از کم اپنے اہل کا دفاع تو کر دیا مراد یہ ہے کہ قتال کرو اگر نہیں تو مسلمانوں کی تعداد کو تو اپنی شمولیت سے تقویت دو۔ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ پہلے تمہید تھی اب یہ منافقین کے اوصاف کا ذکر ہے اور یہ مخفی سوال کا جواب

ہے۔ یعنی انہوں نے تَعَالَوْا کا کچھ جواب دیا تو انہوں نے قَالُوْا الخ کہا اس لیئے اس کا عطف ماقبل پر نہیں کیا ہے۔ ان کے اس قول کے دو مطالب ہیں (1) ایک مطلب یہ ہے کہ نہ تو ہم قتال سے واقف ہیں اور نہ ہی دفاع کرنے سے واقف ہیں ان کا یہ قول عناد اور تکبر کے طور پر تھا یا بطور (تجاہل) یعنی خواہ مخواہ اپنے آپ کو جاہل قرار دینا تھا۔ (2) دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ قتال جہاد نہیں ہے بلکہ بے مقصد ایک دوسرے کو ظلما مار دینا ہے۔ اس قول میں انہوں نے نبی کے عمل کو ظلم قرار دیا جو کہ صریح کفر ہے اس لیئے فرمایا کہ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ یہ ان کی دوسری بری صفت کا ذکر ہے۔ هُمْ یہ مبتداء ہے اور اَقْرَبُ ان کیلیئے اسم تفضیل خبر ہے اور لِلْكُفْرِ اور لِلْاِيْمَانِ دونوں اَقْرَبُ سے متعلق ہیں۔ سوال: دو حروف ایک جیسے حروف جر کسی ایک عامل سے تب متعلق ہو سکتے ہیں جب عطف اور بدلیت کے ساتھ ہوں جبکہ یہاں تو وہ دونوں نہیں ہیں؟ جواب: یہ افعل التفضیل کے ساتھ خاص ہے کیونکہ وہ دو فعلوں کے قائم مقام ہے اور لام من اور الی اَفْعَلُ التَّفْضِيْلِ کے صلہ میں آسکتے ہیں يَوْمَئِذٍ یہ اَقْرَبُ سے متعلق ہے۔ مِنْهُمْ بھی اس سے متعلق ہے اور مِن برائے تفضیل ہے جو مفضول پر داخل ہے۔ اس جملے کا معنی یہ ہے کہ یہ لوگ نفاق چھپاتے تھے اور ایمان کا اظہار کرتے رہے تو کفر سے بہت دور اور ایمان کے بظاہر بہت قریب تھے لیکن جب وہ احد میں مسلمانوں کی مدد سے پلٹ گئے تو ان کا نفاق ظاہر ہوا تو اب بنسبت ایمان والوں کے وہ کفر کے بہت قریب ہوئے۔ یا مراد یہ ہے کہ یہ لوگ کافروں کے بہت قریب ہے بنسبت ایمان کے کیونکہ انہوں نے مسلمانوں کے لشکر کو چھوڑ کر کافروں کے لشکر کو تقویت دی۔ اس توجیہ کی بناء پر مضاف مقدر ہے یعنی اَهْلَ الْكُفْرِ وَ اَهْلَ الْاِيْمَانِ: حسن بصری نے فرمایا کہ کفر کے بہت قریب ہیں اللہ تعالیٰ کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کافر ہیں۔ امام واحدی نے الوسیط میں لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ جس نے کفر کا کلمہ کہہ دیا تو جب تک اس کی تحقیق نہ کی جائے اس پر کفر کا فتویٰ نہیں لگے گا۔ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ یہ ان کی ایک اور صفت قبیح کا ذکر ہے اور ایک سوال کا جواب بھی ہے اور یہ جملہ مستانفہ ہے یعنی جب وہ توحید کا کلمہ پڑھتے ہیں تو کس طرح کفر کے نزدیک ہیں۔ جواب یہ ہے کہ اس قول کے ساتھ عقیدہ قلبی نہیں ہے اس لیئے وہ کفر کے قریب ہیں۔ سوال: قول تو منہ ہی سے نکلتا ہے تو بِاَفْوَاهِهِمْ کیوں فرمایا؟ جواب (1): یہ تاکید ہے اس لیئے کہ قول کبھی نفسانی اور کبھی لسانی ہوتا ہے تو معلوم ہوا کہ یہاں قول لسانی مراد ہے۔ جواب (2): یہاں بیان نفاق کیلیئے افواہ اور قلوب کا تقابل ہے یعنی زبانوں پر ایمان ہے جبکہ دلوں میں نہیں۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ سوال جب وہ آدمی مخفی

چیز کا علم جانتے ہوں تو یوں نہیں کہا جاتا ہے فلاں أعلم ہے؟ جواب: اللہ تعالیٰ کا یَکْتُمُوْنَ پر تفصیلی علم ہے دوسروں کو حاصل نہیں۔

اَلَّذِیْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَ قَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ ”وہ لوگ جنہوں نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ اگر وہ ہماری اطاعت کرتے تو وہ قتل نہیں کیے جاتے جبکہ وہ خود بیٹھے ہوئے تھے فرمادیجئے اگر تم سچے ہو تو اپنے نفسوں سے موت ٹال دو“ [168]۔

تفسیر 168: اس آیت میں ایک اور صفت قبیحہ کا ذکر ہے سابقہ صفات لازمی تھیں اور یہ متعدی ہے یعنی دوسروں پر اثر کرنے والی ہیں یعنی دوسروں کو بھی قتال سے منع کرتے ہیں، اس لیئے اس کو مستقل آیت میں ذکر کیا ہے۔ اَلَّذِیْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ۔ اَلَّذِیْنَ میں اعراب کی کئی وجوہ ہیں (1) حالت رفع (پیش) یہ خبر ہے اور اس کا مبتداء مقدر ہے (2) یَکْتُمُوْنَ کی ضمیر سے بدل ہے۔ (3) مبتداء ہے قُلْ فَادْرَءُوْا اس کیلئے خبر ہے اور فَقُلْ لَّهُمْ اس میں مقدر ہے (4) حالت نصب، بتقدیر فعل ذم یعنی اَذُمُّ الَّذِیْنَ (5) اَلَّذِیْنَ نَافَقُوْا سے بدل ہے (6) اس کیلئے صفت ہے، حالت جر (زیر)۔ (7) اَفْوَاهِهِمْ کی ضمیر سے بدل ہے (8) قُلُوْبِهِمْ کی ضمیر سے بدل ہے: لِاِخْوَانِهِمْ لام اجلیہ ہے اور اخوت سے مراد نسبی یا وطنی مشارکت ہے۔ وَقَعَدُوْا یہ قَالُوْا کی ضمیر سے حال ہے اور قَعَدُوْا سے گھروں میں بیٹھنا یا قتال نہ کرنا مراد ہے۔ لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا یہ قَالُوْا کیلئے مقولہ ہے اور اس میں قتال فی سبیل اللہ سے منع کرنا مقصود ہے۔ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جب تم دوسروں کو قتل سے صرف مشورہ دیتے ہوئے بچا سکتے ہو تو لازماً اپنے آپ کو موت سے بچاؤ گے جبکہ تمام اہل عقل جانتے ہیں کہ کوئی بھی موت سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا۔ موت کو اس لیئے ذکر کیا کہ قتل سبب موت ہے جبکہ سبب اور مسبب دونوں اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ مفسر کشاف وغیرہ نے لکھا ہے کہ ان دنوں میں ان میں سے ستر 70 افراد فوت ہوئے اور کوئی موت سے بچ نہ سکا۔ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ گھروں میں رہنا موت سے نجات کا سبب ہے۔ فائدہ: اس طرح مضمون آیت 156 میں گزرا ہے لیکن وہاں ان کی عمومی عادت کا ذکر تھا کیونکہ لفظ اِذَا اس عموم پر دلیل ہے اور یہاں ان کا یہ قول واقعہ اُحد سے متعلق ہے اور اس جنگ میں ستر (70) افراد قتل کیے گئے تھے اپنی موت سے نہیں مرے تھے اس لیئے اس آیت میں موت کا ذکر نہیں ہوا ہے لہٰذا اس میں تکرار نہیں ہے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ﴿١٦٩﴾

"اور آپ ہرگز ان لوگوں کے بارے میں جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں قتل کیے گئے گمان نہ کریں کہ وہ مردہ ہیں بلکہ وہ تو زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق دیے جاتے ہیں" [169]۔

تفسیر 169: سابقہ آیت میں اس کلام سے کہ لَوْ أَطَاعُونَا مَا قُتِلُوا معلوم ہوا کہ منافقین شہادت کو ضائع اور برباد تصور کرتے تھے تو ان کے رد کیلئے اللہ تعالیٰ نے شہادت کی عظمت بیان کی اور ان کے گمان کی تردید کی اس لیئے اس کو سابقہ آیت پر عطف کیا ہے۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد ہر مخاطب ہے اور منافقین پر تعریض ہے: حُسْبَانٌ، گمان وظن کو کہا جاتا ہے معلوم ہوا کہ شہداء کو مردہ گمان کرنا منع ہے تو یقینی طور پر انکو مردہ کہنا بدرجہ اولیٰ منع ہے۔ اس قسم کی نہی جس میں یقین کی نفی لازم آتی ہے قرآن کے اور مقامات میں بھی ہے (سورۃ ابراہیم آیت 42 اور 47) چونکہ یہاں منافقین کا رد مقصود تھا تو اس عقیدہ کے گمان رکھنے کی بھی نفی کی ہے کہ یہ گمان بھی مت رکھنا اور سورۃ بقرہ آیت 54 میں ایمان والوں کے آداب کا بیان مقصود تھا تو وہاں وَلَا تَقُولُوا فرمایا ہے۔ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ یہ تَحْسَبَنَّ کیلئے پہلا مفعول ہے اور أَمْوَاتًا دوسرا مفعول ہے۔ نکرہ اس لیئے ذکر ہے کہ موت کی ایک قسم مراد ہے جو عام مردوں کی مشابہت یا روح کی موت ہے: بَلْ أَحْيَاءٌ۔ بَلْ یہ لَا تَحْسَبَنَّ الخ کیلئے اضراب ہے اور جملہ کا جملہ پر اضراب ہوتا ہے اور یہاں پر هُمْ مقدر ہے: بَلْ هُمْ أَحْيَاءٌ یعنی ایک قسم کی زندگی ان کو حاصل ہے جس کی تفصیل ابوداؤد، احمد وغیرہ میں عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس طرح منقول ہے کہ جب اُحد میں ستر (70) صحابہ کرام رضی اللہ عنھم شہید ہوئے تو ان کی روحوں کو اللہ تعالیٰ نے سبز پرندوں کے جسموں میں جنت کی نہروں کی سیر کرائی اور میوے کھاتے رہے اور سونے کی قندیلوں میں آرام کرتے رہے جو قندیلیں عرش الٰہی کے نیچے آویزاں ہیں۔ جب انہوں نے ان میووں کی لذتیں، نہروں کے مشروبات اور سونے کی قندیلوں کے مزے لئے تو انہوں نے ایک آرزو پیش کی کہ کاش ہمارے بھائیوں کو کوئی خبر دے کہ ہمیں ہمارے رب نے کیسی مہمان نوازی سے نوازا ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں اُنھیں تمہارے حال کے بارے میں خبر دوں گا تو یہ آیتیں نازل ہوئیں یعنی زندہ مقتولوں کو خبر دی کہ وہ جنت کی نہروں، میووں اور مزوں میں خوشیاں منا رہے ہیں ان کی ارواح زندہ ہیں۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے متعلق سوال کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ ان کے ارواح سبز پرندوں کے پیٹوں میں ہیں (صحیح مسلم

کتاب الامارۃ حدیث 1887) امام ابن جریر، امام ابن کثیر اور دیگر مفسرین نے اس آیت کے تحت اور احادیث جمع کی ہیں۔ یہ بات معلوم ہوئی کہ شہداء سے اللہ نے موت روحانی کی نفی اس لفظ کے ساتھ کی ہے کہ بَلْ اَحْیَآءٌ اور موت ظاہری جسمانی کا لفظ قُتِلُوْا سے کیا ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ شہداء کو ایک خاص حیات حاصل ہے یہ نہیں کہ ان کی اجسام قبروں میں زندہ اور محفوظ ہیں۔ نیز ان کی حیات صرف روحانی نہیں ہے جو عام لوگوں کو حاصل ہے بلکہ یہ ایسی زندگی ہے کہ آثار حیات ان کی روحوں کو حاصل ہے جو لذتوں مزوں سے جنت میں مستفیض ہورہے ہیں۔ امام ابن عطیہ وابن عاشور نے کہا کہ وہ فوت تو ہوچکے ہیں مگر عام مومنوں کی بنسبت ان کو خصوصیت یہ حاصل ہے کہ جنت کی لذتوں سے قتل کے وقت سے مستفیض ہورہے ہیں گویا کہ ان کیلئے دنیاوی زندگی ہمیشہ ہے مگر عین حیات دنیاوی نہیں ہے۔ امام ابن کثیر نے بھی فرمایا ہے کہ دار دنیا میں وہ قتل ہوئے ہیں مگر ان کی ارواح زندہ ہیں۔ امام قرطبی نے ارشاد فرمایا کہ وہ جنت میں زندہ ہیں باقی تفصیل سورۃ بقرہ آیت 154 میں گزر گئی ہے۔ عِنْدَ رَبِّهِمْ یہ لفظ دوسری خبر ہے هُمْ مقدر کیلئے یا أَحْيَاءٌ کیلئے صفت ہے یا يُرْزَقُوْنَ کیلئے ظرف مقدم ہے۔ عِنْدَ سے مراد جنت کا مقام ہے یا شرافت اور مرتبہ عظمت مراد ہے۔ يُرْزَقُوْنَ یہ أَحْيَاءٌ کیلئے صفت یا تیسری خبر ہے هُمْ مقدر کے لیئے اور رزق سے جنت کا رزق مراد ہے جیسا کہ حدیث گزری ہے۔

فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ "وہ اس پر خوش ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے پاس سے دیا ہے اور وہ خوشی محسوس کرتے ہیں ان کے ساتھ جو پیچھے ہیں ان کو نہیں ملے یہ کہ نہ کوئی خوف ہوگا ان پر اور نہ ہی غمگین ہوں گے" [170]۔

تفسیر 170: فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ یہ يُرْزَقُوْنَ کی ضمیر سے حال ہے اور یہ خوشی جنت کی نعمتوں پر ہے۔ دنیا کی نعمتوں پر فرح کافروں کی صفت ہے جو سورۃ قصص آیت 76 میں مذکور ہے۔ مِنْ اجلیہ ہے اس لیئے کہ اللہ تعالیٰ پر اجر وثواب کا دینا فرض نہیں لہٰذا ان کو یہ خوشی عمل کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل کی وجہ سے میسر ہے۔ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اس میں فعل کو اسم (فرحین) پر عطف کیا ہے کیونکہ یہ فعل بھی تاویل اسم میں ہے یا وہ اسم فعل کے معنی میں ہے يَسْتَبْشِرُوْنَ میں (ت) اور (س) طلب کیلئے نہیں ہے بلکہ قبولیت بشارت کیلئے ہے۔ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا اس بارے میں مفسرین کے دو قول ہیں (1) پہلا قول یہ ہے کہ اس سے مراد ان کی اولاد اور ساتھی ہیں جو انہوں نے ایمان اور جہاد کی حالت میں چھوڑے ہیں لہٰذا انہیں اللہ تعالیٰ خبر دے گا جب وہ شہید

ہونگے اور ان کے ساتھ جنت میں ملیں گے اور لَمْ يَلْحَقُوا سے مراد یہ ہے کہ ان کے ساتھ ایک ہی وقت میں شہید نہیں ہوئے۔(2) دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے تمام مومنین مراد ہیں جنہوں نے جہاد نہیں کیا ہے لیکن وہ اپنے لئے بے شمار نعمتوں کی لذتوں پر خوش ہوں گے کہ ایمان کی وجہ سے یہ تمام نعمتیں ہیں جن کا ذکر اٰتٰـهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ میں ہوا ہے اور عام ایمان والوں کے متعلق خوش ہوں گے کہ وہ بھی خوف وغم سے محفوظ ہوں گے جس کی طرف سورۃ الطور آیت 21 میں اشارہ ہوا ہے۔ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ یہ بدل اشتمال ہے بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوا سے (یا) کے تحت داخل ہے اور یہ مُسْتَبْشَرٌ بِهٖ ہے یعنی بشارت دی جاتی ہے کہ تمہارے بعد والے لوگ خوف وغم سے محفوظ ہوں گے اور جنت میں تمہارے ساتھ داخل ہوں گے یا مُسْتَبْشَرٌ بِهٖ مقدر ہے اور اَلَّا میں لام اجلیہ محذوف ہے یعنی انہیں بہت ساری بشارتوں کے ذریعے سے خوشخبری دی جائے گی کہ انہیں خوف وغم سے محفوظ رکھا جائے گا۔ اس میں مختلف اقوال ہیں (1) آنے والے دور میں ان پر خوف نہیں ہوگا اور دنیا سے جدائی پر غمگین نہیں ہوں گے(2) اولاد کے بارے میں ان پر خوف نہیں ہوگا اور نہ ہی دنیا کے مالوں پر غمگین ہوں گے(3) ان پر مصیبتوں کا خوف نہیں ہوگا اور نہ ہی نعمتوں کے زائل ہونے کا غم ہوگا۔ دونوں جملوں میں خوف وغم کے نہ ہونے کی ہمیشگی ذکر ہے۔

يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ "وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور فضل کی بشارت لیتے رہیں گے اور یقیناً اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا ہے" [171]۔ ع

تفسیر 171: يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ اس کے متعلق تین اقوال ہیں (1) یہ جملہ استنافیہ ہے پہلی بشارت بھائیوں کے متعلق ہے اور یہ بشارت اپنے نفسوں کے متعلق ہے (2) دوسرا قول یہ ہے کہ یہ سابقہ يَسْتَبْشِرُوْنَ سے بدل ہے جو برائے تاکید ہے پہلے اَلَّا خَوْفٌ الخ میں علت ذکر کی تھی اور اس آیت میں مُسْتَبْشَرٌ بِهٖ کا ذکر ہے جو نعمت وفضل الٰہی ہے (3) تیسرا قول یہ ہے کہ پہلی بشارت شہداء کیلئے ہے دوسری بشارت ان لوگوں کیلئے تھی جو ابھی ان سے ملے نہیں ہیں اس قول کی بناء پر يَسْتَبْشِرُوْنَ کی ضمیر بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوا کی طرف راجع ہے۔ نعمت اور فضل میں فرق چند وجوہات سے ہیں (1) نعمت سے عمل کا ثواب مراد ہے اور فضل سے اضافی دینا مراد ہے (2) نعمت سے قدر کفایت مراد ہے اور فضل سے اضافی سرور اور لذت مراد ہے اور دونوں کو عظمت کی وجہ سے نکرہ ذکر کیا ہے: وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ یہ نعمت پر عطف ہے اور مستقل بشارت بھی ہے کیونکہ دنیا میں انجام کا خوف اور ایمان پر خطرہ لاحق تھا جو کامل مومن کی صفت

ہے تو قیامت کے دن ان کو بشارت دی جاتی ہے کہ تمہارا کوئی بھی عمل ضائع نہیں ہوا ہے۔ الْمُؤْمِنِيْنَ میں اشارہ ہے
اعمال کے بدلے ایمان پر مبنی ہیں۔ فائدہ: سورۃ بقرہ میں صرف آداب سکھانا مقصود تھا اس لیئے وہاں اختصار کیا گیا اور اس
سورۃ میں منافقین کے حالات کا رد کرنا مقصود ہے اس لیئے پہلی آیت میں ان کو چار بشارتیں دیں دوسری میں دو اور تیسری
میں تین جو کل نو (9) بشارتیں بنتی ہیں۔

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۚ

"وہ لوگ جنہوں نے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت زخم پہنچنے کے باوجود کی ان میں سے جنہوں نے احسان کیا اور تقوی اختیار کیا ان کے لیئے اجر عظیم ہے" [172]۔

تفسیر 172: (ربط) سابقہ آیات میں شہداء احد کی بشارت تھی تو اب احد کے زخمیوں کیلئے بشارت ذکر ہو رہی ہے کیونکہ انہوں نے دوبارہ حکم ماننے میں تکمیل کی ہے۔ امام قرطبیؒ اور دیگر مفسرین نے دو اقوال ذکر کئے ہیں (1) صحیح بخاری کتاب المغازی حدیث 4077، و مسلم میں مختصر و اجمالا روایت عائشہ رضی اللہ عنہا مذکور ہے کہ انہوں نے عبداللہ بن زبیر سے فرمایا تھا اے بھانجے: تیرے والد اور نانا (زبیر و ابوبکر رضی اللہ عنہما) اس آیت کی بشارت میں شامل ہیں یعنی اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا۔ پھر ارشاد فرمایا کہ مشرکین جب اُحد سے پلٹ گئے اور نبی کریم علیہ السلام اور صحابہ کرام کو تکالیف سے دو چار ہونا پڑا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خوف لاحق ہوا کہ مشرکین دوبارہ حملہ آور نہ ہو جائیں تو ان کے تعاقب کیلئے اعلان فرمایا کہ میرے ساتھ جانے کیلئے کون تیار ہے تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ ہم قوت سے اب بھی سرشار ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر و زبیر رضی اللہ عنہما و دیگر ستر (70) افراد کے ساتھ ان کے تعاقب میں نکل گئے جب مشرکین مکہ کو پتا چلا کہ لشکر محمد صلی اللہ علیہ وسلم آ رہا ہے تو وہ بھاگ گئے اس کی مزید تفصیل یہ ہے کہ بروز اتوار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کیا کہ میرے ساتھ وہی لوگ چلیں جو کل میرے ساتھ تھے یہ اعلان جنگ اُحد کے دوسرے دن کیا تھا۔ تو دو سو (200) یا ستر (70) افراد کھڑے ہوئے اور مقام حمراء الاسد تک جا پہنچے یہ مقام مدینے سے آٹھ میل کی مسافت پر ہے جب وہاں نعیم بن مسعود یا ابونعیم ان کو ملا تو اس نے ان کو ڈرانے کیلئے کہا کہ ابوسفیان نے تمہارے خلاف بہت بڑا لشکر تیار کیا ہے اور مدینہ پر چڑھائی کا ارادہ ہے تاکہ یہاں پر مسلمانوں کا قلع قمع کرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جواب میں کہا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ صحابہ کرام نے وہاں تین دن یعنی پیر، منگل، اور بدھ کو قیام کیا اس وقت معبد خزاعی نے قریش کو ڈرایا کہ تم قریش محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے لشکر کا

مقابلہ نہیں کر سکتے ہو جس پر قریش گھبرا کر مکہ بھاگ گئے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ وہاں پر تجارت کی منڈی لگتی تھی وہاں صحابہ کرام نے تجارت کی اور خوب کمایا۔ ایک روایت میں ہے کہ عبدالقیس قبیلے کا قافلہ ابوسفیان کے پاس سے گزرا تو ابوسفیان نے کہا کہ تم کس طرف جا رہے ہو انہوں نے کہا کہ مدینے کی طرف سفر کر رہے ہیں اور وہاں سے غلہ لا رہے ہیں ابوسفیان نے کہا ان کو ہمارے بارے میں ڈراؤ کہ ہم نے ان کیلئے بہت بڑا لشکر جمع کیا ہے عوض میں بہت انعام سے نوازوں گا انہوں نے مقام حمراء الأسد میں یہ بات سنائی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4563۔ (2) دوسرا قول مجاہد اور عکرمہ کا ہے کہ ابوسفیان اُحد سے واپس جا رہا تھا تو نبی کریم ﷺ کیلئے پیغام دے گیا کہ آئندہ سال بدر میں لڑیں گے نبی کریم ﷺ حسب وعدہ بدر میں آئندہ سال حاضر ہوئے اور ابوسفیان نبی کریم ﷺ سے ڈرتے ہوئے نہیں آیا بلکہ مسلمانوں کو ڈرانے کیلئے نعیم کو بھیجا اتفاق سے وہاں بازار لگا ہوا تھا جس میں صحابہ کرام نے تجارت میں خوب کمائی کی یعنی اللہ تعالیٰ نے فائدے سے نوازا۔ امام قرطبیؒ اور امام آلوسیؒ نے پہلے قول کو اکثر مفسرین کا قرار دیا ہے اور دوسرے قول کو شاذ قرار دیا ہے: اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی رسول کی اتباع پر موقوف ہے اس لیے دونوں کو ذکر کیا اور دونوں استجابتوں کا مقصد ایک ہے یعنی احکام الٰہی و اتباع رسول کو تسلیم کرنا اور یہاں پر خصوصی طور پر نبی ﷺ کی بات جہاد کیلئے قبول کرنا مراد ہے۔ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ استجابت اور اجابت میں اور قرح اور جرح میں فرق گزرا ہے۔ یہاں پر مراد بدن کے مصائب اور مال کا نقصان ہے جو غزوہ اُحد میں مسلمانوں کو پہنچا ہے۔ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ تمام محسنین و متقین مستجیبین ہیں مِنْهُمْ میں مِنْ برائے بیان ہے جیسا کہ سورۃ فتح آیت 29 میں ہے ان دونوں صفتوں کے ذکر کرنے میں مدح مقصود ہے اور تعلیل بھی ذکر ہے یعنی استجابت تو سبب اجر ہے مگر احسان و تقویٰ کے ذریعے سے اجر کی عظمت حاصل ہوتی ہے اور اس آیت میں شکست سے بچنے کیلئے آداب مذکور ہیں۔

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾

"ان (مومنوں) سے لوگوں نے کہا بلاشبہ لوگوں نے تمہارے مقابلہ کیلئے ایک بڑا لشکر جمع کیا ہے لہٰذا ان سے بچو تو ان کا ایمان اور بھی زیادہ ہو گیا اور (مومن) کہنے لگے ہمارے لئے تو اللہ ہی کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے" [173]۔

تفسیر 173: اس آیت میں صحابہ کرام کی عظمت شان کا ذکر ہے اور شکست سے بچنے کیلئے ادب مذکور ہے کہ دشمن کے

مقابلے کے وقت حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ پڑھو۔ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ۔ النَّاسُ سے
مراد ابونعیم بن مسعود اشجعی ہے یہ پہلے قول کے اعتبار سے ہے اَلنَّاسُ کا اطلاق اس پر مجازاً ہوا ہے یا جب اس نے یہ
پروپیگنڈا شروع کیا تو کچھ لوگ اس کے ساتھی بنے اس لیے اَلنَّاسُ کا اطلاق کیا گیا یا اَلنَّاسُ سے مراد عبدالقیس قبیلے کے
افراد ہیں جو سابقہ دونوں روایتوں میں ذکر کیے گئے ہیں اور دوسرے اَلنَّاسُ سے مراد ابوسفیان اور ان کے ساتھی ہیں۔
قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ اس کا مفعول مقدر ہے یعنی اَلْجُنُوْدَ وَالْاَسْلِحَةَ لشکر اور اسلحہ لَكُمْ سے لِقِتَالِكُمْ مراد ہے۔ یعنی
تمہارے ساتھ لڑنے کیلئے۔ فَاخْشَوْهُمْ اس سے مراد خوف ہے کہ ابوسفیان کے مقابلے سے گریز کریں۔ فَزَادَهُمْ
اِيْمَانًا ضمیر جو زَادَهُمْ میں ضمیر ہے وہ قَالُوْا کے قول کی طرف یا مَقُوْلٌ کے طرف راجع ہے۔ یہ واضح دلیل ہے کہ ایمان
میں اضافہ ہوتا ہے اور زیادت کمی کیلئے لازم ہے لہٰذا ایمان میں کمی زیادتی دونوں لازم ہیں اور یہ قسمیں ہیں پہلی قسم اعمال
صالحہ کے ذریعے سے بڑھ جاتا ہے اور گناہ کے ارتکاب سے ایمان میں کمی کا آنا ہے اور یہ لازمی نتیجہ ہے کہ اعمال ایمان کا جز
ہے کیونکہ اس کی زیادت اور قلت سے ایمان میں زیادت وقلت پیدا ہوتی ہے لیکن اعمال کے انتفاء سے ایمان کا زوال
نہیں ہوتا ہے محدثین کا یہی موقف ہے۔ دوسری قسم ایمان میں یقین کے اعتبار سے اضافہ اور کمی ہے تو جبرئیل ومیکائیل
کا یقین اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کا یقین ہمارے یقین سے زیادہ ہے اور ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں یہ بات ثابت
ہے کہ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ اور محدثین کا بھی یہی موقف ہے بعض لوگوں کا قول یہ ہے کہ ایمان بسیط ہے اور بسیط میں کمی اور
اضافہ نہیں ہوتا ہے یہ اصطلاح شرعی نہیں بلکہ منطقی ہے لہٰذا اس پر امور شرعیہ کو مبنی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا
اللّٰهُ اس جاسوس کے قول میں دو مقاصد تھے (1) صحابہ کرام کے دلوں میں خوف پیدا کرنا لہٰذا اس بات کے رد میں
فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا کہا گیا دوسرا مقصد لوگوں کے اجتماع کی خبر دینا مقصود تھا تو اس کے جواب میں حَسْبُنَا اللّٰهُ کہا گیا۔
حَسْبُ اسم جامد ہے جس کا معنی ہے کافی ہونا اور اس کا فعل استعمال نہیں ہوتا اور صاحب قاموس نے کہا ہے کہ یہ اسم فعل
ہے جو كَفٰى کے معنی میں ہے۔ بقول امام سیبویہ یہ مصدر ہے اس لیئے اس کی تانیث اور جمع نہیں آتی ہیں اور تَحَسُّبُ
اللہ تعالیٰ کیلئے خاص ہے جیسا کہ سورۃ انفال آیت 64،62 اور سورۃ توبہ آیت 129 اور 159 سورۃ زمر آیت 38، سورۃ
نساء آیت 6 سورۃ اسراء آیت 14، سورۃ احزاب آیت 39 میں ہے۔ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۔ وَكِيْلٌ فَعِيْلٌ مَفْعُوْلٌ کے
معنی میں ہے یعنی مَوْكُوْلٌ اِلَيْهِ وہ ذات جس کو چیزیں سونپی جاتی ہیں لہٰذا وہ قائم ہے اس کام پر جو اسے حوالے کیا گیا ہے

اور یہ کاموں کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے اس لیئے وَكِيْلٌ کے معانی مختلف بھی ہوتے رہتے ہیں۔ دشمنی ختم کرنے ظلم دفع کرنے، مددگار اور دفاع کرنے والے کے معنی میں آتا ہے جیسا کہ قُلْ لَسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ یا اَفَمَنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا۔ اس کو (ضامن) جھگڑوں کا وکیل کہا جاتا ہے۔ کافی اور کفیل کے معنی میں بھی آتا ہے یعنی ذمہ دار جب نظام زندگی چلانے کی طرف نسبت کی جائے۔ جیسا کہ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا اس معنی کی بناء پر وکیل صرف اللہ تعالیٰ کیلئے مختص ہے جس کی دلیل سورۃ نساء آیت 81، 122 اور 171 سورۃ بنی اسرائیل آیت 2 اور 65 سورۃ احزاب آیت 3 اور 48 سورۃ مزمل آیت 9 میں ہے۔ (صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4563) کی حدیث میں ہے کہ یہ کلمہ ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت فرمایا جب انہیں آگ میں ڈالا گیا اور ہمارے نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام نے اس وقت فرمایا جب ان سے کہا گیا کہ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ۝

"پھر دولوٹ آئے اللہ تعالیٰ کے احسان و فضل کے ساتھ انہیں کوئی برائی نہیں پہنچی اور انہوں نے رضائے الٰہی کی پیروی کی اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے" [174]۔

تفسیر 174: یہ سابقہ صفات کی جزاء ہے یعنی ان کا احکام الٰہی کی استجابت، ایمان کی زیادت اور نعم المولی و نعم الوکیل کہنا۔ ان کی جزائیں بھی چار ہیں (1) نعمت، (2) فضل، (3) بلا تکلیف واپسی اور (4) رضائے الٰہی کی اتباع۔ نعمت سے مراد دشمن سے بچنا اور سلامتی ہے اور فضل سے مراد تجارت میں کامیابی ہے۔ لَمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ یعنی اس سفر میں ان کو زخم و تکلیف نہیں پہنچی۔ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ انہوں نے بہادری کے ساتھ صحیح نیت سے جہاد فی سبیل اللہ کیا۔ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ اس میں آخرت کے اجر کی طرف اشارہ ہے جو دنیا کے ثواب و اجر سے بہت عظیم ہے۔

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

"یہ تو شیطان ہی اپنے دوستوں سے تمہیں ڈراتا ہے لہٰذا تم اگر مؤمن ہو تو ان سے مت ڈرو مجھ ہی سے ڈرو" [175]۔

تفسیر 175: سابقہ آیت میں یہ بات ذکر ہو گئی ہے کہ صحابہ کرام ان کے اس قول سے نہیں گھبرائے اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ: تو اب ایمان والوں کو اس عقیدے پر پختگی سے قائم رہنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ ذٰلِكُمْ اس میں ابو نعیم یا عبد القیس قبیلے کے یا ابو سفیان کے قافلے کی طرف اشارہ ہے اور ان کو شیطان کہا گیا ہے کیونکہ انہوں نے صحابہ کرام کو اللہ تعالیٰ کے دین اور جہاد

سے روک رکھا تھا اس لیئے انہیں شیطان انسی کہا گیا۔ یاذٰلِکُمْ میں سابقہ تمام واقعات کی طرف اشارہ ہے ابوسفیان کا جاسوس مقرر کرنا اور اس کا منافقین میں تردد پیدا کرنا وغیرہ۔ لفظ شیطان میں مضاف مقدر ہے یعنی فَعَلَ الشَّیْطٰنِ۔ یُخَوِّفُ اَوْلِیَآءَهٗ۔ وَیُخَوِّفُ تشدید کے ساتھ یہاں دو مَفْعُوْلُوں کی طرف متعدی ہے۔ ایک مفعول مقدر ہے یعنی یُخَوِّفُکُمْ اَوْلِیَآءَهٗ یہ جملہ حالیہ ہے اور مفسر صاحب اللباب نے اعراب کی دیگر توجیہات بھی ذکر کی ہیں۔ تخویف سے مراد یہ ہے کہ مشرکین سے ڈر جائیں اور ان سے قتال نہ کریں۔ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَ خَافُوْنِ وہ خوف مراد ہے جس کے باعث بندہ کوئی کام چھوڑ دے یہ خوف اللہ تعالیٰ کیلئے مختص ہے یعنی ان کے خوف سے قتال مت چھوڑو کیونکہ قتال ترک کرنا معصیت ہے اور معصیت سے بچنے کیلئے خوف الٰہی ضروری ہے: اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ یہ جملہ اُبھارنے کیلئے ہے یا اِنْ۔ اِذْ کے معنیٰ میں ہے یہ دلیل ہے کہ ایمان کیلئے خوف الٰہی کا ہونا لازمی ہے۔

وَلَا یَحْزُنْكَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰهَ شَیْـًٔا ؕ یُرِیْدُ اللّٰهُ اَلَّا یَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِی الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۷۶﴾ "وہ لوگ آپ کو غم میں نہ ڈالیں جو کفر میں جلدی کرتے ہیں بلاشبہ وہ اللہ تعالیٰ کو ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکیں گے اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کہ نہ رکھے ان کیلئے آخرت کا کوئی حصہ اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے"۔[176]

تفسیر 176: پہلے نبی کریم ﷺ اور ایمان والوں کو اولیاء الشیطان کے خوف سے منع فرمایا تو اب نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کو ان کے کفر میں جانے پر غمگینی سے منع فرمایا گیا ہے۔ اس میں نبی کریم ﷺ اور ان کے پیروکاروں کو تسلی دی گئی ہے۔ وَلَا یَحْزُنْكَ سوال: حُزْنٌ غم تو غیر اختیاری چیز ہے تو اس سے منع کس طرح صحیح ہے؟ جواب: حزن سے مراد اس پر مرتب ہونے والا اثر ہے جو کہ دعوت چھوڑنا ہے۔ سوال: کافروں کے کفر پر غم کرنا تو اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت ہے؟۔ جواب (1): اس منع سے مراد وہ غم ہے جو ہلاکت نفس کا سبب بنے جیسا کہ سورۃ فاطر آیت 8 میں ہے: فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَیْهِمْ حَسَرٰتٍ (ترجمہ: ان پر افسوس کرتے ہوئے اپنے نفس کو ہلاکت میں مت ڈالو) اور سورۃ شعرا آیت 3 میں ارشاد ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ: قریب ہے کہ ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے آپ اپنے آپ کو ہلاک نہ کر ڈالیں)۔ جواب (2): اس سے مراد ان کی طرف سے ضرر پہنچنے کا خوف ہے اور بعد والا جملہ اس کیلئے علت ہے: یُسَارِعُوْنَ فِی الْكُفْرِ پہلے ان کا کفر یہ کاموں میں عجلت کا ذکر ہوا جو کہ صحابہ کرام کا قتل اور زخمی کرنا ہے پھر ان

پر قاتلانہ حملے کا ارادہ کرنا اور ڈرانے کیلئے جاسوس بھیجنا یہ سارے کام مشرکین مکہ نے کئے مگر آیت میں تمام کفار شامل ہیں۔ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا یہ لَا يَحْزُنْكَ کیلئے علت ہے جیسا کہ جواب 2 میں گزرا یعنی کفر میں داخل ہونے کیلئے وہ جو جلدی کرتے ہیں اس کا وبال ان پر دنیا وآخرت دونوں میں آئے گا۔ ضرر سے مراد اسلام کو مغلوب اور کفر کو غلبہ دینا ہے ۔شَيْـًٔا مفعول مطلق ہے یعنی شَيْـًٔا مِّنَ الضَّرَرِ یا حرف جر مقدر ہے یعنی بِشَيْءٍ اور اس کو مَنْصُوْبٌ عَلٰى نَزْعِ الْخَافِضِ کہا جاتا ہے۔ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ یہ ایک سوال کا جواب ہے یعنی اگر کہا جائے کہ جب کفر میں جلدی کرتے ہوئے جانا ان کیلئے فائدہ مند نہیں ہے تو وہ یہ کام کیوں کرتے ہیں؟ تو جواب ہوا کہ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا ہے کہ ان کی آخرت کے اجر وثواب کا کوئی حصہ باقی رہے اس وجہ سے یہ جلدی کرتے ہیں تو مسارعت (جلدی) کی نسبت ان کی طرف کی گئی۔ اس میں جبریہ کا رد ہوا جبکہ اللہ تعالیٰ کی طرف ارادے کی نسبت میں قدریہ کا رد ہوا ہے اور یہ دلیل ہے کہ کافر کے کفر میں بھی اللہ تعالیٰ کے ارادے کا عمل دخل ہے اور لفظ ارادہ میں کافروں پر اللہ تعالیٰ کے سخت غضب کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اَرحم الراحمین ان کافروں پر سخت غصہ ہے اور ان کے اجر وثواب سے محرومی اس کی مراد ہے۔ فعل مضارع میں اشارہ ہے کہ ان کا کفر ہر وقت جاری رہے گا لہٰذا اللہ تعالیٰ کا ارادہ بھی ہر وقت ہے۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ یعنی کفر میں جلدی کرنے سے ثواب سے محرومی کی صورت میں عظیم عذاب کے مستحق ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿١٧٧﴾ "یقیناً وہ لوگ جنہوں نے ایمان کے بدلے کفر خریدا وہ اللہ تعالیٰ کو ہر گز کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے" [177]۔

تفسیر 177: سابقہ آیت میں ظاہراً کفر کرنے والوں کیلئے تخویف اور اس آیت میں منافقین کیلئے تخویف ہے اور اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ سورۃ بقرہ میں اِشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى کی طرح ہے اور اشْتَرٰى سے مراد تبدیل کرنا یا اختیار کرنا ہے۔ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا اس جملے کو تکرار کے ساتھ اس لیے ذکر کیا ہے کہ اسلام کے خلاف کفار اور منافقین کی چالیں اور تدبیریں الگ الگ ہوتی ہیں۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ یہ بھی دلیل ہے کہ یہ آیت منافقین کے متعلق اتری ہے جیسا کہ سورۃ بقرہ آیت 10 میں منافقین کیلئے عذاب اَلِيْمٌ کا ذکر تھا اور کافروں کیلئے عذاب عَظِيْمٌ کا ذکر تھا یہاں پر بھی اسی طرح ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿١٧٨﴾

"وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے ہرگز گمان نہ کریں کہ انہیں ہم ڈھیل دے رہے ہیں یہ ان کے نفسوں کیلئے بہتر ہے ہم تو انہیں صرف (اس لیئے) ڈھیل دے رہے ہیں تا کہ وہ گناہ میں زیادہ ہو جائیں اور ان کیلئے رسوا کرنے والا عذاب ہے" [178]

تفسیر 178: یہ سوال کا جواب ہے سوال یہ ہے کہ یہ کفار اور منافقین اسلام کے خلاف مختلف تدبیروں میں مصروف ہیں تو ان کو اللہ تعالیٰ عذاب جلدی کیوں نہیں دیتا ہے؟ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کیلئے عذاب دنیا میں بھی ہے مگر مہلت دینے میں انکا نقصان زیادہ ہے۔ وَلَا يَحْسَبَنَّ یہ لَا يَحْزُنْكَ پر عطف ہے اور اس کا فاعل الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ہے اور امام سیبویہ کے نزدیک (اِنَّ) اور (مَا) يَحْسَبَنَّ کے لئے دو مفعولوں کے قائم مقام ہیں اور امام اخفش کے نزدیک ایک مفعول حذف کیا گیا ہے اور اِنَّمَا ایک مَفْعُوْل کے قائم مقام ہے۔ اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ (مَا) موصولہ یا مصدریہ ہے اور اِملا ء عمر اور مہلت میں اضافہ اور ڈھیل دینے کو کہا جاتا ہے۔ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ یہ ان کیلئے خیر ہے۔ اس جملے کا مقصد کافروں کی اس خوشی کا رد ہے کہ مال ومتاع زیادہ ہے عمر بھی طویل ہے اور عذاب بھی نہیں ہے۔ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْا اِنَّمَا یہ سابقہ حکم کیلئے علت ہے اور مہلت دینے کا حکم ذکر کرنا بھی مقصود ہے۔ یہ حصر پہ دلیل ہے یعنی مہلت میں خیر تو قطعی طور پر نہیں ہے بلکہ یہ تو صرف گناہوں کیلئے موقع مہلت فراہم کرنا ہے۔ لِيَزْدَادُوْا لام برائے تعلیل یا عاقبت وصیرورت ہے یعنی مہلت کی مدت کو اللہ تعالیٰ کی بغاوت میں استعمال کرتے ہیں گناہ کو گناہ تصور ہی نہیں کرتے۔ بغاوت، کفر، منافقت وسرکشی میں مزید بڑھتے جاتے ہیں کیونکہ وہ اس مہلت کو اپنے حق میں اچھائی تصور کرتے ہیں۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ چونکہ کافر مہلت ملنے کی مدت میں دین ربانی کی توہین کرتے ہیں تو ان کیلئے رسوا کن عذاب ہے۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ "نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ مومنوں کو ان کے حال پر چھوڑ دے جس حال پر تم ہو یہاں تک کہ وہ الگ کر دے ناپاک (منافق) کو پاک (مخلص) سے اور نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں غیب (مخفی) چیزوں کی خبر دے لیکن اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے لہٰذا تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اگر تم ایمان لاؤ گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو تمہارے لئے بہت بڑا اجر ہے" [179]۔

تفسیر 179: (ربط 1) پہلے کفار اور منافقین کی اخروی سزا کا ذکر تھا اب ان کے نفاق کو ظاہر کر کے ان کی دنیاوی ذلت

رسوائی کو ذکر کیا جاتا ہے: (ربط 2) پہلے ذکر ہوا کہ مہلت کافروں اور منافقوں کیلئے شر ہے اب یہ ذکر ہو رہا ہے کہ مہلت کے دوران میں کبھی مصائب بھی آتے ہیں تاکہ وہ مؤمنین سے الگ ہوسکیں اور یہ مہلت کی حکمت بھی ہے۔ (ربط 3) جملہ معترضہ بیان کرنے کے بعد اب اُحد کی مصیبتوں کی علتوں اور حکمتوں کی طرف رجوع کیا جا رہا ہے۔ اس کا تعلق وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ سے ہے یعنی مصیبت کے وقت اُحد میں یہ منافق کافروں کی عارضی کامیابی پر خوش ہوئے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ منافق ہیں مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ یہ سوال کا جواب ہے سوال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اُحد میں مصیبت کیوں مسلمانوں پر مسلط کی اس میں کیا حکمت تھی؟۔ اس جملے میں اس کا جواب ہے۔ مَا كَانَ اس میں نفی جحودکی ہے اور ایک فعل مقدر ہے مَا كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ یعنی اس سے مخلص مؤمنین مراد ہیں اور أَنْتُمْ عَلَيْهِ اس سے خطاب میں مؤمنین منافقین دونوں داخل ہیں۔ مَا أَنْتُمْ سے مراد اہل ایمان اور منافقین کا اختلاط یعنی اللہ تعالیٰ منافقین کو اہل ایمان کے ساتھ ہمیشہ کیلئے یکجا نہیں رکھتا ہے تاکہ لوگوں کے سامنے حق دین میں شبہات پیدا نہ ہوں۔ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ اس میں تین توجیہات ہیں (1) خبیث سے منافق اور طیب سے مؤمن مراد ہے۔ اُحد کی جنگ میں یہ تمیز حاصل ہوئی کہ منافقین راستے سے پلٹ آئے اور مسلمانوں کی مغلوبیت پر خوشی منائی۔ (2) خبیث سے مراد گناہگار ہے اور طیب سے مؤمن مراد ہے يَمِيْزَ يُخَلِّصَ کے معنی میں ہے یعنی مؤمنوں کے گناہ مصائب کے ذریعے سے دھوئے جاتے ہیں۔ (3) مستقبل کے اعتبار سے توجیہ یہ ہے کہ خبیث سے مراد کفر و شرک اور طیب سے اسلام مراد ہے اور کفر کی تذلیل اور اسلام کی سربلندی پر تمیز آئی ہے۔ (صاحب اللباب) سوال: پہلی توجیہ پر یہ سوال وارد ہوتا ہے کہ تمیز سے تو اظہار ہوتا ہے تو وہ ظاہری کافر ہوگئے پھر ان پر نفاق کے بجائے کفر کے احکام جاری کیوں نہیں کئے گئے؟ جواب (1): احکام کفر تو اللہ تعالیٰ جاری کرتا ہے جبکہ منافقین پر حکم منافقت کا جاری کیا گیا ہے۔ جواب (2): تمیز سے ظنی ظہور حاصل ہوتا ہے نہ کہ قطعی یقینی۔ فائدہ: اس دور کے منکرین حدیث کا اعتراض ہے کہ احادیث ناقابل اعتبار ہیں کیونکہ اس وقت پہچان مشکل تھی کہ منافق کون ہے اور مؤمن کون لہٰذا حدیث نقل کرنے میں یہ امتیاز نہیں ہوسکا کہ یہ صحابی رسول ہے یا منافق ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً امتحانات کے ذریعے سے یہ فرق ہو چکا ہے لہٰذا کسی منافق سے کوئی حدیث منقول نہیں ہے۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ یہ دوسرے سوال کا جواب ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤمن اور منافق کے فرق کیلئے مصائب لاتا ہے تو وحی کے ذریعے سے یہ خبر ہمیں

کیوں نہیں دیتا ہے کہ فلاں منافق اور فلاں مؤمن مخلص ہے؟ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ وحی تو غیب ہے اور غیب اللہ تعالیٰ صرف رسولوں کو بتاتا ہے۔ غیب سے مراد یہاں خاص وحی ہے جو منافق اور مؤمن کی پہچان کیلئے کی گئی ہے یا مطلق وحی مراد ہے اور اس جملے کا معنیٰ یہ ہے کہ تم سب کو اللہ تعالیٰ وحی نہیں کرتا ہے کہ سب رسول بن جاؤ بلکہ یہ نظام الٰہی کے خلاف ہے۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ۔ لٰكِنَّ کے ساتھ دوسرے سوال کا جواب ہے سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو بھی وحی کے ذریعے سے خبر نہیں دیتا ہے تو جواب ہوا کہ صرف رسولوں کو وحی کے ذریعے سے علم دیتا ہے اور یہ مشیت الٰہی سے ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اس میں اختیار نہیں دیا ہے۔ يَجْتَبِىْ یہ اِجْتِبَا جَبَيٰ سے لیا گیا ہے جس کے معنیٰ اصطفاء اور اختیار (چننے) کے ہے۔ یہ واوی یا یائی ہے جو بہتر چیز کو کھینچنے کے معنیٰ میں ہے۔ نبی پر اس کا اطلاق اس لیئے ہوتا ہے کہ بندوں کے درمیان سے اللہ تعالیٰ اس کو چن لیتا ہے تاکہ پیغام الٰہی کو بندوں تک پہنچائے۔ لٰكِنَّ کے متعلق قاعدہ یہ ہے کہ یہ دو متضاد (مخالف) چیزوں کے درمیان آتا ہے لہٰذا یہاں بھی اسی طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ وحی کسی اور کو نہیں کرتا ہے سوائے رسولوں کے یعنی صرف ان کو وحی کرتا ہے۔ مِنْ رُّسُلِهٖ یہ مِنْ ابتدائے غایہ کیلئے ہے لہٰذا تمام رسول اس سے مراد ہیں۔ یا مِنْ برائے تبعیض ہے کیونکہ بعض اوقات اِطِّلَاعٌ عَلَى الْغَيْبِ ہوتی ہے اور بعض وقت نہیں ہوتی۔ فائدہ: یہ دلیل ہے کہ نجوم، کہانت، کشف و الہام سے غیب کا علم حاصل نہیں ہوتا ہے بلکہ صرف گمان حاصل ہوتا ہے۔ اس لیئے اہل علم نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ الہام و کشف اسباب علم میں سے نہیں ہیں فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ سے مفسر ابوحیان اور زمخشری نے لکھا ہے کہ یہ ماقبل پر تفریع ہے یعنی جب تمہارے سوالوں کے جوابات دیدیئے گئے اور اس رسول کی سچائی ثابت ہوگئی تو اللہ و رسول پر ایمان لازماً لانا چاہئے اللہ تعالیٰ پر ایمان یہ ہے کہ صفات الوہیت کو اس کیلئے خاص تسلیم کریں جن میں سے ایک صفت علم کلی ہے۔ رسولوں پر ایمان یہ ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے چنے ہوئے بندے مانا جائے اور ان کیلئے صرف وہ علم مانا جائے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عنایت کیا اور ان کیلئے علم غیب ثابت نہ کریں۔ رُسُلِهٖ کو جمع اس لیئے ذکر کیا ہے کہ ایک رسول کا انکار تمام رسولوں سے انکار کے مترادف ہے اور ایک رسول پر ایمان سب پر ایمان لانے کے مترادف ہے۔ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ اس آیت میں ایمان کے بعد تقویٰ کی اس لیئے صراحت کی ہے کہ توحید قبول کرنے پر شرک سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے رسول پر ایمان لانے سے کفر سے بچاؤ ہوتا ہے اتباع رسول سے بدعات سے اجتناب و تقویٰ حاصل ہوتا ہے لہٰذا سابقہ آیتوں کے ساتھ وَاتَّقُوْا متعلق ہے اَجْرٌ عَظِيْمٌ سے مراد یہ ہے کہ عذاب سے بچ

کہ جنت میں داخل ہوں گے۔ فائدہ: بعض متجاہلین کا یہ عقیدہ ہے کہ آخری نبی ﷺ اور دیگر انبیا کو علم غیب کلی طور پر حاصل ہے ایسے لوگوں کو ان علاقوں میں بریلوی کہتے ہیں انہوں نے اس آیت سے یوں استدلال کیا ہے کہ اَلْغَیْبِ میں الف لام استغراقی ہے اور لٰکِنَّ کے ذریعے سے استثنیٰ متصل ہے تو معنی یہ ہوا کہ نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ تمہیں غیب کی تمام خبریں دیدے بلکہ وہ غیب کی تمام خبریں صرف رسولوں کو دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے منتخب بندے ہیں۔ جواب (1): جیسا کہ امام سیوطی نے ترتیب نزولِ سُوَرْ میں فرمایا ہے کہ سورۃ آل عمران تیسری مدنی سورت ہے اس سے پہلے 16 سورتیں نازل ہوئی تھیں لہٰذا پھر تو بعد والی سورتوں کا نزول بے فائدہ قرار پایا کیونکہ اس سورۃ میں بقول ان کے تمام چیزوں کا علم نبی آخر الزمان کو حاصل ہو گیا تھا۔ جواب (2): اس سورۃ کے بعد سورۃ نساء میں آیت 105 ن چوری کا واقعہ ذکر ہے سورۃ نور آیت 11 میں واقعہ افک یعنی ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت کا واقعہ ذکر ہے سورۃ منافقون آیت 1، سورۃ توبہ آیت 101 میں اور دیگر سورتوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے علم غیب کی نفی ثابت ہوتی ہے اس طرح سے تو اللہ تعالیٰ کی کتاب میں تعارض اور ٹکراؤ ثابت ہوگا جو جہل کی دلیل کے ساتھ ساتھ بھول (نسیان) اور باطل ہونے کی دلیل ہے جبکہ کتاب الٰہی تو اس سے پاک ہے۔ جواب (3): مفسرین نے اس سے کچھ امور غیبیہ یعنی منافق و مومن کی تمیز مراد لی ہے۔ (1) ابن عطیہ نے فرمایا کہ اس غیب سے مراد یہ ہے کہ کون ایمان لائے گا اور کون نہیں لائے گا یا منافقین کے واضح نام بتانا مراد ہے۔ یا اُحد کی شکست کی خبر مراد ہے۔ (2) امام قرطبی نے فرمایا کہ اس سے منافقین کے ناموں کی وضاحت مراد ہے یا یہ کہ نبوت کا مستحق کون ہے۔ (3) امام دمشقی نے اللباب میں لکھا ہے کہ منافقین کے ناموں کا تعین اور علم نبوت مراد ہے۔ (4) مفسر قاسمی نے فرمایا کہ وہ چیز جس کے ذریعے سے کفر و اسلام کی پہچان ہو سکے۔ (5) امام ابو حیان نے سدی سے نقل کیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ کون ایمان لائے گا اور کون کفر پر باقی رہے گا۔ امام مجاہد کی روایت میں ہے کہ اُحد کی شکست مراد ہے یہی قول امام ابن جریج سے منقول ہے۔ (6) امام آلوسی نے کہا ہے کہ ایمان اور نفاق کی علامات مراد ہیں۔ نیز یہ بھی مقصود ہے کہ تمہیں صرف علم استدلالی حاصل ہے غیب کا علم تمہیں نہیں ہے۔ (7) ابن کثیر نے فرمایا کہ اس سے مراد مومن اور منافق کی پہچان ہے۔ (8) بقول امام خازن مومن، کافر اور منافق کا فرق مراد ہے۔ (9) ابن جریر کا بھی مذکورہ قول ہے۔ (10) امام شربینی کا بھی یہی قول ہے یعنی نبی اکرم علیہ السلام کو بعض مغیبات کے متعلق وحی ہوتی ہے۔ (11) نیشاپوری کا قول ہے کہ نبی اپنی طرف سے غیب کی خبر نہیں دیتا ہے بلکہ وحی سے دیتا ہے اس وحی میں اس بات

کی خبر ہے کہ فلاں منافق اور فلاں مؤمن ہے۔ (12) مظہری کا قول ہے کہ بعض غیبی علوم مراد ہیں۔ (13) جامع البیان میں ہے کہ بعض مغیبات کا علم مراد ہے لہٰذا جو لوگ اس سے علم غیب کلی مراد لیتے ہیں وہ مذکورہ تمام مفسرین کے خلاف ہیں۔ جواب (4): الغیب میں الف لام استغراقی نہیں ہے جیسا کہ عربیت کے علماء نے تصریح کی ہے تفتازانی نے تلویح میں لکھا ہے کہ الف لام میں اصل عہدی ہے اسی طرح سیالکوٹی نے حاشیہ مطول میں لکھا ہے کہ الف لام میں اصل عہدی پھر جنسی ہے لہٰذا بلا کسی دلیل کے اصل چھوڑ کر اصل کے خلاف اختیار کرنا ناجائز ہے۔ سوال: روح المعانی اور بعض تفاسیر میں منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم علیہ السلام کے سامنے تمام اولادِ آدم کی صورتوں کو پیش کیا اور آپ کو اس بات کا علم دیا گیا کہ ان میں کون مؤمن اور کون کافر ہے لہٰذا یہ کلی غیب کی دلیل ہے؟ جواب: امام آلوسی نے فرمایا ہے کہ اس اثر کی سند میں کلام ہے بعض محدثین نے اس کے راویوں کو مجہول قرار دیا ہے اور ابو العالیہ نے اس کے برعکس روایت نقل کی ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم ۖ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۖ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿١٨٠﴾

" ہرگز وہ لوگ گمان نہ کریں جو اس چیز پر بخل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انکو اپنے فضل میں سے دیا ہے کہ وہ ان کیلئے بہتر ہے بلکہ ان کیلئے وہ بدتر ہے عنقریب وہ طوق پہنائے جائیں گے اس مال کے ساتھ جو انہوں نے بخل کیا قیامت کے دن اور اللہ ہی کیلئے آسمانوں وزمین کی ملکیت ہے اور جو عمل تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے خوب باخبر ہے" [180]۔

تفسیر 180: (ربط 1) سابقہ آیت میں جہاد کے ذریعے مؤمن اور منافق کی تمیز کی گئی تو اب ان میں امتیاز مال خرچ کرنے سے ذکر کیا جاتا ہے۔ (ربط 2) سابقہ آیات کے مضمون میں نفوس سے جہاد کی طرف ترغیب کا ذکر تھا تو اب مال کے ذریعے جہاد کی طرف ترغیب کا ذکر ہے۔ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم اس آیت میں ان لوگوں کے لئے زجر اور تخویف دنیاوی ہے جو بخل کرتے ہیں۔ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ فاعل ہے اور اس کا مفعول اول مقدر ہے جس پر يَبْخَلُونَ دلالت کرتا ہے جو کہ بُخْلَهُمْ ہے اور هُوَ ضمیر فصل برائے تاکید ہے اور خَيْرًا مفعول ثانی ہے۔ بخل اکثر اہل علم کا قول ہے کہ اس مقام پر واجب خرچ کرنے سے منع اور بخل مراد ہے جس کی دلیل شدید وعید ہے اور اس کی بہت سی قسمیں ہیں (1) اپنی ذات اور اہل وعیال پر خرچ (2) زکوٰۃ (3) جہاد اور دعوت دین میں خرچ (4) ضرورت مند اور محتاج کو اتنا دینا جس سے اس کا گزران ہو سکے۔ بِمَا آتَاهُمُ یہ مال اور علم دونوں کیلئے ہے البتہ مراد

اول ہے۔ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ یہ خیر کی نفی کیلئے بطور تاکید ذکر کیا ہے کہ اس میں کسی قسم کی خیر نہیں ہے البتہ شر اس میں یقینی ہے اس کو نکرہ اس لئے ذکر کیا ہے تا کہ اس کی عظمت واضح ہو۔ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ یہ اخروی شر کی تفصیل ہے۔ تطویق کا معنیٰ ہے گلے میں طوق پہننا اس میں حقیقی معنیٰ مراد لینا حدیث کی روشنی میں زیادہ بہتر ہے۔

(صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4565) میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے آیا ہے کہ جس نے فرض زکوٰۃ ادا نہیں کی جبکہ اس کے پاس مقدار زکوٰۃ میں مال ہے تو قیامت کے دن اس مال کو سانپ کی صورت میں اس کے گلے میں پہنایا جائے گا اور وہ ایسا سانپ ہوگا جو کثرت زہر کی وجہ سے گنجا ہوگا اور اس کی کشش کی طرح دو آنکھیں ہوں گی اور اس کے جبڑے کو کھینچتا ہوا کہے گا میں تیرا مال ہوں میں تیرا خزانہ ہوں۔ اس مضمون کی اور بھی روایات ہیں بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ بصورت تاویل ہوگی یعنی ان پر یہ عذاب بخل کی وجہ سے مسلط کیا گیا ہوگا۔ وَلِلّٰهِ مِيرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اس کے دو معنی ہیں (1) پہلا معنیٰ یہ ہے کہ جو مال لوگ ایک دوسرے سے میراث میں لیکر جاتے ہیں وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی کی میراث ہے کیونکہ وہ سب آخر میں اللہ ہی کی ملکیت میں رہے گا تم تو چند دنوں کیلئے اس کے عارضی مالک بنائے گئے ہو لہٰذا اس پر بخل مت کرو اس طرح عنوان سورۃ حدید آیت 7 میں بھی ہے (2) دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ زمین و آسمان والے سارے فنا ہو جائیں گے تو وہ سارے اللہ تعالیٰ کیلئے اس میراث کی طرح ہوں گے جیسا کہ فنا ہونے والے شخص سے مال وغیرہ رہ جاتا ہے۔ پہلے معنیٰ کے اعتبار سے میراث حقیقی ہے اور دوسرے معنیٰ کے اعتبار سے تشبیہی میراث مراد ہے۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ بخل چونکہ باطنی عمل ہے اور خبیر بھی باطنی امور میں استعمال ہوتا ہے اور اس میں ہر عمل پر جزا دینے کی طرف اشارہ ہے۔

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿181﴾ ”یقیناً اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی بات سن لی جنہوں نے کہا تھا کہ اللہ تو محتاج ہے اور ہم غنی ہیں جو انہوں نے کہا اسے ہم لکھ رکھیں گے اور جو وہ انبیاء کو ناحق قتل کرتے رہے (وہ بھی لکھ رکھا ہے) اور ہم (قیامت کے دن) کہیں گے کہ اب جلا دینے والے (شدید) عذاب کا مزا چکھو“[181]۔

(خلاصہ) اس آیت سے آیت 186 تک اس حصے کا دوسرا باب ہے جس میں اس امت کو ڈرانے کیلئے اہل کتاب کی تین

برائیاں مذکور ہیں (1) مال خرچ کرنے سے باطل عذر کے ساتھ انکار کرنا آیت 181۔(2) باطل دلیل کے ساتھ رسول کا انکار آیت 183۔(3) دنیا کے حصول کیلئے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو چھوڑ دینا اور چھپالینا آیت 187 میں ہے اور درمیان میں نبی اکرم علیہ السلام کو تسلی دی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں مالی وجانی مشکلات کا ذکر ہے۔آخر میں اس کام پر خوشی کا اظہار اور لوگوں سے تعریف طلب کرنا ہے جو انہوں نے نہیں کیا ہے آیت 188۔ (ربط) جیسا کہ بخیلوں کو زجر کے ضمن میں انفاق کی ترغیب دی گئی یہ ترغیب بھی اس طرح ذکر کی گئی ہے کہ مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا ہذی بن اخطب، فنحاص اور ان دونوں کی تقلید میں دیگر یہودیوں نے بھی کہا کہ اللہ تعالیٰ فقیر ہے اس لیئے ہم سے قرض کا مطالبہ کرتا ہے تو ان کے اس قول پر ان کو تنبیہ کی گئی اسی طرح پہلے منافقین کا بخل کے حوالہ سے رد کیا گیا تو یہود بھی اس عمل میں ان کے ساتھ شریک تھے اس لیئے انہوں نے بہانہ بنایا۔ لَقَدۡ سَمِعَ اللّٰهُ قَوۡلَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا لام اور قَدۡ کو برائے تنبیہ ذکر کیا ہے اس طرح عبارت کبھی زجر کیلئے استعمال ہوتی ہے اور کبھی شفقت کیلئے آتی ہے جیسا کہ سورۃ مجادلہ آیت 1 میں ہے۔اِنَّ اللّٰهَ فَقِیۡرٌ ان کا یہ قول بطور مزاق جدل اور الزام کے تھا یعنی جو قرض مانگتا ہے وہ فقیر ہوتا ہے۔

تفسیر 181: فتح البیان میں ہے کہ یہاں حرف استفہام مقدر ہے یا پھر یہ ان کے عقیدہ کے مطابق کلام ہے جیسا کہ انہوں نے کہا تھا یَدُ اللّٰهِ مَغۡلُوۡلَةٌ تو یہ بات ان سے بعید نہیں ہے۔ یا علماء نے بطور جدل کہا اور عوام نے بطور عقیدہ کہا اور زیادہ تاکید کی وجہ سے انہوں نے یہ جملہ (اِنَّ) کے ساتھ کہا۔وَّ نَحۡنُ اَغۡنِیَآءُ اس کلام میں انہوں نے تاکید نہیں کی اس لیئے کہ اپنی مالداری کو وہ ظاہر تصور کرتے تھے۔سَنَكۡتُبُ مَا قَالُوۡا ان کا یہ قول عناد پر مبنی تھا اس لیئے کوئی حقیقی جواب نہیں دیا بلکہ بطور ڈانٹ وتنبیہ جواب دیا ہے۔ کتابت سے حقیقی معنیٰ مراد ہے یعنی کِرَامًا کَاتِبِیۡنَ کے صحیفوں میں تحریر کرنا اس میں (س) مستقبل کیلئے نہیں ہے بلکہ برائے تاکید ہے کیونکہ دوسرے نصوص سے ثابت ہوتا ہے کہ ملائکہ انسانوں کے اعمال فی الحال لکھتے ہیں۔دوسرا قول یہ بھی ہے کہ کتابت سے مراد سزا لازم کرنا ہے جیسا کہ کُتِبَ عَلَیۡكُمُ الصِّیَامُ ہے البتہ پہلا قول بہتر ہے۔لکھنا حفاظت کیلئے ہے جیسا کہ امام بخاری نے سَنَكۡتُبُ کا معنیٰ سَنَحۡفَظُ کیا ہے۔وَ قَتۡلَهُمُ الۡاَنۡۢبِیَآءَ بِغَیۡرِ حَقٍّ یہ مَا قَالُوۡا پر عطف ہے اور مصدر کا فعل پر عطف اس وقت جائز ہوتا ہے جب فعل مصدر کی تاویل میں ہو۔ سوال: قتل تو ان کے بزرگوں بڑوں نے کیا تھا تو ان کو کیوں نسبت کی گئی؟ جواب: جب یہ ان کے اعمال پر خوش تھے تو اس لیئے ان کی طرف نسبت کی گئی کیونکہ کسی کے گناہ پر خوش ہونا ان کے ساتھ گناہ میں شریک ہونے کے مترادف

ہے۔ امام قرطبی اور صاحب اللباب نے امام شعبی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ اس کے سامنے کہنے والے نے کہا کہ جنہوں نے عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو قتل کیا تھا انہوں نے صحیح کیا تھا۔ امام صاحب نے فرمایا تم بھی اس کے قتل میں شریک ہونے اس لیئے کہ گناہ پر رضامندی اس میں شرکت کے مترادف ہے۔ (نیز اس طرح مرفوع حدیث سے بھی ثابت ہے۔ صحیح ابوداؤد کتاب الملاحم حدیث 4345 صحیح ترغیب حدیث 2323) (مترجم)۔ سوال: قتل کے ذکر میں یہاں کیا فائدہ ہے؟ جواب: اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ قول بہت (قبیح) برا ہے لہٰذا ان کا نبیوں کو قتل کرنا بھی بہت برا عمل ہے لہٰذا ان کا قول اور فعل دونوں بدترین ہیں تو یہ عذاب کے مستحق ہیں اس لیئے متصل عذاب کا ذکر ہو رہا ہے۔ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ۔ الْحَرِیْقِ یہ محرق کے معنی میں ہے جیسا اَلِیْمٌ مُؤْلِمٌ کے معنی میں ہے۔ بعض کے قول کے مطابق شعلوں والی آگ مراد ہے یا جہنم کے ایک طبقے کا نام ہے۔ یہ اضافت بیانیہ ہے یہ قول ملائک کی جماعت کا ہے جو ان کی موت کے وقت یا میدان محشر میں یا دونوں اوقات میں کہا جائیگا۔ ذُوْقُوْا محسوسات میں سے ہے اس میں اشارہ ہے کہ اس عذاب کا درد انہیں محسوسات کی طرح معلوم ہوگا اور امام آلوسی نے فرمایا ہے مال پر بخل اس لیئے کرتے تھے کہ مال کھائیں تو سزا بھی ان کو اس طرح دی جائے گی گویا کہ اس کو کھا رہے ہیں۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے اقوال وافعال سے انبیاء اور ان کے متعلقین صالحین کو تکلیفوں کے گھونٹ پلائے تھے تو ان کو اس کی سزا بھی اسی طرح عذاب کے گھونٹ پلا کر دی جائے گی۔ امام زجاج نے فرمایا ہے لفظ ذُوْقِیْ وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں معافی کا کوئی امکان نہ ہو اور اسی طرح عذاب کے گھونٹ پلا کر سخت غلیظ غضبناک عذاب کا سامنا ہو۔

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ﴿۱۸۲﴾

"یہ تمہارے اپنے ہی ہاتھوں کی کمائی ہے اور اللہ یقیناً" اپنے بندوں پر (ذرہ برابر) ظلم نہیں کیا کرتا" [182]۔

تفسیر 182: ذٰلِكَ بِمَا اس میں عذاب کی طرف اشارہ ہے (با) برائے سببیہ ہے اور (تا) قَدَّمَتْ میں سابقہ اقوال افعال عقائد سب کو شامل ہے البتہ اَیْدِیْكُمْ کثرت کے اعتبار سے کہا گیا ہے۔ اَیْدِیْ سے نفس مراد ہے یعنی جز کو ذکر کیا گیا ہے جبکہ مراد کل ہے۔ وَاَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ یہ مَا قَدَّمَتْ پر عطف ہے ہر ظلم کی نفی سے کامل عدل ثابت ہوتا ہے حاصل یہ ہے کہ ان کے عذاب کیلیئے دو اسباب ہیں جس کے مجموعے سے ایک کامل سبب بنتا ہے (1) پہلا سبب ان کے اعمال ہیں دوسرا سبب اللہ تعالیٰ کا عدل ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا عدل تقاضا کرتا ہے کہ ان کے قولی فعلی مظالم کی سزا سخت

سے سخت دی جائے۔ سوال: بِظَلَّامٍ تو مبالغہ کا صیغہ ہے جو کثرت اور زیادت پر دلیل ہے تو اس میں کثیر ظلم کی نفی ثابت ہوئی تو نفی کثیر سے اصل چیز کی نفی لازم نہیں آتی ہے جبکہ اس سورۃ کی آیت 108 میں اللہ تعالیٰ نے ظلم کی نفی اپنی ذات سے اس طرح کی ہے کہ میں تو ظلم کا ارادہ نہیں کرتا ہوں؟ جواب (1): فَعَّالٌ کا وزن ہمیشہ مبالغہ پر دلالت نہیں کرتا ہے بلکہ کبھی صرف متصف ہونے اور نسبت پر دلالت کرتا ہے تو مطلب یہ ہوا لَيْسَ بِذِي ظُلْمٍ نہیں ہے ظلم والا (جلالین) جواب (2): چونکہ بندے زیادہ ہیں اور جب ہر بندے پر ظلم ہو تو مظالم بھی زیادہ ہو جائیں گے اس لیئے کثرت کا صیغہ ذکر کیا ہے۔ جواب (3): کثیر ظلم کی نفی سے قلیل کی بھی نفی ہوگی کیونکہ جب کوئی ظلم کرتا ہے تو اپنے فائدے کیلئے کرتا ہے لہٰذا جب کوئی جہت سارے فائدوں کے باوجود کثیر ظلم نہیں کرتا ہے تو قلیل تو بطریق اولیٰ نہیں کرے گا۔ اس طرح جملہ قرآن مجید میں سورۃ انفال آیت 51 سورۃ حج آیت 10 سورۃ حٰم سجدہ آیت 46 سورۃ قٓ آیت 29 میں مذکور ہے۔ فائدہ: امام راغب نے فرمایا کہ لفظ عبید عام ہے ان لوگوں کیلئے جو اللہ تعالیٰ کی بندگی کریں یا غیر اللہ کی جبکہ عباد لفظ خاص ہے ان لوگوں کیلئے جو صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی کریں۔

اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ۭ قُلْ قَدْ جَاۗءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْھُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ "(یہی وہ لوگ ہیں) جنہوں نے کہا تھا کہ بلاشبہ اللہ نے ہم سے عہد لیا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک (یہ معجزہ صادر نہ ہو) کہ وہ ہمارے پاس قربانی لائے جسے آگ کھا جائے کہو مجھ سے پہلے تمہارے پاس کئی رسول آئے جو واضح نشانیاں لائے تھے اور وہ نشانی بھی جو تم اب کہہ رہے ہو پھر اگر تم سچے ہو تو تم نے انہیں قتل کیوں کیا تھا" [183]۔

تفسیر 183: اس آیت میں ان کے ایک اور (قبیح) برے عمل پر زجر کا ذکر ہے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہودیوں کے سردار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہنے لگے کہ ہمیں تورات میں حکم دیا گیا ہے کہ ایسے رسول پر ایمان لاؤ جس کی قربانی اور صدقات آگ جلاتی ہو لہٰذا آپ ہمیں یہ عمل کر کے دکھائیں کہ آپ کی قربانی آسمانی آگ سے جل جائے۔ اس پر یہ آیت بطور تردید نازل ہوئی تفسیر قرطبی 4، 295۔ اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا یہ اَلَّذِيْنَ آیت 181 کیلئے صفت یا بدل ہے یا پھر اس کا مبتدا (هُمْ) مقدر ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ۔ عَهِدَ وصیت کے معنی میں ہے اور عہد امر سے خاص ہے کیونکہ عہد اس جگہ مستعمل ہوتا ہے جس کی مدت طویل ہو: اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ یہاں (فی) مقدر ہے یا عہد کیلئے مفعول ہے جو الزام کے

معنی میں ہے اور ایمان کے صلے میں لام بمعنی اقرار اور اعتراف ہے: حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ یہ اصل میں مصدر ہے لیکن مفعول کے معنی میں ہے۔ یہ ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل ہوتی ہو خواہ وہ جانور ہو یا کوئی اور چیز ہو۔ تَاْكُلُهُ النَّارُ کھانے کی نسبت آگ کی طرف مجازی ہے اصل مقصد جلانا اور ختم کرنا ہے: قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ یہ الزامی جواب ہے۔ اشارہ ہے کہ قربانی کو آگ کے ذریعے جلانا ایک معجزہ ہے اور اس کے علاوہ بھی ان کو معجزات دیے گئے مگر بنی اسرائیل نے ان سب سے انکار کیا تھا۔ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ یہ تخصیص بعد تعمیم ہے یعنی قربانی کو آگ کے ذریعے سے جلانے والا معجزہ بھی تمہارے نبیوں نے پیش کیا تھا اور یہ دلیل ہے کہ تورات میں یہ شرط تصدیق رسول کیلئے موجود تھی جیسا کہ آدم علیہ السلام کے زمانے میں قابیل و ہابیل کے واقعہ میں ہے اور اسی طرح یوشع علیہ السلام کے زمانے میں مال غنیمت کے جلانے کا واقعہ صحیح بخاری کتاب فرض الخمس حدیث 3124 صحیح مسلم حدیث 1747 میں وارد ہے۔ امام قرطبی نے فرمایا ہے اس طرح معجزہ زکریا اور شعیب علیہما السلام نے پیش کیا تھا لیکن یہودیوں نے تورات میں تحریف کر کے ان الفاظ کو چھپایا تھا کہ الا المسیح علیہ السلام و محمد ﷺ یہ معجزہ عیسیٰ علیہ السلام و محمد ﷺ کو حاصل نہیں ہوگا یہ سدی سے منقول ہے اور بعض مفسرین کا قول ہے کہ تورات میں یہ شرط موجود نہیں تھی انہوں نے اپنی طرف سے گھڑلی تھی البتہ بعض نبیوں کے معجزات میں یہ معجزہ شامل تھا جبکہ یہ معجزہ تو موسیٰ علیہ السلام کو بھی حاصل نہیں تھا البتہ ان کا یہ مطالبہ نبی کریم ﷺ سے ایسا تھا جیسا صالح علیہ السلام سے قوم نے کیا تھا یا مشرکین مکہ نے نبی اکرم علیہ السلام سے کیا تھا۔ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ یہ قتل ان کے بڑوں بزرگوں نے کیا تھا جیسا کہ پہلے گزر گیا ہے مگر بعد والی نسلیں اس عمل پر راضی تھیں اس لئے ان کی طرف نسبت کی گئی ہے (تکذیب) جھٹلانے سے قتل زیادہ بڑا جرم ہے اس لیے قتل ذکر کیا گیا ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ یعنی اس وعدے میں یا آگ سے جلانے والی قربانی پر ایمان میں سچے ہو۔

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿١٨٤﴾ "پھر اگر انہوں نے آپ کو جھٹلایا تو بلاشبہ کئی رسول آپ سے پہلے جھٹلائے گئے وہ واضح دلائل صحیفے اور روشن کتاب لائے تھے" [184]۔

تفسیر 185: اس آیت میں نبی اکرم ﷺ کو تسلی دی گئی ہے۔ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ ۔ (اِنْ) اِذَا کے معنی میں ہے۔ فَقَدْ كُذِّبَ اس میں شرط کی جزاء مقدر ہے یعنی فَاصْبِرْ یعنی اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو آپ صبر کرتے رہیں۔ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ

مجہول کا صیغہ اور رُسُلٌ کو جمع ذکر کرنا دلیل ہے کہ یہود کی طرح سابقہ دیگر اُمتوں نے بھی نبیوں کی تکذیب کی ہے۔ مِّنْ قَبْلِكَ یہ كُذِّبَ سے متعلق ہے۔ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ یہ جملہ رُسُلٌ کیلئے صفت ہے۔ اَلْبَيِّنٰتِ سے واضح معجزات مراد ہیں۔ وَالزُّبُرِ زَبُوْر کی جمع ہے اور یہ زَبَرَ سے لیا گیا ہے جو مفعول کے معنی میں ہے۔ یعنی اَلْكُتُبُ الْمَزْبُوْرَةُ لکھی گئی کتابیں۔ اس کا اطلاق ان کتابوں پر ہوتا ہے جن میں احکام کم ہوں یا نہ ہوں اور وعظ نصیحت زجر وغیرہ ان میں زیادہ ہوں۔ داؤد علیہ السلام کی کتاب زبور بھی مواعظ زواجر اور فضائل پر مشتمل تھی اور اس میں احکام نہیں تھے اسی طرح ابراہیم علیہ السلام و دیگر انبیاء کرام کے صحیفے تھے تو یہاں تمام صحائف اور داؤد علیہ السلام کی زبور سب مراد ہیں۔ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ اس سے تورات انجیل مراد ہیں اور احکام پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ان کو مُنِيْرِ کہا گیا ہے۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ اَلْبَيِّنَاتُ سے مراد وہ ہے جو عوام کی سمجھ میں آتا ہو اور کتابِ مُنِيْر سے مراد خواص کے علم کیلئے ہوتی ہے اور اَلزُّبُر درمیانے لوگوں کیلئے ہے۔ اس زمانے کے بعض مشائخ کا قول ہے کہ اَلْبَيِّنَاتِ میں عقلی دلائل کی طرف اشارہ ہے اَلزُّبُر میں نقلی دلائل جبکہ کتابِ مُنِيْر میں دلائل وحی کی طرف اشارہ ہے البتہ اس تخصیص کیلئے کوئی قرینہ اور نقل ثابت نہیں ہے اور رسولوں کا آنا اس کیفیت سے مجموعی حیثیت سے ہے یعنی ہر نبی ان تین قسم کی کتابوں کو لیکر نہیں آئے بلکہ کوئی ایک کوئی دو اور کوئی مذکورہ تینوں قسم کے امور لیکر آیا ہے۔ سورۃ فاطر آیت 25 میں تینوں امور مذکور ہیں جبکہ سورۃ نحل آیت 44 میں دو کا ذکر ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۗ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۗ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿١٨٥﴾ "ہر شخص کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور قیامت کے دن تمہیں تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ پھر جو شخص جہنم سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا تو وہ کامیاب ہو گیا اور یہ دنیا کی زندگی تو محض دھوکے کا سامان ہے" [185]۔

تفسیر 185: اس آیت میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے اور مُتَّبِعِيْنَ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تسلی دی گئی ہے کیونکہ جو لوگ موت کا عقیدہ رکھتے ہیں تو ان سے دیگر غم دور ہوتے ہیں۔ نیز اس میں تسلی ہے کہ موت کے بعد سچوں اور جھوٹوں کی تمیز ہو گی اس میں جہاد فی سبیل اللہ کی طرف ترغیب بھی ہے اور بہادری کا درس بھی ہے اور انفاق فی سبیل اللہ کا بھی تذکرہ ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ لفظ کل اگرچہ مذکر ہے لیکن نحویوں کا قول ہے کہ اضافت کے وقت اعتبار مضاف الیہ کا ہوتا ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ امام ابن عطیہؒ کے بقول اس سے مراد پیدا ہونے والا نفس ہے۔ امام آلوسیؒ نے فرمایا ہے کہ اس سے مستثنیات بہت

ہیں اس فرمان کی وجہ سے کہ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ اس قول کی بناء پر کہ صَعِقَ سے موت مراد لی جائے اور یہ آیت كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ سے عام ہے کیونکہ اس میں عَلَيْهَا سے زمین کے اوپر کے مخلوق مراد ہے اور اگر اس سے آسمانی مخلوق بھی مراد لی جائے تو ان پر بھی علیہا کا اطلاق ہو سکتا ہے اور یہ قول بہتر ہے جس کیلئے قرینہ وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ اور كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ہے معلوم ہوا کہ یہ تینوں کلیات ہیں البتہ بعض نصوص کی وجہ سے اس سے تخصیصات ثابت ہیں اس کی تفصیل سورۃ قصص کے آخر میں مذکور ہے امام ابن کثیر کے بقول اس کلیہ میں انسان، جن، ملائک عرش اُٹھانے والے ملائک سب داخل ہیں۔ ذات الٰہی کے علاوہ جو کہ اَلْحَيُّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ ہے۔ صاحب اللباب نے فرمایا کہ اگر سوال کیا جائے کہ نفس کا اطلاق تو قرآن میں ذات باری تعالیٰ پر بھی ہوا ہے۔ نیز نفس اور ذات ایک ہی چیز ہے لہٰذا اس میں جمادات بھی داخل ہیں تو جواب یہ ہے کہ نفس سے مراد وہ نفوس ہیں جو دنیا میں مکلف ہو سکتے ہیں یعنی زندہ نفوس ہیں۔ فائدہ: نفس کا اطلاق کبھی روح پر اور کبھی بدن پر ہوتا ہے ذات مراد ہے جس کی دو وجوہات ہیں (1): ذائقہ چکھنے والا ذائقہ لیتے وقت موجود ہوتا ہے لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ روح پر موت نہیں آتی۔ (2) موت حرارت اور رطوبت کے غلبے سے پیدا ہوتی ہے اور یہ جسم کی صفات ہیں لہٰذا روح سے اس کا تعلق نہیں۔ علماء شریعت کے نزدیک نفس یہاں روح و بدن دونوں کیلئے مستعمل ہے اور ہر ایک کی موت الگ الگ معنیٰ کے ساتھ مراد ہے۔ بدن کی موت یہ ہے کہ روح اس سے جدا ہو جاتی ہے اور حواس میں سے کوئی حاسہ اس میں باقی نہیں رہتا اور روح کی موت یہ ہے کہ بدن کے ذریعے سے جو لذتیں اسے حاصل تھیں وہ بدن سے جدائی پر منقطع ہو گئیں۔ نیز انبیاء کرام اور شہداء کرام کو ایک خاص قسم کی روحانی زندگی حاصل ہے جس کا ذکر بَلْ اَحْيَاءٌ، سورۃ بقرۃ و سورۃ آل عمران میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔ لفظ ذوق سے معلوم ہوتا ہے کہ موت ہمیشہ کیلئے نہیں ہے بلکہ موت کے بعد پھر زندگی ہے اور یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ موت کی مدت کم ہے اور حرارت و رطوبت والا فلسفہ غلط ہے بلکہ موت لفظ کُنْ کے ساتھ حکم الٰہی سے ہے۔ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اس سے پہلے بعث بعد الموت مراد ہے یعنی تُبْعَثُوْنَ بَعْدَ الْمَوْتِ وَتُوَفَّوْنَ الخ۔ موت کے بعد اُٹھائے جاؤ گے پھر تمہیں پورا پورا اجر ملے گا۔ سوال: تَوْفِيَه میں اشارہ ہے پوری جزاء دینے پر جبکہ قیامت سے پہلے قبر اور دنیا میں بھی ان کو کچھ اجور دیئے گئے ہیں تو کیا وہ اس میں شمار نہیں؟ جواب (1): امام قرطبی کا قول ہے کہ اصلی اجر مومن کا جنت اور کافر کا جہنم ہے اس لئے اس سے قبل کی جزاء اجر اس میں شامل نہیں ہے۔ جواب (2): تُوَفّٰی تکمیل کرنے کے معنی میں ہے

یعنی پہلے ان کو کچھ اجر دیا ہے اور قیامت میں ناقص کی تکمیل ہوگی۔ سوال: قیامت میں کافروں اور گناہگاروں کیلئے بھی مختلف عذاب ہیں اس کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ جواب (1): یہاں مقصد نبی کریم ﷺ اور ان کے پیروکاروں کو خطاب تھا کہ ان کیلئے مغفرت اور اجر وثواب ہے۔ جواب (2): امام قرطبی اور ابوحیان نے فرمایا ہے کہ اجر سے مراد جزاء ہے اور جزاء اطاعت پر بھی ملتی ہے اور معصیت پر بھی ملتی ہے لہٰذا اس میں عذاب بھی شامل ہے۔ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ اجر دینے سے لوگوں کی دو قسمیں بنتی ہیں تو (فا) کے ذریعے سے اس کی تفصیل کی جارہی ہے کہ ان میں پہلی قسم کامل اہل ایمان کی ہے ان کا ذکر اس جملے میں ہے۔ زُحْزِحَ: دور رکھنے اور بچا لینے کے معنی میں ہے یعنی جسے ابتداء سے ہی جہنم میں داخل ہونے سے بچایا جائے اور بغیر عذاب دینے سے جنت میں داخل کیا جائے اس شخص کو فائز کہا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ جو لوگ کچھ عرصے کیلئے جہنم میں داخل کئے جائیں پھر سزا پوری ہونے کے بعد جنت میں داخل ہوں یا اعراف مقام پر انہیں ٹھہرایا جائے اور پھر جنت میں داخل کیا جائے تو وہ لوگ جنتی تو ہیں مگر فائزین نہیں ہیں۔ کامل مرتبہ ذکر کرنے میں اشارہ ہے کہ صحابہ کرام نے اعلیٰ مراتب حاصل کئے ہیں۔ زُحْزِحَ اور اُدْخِلَ مجہول ذکر کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ مرتبہ ان کے اختیار میں نہیں ہے بلکہ یہ سعادت صرف اللہ تعالیٰ کے فضل سے ملتی ہے دوسری قسم یعنی جو لوگ کامل مؤمن نہیں ہیں ان کی سزا صراحتاً ذکر نہیں کی گئی البتہ ان کی سزا کے سبب کی طرف اس جملے میں اشارہ کیا گیا ہے۔ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ۔ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ سے مراد زندگی گزارنے کا سازوسامان ہے یا وہ عمر مراد ہے جو خالص حصول دنیا میں خرچ ہو جائے اور آخرت کی طرف اس میں توجہ نہیں ہو۔ مَتَاعٌ۔ اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ چیز جس پر معمولی فائدہ حاصل ہوتا ہے اور پھر ختم ہو جاتا ہے عکرمہ کے بقول کلہاڑی، پیالہ، مٹی کا پتیلہ وغیرہ۔ حسن بصری کا قول ہے کہ سبز پودے، بچیوں کی گڑیاں، بچیوں کے کھیل کے زیورات، جس سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو جیسے سراب ہے۔ امام زمخشری کے بقول مَتَاعٌ وہ سامان ہے کہ خریدنے والے نے دھوکے سے خریدا اور بعد میں نقصان کا پتا چلا کہ یہ تو فاسد بیکار سامان ہے۔ الْغُرُوْرِ یہ مصدر ہے دھوکا ہونے کے معنی میں ہے اور یہ جمع بھی ہوسکتا ہے جس کا واحد (غَار) دھوکا دینے والا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ دنیا نے بہت سارے لوگوں کو دھوکا دیا ہے اور ان کو آخرت سے غافل یا منکر بنادیا ہے تو یہ لوگ کامل مؤمنین کی ضد ہے اور ان کیلئے ان کے مناسب سزا ہے۔

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۟ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى

كَثِيرًا ۚ وَ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَ تَتَّقُوۡا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ۝ "بلاشبہ تم اپنے مالوں اور جانوں میں آزمائے جاؤ گے اور ضرور تم سنو گے ان لوگوں سے جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور ان لوگوں سے جنہوں نے شرک کیا ہے ایذاء تکالیف کی بہت سی باتیں اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے" [186]۔

تفسیر 186: (ربط 1) احد کی مصیبتوں پر تسلی دینے کے بعد اب ایمان والوں کو مزید تسلی دی جاتی ہے یعنی دشمنان اسلام کی طرف سے آئندہ بھی تم پر مصائب آئیں گے مگر تم نے صبر کرنا ہے۔ (ربط 2) اس سے قبل مشرکین اور اہل کتاب کی برائیوں کو ذکر کیا تو اب ان کی طرف سے آئندہ مزید اور امتحانات کا ذکر ہو رہا ہے لَتُبۡلَوُنَّ فِيۡۤ اَمۡوَالِكُمۡ وَ اَنۡفُسِكُمۡ: اِبۡتِلَاء اصل میں بلاء سے لیا گیا ہے یعنی کسی کی حقیقت کو معلوم کرنا اور یہ کبھی تو مصیبتوں سے اور کبھی انعامات سے معلوم ہوتی ہے اس لئے بلاء کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے البتہ اکثر ابتلاء مصائب آنے سے ہوتی ہے یہاں مالوں میں عام امتحان مراد ہے چاہے تکالیف شرعیہ کے ذریعے سے ہو جیسے زکوۃ انفاق فی سبیل اللہ یا تکالیف کونیہ یعنی قحط وغیرہ کے ذریعے سے ہو یا دیگر حوادث کے ذریعے سے ہو جیسے مالوں کی ہلاکتیں اور نفسوں میں بھی امتحان عام ہے چاہے تکالیف شرعیہ کے ذریعے سے ہو جیسے شہادت یا جہاد میں زخمی ہونا اور نماز پڑھنا یا تکالیف کونیہ کے ذریعے سے ہو جیسے امراض وغیرہ جیسا کہ سورۃ بقرہ میں گزر گیا ہے۔ وَ لَتَسۡمَعُنَّ مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ بدنی مالی امتحان کے بعد اس میں روحانی امتحان کا ذکر ہے اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ اس سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں اس میں ان کی تذلیل مقصود ہے کہ اہل علم ہوتے ہوئے ایسے گناہوں میں مبتلا ہیں۔ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ اس میں مزید تاکید ہے کہ قدیم علماء ہیں یا اس کو اس لیے ذکر کیا کہ اہل کتاب کا اطلاق قرآن والوں پر بھی ہوتا ہے اس لیے قید احترازی لگائی ہے۔ وَ لَتَسۡمَعُنَّ اس میں اشارہ ہے کہ یہ تکلیف دینے والی باتیں علانیہ کرتے ہیں تاکہ تم سن سکو۔ وَ مِنَ الَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡۤا مشرکین عرب و عجم کے عوام مراد ہیں اَذًى كَثِيۡرًا ۔ اَذًى کا اطلاق عام طور پر زبانی بد اخلاقی پر ہوتا ہے یہ لفظ انکے شرکیہ اقوال اور نبی اور ایمان والوں پر طعن و تشنیع کرنا اور شعر و شاعری میں دین دار لوگوں کی برائیاں بیان کرنا اور ان پر بہتان باندھنا تاکہ ان سے دلوں کو ٹھیس پہنچائیں وغیرہ کو شامل ہے وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَ تَتَّقُوۡا یعنی ان تکلیفوں پر صبر کرتے ہوئے اگر دین پر ثابت قدم رہو۔ وَ تَتَّقُوۡا یعنی واعی، مجاہد، مومن کیلئے جو کام مناسب نہیں ہے ان سے اجتناب کرنا تقویٰ ہے فَاِنَّ ذٰلِكَ مجموعہ صبر و تقویٰ کی طرف اشارہ ہے مفرد اس لیے ذکر کیا کہ دونوں اعمال کو جمع کرنے میں فائدہ ہے: مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ عزم مصدر ہے اور مفعول کے معنی میں ہے اور

عزم کے معنی پختہ عزم اور قصد کرنا ہے یہ صفت کی اضافت موصوف کو ہوئی ہے یعنی الْاُمُوْرِ الْمَعْزُوْمَةِ عَلَيْهَا وہ کام جن کا ہر عاقل شخص پختہ قصد کرے یا وہ کام جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر لازم کیا ہے امام ابوحیان کا قول ہے کہ اچھے اور پختہ کام مراد ہیں صاحب اللباب نے فرمایا ہے کہ خیر اور حق کے کام مراد ہیں بعض مفسرین کا قول ہے کہ یہ آیت جہاد سے منسوخ ہے مگر یہ قول درست نہیں ہے صحیح قول یہ ہے کہ اچھے اخلاق درگزر مدارات وغیرہ دعوت کیلئے ہے جو کہ منسوخ نہیں ہے۔

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ٘ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَ اشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ۝۱۸۷ "جب اللہ تعالیٰ نے وعدہ لیا ان لوگوں سے جو دیئے گئے تھے کتاب کہ اسے تم بلاشبہ ضرور لوگوں کیلئے بیان کرو گے اور تم اُسے چھپاؤ گے نہیں پھر بھی انہوں نے اُسے اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا اور اس کے بدلے تھوڑا مول خرید لیا لہٰذا بہت برا ہے جو وہ خریدتے ہیں" [187]۔

تفسیر 187 :اس آیت میں ان کی تیسری قباحت کا ذکر ہے جو کہ حق چھپانا اور عہد توڑ دینا ہے اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو تنبیہ کی ہے اور سابقہ آیت سے ربط یہ ہے کہ اس میں تکالیف دینے کا ذکر تھا تو اس آیت میں اس کیلئے ایک مثال ذکر ہو رہی ہے کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی ان کی کتاب میں موجود تھی مگر انہوں نے اس حقیقت کو چھپایا تھا اس لیئے بطور عطف ذکر کیا ہے۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۔لفظ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ان کی تذلیل میں زیادت کیلئے ہے کہ ان کے پاس کتاب موجود ہے پھر بھی حق چھپاتے رہے اور یہ میثاق ان کی اس کتاب میں موجود ہے جو ان کو دی گئی ہے۔ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ (ہٗ) ضمیر کتاب کی طرف راجع ہے۔ تِبْيَان سے مراد اس میں جو عقائد و احکام اور آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات ہیں ان کو لوگوں کے سامنے بیان کرنا ہے وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ یہ لَتُبَيِّنُنَّهٗ پر عطف ہے اور اس میں نون تاکید اس لیئے نہیں ہے کہ یہ منفی ہے یا سابقہ نون تاکید پر اکتفا کیا گیا ہے۔ بعض مفسرین کے مطابق یہ جملے کے مقام پر واقع ہے۔ سوال: بیان کرنے سے تو خود بخود لازمی (کتمان) چھپانے کی نفی ہوتی ہے تو پھر اس کے بیان کا کیا فائدہ؟ جواب: تِبْيَان سے ان آیتوں کی تشریح مراد ہے جو اس کتاب میں ہے اور چھپانے سے مراد باطل تاویلات اور شبہات ہیں جو بیان کے منافی ہیں۔ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ (ہٗ) ضمیر کتاب یا میثاق کی طرف راجع ہے۔ پیٹھوں کے پیچھے پھینکنے سے مراد اس سے بے رغبتی اور اس کا اعتبار ہی نہ کرنا ہے جیسا کہ کوئی چیز نظروں سے اوجھل پیٹھ کے پیچھے ہوتی ہے۔ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا نبذ ایک قسم کی برائی ہے اور وَاشْتَرَوْا اس سے بڑھ کر برائی ہے اس میں دنیا کو

آخرت پر ترجیح دینا مراد ہے ثَمَنًا قَلِیْلًا دنیا کے تمام مال مرتبے وعہدے کو کہا گیا ہے۔فَبِئْسَ مَا یَشْتَرُوْنَ یہ سبب عذاب ہے اس لیئے بہت برا ہے۔ فائدہ: امام آلوسیؒ نے اشارات میں لکھا ہے کہ اُوْتُوا الْکِتٰبَ میں مطلق علماء کی طرف اشارہ ہے جبکہ فتح البیان میں لکھا ہے کہ مراد وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالٰی نے کتاب کا علم دیا ہو خواہ کوئی بھی آسمانی کتاب ہو اس اُمت کے علماء بھی اہل کتاب ہیں۔تفسیر کبیر میں ہے کہ آیت کے ظاہر سے پتا چلتا ہے کہ یہ خاص یہود و نصارٰی سے خطاب ہے مگر بعید نہیں ہے کہ دیگر مسلمانوں کو بھی شامل ہو کیونکہ وہ اہل قرآن ہیں اور قرآن تمام کتابوں میں معزز ہے۔امام قرطبی نے فرمایا کہ یہ بات ان کیلئے اور دیگر مسلمانوں کیلئے عام ہے۔حسن اور قتادہ کا قول ہے کہ ہر اس شخص کیلئے ہے کہ اسے اللہ تعالٰی نے کتاب کا علم دیا ہو اُسے بیان کرنا چاہئے کہ وہ کتمانِ علم میں شامل نہ ہو جائے کیونکہ یہ ہلاکت کا سبب ہے۔محمد بن کعب نے فرمایا کہ کسی عالم کے لیئے حلال نہیں ہے کہ اس علم پر خاموش رہے اور جاہل کو اپنی جہالت پر خاموش نہیں رہنا چاہئے اس لیئے کہ علماء کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی اور جاہلوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ فَاسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر قرآنی آیت نہ ہوتی جس میں اہل کتاب سے عہد لیا گیا ہے تو میں کوئی حدیث بیان نہیں کرتا پھر انہوں نے اس آیت کی تلاوت کی صحیح بخاری کتاب العلم حدیث 118 صحیح مسلم کتاب فضائل الصحابۃ حدیث 2492 اور ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ کعب الاحبار نے فرمایا! اے ایمان والو یہ آیت تمہارے لیئے نہیں ہے تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان کو غصہ کیا۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّیُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّھُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۸۸﴾ "جو لوگ اپنے کرتوتوں (کتمانِ حق) پر خوش ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی ایسے کاموں پر تعریف کی جائے جو انہوں نے نہیں کیئے ان کے متعلق یہ گمان نہ کیجئے کہ وہ عذاب سے نجات پا جائیں گے اور ان کیلئے تو دردناک عذاب ہے" [188]۔

تفسیر 188: اس آیت میں اہل کتاب کیلئے ڈانٹ تنبیہ اور یہ تکلیف دینے کی ایک اور مثال ہے۔مفسر ابن جریر نے حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ان کی کتابوں میں نبی اکرم ﷺ کی صفات ذکر کی گئی تھی تو وہ اس کو چھپاتے تھے اور اس پر خوشی بھی مناتے اور تمنا بھی کرتے کہ ہماری تعریف کی جائے کہ دین ابراہیمی کو ہم ماننے والے ہیں۔ اس قول سے سابقہ آیت سے جوڑ پیدا ہوتا ہے اور لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا اس الَّذِیْنَ میں ان لوگوں کا

ذکر ہے جن سے وعدہ لیا گیا تھا اور سابقہ آیت میں ان کا ذکر تھا یعنی اسم ظاہر کو ضمیر کی جگہ رکھا ہے اور اس کی تائید صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4568 وصحیح مسلم صفات المنافقین حدیث 2778 کی حدیث سے ہوتی ہے کہ مروان نے ابو رافع سے کہا کہ جا کر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہو کہ اگر کوئی شخص اس چیز پر خوشی کا اظہار کرتا ہے جو اسے دیا گیا ہے (اَتَوا کی قراءت کے مطابق) اور چاہتا ہو کہ اس کی تعریف کی جائے ایسی چیز کے متعلق جو اس نے نہیں کی ہے تو پھر تو ھُمْ میں سے ہر شخص عذاب کا مستحق ہے کیونکہ یہ عادت تو ہر شخص کی ہے تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تمہارا اس آیت سے کیا واسطہ ہے یہ تو اہل کتاب کے متعلق نازل ہوئی ہے وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ دونوں آیتوں کو تلاوت کر کے فرمایا کہ یہاں پر اَتَوا سے نبی اکرم ﷺ کی صفات کو چھپانا مراد ہے اس سے ثابت ہوا کہ اس آیت کی ماقبل آیت سے مناسبت ہے۔ بِمَآ اَتَوا اس سے مراد دیگر گناہوں کے ساتھ حق چھپانا مراد ہے یعنی یہاں پر اتیان (آنا) فعل کے معنی میں ہے یَفْرَحُوْنَ سے مراد تکبر اور فخر ہے۔ وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا انہوں نے حق کا ساتھ نہیں دیا نہ انہوں نے اطاعت رسول کی اور نہ ہی دین وملت ابراہیمی کا پاس رکھا پھر بھی اپنی تعریف چاہتے ہیں۔ بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ اس میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جنہوں نے نیکی کا عمل کیا اور ان کا مقصد اس سے ریاکاری اور تکبر ہو اور چاہتے ہوں کہ لوگ تقویٰ وطہارت کے ذریعے سے ہماری تعریف واچھائی بیان کریں اس زمانے میں ایسے لوگ بہت زیادہ ہیں فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ امام زجاج نے فرمایا ہے کہ جب کلام طویل ہو جائے اور سابقہ کلام ناقص ہو تو اس فعل کو تاکید کیلئے واپس لایا جاتا ہے یہاں پر فَلَا تَحْسَبَنَّ پہلے لَا تَحْسَبَنَّ کیلئے (اعادہ) ہے اور مَفَازَةٍ دوسرا مفعول ہے اس کیلئے مَفَازَةٍ مصدر میمی یا اسم مکان ہے۔ بچنا یا بچنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ (با) ملابست کیلئے یعنی مُتَلَبِّسِيْنَ بِمَفَازَةٍ۔ امام فراء نے کہا ہے کہ مَفَازَةٍ کا معنی عذاب سے (بعید) دوری کا ہے۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ یہ ماقبل جملے کیلئے تاکید ہے۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ١٨٩ ع

"اور اللہ ہی کیلئے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے" [189]۔

(خلاصہ) اس آیت سے آخر تک تیسرا باب ہے اس میں سورۃ کے چار مضامین کا اعادہ کیا گیا ہے۔ توحید کو آیت 189 رسالت کو آیت 193 جہاد کو آیت 195 اور انفاق فی سبیل اللہ کی طرف آیت 196 میں اشارہ ہے اور صالحین کی دس

صفتوں کا ذکر کیا گیا ہے: أُولُوا الْأَلْبَاب زبان سے ذکر، جوارح سے عبادت، دل سے فکر، چار دعاؤں کا درد اور آیت 195 میں پانچ صفتوں کا ذکر اور اہل کتاب کے صالحین کا ذکر ہے اور آخری آیت تمام سورت کے ساتھ متعلق ہے۔

تفسیر 189: اس آیت میں اس بات کیلئے علت ہے کہ فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ یعنی وہ ذات جس کیلئے تمام چیزوں کی بادشاہت خاص ہے اور مخلوق اس کی رعیت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے تو اس قسم کی ذات کے عذاب سے یہ لوگ کس طرح بچ سکیں گے (اللباب)۔ نیز اس آیت میں اللہ تعالیٰ کیلئے توحید فی التصرف اور قدرت کو کلی طور پر ثابت کیا گیا ہے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ﴿١٩٠﴾ "یقیناً آسمانوں و زمین کی پیدائش میں اور دن اور رات کے بدل بدل کر آنے جانے میں بلاشبہ عقلمندوں کیلئے نشانیاں ہیں" [190]۔

تفسیر 190: سابقہ آیت میں توحید کا دعویٰ مذکور تھا تو اس آیت میں اثبات توحید کیلئے دلیل عقلی ذکر ہوئی: إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ان کی خبر کی تفسیر سورۃ بقرہ کی آیت 164 اور أُولِي الْأَلْبَابِ کی تفسیر اس سورۃ میں گزری ہے۔ سوال: یہاں چار چیزوں کا ذکر ہے اور سورۃ بقرہ آیت 164 میں دس چیزوں کا ذکر ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ جواب: وہاں لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ کا ذکر تھا جو عام لوگ تھے ان کے سمجھانے کیلئے تفصیل کی ضرورت تھی اور یہاں لِأُولِي الْأَلْبَابِ کا ذکر ہے یہ خاص لوگ ہیں لہٰذا ان کیلئے اختصار کافی ہے۔

فائدہ: امام ابوحیان، سیوطی اور ابن کثیر رحمہم اللہ نے ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ ایک دن نبی کریم ﷺ رات کو عبادت کرتے ہوئے رو رہے تھے اور فرمایا کہ میں کیوں نہیں روؤں گا جبکہ اللہ تعالیٰ نے آج رات یہ آیتیں نازل کی ہیں۔ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ الخ پھر فرمایا ان لوگوں کیلئے ہلاکت ہے جو ان آیتوں کو تلاوت کرتے ہیں اور ان میں غور نہیں کرتے ہیں ایک اور روایت میں ہے کہ اس شخص کیلئے ہلاکت ہے جو دونوں ہونٹوں و جبڑوں کو ان آیتوں کی تلاوت پر حرکت دیتا ہے مگر بغیر غور فکر کے۔ صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4569 و صحیح مسلم کتاب صلوۃ المسافرین حدیث 763 میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ رات کو نیند سے بیدار ہوئے اور آسمان کی طرف نظر اٹھا کر ان آیتوں کی تلاوت فرمائی پھر گیارہ رکعت نماز پڑھی اس روایت میں سورۃ آل عمران کی آخری دس آیتوں کی تلاوت کا ذکر ہے۔ اور ایک روایت میں سورۃ آل عمران کے اختتام تک تلاوت کا ذکر ہے اس آیت سے آخر تک گیارہ آیتیں ہیں ان میں تطبیق کا طریقہ یہ ہے کہ جس روایت میں دس آیتوں کا ذکر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ إِنَّ فِي

خَلْقِ السَّمٰوٰتِ آیت کے بعد دس آیتوں کی تلاوت فرمائی۔

الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ ''وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کو کھڑے بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر یاد کرتے ہیں اور زمین و آسمانوں کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) اے ہمارے رب تو نے یہ سب بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے تو پاک ہے لہٰذا تو ہمیں آگ کے عذاب سے بچا'' [191]۔

تفسیر 191: اس میں تین صفات کی واضح صراحت ہے (1) زبان سے ذکر (2) غور و فکر کرنا (3) دعاء مانگنا (4) اور چوتھی صفت یعنی جوارح کی عبادت کی تین حالتیں ذکر کی ہیں: الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ یہ اولی الالباب کی صفت ہے اس میں دو اقوال ہیں (1) پہلا قول ابن مسعود، علی اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کا ہے امام نخعی، قتادہ سے بھی منقول ہے کہ مراد اس سے نماز کو کھڑے ہو کر پڑھنا ہے اگر قیام کی طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر ادا کریں اگر بیٹھنے کی طاقت نہ ہو تو پہلوؤں کے بل نماز ادا کریں اس طرح حدیث عمران بن حصین میں ہے جو صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 1117 میں ہے۔ اس کی تائید سورۃ نساء کی آیت 103 سے ہوتی ہے دوسرا قول اکثر مفسرین کا ہے کہ اس سے مراد ذکر الٰہی کا ہر حال میں دوام ہے اور انسان ان تین حالتوں میں ہی ہوتا ہے اور مراد زبان سے ذکر ہے جبکہ دل بھی یاد الٰہی میں حاضر ہو۔ امام آلوسی نے اس پر اہل علم کا اجماع نقل کیا ہے کہ زبان سے ذاکر اور دل سے غافل ہونے والے کیلئے اجر و ثواب نہیں ہے۔ اس میں ذکر، حمد، تسبیح، تہلیل و تکبیر داخل ہے۔ ابن جریج سے منقول ہے کہ قراءت قرآن بھی ذکر ہے۔ پہلے قول کی بناء پر جب نماز مراد لی جائے تو پہلے قیام ذکر کیا جو نماز کیلئے اصلی حالت ہے پھر اس کی طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر نماز کی ادائیگی ہوگی اس سے بھی قاصر ہو تو پہلو پر بھی نماز ادا کرے گا مگر ادائیگی ہر حال میں ہے۔ اس میں اعلیٰ مرتبے سے ادنیٰ کی طرف (انتقال) نزول کیا گیا ہے اور جب دوسرا قول مراد لیا جائے تو قیام کا ذکر آسان ہے پھر اکثر انسان بیٹھ کر کسی کام میں مشغول ہوتا ہے اس لیئے بہ نسبت قیام اس حال سے مشکل ہے جبکہ پہلو تو اکثر آرام کیلئے مستعمل ہے اور خصوصاً رات کا اکثر حصہ اس میں صرف ہوتا ہے تو اس حالت میں ذکر کرنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے یا قیام کا وقت کم ہوتا ہے پھر بیٹھنے کا زمانہ قیام سے زیادہ ہوتا ہے اور پھر پہلو کے بل لیٹنے کا زمانہ بیٹھنے سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ سوال: سورۃ یونس آیت 12 اس ترتیب کے برعکس ہے یعنی دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖۤ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا اس کا کیا سبب ہے؟ جواب: وہاں ناشکر مشرک کا انتہائی مجبوری

کے عالم میں اللہ تعالیٰ کو پکارنے کا ذکر ہے مجبوری پہلو سے شروع ہوتی ہے پھر بیٹھنے کی مجبوری اس سے کم ہوتی ہے اور قیام کی مجبوری اس سے کم ہوتی ہے وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یہ یَذْکُرُوْنَ پر عطف ہے یہ قلبی عبادت ہے اس کو ذکر سے بعد میں لایا گیا ہے اشارہ ہے کہ عقل اور ہدایت ذکر کے نور سے حاصل ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ عام سائنس دان عقل سے فکر کرتے ہوئے دنیا میں بہت کچھ حاصل کرتے ہیں مگر ذکر سے غفلت کی وجہ سے ہدایت کے نور سے محروم ہوتے ہیں۔ امام قرطبی نے فرمایا کہ فَکَّرُوْا دل کا کسی معاملے میں تدبر کا نام ہے۔ خَلْق سے مصدری معنیٰ مراد ہے اور مصدر مفعول کی طرف مضاف ہے یعنی مخلوقات کی جینات اور صفات میں فکر کرتے ہیں یا مخلوق کے معنیٰ میں ہے اور اضافت (فی) کے معنیٰ میں ہے یا پھر اضافت بیانیہ ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مخلوقات کے عجائبات میں فکر کرتے ہیں اور ان کی حکمتوں، باریکیوں اور رازوں میں غور کرتے ہیں اور اس سے پیدا کرنے والے کی ذات اور وحدانیت پر دلیل لیتے ہیں کہ وہ قدرت علم اور تمام صفات میں یکتا و کامل ہے اللہ تعالیٰ کی صفات سے متعلق غور و فکر کا حکم مختلف مقامات میں دیا گیا ہے سورۃ انبیاء آیت 30 تا آیت 33 سورۃ ق آیت 6 تا 11 آیت سورۃ ملک 3، 4، 5، 11 سورۃ نباء آیت 6 تا 16 سورۃ نازعات آیت 27 تا 33 سورۃ غاشیہ آیت 18، 19 اور 20۔ اس طرح آیتیں بہت زیادہ ہیں جن میں مختلف مقامات پر غور و فکر و تدبر کا ذکر ہے۔ (1) پہلے آسمانوں اور زمین میں فکر جیسا کہ اس آیت میں ہے۔ (2) اپنے نفسوں میں غور جیسا کہ سورۃ روم آیت 8 میں ہے۔ (3) قرآنی آیات میں میں فکر جیسا کہ بقرہ آیت 219 سورۃ نحل آیت 21 میں ہے۔ (4) نبی اخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فکر، سورۃ اعراف آیت 184۔ (5) قرآن کی مثالوں میں فکر جیسا کہ سورۃ حشر آیت 21 میں ہے۔ (6) عقلی دلائل میں فکر جیسا کہ سورۃ رعد آیت 3۔ (7) شہد کی مکھی میں فکر سورۃ نحل آیت 69۔ سوال: اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ میں چار چیزوں کا ذکر ہے آسمان، زمین، دن اور رات جبکہ یہاں تو صرف دو چیزوں کا ذکر ہے؟ جواب: رات اور دن کے حالات آسمانوں اور زمین کے حالات کے تابع ہیں اور اس میں یہ بھی مقصد ہے کہ بعض چیزوں میں غور و فکر کرنے سے بھی انسان ہدایت تک رسائی حاصل کرسکتا ہے۔ فائدہ: 1 فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ الخ میں اشارہ ہے کہ ذات الٰہی میں تفکر منع ہے اس لیئے امام قاسمی نے ابو حاتم سے اور امام آلوسی نے عمرو بن مرۃ سے اور ابن عمر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایات نقل کی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور مخلوق میں تو فکر کرو مگر ذات الٰہی میں نہیں۔ امام قاسمی نے فرمایا کہ اس کے متعدد شواہد ہیں جبکہ ذات الٰہی میں فکر کرنے سے وسوسے پیدا ہوتے ہیں جن سے

شریعت میں (تعوذ) پناہ مانگنے کا حکم ہے۔ فائدہ: 2 امام قرطبی اور امام ابن کثیر نے عبادت میں فکر اور اس کی اہمیت سے متعلق سلف سے متعدد اقوال نقل کئے ہیں اگر چہ ان میں صحیح متصل حدیث نہیں ہے لیکن نصوص قرآنی میں اکثر تفکر سے متعلق امر یا ترغیب دی گئی ہے لہٰذا اس بارے میں سلف کے اقوال پر بھی اکتفا کیا جا سکتا ہے ان میں سے بعض اقوال یہ ہیں (1) حسن بصری نے متعدد صحابہ کرام سے نقل کیا ہے کہ ایمان کی روشنی تفکر ہے۔ (2) عمر بن عبدالعزیز سے روایت ہے کہ ذکر الٰہی کے متعلق گفتگو بہتر کام ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں فکر بہتر عبادت ہے۔ (3) حسن بصری کا قول ہے کہ ایک لمحہ فکر ساری رات کی عبادت سے افضل ہے۔ (4) امام قرطبی نے بلا سند یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک لمحہ فکر کرنا سال بھر عبادت سے بہتر ہے۔ (5) امام قرطبیؒ نے ابن عربی سے نقل کیا ہے کہ صوفیہ کا مذہب یہ ہے کہ نماز سے فکر افضل ہے جبکہ فقہاء کا قول ہے کہ نماز فکر سے افضل ہے (6) ابن عطیہ کا قول ہے کہ درمیانہ راستہ بہتر ہے یعنی نماز اور فکر دونوں کرنے چاہئیں جیسا کہ نبی کریم ﷺ کے متعلق گزر گیا ہے کہ رات کو اٹھنے کے بعد پہلے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور پھر تہجد کی نماز پڑھی۔ قرآن وسنت کا فہم ومعنی حاصل کرنا افضل عمل ہے۔ انہوں نے صوفیوں کا رد کیا ہے کہ فکر کو کبھی نماز پر مقدم کرتے ہیں تو کبھی بغیر وضو نماز ادا کرتے ہیں جبکہ یہ تو (الحاد) بے دینی کا عمل ہے۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا یہ جملہ حالیہ ہے اور يَقُولُونَ مقدر ہے یا یہ جملہ مستانفہ ہے جس میں ذکر کا نتیجہ مذکور ہے اور وہ بالترتیب چار نتائج ہیں جن کو آلوسی نے اس طرح ذکر کیا ہے یعنی جب انہوں نے مخلوق میں فکر کی تو اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ مخلوقات کا خالق ضرور موجود ہے تو انہوں نے کہا رَبَّنَا اور جب اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ ان مخلوقات میں بہت ساری حکمتیں ہیں تو کہنے لگے۔ مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔ هٰذَا میں مخلوق کی طرف اشارہ ہے باطل عبث بے فائدہ کو کہا جاتا ہے یا وہ جس میں فائدہ مقصود نہ ہو۔ جب مخلوق کا سب سے بڑا فائدہ وحکمت توحید باری تعالیٰ ہے کہ وہ ہر اعتبار سے پاک ہے تو اس لیئے متصل فرمایا سُبْحٰنَكَ جب معلوم ہوا کہ عالم باطل نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ باطل بنانے سے پاک ہے تو اللہ تعالیٰ سے اس عقیدے میں لوگ صحیح اور غلط عقیدے کے اعتبار سے مختلف ہیں لہٰذا دونوں فرقوں کے بدلے اور جزاء میں فرق ہے تو سوال کیا جاتا ہے کہ صحیح عقیدے کے ذریعے سے ہمیں آگ سے نجات دیدے اس لیئے (فا) ذکر کی گئی۔ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ اس میں اس عقیدہ کے طلب کرنے کی دعاء ہے جس کے ذریعے سے جہنم سے نجات حاصل ہوتی ہے۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿١٩٢﴾ اے ہمارے رب! تو جس کو آگ میں

داخل کرے یقیناً تو نے اسے رسوا کیا اور ظالموں کیلئے (کوئی) مددگار نہیں ہوگا'' [192]۔

تفسیر 192: توحید کی توفیق طلب کرنے کے بعد یہ شرک سے بچنے کیلئے دوسری دعاء ہے اور یہ قِنَا عَذَابَ النَّارِ کیلئے علت ہے، اس لیئے عطف کے ساتھ ذکر نہیں کیا ہے۔ رَبَّنَا إِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ۔ اخزاء سے مراد ہلاکت ہے یا سخت رسوائی اور سخت ذلیل کرنا ہے۔ اس معنی میں اخزاء کافروں کے ساتھ مختص ہے یہ سعید، ثوری اور قتادہ رحمہم اللہ سے منقول ہے معلوم ہوا ہے کہ داخل ہونے سے آگ میں ہمیشہ جانا مراد ہے۔ اس دعاء میں مسبب کا ذکر ہے جبکہ مراد سبب ہے یعنی ہمیں شرک سے محفوظ رکھنا تاکہ سخت شرمندگی اور رسوائی سے بچ سکیں۔ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ مدد کی نفی میں شفاعت اور ولایت ودوستی سے محرومی داخل ہے نیز یہ دلیل ہے کہ اس سے مراد کافر و مشرک ہے۔

رَبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا ۚ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ ﴿١٩٣﴾ "اے ہمارے رب! ہم نے سنا ایک منادی کو وہ پکارتا ہے ایمان کی طرف یہ کہ تم اپنے رب پر ایمان لاؤ اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے لہٰذا تو ہمارے گناہ معاف کر اور ہماری برائیاں ہم سے دور کر اور نیک لوگوں کے ساتھ ہمیں موت دے'' [193]۔

تفسیر 193: یہ تیسری دعاء ہے عقیدہ توحید اختیار کرنے اور شرک سے بچنے کے بعد اب قرآن کریم اور رسول پر ایمان لانے کا ذکر کرتے ہیں جو گناہوں کی مغفرت کیلئے وسیلہ ہے سابقہ دونوں دعائیں تفکر یعنی عقلی دلائل میں غور وفکر کرنے پر مبنی تھیں اور یہ دونوں دعائیں (سمعی) سننے والے دلائل میں تامل کرنے پر مبنی ہیں اور رَبَّنَا کو بار بار ذکر کرنے سے ان کی انکساری عاجزی ثابت ہوتی ہے۔ رَبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا سمع کبھی اس چیز کی طرف متعدی ہوتا ہے جو سنی گئی ہو تو پھر ایک مفعول چاہتا ہے اور جب ایسی ذات کی طرف متعدی ہو جس کی سماع نہیں ہوتی ہے تو بعد والا ایسا جملہ جو سننے پر دلالت کرتا ہے یا تو حال ہوگا یا مفعول ثانی ہوگا اس مقام پر وہ يُنَادِي لِلْإِيمَانِ ہے اور مُنَادِي سے مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہے یہ ابن مسعود وابن عباس رضی اللہ عنہم سے منقول ہے جبکہ بقول محمد بن کعب اور قتادہ رحمہم اللہ اس سے مراد قرآن مجید ہے۔ مُنَادِيًا اس تنوین (ن) میں عظمت شان کی دلیل ہے اور منادی میں دعوت کی زیادہ تاکید ہے کیونکہ یہ لفظ عام ہے جس میں قریب اور دور سب شامل ہیں۔ مُنَادِيًا کے بعد يُنَادِي بھی دعوت پر زیادہ تاکید کیلئے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ تفصیل کے بعد اختصار ہے یا تخصیص کے بعد تعمیم ہے۔ لِلْإِيمَانِ نداء کے بعد کبھی لام استعمال ہوتا ہے جو خصوصیت پر دلیل ہوتی

ہے اور کبھی الٰی استعمال ہوتا ہے جو انتہا کے لئے آتا ہے چونکہ یہاں خصوصیت مراد تھی اس لیئے لام مذکور ہے۔ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا۔ اَنْ برائے تفسیر ہے جو یُّنَادِیْ کے بیان کیلئے ہے یا پھر (با) مقدر ہے اور یُّنَادِیْ سے متعلق ہے: فَاٰمَنَّا سَمِعْنَا پر عطف ہے یعنی دعوت سنتے ہی ہم نے دعوت قبول کی۔ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا (فا) ایمان پر تفریع ہے اور یہ ربوبیت پر دلالت کرتا ہے یعنی یہ ایمان اس دعاء کیلئے وسیلہ ہے۔ ذُنُوْب سے بڑے گناہ مراد ہیں ذُنُوْب ذنب سے لیا گیا ہے دُم کو کہا جاتا ہے تو مراد یہ ہے کہ یہ کبائر بڑے گناہوں کو کہتے ہیں یعنی وہ گناہ جن کے پیچھے سزا ایسے منسلک ہوتی ہے جیسے کسی چیز کے پیچھے اس کی دُم ہوتی ہے۔ وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا۔ سَيِّاٰت سے چھوٹے گناہ مراد ہیں یہ سوء نفس سے لیا گیا ہے یعنی وہ گناہ جو برا مانا جاتا ہو۔ غُفْرَان اور تکفیر میں پہلا فرق یہ ہے کہ غُفْرَان اکثر اللہ تعالیٰ کے عمل یعنی فعل میں استعمال ہوتا ہے اور تَكْفِيْر بندے کے فعل میں جیسا کہ قسم اور ظہار وغیرہ کا کفارۃ معلوم ہوا کہ دوسرا لفظ پہلے لفظ سے افضل ہے لہٰذا پہلا لفظ بڑے گناہوں کیلئے اور دوسرا لفظ چھوٹے گناہوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ تَكْفِيْر میں چھپانے کا معنیٰ پایا جاتا ہے تو بڑے گناہوں کیلئے پردہ پوشی اور چھپانا مناسبت رکھتا ہے اور چھوٹے گناہوں کیلئے زائل ہونے کا معنیٰ مناسبت رکھتا ہے۔ وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ یا بَرّ یا بَارّ کی جمع ہے وہ لوگ جن کی نیکیاں زیادہ تعداد میں ہوں نیز اس میں موت کا سوال نہیں ہے کیونکہ حدیث میں اس سے منع آیا ہے۔ صحیح بخاری کتاب المرضیٰ حدیث 5673 اس میں اصل مقصد نیک لوگوں کی معیت ہے اور معیت کے دو معنیٰ ہیں (1) ان کی طرح انجام ہو تو برزخ میں ارواح ساتھ ہوں گی اور جنت میں اکٹھے ہوں گے (2) معنیٰ یہ ہے کہ (معیت) اتباع کے معنیٰ میں ہے جیسا کہ اُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ سورۃ نساء آیت 69۔

رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ؁ "اے ہمارے رب! تو ہمیں وہ دے جس کا تو نے رسولوں کی زبانی وعدہ کیا ہے اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کرنا یقیناً تو اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا ہے۔" [194]۔

تفسیر 194: اس میں چوتھی دعاء کا ذکر ہے کہ حصول ایمان اور گناہوں کی مغفرت کے بعد توفیق حسنات دیکر ہمیں جنت کا مستحق بنا۔ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا گناہوں کی مغفرت اور نیکیوں کی توفیق کا آپس میں تعلق ہے اس لیئے واؤ کو عطف کیلئے ذکر کیا ہے۔ سوال: اللہ تعالیٰ تو اپنے وعدے کی مخالفت کبھی نہیں کرتا تو پھر اس کو کیوں مانگنا پڑا؟ جواب (1): دعاء

میں مقصد کے حصول کے علاوہ عاجزی وانکساری بطور بندگی پیش کرنا مقصود ہے۔ جواب (2): یہاں اصل میں ان اسباب کے طلب کرنے کی دعا ہے جن کے ذریعے سے بندہ اس وعدے کا حقدار ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے ان اعمال کی توفیق طلب کرتے ہیں جن کے ذریعے سے اس وعدے تک رسائی آسان ہو جائے۔ عَلٰی رُسُلِكَ یہاں مضاف مقدر ہے یعنی عَلٰی اَلْسِنَةِ رُسُلِكَ یا متعلق مقدر ہے یعنی مُنَزَّلًا عَلٰی رُسُلِكَ جب اس آیت میں اس وعدے کا سوال ذکر ہے تو سورۃ فرقان آیت 16 میں اس کو وَعْدًا مَسْئُوْلًا کہا گیا ہے اس میں دلیل ہے کہ اجر وثواب بندوں کے اعمال کے بدلے میں نہیں ہے جو کہ معتزلہ کا عقیدہ ہے بلکہ وعدے کی بناء پر اجر وثواب ملے گا یہ اہل سنت کے نزدیک حق تفضلی کہلاتا ہے۔ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ جنت کا وعدہ دو قسم کا ہے۔ (1) ابتداء سے جنت میں داخل کرنا اور جہنم کی رسوائی شرمندگی سے بچالینا۔ (2) جہنم میں سزا پالینے کے بعد جنت میں داخل ہونا یہاں ابتداء سے داخل ہونے کیلئے یہ جملہ ذکر فرمایا۔ پچھلی آیت 192 میں کامل شرمندگی مراد ہے جو کہ مستقل طور پر جہنم میں داخل ہونا ہے جبکہ یہاں صرف جہنم میں داخل ہونا مراد ہے لہٰذا اس میں تکرار نہیں ہے۔ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ یہ صفت سلبیہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ سے دعاء کیلئے بطریقہ وسیلہ ذکر کیا ہے جبکہ اس سورۃ کے آیت 9 میں اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ تسلی کے طور پر ذکر تھا اس لیئے یہاں پہ بصیغہ مخاطب اور وہاں بصیغہ غائب ذکر کیا ہے۔ فائدہ: اس میں طلب دعا میں مبالغہ پیدا کرنے کیلئے لفظ صفت رَبَّنَا پانچ مرتبہ ذکر ہے معلوم ہوا کہ دعاء میں الحاح (مبالغہ) سبب قبولیت ہے حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے کہ انہوں نے کثرت سے ربّنا ربنا پڑھ لیا تو اللہ تعالیٰ نے دعا قبول کی۔ سیدنا جعفر کا قول ہے کہ جس پر مصیبت و پریشانی واقع ہو جائے اور وہ پانچ مرتبہ رَبَّنَا کے ساتھ عاجزی کرتے ہوئے دعا طلب کرے تو قبول ہو جائے گی اور وہ تکلیف اللہ تعالیٰ ختم کر دے گا امام ابوحیان نے اس طرح البحر المحیط میں لکھا ہے۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾ " ان کے رب نے ان کی دعا قبول کی یہ کہ میں ضائع نہیں کروں گا عمل کرنے والے کا عمل تم میں سے مرد ہو یا عورت تمہارے بعض بعض سے ہیں لہٰذا وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور وہ اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے اور میرے راستے میں تکلیفیں دیئے گئے اور وہ لڑے اور

قتل کئے گئے تو ضرور میں ان کی برائیاں دور کروں گا اور یقیناً میں ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں چلتی ہیں (یہ) بطور ثواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بدلہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے پاس اچھا بدلہ ہے" [195]۔

تفسیر 195: اس آیت میں دعا کی قبولیت پر خوشخبری اور مزید پانچ صفات کو آخرت کی خوشخبری کیلئے بیان کیا جاتا ہے فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ سابقہ صفات دعائیں مستقبل کے صیغہ سے ذکر ہوئی تھیں اس میں لِأُولِي الْأَلْبَابِ کی مستقبل اچھی عادات کی طرف اشارہ ہے جبکہ قبولیتِ دعا صیغہ ماضی کے ساتھ ذکر کرنا یقین کیلئے ہے یہ (اِسْتَجَابَ) بھی مستقبل کے معنی میں ہے۔ اِسْتِجَابَتْ اصل میں اجابت کو کہا جاتا ہے یعنی مراد حاصل ہونا۔ جیسا کہ اس کا ذکر گزر گیا ہے جب اس کے ساتھ دعا مانگنے والا ذکر ہو جائے تو لام کے ساتھ متعدی ہوتا ہے جب صرف دعا ذکر ہو تو خود متعدی ہوتا ہے۔ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنْكُمْ اس میں (با) ضمیر مقدر ہے اور کلام میں غائب سے متکلم کی طرف اور مخاطب کی طرف التفات کیا گیا ہے یہ دعا مانگنے والوں کی تعظیم کیلئے کیا ہے۔ کوفیوں کے نزدیک استجاب میں قول کا معنی ہے تو مراد یہ ہوگا کہ قَائِلًا یا مَقُولًا لَهُمْ أَنِّي عَمَلَ عَامِلٌ عمل سے وعائیں مراد ہیں جیسا کہ گزر گیا یا دیگر نیک اعمال یعنی قبولیت دعا میں نیک اعمال کا بھی عمل دخل ہے۔ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى عمل کرنے والے کا بیان ہو رہا ہے اور بشارت کو عام کرنا مقصود ہے جو عورتوں مردوں سب کو شامل ہے۔ بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ یہ جملہ مستانفہ ہے جس میں مذکورہ قبولیت دعا میں مردوں اور عورتوں کے اشتراک کا ذکر ہے مِنْ بَعْضٍ یعنی ایک جنس یا نسل یا دین سے ہے یا طاعت کی وجہ سے تم آپس میں اجر و ثواب میں برابر ہو یا گناہ کی وجہ سے (عِتَابٌ) سزا میں برابر ہو۔ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا یہ ان بعض اعمال کا ذکر ہے جو ضائع نہیں ہوتے ہیں۔ پہلے ہجرت کو ذکر کیا کیونکہ یہ مشکل عمل ہے انسان کے نفس اور بدن پر سخت گراں ہوتا ہے یعنی وہ وطن جس میں انسان کی نشو و نما ہوتی ہے اس کو خالص اللہ تعالیٰ کے دین کیلئے چھوڑنا ہوتا ہے۔ وَأُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ یہ عطف تفسیر ہے جس میں ہجرت کے سبب کا ذکر ہے یعنی مجبور ہو کر ہجرت کی ہے۔ یا هَاجَرُوا سے شرک چھوڑنا اور مشرکین سے قطع تعلقی مراد ہے اور اخراج سے ہجرت عرفی مراد ہے۔ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي۔ إِيذَا عام ہے علاقہ بستی سے نکل جانا اور دیگر مظالم وغیرہ کو شامل ہے اور اللہ تعالیٰ کے راستے سے مراد عبادت اور اللہ تعالیٰ کا دین ہے اور اخراج (علاقے سے نکالے جانے) کے اسباب میں سے ہیں یعنی اگرچہ ظاہر میں اخراج نہ کیا ہو لیکن تکالیف دینا اس کا سبب ہے اور ہجرت کے بعد بھی مختلف طریقوں سے تکلیف دیتے ہیں جیسا کہ وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا ہے۔ ان دونوں میں دشمنوں کی طرف سے تکلیف ہے اور ان

دونوں کا ثواب بھی الگ الگ ہے اور یہ تمام جملے فَالَّذِیْنَ کیلئے صلہ ہیں مگر یہ لازم نہیں ہے کہ یہ تمام صفات ایک شخص میں جمع ہوں بلکہ مختلف افراد میں یہ کل صفات جمع ہوں تو لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ کا حکم تب بھی ان پر صادق ہے یہاں صغیرہ گناہ مراد ہیں جو نیکیوں سے ختم ہو جاتے ہیں کبائر ہوں یا نہ ہوں۔ یہ اہل سنت کا مذہب ہے یا پھر سَیِّئَاتٌ سے مراد بری صفات ہیں جو کفر یا معصیت کے ایام میں کی ہیں۔ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ. ثَوَابًا مفعول مطلق ہے کیونکہ اُدْخِلَنَّهُمْ کا معنی لَاُتِیَنَّهُمْ ہے یا جنت کیلئے حال یا تمیز ہے ثَوَابًا کی نکارت اور اس کی صفت مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ برائے تعظیم ہے۔ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ. عِنْدَهٗ کا لفظ بہت قریب اور خاص ہونے پر دلالت کرتا ہے جبکہ عِنْدَهٗ کا متعلق (مخفی) مقدر ہے جو کہ اِسْتَقَرَّ ہے اور حُسْنُ الثَّوَابِ اس کا فاعل ہے ثواب اکثر خیر کے بدلے میں استعمال ہوتا ہے اور لفظ حسن زیادہ اچھائی کیلئے ذکر کیا ہے۔

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ﴿١٩٦﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۫ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٩٧﴾

"آپ کو دھوکے میں نہ ڈالے ان لوگوں کا شہروں میں چلنا پھرنا جنہوں نے کفر کیا ہے"[196]۔ "یہ تھوڑا سا فائدہ ہے پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے"[197]۔

تفسیر 196، 197 سابقہ آیت سے پیدا ہونے والے وہم کا جواب ہے وہم یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مذکورہ دعاؤں اور صفات کی وجہ سے ایمان والوں کے ساتھ وعدہ کیا کہ تمہیں دنیا و آخرت میں پورا بدلہ دیں گے تو معلوم ہوا کہ کافر تو محروم ہونگے جبکہ ایسا تو نہیں ہے بلکہ کافر تو دنیا میں خوب کماتے کھاتے اور تجارتوں کیلئے مختلف شہروں میں سفر کرتے پھرتے ہیں؟ تو جواب دیا گیا کہ لَا يَغُرَّنَّكَ غرور کا معنی پسندیدہ چیز کی امید دلانا ہے یا کسی ضرر والی چیز کو فائدے کی صورت میں ذکر کرنا ہے غرور سے ممانعت اغترار سے ممانعت کو مستلزم ہے یعنی دھوکا ہونے سے بچ جاؤ خطاب نبی کو ہے اور مراد امت ہے۔ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ. تَقَلُّبُ یعنی کثرت کے ساتھ تجارتوں کیلئے گھومنا پھرنا اور چونکہ منافع کے ساتھ تکلیفیں مشکلات بھی ہوتی ہیں اسلئے باب تَفَعُّل ذکر کیا تاکہ تکلیف پر بھی دلالت کرے: اَلْبِلَاد مختلف شہر بستیاں اور ممالک مراد ہیں۔ متاع یہ لَا يَغُرَّنَّكَ کیلئے علت ہے یہ مخفی مبتدا کیلئے خبر ہے یعنی هٰذَا التَّقَلُّبُ مَتَاعٌ۔ متاع سے قلت کی مراد ہے۔ قلیل یہ متاع میں قلت کیلئے تاکید ہے۔ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ یہ لَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ کے مقابل ہے جو کہ مومنوں کیلئے جزا ہے مِهَاد وہ چیز جو انہوں نے اپنے لئے تیار کی ہے یا اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے تیار کی

ہے اسے مِھَادُ کہتے ہیں اور مِھَادُ بطور مزاق استہزاء کہا گیا ورنہ یہ تو آرام کی جگہ کو کہا جاتا ہے جبکہ یہ تو عذاب کی جگہ ہے۔

لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ

خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ۝ ''لیکن وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈر گئے ان کیلئے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ بطور مہمان نوازی اللہ کے پاس ان میں ہمیشہ رہیں گے اور وہ جو اللہ کے پاس نیک لوگوں کیلئے ہے وہ بہترین ہیں '' [198]۔

تفسیر 198: اس آیت میں متقین کے لئے خوشخبری اور ایک سوال کا جواب بھی ہے یعنی شہروں بستیوں میں تو صالحین بھی تجارت کی غرض سے سفر کرتے رہتے ہیں؟ یا دوسرے لفظوں میں سوال یہ ہے کہ پرہیزگاروں کے لئے تو مال دولت بھی نہیں ہے لہٰذا ان کا اکثر گزران غربت اور فقیری میں رہتا ہے پہلی صورت میں جواب یہ ہے کہ باوجود بستیوں میں تجارت کی غرض سے چلنے پھرنے کے آخرت کے اجر وثواب کے بھی وہ مستحق ہونگے۔ دوسری صورت میں جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ پرہیزگاروں کے لیئے دنیا میں کافروں کی طرح عیش وعشرت نہیں ہے بلکہ ان کے لیئے آخرت میں ہے جو ہمیشہ ہے اور دنیا کے مزے تو عارضی ہیں جبکہ آخرت کی خوشیاں مستقل ہیں لہٰذا مستقل اور ہمیشہ رہنے والی نعمتیں بہت بہتر ہیں۔ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ تقویٰ سے مراد شرک، کفر اور کافروں کی طرح بے لگام گھومنے پھرنے سے اجتناب ہے لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَهُمْ اس میں لام برائے تخصیص ہے نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ نُزُلٌ اس طعام کو کہا جاتا ہے جب مہمان کی آمد کے وقت تیار کیا جاتا ہے جہنم کی متعلق نُزُلٌ بطور استہزاء استعمال ہوا ہے جیسے سورۃ واقعہ آیت 93 یا پھر جنات سے حال بن کر آیا ہے اور نُزُلٌ نَازِلِيْنَ کی جمع ہے اس میں اشارہ ہے کہ جنتیوں کا ہر وقت مہمان نوازی کا اہتمام ہوگا جیسے کہ ہر نئے مہمان کی آمد پر ہوتا ہے اور یہ اکرام کی انتہا ہے جبکہ دنیا میں مہمان کے لیئے تین دن مہمان نوازی کی مدت ہے مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اس میں انتہائی اکرام اور عزت کی طرف اشارہ ہے وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ خَيْرٌ کافروں کی متاع کے مقابل فرمایا ہے لفظ (مَا) میں ابہام ہے مراد یہ ہے کہ دنیا والوں کو جنت کی نعمتوں کی تفصیلات معلوم نہیں ہوسکتیں۔ لِلْاَبْرَارِ۔ اس میں اشارہ ہے کہ برّ اور تقویٰ ہم معنیٰ الفاظ ہیں اس لیئے کہ سورۃ بقرہ آیت 177 میں لفظ برّ کی تشریح وتوضیح تقویٰ کی ساتھ کی گئی ہے۔

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ

بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾ "بلاشبہ اہل کتاب میں بعض
وہ لوگ بھی ہیں جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور تمھاری طرف جو اتارا گیا ہے اور جو ان کی طرف اتارا گیا ہے اس پر بھی، اللہ
سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے آیتوں کو تھوڑی قیمت پر بیچتے بھی نہیں ہیں ان کا بدلہ ان کے رب کے پاس ہے یقیناً اللہ
جلد حساب لینے والا ہے" [199]۔

تفسیر 199: اس آیت میں متقیوں کیلئے بشارت ہے نیز یہ ایک سوال کا جواب ہے سابقہ آیت میں اہل کتاب کے ماسوا پرہیزگاروں کیلئے خوشخبری تھی اب اہل کتاب کیلئے پانچ صفات کے ساتھ خوشخبری کا ذکر ہے، وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ: صحیح قول یہ ہے کہ یہ آیت عام ہے جس میں عبداللہ بن سلام، نجران کے نصاریٰ اور حبشہ والے نصاریٰ سب مراد ہیں جن میں یہ صفات موجود تھیں، پہلی صفت لَمَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ: اس سے صحابہ کرام کے ایمان جیسا ایمان مراد ہے جسمیں شرکی عقیدہ، تشبیہ اور تثلیث نہ ہو۔ دوسری صفت وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ، یعنی قرآن کریم ہے۔ تیسری صفت وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِمْ۔ تورات، انجیل وغیرہ ان کو بعد میں اس لئے ذکر کیا ہے کہ ان پر ایمان قرآن کے تابع ہے کیونکہ نزول قرآن کے بعد قرآن مجید پر ایمان مقدم ہے ان کا اہل کتاب کے نام سے ذکر اس لئے ہوا ہے کہ سابقہ کتابوں پر ایمان لائے تھے، چوتھی صفت خٰشِعِیْنَ۔ اس میں اشارہ ہے کہ خوف الٰہی کی وجہ سے وہ تحریف اور کتمان نہیں کرتے یعنی دین میں تبدیلی بھی نہیں کرتے اور اس طرح حق بھی نہیں چھپاتے تھے، پانچویں صفت لَا یَشْتَرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِیْلًا۔ دنیا کے مراتب جاہ وجلال رشوت کی وجہ سے دین حق نہیں چھوڑتے اور یہ صفت اہل علم کیلئے خاص ہے اور ان کے ایمان پر بقا وکمال کیلئے ہے: اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ۔ اشارہ ہے کہ ان کا اجر اور کافروں اور اہل کتاب کی طرح برباد نہیں ہے لَهُمْ میں ان کے خاص اجر کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا اجر دگنا ہے جیسا کہ سورۃ حدید آیت 28 سورۃ قصص آیت 54 میں ہے: اِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ، یہ سابقہ جملہ کیلئے علت ہے یعنی اللہ تعالیٰ مکمل علم رکھتا ہے اجر کی مقدار اور لوگوں کے مرتبوں کا یا پھر سابقہ جملہ کی تکمیل کیلئے ہے یعنی سریع، جلدی اجر دینا مقصود ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۫ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾ ع

"اے لوگوں جو ایمان لائے ہو صبر کرو اور صبر پر ڈٹے رہو اور کمر بستہ رہو اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم فلاح پاؤ" [200]۔

تفسیر 200: سورۃ کے اختتام پر چار چیزوں کا حکم دیا جارہا ہے جو کامیابی اور دین کی نشرو اشاعت کے اسباب ہیں اور اس

سورۃ کے تمام مضامین کا خلاصہ ہے: یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا۔ یہ صبر کی تینوں قسموں کو شامل ہے (1) مصیبتوں پر صبر (۲) طاعات پر صبر (3) گناہوں سے اجتناب پر صبر، اس میں توحید پر مضبوط رہنا فرائض واجبات پر عمل پیرا ہونا نیز تمام منھیات یعنی شرک کفر بدعت فسق وفجور نفاق سے پرہیز کرنا داخل ہے۔ صَابِرُوْا۔ یہ تخصیص بعد التعمیم ہے یعنی دشمنوں پر صبر کیونکہ باب مفاعلہ مبالغہ کیلئے آتا ہے ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہنا جیسا کہ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ سورۃ بلد 17 اور سورۃ عصر 3 میں ہے وَرَابِطُوْا اسلامی ملک کی سرحد پر تیار رہنا اور دشمن کے مقابل گھوڑوں کو تیار رکھنا اسلامی فوج کی چوکیداری کرنا اور دشمن کے مقابلے کیلئے اسلحہ کی تیاری ان تمام امور کو عام ہے اور حدیث میں ایک فرض نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا بھی اس مرابطہ میں شمار کیا گیا ہے صحیح مسلم کتاب الطہارۃ حدیث 251 نسائی کتاب الطہارۃ 143 احمد 2، 277۔ وَاتَّقُوا اللّٰہَ یعنی اوامر کو بجالاؤ اور نواہی یعنی جن چیزوں سے روکا گیا ہے ان سے اجتناب کرو۔ پوری سورۃ کے ساتھ اس کا تعلق اس طرح ہے کہ اہل زیغ کے شبہات کے مقابل صبر کرنا اور جو اہل زیغ واہل بغی ہیں ان کی دوستی سے اجتناب کرنا اور ان کے شبہات کے جوابات دینا یہ سورۃ کا پہلا حصہ ہے اور مُصابرہ ان اہل کتاب کے مقابلے میں ہے جو اپنی قباحتوں اور خباثتوں پر قائم ہیں اور یہ دوسرا حصہ ہے اور اصول اتحاد میں مرابطہ کرنا تیسرا حصہ ہے اور تقویٰ اختیار کرنا ان صفات کے حصول کے لئے جو شکست سے بچنے کیلئے سبب ہے، نیز منافقین واہل کتاب کی صفات سے بچنا یہ سورت کا چوتھا حصہ ہے اور یہ کل مجموعہ فلاح کیلئے سبب ہے۔ اس سورۃ کی خصوصیات یہ ہیں: (1) توحید پر نصاریٰ کے بعض شبہات کے جوابات (2) آخری نبی کی رسالت پر شبہات کے جوابات (3) عیسیٰ علیہ السلام کے عبد (بندہ) ہونے پر متعدد دلائل (4) اہل کتاب کے متعدد قبائح یعنی برائیاں (5) دعوت وتنظیم کیلئے اصول (6) احد کی جنگ میں اسباب شکست (7) جنگ احد کے متعلق منافقین کیلئے بہت زواجر (8) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم الشان صفات۔ (9) شہدا کیلئے خصوصی بشارتیں (10) نصاریٰ کو دعوت مباہلہ (11) اولوالالباب کی اچھی صفات اور ان کی دعائیں (12) عمران علیہ السلام کے حالات کا ذکر، ان کی بیوی کے حالات کا ذکر نیز ان کی بیٹی یعنی مریم اور عیسیٰ علیہما السلام کی پرورش کرنے والا زکریا علیہ السلام ہے۔

آیاتھا ۱۷۶ ۔ ۴ سورۃ النساء مدنیۃ ۹۲ ۔ رکوعاتھا ۲۴

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خاص اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑا مہربان اور رحیم ہے

اس سورۃ کو سورۃ النساء الکبریٰ بھی کہا گیا ہے جیسا کہ تفسیر بصائر ذوی التمیز میں مذکور ہے۔ گذشتہ سورت کے ساتھ ربط کی وجوہات یہ ہے:

(1) سورۃ بقرہ میں یہودیوں کے قبائح کا رد کیا گیا تھا اسی طرح سورۃ آل عمران میں نصاریٰ کی خباثتوں اور شبہات کا رد کیا گیا تو اس سورۃ میں اہل جاہلیت کے مظالم کا رد اور مومنین کی اصلاح کا ذکر کیا گیا۔

(2) سابقہ سورتوں میں آخرت کے متعلق احکام کا ذکر تھا تو اس سورۃ میں دنیا کے متعلق مسائل کا ذکر ہے۔

(3) سورۃ آل عمران میں "التھذیب العفوس" نفسوں کے اصلاح سے متعلقہ امور کا ذکر تھا اور اس سورت میں "تدبیر منزل" اور "سیاست مدنیہ" کے امور ذکر ہو رہے ہیں۔

(4) سورۃ آل عمران میں ان لوگوں پر رد تھا جنہوں نے اللہ کے نیک بندوں سیدنا عیسیٰ اور مریم علیھا السلام کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک بنایا تھا اور اس سورت میں عمومی انداز سے شرک کا رد کیا گیا۔ نیز نصاریٰ کے اس عقیدہ کا رد ہو رہا ہے کہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو (ابن اللہ) اللہ کا بیٹا قرار دیا تھا۔

(5) گذشتہ سورت کے آخر میں تقویٰ اختیار کرنے کا حکم تھا اور اس سورت کے شروع میں تقویٰ کے دو اقسام یعنی تقویٰ فی حقوق اللہ اور تقویٰ فی حقوق العباد کا ذکر ہے (یعنی گذشتہ سورت کا آخر موجودہ سورت کی شروع سے مشابہت رکھتا ہے)۔ نیز اس سورت کی شروع میں تقویٰ کی دو قسمیں ذکر ہے یعنی حقوق اللہ اور حقوق العباد میں تقویٰ اس کو تشابہ الاطراف بھی کہتے ہیں۔

سورۃ کا دعویٰ یعنی عنوان: اس میں ان امور کا ذکر ہے جن سے انسداد ظلم یعنی ظلم کی روک تھام ہو جیسا کہ یتیموں، ناسمجھوں اور خواتین پر مظالم دور جاہلیت سے جاری تھے اس کیلئے دو طریقے اختیار کئے گئے (1) وہ امور جن سے معاشرے میں مظالم سے روک تھام ہو سکے۔ (2) پورے ملک میں سیاسی شرعی نظام یعنی کتاب وسنت کو جاری کرنا اور ساتھ میں عسکری نظام تشکیل

دینا۔ حقوق اللہ میں سب سے بڑا ظلم شرک ہے اس کی قباحت کو آیت 48و116 میں ذکر کیا ہے نیز شرک کی دیگر اقسام یعنی شرک فی العلم، فی العبادت، فی التصرف، فی الدعاء، فی التحلیل وفی التحریم کا اور عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ولدیت کا عقیدہ ان تمام کا رد ہے۔ اس وجہ سے مسئلہ توحید کو چھ مرتبہ مندرجہ ذیل آیاتوں میں ذکر کیا ہے آیت 1، 36، 87، 126، 131، 132 سورۃ کا دعویٰ آیت 1 میں ہے اور کل 26 اسماء الحسنیٰ اس سورۃ میں مذکور ہیں۔ سورۃ کا اجمالی خلاصہ: اجمالی خلاصہ یہ ہے کہ اس سورۃ کے تین حصے ہیں پہلا حصہ آیت نمبر 1 سے آیت 57 تک ہے، اس حصے میں یتیموں، عورتوں اور ناسمجھ لوگوں پر ظلم وستم ختم کرنے کیلئے اٹھارہ امور ذکر ہوئے ہیں اور آخر میں توحید کا حکم اور انسانوں کے حقوق ذکر ہیں پھر منافقین کی برائیاں اور یہود کی خباثتوں کا ذکر ہے۔ دوسرا حصہ آیت 135 تک ہے اس میں شہری مسائل سے متعلق 9 احکام مذکور ہیں اور درمیان میں وقفہ وقفہ سے منافقین کی برائیاں بیان ہوئی ہیں اور نبی کریم علیہ السلام واصحاب رسول ﷺ کے مخالفین کا رد ہے اور اقسام شرک کا رد ہے۔ تیسرا حصہ آخر تک ہے اس حصے میں منافقین و یہودیوں کے قبائح وخبائث کا ذکر ہیں اور یہود کے غلو کا رد ہے اور قرآن وسنت رسول کی اطاعت کی طرف ترغیب ہے۔ تفصیلی خلاصہ: پہلے حصے میں تین باب ہیں پہلا باب آیت 36 تک ہے، اس باب میں تدبیر منزل کے اٹھارہ امور کا بیان ہے۔ اور حقوق اللہ میں سے اللہ تعالیٰ کی توحید کا بیان اور شرک کا رد ہے اور اسی طرح حقوق العباد کا بیان ہے۔ اس سورۃ کی فضیلت: سیدنا ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سورۃ نساء میں پانچ آیتیں ایسی ہیں کہ ان کے بدلے مجھے دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے دیدیا جائے تو مجھے وہ خوشی نہیں ہوگی جو ان آیتوں سے ہے آیت 31، 40، 48، 58 اور 64 یہ مستدرک حاکم حدیث 3194 کی روایت ہے ابن جریر نے ابن عباس رضی اللہ عنھما سے روایت نقل کی ہے کہ اس سورۃ میں آٹھ آیتیں ایسی ہیں کہ اس امت کیلئے ہر اس چیز سے بہتر ہیں جس پر سورج طلوع وغروب ہوتا ہے اس میں مذکورہ پانچ آیتوں کے علاوہ مزید تین آیتیں شامل ہیں۔ اور مزید تین آیتیں یہ ہیں۔ 26، 27، 28 اور مصنف عبدالرزاق کے حوالے سے حاکم کی روایت پر آیت 110 کا اضافہ ہے۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں یہ ساری آیتیں مجھے پوری دنیا سے زیادہ محبوب ہیں۔ مذکورہ آیتوں میں اس امت پر اللہ تعالیٰ کے خصوصی انعامات کا ذکر ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ① "اے لوگو اپنے رب سے ڈرتے رہو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا پھر اسی سے اس کا جوڑا بنایا پھر ان دونوں سے (دنیا میں) بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں اور اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور قریبی رشتوں میں اللہ سے ڈرو بلا شبہ اللہ تم پر نظر رکھے ہوئے ہے" [1]۔

تفسیر 1: يَا أَيُّهَا النَّاسُ: اَلنَّاسُ میں الف لام استغراقی ہے لہٰذا یہ خطاب تمام لوگوں کیلئے ہے اور اس کے ساتھ ایک عمومی علت بیان فرمائی کہ سارے انسان آدم وحوا علیہما السلام کی اولاد ہیں۔ لیکن آدم کی بقیہ تفصیل سورۃ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ اس آیت میں سورت کا دعویٰ مذکور ہے اسی طرح سورت میں آنے والے تمام مضامین اور احکام پر عمل کرنے کی ترغیب بھی ہے۔ نکتہ: یہ سورت قرآن کی مصحفی ترتیب کے اعتبار سے چوتھی سورت ہے۔ اس کی ابتدا يَا أَيُّهَا النَّاسُ سے کی گئی ہے اور اسی طرح نصف قرآن کے بعد سورۃ حج بھی چوتھی سورۃ ہے جس کی ابتداء اسی خطاب سے ہوئی ہے دونوں میں تقویٰ کا ذکر ہے البتہ اس سورۃ میں انسانوں کی مُبْتَدَأ (ابتداء) ذکر ہے اور سورۃ حج میں انسان کے معاد یعنی آخرت کا ذکر ہے اس میں اشارہ ہے کہ انسانیت دنیاوی اور اخروی امور میں تقویٰ اختیار کرنے پر مکلّف ہے۔ اتَّقُوا رَبَّكُمُ یہاں سورت میں مذکور انسانی حقوق میں تقویٰ کی طرف اشارہ ہے۔ لفظ رَبَّكُمُ اللہ تعالیٰ کے احسان ربوبیت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ سورت میں آنے والے تمام احکامات انسان کی تربیت میں مددگار ہیں۔ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ اس پورے کلام سے صانع اور انسان کی ابتدائی خلقت کی طرف اشارہ ہے تاکہ نسبی احترام کی وجہ ایک دوسرے کے ساتھ تعلق استوار کرنے میں پیش پیش رہے کہ اس میں صانع اور انسان کی ابتداء پر تنبیہ ہے یعنی پیدا کرنے والے اور پیدا کیے گئے پر اور اس میں تیزی دینا مقصود ہے کہ ایک دوسرے سے نسبی ربط و تعلق قائم رکھو۔ امام ابن کثیر نے فرمایا ہے کہ ایک باپ اور ماں کا ذکر اس لیئے فرمایا کہ آپس میں شفقت و مہربانی کرنے کی طرف متوجہ ہو جائیں اور کمزور افراد کی مدد کر سکیں۔ یعنی اس میں سورۃ کے مقصد کی طرف اشارہ ہے۔ ابو حیانؒ نے فرمایا ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ ایک دوسرے پر تکبر اور فخر مت کرو۔ نَّفْسٍ سے مراد آدم علیہ السلام ہے اور چونکہ نفس مذکر و مؤنث دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے وَاحِدَةٍ صفت مؤنث لائے ہیں۔ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا اکثر مفسرین رحمہم اللہ کا قول ہے کہ

مِنْهَا کی ضمیر نفس کی طرف راجع ہے اس قول کی تائید ایک صحیح حدیث سے ہوئی ہے کہ آدم علیہ السلام کی زوجہ اس کی بائیں پسلی سے پیدا کی گئی تھی۔ (صحیح البخاری کتاب الانبیاء حدیث 3331 صحیح مسلم کتاب الرضاع حدیث 59) ابو مسلم اور موجودہ زمانے کے بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ مِنْهَا سے مراد اس کی جنس ہے یعنی مِنْ جِنْسِهَا اور ان کا قول ہے کہ حوا آدم علیہ السلام کے بدن سے پیدا نہیں ہوئی لیکن امام آلوسیؒ نے اس قول کا تفصیلی رد لکھا ہے اور امام ابن کثیرؒ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ خواتین ایک مرد (آدم) سے پیدا ہوئی ہیں۔ اس وجہ سے ان کا حرص و میلان مردوں کی طرف بہت ہوتا ہے جبکہ مرد مٹی زمین سے پیدا ہوا ہے اس لیئے اس کا میلان زمین کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ ہر ایک اپنے اصل کی طرف مائل ہوتا ہے یعنی اَلْجِنْسُ يَمِيْلُ اِلَى الْجِنْسِ ۔وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً یہ جملہ ماقبل خَلَقَكُمْ کے لیے بیان اور تفسیر ہے خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ کا بیان ہے تا کہ وہ وہم ختم ہو جائے کہ شاید مردوں کا مبدأ یعنی ابتداء الگ ہے اور عورتوں کا الگ ہے۔ اسی طرح اس میں مناکحت کی طرف اشارہ ہے کہ انسانوں کی پیدائش میں مناکحت اور زوجیت کا دخل ہے جبکہ رِجَالًا وَّنِسَآءً سے تمام مرد اور عورتیں مراد ہیں خواہ بالغ ہوں یا غیر بالغ ہوں چونکہ یہ مقام خطاب کے اعتبار سے تقویٰ کا ہے اس لیئے یہ بالغوں کے ساتھ مناسب ہے۔ اس لیئے بجائے ذُكُوْرًا وَّ اُنَاثًا کے رِجَالًا وَّنِسَآءً ذکر فرمایا اور نساء پر رجال کو فضیلت کی وجہ سے مقدم کیا ہے نیز نِسَآءً میں بھی کثرت کی صفت ہونا مراد ہے لیکن خواتین کے لئے پوشیدگی مناسب ہونے کی وجہ سے اس کو حذف کیا ہے اور (خُنْثٰی) مخنث کا ذکر اس لیئے نہیں کیا ہے کہ وہ یا تو مردوں کے حکم میں یا عورتوں کے حکم میں داخل ہوگا۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ یہاں تقویٰ سے مراد حقوق اللہ میں تقویٰ ہے یعنی شرک اور ظلم سے اپنے آپ کو بچانا (توحید اللہ تعالیٰ کا حق ہے)۔ تَسَآءَلُوْنَ یہ باب تفاعل سے اور ایک (ت) اس میں حذف ہے اس میں دو قول ہیں۔ (1) پہلا قول یہ ہے کہ یہ مشارکت کے معنی میں ہے یعنی ایک دوسرے سے اس کے نام پر سوال کرتے ہو۔ (2) دوسرا قول یہ ہے کہ یہ مجرد کے معنی میں ہے یعنی تم اس کے نام پر سوال کرتے ہو۔ یا (با) اضافی ہے یعنی تَسْئَلُوْنَهٗ یعنی اس سے سوال کرتے ہو اور یہ تقویٰ کیلئے علت ہے جب تم اللہ تعالیٰ کے نام کو وسیلہ بنا کر لوگوں سے مانگتے ہوں یا خود اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہو تو پھر لازمی طور سے تمہیں اللہ تعالیٰ کی توحید اور احکام کو بجالا کر تعظیم کرنی چاہئے۔ وَالْاَرْحَامَ اس میں تین اقوال ہیں (1) پہلا قول یہ ہے کہ لفظ اللہ پر عطف ہے اور مضاف مقدر ہے یعنی قَطْعَ الْاَرْحَامِ ۔ یہ عام پر خاص کو عطف کیا ہے یعنی تقویٰ اختیار کرو اور اللہ تعالیٰ کے حکموں

کی مخالفت سے بچ جاؤ بالخصوص رشتہ داروں سے صلہ رحمی کے متعلق اللہ سے ڈرو۔ یہ قول مجاہد، ضحاک اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہ کا ہے۔ (2) دوسرا قول یہ ہے کہ یہ منصوب ہے جو ابھارنے براانگیختہ کرنے کے لیے۔ یعنی الْاَرْحَامَ اِحْفَظُوْهَا رشتہ داری کی حفاظت و رعایت کرو یہ واحدی کا قول ہے۔ (3) تیسرا قول یہ ہے کہ یہ پہلی ضمیر کے محل پر عطف ہے اور اس کا محل نصب کا ہے۔ یہ عرب کی عادت کے مطابق ذکر ہے کہ وہ ایک دوسرے کو رشتہ داری کا واسطہ دیکر سوال کرتے تھے یعنی جب رشتہ داری کو وسیلہ بناتے ہو تو لازم ہے کہ کمزور رشتہ داروں کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی مدد کرو اور ان پر ظلم سے اجتناب کرو۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت سے اس قول کی تائید ہوتی ہے جس میں (وَبِالْاَرْحَامِ) آیا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا یہ تقویٰ کے سابقہ حکم کیلئے علت ہے۔ رَقِيْبًا رَقَابَةٌ سے لیا گیا ہے یعنی کسی کام کی تحقیق کیلئے نظر تیز کرنا۔ رقیب مراقب یعنی چوکیدار کے معنیٰ میں بھی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں حفیظ کے معنیٰ میں ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ اس حدیث پر عمل کرنے کی طرف اشارہ ہے جس میں ہے کہ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ ۔ (صحیح بخاری کتاب الایمان حدیث 50 (صحیح مسلم کتاب الایمان حدیث 8)۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی بندگی اس انداز سے کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو اگر ایسا انداز نہ ہو تو کم از کم ایسے انداز میں کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت میں كَانَ (دوام) ہمیشگی کیلئے آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت میں رقیب سورۃ مائدۃ آیت 117 اور سورۃ احزاب آیت 52، میں اور رسول کی صفت میں سورۃ ھود آیت 93، میں اور مَلَكٌ کی صفت میں ایک مرتبہ سورۃ قٓ آیت 18 میں جبکہ دس مرتبہ مجرد اور مزید فیہ کے ابواب سے مختلف صیغوں کے ساتھ لغوی معنیٰ میں مذکور ہے۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۠ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝

"اور تم یتیموں کو ان کے مال دو اور تم ناپاک کو پاک کے بدلے نہ بدلو اور ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر مت کھاؤ یقیناً یہ بہت بڑا گناہ ہے" [2]۔

تفسیر 2: اس سورۃ کے احکام میں سے یہ پہلا حکم ہے اس میں یتیموں کے مال کی حفاظت اور دور جاہلیت کے ظالمانہ طریقے سے ان کے مال کھانے سے منع فرمایا ہے اور اس آیت میں یتیموں کے متعلق تین احکام دیے گئے، دو احکام صیغہ نہی یعنی منع کرنے کے ساتھ اور ایک حکم صیغہ امر یہ آیت گذشتہ آیت سے مربوط ہے اس لیے کہ اس آیت میں مذکورہ تمام احکام تقویٰ کے تقاضہ کرتا ہے اور اسی طرح رشتہ داری میں صلہ رحمی کے زیادہ حقدار یتیم بچے ہوتے ہیں۔ اس حکم کا وجوب صیغہ امر سے

بیان ہے۔ وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ اٰتُوْا اِيْتَاء کا مطلب ہے کسی کو کوئی چیز دینا تخصیص کرکے یہ محسوسات اور غیر محسوسات سب کو شامل ہے۔ اَلْيَتٰمٰى یتیم اور یتیمہ دونوں کیلئے استعمال ہوا ہے اور یہ صیغہ جمع ہے۔ جب يَتِيْمَةٌ کی جمع ہو تو يَتَائِم آئے گا بروزن فَعَائِل پھر اس میں قلب مکانی ہوا ہے جس کے سبب سے يَتَامِي بنا پھر تخفیف کیلئے میم کی زیر کو زبر سے بدل دیا اور ہمزہ کو الف سے بدلا گیا تو يَتَامٰى بنا اور یتیم کی جمع ہو تو پھر اس میں دو قول ہیں۔ (1) پہلا قول یہ ہے کہ یہ فعیل کی جمع ہے فعائل کے وزن پر یہ اسم بنا ہے (اگرچہ مذکر کی صفت میں اس طرح جمع نہیں آتی) تو پھر اس میں قلب مکانی ہوا ہے۔ (2) دوسرا قول یہ ہے کہ یہ جمع الجمع ہے یعنی پہلے يَتْمٰى کی صورت میں جمع کیا جیسا اسیر کی جمع اَسْرٰى ہے پھر يَتَامٰى کی صورت میں اسارٰی کی طرح جمع ہوا۔ لغت میں ''يُتْمٌ'' تنہائی کو کہا جاتا ہے اور عرف میں ایسے نابالغ بچے پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جس کا والد فوت ہو جائے یتیم کو یتیم اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ بھی اکیلا رہ جاتا ہے، اس کی کفالت اور دفاع کرنے والا نہیں رہتا، جب تک وہ بالغ نہیں ہوتا وہ دفاع کا محتاج ہوتا ہے اس لئے کہ بالغ بچے پر یتیم کا اطلاق شرعاً اور عرفاً نہیں ہوتا ہے جیسا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ بلوغت کے بعد کوئی یتیم نہیں رہتا۔ ابوداؤد کتاب الوصایا حدیث 2873 شیخ البانی نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ اَمْوَالَهُمْ یہ دلیل ہے کہ نابالغ بچہ مال کا مالک بن سکتا ہے کیونکہ یہاں اضافت ملکیت کے اعتبار سے ہے اور اٰتُوْا میں متولی کو خطاب ہے کیونکہ یتیم کا مال اُس کے پاس ہوتا ہے۔ سوال: جب کوئی نابالغ بچہ ہو تو اس کو مال دینا منع ہے جیسا کہ آیت 5 اور 6 میں ہے اور جب بالغ ہوتا ہے تو یتیم نہیں رہتا تو پھر اٰتُوا الْيَتٰمٰٓى کا کیا مقصد ہے؟ جواب: امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ یتیموں کو مال دینے کے دو طریقے ہیں (1) ان کو کھلانا، پہنانا، علاج معالجہ وغیرہ جب تک اس کی ولایت پرورش میں ہوں یعنی وہ نابالغ ہوں۔ (2) دوسرا طریقہ: بلوغت اور عقل شعور آنے کے بعد سارا مال یکبارگی سے دینا جیسا کہ آیت ٦ میں بیان فرما رہے ہیں۔ دوسری صورت میں انہیں يَتَامٰى مجازاً کہا جاتا ہے کیونکہ یہ مَا كَانَ کے اعتبار سے یتیم تھے (زمانہ ماضی کے اعتبار کرکے) یہاں پہلا طریقہ مراد لینا مناسب ہے کیونکہ دوسرا طریقہ اپنے شرائط کے ساتھ بعد میں بیان ہو رہا ہے۔ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ یہ بطور نہی دوسرا حکم ہے۔ تبدل باب تفعل بمعنی استبدال کے ہے، استبدال کا مفعول وہ چیز بن سکتی ہے جو حاصل کی جا سکتی ہو اور مجرور وہ ہو سکتی ہے جو چھوڑی جا سکتی ہو اس جملے کی تفسیر میں چند توجیہات ہیں: (1) امام فراء، بغویؒ اور زجاجؒ کا قول ہے کہ یتیم کا مال مت لو جو کہ تمہارے اپنے حلال مال کی نسبت تمہارے لئے حرام ہے۔ (2) دوسرا قول سعیدؒ اور زہریؒ کا ہے کہ اپنے

ردی مال کے بدلے یتیم کا کھرا اور سالم مال مت لو اس معنی میں تَتَبَدَّلُ تبدیلی کے معنی میں ہے (3) تیسرا قول یہ ہے کہ تم یتیم کا مال لیتے ہو جو کہ تمہارے لئے حرام ہے اور اپنا مال چھوڑتے ہو جو تمہارے لئے حلال ہے نیز خبیث اور طیب کے معنی سورۃ بقرہ میں گزر گئے ہیں۔ وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰٓ أَمْوَالِكُمْ: نہی کی صورت میں یہ تیسرا حکم ہے یہاں إِلَىٰ مَعَ کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ سورۃ مائدہ آیت 6 میں ہے یا اپنے معنی پر ہے مگر اس کا متعلق مقدر ہے یعنی مَضْمُومَةً إِلَىٰٓ أَمْوَالِكُمْ۔ أَكَلَ سے ہر قسم کا فائدہ لینا مراد ہے صرف کھانا مراد نہیں۔ سوال: سابقہ جملے میں یتیم کے مال سے منع کیا گیا یعنی ہر لحاظ سے منع ہے چاہے اپنے مال کے ساتھ ملا کر ہو یا علیحدہ ہو پھر اس جملے کا کیا مقصد ہے؟ جواب: (1) یہ جملہ برائے تاکید ہے اس لیئے کہ جاہلیت والوں کا یہ خاص طریقہ تھا کہ وہ یتیم کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر کھاتے تھے۔

جواب: (2) سابقہ آیت میں کھلے عام یتیم کا مال کھانے سے منع فرمایا تھا یہاں حیلے بہانے سے یعنی ملا کر کھانے سے منع فرمایا یعنی حرام کے حصول کیلئے جو حیلہ کیا جاتا ہے وہ بھی حرام ہے۔ سوال: سورۃ بقرہ میں اختلاط (ملاوٹ) کو جائز قرار دیا تھا یہاں کیوں منع کیا؟ جواب: وہاں تو بطور اصلاح ملانے کو جائز قرار دیا تھا اور فرمایا تھا کہ وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ کہ اللہ فسادی کو مصلح سے خوب جانتا ہے جبکہ یہاں ملانے سے منع اس لیئے کیا ہے کہ بطور حیلہ کھانے کیلئے وہ ملاتے ہیں۔ اس لئے اس سے نہی کی گئی یہی وجہ ہے کہ۔ وَلَا تُخَالِطُوٓا نہیں فرمایا بلکہ وَلَا تَأْكُلُوٓا فرمایا ان تمام جملوں کا حاصل یہ ہے کہ یتیم کا مال مت کھاؤ البتہ اس کو استعمال کیلئے دو اور اس کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر مت کھاؤ یعنی ملاوٹ کو کھانے کیلئے ذریعہ مت بناؤ۔ إِنَّهُۥ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا (ۚ) کی ضمیر بتاویل مذکور أَكَلَ کھانے اور تَبَدَّلُ دونوں کی طرف راجع ہے اور کان دوام ہمیشگی کیلئے ہے۔ حُوبًا ڈانٹ (زجر) کو کہا جاتا ہے۔ امام قرطبی نے فرمایا کہ وحشت کو کہا جاتا ہے۔ قفال کا قول ہے تَحَوُّبُ اس چیز کا کمانا ہے جو درد پیدا کرتی ہے اور یہاں مراد گناہ یا ظلم ہے۔ كَبِيرًا حُوبًا کیلئے تاکید ہے۔

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا ۝ "اور اگر تمہیں خوف ہو کہ انصاف نہیں کر سکو گے یتیم عورتوں کے بارے میں (تو ان کے بجائے) اور عورتوں سے جو تمہیں اچھی لگیں نکاح کر لو، دو دو تین تین اور چار چار (نکاح کر لو) لیکن اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ ان میں انصاف نہ کر سکو گے پھر ایک کافی ہے یا وہ کنیزیں جو تمہارے قبضے میں

ہوں بے انصافی سے بچنے کیلئے یہی قرین صواب ہے"[3]۔

تفسیر 3: اس آیت میں سورۃ کے احکام میں دوسرا حکم یتیموں کے متعلق ذکر ہے جو اصالتاً ان کے نفوس، جانوں کے متعلق ہے اور ضمناً ان کے مالوں کو بھی شامل ہے۔ وَإِنْ خِفْتُمْ یہاں خوف سے مراد علم ہے یعنی اگر تمہیں معلوم ہو ایک معلوم چیز میں جب خوف اور ڈر کا پہلو موجود ہو تو وہاں علم بمعنی خوف استعمال ہو سکتا ہے اور یہ اس وقت مستقبل میں خوف سے تعلق رکھتا ہے۔ ابو عبیدہؒ کے بقول یہ بمعنی یقین ہے لیکن پہلا قول بہتر ہے۔ أَلَّا تُقْسِطُوا یہ خِفْتُمْ کیلئے بتاویل مصدر مفعول ہے یعنی عَدَمَ الْقِسْطِ "اقساط" عدل اور انصاف کے معنی میں ہے اس لفظ کی تحقیق ان شاء اللہ سورۃ الجن میں بیان ہوگی۔ امام راغبؒ نے مفردات القرآن میں فرمایا کہ "قِسْط" قاف کے زیر کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے کسی دوسرے کا حصہ لینا یہ صورت ظلم شمار ہوتی ہے اور اَقْسَاط افعال کا مصدر ہے اس کا معنی ہے دوسرے کو اس کا حق دینا ہے اور یہ عدل کی صورت بعض اہل علم کے مطابق "قَسْط" قاف کے زبر کے ساتھ عدل کا معنی دیتا ہے اور زیر کے ساتھ ظلم کے معنی میں ہوتا ہے فِي الْيَتٰمٰى ایک توجیہ کے مطابق اس سے مراد نابالغ یتیم بچی ہے دوسری توجیہ کے مطابق اس میں مؤنث و مذکر دونوں مراد ہیں جیسا کہ بعد میں ذکر ہو رہا ہے۔ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ یہ ایک توجیہ کے مطابق اِنْ خِفْتُمْ کیلئے جزاء ہے۔ مَا طَابَ لَكُمْ میں "مَا" موصولہ ہے امام سیبویہ کے نزدیک "مَا" کا استعمال بھی "مَنْ" کی طرح حقیقۃ ذوی العقول کے لیے ہوتا ہے یا "مَا" مصدریہ ہے۔ طَابَ۔ اَحَلَّ۔ کے معنی میں ہے اکثر مفسرین کے نزدیک کسی بھی حلال چیز کی تعبیر "طیبہ" سے ہو سکتی ہے سَكِيْنَةً طَابَ میں لذت اور میلان کے معانی پائے جاتے ہیں۔ مِنَ النِّسَاءِ۔ اس میں مِنْ بیانیہ یا تبعیضیہ ہے۔ سوال: اس شرط اور جزاء میں کیا مطابقت ہے یعنی خوف عدم قسط اور جزاء جو حکم نکاح ہے؟۔ جواب: اس میں چار اقوال نقل ہیں۔ (1) پہلا قول یہ ہے کہ امام بخاری و امام مسلم نے روایت نقل کی ہے کہ ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے عروہ نے اس کی تفسیر پوچھی تھی تو ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ وہ یتیم بچی جو کسی ولی کی کفالت میں ہو اور حسین اور مالدار ہو اس کو نکاح میں رکھنا ولی پسند کرتا ہے مگر اس کو مہر و نان نفقہ پورا دینے کیلئے تیار نہیں ہے یعنی انصاف کرنے کیلئے اس کے ساتھ تیار نہیں ہے صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 74۔ 4573 صحیح مسلم کتاب التفسیر حدیث 3018 (اور چونکہ یہ رشتہ کسی اور سے نہیں مانگتا ہے بلکہ گھر میں ہی یہ اس کا ولی ہے۔ لہٰذا یہ آیت ان یتیم بچیوں کے بارے میں نازل ہوئی اس بناء پر یتامٰی سے یتیم لڑکیاں مراد ہیں جن کے حقوق ادا کیئے بغیر

ولی ان کو نکاح میں رکھنا چاہتے ہیں تو اَلنِّسَآءِ سے غیر یتیم لڑکیاں مراد ہیں یعنی اگر تمہیں خوف ہو کہ ان یتیم لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہیں کرسکو گے تو بجائے ان یتیم لڑکیوں کے اور عورتوں سے نکاح کرو جو تمہارے لئے حلال بھی ہوں اور ان کے حقوق بھی تم ادا کرو۔ تو مراد یہ ہے کہ یتیم لڑکیوں پر ظلم مت کرو۔ اس توجیہہ میں اِنْ خِفْتُمْ کیلئے جزاء فَانْكِحُوْا ہے (2) دوسرا قول یہ سعید بن جبیرؒ اور قتادہؒ اور ضحاکؒ سے امام سیوطیؒ اور ابن جریرؒ نے نقل کیا ہے کہ مذکورہ آیت نازل ہونے کے بعد لوگ یتیموں کے مال سے بچتے اور بہت احتیاط کرتے تھے لیکن خواتین میں بے احتیاطی کا مظاہرہ کرتے تھے یعنی چار سے زیادہ شادیاں کرتے تھے مگر ان میں عدل و انصاف نہیں کرتے تھے لہٰذا ان کو حکم ہوا کہ یتیموں کے متعلق تو تم نے خوف و احتیاط اختیار کیا ہے مگر عام خواتین کے متعلق تم میں عدل نہیں ہے یعنی اگر تم اپنے آپ کو یتیم لڑکوں اور لڑکیوں کے مال سے بچاتے ہو تو اسی طرح عام خواتین میں عدل و انصاف کرو اور ان میں ظلم و ستم سے اجتناب کرو اور اس سے بچنے کیلئے طریقہ یہ ہے کہ چار سے زیادہ شادیاں مت کرو اس لیئے کہ تم عدل نہیں کرسکتے ہو یعنی جب انسان کسی گناہ سے اجتناب کرتا ہے تو اس جیسے اور گناہ سے اسے بچنا چاہئے۔ اس توجیہہ میں یتامیٰ لڑکے اور لڑکیاں دونوں کو عام ہے اور فَانْكِحُوْا سے پہلے جزاء مقدر ہے یعنی فَلَا تَظْلِمُوْا فِي الْمَنْكُوْحَاتِ اور فَانْكِحُوْا اس پر عطف ہے (3) تیسرا قول یہ ہے کہ عکرمہؒ سے ابن جریرؒ اور سیوطیؒ نے نقل کیا ہے کہ ایک شخص یتیموں کی ولایت کرتا اور چار سے زیادہ عورتیں اس کے نکاح میں ہوتیں تو جب بیویوں پر خرچ کرنا چاہتا تو یتیموں کے مال سے خرچ کرلیتا تو ان کو حکم ہوا کہ جب تم لوگ عام حالات میں ظلم سے بچنا چاہتے ہو تو زیادہ شادیوں کے بعد بھی یتیموں کے مال کھانے سے بچ جاؤ۔ یعنی زیادہ عورتوں کے رکھنے سے اجتناب کرو تو حرام مال لینے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ (4) چوتھا قول یہ ہے کہ لوگ یتیموں پر ظلم کرتے تھے مگر جب ان سے نکاح کرلیتے تو پھر ظلم سے باز آجاتے لہٰذا ان کو حکم ہوا کہ ان سے نکاح کرو تاکہ ظلم سے بچ سکو۔ ان تمام اقوال میں شرط و جزاء کے درمیان مناسبت ظاہر ہے۔ ان میں پہلا قول بہتر ہے۔ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۔ ان کو اسماء معدودۃ کہتے ہیں اور یہ تمام طَابَ کی ضمیر سے احوال ہیں یہ سارے تکرار کا معنی دیتے ہیں۔ یعنی اِثْنَانِ اِثْنَانِ، ثَلَاثَةً ثَلَاثَةً، اَرْبَعَ اَرْبَعَ۔ بصریوں کے نزدیک اس میں قیاس جاری نہیں ہوتا ہے۔ اس میں آٹھ الفاظ نقل ہیں آحاد، مُوحَدَ، ثُنَاءَ، مَثْنٰى، رُبَاعَ، مُرَبَّعَ اور اس سے اوپر الفاظ عرب سے منقول نہیں اور فصیح عرب کی زبان سے نہیں سنے گئے اور کوفیوں کے نزدیک اس میں قیاس صحیح ہے۔ ان کیلئے اشعار منقول ہیں لیکن امام قرطبیؒ نے فرمایا ہے کہ وہ شاذ ہیں اور امام آلوسیؒ کا قول ہے کہ متنبی کی

کتاب کے شعر کی عیب جوئی کی گئی ہے جس میں اَحَادَ اَمْ سُدَاسَ فِی اَحَادَ ہے ابو عبید قرطبی نے فرمایا ہے صحیح بات یہ ہے کہ چار یعنی رباع سے اوپر ثابت نہیں ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اس کو پسند کیا ہے کہ ایک وقت میں چار سے زیادہ ثابت نہیں ہیں جیسا کہ سورۃ فاطر آیت 1، سورۃ سباء آیت 46 میں ہے۔ سوال: اس کے درمیان واؤ سے عطف کیا ہے اوْ کے ساتھ عطف نہیں کیا ہے؟ جواب: اَوْ دلالت کرتا ہے تقسیم پر یعنی ایک قسم مردوں کیلئے مَثْنٰی دوسری قسم کیلئے ثُلٰثَ اور ایک قسم والوں کیلئے رُبٰعَ جائز ہے جبکہ یہ تو اصل مقصد کے خلاف ہے۔ اصل مقصد تو یہ ہے کہ ایک مرد کیلئے دو دو تین تین اور چار چار بیویاں اس شرط پر جائز ہیں کہ ان کے درمیان انصاف کرے۔ سوال: اِثْنَانِ وَ ثُلٰثَ وَ اَرْبَعَ کیوں نہیں فرمایا؟ جواب: اسماء عدد اور اسماء معدولہ میں فرق یہ ہے کہ اسماء عدد میں مقصود صرف عدد ہوتا ہے اور اسماء معدولہ میں عدد کے سوا مزید معانی بھی مراد ہوتے ہیں۔ یعنی جب کہا جائے کہ جَآءَ الْقَوْمُ مَثْنٰی یعنی دو آدمی قوم میں سے اکٹھے آ گئے اور جب کہا جائے کہ جَآءَ الْقَوْمُ اِثْنَانِ یعنی قوم کے دو آدمی آ گئے خواہ الگ الگ آئیں یا اکٹھے۔ یہاں پر مقصد یہ ہے کہ دو بیویاں اکٹھی رکھنا درست ہے اس لیئے اسماء معدولہ ذکر کیا ہے۔ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً - یہ جملہ دلیل ہے کہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے میں عدل شرط ہے لہٰذا شرط نہ پائے جانے کی صورت میں مشروط کی نفی ہوئی یعنی عدل نہ کرنے کی صورت میں تعدد ازواج منع ہوگا جیسے اس کلام میں اشارہ ہے: اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا - یعنی عدل نہ کرنے کی صورت میں تعدد منع ہوگا۔ بلکہ فَوَاحِدَةً سے قبل اِلْزَمُوْا یا اِکْتَفُوْا لفظ مقدر ہے یہاں فَوَاحِدَةً سے پہلے لفظ "حُرَّةً" کی صفت مقدر ہے کہ ایک ہی آزاد عورت سے نکاح کرو۔ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ یہ فَوَاحِدَةٍ پر عطف ہے مطلب یہ ہے کہ لونڈیوں کی تعداد زیادہ رکھنے میں کوئی شرط نہیں ہے لہٰذا جتنی رکھو درست ہے اس لیے کہ ان میں عدل برابری کی شرط نہیں البتہ اچھا گزربسران کے ساتھ بھی لازمی ہے۔ یا یہ مَا طَابَ لَكُمْ پر عطف ہے اور فعل مقدر ہے تو عبارت اس طرح ہے کہ وَاقْتَصِرُوْا عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ: چونکہ یہاں پر خطاب لونڈیوں کے مالکوں سے ہے تو ان کیلئے لونڈیوں سے نکاح لازم نہیں ہوتا ہے۔ اور اس سورۃ کی آیت 25 میں غیر مالکوں سے خطاب ہے تو وہاں پر فرمایا فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اس عبارت میں اَنْكِحُوْا مقدر ہے۔ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا۔ ذٰلِكَ اسم اشارہ میں دو قول ہیں۔ (1) اس سے وَاحِدَةً اور مَا مَلَكَتْ کی طرف اشارہ ہے۔ (2) دوسرا قول یہ ہے کہ سابقہ پورے کلام کی طرف اشارہ ہے یعنی چار تک عورتوں سے نکاح عدل وانصاف کے ساتھ درست ہے بصورت دیگر ظلم سرزد ہو جانے کے

خوف سے ایک ہی پر اکتفاء کرنا اور لونڈیوں تک محدود رہنا درست ہے۔ اَدْنٰی۔ زیادہ قریب کے معنی میں ہے یہاں معنوی قربت مراد ہے حسی نہیں۔ امام آلوسی اور بعض دیگر مفسرین نے لکھا ہے کہ عَالَ اور تَعُوْلُ کے متعدد معنی ہیں۔ میلان کے معنی میں ہے۔ اسی طرح ظلم کرنا، غربت، اہل وعیال کا بڑھ جانا، مشقت کا آنا، خرچ کرنا، عاجز اور کمزور ہو جانا۔ اکثر مفسرین نے جمہور اسلاف اور سیدنا ابن عباس ؓ سے روایت کیا ہے کہ اس سے ظلم کی طرف میلان مراد ہے جو عدل کے مقابل ہے۔ ابن ابی حاتم نے سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ اس سے مراد فقر ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہاں اہل کے زیادہ ہونے کے معنی میں ہے۔ ثعلبی اور ابن عربیؒ نے اس قول کا سخت رد کیا ہے لیکن امام قرطبیؒ نے فرمایا ہے امام شافعیؒ سے بھی پہلے بڑے بڑے ائمہ زید بن اسلمؒ اور جابر بن زیدؒ سے بھی یہی معنی نقل کیا گیا ہے اسی طرح لغت کے بڑے ائمہ امام کسائی، ابوعمر الدوری نے بھی یہی معنی بیان کیا ہے۔ البتہ اس معنی پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے لونڈیاں زیادہ رکھنے کی اجازت دی ہے تو پھر زیادہ اولاد ان سے بھی پیدا ہو سکتی ہے تو امام شافعیؒ کا بیان کردہ معنیٰ یہاں درست نہیں ہوگا اور اس کی مناسب آیت سے نہیں ہوتی اَن لَّا تَعُوْلُوْا (کہ اولاد زیادہ نہ ہو جائے) کے ساتھ کیا مناسبت ہے؟ جن بعض مفسرین نے امام شافعیؒ کی طرف سے بے عذر نقل کیا ہے کہ لونڈیوں کی اولاد نہیں ہوتیں حقیقت سے بہت دور کی بات فرمائی ہے۔ موجودہ دور کے جن بعض لوگوں نے اپنی گمراہی کے لئے خاندانی منصوبہ بندی میں امام شافعیؒ کے اس قول کو بطور دلیل پیش کیا ہے کہ کثرت اولاد سے اسلام منع کرتا ہے۔ بہت غلط اور بے جا استدلال ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ قول قرآن وسنت کی ان نصوص کے خلاف ہے جن میں نکاح وجماع کا مقصد اولاد کی پیدائش قرار دیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ - فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ : حدیث میں ہے۔ تَزَوَّجُوا الْوَدُوْدَ الْوَلُوْدَ ان خواتین سے نکاح کرو جو محبت کرنے والیاں اور کثرت سے بچے پیدا کرنے والیاں ہوں۔ (مسند احمد ج3 ص158 ابوداؤد کتاب النکاح حدیث 2050 قال البانی حسن صحیح)۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس آیت میں چار نکاحوں کی اجازت دی گئی ہے تو ان سے اولاد زیادہ پیدا ہوتی ہیں تو پھر اولاد کی قلت (کمی) کی ترغیب کا کیا معنیٰ ہے۔ البتہ امام شافعی رحمہ اللہ کے قول کی توجیہ اس طرح ہو سکتی ہے کہ کثرت عیال سے مراد کثرت ازواج ہے اور ذٰلِكَ اشارہ چار کے عدد کی طرف ہے یعنی اس تعداد سے بیویاں زیادہ نہ ہوں ورنہ بوجھ بن جائیں گی یعنی تم پر اخراجات ناقابل برداشت ہوں گے۔ فائدہ 1 : مذکورہ آیت اور احادیث اور اجماع امت کی وجہ سے اہل سنت

والجماعت کا متفقہ عقیدہ ہے کہ چار سے زیادہ عورتیں نکاح میں رکھنا حرام ہے۔ امام قرطبی نے رَوَافِض اور بعض اہل ظواہر کی طرف بھی نسبت کی ہے کہ وہ نو (9) بیویوں کے نکاح میں رکھنے کے قائل ہیں جبکہ ان میں سے بعض نے تو کسی خاص عدد کے ہونے سے بھی انکار کیا ہے اور کہتے ہیں جتنی چاہے بیویاں نکاح میں رکھ سکتے ہیں امام آلوسیؒ کے بقول شیعہ امامیہ اس مذہب کے قائل نہیں لیکن امام قاسیؒ نے اپنی تفسیر میں یہ بات امام شوکانی کی کتاب وَبْلُ الْغَمَام اور نیل الاوطار کے حوالہ سے ثابت کی ہے کہ اس کی نسبت اہل ظاہر اور ابن صباغ، عمرانی، قاسم بن ابراہیم اور اہل تشیع کی ایک جماعت کی طرف ثابت ہے۔ انہوں نے ان احادیث پر کلام کی ہے جن میں چار عورتوں سے زیادہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ اور انکا یہ بھی کہنا ہے قرآن میں چار سے زیادہ کی ممانعت نہیں۔ کیونکہ آیت میں چار کی کوئی قید نہیں۔ اما شوکانی نے "السیل الجرار" میں فرمایا ہے کہ چار سے زیادتی کی ممانعت والی تمام احادیث میں اگرچہ انفرادی طور سے ہر حدیث میں کوئی نہ کوئی کلام ضرور ہے تاہم مجموعی طور سے یہ تمام احادیث حسن کے درجے میں ہیں اس کے علاوہ اجماع امت سے بھی ان احادیث کی تائید ہوئی ہے۔ میری رائے ہے کہ چار عورتوں میں حصر اور زیادہ کی ممانعت قرآن کریم سے ثابت ہے۔ (1) اگر نو (9) عورتوں سے نکاح جائز ہوتا اور چار میں حصر نہ ہوتا تو قرآن کریم مَثْنٰی، وَثُلٰثَ، اور رُبٰعَ کیوں ذکر کرتا بلکہ لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیتا جتنی کوئی چاہتا نکاح کر لیتا۔ (2) پہلی بات یہ ہے کہ عرب اس عدد سے زیادہ نکاح نہیں کرتے جیسا کہ اسمائے عدد اور اسمائے معدولہ کی بحث میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ عرب اسماء معدولہ میں "رُبٰعَ" سے اوپر کوئی عدد ذکر نہیں کرتے اللہ تعالیٰ نے بھی "رُبٰع" فرمایا اَرْبَعَ نہیں فرمایا معلوم ہوا کہ چار میں ہی حصر ہے تاہم سورۃ فاطر میں اسمائے معدولہ ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ " یہاں تو ایسا کچھ بھی نہیں فرمایا معلوم ہوا حصر چار میں ہی ہے۔ (3) اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے درمیان عدل وانصاف قائم کرنے کیلئے عدد کا ذکر فرمایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان چار سے زائد میں عدل قائم کرنے پر طاقت نہیں رکھتا ہے اور انبیاء کرام اگر اس سے زیادہ نکاح کرتے ہیں تو یہ انکا معجزہ ہے۔ (4) اَلَّا تَعُوْلُوْا: ہر معنی میں لیا جائے تو نتیجہ یہ نکل آتا ہے کہ چار سے زیادہ عورتوں سے نکاح میں میلان ایک کی طرف ضرور ہوتا ہے نیز سلف صالحین کا چار سے منع پر اجماع بھی ثابت ہے۔ امام آلوسی کا قول ہے کہ اس میں سب سے قوی دلیل اجماع ہے کہ اجماع کے وقت کسی سے اس کی مخالفت ثابت نہیں ہوئی اور اجماع میں یہ شرط نہیں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے تاقیامت اس میں کوئی اختلاف ثابت نہ ہو ورنہ اس قسم کا اجماع تو کسی

بھی مسئلہ پر ثابت نہیں ہوسکتا ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ کے قول میں اس شرط کی طرف اشارہ ہے لیکن یہ درست نہیں ہے۔ امام رازی کا قول ہے کہ اس اجماع کے مخالف اہل بدعت ہوں گے لہٰذا ان کے قول کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ ابن عربی نے ان مخالفین کو (جہال) بہت جاہل قرار دیا ہے۔ امام ابن کثیر نے اس عنوان میں احادیث جمع کی ہیں ان کا مطالعہ وہاں کیجئے۔ قرآن، حدیث اور اجماع کے مطابق چار عورتوں سے زیادہ نکاح میں رکھنا منع ہے البتہ انبیاء علیہم السلام کیلئے اجازت ہے جو ان کی خصوصیت ہے ہمارے لئے اس میں ان کی پیروی جائز نہیں ہے۔ فائدہ 2: منکرین حدیث نے اس آیت میں تحریف کی ہے اور امام آلوسیؒ نے اس قول کی نسبت جبائی معتزلی کی طرف کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ آیت صرف یتیم لڑکیوں سے متعلق ہے جو کسی کی پرورش میں ہوں اور چار سے زیادہ نکاح میں رکھنے سے ظلم کا اندیشہ ہو تو اُسے منع فرمایا کہ صرف چار یتیم بچیوں کو نکاح میں رکھ سکتے ہو زیادہ نہیں جبکہ عام عورتوں میں یہ قانون نہیں ہے لیکن مذکورہ بحث سے معلوم ہوا کہ یہ قول قرآن وحدیث اور اجماع کے خلاف ہے نیز اگر یہ قول درست ہوتا تو عبارت اس طرح ہوتی وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنْهُنَّ لیکن یہاں تو لفظ اَلنِّسَآءِ ذکر ہے اور وہ عام ہے۔ قرآن مجید کی کسی آیت کی تفسیر جو سلف صالحین کے اجماع کے خلاف ہو وہ تحریف ہے۔ فائدہ 3: امام قرطبی نے عمر فاروق اور کعب اسدی رضی اللہ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے جس میں کعب اسدی نے چار بیویوں کو رکھنے کیلئے بطور استدلال کہا ہے کہ تین راتیں اگر شوہر عبادت میں صرف کرے تو درست ہے مگر چوتھی رات ضرور بیوی کو حق دے گا۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۚ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا ④ "اور تم عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی سے دو پھر اگر وہ اپنے نفس کی خوشی سے اس میں سے کچھ دیں تو اس کو مزے سے نقصان سے پاک سمجھ کر کھاؤ" [4]۔

تفسیر 4: سورۃ میں مذکورہ احکامات میں سے اس آیت میں تیسرا حکم بیان ہو رہا ہے یہ حکم عقد نکاح کی تاکید اور اپنی بیوی کے ساتھ اچھا گزر بسر کرنے سے متعلق ہے اس تیسرے حکم میں دو مسئلے ہیں۔ (1) بیوی کو مہر دینا۔ (2) بیوی کا اپنے خاوند کو مہر معاف کرنا۔ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ: سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ، ابن زید اور جریج رحمھم اللہ کا قول ہے کہ سابقہ آیت میں بھی خطاب شوہروں سے تھا اور اس آیت میں بھی۔ اَلنِّسَآءَ سے بیویاں مراد ہیں یہ لفظ آزاد عورتوں اور نکاح میں رہنے والی لونڈیوں دونوں کو شامل ہے اور ابو صالح کا قول ہے کہ یہ خطاب عورتوں کے اُولیاء سے ہے کیونکہ دور جاہلیت میں ولی اپنی بہن، بیٹی عورت کا نکاح میں دے دیتا اور مہر خود لیتے چاہے کم ہو یا زیادہ۔ یا کسی دوسرے طریقے

سے مہر پر قبضہ جماتے تھے تو جاہلیت کی اس رسم کے خاتمہ کیلئے اللہ تعالیٰ نے خطاب اس طرح کیا وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ۔ حضرمیؒ کا قول ہے کہ اس میں نکاح شغار کا رد ہوا ہے کہ عورت کو عورت کے بدلے میں دے دیتے اور ان کیلئے مہر مقرر نہیں کرتے تھے تو ان کو خطاب میں کہا گیا کہ عورتوں کو مہر دینا لازم ہے۔ صَدُقٰتِ۔ صدقہ کی جمع ہے۔ یہ لفظ صداق مہر کے ساتھ خاص ہے۔ تاکہ نکاح میں صدقِ نیت اور نکاح کی رغبت معلوم ہو سکے۔ نِحْلَةً یہ اس عطیہ کو کہتے ہیں جو کسی کو بغیر عوض کے محض احسان کے طور دیا جائے یہ لفظ ھبہ کی طرح عام نہیں بلکہ خاص ہے ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ رحمہ اللہ سے نقل ہے کہ نِحْلَةً فَرِيْضَةً کے معنی میں ہے لہٰذا ترکیب میں یہ لفظ "صَدُقٰتِ" سے حال بن کر آیا ہے زجاجؒ کا قول ہے کہ یہ دِيَانَةً شَرْعِيَّةً کے معنی میں ہے تو یہ مفعول لہ ہے۔ کلبی کا قول ہے کہ یہ هَدِيَّةً وَ هِبَةً کے معنی میں حال ہے یا وَاٰتُوْا هُنَّ کیلئے مفعول مطلق ہے۔ سوال: نِحْلَةً تو اصل میں کسی بھی چیز کے بغیر عوض کے دوسرے کو دینے کو کہا جاتا ہے۔ جبکہ مہر تو عورت کے بدلے میں ہے تو یہ کیسا نِحْلَةً ہو سکتا ہے؟ جواب: شوہر کا اپنی بیوی سے لذت حاصل کرنا یک طرفہ نہیں بلکہ جانبین سے ہوتا ہے معلوم ہوا مہر ایک اضافی چیز ہے عورت کے بدلے نہیں اس لئے نِحْلَةً بصفت ذکر کیا ہے۔ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا یہ دوسرا مسئلہ ہے یعنی عورت کیلئے جائز ہے پورا مہر یا مہر کا کچھ حصہ اپنے شوہر کو یا ولی کو بخش دیں۔ قرطبیؒ اور ابن جریرؒ رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ بعض شوہر اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ بیوی سے مہر لے لیں تو اللہ تعالیٰ نے اس کا جواز بیان کیا۔ طِبْنَ خوشی سے معاف کرنا ہے۔ عَنْ شَيْءٍ۔ طبن کے صلے میں (با) آتی ہے اور یہاں عَنْ استعمال ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں عَنْ "عَفَوْا" اور تَبَاعَدَ کے معنی کو متضمن ہے اس لئے عَنْ لائے۔ مِّنْهُ۔ اس کی ضمیر صدقات کی طرف راجع ہے یعنی بتاویل مذکور جو کہ مال یا صداق ہے۔ مِن۔ لیثؒ کے قول کے مطابق برائے تبعیض ہے اور ابن عطیہؒ کے بقول برائے بیان جنس ہے۔ نَفْسًا ترکیب میں طِبْنَ کی ضمیر سے تمیز ہے "طَيِّبَاتِ اَنْفُسِهِنَّ"۔ یعنی خوش دلی کے معنی میں ہے نَفْسًا سے دلی خوشنودی کی تاکید بتا رہے ہیں یعنی مہر معاف کرنے کی خوشی صرف ظاہری نہیں ہے بلکہ حقیقتاً دل سے ہوتی ہے۔ حاصل معنی یہ ہے کہ اگر وہ خاتون اپنی خوشی سے تمہیں کوئی مہر میں سے عطا کریں۔ امام آلوسیؒ نے ابن ہبیرہؒ سے نقل کیا ہے کہ ائمہ اربعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کو اگر کچھ دیدیں تو پھر واپس لینا جائز نہیں۔ صاحب اللباب نے بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ بسا اوقات ایک بیوی اپنے شوہر کو مہر کا کچھ حصہ معاف کر دیتی ہے اور بعد میں پھر تقاضا کرتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ بیوی نے دلی خوشی سے

معاف نہیں کیا ہوتا اس کی تائید کے لئے امام شعبیؒ نے شریح کا ایسا ہی واقعہ نقل کیا ہے۔ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے بھی اس طرح روایت نقل کی ہے۔ فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـئًا مَّرِيْٓـئًا۔ "اَكَلَ" سے ہر جائز نفقہ وغیرہ لینا مراد ہے مگر کھانا ایک اہم ضرورت ہے اسلئے اس کا ذکر کیا ہے۔ هَنِيْٓـئًا مَّرِيْٓـئًا یہ كُلُوْهُ کی ضمیر سے حال یا مقدر موصوف کیلئے صفت ہے یعنی اَكْلًا هَنِيْٓـئًا۔ هَنِيْٓـئًا هَنِیَٔ سے اسم فاعل ہے اور مَرِيْٓـئًا مرئی سے ہے اور ان دونوں میں کئی وجوہات سے فرق ہے۔ (1) هَنِیْءٌ وہ چیز ہے جو تکلیف کے بغیر حاصل ہو اور مَرِيْٓـئًا وہ چیز جو جلدی ہضم ہوتی ہو۔ (2) هَنِيْٓـئًا وہ ہے جس میں کوئی گناہ نہیں ہے اور مَرِيْٓـئًا وہ جس میں کوئی مرض نہیں ہے۔ (3) هَنِيْٓـئًا آسانی سے نگل جانے یعنی حلق سے گزرنے والا اور مَرِيْٓـئًا جس کا انجام بلا ضرر ہو۔ (4) هَنِیْءٌ مزیدار اور مرئی آسانی سے حلق سے اترنے والا۔ امام قرطبیؒ نے فرمایا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ دنیا میں اس مال کا مطالبہ نہیں ہے اور آخرت میں نقصان نہیں ہے۔ فائدہ: ابن کثیر، آلوسی، قرطبی نے علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ اگر کسی کو بیماری ہو یا پیٹ میں درد وغیرہ ہو تو بیوی سے تین درہم مثلاً تین روپیہ طلب کرے اور ایک روایت کے مطابق مہر کی رقم میں سے طلب کرے پھر اس پر شہد خرید لے اور بارش کے پانی میں ملائے پھر اس کو پی جائے تو اس کی بیماری دور ہوگی۔ اور علی رضی اللہ عنہ نے تین آیتیں تلاوت کی ہیں۔

(۱) وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا (۲) يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ (۳) فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـئًا مَّرِيْٓـئًا

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۵﴾

"اور بے وقوفوں کو تم اپنا مال مت دو وہ جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے گزران کا سبب بنایا ہے اور تم اسی میں سے ان کو کھلاؤ اور پہناؤ اور تم ان سے معقول بات کہو" [5]۔

تفسیر 5: سورت کے احکامات میں سے اس آیت میں یہ چوتھا حکم بیان ہو رہا ہے۔ یہ حکم کم عقل اور نا سمجھ لوگوں سے ظلم دفع کرنے سے متعلق ہے۔ ربط: اس آیت کا ماقبل سے ربط یہ ہے کہ گزشتہ آیات میں حکم تھا کہ یتیم بچوں بچیوں کو ان کے اموال دو اور اپنی بیویوں کو ان کے مہر دو۔ اب یہاں ایک قید بتا رہے ہیں کہ نا سمجھی کی حالت میں انہیں ان کے اموال نہ دو تاکہ ضائع نہ ہو جائے۔ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ یہ خطاب ان کے ولی کفیل یا وصی سے ہو رہا ہے۔ امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ اس میں ضمناً ولی کفیل وصی مقرر کرنے کا جواز ہے۔ السُّفَهَآءَ اس کی تفسیر سورۃ بقرہ میں گزری ہے۔ سُفَهَآء کے مصداق

میں یہاں مختلف اقوال ہیں۔ سعید بن جبیرؒ کا قول ہے کہ اس سے مراد یتیم بچے اور بچیاں ہے۔ ابو مالکؒ کا قول ہے کہ اسے نابالغ مراد ہے یتیم ہو یا نہ ہو۔ مجاہدؒ کا قول ہے کہ اس سے مراد خواتین ہیں۔ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ہر وہ شخص اس میں داخل ہے جس پر پابندی لگائی جاتی ہو۔ لہٰذا اس میں مذکورہ تمام اقوال داخل ہیں۔ اسی طرح اسراف کرنے والے پاگل، دیوانے بھی اس میں داخل ہیں۔ اَمْوَالَكُمُ اس سے وہ اموال مراد ہیں جو ولی، کفیل وصی کے اختیار، قبضہ میں ہو۔ نیز اس اضافت میں تاکید ہے کہ تم انکے مالوں کی اس طرح حفاظت کرو جس طرح اپنے مالوں کی کرتے ہو۔ سوال: دوسری آیت میں مال کی اضافت یتیموں کی طرف ہوئی ہے جبکہ یہاں ان کی طرف نہیں ہوئی؟ جواب: وہاں ناجائز تصرف سے منع کرنا مقصود تھا اسلئے علت کی طرف اشارہ ہوا کہ وہ مال تمہارا نہیں بلکہ یتیموں کا مال ہے اور یہاں پہ مال میں فساد سے منع مقصود ہے لہٰذا اس اضافت میں اشارہ ہے کہ جس طرح تم اپنے مال کو فساد اور بربادی سے بچاتے ہو اسی طرح ان کے اموال کی بھی حفاظت کرو۔ الَّتِي جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا یہ صفت اس حکم کیلئے بطور علت ہے۔ یعنی یہ مال تمہاری معیشت کا سبب ہے لہٰذا اگر ان کو دو گے تو معیشت کی بربادی ہوگی۔ اس لَكُمْ میں اولیاء، سفہاء اور عام لوگوں سے خطاب ہے۔ قِيٰمًا قَامَ سے مصدر ہے اصل میں قِوَامًا ہے لیکن واؤ کو (یا) سے بدل دیا ہے۔ یعنی جسموں کے قیام اور بقاء کیلئے سبب ہے۔ بقول زمخشری معنیٰ یہ ہے کہ تم اس کے سبب زندگی کا گزر بسر کرتے ہوں۔ قرطبیؒ کا قول ہے کہ زندگی کے گزر بسر کا سبب اور دین کی اصلاح کا سبب ہے یعنی صنعت وتجارت اموال پہ مبنی ہے اور یہ بنی نوع انسان کیلئے سبب معیشت ہے۔ کعبۃ اللہ کیلئے قِيٰمًا لِّلنَّاسِ سورۃ مائدہ آیت 97 میں فرمایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی تعظیم عالم پر لازم ہے کیونکہ سارے عالم کی بقاء اس کے ساتھ منسلک ہے آلوسیؒ کا قول ہے کہ اس میں اموال کی مدح کی طرف اشارہ ہے سلف صالحین سے نقل ہے کہ مال مؤمن کیلئے اسلحہ ہے سلف کا یہ بھی قول ہے کہ حلال تجارت کر لیا کرو اسلئے کہ تم ایسے دور میں جی رہے ہو کہ اگر تم میں سے کوئی محتاج ہو جائے تو سب سے پہلے اپنا دین بیچ دے گا۔ وَّارْزُقُوْهُمْ رزق سے مراد نفقہ اور خرچہ دینا اور کھانا پینا علاج معالجہ وغیرہ ہے۔ وَاكْسُوْهُمْ میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جس طرح انسان رزق کا محتاج ہے اسی طرح لباس کا بھی محتاج ہے۔ فِيْهَا فرمایا مِنْهَا کی جگہ اس میں اشارہ ہے کہ ان اموال کو محل روزی اور لباس بنالو یعنی ان اموال میں تجارت کرو اور اس سے کماتے ہوئے ان کیلئے روزی ولباس کا بندوبست کرو تا کہ ان کے اموال برباد ہونے سے بچ جائے۔ مِنْهَا سے مراد اصل مال سے خرچ کرو اور فِيْهَا سے مراد کمائی میں سے خرچ ہے وَ

قُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۔ مَّعْرُوفًا ہر اس قول اور فعل کو کہا جاتا ہے جو نفس کیلئے سکون کا باعث ہو اور عقلاً یا شرعاً خوبصورت ہو۔ اس سے مراد ایسا کلام ہے جس پر نادان اور بے وقوف کم عقل خوش ہوتا ہو مثلاً اس سے کہا جائے گا تیرا مال میرے پاس امانت ہے بلوغت کے بعد تجھے دونگا۔ یہ تیرا مال ہے جب تو عقلمند سمجھدار ہو جائے تو تیری امانت تجھے دونگا قرطبیؒ نے کہا ہے کہ ان کیلئے دعا کرے۔ بَارَكَ اللهُ فِيكُمْ ۔ امام آلوسیؒ نے فرمایا کہ اس میں ان کی دینی اور علمی اصلاح بھی مراد ہے۔ دین کا ضروری علم بھی انہیں سکھائیں۔

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝ "اور تم ان کو پرکھو یہاں تک کہ وہ یتیم نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں پھر اگر تم ان میں سمجھداری پاؤ تو ان کا مال ان کو سونپ دو اور ان کے مال تم حد سے بڑھ کر مت کھاؤ اور نہ ہی جلدی کرتے ہوئے اس ڈر سے کہ وہ یتیم بڑے ہو جائینگے اور جو کوئی مالدار ہو تو چاہیے کہ وہ بچے اور جو کوئی فقیر ہو تو معروف طریقے کے موافق کھالے پھر جب انہیں ان کے مال سونپو تو ان پر گواہ بنالو اور اللہ تعالیٰ حساب لینے کیلئے کافی ہے" [6]۔

تفسیر 6: اس آیت میں دفع ظلم اور مظالم کے سدباب کے لئے پانچواں حکم بیان فرمارہے ہیں۔ چونکہ کم عقلی مخفی صفت یعنی اس کے جانچنے اور پرکھنے کے لئے ظاہری کوئی علامت نہیں تو اس مخفی صفت کے ازالے کے لئے طریقہ دو شرائط کے ساتھ ذکر کرتا ہے (1) بلوغت، (2) عاقل سمجھدار ہونا۔ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى (ابتلاء) امتحان سے ان کی عقلمندی معلوم کرنا مراد ہے تا کہ ان کے مالوں کی حفاظت ہو سکے اور اس کے مختلف طریقے ہیں۔ (1) اس کو تجارت یا اہل وعیال پر خرچ کرنے کیلئے کچھ کم مقدار میں مال دیا جائے اس سے اندازہ لگائیں کہ عاقل ہے یا نہیں دوسرا طریقہ یہ بھی ہے کہ ولی اس کو اپنے ساتھ خرید و فروخت کے وقت لے جائے تا کہ اس کی تربیت ہو اس کے علاوہ اور طریقے بھی ہیں۔ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ یہ پہلی شرط ہے۔ اس سے احتلام مراد ہے جیسا سورۃ نور آیت 59 میں ہے احتلام مذکر اور مؤنث دونوں میں بلوغت کی مشترک علامت ہے اس کے علاوہ دیگر علامات بھی ہیں۔ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا انس سے مراد اَحَسَّ، وَجَدَ اَبْصَرَ ہے جیسا کہ فرمان الٰہی ہے اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۔ سورۃ قصص آیت 29 ''رُشْدًا'' خیر اور بھلائی تک رسائی کو کہا جاتا ہے جس کے مقابل غی آتا ہے جیسا فرمان الٰہی ہے قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ اس سے بقول ابن عباس رضی اللہ عنہما عقلی

صلاحیت اور حفاظت اموال کی صلاحیت مراد ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ کے بقول صلاحیت عقل اور صلاحیت دین مراد ہے۔ اکثر علماء نے لکھا ہے کہ رشد بلوغت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اگر بلوغت کے بعد بھی عاقل نہیں ہوا تو پھر اس پر پابندی لگائی جائے گی۔ یہ اکثر صحابہ کرام تابعین عظام اور مجتہدین کا فتویٰ ہے۔ امام احمد، مالک، ابو یوسف محمد وغیرہ رحمہم اللہ نیز علماء احناف کا اس پر فتویٰ ہے۔ فَادْفَعُوْا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ: ابن عطیہؒ کا قول ہے ہمارے زمانے میں یہ معاملہ قاضی اور بادشاہ کے حوالے کیا جائیگا اور ان کے واسطے سے ان کو مال دیا جائے گا کیونکہ اس زمانہ میں فساد زیادہ ہے۔ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّ بِدَارًا۔ یہ دونوں لفظ ترکیب میں اسم فاعل یا مفعول کے معنی میں ہو کر گزشتہ فعل کی ضمیر سے حال واقع ہو رہے ہیں۔ لغت میں اسراف حد سے تجاوز کو کہا جاتا ہے اور خرچ کرنے میں غلطی اور غفلت کو بھی کہتے ہیں جیسا کہ قرطبیؒ نے لکھا ہے بِدَارًا باب مفاعلہ کا مصدر ہے۔ باب مفاعلہ میں جانبین سے مقابلہ ہوتا ہے۔ یعنی ولی یتیم کے مال سے لینے میں آگے بڑھتا ہے اور یتیم بلوغت کی طرف رواں دواں ہوتا ہے یا مفاعلہ نفس فعل کے معنی میں ہے لہذا ایک جانب سے صادر ہونا کافی ہے۔ اَنْ يَّكْبَرُوْا یہ بدار کیلئے مقدر مضاف سے مل کر مفعول لہ بنا ہے یعنی مَخَافَةَ كِبَرِهِمْ یعنی ان کے مال کھانے میں جلدی کرتے ہیں تاکہ ان کے بڑے ہونے سے پہلے ان کا مال ختم کریں بلا ضرورت ان کا مال جلدی جلدی خرچ کرتے ہیں کہ وہ ہم سے بلوغت کے بعد مال یا حساب طلب نہ کریں اور یہ لَا تَاْكُلُوْا کی نہی میں داخل ہے۔ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ عفت اپنے آپ کو حرام سے بچاؤ اور فَلْيَسْتَعْفِفْ میں مبالغہ ہے یعنی حرام کے شبہات سے اپنے آپ کو بچاؤ سورۃ نور آیت 33 میں بھی اس طرح ہے وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ: فَقِيْرًا سے مراد وہ ہے جو نفقے کی کمائی کی طرف محتاج ہے تو اگر یہ اپنے لئے مستقل مزدوری کرتا ہے تو پھر یتیم کے مال کی حفاظت نہیں کر سکے گا لہذا یہ اپنا پورا وقت یتیم کے مال کی نگرانی اور دیکھ بھال میں صرف کرے گا اور اس کے عوض عرف کے مطابق اجرت لے گا۔ ابو داؤد کتاب الوصایا حدیث 2872 نسائی کتاب الوصایا حدیث 3698 احمد 186.2 کی روایت اس پر دلیل ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ میں یتیم بچوں کا کفیل ہوں اور میں فقیر مسکین آدمی ہوں میرا کوئی مال ومتاع نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس مال میں سے فضول خرچ نہیں کرنا اور ضرورت کے مطابق اس سے خرچ کرو اور جمع بھی نہیں کرنا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما، امام ابو العالیہؒ، اور امام شعبیؒ سے منقول ہے کہ ان کے جانوروں سے دودھ لینا اور سواری کرنا اور ان کے غلاموں سے فائدہ لینا درست ہے۔ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ: دفع عام ہے نقد مال ہو یا

ان پر خرچ کرنا ہو ان صورتوں میں گو وہ ضروری ہے بعض کے نزدیک مستحب اور بعض کے نزدیک فرض ہے فرضیت قرآن کے ظاہر سے ثابت ہے۔ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا اس جملے میں ہر منکر حق کیلئے وعید ہے۔ كَفٰى فعل ماضی ہے اور بِاللّٰهِ فاعل ہے (با) برائے تاکید ہے۔ ابو البقاء اور ابن عطیہ وغیرہ کا قول ہے کہ اس (با) کو اسلئے ذکر کیا ہے کہ امر پر دلیل بنے یعنی اِكْتَفُوْا بِاللّٰهِ۔ حَسِيْبًا مُحَاسِبٌ کے معنی میں ہے یعنی حساب لینے والا یا کافی کے معنی میں ہے۔ (اللباب)

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ ۪ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا۝ " مردوں کے لئے حصہ ہے اس میں سے جو ماں باپ چھوڑ جائے اور رشتہ دار چھوڑ جائے اور عورتوں کیلئے بھی حصہ ہے جو ماں باپ چھوڑ جائیں اور قرابت والے اس میں سے جو تھوڑا ہو یا زیادہ اس حال میں کہ یہ حصہ مقرر کیا ہوا ہے" [7]۔

تفسیر 7: اس سورت کے من جملہ احکامات میں سے اس آیت میں چھٹا حکم بیان ہو رہا ہے اور یہ حکم میراث سے متعلق ہے۔ ظلم دفع کرنے کے لئے۔ اور اسی طرح زمانہ جاہلیت کے رسومات میں سے ایک رسم کا رد کیا گیا۔ زمانہ جاہلیت والوں کی ایک بری رسم یہ تھی کہ جو لوگ لڑائیوں اور جنگوں میں حصہ نہیں لے سکتے تھے جیسے خواتین، معذور، بچے، ضعیف العمر لوگ وغیرہ ان کو میراث میں حصہ نہیں دیتے تھے لہٰذا اجمالی طور پر ان کا حصہ ذکر ہوا ہے۔ جن کی تفصیل بعد میں ذکر ہوگی۔ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ رِجَالٌ عام ہے۔ بالغ، نابالغ، معذور، صحت مند سب کو شامل ہے میراث کیلئے سبب ولادت یا قرابت ہے اور قرابت زوجیت کو بھی کہا جاتا ہے اسلئے الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ دونوں کو ذکر کیا ہے۔ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ اس میں بھی وہی عمومیت مراد ہے البتہ علت بھی ذکر ہے۔ ترکہ سے وہ مال مراد ہے جو مرنے والے نے چھوڑا ہے۔ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ۔ یہ جار و مجرور اصل میں نَصِيْبٌ کیلئے صفت ہے یا پھر مِمَّا تَرَكَ میں (مَا) سے بدل ہے۔ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا زجاج اور مکی کا قول ہے کہ یہ نَصِيْبٌ سے حال ہے یا "قَلَّ" کے هُوَ ضمیر فاعل سے حال ہے "فَرْض" کا اصلی معنی کاٹنے کے ہے کسی بھی یقینی چیز کو فرض اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ بھی شبہات کو ختم اور کاٹ دیتا ہے۔ یہ حصے انہیں دینا اللہ تعالیٰ نے فرض کر دیئے ہیں یعنی یہ حصہ ان کیلئے مقرر ہو چکا ہے جس کا ذکر بعد میں ہوگا اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر حصے کو دوسرے حصے سے الگ اور جدا کیا جا سکتا ہے۔ یا فرض تقدیر کے معنی میں ہے یعنی یہ سارے حصے قرآن یا احادیث یا اجماع امت کے ذریعے متعین اور مقرر کر دیئے گئے ہیں۔

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُمْ مِنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا ⑧

''اور جب حاضر ہو جائیں تقسیم کیلئے رشتے دار یتیم اور مساکین تو تم اس میں سے ان کو کچھ دو اور تم ان سے اچھی بات کہو، [8]۔

تفسیر 8: یہ ساتواں حکم ہے جس میں کمزور وارثوں سے ظلم کا ازالہ کیا گیا ہے۔ وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ۔ ''اَلْقِسْمَةَ'' اسم ہے جو اِقْتِسَام کے معنی میں ہے میراث تقسیم کرنا مراد ہے۔ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُمْ مِنْهُ. مِنْهُ کا ضمیر اَلْقِسْمَةَ کی طرف راجع ہے مال مقسوم کے معنی میں اور الف لام اس میں عہدی ہے جو سابقہ آیت میں لفظ نَصِيبٌ میں تقسیم کی طرف اشارہ تھا۔ اس آیت کے متعلق چار اقوال ہیں۔ (1) پہلا قول ابن عباس رضی اللہ عنہما اور متعدد تابعین کا ہے کہ اس سے مراد وہ افراد ہیں جو میراث میں حصہ دار تو نہیں البتہ تقسیم کے وقت حاضر ہوئے لہٰذا تمام وارثوں کی رضامندی سے ان کو کچھ حصے دے دیئے جائیں اور یہ حکم مستحب ہے واجب نہیں ہے اور یہ آیت منسوخ بھی نہیں ہے۔ قتادہؒ کا قول ہے کہ یہ حکم ثابت ہے لیکن اکثر لوگوں نے اس پر عمل چھوڑ رکھا ہے جبکہ یہ مستحب عمل ہے یہ قول امام بخاریؒ نے بھی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے دوسرا قول ایک روایت کے مطابق ابن عباس، ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم اور بعض تابعین رحمہم اللہ کا ہے کہ یہ حکم آیت میراث کے نزول سے پہلے واجب تھا لیکن میراث کی آیت کے نزول کے بعد یہ منسوخ ہوا۔ تیسرا قول سعید ابن المسیب اور ابن زید رحمہم اللہ سے منقول ہے کہ جب ایک انسان کی موت کا وقت قریب ہو اور وہ وصیت کرنا چاہتا ہو تو رشتہ داروں، مسکینوں اور یتیموں کے متعلق مناسب وصیت کرے اور مراد وہ لوگ ہیں جو میراث میں حصہ دار نہیں ہیں۔ یتیم پوتا یہ حکم بھی استحبابی ہے اور اگر واجب حکم تھا اور آیت میراث سے یہ بھی منسوخ مانا جائے گا۔ (قرطبیؒ)۔ چوتھا قول سعید بن جبیرؒ کا ہے کہ اس سے مراد وہ افراد ہیں جن کا میراث میں حصہ ہے لہٰذا ''الْيَتَامَىٰ'' ''وَالْمَسَاكِينُ'' ''أُولُوا الْقُرْبَىٰ'' کیلئے عطف تفسیری ہے۔ یعنی یہ لوگ ضرورت کی وجہ سے تقسیم میراث کا مطالبہ کرتے ہیں جبکہ فی الحال تقسیم میں مشکلات ہیں تو ان کو فی الحال کچھ مال دیا جائے جو بعد میں مکمل تقسیم کے وقت ان سے کاٹ لیا جائے گا اور اب ان کی ضرورت پوری ہو جائے گی لہٰذا یہ حکم ان کی ضرورت کی وجہ سے واجب ہے۔ اس قول کی طرف ابن عاشورؒ نے اشارہ کیا ہے اور ہمارے مشائخ اساتذہ نے اسے پسند کیا ہے۔ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا سابقہ اقوال کی بناء پر اس سے مراد یہ ہے کہ ان سے کہا جائے کہ اس مال میں تمہارا حصہ نہیں ہے لیکن صرف بطور صدقہ تمہیں دیتے ہیں۔ آخری قول کی بناء پر مراد یہ ہے کہ ضرورت کی وجہ سے یہ تھوڑا حصہ لے لو کچھ دنوں بعد مکمل تقسیم کر دینگے تو تمہیں

پورا حصہ مل جائے گا۔ مطلب یہ ہوا کہ مسکینوں اور یتیموں کو ناراض کرنا جائز نہیں ان کی ضروریات کو پورا کرنا چاہیے۔

وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۖ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ﴿٩﴾

"اور چاہیے کہ ڈریں وہ لوگ کہ اگر چھوڑ جائیں وہ اپنے پیچھے کمزور اولاد تو وہ کیسے خوف ان پر کھاتے ہونگے تو چاہیے کہ وہ اللہ سے ڈریں اور چاہیے کہ وہ سیدھی بات کہیں" [9]۔

تفسیر 9: گذشتہ آیات میں یتیم بچوں، بچیوں اور ناسمجھ افراد سے متعلق جو احکامات بیان ہوئے اس آیت میں ان احکامات پر عمل کی ترغیب دی جارہی ہے اور ساتھ میں "فَارْزُقُوْهُمْ" میں ذکر کردہ حکم کی تائید فرمارہے ہیں۔ وَلْيَخْشَ یہ امر غائب کا صیغہ ہے اور اس سے لام امر بغیر ضرورت شعری حذف نہیں ہوسکتا ہے یہ سیبویہ کا قول ہے۔ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ. الَّذِيْنَ اپنے موصول سمیت وَلْيَخْشَ کیلئے فاعل ہے جس کا مفعول مقدر ہے یعنی اَلظُّلْمَ عَلٰى اَوْلَادِ غَيْرِهٖ یعنی کسی غیر کی اولاد پر ظلم کرنا۔ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا یہ تَرَكُوْا کیلئے مفعول ہے مِنْ خَلْفِهِمْ میں اس کی موت کی طرف اشارہ ہے ذُرِّيَّةً میں بچے اور عورتیں وغیرہ شامل ہیں معنی اس کا گزر گیا ہے۔ ضِعٰفًا یہ قید برائے تاکید ہے یا پھر اگر ذُرِّيَّةً نسل انسانی کیلئے عام ہو تو پھر یہ قید احترازی ہے۔ خَافُوْا عَلَيْهِمْ. اس خَافُوْا کا مفعول مقدر ہے یعنی ظُلْمَ النَّاسِ عَلَيْهِمْ لوگوں کے ان کے اولاد پر ظلم کرنا اور یہ جملہ ذُرِّيَّةً کیلئے حال یا صفت ہے۔ حرف لَوْ کی جزاء مقدر ہے یعنی ان پر ناراض ہوتے ہیں۔ یا "خَافُوْا" جزاء ہے ماقبل "لَوْ تَرَكُوْا" کے لیے لام مقدر کے ساتھ یعنی لَخَافُوْا عَلَيْهِمْ. اس آیت کی تفسیر میں چار اقوال ہیں۔ پہلا قول یہ آیت یتیم بچوں کے اولیاء یا کفالت کرنے والوں کے لیے وعظ ونصیحت ہے کہ ان یتیموں کے ساتھ وہ برتاؤ کرو جو اپنے مرنے کے بعد اپنے بچوں کے ساتھ پسند کرتے ہو یعنی ان پر ظلم مت کرو۔ بعد والی آیت بھی اس پر دلیل ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ تمام انسانیت کو خطاب ہے کہ یتیموں اور دوسرے کی اولاد پر ظلم مت کرو جیسا کہ تم اپنی اولاد پر ظلم پسند اور برداشت نہیں کروگے یعنی جب کوئی اپنی اولاد کے لیے امن چاہتا ہے تو وہ دوسروں کی اولاد پر بھی ظلم نہ کرے کیونکہ عموماً ظلم کی سزا دنیا میں ملتی ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو مرنے کے قریب ہو یعنی نزع کی حالت میں ہو یعنی اٰثَارُ الْمَوْتِ بعض ناسمجھ حاضرین اسے پورا مال وصیت کرنے کا کہتے ہیں یا پورا مال صدقہ کرنے کا کہتے ہیں یا اسے کہتے ہیں کہ اپنی آخرت کا فکر کریں اور اولاد کی فکر چھوڑیں انہیں اللہ تعالیٰ پالیں گے یہ مرنے والا ان حاضرین کی باتوں میں آکر اپنا پورا مال یا اکثر مال خیرات کردیتا ہے یا پورے مال کی

وصیت کر دیتا ہے آیت میں ایسے لوگوں سے خطاب ہے کہ جیسے تم لوگ اپنی اولاد کے بارے میں ڈرتے ہوں اوران سے ساتھ نرمی کا معاملہ کرتے ہوں ایسے ہی دوسروں کی اولاد کے ساتھ بھی رویہ رکھو۔ چوتھا قول یا سابقہ قول کے برعکس ہے یعنی وصیت کرنے سے منع کیا جاتا ہے جب وہ اپنے رشتہ دار غیر وارثوں کے لیے وصیت کرنا چاہتا ہے، آیت کا حکم ان سب کیلئے ہے۔ فَلْيَتَّقُوا اللهَ جب دلیل کے ساتھ خشیت کا حکم ثابت ہوا تو اب اُس پر تقویٰ کی تفریع ہو رہی ہے۔ خشیت قلبی سے کامل تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا یہ حکم عام ہے وصی کفیل کو خطاب ہے کہ یتیم کو اپنی اولاد کی طرح اچھے آداب سکھاؤ۔ حاضرین کو بھی خطاب ہے کہ مریض سے کہو کہ حقوق واجبہ میں کمی مت کرنا اور مناسب شرعی وصیت کرو۔ نیز اس کو لا الہ الا اللہ کی تلقین کرو البتہ اس کو حکم نہ دو اور وصیت کرنے والا تیسرے حصے سے زیادہ وصیت نہ کرے اور رشتہ داروں کو فقیر چھوڑ کر نہ جائے کہ بعد میں وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلائیں حدیث میں اس طرح مذکور ہے۔ صحیح بخاری کتاب الفرائض حدیث 6733 میں سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا واقعہ اس پر دلیل ہے عام مسلمان بھی یتیم کو سخت غصہ اور بداخلاقی والی بات نہ کریں۔ سَدِيدًا وہ قول اور فعل جو حق اور انصاف پر مبنی ہو اور شریعت کے موافق ہو۔

إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ﴿١٠﴾

"یقیناً وہ لوگ جو یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے ہیں تو بلاشبہ وہ پیٹوں میں آگ ڈالتے ہیں عنقریب وہ دہکتی ہوئی آگ میں داخل ہونگے" [10]۔

تفسیر 10: اس آیت میں تخویف اُخروی ہے یعنی ان لوگوں کو آخرت سے ڈرانا مقصود ہے۔ اس آیت کے ماقبل پر عطف کے بغیر حرف إِنَّ کے ساتھ اس لئے ذکر فرمایا کیونکہ یہ آیت ماقبل ذکر کردہ دو احکام یعنی یتیموں کو ان کے مال دینا اور ان کو اچھی باتوں کی تلقین کرنے کے لئے علت ہے (یعنی یہ گزشتہ دو کام اس لئے ذکر کیئے کیونکہ جو لوگ یتیم کا مال کھاتے ہیں ناحق وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھر رہے ہیں) إِنَّ الَّذِينَ اس کو عطف کے بغیر إِنَّ سے شروع کیا ہے۔ اسلئے کہ اس میں ان کے رزق اور ان کیلئے سیدھی بات یعنی قول سدید کا وجوب مذکور ہے اور یہ عام ہے وہ کفیل اور وصی جو یتیموں کے مال ضائع کرتے ہیں یا وہ لوگ جو یتیموں کو میراث سے محروم کرتے ہیں یا وہ لوگ جو غیر شرعی طریقوں سے یتیموں کا مال خرچ کرتے ہیں یعنی تیجہ، ساتواں، چہلم، سالگرہ، حیلہ اسقاط وغیرہ میں ضائع کرتے ہیں ان سب کو شامل ہے یعنی آیت میں ان تمام منکرات سے منع فرمایا۔ يَأْكُلُونَ اس سے یا تو کھانا مراد ہے یا ہر اعتبار سے ضائع کرنا مراد ہے۔ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ

ظُلْمًا لفظ ظُلْمًا حال ہے یا تمیز ہے یا مفعول مطلق ہے جس کا موصوف مقدر ہے یعنی اَكْلًا ظُلْمًا یہ قید اسلئے لگائی کہ کبھی کبھار یتیم کا مال ولی مزدوری کے طور اور نفقہ کے طور پر کھا سکتا ہے یعنی اجرت وغیرہ میں۔ اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا فِيْ بُطُوْنِهِمْ میں کثرت سے کھانے کی طرف اشارہ ہے یعنی پیٹ بھرتا ہے۔ نیز اس لفظ میں ان کی بہت قباحت کی طرف اشارہ ہے۔ نَارًا اس سے جہنم کی آگ مراد ہے یعنی ذکر مسبب کا ہو رہا ہے اور مراد سبب ہے یعنی حرام۔ یا اس سے مراد دنیا کے مصائب بیماریاں درد وغیرہ ہیں جو حرام مال سے پیدا ہوتے ہیں یا مراد حقیقت میں آگ ہے کہ وہ جہنم میں آگ کھائیں گے اس بارے میں ابن جریر نے ابو سعید خدری کی روایت نقل کی ہے جو اس پر واضح دلیل ہے۔ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا : جب سابقہ کلام میں آگ مراد لی جائے تو یہ جملہ اس کے لیے بطریقہ تفسیر ہے اور اس سے اگر دنیا کی مصیبتیں وغیرہ مراد لی جائیں تو پھر اس میں دنیاوی عذاب کے بعد اخروی عذاب کا ذکر ہے۔ صلي میں دلیل ہے کہ آگ میں جلنے کیلئے داخل ہونگے۔ سَعِيْر شعلوں والی آگ کو کہا جاتا ہے لہٰذا سَعِيْر بمعنی سَعُوْر ہے۔

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۤ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَاۗءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۭ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿11﴾

"تمہیں اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے مرد کیلئے مثل دو عورتوں کے حصے کے برابر حصہ ہے پھر اگر دو عورتیں یا دو سے زیادہ ہوں تو ان کیلئے ان میں سے جو وہ چھوڑ جائے دو تہائی ہے اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کیلئے آدھا ہے اور اس کے ماں باپ میں سے ہر ایک کیلئے چھٹا حصہ ہے اس میں سے جو وہ چھوڑ گیا اگر اس کی اولاد ہے پھر اگر نہ ہو اس کی اولاد اور اس کے وارث اس کے ماں باپ ہی ہوں تو اس کی ماں کیلئے تیسرا حصہ ہے پھر اگر اس کے ایک سے زیادہ بہن بھائی ہوں تو اس کی ماں کا چھٹا حصہ ہے وصیت کے بعد کہ وہ وصیت کر جائے اس کی یا قرض کے بعد، تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے تم نہیں جانتے ہو کون ان میں سے نفع کے اعتبار سے تمہارے قریب ہے یہ حصہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیا اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا بڑی حکمت والا ہے" [11]۔

تفسیر 11: اس آیت میں آٹھواں حکم ہے اور اس آیت میں ان تمام حصوں کا ذکر ہے جو اجمالی طور پر لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ میں بیان ہوئے تھے اور اس میں زمانہ جاہلیت والوں کا رد ہے کیونکہ وہ معذوروں، بچوں اور عورتوں کو حصہ نہیں دیتے تھے۔ يُوصِيكُمُ اللهُ. قفال نے کہا ہے کہ ایصاء اصل میں پہنچانے کو کہا جاتا ہے اور زجاج نے کہا کہ ایصاء یہاں پر فرض کے معنی میں ہے۔ ابن عاشورؒ نے فرمایا کہ ایصاء کا معنی ہے ایسی چیز کا حکم دینا جسمیں مامور (جس کو حکم کیا جارہا ہے) اس کے لئے بھلائی ہو اور حکم دینے والے کی طرف سے اس حکم کا باقاعدہ اہتمام کیا گیا ہو۔ امام ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ معنی یہ ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ عدل کا حکم دیتا ہے۔ وصیت اس حکم کو کہا جاتا ہے جو کسی اور حکم سے منسوخ نہ ہو لہٰذا اس سے حکم میں تاکید کی طرف اشارہ ہے اس سے ثابت ہوا کہ مسئلہ میراث ایک اہم مسئلہ ہے تو ثابت ہوا کہ مسئلہ میراث میں یہ اہتمام کیلئے تاکید ہے۔

فائدہ 1: امام ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ یہ دونوں آیتیں اور اس سورۃ کی آخری آیت تینوں علم میراث سے متعلق ہیں اور احکام میراث ان آیتوں سے ماخوذ ہیں اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تفسیر و توضیح ہے اور علم میراث سیکھنے میں احادیث وارد ہیں۔ امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ آیت احکام دین کے ستونوں میں سے ایک ستون اور ارکان میں سے رکن اور ام الآیات ہے اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ علم میراث کل علم دین کا تیسرا حصہ ہے بلکہ آدھا علم ہے البتہ یہ علم سب سے پہلے لوگوں سے اُٹھایا جائیگا۔ فائدہ 2: میراث کیلئے شرعی طور پر تین اسباب ہیں۔ (1) نسبت تولد یعنی اولاد اور والدین۔ (2) نسبت زوجیت یعنی میاں بیوی۔ (3) اخوت کی نسبت یعنی بہن بھائی۔ پہلا اور دوسرا سبب ان دونوں آیتوں میں مذکور ہے جبکہ تیسرا اس دوسری آیت کے آخر میں اور سورۃ کے آخر میں ذکر ہے۔ پہلی آیت میں چھ مسائل ذکر ہیں جو والدین اور اولاد سے متعلق ہیں۔ دوسری آیت میں زوجیت کے تعلق سے چار مسائل جبکہ اخیافی بہن بھائی کی حیثیت سے پانچ مسائل مذکور ہیں۔ ورثاء کی تین قسمیں ہیں۔ (1) ذوی الفروض۔ (2) عصبہ۔ (3) ذوی الارحام۔ آخری قسم کی میراث میں اختلاف پایا جاتا ہے ذوی الفروض وہ لوگ ہیں جن کے حصے قرآن کریم، احادیث نبوی اور اجماع سے ثابت ہوئے ہیں اور یہ چھ حصے ہیں۔ (1) آدھا مال، (2) چوتھائی مال، (3) آٹھواں حصہ، (4) دو تہائی مال، (5) تین میں سے تیسرا حصہ، (6) چھ میں سے چھٹا حصہ۔ ذوی الفروض دو قسم کے لوگ ہیں مرد و خواتین۔ مردوں میں دس قسم کے لوگ ہیں (1) بیٹا، (2) پوتا۔ اس کے نیچے بھی حصہ دار ہوسکتے ہیں یعنی پڑپوتا وغیرہ۔ (3) والد، (4) دادا، پردادا وغیرہ اس میں شامل ہیں۔ (5) بھائی، (6) بھتیجا، (7) چچا، (8) چچا زاد بھائی، (9) شوہر، (10) مولیٰ یعنی غلام کو جس نے آزاد کیا ہے۔ خواتین کی سات قسمیں ہیں۔ (1) بیٹی،

(2)پوتی، پڑ پوتی اس میں داخل ہیں۔ (3)ماں، (4)دادی پردادی اس میں داخل ہے۔ (5)بہن، (6)بیوی اور (7)مولاۃ یعنی لونڈی آزاد کرنے والی۔ عصبہ وہ وارث ہے کہ ان کے حصے مقرر نہیں البتہ ذوی الفرائض سے جو مال بچ جائے وہ انکا حق ہوتا ہے نیز ادائیگی اور وصیت شرعی پورا کرنے کے بعد میراث کی تقسیم ہوگی۔ اگر ذوی الفروض موجود ہوں تو پہلے ان کے حصے نکالیں گے جو بچ جائے اس کو عصبہ میں تقسیم کرینگے۔ عصبہ کا حق قرآن مجید کے سکوت اور احادیث سے صراحتاً ثابت ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ذوی الفروض کو ان کا حق پہنچاؤ اور بقایا اس شخص کو دیدو جو میت کا قریبی رشتہ دار ہو۔ صحیح بخاری کتاب الفرائض حدیث 6735۔ فائدہ 3: يُوصِيكُمُ یہ خطاب اگرچہ عام ہے مگر احادیث کے ذریعے سے اس کی تخصیص کی گئی ہے: (1) وراثت کافر کو نہیں دی جائیگی۔ صحیح بخاری میں حدیث ہے لَا يَرِثُ الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ (2) غلام، آزاد کا وارث نہیں ہوسکتا۔ (3) قاتل اپنے حق وراثت سے محروم ہوگا۔ (4) انبیاء کرام کی میراث تقسیم نہیں ہوتی ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ نَحْنُ مَعْشَرَ الْأَنْبِيَاءِ لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ صحیح بخاری کتاب الفرائض حدیث 6730،4034 ہم انبیاء کی جماعت کی میراث نہیں ہوتی ہم جو چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ یہ حدیث سترہ (17) صحابہ کرام سے نقل ہے جو کہ حدیث متواتر ہے۔ یہ مسئلہ اہل تشیع کی کتب میں بھی موجود ہے مثلاً ابن ابی الحدید کی شرح نہج البلاغۃ میں لکھا ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث فاطمہ رضی اللہ عنہا کے سامنے پیش کی تو وہ راضی ہوئی۔
سوال: حدیث میں ہے کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ناراض ہوئی تھی اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے موت تک بات نہیں کی؟
جواب: امام بیہقی اور علامہ عینی نے عمدۃ القاری اور ابن حجر نے فتح الباری میں ذکر کیا ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر پر آئے تھے یہاں تک کہ وہ راضی ہوئی۔ ابن کثیرؒ نے البدایۃ والنہایۃ میں بھی لکھا ہے جلد 5 ص289۔ بات نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس نے میراث سے متعلق ابوبکر سے موت تک بات نہیں کی اسلئے کہ وہ حدیث سننے پر مطمئن ہوئی۔ اس مکمل بحث کو فتح الباری کتاب فرض الخمس حدیث 3093 میں ملاحظہ کیجئے (مترجم) فِيْ أَوْلَادِكُمْ: اولاد کی میراث سے اسلئے شروع کیا کہ اولاد سے انسان کا تعلق مقدم اور زیادہ ہوتا ہے اور یہاں پر مضاف مقدر ہے یعنی فِيْ إِرْثِ أَوْلَادِكُمْ اور ارث عام ہے خواہ اولاد اپنے والدین سے مال وراثت حاصل کریں یا والدین اپنی اولاد کے وارث بنے۔ اولاد کی دو حالتیں ہیں۔ حالت انفرادی یعنی اکیلے ہوں یا حالت اجتماعی ہو یعنی اور بھی افراد ساتھ ہوں اور انفرادی حالات تین قسم کے ہیں۔ مؤنث و مذکر دونوں ہونگے اس کو لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ کے الفاظ

کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ یا صرف مؤنث اولاد ہوں گی تو ان کو بعد والے جملے میں ذکر کیا اور جب صرف مذکر ہو تو ان کا حصہ صراحتاً ذکر نہیں کیا کیونکہ عصبہ ہونے کی وجہ سے یہ کل مال کے وارث ہوں گے۔ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ یہ پہلا مسئلہ ہے جس کی دو صورتیں ہیں۔ (1) کوئی مرد یا عورت فوت ہو جائے اور ایک بیٹا اور ایک بیٹی رہ جائے تو مال کو تین حصوں میں تقسیم کر کے دو حصے بیٹے اور ایک حصہ بیٹی کو دیا جائیگا۔ (2) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک بیٹا اور دو بیٹیاں رہ گئی ہیں تو مال کو دو حصوں میں بانٹ کر ایک حصہ بیٹے اور بقایا ایک حصہ بیٹیوں میں برابر تقسیم کیا جائیگا۔ سوال: اس طرح کیوں نہیں فرمایا کہ لِلْأُنْثَيَيْنِ مِثْلُ حَظِّ الذَّكَرِ یا لِلْأُنْثَى مِثْلُ نِصْفِ حَظِّ الذَّكَرِ؟ جواب: اس لیے کہ آیت میں مرد کی عورت پر فضیلت پہ صراحت ہے۔ نیز زمانہ جاہلیت کی رسم کی وجہ سے مذکر سارے مال کی اُمید رکھتا کہ سارا مال میرا ہوگا تو فرمایا کہ سارا مال تمہارا حق نہیں ہے بلکہ خواتین بھی تمہارے ساتھ شریک ہیں۔ سوال: خواتین کمزور مخلوق ہے ان کے لیے مردوں کے حصے کے آدھا حصہ کیوں مقرر کیا؟ جواب: مذکر پر بیوی، بہن اور بیٹی کے حقوق ہیں جبکہ خاتون پر ایسا نہیں ہے۔ فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ: كُنَّ ضمیر خواتین کی طرف راجع ہے جو أَوْلَادِكُمْ کے ضمن میں داخل ہے یا "مَتْرُوكَاتٌ" یعنی چھوڑے گئے کی طرف راجع ہے۔ اس میں دوسرے مسئلے کا ذکر ہے یعنی جب ورثاء صرف خواتین ہوں نرینہ وارث نہ ہو۔ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ: سارے مال کو تین حصے بنا کر دو حصہ ان خواتین میں برابر تقسیم کئے جائیں اور ایک حصہ عصبہ کو دیا جائیگا وہ کوئی بھی ہو۔ وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ: یہ تیسرا مسئلہ ہے صرف ایک بیٹی ہو اور بھائی مذکر ساتھ نہ ہو تو سارے مال کو دو حصے بنا کر ایک حصہ بیٹی کو دیا جائیگا اور باقی مال عصبہ میں تقسیم ہوگا۔ سوال: اس میں دو بیٹیوں کے حصے کا ذکر نہیں ہے تو انکا حصہ کس طرح ہے؟ جواب: دو بیٹیوں کا حصہ دو طریقے سے معلوم ہوا۔ (1) پہلا طریقہ یہ ہے کہ جب ایک بہن کو بھائی کے ساتھ ثلث تیسرا حصہ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ کی دلیل سے ملتا ہے تو لامحالہ ایک بیٹی کو دوسری بیٹی کی (معیت) ساتھ ہونے کی وجہ سے بھی ثُلُثٌ ملنا چاہیے۔ دوسرا طریقہ قیاسی ہے یعنی جب دو بہنوں کو بھائی کی میراث میں دو تہائی مال ملتا ہے جیسا کہ اس سورۃ کے آخر میں ہے تو بیٹیاں تو بہنوں کی بنسبت میت کے زیادہ قریب ہوتی ہیں ان کو بھی اتنا حصہ دینا چاہیے۔ سوال: لفظ فَوْقَ ذکر کرنے میں کیا فائدہ ہے؟ جواب: اس میں ایک اشکال کو ختم کرنا مقصود ہے یعنی اگر کہا جائے کہ دو بیٹیوں کیلئے اگر دو تہائی مال ہے تو تین کیلئے تینوں ثُلُثَيْنِ یعنی کل مال ہوگا تو اس اشکال کو ختم کرتے ہوئے فرمایا کہ دو سے زیادہ بھی ہوں تو ان کو دو ثلث ملے گا جو ان پر

برابر تقسیم ہوگا۔ سوال: اس سورۃ کے آخر میں ایسا کیوں نہیں فرمایا؟ جواب: جب بیٹی کا حق بہن کی نسبت زیادہ ہے تو شبہ پیدا ہو رہا تھا کہ دو سے زیادہ بیٹیاں ہونے کی صورت میں ان کو زیادہ حصہ دیا جائے گا جبکہ بہنوں کے متعلق وہم پیدا نہیں ہوتا۔ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِن كَانَ لَهُ وَلَدٌ ماں باپ سے میراث لینے کے بعد اب ماں باپ کا اولاد سے میراث لینے کے مسائل کا ذکر ہے۔ یہ چوتھا مسئلہ ہے یعنی ایک شخص فوت ہوا اور وارثوں میں ماں باپ اور اولاد ہوں تو ماں باپ میں سے ہر ایک کیلئے چھٹا حصہ ہے اور اگر مذکر یعنی نرینہ اولاد ہوں تو بقایا کل مال اس کا ہے اگر نرینہ و زنانہ دونوں قسم کی اولاد موجود ہو تو لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ کے قاعدے کے مطابق بقیہ مال تقسیم ہوگا اور اگر صرف مونث اولاد ہو تو اگر ایک ہی بیٹی ہے تو اس کیلئے کل مال میں سے آدھا حصہ ہے اور اگر دو بیٹیاں یا زیادہ ہوں تو دو تہائی مال ان کو دیا جائیگا جیسا کہ گزر گیا ہے اور بقایا بچا ہوا مال عصبہ ہونے کی وجہ سے باپ کو دیا جائیگا۔ ترکیب اس طرح سے ہے وَلِأَبَوَيْهِ خبر مقدم مبدل منہ ہے اور لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا اس سے بدل ہے اور السُّدُسُ مبتداء ہے اور أَبَوَيْهِ کی ضمیر اس میت کی طرف راجع ہے جس پر تَرَكَ دلیل ہے نیز لفظ أَبَوَيْهِ میں تغلیب ہے جو کہ اصل میں لِلْأَبِ وَلِلْأُمِّ تھا۔ لِكُلِّ وَاحِدٍ: بدل لانے میں فائدہ یہ ہے کہ معلوم ہو جائے کہ السُّدُسُ میں دونوں شریک نہیں ہیں بلکہ ہر ایک کیلئے الگ الگ سدس ہے دونوں کے لیے الگ الگ حصہ۔ سوال: اس حالت میں ماں باپ کو برابر کا حصہ کیوں دیا ہے؟ جواب: اولاد کیلئے جس طرح باپ مشقت برداشت کرتا ہے، کھانا پینا، لباس اور دیگر ضروریات پوری کرتا ہے تو اسی طرح ماں بھی حمل کے وقت پیدائش اور رضاعت کے وقت میں بہت مشقتیں اٹھاتی ہے تو اسلئے دونوں کو برابر کا حصہ دیا ہے۔ وَلَدٌ اس سے سگا بیٹا اور بیٹی مراد ہے جب یہ دونوں نہ ہوں تو پھر پوتا اس میں داخل ہے عموم مجاز یا عموم مشترک کے طریقے پر عموم میں علماء کے یہی دو اقوال ہیں۔ فَإِن لَّمْ يَكُن لَّهُ وَلَدٌ یعنی اگر میت کے اولاد نہ ہوں اولاد سے مراد میت کے بیٹے، بیٹیاں، پوتے، پوتیاں ہیں یعنی اگر ان میں سے کوئی ایک نہ ہو۔ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ اس قید لگانے کی وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات ماں باپ میراث سے قاتل ہونے، کافر ہونے یا غلام ہونے کی وجہ سے محروم ہوتے ہیں۔ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ یہ پانچواں مسئلہ ہے یہاں باپ کا حصہ ذکر نہیں ہوا وجہ یہ ہے کہ دو ثلث باقی ہیں وہ سارا مال عصبہ ہونے کی حیثیت سے اس کا حق ہے۔ فَإِن كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ: یہ چھٹا مسئلہ اور فَإِن لَّمْ يَكُن لَّهُ وَلَدٌ کے تحت ہے یعنی اولاد نہ ہو صرف ماں باپ اور ان کے ساتھ میت کے بھائی ہوں۔ یاد رہے میراث کے عنوان میں دو بھی جمع کے حکم میں ہوتے ہیں لہذا دو

بھائی ہوں یا زیادہ سب کیلئے ہے۔ حقیقی بھائی یعنی ماں، باپ شریک ہوں، یا باپ شریک ہو ماں الگ اسی طرح ماں شریک بھائی سب کو شامل ہے (قرطبی)۔ ان بھائیوں کے موجود ہونے سے والدہ ثلث تیسرے حصے سے محروم ہو کر چھٹے حصے کی حقدار بن گئی۔ علم میراث کی اصطلاح میں اس قسم کو "حجب نقصان" کہتے ہیں۔ بھائیوں کے اس حصے میں اختلاف ہے۔ جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ والد کی موجودگی میں یہ محروم ہیں تاہم والدہ کا حصہ تہائی سے کم کرتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول یہ ہے کہ ان کیلئے بھی سدس چھٹا حصہ ہے جو کہ ماں کے حصے سے کم کیا گیا ہے اور صرف بہنوں کی میراث میں بھی اختلاف ہے جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ بہنیں والدہ کا (حجب) نقصان کر سکتی ہیں جبکہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا موقف ہے کہ والدہ کی حجب نہیں کر سکتی ہیں اور جمہور کے نزدیک جب ماں چھٹا حصہ لے جاتی ہے تو بقایا پانچ حصے والد لے گا۔ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ: امام زمخشریؒ کا قول ہے کہ یہ سابقہ تقسیم سے متعلق ہے یعنی ان حصوں کی تقسیم قرض اور وصیت پورا کرنے کے بعد ہے۔ امام ابو حیانؒ کا قول ہے کہ یہاں پر مضاف مقدر ہے یعنی ان حصوں کے وہ حقدار ہیں مگر وصیت کے بعد یعنی تَنْفِيْذِ وَصِيَّةٍ وصیت جاری کرنا۔ يُوْصِيْ ضمیر میت کی طرف راجع ہے اور دَيْنٍ میں بھی مضاف مقدر ہے یعنی اِدَاءِ دَيْنٍ۔ صاحب اللباب نے ابو البقاءؒ سے نقل کیا ہے کہ (اَوْ) کا مطلب ہے کہ دونوں چیزوں میں سے ایک مراد ہے اور ترتیب کا فائدہ نہیں دیتا یعنی دونوں چیزیں (قرض اور وصیت) ہوں یا دونوں میں سے ایک چیز ہو تقسیم میراث سے پہلے ہوں گے۔ وصیت کو تیسرے حصے سے پورا کیا جائیگا اور قرض کل مال سے ادا کیا جائیگا پھر ورثاء میں مال تقسیم ہوگا۔ سوال: دلائل شریعہ سے ثابت ہے کہ ادائیگی قرض وصیت پر مقدم ہے تو یہاں پر کیوں وصیت کو قرض پر مقدم کیا ہے؟ جواب: وصیت میراث کی طرح بغیر بدلے کی چیز ہے اسلئے وارثوں کیلئے اس پر عمل مشکل ہے اسلئے اس کو مقدم کیا ہے اور جس کیلئے وصیت کی گئی ہے وہ بھی جبراً مطالبہ نہیں کر سکتا ہے۔ قرض کا معاملہ اس کے برعکس ہے کیونکہ وہ قرض خواہ طلب بھی کرتا ہے اور ورثاء پر بھی بھاری نہیں ہے اس لئے وصیت کو اہتمام کی وجہ سے قرض پر مقدم کر دیا گیا۔

اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا: ذکر کی گئی تقسیم کیلئے یہ علت ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے میراث کی تقسیم تمہاری عقلوں پر نہیں چھوڑی ہے کیونکہ تمہاری عقلیں تمام مصلحتوں کا احاطہ نہیں کر سکتیں کبھی نفع کو ضرر اور ضرر کو نفع قرار دیتے ہو جبکہ اللہ تعالیٰ تمام مغیبات کا علم رکھتا ہے اسلئے اللہ تعالیٰ نے ان حصوں کی تقسیم و تقدیر اپنے علم سے کی یا پھر یہ جملہ وصیت کے متعلق ہے کہ کبھی تو وصیت ماں باپ کیلئے اور کبھی اولاد کیلئے مفید ہوتی ہے۔ لیکن پہلا قول بہتر ہے اور ابن

عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ یہ آخرت سے متعلق ہے اور نفع سے اولاد کی والدین اور والدین کی اولاد کیلئے شفاعت مراد ہے۔ مجاہد اور ابن سیرینؒ سے منقول ہے کہ یہ دنیاوی حیات سے متعلق ہے یعنی والدین اولاد سے بہت شفقت کرتے ہیں اور اولاد والدین کی اطاعت فرمانبرداری کرتے ہیں۔ اس میں بہتر پہلو یہ ہے کہ دنیا و آخرت دونوں سے متعلق ہے۔ امام قرطبیؒ نے فرمایا کبھی تو اولاد کی دعاؤں سے والدین بلند مقام حاصل کر لیتے ہیں تو کبھی ماں باپ کی دعاؤں سے اولاد بلند مقام تک جا پہنچتی ہیں۔ امام ابو حیانؒ کا قول ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ مورث کی موت کی تمنا مت کرو۔ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ یہ يُوصِيكُمُ یہ مفعول مطلق ہے يُوصِيكُمُ کے محل کے لیے کیونکہ یہاں "يُوصِيكُمُ" "يَفْرِضُ" کے معنی میں ہے یا یہ فعل مقدر کے لیے مفعول مطلق ہے تقدیری عبارت ہوگی "فَرَضَ اللَّهُ فَرِيضَةً" اس میں اشارہ ہے کہ بیان کردہ مذکورہ مقادیر حصے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض ہیں لہٰذا ان کو جاری اور منعقد کرنا ضروری ہے۔ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا اس میں بھی اشارہ ہے کہ مذکورہ تقسیم اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت پر مبنی ہے لہٰذا اس کی مخالفت مت کرو۔

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِن كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِن كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُم مِّن بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ وَإِن كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِن كَانُوا أَكْثَرَ مِن ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ ۚ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ﴿١٢﴾ "تمہاری بیویاں جو کچھ چھوڑ جائیں اور ان کی اولاد نہ ہو تو تمہارے لئے آدھا مال ہے اور اگر ان کی اولاد ہو تو تمہارے لئے اس میں چوتھائی حصہ ہے۔ اس وصیت کی ادائیگی کے بعد جو وہ کر گئی ہوں یا کوئی قرض ہو تو اس کے بعد اور جو تم چھوڑ جاؤ گے ان کیلئے چوتھائی حصہ ہے بشرطیکہ تمہاری اولاد نہ ہو اور اگر تمہاری اولاد ہو تو پھر ان کیلئے آٹھواں حصہ ہے اس وصیت کے بعد جو تم کر گئے ہو یا قرض کی ادائیگی کے بعد۔ اور جن کی میراث لی جاتی ہے وہ کلالہ ہو خواہ مرد ہو یا عورت (جس کا باپ بیٹا نہ ہو) اور اس کا بھائی یا ایک بہن ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے اور اگر بہن بھائی زیادہ ہوں تو پھر سب ایک ثلث ایک تہائی میں شریک ہیں اس وصیت کے بعد جو کی جائے اور قرض کے بعد جبکہ اس وصیت میں اوروں کا نقصان نہ کیا گیا ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی

طرف سے مضبوط حکم ہے اور اللہ تعالیٰ علم اور صبر والا ہے'' [12]۔

تفسیر 12: اس آیت میں سبب نکاح سے جو میراث حاصل ہوتا ہے اس کا ذکر ہو رہا ہے جبکہ سابقہ آیت میں نسبی میراث کے حصے مذکور تھے چونکہ نسبی میراث مقدم ہے سببی میراث پر اسلئے ذکر کرنے میں بھی اس کا لحاظ کیا گیا اور جس طرح نسبی میراث میں مرد (نر) کو دوگنا حصہ دیا گیا ہے بمقابل خاتون (زنانہ) کے تو یہی معاملہ میراث سببیہ میں بھی ہوا ہے کہ خاوند کو بیوی کے مقابل زیادہ حصہ دیا ہے۔ وراثت سببی میں چار مسئلے ذکر ہیں:

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ۔ (1) یہ پہلا مسئلہ ہے اور خطاب مردوں سے ہے۔ ازواج سے بیویاں مراد ہیں یعنی جب بیوی فوت ہو جائے اور موجودہ شوہر یا دوسرے شوہر سے اس کی اولاد نہ ہو تو شوہر کو آدھا مال لینے کا حق حاصل ہے۔ اور ''ولد'' بیٹا بیٹی یا پوتا پوتی مذکر و مؤنث نرینہ و زنانہ سب کو شامل ہے۔

فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ۔ (2) یہ دوسرا مسئلہ ہے یعنی بیوی فوت ہوئی اور شوہر زندہ ہو تو اولاد کی موجودگی میں شوہر کا چوتھا حصہ ہے اولاد اس شوہر سے ہو یا دوسرے سے ہو اولاد کے حصوں کا ذکر گزشتہ آیت میں کیا گیا ہے۔ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ اس کی تفسیر گزر گئی ہے البتہ اس میں یہ مسئلہ واضح ہوا ہے کہ بیوی کو اپنے ذاتی مال میں اختیارات حاصل ہیں شوہر کی اجازت کی پابند نہیں ہے۔ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ (1) یہ تیسرا مسئلہ ہے یعنی شوہر فوت ہوا لیکن اس کی اولاد نہ اس بیوی سے اور نہ ہی اور بیویوں سے ہیں تو بیوی کو چوتھا حصہ دیا جائیگا۔ سابقہ آیت میں مردوں سے خطاب کیا گیا جبکہ یہاں خواتین سے خطاب نہیں کیا گیا بلکہ ان کو غائب کی ضمیر سے ذکر کیا گیا۔ اس میں تعلیم کے ادب کی طرف اشارہ ہے خواتین کو مخاطب کے بجائے غائب ہی رکھا جائے یعنی ان کیلئے پردہ نشینی میں ہی خیر ہے اور یہ حکم شرعی ہے۔ تَرَكْتُمْ میں مردوں کو مرنے کے بعد مجازی خطاب ہے۔ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ (2) یہ چوتھا مسئلہ ہے یعنی شوہر فوت ہوا اور وارثوں میں سے ایک یا ایک سے زیادہ بیویاں ہیں اور اولاد بھی ہے تو بیوی یا بیویوں کیلئے آٹھواں حصہ ہے جو سب کے درمیان برابر تقسیم ہوگا اور اولاد کے حصوں کا ذکر گزشتہ آیت میں کیا گیا ہے۔ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ہر تقسیم کے بعد اس جملے کو ذکر کیا ہے جو قرض اور وصیت کیلئے بطور تاکید ہے۔ وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّورَثُ كَلَالَةً ان جملوں میں اخیافی بہن بھائیوں کی میراث اور حصوں کا ذکر ہے البتہ میراث میں حقداری کیلئے لازم ہے کہ اخوت کے سبب کے ساتھ ساتھ وہ (مورث) کلالہ بھی ہو (جس کا باپ بیٹا نہ ہو)

نوٹ: بہنوں اور بھائیوں کی تین قسمیں ہیں۔ (1) اعیانی سگے جن کے ماں باپ ایک ہی ہوں۔ (2) علاتی باپ ایک ہے مگر مائیں الگ الگ ہیں یعنی سوتیلے ہیں ان دونوں کے حصے سورۃ کے آخر میں ذکر ہیں۔ (3) اخیافی ماں ایک ہو مگر والد میں اکٹھے نہ ہوں بلکہ سوتیلے ہوں یعنی صرف ماں شریک بہن بھائی ہوں ان جملوں میں ان کا ذکر ہے۔ ان کے متعلق پانچ مسائل ذکر ہیں۔ سوال: ان کی میراث زوجیت کے ساتھ کیوں ملا کر ذکر کی گئی ہے؟ جواب: جب کوئی خاتون شادی اور اولاد پیدا کرنے کے بعد بیوہ یا مطلقہ ہو جائے تو عدت گزرنے کے بعد دوسری شادی کر لیتی ہے اور اس شوہر سے بھی بچے جن لیتی ہے تو یہ بعد والی شادی اخیافی بھائی چارگی کا سبب ہے جو زوجیت کے سبب سے وجود میں آئی ہے اسلئے اس کو میراث زوجیت کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ كَلٰلَةً اس کے اصل مادہ میں اختلاف ہے۔ زمخشری کا قول ہے کہ لفظ کلال سے لیا گیا ہے جس کا معنیٰ ہے تھکاوٹ کی وجہ سے قوت ختم ہونا۔ کسی نے کہا کہ یہ تَكَلَّلَ الشَّيْءُ سے لیا گیا ہے جو احاطے کے معنیٰ میں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ كَلَّ عَنْهُ سے لیا گیا یعنی دوری تَبَاعُدُ کے معنیٰ میں ہے یہ لفظ مذکر مؤنث واحد تثنیہ جمع سب کیلئے ایک جیسا استعمال ہوتا ہے اور شرعی معنیٰ میں بھی بہت اقوال ہیں۔ (1) پہلا قول علی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور جمہور اہل لغت کا ہے کہ اس سے وہ میت مراد ہے جس کا باپ بیٹا نہ ہو امام قرطبیؒ نے کہا ہے کہ اس قول پر اجماع ہے۔ (2) دوسرا قول ابو بکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کا ہے کہ وہ میت جس کا والد نہ ہو۔ امام قرطبیؒ نے فرمایا ہے کہ انہوں نے اس قول سے رجوع کیا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ جس کا بیٹا نہ ہو۔ اس قول کی دلیل اس سورۃ کی آخری آیت ہے جس میں فرمان باری تعالیٰ ہے اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ جبکہ دیگر اہل علم کا قول ہے اسی آیت میں قرینہ سے لا والد ثابت ہوتا ہے جس کا ذکر ان شاء اللہ وہاں ہوگا۔ ان تمام اقوال میں کلالہ میت کی صفت ہے۔ قطرب کا قول ہے کہ ماں باپ کے علاوہ باقی ورثاء کو کلالہ کہا جاتا ہے اور یہ معنیٰ مناسب ہے اور جابر رضی اللہ عنہ کی روایت اس پر دلیل ہے جس میں ذکر ہے کہ لَا يَرِثُنِيْ اِلَّا كَلٰلَةٌ صحیح بخاری کتاب الوضوء حدیث 194 نضر بن شمیلؒ کا قول ہے کہ کلالہ مال (موروث) جو وراثت میں حاصل شدہ مال ہو اس کو کہا جاتا ہے۔ کسی نے کہا کہ کلالہ مطلق قرابت اور وراثت کو کہا جاتا ہے لیکن قرآن مجید کے ساتھ مناسب قول پہلا والا ہے۔ كَانَ فعل ناقص ہے۔ رَجُلٌ اس کا اسم ہے "يُّوْرَثُ رَجُلٌ" کیلئے صفت ہے اور کلالہ خبر ہے یا يُوْرَثُ خبر اور کلالہ یورث کی ضمیر سے حال ہے۔ صاحب اللباب اور ابو حیان نے اس کے علاوہ بھی اعراب کی توجیہات بیان کی ہیں۔ اَوِ امْرَاَةٌ یہ رَجُلٌ پر عطف ہے اور کلالہ مقدر اس کی خبر ہے۔ وَلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ: اس میں چار (4) مسائل ہیں۔ (1) میت مرد ہو اور ورثاء

میں سے صرف ایک بھائی ہو۔(2) دوسرا مسئلہ یہ ہے میت عورت ہو اور ورثاء میں صرف ایک بھائی ہو۔(3) تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ آدمی فوت ہوا جو کہ کلالہ ہے اور وارث صرف ایک بہن ہے۔(4) چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ عورت فوت ہوئی اور صرف ایک بہن وارث ہے لَهٗ ضمیر رَجُلٌ مذکر اور اِمْرَاَةٌ کیلئے كُلٌّ وَاحِدٍ کی تاویل یا میت کی تاویل سے راجع ہے۔ اَخٌ اور اُخْتٌ میں مراد اخیافی بہن بھائی ہیں امام قرطبیؒ نے اس پر اہل علم کا اجماع نقل کیا ہے اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی قراءت میں مِنْ اُمٍّ کا لفظ ذکر ہے اور امام ابن کثیرؒ اور صاحب اللبابؒ نے اس میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اثر بھی نقل کیا ہے۔ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ یعنی میت کے مال کو چھ (6) حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ یعنی چھٹا حصہ اخیافی بہن یا بھائی کو دیا جائے گا اور باقی مال عصبہ میں تقسیم ہوگا۔ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ اس میں پانچواں مسئلہ ہے۔ ذٰلِكَ۔ اَخٌ یا اُخْتٌ کی طرف اشارہ ہے اور اکثر سے مراد دو بہنیں یا دو بھائی یا زیادہ بہنیں یا زیادہ بھائی ہیں۔ شُرَكَآءُ یعنی بہن بھائیوں میں برابر تقسیم ہوگا اس میں (مذکر و مؤنث) مرد و عورت برابر ہیں کیونکہ وراثت ان کو ماں کی جانب سے ملی ہے اس لئے اس میں مرد کو عورت پر فضیلت حاصل نہیں۔ مسائل میراث میں یہ وہ خاص مقام ہے جس میں مرد و عورت حصہ داری میں برابر ہیں۔ مزید تفصیل کیلئے تفسیر قرطبی میں اس مقام کا مطالعہ کریں۔ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ۔ يُوْصٰى صیغہ مجہول اسلئے ذکر کیا کہ وصیت کرنے والا کبھی مرد اور کبھی عورت ہوتی ہے اسلئے فاعل کا تعین نہیں کیا۔ باقی تفسیر گزر چکی ہے غَيْرَ مُضَآرٍّ یہ اصل میں فاعل سے حال ہے لیکن فاعل کی جگہ مفعول قائم کیا گیا ہے لہٰذا فعل مجہول مستلزم ہے فاعل کو یعنی يُوْصِيْ غَيْرَ مُضَآرٍّ اور ضرار کا تعلق وصیت اور قرض دونوں سے ہے اور اس میں ضرر کے مختلف طریقے ہیں۔(1) ثلث تین تہائی سے زیادہ کی وصیت کرنا۔(2) وارث کیلئے وصیت کرنا۔(3) وارثوں کے مال اور حصے کم کرنے کی نیت سے وصیت کرنا۔(4) دین (قرض) میں بھی ضرر کے مختلف طریقے ہیں۔(1) یعنی کسی کیلئے اقرار کرنا کہ اس کی میرے ذمہ اتنی رقم ہے اگرچہ گواہ اور تحریر نہ ہو۔(2) کسی کے متعلق کہنا کہ اس کی طرف جو میرا قرضہ تھا وہ اُس نے دیدیا ہے حالانکہ یہ بات جھوٹ پر مبنی ہو۔(3) رشتہ داروں وارثوں کے نقصان کیلئے کسی کو قیمتی چیز معمولی قیمت پر دینا۔(4) یا حقیر معمولی چیز بھاری قیمت پر خریدنا۔ ان تمام کاموں میں مقصود وارثوں کو نقصان پہنچانا ہو۔ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ یہ يُوْصِيْكُمُ کیلئے مفعول مطلق یا حال ہے اس میں حصوں کی ادائیگی کی بہت تاکید ہے یعنی وارثوں کو یہ مقرر حصے ادا کرنے کا حکم تاکیدی و لازمی ہے۔ سوال: سابقہ آیت میں فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ فرمایا تھا اور یہاں پر

وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ فرمایا ایسا کیوں؟ جواب: سابقہ آیت میں اولاد کی میراث کا ذکر تھا اس کیلئے زیادہ تاکید کی ضرورت تھی اسلئے فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ فرمایا جبکہ یہاں پر میاں بیوی اور کلالہ کی میراث کا ذکر ہے اس میں اس کی نسبت تاکید کم ہے۔
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ: عَلِيْمٌ میراث کو انصاف کے ساتھ ادا کرنے والوں یا اس میں خیانت و ظلم کرنے والوں کو جانتا ہے۔ حَلِيْمٌ صابر ہے عذاب دینے میں مہلت دیتا ہے باوجود ظالموں کے ظلم کرنے کے عذاب میں ڈھیل دیتا ہے۔
سابقہ آیت میں حَكِيْمًا فرمایا تھا اس میں فرق یہ ہے کہ اس میں نرینہ اور زنانہ اولاد کے حصوں میں فرق تھا اور ماں باپ کے حصوں میں فرق تھا اور ماں کے حصے میں بھائیوں اور بہنوں کی وجہ سے نقصان تھا۔ یہ تمام مسائل اللہ تعالیٰ کی حکمت پر مبنی ہیں اس پر کسی قسم کا اعتراض نہیں ہوسکتا یہاں پر صفت حلیم ذکر کی ہے اس میں اشارہ ہے کہ اکثر لوگ خواتین کے ساتھ اور اخیافی بہن بھائیوں کے ساتھ ظلم کرتے ہیں تو ان کو خوف دلانا مقصود ہے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ "یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں اور جو کوئی اللہ و رسول کی اطاعت کرے گا تو اسے اللہ تعالیٰ ایسے باغوں میں داخل کرے گا کہ ان کے نیچے نہریں چلتی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے" [13]۔

تفسیر 13: اس آیت میں ان لوگوں کیلئے خوشخبری ہے جو گزشتہ تمام احکامات پر اور خصوصاً حکم میراث میں اللہ و رسول ﷺ کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔ تِلْكَ اس میں سابقہ تمام احکام یا خصوصاً احکام میراث کی طرف اشارہ ہے۔ حُدُوْدُ اللّٰهِ اس سے احکام اور شرائع الٰہی مراد ہیں اس کو حدود اسلئے کہا ہے کہ اس سے تجاوز یا اس میں کمی و زیادتی کرنا حرام ہے۔
وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ۔ رَسُوْلَ میں اشارہ ہے کہ احکام میراث میں قرآن مجید کے علاوہ حدیث نبوی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ امام ابن کثیرؒ نے فرمایا ہے کہ یہاں پر اطاعت یہ ہے کہ مختلف حیلوں اور بہانوں سے لوگوں کے حصوں میں کمی یا زیادتی مت کرو۔

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ ع

"اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی حدوں سے تجاوز کرے گا تو اسے آگ میں داخل کرے گا اور وہ اس میں ہمیشہ رہے گا اور اس کیلئے رسوا کن عذاب ہے" [14]۔

تفسیر 14: اس آیت میں "تخویف اخروی" کا ذکر ہے یعنی آخرت سے ڈرانا۔ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ابن جریج و

ابن جبیر رحمہم اللہ کا قول ہے کہ اس سے مراد اللہ اور رسول پر ایمان لانے سے انکار ہے۔ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ امام ابن کثیر نے فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ ضد کرتا ہو اور تقسیم الٰہی پر ناراض ہو اور اس سے اعراض کرتا ہو تو یہ کفر ہے۔ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا جنت والوں کے متعلق خَالِدِيْنَ جمع ذکر کیا ہے اسلئے کہ وہ اہل شفاعت ہیں اور یہ (شفاعت) ان کو اللہ تعالیٰ کی اجازت سے حاصل ہوگی لہٰذا ان کی شفاعت کے سبب سے اور بھی بہت سارے لوگ ان کے ساتھ جنت میں جائیں گے جبکہ جہنم والے ہر ایک جہنم میں جانے کیلئے الگ اور مستقل صفت رکھتا ہے چاہے کوئی ساتھی ساتھ ہو یا نہ ہو اور جمع کے صیغہ میں الفت اور شفقت کی طرف اشارہ ہے جبکہ مفرد اکیلا رہنے کی صفت میں وحشت، گھبراہٹ اور ذلت کی طرف اشارہ ہے۔ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ جب حدود الٰہی کی نافرمانی میں اس کی توہین ہوتی ہے تو توہین کرنے والوں کی سزا اہانت ہے تاکہ ان کو اپنے کیے کی سزا برابر مل جائے۔

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴿١٥﴾ "اور وہ جو تمہاری عورتوں میں سے بے حیائی کا کام کریں ان پر تم میں سے چار گواہ ٹھہراؤ پھر اگر وہ گواہی دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ ان کو موت آجائے یا اللہ تعالیٰ ان کیلئے کوئی راستہ بنادے" [15]۔

تفسیر 15: اس آیت میں نواں حکم بیان ہوا ہے جو بے حیائی کرنے والی خواتین کو گھروں میں بند رکھنے اور معاشرے کو صاف رکھنے کیلئے ہے یعنی ان کو ایذا اتکلیف دو تاکہ عورتیں فحش کام سے باز آجائیں اور یہ حقیقت میں ان پر احسان ہے۔

ربط: سابقہ آیتوں میں خواتین کے ساتھ احسان کا ذکر ہوا تو اب ان پر بے راہ روی، فحاشی کے وقت سختی کا حکم ہے اور یہ بھی ان کیلئے احسان ہے اور اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خواتین پر احسانات مانع نہیں بن سکتے ان پر حدود الٰہی نافذ کرنے سے یعنی باوجودیکہ احکام میراث اور دیگر احکامات کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے خواتین پر احسان فرمایا لیکن حدود اللہ سے تجاوز کی صورت میں ان پر سزائیں جاری ہوں گی۔ وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ: الّٰتِيْ معنا جمع ہے اور لفظاً جمع نہیں ہے ان کے صیغے جمع کیلئے بنائے گئے ہیں مگر حقیقت میں جمع نہیں۔ اَلْفَاحِشَةَ قبیح اور برے کام کو کہا جاتا ہے اور عرف میں زنا پر اس کا اطلاق ہوتا ہے یہاں پر بھی بالاجماع زنا مراد ہے کیونکہ ہر عاقل انسان اس کو برا کہتا ہے اس لئے اس کو فاحشہ کہا گیا ہے۔ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اس میں اشارہ ہے کہ مومن عورتیں مراد ہیں یعنی اضافت دین کے اعتبار سے

ہوئی ہے خواہ (منکوحہ) شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ ہوں۔ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۔ مِنْكُمْ
میں مسلمان مراد ہیں کیونکہ مسلمان پر غیر مسلم کی گواہی قبول نہیں۔ اِسْتِشْهَادٌ گواہوں کو طلب کرنے کو کہا جاتا ہے۔
گواہ کو اس وقت بلایا جاتا ہے جب زانی خود اقرار نہیں کرتا۔ امام قرطبی نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زناء کے اثبات میں
مدعی پر سختی کرتے ہوئے چار گواہوں کو پیش کرنے کا حکم دیا تا کہ کوئی مدعی جھوٹا دعویٰ کرنے کی جرأت نہ کر سکے جبکہ مالی
معاملات میں صرف دو گواہ مقرر کئے ہیں کیونکہ اللہ کے نزدیک ایک انسان کی عزت نفس مال کے مقابلے میں بہت بڑی
ہے لہٰذا اس کی عزت وعظمت شان کا لحاظ کیا گیا ہے اور اس میں بندوں کی پردہ پوشی کرنا بھی مقصود ہے امام قرطبیؒ کا قول ہے
کہ چار گواہوں کی شہادت قرآن، تورات اور انجیل تینوں کتابوں میں موجود ہے۔ قرآن مجید میں تو سورۃ نور آیت 4 میں
ذکر ہے اور ابوداؤد کتاب الحدود حدیث 4452 کی روایت میں ہے کہ یہودیوں نے اقرار کیا کہ ہماری کتاب تورات میں
بھی شہادت کیلئے چار گواہوں کی شرط موجود ہے۔ أَرْبَعَةً یہ لفظ دلیل ہے کہ زنا کے مسئلے میں عورتوں کی گواہی مردود ہے
صرف مرد گواہی دینگے جیسا کہ قانون عربی میں ہے کہ أسماء العدد یعنی گنتی میں مردوں کیلئے آخر میں (ۃ) استعمال ہوا ہے اور
خواتین کیلئے بغیر (ۃ) آتا ہے اور صحیح حدیث میں ان گواہوں کیلئے عادل ہونا، آزاد ہونا شرط ذکر ہوئی ہے کیونکہ فاسق اور
غلام کی گواہی قبول نہیں ہوگی۔ (ابوداؤد کتاب الاقضیہ حدیث 3600، ابن ماجہ حدیث 2366، امام البانی نے اس
حدیث کو حسن کہا ہے) مستور الحال یعنی جس کی حالت پوشیدہ ہو کی گواہی بھی نہیں چلے گی نیز گواہ بھی مشاہدے کی گواہی
دینگے یعنی گواہ بیان دیتے وقت اس بات کی وضاحت کرے گا کہ میں نے دونوں کو اس حال میں دیکھا ہے کہ مرد کا عضو خاص
عورت کے عضو خاص میں اس طرح داخل تھا جیسا کہ سرمہ دانی میں سلائی داخل ہوتی ہے۔ فَإِنْ شَهِدُوْا فَأَمْسِكُوْهُنَّ فِي
الْبُيُوْتِ جمہور مفسرین کا یہ قول ہے کہ چار گواہوں کی شہادت کے بعد اس خاتون کو گھر میں بند کیا جائے گا یہاں تک کہ
فوت ہو جائے یا اُس کے لئے اللہ تعالیٰ کوئی اور راستہ بنائے۔ امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ ابتداء اسلام میں گھروں میں بند
کرنے کا عمل تھا لیکن بعد میں جیل خانے بن گئے تو جیلوں میں رکھنا شروع ہوا۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ حد زنا
مرا داخل ہے یا بعد میں حد قائم ہونے کے لیے صرف تنبیہ ہے۔ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ ۔ سوال: تَوَفِّيْ موت کو کہا
جاتا ہے تو اس لفظ کا کیا معنیٰ ہے کہ موت اس کو موت دے؟ جواب: یہ بات گزر گئی ہے کہ تَوَفِّيْ عام ہے نیند، پورا لینا یا
موت حقیقی مراد ہے لہٰذا یہاں پر فاعل کے ذریعے سے تخصیص کی گئی ہے یا مضاف مقدر ہے یعنی مَلٰٓئِكَةُ الْمَوْتِ ۔ أَوْ

يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيلًا: أَوْ برائے عطف ہے جو يَتَوَفّٰهُنَّ پر عطف کیا گیا ہے یا پھر إِلَّا کے معنی میں ہے تو اس کے بعد کا فعل (أن) مقدر کی وجہ سے منصوب ہوگا۔ حدیث میں وارد ہے کہ نبی اکرم ﷺ پر وحی نازل ہوئی تو آپ نے اعلان فرمایا کہ اللہ تعالی نے راستہ بنا دیا لہٰذا شادی شدہ مرد وعورت کو 100 کوڑے اور سنگسار ہے اور کنواروں، غیر شادی شدہ مرد وعورت کیلئے 100 کوڑے اور ایک سال کیلئے جلا وطنی ہے صحیح مسلم کتاب الحدود حدیث 1690 مسند احمد 5318 ترمذی کتاب الحدود حدیث 1434 ابوداؤد کتاب الحدود حدیث 4434 صحیح ابن حبان حدیث 4425۔ گھروں میں بیٹھنے یا جیل میں ڈالے جانے کو ختم کرنے کے لیے راستہ ہے۔ فائدہ: اس آیت میں دو قول ہیں۔ (1) پہلا قول متقدمین علماء کا ہے کہ سورۃ نور حد زنا والی آیت ہے اور مذکورہ حدیث کے ذریعے سے یہ آیت منسوخ ہے کیونکہ متقدمین علماء کے نزدیک نسخ کا عام معنی ہے یعنی ان کے نزدیک اس حکم کو بھی شامل ہے جو واجب ہوجاتا ہے کسی اور حکم کے بعد اگرچہ انتہا معلوم ہو یا نہیں۔ (2) دوسرا قول متاخرین علماء کا ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہے اسلئے کہ مطلق حکم کو منسوخ کیا جاتا ہے جبکہ یہاں تو سابقہ حکم میں (غایہ) یعنی انتہا کیلئے قید لگائی ہے یعنی أَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيلًا۔ پہلے حکم میں گواہوں کی شہادت کے بعد ان کو بند کرنا تھا پھر دوسرے حکم کا انتظار کرو جو کہ حد ہے۔ اس مقام میں صرف اصطلاح کا فرق ہے باقی حکم حد جو سورۃ نور اور مذکورہ حدیث میں ہے اس پر تو اجماع ہے۔ حد نازل ہونے کے بعد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ زانی وزانیہ پر چار گواہ پیش ہونے کے بعد قاضی گواہوں کی جانچ پڑتال یعنی تحقیق چاہتا ہے تو ان کو قید میں رکھا جائیگا تاکہ اس دوران میں فرار نہ ہو جائیں پھر جب قاضی گواہوں سے مطمئن ہوجائیگا تو حد لگانے کیلئے ان کو جیل سے لایا جائیگا لہٰذا اس ترتیب سے نسخ کے بجائے اب بھی یہ آیت معمول بہا ہے اگرچہ آیت حد زنا نازل ہونے سے اس آیت پر منسوخ ہونے کا حکم اتفاقی ہے۔

وَالَّذٰنِ يَأْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَإِنْ تَابَا وَأَصْلَحَا فَأَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۗ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿16﴾

"اور وہ مرد جو تم میں سے ہیں بے حیائی کا کام کریں تو انہیں سزا دو پھر اگر وہ دونوں توبہ کریں اور دونوں اصلاح کریں تو ان دونوں سے درگزر کرو بلاشبہ اللہ بہت توبہ قبول کرنیوالا رحم کرنیوالا ہے" [16]۔

تفسیر 16: یہ آیت سابقہ حکم کیلئے تکملہ ہے۔ وَالَّذٰنِ يَأْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ اس میں مندرجہ ذیل اقوال ہیں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے امام مجاہدؒ نے نقل کیا ہے کہ اس سے دو قسم کے زناکار مرد مراد ہیں ایک شادی شدہ اور دوسرا غیر شادی شدہ یعنی محصن اور غیر محصن اور اس میں ضمیر (ھا) فاحشہ کی طرف راجع ہے جس سے زنا مراد ہے۔ دوسرا قول سدی اور قتادہ رحمہما اللہ سے نقل

ہے کہ اس سے بدکار مرد اور عورت مراد ہیں لیکن مرد کو عورت پر ترجیح دی ہے اسلئے وَ الَّذٰنِ فرمایا ہے دونوں اقوال کے اعتبار سے دونوں آیتوں میں فرق ہے۔ (1) پہلی وجہ مجاہدؒ سے نقل ہے کہ یہ بندش عورتوں کیلئے خاص ہے اسلئے کہ اس (عورت) کے گھر سے باہر نکلنے پر وہ بدکاری میں مبتلا ہوئی ہے لہٰذا بندش کے ساتھ وہ گناہ سے بچ جائے گی اور ایذا تکلیف دینا مرد کے ساتھ خاص ہے اسلئے کہ اُسے ضرورت کی وجہ سے باہر جانا پڑتا ہے تو اس کیلئے ایذا دینا بہتر ہے۔ دوسری وجہ بندش عورت کیلئے خاص ہے اور ایذا دینا دونوں کیلئے ہے یعنی مرد و عورت کیلئے مشترک ہے۔ تیسری وجہ سدیؒ سے منقول ہے کہ پہلی آیت میں (محصنات) شادی شدہ خواتین مراد ہیں کیونکہ نِسَآئِكُمْ ایسی عورتوں کیلئے مناسب لفظ ہے اور كُمْ کی اضافت میں شوہروں سے کلام ہے۔ اس زیر بحث آیت میں کنواری اور غیر شادی شدہ عورتیں مراد ہیں۔ فَاٰذُوْهُمَا ایذا وہ تکلیف ہے جو زیادہ سخت اور شدید نہ ہو۔ مارنے کے ذریعے سے ہو لیکن زخم نہ آئے یا سخت کلامی، ملامت کرنا وغیرہ ہو البتہ ایذا سے کوڑے مارنا اور قید کرنا مراد نہیں ہے کیونکہ اس کا ذکر گزر گیا ہے۔ ایذا دینا مجمل حکم ہے تو اس کو قاضی اور حاکم پر چھوڑا گیا ہے لیکن علماء کا اتفاق ہے کہ ایذا کا حکم سورۃ نور اور گزشتہ روایت کی وجہ سے منسوخ ہے لیکن یہ اس وقت جب ایذا حد کی جگہ قائم ہو جبکہ دوسری توجیہ جو بعد میں ذکر ہے یہ ہے کہ ایذا منسوخ نہیں ہے۔ اس آیت میں تیسرا قول ابو مسلم کا ہے جس کی نسبت انہوں نے مجاہدؒ کی طرف کی ہے کہ اس سے مراد دو (مذکر) مرد ہیں جو آپس میں بدفعلی یعنی قوم لوط علیہ السلام کی طرح عمل کریں اور (هَا) کی ضمیر فحاشی بدکاری کی طرف راجع ہے لیکن پہلے فاحشہ سے زنا مراد ہے اور ضمیر سے دو (مذکر) مردوں کی آپس میں فحاشی مراد ہے۔ ایذا سے سزا مراد ہے اگرچہ اس سزا میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ امام آلوسیؒ نے پہلے اس قول کیلئے دلائل ذکر کئے ہیں اور پھر ان کے جوابات ذکر کیے ہیں اور آخر میں فرمایا ہے کہ یہ قول فاسد نہیں ہے البتہ جمہور مفسرین کے قول کے خلاف ہے۔ فَاِنْ تَابَا وَ اَصْلَحَا ۔ اس میں توبہ کرنے کیلئے ترغیب ہے یعنی سزا کی وجہ سے بھی توبہ کرلو تو بہتر ہے۔ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا یعنی ان کو مزید سزا مت دو کیونکہ مقصد توبہ کی طرف رجوع کرنا تھا جو سزا سے حاصل ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ سزا حد کے علاوہ ہے کیونکہ توبہ کرنے سے حد ساقط نہیں ہوتی ہے۔ دونوں آیتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ گواہی کے بعد کچھ مناسب وقت ان کو قید میں رکھو پھر حد قائم کرنے کیلئے باہر نکالو تو سخت ملامت کرو پھر ان پر حد قائم کرو البتہ جب توبہ کریں تو ایذا مت دو اور حد قائم کرو۔ ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کے ساتھ اسی طرح کیا گیا تھا لیکن پھر نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ سارے مدینہ والوں پر تقسیم کی جائے تو سب کیلئے کافی ہو جائے

گی۔(صحیح بخاری کتاب الحدود حدیث 6820 صحیح مسلم کتاب الحدود حدیث 4979)۔
پھر صحابہ کرام نے اس کو ایذا دینا چھوڑ دیا اور اس پر حد قائم کی اور اگر ایذا سے دو مردوں پر بدکاری کی حد لگانا مراد ہو تو وہ توبہ سے ساقط نہیں ہوگی لہٰذا ابومسلم کے قول کے فاسد ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے اور اگر اعراض سے مراد ملامت کرنا اور تنبیہ ہو تو پھر یہ (ابومسلم کی) توجیہہ درست ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا یہ اعراض کیلئے علت ہے۔

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ "یقیناً اللہ کے ذمہ اُنہی لوگوں کی توبہ قبول کرنا ہے جو جہالت کی وجہ سے برا عمل کرتے ہیں پھر وہ جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں تو یہی لوگ ہیں اللہ تعالیٰ ان پر متوجہ ہوتا ہے (توبہ قبول کرتا ہے) اور اللہ تعالیٰ بہت جاننے والا خوب حکمت والا ہے"[17]۔

تفسیر 17: فحاشی سے توبہ ذکر کرنے کے بعد اب عام گناہوں سے توبہ کی ترغیب اور قبولیت توبہ کیلئے شرائط ذکر کر رہے ہیں۔ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ: ابوحیانؒ نے فرمایا ہے کہ یہ مبتدا اور خبر ہے اور دونوں میں تقدیری عبارت موجود ہے۔ یعنی اِنَّمَا قُبُوْلُ التَّوْبَةِ مُرَتَّبٌ عَلٰى فَضْلِ اللّٰهِ یعنی توبہ کی قبولیت فضل الٰہی سے ہوتی ہے۔ سوال: علی واجب ہونے پر دلالت کرتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں ہے؟ جواب: اصطلاح میں اس کو وجوب تفضّلی کہا جاتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے اور وہ اپنے وعدے سے اعراض نہیں کرتا بلکہ وہ وعدہ ضرور پورا کرتا ہے تو یہ بالکل اسی طرح ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ پر واجب ہے۔ حسن بصریؒ کے نزدیک (عَلٰى) (عِنْدَ) کے معنی میں ہے۔ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ۔ یہ "مرتب" مقدر سے متعلق ہے ترکیبی حیثیت میں اور "مرتب" "علی اللہ" سے پہلی مقدر مانا گیا ہے۔ کہ عَلَى اللّٰهِ سے قبل ہے یا پھر التَّوْبَةُ مبتدا ہے اور عَلَى اللّٰهِ اس کی صفت ہے اور لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ خبر ہے۔ السُّوْٓءَ کبیرہ صغیرہ تمام گناہوں کو شامل ہے اسی طرح کفر اور شرک وغیرہ بھی اس میں داخل ہیں۔ جہالت سے سفاہت مراد ہے یعنی وہ گناہ جو عقل والوں کی شان کے خلاف ہو۔ اس سے مراد بے علمی نہیں ہے یعنی ہر گناہ کا مرتکب انجام گناہ سے غافل ہے۔ جہالت کا یہ معنی سورۃ بقرہ آیت 67 سورۃ یوسف آیت 33، 89 اور سورۃ ہود آیت 46 میں بھی ہے یہ معنی جان کر اور بھول کر دونوں کو شامل ہے۔ امام بیہقی نے مجاہدؒ سے نقل کیا ہے کہ ہر گناہ گار جاہل ہوتا ہے۔ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ مِنْ ابتداء غایہ کیلئے یا تبعیض کیلئے ہے اور قریب کیلئے موصوف مقدر ہے۔ یعنی زَمَانٍ قَرِيْبٍ۔ قریب میں کئی اقوال ہیں۔

(1) سدی اور قتادہ رحمہما اللہ کا قول ہے تندرستی میں توبہ کریں۔ (2) ملک الموت کے دیکھنے کے بعد یعنی موت کے آثار ظاہر ہونے کے بعد توبہ کریں۔ (3) ضحاکؒ کا قول ہے کہ موت سے قبل قریب کہا جاتا ہے۔ جب تک حالت نزع نہ ہو۔ عکرمہؒ کا قول ہے کہ ساری دنیا قریب ہے۔ یہ تمام اقوال تعبیر کے اعتبار سے ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ امام ابن کثیرؒ نے اس بارے میں بہت احادیث جمع کی ہیں جو مرفوع، مرسل وغیرہ ہیں۔ لفظ ثُمَّ بھی تراخی یعنی مہلت الٰہی اور وسعت رحمت الٰہی کی دلیل ہے۔ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ یہاں قبولیت توبہ مراد ہے۔ أُولَٰئِكَ ماقبل صفت پر دلالت کرتا ہے جو کہ توبہ قریب ہے۔ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا: بندے کے گناہ کا بھی اس کو علم ہے اور اس کا اخلاص کے ساتھ توبہ کرنا بھی اس کے علم میں ہے معصیت کی قوت دینا پھر گناہ کے بعد توبہ کرنے کی توفیق دینا اس میں الگ الگ حکمتیں ہیں۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٨﴾ "اور ان لوگوں کیلئے قبولیت توبہ نہیں ہے جو گناہوں کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت حاضر ہوتی ہے تو کہتا ہے کہ یقیناً میں نے اب توبہ کر لی اور نہ ہی ان لوگوں کی توبہ قبول ہے جو حالت کفر میں فوت ہوتے ہیں ان لوگوں کیلئے ہم نے دردناک عذاب تیار کیا ہے" [18]۔

تفسیر 18: اس آیت میں توبہ کے اس قسم کا بیان ہے جو مذکورہ شرائط سے خالی ہے اور نا قابل قبول ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم یہ ہے کہ "وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ: ان کی توبہ کی قبولیت کی نفی ہے یعنی اب یہ توبہ قبول نہیں ہے۔ السَّيِّئَاتِ: گناہوں کی کثرت اور بار بار کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ یہاں گناہ کے تمام اقسام مراد نہیں۔ حَضَرَ الْمَوْتُ سے موت کے یقین کا آنا مراد ہے یعنی زندگی سے نا امید ہو جاتا ہے تو اس وقت کی توبہ قبول نہیں ہے کیونکہ یہ تو اضطراری حالت ہے۔ قَالَ کہا تاب نہیں فرمایا اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ یہ توبہ اخلاص اور یقین سے متصف نہیں صرف زبانی قول سے ہے لہٰذا یہ قابل قبول نہیں۔ الْآنَ سے حاضر وقت مراد ہے یعنی ابھی تک توبہ کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہ آیت کافر منافق مسلمان سب کیلئے مشترک ہے اس طرح کی آیتیں مندرجہ ذیل ہیں۔ سورۃ یونس 90 اور 91 میں فرعون کی توبہ کا ذکر ہے۔ نیز سورۃ مؤمنون آیت 99 سورۃ مؤمن آیت 85 سورۃ انعام آیت 158 اور سورۃ منافقون آیت 10 اور 11 میں بھی ہے۔ دوسری قسم وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ: سوال: اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ توبہ کی بحث میں دوسری قسم کیوں ذکر کیا؟ جواب (1): جواب یہ ہے

کہ پہلی قسم کی توبہ کی عدم قبولیت میں مبالغہ کے لیے دوسری قسم لائے۔ یعنی حالت نزع میں توبہ کرنا اور کفر کی حالت میں مرنا دونوں برابر ہیں۔ جواب (2): موت کے بعد یا حالت نزع میں جو لوگ دنیا میں واپسی اور نیک اعمال کی تمنا کرتے ہیں یہ ایسا جیسے مرنے کے بعد کوئی توبہ کریں اور مرنے کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتا ہیں جیسا کہ سورۃ انعام آیت 27 سورۃ فاطر آیت 37 اور سورۃ سجدہ آیت 12 میں ہے۔ أُولَٰئِكَ اس میں فریقین کی طرف اشارہ ہے۔ أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا سوال: اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ فاسق مومن کیلئے عذاب واجب ہے جبکہ یہ معتزلہ کا موقف ہے؟ جواب (1) یہ عذاب کی تیاری ہے اس سے عذاب دینا لازم نہیں آتا اور نہ ہی واجب ہوتا ہے۔ جواب (2) أُولَٰئِكَ میں صرف کافروں کی طرف اشارہ ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا ۖ وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ﴿١٩﴾ "اے ایمان والو تمہارے لئے حلال نہیں کہ تم زبردستی عورتوں کے وارث بنو اور نہ ہی انہیں روکو تا کہ تم اس حق مہر کا کچھ حصہ لے لو جو تم نے انہیں دیا ہے مگر یہ کہ وہ کھلی بے حیائی کریں اور تم ان کے ساتھ خوشی سے گزر بسر کرو پھر اگر تم اسے ناپسند کرو تو شاید کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اس میں بہت بھلائی کر دے" [19]۔

تفسیر 19: یہ دسواں حکم ہے۔ ان خواتین پر مظالم روکنے کے لیے جو بیوہ ہو جاتی ہے اور اس کے ورثاء جبراً اس کا نکاح کرائے یا اس کے مال پر قبضہ کرتے ہیں۔ ربط: سابقہ آیات میں زمانہ جاہلیت کے ان مظالم کا رد کیا گیا جو یتیم بچوں کے میراث اور خواتین کے میراث سے متعلق تھے اب اس آیت میں بیوہ خواتین کے نکاح سے متعلقہ مظالم کا رد فرما رہے ہیں اور اس میں دو قول ہیں۔ (1) پہلا قول یہ ہے کہ یہ خطاب میت کے وارثوں (اولیاء) سے ہے کہ دور جاہلیت کا طریقہ یہ تھا کہ شوہر کے فوت ہونے کے بعد وارث اس بیوہ کو خود نکاح میں رکھ لیتے تھے اور اس میں اس کی رضامندی شامل نہیں ہوتی تھی یا اس کی رضامندی کے بغیر کسی اور کے نکاح میں دے دیتے اور کبھی نکاح سے بالکل منع کر دیتے۔ دوسری روایت میں ہے کہ شوہر فوت ہوتے تو کوئی وارث آکر اس عورت پر اپنی چادر ڈال دیتا اور یہ کہہ دیتا کہ جس طرح میں اس کے مال کا وارث ہوں اسی طرح اس کی بیوی کا بھی وارث ہوں۔ یہ روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے امام بخاری نے سنداً نقل کی ہے صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4579۔ (2) دوسرا قول یہ ہے کہ یہ خطاب ان شوہروں کو ہے جنھیں اپنی بیویاں پسند نہ ہوتیں لیکن مالداری کی وجہ سے اپنے پاس رکھ لیتے طلاق بھی نہیں دیتے اور ان کے حقوق ادا نہیں کرتے یہاں تک کہ وہ

مر جاتیں تو اس کا مال بطور میراث لے لیتے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ: پہلے قول کی مطابق یہ مفعول اول ہے اور نِسَاءَ مَوْرُوْثَاتٌ ہے اور دوسرے قول کی بناء پر یہ مفعول ثانی ہے اور مفعول اول مقدر ہے یعنی تَرِثُوا الْمَالَ مِنَ النِّسَآءِ، كَرْهًا یہ اَلنِّسَآءَ سے حال بنا ہے یعنی کَارِھَاتٍ یا مَکْرُوْھَاتٍ ہے۔ کَرْہًا اور کُرْہًا کا ایک ہی معنی ہے جیسا ضَعْف اور ضُعْف یا پہلا کراہیت کے معنی میں ہے اور دوسرا اکراہ کے معنی میں ہے اور یہ احترازی قید نہیں ہے بلکہ زیادہ مبالغہ کیلئے ہے کیونکہ عورت کو مال میں شمار کرنا انتہائی درجہ ظلم ہے خواہ وہ راضی ہو یا ناراض ہو۔ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ عَضَلٌ۔ حقیقت میں کسی چیز سے روکنے یا تنگ کرنے کے معنی میں ہے تو پہلے قول کی بنیاد پر عورت کو نکاح سے منع کرنا مراد ہے۔ دوسرے قول کی بناء پر عورت کو تنگ و پریشان کرنا مراد ہے تاکہ زندگی گزارنا اس کیلئے مشکل ہو جائے اور وہ خود خلع کرنے کا مطالبہ کرے اس طریقے سے شوہر مال پر قبضہ کر بیٹھے۔ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ پہلے قول کی بناء پر عورت کا مال ہے جو میراث میں اس کو حاصل ہوا۔ دوسرے قول کی بناء پر وہ مہر مراد ہے جو شوہر سے ملا ہے لفظ اَخَذَ کی نسبت اِذْھَاب میں زیادہ قباحت ہے۔ اِلَّاۤ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ۔ فَاحِشَةٍ عام ہے فحاشی بدزبانی برے اخلاق سب کو شامل ہے۔ پہلے قول کی بناء پر جب اولیاء کو خطاب ہو تو یہ استثناء منقطع ہے اور مبتداء ہے جس کی خبر مقدر ہے یعنی عورت کی فحاشی کی صورت میں اس کو تادیب دینا تم پر لازم ہے خود ادب دو یا قاضی کو پیش کرو بشرطیکہ حد کی مستحق ہو۔ دوسرے قول کی بناء پر شوہروں کو خطاب ہے تو استثنیٰ متصل ہے۔ تَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ سے یعنی جب اس سے بدکاری ثابت ہو تو شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ اس سے اپنا دیا ہوا مہر واپس لے اور اسے خلع دے جیسا کہ سورۃ بقرہ آیت 229 میں ذکر گزرا ہے۔ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ پہلے قول کی بناء پر یہ اولیاء سے خطاب ہے اور ظلم سے بچنے کیلئے لفظ معروف استعمال کیا ہے۔ دوسرے قول کی بناء پر یہ خطاب شوہروں سے ہے اور معروف سے خواتین کیلئے کھانا، لباس اور حقوق زوجیت یعنی شرعی حقوق مراد ہیں۔ امام قرطبیؒ نے فرمایا اگر وہ خادم نوکر کی ضرورت مند ہو تو شوہر اس کو خادم نوکر بھی دے گا (بشرطیکہ وہ طاقت رکھتا ہو)۔ امام آلوسیؒ نے فرمایا کہ ان سے بداخلاقی نہ کرنا، مار پیٹ نہ کرنا، گالی گلوچ نہ کرنا یہ معروف ہے۔ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ یعنی اگر تمہیں ان سے کراہیت ہو تو صبر کرو یہ جزاء مقدر ہے، یہاں پر طبعی کراہیت مراد ہے یعنی وہ تم پر بوجھ نہیں جبکہ ان کی طرف سے نقصان نہ ہو یا معمولی نقصان ہو البتہ فاحشہ نہ ہو تو برداشت کرو یہ خطاب شوہروں اور اولیاء سب کو ہے لیکن عَاشِرُوْهُنَّ کا خطاب شوہروں سے ہی منسلک کرنا مناسب ہے۔ فَعَسٰۤی

اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـئًا وَّيَجۡعَلَ اللّٰهُ فِيۡهِ خَيۡرًا كَثِيۡرًا: یہ ان مقدر جزاء کیلئے علت ہے یعنی اس خاتون میں اگر کچھ عیب ہوتو اس میں بہت سارے اچھی اور خیر کی عادات واعمال ہونگے لہٰذا اس معمولی ناپسند پر صبر کرو۔ اس جملے کو قاعدے اصول کی طرح بیان کیا ہے کہ بہت سارے کام اور چیزیں انسان کو ناپسند ہوتی ہیں لیکن ان میں خیر کثیر پائی جاتی ہے لہٰذا کراہیت بدنی یا مالی کی وجہ سے نہیں چھوڑنا چاہئے یہ سورۃ بقرہ آیت 216 کی مانند ہے۔

وَاِنۡ اَرَدۡتُّمُ اسۡتِبۡدَالَ زَوۡجٍ مَّكَانَ زَوۡجٍ ۙ وَّاٰتَيۡتُمۡ اِحۡدٰٮهُنَّ قِنۡطَارًا فَلَا تَاۡخُذُوۡا مِنۡهُ شَيۡـئًا ؕ اَتَاۡخُذُوۡنَهٗ بُهۡتَانًا وَّاِثۡمًا مُّبِيۡنًا ۝۲۰ ”اگر تم بدلنا چاہو ایک بیوی کو دوسری بیوی کی جگہ اور ان میں سے تم نے ایک کو بہت سارا مال دیا ہو تو اس میں کچھ بھی واپس مت لو کیا صریح گناہ کا ارتکاب کرتے ہوئے اور بہتان باندھتے ہوئے تم اس سے واپس لوگے“ [20]۔

تفسیر 20: یہ شوہروں سے خطاب ہے اور اِلَّاۤ اَنۡ يَّاۡتِيۡنَ کے مقابل ہے یعنی فحاشی کے ارتکاب (کی وجہ سے اس سے تم مہر لے سکتے ہو) مگر جب اس سے فحاشی کا جرم ثابت نہ ہو تو پھر اس سے تم مہر واپس نہیں لے سکتے ہو یا پھر عَاشِرُوۡهُنَّ کے مقابل ہے یعنی پہلا کام تو یہ ہے کہ اچھے طریقے سے اس کے ساتھ زندگی گزارو مگر بصورت دیگر اس سے مہر نہیں لے سکتے ہو۔ وَاِنۡ اَرَدۡتُّمُ اسۡتِبۡدَالَ زَوۡجٍ مَّكَانَ زَوۡجٍ جب اَرَدۡتُّمۡ جمع ہے تو اس کے قرینہ سے پتا چلا کہ زوج بھی ازواج کے معنی میں ہے اور جمع کا مقابلہ جمع کے ساتھ آحاد کی تقسیم چاہتا ہے یعنی تم میں ہر شخص جو بیوی کو طلاق دے کر دوسری شادی کرنا چاہتا ہے تو سابقہ بیوی سے مہر وغیرہ واپس نہیں لے سکتا ہے اور اس شرط کا مفہوم مخالف معتبر نہیں ہے یعنی اگر کوئی بیوی بدلنا نہیں چاہتا ہے تو وہ مہر لے سکتا ہے تو جواب یہ ہے کہ نہیں۔ مگر دو وجوہات سے اس شرط کو ذکر کیا ہے۔ (1) پہلا سبب، انسان شادی کے وقت مال کا محتاج ہوتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ پہلی بیوی سے مال لیکر دوسری شادی اس مال سے کر لونگا۔ (2) دوسرا سبب یہ ہے کہ یہ دور جاہلیت کی رسم تھی تو اللہ تعالیٰ نے اس کی تردید کی ہے۔ وَّاٰتَيۡتُمۡ اِحۡدٰٮهُنَّ قِنۡطَارًا قنطار کی تفسیر سورۃ آل عمران آیت 14 میں گزری ہے اور اس آیت میں زیادہ مقدار میں مہر دینے کیلئے جواز ہے۔ (سوال) عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قصہ مختلف اسانید سے امام ابن کثیر اور ابن جریر رحمھما اللہ نے ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ زیادہ مہر مت دیا کرو اگر زیادہ مہر عزت کا سبب ہوتا تو نبی کریم ﷺ اپنی بیویوں اور بیٹیوں کیلئے زیادہ مقدار میں مہر مقرر کر لیتے مگر انہوں نے تو اپنی بیویوں اور بیٹیوں کیلئے (12) اوقیہ چاندی سے زیادہ مہر نہیں دیا ہے اور ایک روایت میں چار سو 400 درہم کا ذکر ہے۔ صحیح ابوداؤد کتاب النکاح حدیث 2106۔ ابن ماجہ حدیث 1887 سنن نسائی

2۔87 ترمذی 1۔208 وصححہ وکذا ابن حبان 1259۔ دارمی 2۔141 ایک عورت نے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس فرمان کا رد کرتے ہوئے اس آیت کو پیش کیا تو عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اَللّٰھُمَّ غُفْراً کُلُّ النَّاسِ أَفْقَهُ مِنْ عُمَرَ اس روایت کو مجالد بن سعید راوی کی وجہ سے تخریج ابن کثیر میں ضعیف قرار دیا ہے۔ مہر کے متعلق نبی کریم ﷺ کی سنت اس آیت کے خلاف ہے کہ آپ ﷺ نے بہت کم کر دیا۔ (جواب) کئی وجوہات سے اس کا جواب دیا گیا ہے (1) فخر تکبر کیلئے زیادہ مہر مقرر کرنا خلاف شرع ہے اور جب یہ عیب نہ ہو تو جائز ہے۔ (2) دوسرا سبب یہ ہے کہ مہر میں زیادتی بصورت جملہ خبر۔ یہ ہے جو بطریقہ شرط ہے لہٰذا یہ مہر کی زیادتی کے جواز کو مستلزم نہیں ہے۔ (3) زیادہ مہر دینا رخصت اور صرف جواز ہے جبکہ تھوڑا مہر عزیمت اور اولی ہے اور جو عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا خاتون کو جواب دینا ہے وہ تواضع اور کسر نفسی کی وجہ سے ہے نیز اُمت کو قرآن کے فہم کی ترغیب دینا مقصود ہے۔ اس سے زیادہ تفصیل روح المعانی میں ہے (عمر فاروق سے متعلق جو حصہ ہے وہ ضعیف ہے۔ الشیخ البانی فرماتے ہیں) اخرجه البیهقی وقال هذا منقطع 2338, قلت ومع انقطاع ضعیف من اجل مجالد وهو ابن سعید لیس بالقوی۔ ارواء الغلیل 3474 حدیث 1927 مزید تفصیل امام آلوسی نے روح المعانی میں بیان کی ہے۔ فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا قِنطَارٌ کی طرف ضمیر راجع ہے اور شَيْئًا عام ہے مال زیادہ ہو یا کم۔ أَتَأْخُذُونَهُ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا پہلے "نہی" زجر توبیخ کی جارہی ہے۔ بہتان فاعل سے حال ہے یعنی بہتان باندھنا ظاہراً یا بہتانا تمیز سے علت کے لیے ہے۔ دور جاہلیت کے لوگوں کا طریقہ تھا کہ بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کرتے تو بہتان باندھ کر اس کو بہانہ بنا لیتے تا کہ مہر دینا نہ پڑے اس وجہ سے لفظ بہتان استعمال کیا ہے۔ بیوی سے مہر واپس لینا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ شخص مہر کو فرض نہیں مانتا ہے اور فرض سے انکار کرنا ظاہراً ظلم ہے۔

وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ وَأَخَذْنَ مِنكُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا ﴿٢١﴾ "اور کس طرح ان سے تم (مہر) لوٹاؤ گے جبکہ بلاشبہ تم نے ایک دوسرے سے ملاپ کیا ہے اور انہوں نے تم سے پختہ وعدہ لیا ہے"[21]۔

تفسیر 21: وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ اس آیت میں مزید طریقوں سے بیوی سے مہر واپس لینے کی شناعت بیان کی گئی اور اس عمل پر رد کیا گیا ہے۔ (1) طریقہ یہ ہے کہ موجب (سبب) مہر موجود ہوا ہے یعنی جماع کرنا جس کو افضی سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس سے مہر شوہر پر لازم ہو جاتا ہے۔ (2) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ یہ وعدہ سے

اعراض ہے کَیْفَ میں استفہام انکاری اور تعجب دونوں ہیں۔ اَفْضٰی یہ جماع سے کنایہ ہے اور خلوت صحیحہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ اَفْضٰی اس کو شامل ہے یا نہیں اس کی تفصیل امام رازی آلوسیؒ، قرطبیؒ اور صاحب اللبابؒ نے کی ہے۔ وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا اس سے شرعی نکاح مراد ہے جو اعلاناً اور گواہوں کی موجودگی میں کیا جاتا ہے۔

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ؑ ﴿۲۲﴾ ع ٨

"اور تم نکاح مت کرو ان عورتوں سے جن سے تمہارے باپوں نے نکاح کیا ہے مگر جو پہلے گزر چکا یقیناً یہ بے حیائی کا کام ہے اور انتہائی بری بات اور طریقہ ہے" [22]۔

تفسیر 22: یہ گیارھواں حکم ہے جس میں دور جاہلیت کی رسم کی تردید کی گئی یعنی سوتیلی ماں سے نکاح ظلم اور جہالت ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور جمہور مفسرین سے نقل ہے کہ دور جاہلیت میں جب کسی کا والد فوت ہوجاتا یا طلاق دے دیتا تو سوتیلی ماں سے نکاح کر لیتے تھے اس رسم جاہلیت کے رد میں اس آیت کو اللہ نے نازل کیا ہے۔ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ لفظ (مَا) میں دو وجوہ ہیں۔ (1) پہلی وجہ (مَا) موصولہ ہے اور مِّنَ النِّسَآءِ اس کا بیان ہے تو معنی یہ ہوا کہ ان عورتوں سے نکاح مت کرو جن سے تمہارے باپوں نے نکاح کیا ہو۔ (2) دوسری وجہ یہ ہے کہ (مَا) مصدریہ ہے اور مِّنَ النِّسَآءِ وَلَا تَنْكِحُوْا سے متعلق ہے تو معنی یہ ہوا کہ عورتوں سے اپنے جاہل باپوں کی طرح نکاح مت کرو جیسا نکاح شغار (وٹہ سٹہ) وغیرہ۔ اس قول کو ابن جریرؒ نے ترجیح دی ہے جبکہ پہلے قول کو جمہور محدثین نے پسند کیا ہے۔ (قرطبی)۔ نکاح کے معنی میں یہاں پر تین اقوال ہیں (1) یہ نکاح کے معنی میں ہے۔ (2) یہ جماع (زنا) کے معنی میں ہے۔ (3) یہ عام ہے نکاح جماع دونوں کیلئے۔ لہٰذا دوسرا اور تیسرا معنی مراد لینے سے ثابت ہوتا ہے کہ جس خاتون سے زانی نے زنا کیا ہے تو اس کے بیٹے کے نکاح میں وہ نہیں آسکتی ہے یعنی اس کیلئے حرام ہے یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کا قول ہے۔ اگر پہلا معنی لیا جائے تو پھر اس خاتون کا نکاح اس زانی شخص کے بیٹے کے ساتھ جائز ہے۔ یہ امام شافعی اور دیگر علماء کرام کا قول ہے۔ صاحب اللباب نے اس کی مکمل تفصیل ذکر کی ہے۔ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ۔ سَلَفَ کا معنی جو گزر گیا ہے یعنی سابقہ دیے گئے رشتے وغیرہ۔ بیع سَلَم کو بھی سَلَف اسلئے کہتے ہیں کہ اس میں قیمت پہلے ادا ہوتی ہے اور مطلق قرض کو سلف کہا جاتا ہے اور جو لوگ زمانہ ماضی میں گزر گئے ان کو بھی سلف کہتے ہیں اور اہل شریعت کی اصطلاح میں اس کے مصداق صحابہ کرام و تابعین (ان کو سلف صالحین کہا جاتا ہے) عظام ہیں اور یہاں سلف سے مراد اس حکم کے نازل ہونے

سے پہلے بیٹے کے والد کی بیوی (سوتیلی ماں) سے نکاح ہے۔ سوال: مَا قَدْ سَلَفَ فعل ماضی ہے اور وَلَا تَنْكِحُوْا فعل مضارع ہے تو یہ استثنا کس طرح درست ہوگا؟ جواب: یہ استثناء منقطع ہے یعنی اس منع سے قبل جو نکاح ہوا اس کو چھوڑ دو اس کا گناہ نہیں ہے یا پھر اِلَّا بَعْدَ کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى۔ یا اِلَّا کے معنی میں ہے جیسا اس فرمان میں ہے وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَاً اس میں اور بھی توجیہات مفسرین نے ذکر کی ہیں۔ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً یعنی برائی اور قباحت میں انتہا تک پہنچا ہے یہ انتہا برا عمل ہے جو تمام عقلمندوں کو برا لگتا ہے اسلئے کہ سوتیلی ماں بھی سگی ماں کی طرح ہے لہٰذا یہ بہت بری بات ہے۔ وَّمَقْتًا۔ مَقْتٌ اس حسد کو کہا جاتا ہے جس کے ساتھ حقارت ہو اور اللہ تعالیٰ کا مَقْتُ بندوں کیلئے خسران شرمندگی و ذلت پر مبنی ہوتا ہے عرب معاشرے میں سوتیلی ماں سے نکاح کو نکاح مَقْتُ اور نکاح کرنے والے کو مُقِيْتٌ اور ان سے جو بچہ پیدا ہوا سے مَقْتِيْ کہتے تھے نیز نکاح کرنے والے کو خَيْزَنْ بھی کہتے تھے۔ وَسَآءَ سَبِيْلًا کسی عمل کی قباحت برائی کیلئے تین مرتبے ہیں۔ (1) پہلا مرتبہ عقلی قباحت، فاحشہ لفظ میں اس کی طرف اشارہ ہے (2) دوسرا مرتبہ قباحت شرعیہ ہے مَقْتًا میں اس کی طرف اشارہ ہے۔ (3) تیسرا مرتبہ عرف اور رواج کے اعتبار سے ہے تو وَسَآءَ سَبِيْلًا میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ تمام قباحتوں (برائیوں) سے بڑھ کر برائی اور جرم کا ارتکاب اس نکاح میں موجود ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۡ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ۡ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿23﴾ "تم پر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور تمہارے بھائی کی بیٹیاں اور تمہاری بہنوں کی بیٹیاں (بھتیجیاں اور بھانجیاں) اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے اور تمہاری رضاعی بہنیں اور تمہاری بیویوں کی مائیں (ساس) اور تمہاری وہ سوتیلی بیٹیاں جو تمہاری گودوں (پرورش) میں ہیں تمہاری ان عورتوں سے جن سے تم نے صحبت کی ہے اگر تم نے ان سے صحبت نہیں کی ہے تو تم پر کوئی گناہ نہیں اور تمہارے بیٹوں کی بیویاں (تمہاری

جمع نہیں) وہ (بیٹے) جو تمہاری پشتوں سے ہیں اور تمہارا دو بہنوں کو اکٹھا کرنا مگر جو پہلے گزر گیا یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے"|23|۔

تفسیر 23: اس آیت میں بارہواں حکم ہے جس میں محرمات ابدیہ کا تفصیلی بیان ہے اور جاہلیت والوں کا رد ہے کہ وہ ان میں سے بعض خواتین کو جائز تصور کرتے تھے جس کی طرف اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ میں اشارہ ہے۔ اس آیت میں ان خواتین کا ذکر ہے جن کے ساتھ نکاح مطلقاً حرام ہے ان میں سے سات (7) رشتے خواتین نسب کی وجہ سے حرام ہیں یعنی ماں، بیٹی، بہن، خالہ، پھوپھی، بھانجی، بھتیجی اور سات (7) رشتے سبب کی وجہ سے حرام ہیں۔ اسباب یہ ہیں، پہلا سبب رضاعت ہے سبب رضاعت سے دو خواتین حرام ہیں یعنی رضاعی بہن اور رضاعی ماں۔ دوسرا سبب مصاہرت ہے (سسرالی) رشتہ داراس سبب سے چار خواتین کو حرام کیا ہے یعنی ساس، سوتیلی بیٹی (جو تمہاری بیوی کے) دوسرے شوہر سے ہو۔ بہو، سالی، بیوی کی حیات میں اس کے ساتھ نکاح کرنا۔ تیسرا سبب تعلق غیر کی نکاح کا ہے وہ آئندہ آیت میں ایک خاتون ذکر ہوئی ہے جو کسی کے نکاح میں ہو یہ کل سات عورتیں ہوئیں۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے نقل کیا ہے جو کہ صحیح روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ سات عورتیں نسب کی وجہ سے اور سات صہر کی وجہ سے حرام ہوئیں۔ (رواه ابن جرير الطبري 8، 142 وابن ابی حاتم فی تفسیره 3، 911 تخريج ابن كثير وسنده صحيح)۔ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ احکام شرعیہ میں سے حلال یا حرام ہونے کا تعلق بندوں کے افعال کے ساتھ ہوتا ان کی ذات کے ساتھ نہیں۔ اسی وجہ سے علماء کرام کا یہاں اجماع ہے کہ اس سے مراد نکاح کی حرمت ہے۔ گزشتہ اور آنے والا بحث بھی نکاح سے متعلق ہے تو یہ بھی ایک قرینہ ہے۔ اور یہ جملہ بظاہر تو خبریہ ہے مگر معناً انشائیہ ہے اور (فاعل) حرام کرنے والا تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو عرفاً اور شرعاً معلوم ہے اسلئے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ أُمَّهٰتُكُمْ أم اصل کو کہا جاتا ہے لہذا اس معنی کے اعتبار سے یہ لفظ نانی کو بھی حقیقتاً شامل ہے۔ امام قرطبی فرماتے ہیں کہ ام ہر اس خاتون کو کہا جاتا ہے جس کا تجھ پر ولادت کا حق ہو لہذا نانی اور دادی دونوں اس میں شامل ہیں۔ وَبَنٰتُكُمْ بِنتٌ کی جمع ہے اور اس میں وہ تمام خواتین شامل ہیں جن پر تیرا حق ولادت ہو یا اس کا نسب تیری طرف لوٹ آتا ہو ایک مرحلے میں یا دو مرحلوں میں یا اس سے زیادہ میں۔ لہذا یہ الفاظ بیٹی، پوتی نواسی سب کیلئے مشترک ہیں اس کے بعد والی یعنی پڑپوتی وغیرہ اس میں شامل ہیں۔ وَاَخَوٰتُكُمْ یہ اُخْتٌ کی جمع ہے اور اس میں ہر وہ خاتون شامل ہے جو ماں باپ میں تمہارے ساتھ شریک ہو اعیانی اخیافی علاتی تمام قسم کی بہنیں اس میں شامل

ہیں۔اہل لغت کا کہنا ہے کہ بَنَاتٌ بِنْتٌ کی جمع ہے جو اصل بَنِيَةٌ ہے تو (یا) کو حذف کرنے کی وجہ سے با کے نیچے زیر ڈالی گئی ہے اور اخت اصل میں اخوۃ ہے اس میں واؤ کو حذف کیا اور ہمزہ پر پیش اسلئے لاتے ہے تا کہ واؤ محذوف کی طرف اشارہ ہو۔وَعَمّٰتُكُمْ ۔ عَمَّةٌ وہ خاتون ہے جو تیرے دادا اور والد میں تیرے ساتھ ایک اصل میں یا دونوں اصول میں شریک ہو اس کی تین اقسام ہیں کبھی عمۃ والدہ کی طرف سے بھی آتی ہے یعنی والد کی خالہ ہوتی ہے۔وَ خٰلٰتُكُمْ یہ وہ خاتون ہے جو تیری ماں کے ساتھ ایک یا دو اصلوں میں شریک ہو اس میں بھی تین قسمیں ہیں کبھی خالہ باپ کی طرف سے آتی ہے یعنی باپ کی ماں کی بہن ۔وَ بَنٰتُ الْاَخِ وَ بَنٰتُ الْاُخْتِ یہ بھی وہی خواتین ہیں جن پر تیرے بھائی یا بہن کا حق ولادت ہو خواہ بالذات ہو یا بالواسطہ ہو۔اور اَخ اور اُخت میں اعیانی ،اخیافی اور علاتی تینوں شامل ہیں یعنی تمہاری ہرقسم کی بہنوں یا بھائیوں کی بیٹیاں یعنی بھانجیاں و بھتیجیاں سب کی ترتیب میں اقرب فالاقرب (قریب سے قریب تر) کالحاظ کیا گیا ہے مثلاً والدہ ،پھر بیٹی ،پھر بہن ،پھر پھوپھی ،پھر خالہ ،پھر بھتیجی ،پھر بھانجی نیز احترام کی وجہ سے خالہ پھوپھی کو بھانجی و بھتیجی سے پہلے ذکر کیا ہے کیونکہ وہ اکثر عمر میں ان سے بڑی ہوتی ہیں۔وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیْۤ اَرْضَعْنَكُمْ رضاعت کو سبب حرمت بنایا ہے لغت میں رضاعت پستان کے چوسنے کو کہا جاتا ہے شریعت کی اصطلاح میں خاص مدت کے اندر بچے کا عورت کے پستان سے دودھ پینا ہے نیز کسی اور ذریعے سے بھی اگر بچہ یہ دودھ عورت سے پی لے تو رضاعت ثابت ہوگی یعنی بوتل وغیرہ سے ،اہل رضاعت سے یہاں پر دو رشتے ذکر کئے ہیں (ماں اور بہن) لیکن ابن عباس رضی اللہ عنہم اور عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایات سے ثابت ہے کہ جو رشتے نسب سے حرام ہیں وہ رشتے رضاعت سے بھی حرام ہیں۔(صحیح بخاری کتاب الشھادات حدیث 2646 صحیح مسلم کتاب الرضاع حدیث 1444) امام قرطبیؒ نے اس کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے کہ جو خاتون بچے کو دودھ پلاتی ہے وہ اس بچے کی رضاعی ماں بن گئی اس کی بیٹی رضاعی بہن بنی اس کی بہن خالہ بنی اور اس کی ماں رضاعی نانی بنی اور جس کی وجہ سے دودھ پیدا ہوا یعنی اس آدمی کی بچی اس کی رضاعی بہن بنی۔یعنی دوسری عورت سے ہو اور یہ شخص اس کا رضاعی والد بنا اس کی بہن رضاعی پھوپھی بنی اور اس کی ماں دادی بنی اور اس آدمی کی پوتی نواسی بھی اس لڑکے پر حرام ہوئی کیونکہ وہ اس کی رضاعی بھانجیاں اور بھتیجیاں بنیں۔امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک دودھ زیادہ یا کم مقدار میں ہو رضاعت ثابت ہوگی جبکہ امام شافعی اور دیگر علماء کے نزدیک پانچ مرتبہ دودھ پلانا شرط ہے یعنی خَمْسُ رَضَعَاتٍ۔(صحیح بخاری کتاب الشھادۃ حدیث 2646 صحیح مسلم کتاب

الرضاع حدیث 1450 ابو داؤد، کتاب النکاح حدیث 2063، ترمذی کتاب الرضاع حدیث 1150)۔ اس میں مزید دو اقوال بھی ہیں تفصیل کیلئے تفسیر روح المعانی اور قرطبی ملاحظہ کیجئے۔ نیز دو سال کی عمر کے بعد رضاعت ثابت ہے یا نہیں اس کی تفصیل امام آلوسیؒ نے ذکر کی ہے۔ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ یہ عام بہن ہے اعیانی، اخیافی اور علاتی سب اس میں شامل ہیں۔ مِّنَ اجلیہ تعلیل کیلئے ہے۔ سوال: جب رضاعت ماں اور بہن اور دیگر رشتوں کیلئے بھی ہے تو ان دونوں کو کیوں خاص کیا ہے؟ جواب: نسب کی وجہ سے حرمت دو طریقوں سے ہے۔ (1) پہلا طریقہ ولادت سے ہے جو کہ ماں اور بیٹی ہے۔ (2) دوسرا طریقہ اخوت سے ہے اس میں پانچ رشتے ہیں بہن، خالہ، پھوپھی، بھتیجی، بھانجی تو رضاعت میں بھی یہ دو طریقے استعمال کئے ہیں پہلا ولادت جو رضاعی ماں ہے اور دوسرا اخوت جو رضاعی بہن ہے اور یہ باقی کیلئے اختصار کے ساتھ تنبیہ ہے۔ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ: اُمَّهٰتُ کے لفظ میں نانی دادی شامل ہیں اور نِسَآء سے منکوحات نکاح والی عورتیں مراد ہیں اور اس میں عموم ہے اس کے ساتھ دخول یعنی مباشرت ہو یا نہ ہو۔ یہ قول صحابہ کرام تابعین اور چاروں ائمہ کرام کا ہے۔ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ، رَبَائِبُ رَبِیْبَةٌ کی جمع ہے وہ بیٹی جو دوسرے باپ سے ہو اور ماں کے ساتھ دوسرے سوتیلے باپ کے ساتھ منسلک ہو جاتی ہے اور وہ سوتیلا باپ اس کی پرورش کرتا رہتا ہے۔ حُجُوْرِ حجر کی جمع ہے لغت میں کروٹ کو کہا جاتا ہے عام اصطلاح میں گود کو کہا جاتا ہے جبکہ مراد پرورش ہے یہ قید غالبی کے طور پر ہے کیونکہ اکثر جب کوئی خاتون مطلقہ یا بیوہ ہو کر دوسری شادی کرتی ہے تو اپنے ساتھ بچی کو دوسرے شوہر کے گھر لیکر جاتی ہے اور رَبَائِبُ اور حُجُوْرِكُمْ کے الفاظ حرمت کی علت کی تاکید کیلئے ہیں۔ جیسا کہ لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً میں تاکید ہے۔ اکثر اہل علم کے نزدیک یہ قید احترازی نہیں ہے اگر وہ اس باپ کی پرورش میں نہیں ہوگی تب بھی وہ اس پر حرام ہے۔ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ یہ صفت صرف بعد والی نِسَآئِكُمْ کیلئے ہے سابقہ کیلئے نہیں ہے اسلئے کہ اس حرمت میں دخول شرط ہے سابقہ میں نہیں ہے۔ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اس کی تصریح میں اشارہ ہے کہ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ میں جو قید لگائی ہے وہ فِیْ حُجُوْرِكُمْ کی طرح نہیں ہے وہ تو عادتی اور غالبی قید ہے اور یہ احترازی ہے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص کسی بیوہ یا مطلقہ سے نکاح کرتا ہے اور اس کے ساتھ جماع نہیں کیا اس سے پہلے فوت ہوئی یا طلاق دی تو اس خاتون کے دوسرے شوہر سے پیدا ہونے والی لڑکی سے یہ شخص نکاح کر سکتا ہے۔ امام قرطبیؒ نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک، ثوری سے نقل کیا ہے کہ شہوت سے ہاتھ لگانا یا خاص مقام کو شہوت سے دیکھنا جماع میں داخل

اور شامل ہے (مگر یہ قول درست نہیں) وَحَلَآئِلُ اَبۡنَآئِكُمُ الَّذِيۡنَ مِنۡ اَصۡلَابِكُمۡ: حَلَآئِلُ حَلِیۡلَةٌ کی جمع ہے اور حلول سے لیا گیا ہے یعنی بیوی شوہر کے ساتھ ایک بستر پر حلول کرتی ہے یا جہاں شوہر نزول کرتا ہے وہاں بیوی بھی رہائش اختیار کرتی ہے کیونکہ وہ شوہر کی تابع ہے اس معنی میں حلیلہ فاعل کے معنی میں ہے یا پھر یہ حل اور حلال سے لیا گیا ہے جو مفعول کے معنی میں ہے یعنی حلال کی ہوئی۔ اس سے مراد منکوحات شادی شدہ خواتین ہیں یعنی صرف نکاح کرنے پر وہ اپنے سسر پر حرام ہو جاتی ہے خواہ اس کے بیٹے نے اس سے مباشرت (جماع) کی ہو یا نہیں۔ اَبۡنَآئِكُمۡ اس حکم میں بچے کا بیٹا (پوتا) اور اس کے بعد والے شامل ہیں جہاں تک یہ سلسلہ جاتا ہے حرمت جاری ہوگی۔ اَصۡلَابِكُمۡ صلب کی جمع ہے صلب کمر کو کہتے ہیں یہاں مراد پانی کا نطفہ ہے جو مرد کی پشت (کمر) سے نکلتا ہے جیسا کہ سورۃ طارق میں ارشاد گرامی ہے يَخۡرُجُ مِنۡۢ بَيۡنِ الصُّلۡبِ وَالتَّرَآئِبِ اس لفظ کے ذریعے سے متبنّٰی یعنی منہ بولے بیٹے سے احتراز کیا گیا ہے کیونکہ وہ عرف عرب میں بیٹوں میں شمار تھا جبکہ اس کی بیوی سے (اس کی موت یا طلاق دینے کے بعد) نکاح کرنا جائز ہے البتہ رضاعی بیٹا اس میں شامل نہیں ہے کیونکہ وہ مستقل حرمت والوں میں سے ہے۔ جیسا کہ بخاری کی حدیث میں گزرا ہے کہ جو رشتے نسب سے حرام ہیں وہی رشتے رضاعت سے بھی حرام ہوتے ہیں۔ متبنّٰی منہ بولا بیٹا اور اسکی بیوی کی حلت سورۃ احزاب میں ذکر ہے۔ وَاَنۡ تَجۡمَعُوۡا بَيۡنَ الۡاُخۡتَيۡنِ یہ اُمَّهٰتُكُمۡ پر عطف ہے اور مقام رفع میں ہے یعنی ایک شخص کے نکاح میں دو بہنوں کا رہنا حرام ہے اپنی سالی کے ساتھ نکاح کرنا حرام ہے جب تک اس کی بیوی زندہ اور اس کے نکاح میں ہو۔ جمع اسلئے ذکر کیا ہے کہ یہاں پر ابدی حرمت مراد ہے اور وہ جمع کرنے سے متعلق ہے جمع کرنے کے بغیر تو ہر ایک کا نکاح جائز ہے اور اس جمع کے حکم میں (صحیح بخاری کتاب النکاح حدیث 5109 صحیح مسلم حدیث 1408 ابوداؤد حدیث 2065 ترمذی حدیث 1126 سنن نسائی حدیث 98 کی حدیث سے بیوی کے ساتھ اس کی پھوپھی، خالہ، بھانجی، بھتیجی بھی حرام ہے اس حدیث کو نسائی نے چھ (6) صحابہ کرام سے نقل کیا ہے حدیث مشہور ہے اور صحیح حدیث سے حکم قرآن مجید کو مقید کرنا درست ہے۔ یہ بات سورۃ اعراف میں (وَاِذَا قُرِئَ الۡقُرۡاٰنُ الخ میں ان شاء اللہ ذکر ہوگی) البتہ جب کوئی بیوی کو غیر رجعی طلاق دیدے تو عدت پوری ہونے سے قبل اس کی بہن یعنی سالی سے نکاح کر سکتا ہے یا نہیں تو اس میں صحابہ کرام، تابعین اور علماء کرام میں اختلاف ہے اور طلاق رجعی دی ہو تو پھر عدت پوری ہونے کا انتظار کرے گا البتہ اگر کوئی بیوی فوت ہو جائے تو اس کی بہن سے نکاح کر سکتا ہے عدت پوری ہونے کا انتظار ضروری نہیں ہے۔ اِلَّا مَا قَدۡ

سَلَفَ یہ استثناء منقطع ہے یعنی جو جاہلیت میں گزر گیا ہے یعنی بعض محرمات سے نکاح کیا تھا اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کرے گا۔ اکثر مفسرین کے نزدیک اس کا تعلق دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنے سے ہے کیونکہ مذکورہ دیگر محرمات کے تو وہ جاہلیت قائل تھے جیسا کہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے البتہ دو بہنوں کو جمع کرنا جائز قرار دیتے تھے اسلئے فرمایا گیا کہ جنہوں نے دو بہنوں کو جاہلیت میں ایک ساتھ نکاح میں رکھا ہے وہ اسلام قبول کرنے کے بعد ایک ان میں سے الگ کر دے یعنی طلاق دیدے۔ اس طرح ترمذی کتاب النکاح حدیث 1129 ابوداؤد کتاب الطلاق حدیث 2243 میں وارد ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ جاہلیت والے تمام محرمات کے قائل تھے البتہ سوتیلی ماں اور دو بہنوں کو جمع کرنے کی حرمت کو نہیں مانتے تھے۔ اس لئے دونوں کے آخر میں فرمایا اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ یہ قول امام محمد بن حسن کا بھی ہے۔ (قرطبی، آلوسی)۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ سے متعلق ہے۔ سوتیلی ماں سے نکاح بہت قبیح برائی تھی تو اس کیلئے اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً الخ فرمایا اور وجمع بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ میں اس کی بنسبت برائی قباحت کم تھی کیونکہ کہا گیا ہے کہ یعقوب علیہ السلام کے دین میں اس کا جواز تھا اسلئے اس کے آخر میں مغفرت اور رحم ذکر کیا ہے۔

وَّالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ‌ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ‌ۚ وَاُحِلَّ لَـكُمۡ مَّا وَرَآءَ ذٰ لِكُمۡ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا بِاَمۡوَالِكُمۡ مُّحۡصِنِيۡنَ غَيۡرَ مُسٰفِحِيۡنَ‌ ؕ فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهٖ مِنۡهُنَّ فَاٰ تُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ فَرِيۡضَةً‌ ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِيۡمَا تَرٰضَيۡتُمۡ بِهٖ مِنۡۢ بَعۡدِ الۡفَرِيۡضَةِ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ﴿۲۴﴾

"اور شادی شدہ عورتیں بھی (حرام ہیں) مگر جن کے تمہارے دائیں ہاتھ مالک ہوں یہ اللہ تعالیٰ نے تم پر لکھ دیا ہے۔ اور جو ان کے علاوہ ہیں وہ حلال کر دی گئی ہیں بشرطیکہ تم اپنے مالوں کے بدلے سے تلاش کرو نکاح میں لانے والے ہو نہ کہ بدکاری کرنے والے ہو پھر ان خواتین سے جو فائدہ اٹھایا تم نے تو ان کو انکا مہر جو مقرر کردہ ہے دیدو اور کوئی گناہ نہیں اگر مقرر کردہ مہر میں باہم رضامندی سے کوئی (کمی بیشی) ہو جائے یقیناً اللہ تعالیٰ خوب جاننے اور بڑی حکمت والا ہے"[2]۔

تفسیر 24 یہاں سے محرمات سببیہ کی ساتویں قسم کو ذکر فرما رہے ہیں یہ اس ساتویں قسم کو ماقبل سے الگ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ماقبل کی محرمات کی تحریم ابدی اور ہمیشہ کے لئے ہے اور اس قسم کی تحریم ہمیشہ کے لئے نہیں ہیں۔ تنبیہ: تلاوت قرآن کے دوران میں اس آیت کو سابقہ آیت سے منقطع یعنی زیادہ وقفہ سے نہیں پڑھنا چاہئے کیونکہ یہ مضمون کے اعتبار سے سابقہ پر عطف ہے الگ پڑھنے سے کلام ناقص رہتا ہے۔ وَّ الۡمُحۡصَنٰتُ یہ إِحۡصَانٌ سے لیا گیا ہے اور إِحۡصَانٌ حِصۡنٌ سے لیا گیا ہے اور حِصۡنٌ لغت میں منع کرنے اور بچانے کے معنی میں ہے جیسا کہ سورۃ انبیاء آیت 80 میں ہے کہ لِتُحۡصِنَكُمۡ مِّنۡۢ بَاۡسِكُمۡ اسی طرح حِصَانٌ وہ خاتون ہے جس نے اپنے آپ کو زنا سے محفوظ رکھا ہے اور احصان قرآن مجید میں چار معنوں میں مستعمل ہے: پہلا معنی تزوج ہے یعنی نکاح کرنا اس آیت میں اور مُّحۡصِنِيۡنَ بعد والی آیت میں مُحۡصَنٰتٌ اور اُحۡصِنَّ (یہ الفاظ نکاح کیلئے استعمال ہوئے ہیں)۔ دوسرا معنی پاکدامنی ہے جیسا کہ اَلَّتِىۡۤ اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَهَا (سورۃ انبیاء 91) اور وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الۡمُؤۡمِنٰتِ (سورۃ مائدہ 5)۔ تیسرا معنی (حریت) آزادی ہے جیسا کہ بعد میں یہ الفاظ وارد ہیں فَعَلَيۡهِنَّ نِصۡفُ مَا عَلَى الۡمُحۡصَنٰتِ مِنَ الۡعَذَابِ: چوتھا معنی اسلام ہے بقول امام قرطبی قرآن میں اس معنی میں وارد نہیں ہے البتہ حدیث میں وارد ہے صاحب اللباب کا قول ہے کہ بعض مفسرین نے بعد میں آنے والے الفاظ (فَاِذَاۤ اُحۡصِنَّ) کو آزادی کے معنی میں لیا ہے۔ لہٰذا یہاں پر اَلۡمُحۡصَنٰتِ میں پہلا معنی مراد ہے یعنی وہ عورتیں جو کسی کے نکاح میں ہوں وہ بھی حرام ہیں۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

کہ یہ آیت مشرکین مکہ کی بیویوں کے متعلق نازل ہوئی۔ مشرکین کی بیویاں ہجرت کر کے مدینہ آئیں اور اسلام قبول کرتیں مدینہ کے مسلمان ان عورتوں سے شادیاں کر لیتے اس کے بعد ان عورتوں کے شوہر بھی مسلمان ہو کر مدینہ ہجرت کرتے جبکہ ان کی بیویوں کے ساتھ مسلمانوں نے نکاح کیا ہوتا تھا اس آیت میں ان عورتوں کے نکاح سے گزشتہ شوہروں کی وجہ سے منع فرمایا۔ اور پھر اس میں سے استثنا کیا ہے کہ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اس سے مراد وہ عورتیں ہیں جو جنگ کے موقع پر کافروں سے چھین لی جاتی ہیں یعنی لونڈیاں مَلَكَتْ سے مراد لونڈیاں ہیں اور لونڈی بنتے ہی انکا سابقہ نکاح ختم ہو جاتا ہے۔ یہ قول عمر فاروق، عثمان غنی رضی اللہ عنہما اور دیگر بہت سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام اور چاروں ائمہ کرام کا ہے البتہ اس میں اختلاف ہے کہ شوہر بھی قید ہو کر ساتھ آیا ہو تو نکاح ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں امام شافعی کے نزدیک نکاح پھر بھی ٹوٹ جاتا ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک نکاح نہیں ٹوٹتا جب شوہر بھی ساتھ قیدی بنا ہو۔ (اس کی مزید تفصیل روح المعانی میں ملاحظہ کیجئے)۔ اس میں مزید اقوال بھی ہیں مگر پہلا قول بہتر ہے۔ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اس میں تین وجوہ یعنی اعراب ہیں۔ (1) مضمون کی حرمت کیلئے مفعول مطلق ہے یعنی مذکورہ جملوں میں کتابت کا معنی ہے۔ یعنی كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ تَحْرِيْمَ مَا ذُكِرَ سَابِقًا كِتَابًا اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر اس گزرے ہوئے حکم کی فرضیت لکھ دی ہے۔ (2) یہ منصوب ہے (اغراء) ابھارنے کے ساتھ یعنی كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ تمہارے اوپر اللہ تعالیٰ کا حکم کتاب لازم ہے یہ امام کسائی کا قول ہے اور ان کے نزدیک منصوب کی تقدیم جائز ہے۔ (3) یہ مقدر فعل کی وجہ سے منصوب ہے یعنی اَلْزِمُوْا كِتَابَ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو لازمی پکڑو۔ یہ قول ابوالبقاء کا ہے وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ یہ حرمت پر عطف ہے یعنی حرمت کے بعد اب حلت کا ذکر ہے۔ سوال: اس سے تو ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ قسموں کے علاوہ تمام عورتیں حلال اور ان کے ساتھ نکاح جائز ہے یعنی خالہ، پھوپھی، بھانجی، بھتیجی، نانی، دادی، رضاعی ماں اور بہن کے علاوہ دیگر رشتے یا کسی کی عدت میں ہونے والی خاتون، پانچویں عورت کو نکاح میں رکھنا اور لعان کی ہوئی عورت واپس لعان کرنے والے کیلئے اور مطلقہ ثلاثہ دوسرے شوہر کی مباشرت سے پہلے اسی آدمی کیلئے جب تک کہ دوسرے شوہر سے شادی کر کے مباشرت نہ کرے۔ جواب: کے مختلف پہلو ہیں۔ (1) یہ آیت عام ہے جبکہ عام کو دوسرے نصوص کے ذریعے سے خاص کیا جاتا ہے یعنی پانچویں عورت سے نکاح کرے، مطلقہ ثلاثہ عورت جب تک دوسرے شوہر سے نکاح مباشرت شرعی اصول کے مطابق نہ کرے اور عدت کے زمانے کے متعلق دوسری آیاتیں نازل ہوئی ہوں اور ایک ہی

شخص کے نکاح میں بیوی کے ساتھ خالہ، پھوپھی، بھانجی، بھتیجی، رضائی رشتے جو ماں اور بہن کے علاوہ ہیں ان کی حرمت اخبارِ آحاد سے نہیں۔ اخبارِ مشہورہ سے ہے

(صحیح بخاری کتاب الشھادات حدیث 2646 صحیح مسلم کتاب الرضاع حدیث 1444 جیسا کہ گزر گیا صحیح بخاری کتاب النکاح حدیث 5104، صحیح مسلم کتاب النکاح حدیث 1408 میں ہے) اور وہ احادیث جن میں بیوی کی حیات میں اس کی خالہ، پھوپھی، بھانجی، بھتیجی کو جمع کرنے کا منع آیا ہے وہ آٹھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے نقل ہیں یعنی ابن عباس، جابر، ابن عمر، ابو موسیٰ، ابو سعید، ابو ہریرہ اور عائشہ رضی اللہ عنہم سے نقل ہیں۔ بعض علماء نے متواتر کا حکم لگایا ہے۔ ابن عطیہ کا قول ہے کہ اس تحریم پر اجماع ہے لہٰذا قرآن سے تخصیص متواتر حدیث یا مشہور و اجماع کے ذریعے سے کرنا اتفاقی مسئلہ ہے (البحر المحیط)۔ (2) ہمارے ذمہ قرآن و سنت پر عمل کرنا فرض ہے ان میں سے بعض مسائل قرآن اور بعض حدیث میں وارد ہیں اس کی تفصیل مفسر قاسمی نے ذکر کی ہے۔ (3) بَعْدَ کا لفظ یا غَیْرَ ذٰلِکُمْ کے الفاظ نہیں فرمائے بلکہ وَرَآءَ ذٰلِکُمْ فرمایا جو بہت ہی دوری پر دلالت کرتا ہے یعنی گزشتہ آیتوں میں محرمات کا صراحتاً ذکر ہوا ہے اس سے بعض دلالتاً ثابت ہوتے ہیں اور بعض احادیث کے ذریعے سے ثابت ہوتے ہیں ان سب کے بعد دیگر عورتیں حلال ہیں۔ اس کی طرف ابن عطیہ رحمہ اللہ نے اشارہ کیا ہے اور آلوسی رحمہ اللہ نے بھی۔ (4) یہ اقرباء کے ساتھ مقید ہے یعنی حلال کیا گیا ہے ماقبل اقارب کے علاوہ جو غیر محارم ہیں ان تمام توجیہات میں پہلی توجیہ اولیٰ اور راجح ہے۔ (تفسیر ابو حیانؒ)۔ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ اس کے محلِ اعراب میں اختلافؒ ہے: (1) مَّاوَرَآءَ ذٰلِکُمْ سے بدل اشتمال ہے لہٰذا محل رفع میں ہے۔ (2) دوسرا قول یہ ہے کہ مفعول لہٗ ہے اور نصب کے محل میں واقع ہے اور لام اجلیہ مقدر ہے۔ (3) تیسری وجہ یہ ہے کہ یہاں (با) مقدر ہے یعنی بِاَنْ تَبْتَغُوْا اور جر کے محل میں واقع ہے اور تَبْتَغُوْا کا مفعول مقدر ہے یعنی النِّسَآءَ۔ بِاَمْوَالِکُمْ میں (با) (عوض) بدلہ کیلئے ہے اور اموال سے مہر کا مال مراد ہے جو نکاح کیلئے عوض ہے۔ امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ لفظ دلالت کرتا ہے کہ مہر تھوڑا ہو یا زیادہ جائز ہے اور جمہور اہل علم و اہل الحدیث کا یہی موقف ہے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ ہر چیز جو کسی چیز کی قیمت بن سکتی ہے وہ مہر میں دی جا سکتی ہے خواہ کم ہو یا زیادہ۔ تو معلوم ہوا کہ تعلیم قرآن مجید مہر میں دی جا سکتی ہے کیونکہ اس پر اجرت جائز ہے اور اس پر دلیل وہ مشہور حدیث ہے جو امام بخاریؒ وغیرہ نے نقل کی ہے۔ صحیح بخاری کتاب النکاح حدیث 5135 امام مالکؒ کا قول ہے کہ تین درہم یا دینار کا چوتھائی حصہ مہر ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے دس

درہم کا قول ذکر کیا ہے اور دارقطنی کی ایک روایت سے استدلال کیا ہے لیکن اس حدیث کی سند میں مبشر بن عبید راوی ہے جو محدثین کے نزدیک متروک ہے جیسا کہ امام قرطبی نے اس کی تفصیل ذکر کی ہے البتہ دارقطنی نے جو لوہے کی انگوٹھی یا معمولی دیگر چیزیں ذکر کی ہیں وہ صحیح روایات سے ثابت ہیں۔ (صحیح ابوداؤد حدیث 4223 صحیح ترمذی حدیث 1785 صحیح جامع الصغیر 2938 نسائی حدیث 5195)۔ مُّحْصِنِيْنَ یہ تَبْتَغُوْا کے فاعل سے حال ہے اور احصان سے مراد نکاح ہے۔ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ یہ دوسرا حال ہے لغت میں سفح بہانے کو کہا جاتا ہے جیسا کہ سورۃ انعام میں دَمًا مَّسْفُوْحًا آیا ہے اور یہاں پر سفاح سے زنا کرنا مراد ہے کیونکہ زنا میں بھی پانی بہانا یعنی منی زائل کرنا مقصد ہوتا ہے اس میں تصریح ہے کہ نکاح کے عوض مال دینا مراد ہے جس کو مہر کہا جاتا ہے۔ زنا کی اجرت مراد نہیں ہے کیونکہ وہ تو حرام ہے۔ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً سابقہ جملے میں شرط مہر ذکر کی گئی تھی تو اس جملے میں اس (مہر) کے کامل ایجاب کے لیے سبب ذکر ہے جو کہ اِسْتِمْتَاع یعنی فائدہ اٹھانا ہے (مَا) موصولہ یا شرطیہ ہے اور اس میں مراد وہ خاتون ہے جس سے فائدہ لیا جائے یعنی مباشرت کی جائے یہ نَوْعٌ مُّسْتَمْتَعٌ کی تاویل کے ساتھ یا پھر (مَا) مصدریہ ہے تو پھر مراد یہ ہوگا کہ وہ فائدہ جو تم حاصل کر لیتے ہو۔ فَاٰتُوْهُنَّ اس کی جزاء اور خبر ہے اور هُنَّ کی ضمیر حرف (مَا) کی طرف راجع ہے کیونکہ (مَا) نساء کے معنی میں ہو سکتا ہے دوسری توجیہ یہ ہے کہ (مَا) مہر کے معنی میں ہے اور بِهٖ میں (بَا) سببیہ عوضیہ ہے۔ اُجُوْرَهُنَّ میں اسم ظاہر کو ضمیر کی جگہ ذکر کیا ہے تاکہ علت کا وجوب واضح ہو جو کہ اجرت یعنی مہر ہے اور وہ دینا واجب ہے۔ اِسْتِمْتَاعٌ لغت میں فائدہ حاصل کرنے کے معنی میں ہے اور جس چیز کے بدلے نفع حاصل کیا جائے وہ متاع کہلاتا ہے۔ جمہور مفسرین کے نزدیک اس سے مراد جماع ہے جو نکاح کے بعد کیا جاتا ہے جس کی دلیل لفظ مُّحْصِنِيْنَ کے ساتھ پہلے گزری ہے۔ اس جملے کا معنی یہ ہے کہ جب نکاح کے بعد مباشرت کرے تو پورا مہر ادا کرے گا جبکہ مباشرت سے قبل شوہر پر نصف مہر ادا کرنا لازم تھا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک خلوت صحیحہ کے ساتھ شوہر پر کامل مہر ادا کرنا لازم ہوتا ہے۔ بعض مفسرین نے اس سے مراد متعہ لیا ہے جو کہ منسوخ ہوا ہے جبکہ پہلے یہ جائز عمل تھا۔ ایک قراءت میں اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لفظ آیا ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا اور قاسم بن محمد سے نقل ہے کہ متعہ کی حرمت اور منسوخ ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے پھر انہوں نے بطور دلیل قرآن سے تلاوت کی وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ؛ سورۃ المومنون آیت 6 یعنی متعہ نکاح شرعی نہیں ہے اور ملکیت

(ملک) بھی نہیں ہے تو وَرَآءَ ذٰلِكُمْ میں داخل ہے اس قول اور تفسیر کے مطابق یہ آیت مکی سورۃ میں مدنی آیت ہے۔ دارقطنی میں علی رضی اللہ عنہ سے روایت نقل ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ سے منع کیا تھا۔ صحیح مسلم کی روایت کتاب النکاح حدیث 1421 جو سبرۃ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم نے ارشاد فرمایا ہے کہ متعہ قیامت تک حرام ہے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ متعہ منسوخ ہے کیونکہ طلاق، عدت، میراث، تینوں متعہ والی عورت کیلئے نہیں ہیں لہٰذا یہ متعہ کی منسوخیت کیلئے دلیل ہے کیونکہ وہ مدت مقررہ کے بعد آزاد ہوتی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما متعہ کے قائل تھے لیکن منسوخیت کا حکم پہنچنے کے بعد انہوں نے رجوع کیا تھا۔ اس طرح عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے بھی رجوع کیا تھا۔ (مزید تفصیل کیلئے قرطبی روح المعانی اللباب دیکھئے)۔ اُجُوْرَهُنَّ اس سے مراد بالاتفاق مہر ہے خواہ مہر مسمّٰی ہو یا مہر مثل اور مہر عوض ہے عورت کے سارے بدن کا حلال ہونا اس سے فائدہ اٹھانا اس قول کو امام قرطبیؒ نے نقل کیا ہے فَرِيْضَةً اُجُوْرَ سے حال ہے یا فعل مقدر سے مفعول متعلق ہے یعنی فَرَضَ اللّٰهُ فَرِيْضَةً پھر مفعول مطلق ہے۔ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ اس جملے میں مہر مقرر کرنے اور فرض ہونے کے بعد اس میں کمی یا اضافہ کرنا یا معاف کرنا مقصود ہے۔ اس میں اضافہ کرنے میں شوہر کی رضامندی شرط ہے اور کم کرنے میں عورت کی رضامندی شرط ہے۔ جیسا سورۃ بقرہ آیت 237 اور سورۃ نساء آیت 4 میں گزرا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا اس میں گزرے ہوئے احکام پر عمل پیرا ہونے کیلئے ترغیب ہے یعنی اس میں اتنی بے شمار حکمتیں ہیں جو بندوں کے علم سے بالاتر ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَاۤ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ع ﴿۲۵﴾ ” اور جو شخص تم میں سے آزاد مومن عورت سے نکاح کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ہو تو ان سے نکاح کرے ع
جس کے تمہارے دائیں ہاتھ مالک ہیں تمہاری مومن لونڈیوں میں سے اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان کو خوب جانتا ہے بعض تمہارے بعض سے ہیں لہٰذا تم ان کے مالکوں کی اجازت سے ان سے نکاح کرو اور تم انہیں ان کا مہر دستور کے مطابق دو

جب وہ نکاح میں لائی گئی ہوں نہ ہوں بدکاری کرنے والیاں اور نہ ہی چھپے یار بنانے والیاں پھر جب وہ نکاح میں لائی جا چکیں پھر وہ اگر بے حیائی کا کام کریں تو ان پر آدھی سزا ہے جو آزاد عورتوں پر ہے یہ اجازت اس کیلئے جو تم میں سے گناہ میں پڑنے سے ڈریں اگر تم صبر کرو تو تمہارے لئے بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے" [25]۔

تفسیر 25: اس آیت میں تیرہواں حکم بیان ہو رہا ہے یعنی آزاد عورتوں میں حلال وحرام کی وضاحت کے بعد لونڈیوں کے ساتھ نکاح حلال وحرام کا بیان ہو رہا ہے اس آیت میں کل (9) جملے ہیں۔ پہلا جملہ وَمَنۡ لَّمۡ يَسۡتَطِعۡ مِنۡكُمۡ طَوۡلًا اَنۡ يَّنۡكِحَ اصل میں طول فضل کو کہا جاتا ہے اور اس میں تین اقوال ہیں۔ (1) پہلا قول ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ کا ہے کہ طَوۡلًا مالداری وسعت غنا کے معنی میں ہے اور یہاں پر آزاد عورت کے مہر ادا کرنے کی وسعت مراد ہے یعنی جب اس کی طاقت آزاد عورت کے مہر دینے کی نہ ہو۔ (2) دوسرا قول ابن حبیب امام ابو یوسف اور امام ابو حنیفہ کا رحمہم اللہ ہے کہ لفظ طَوۡلًا سے مراد اس آدمی کے نکاح میں آزاد عورت کا ہونا ہے یعنی جب اس کے نکاح میں آزاد عورت موجود ہے تو لونڈی سے نکاح جائز نہیں ہے اگرچہ اس کے پاس وسعت نہ ہو اور عَنَتَ سے مراد اپنے آپ کو مشکل میں ڈالنا ہے یعنی اس (عَنَتَ) سے ڈرتا ہے (طبری)۔ (3) تیسرا قول قتادہ، نخعی، عطاء اور سفیان ثوری رحمہم اللہ کا ہے کہ طَوۡلًا سے صبر اور دلیری مراد ہے۔ اس قول کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص لونڈی سے محبت کرتا ہے اور عَنَتَ زنا سے بھی ڈرتا ہے تو اس کو چاہئے کہ اس سے نکاح کرے اگرچہ آزاد عورت سے نکاح کی وسعت رکھتا ہے۔ ان اقوال کی تشریح: پہلے قول میں لونڈی سے نکاح دو شرطوں پر کیا جا سکتا ہے۔ (1) آزاد عورت سے نکاح کی طاقت نہ ہو۔ (2) عَنَتَ یعنی زنا کا خوف ہو۔ یہ جابر، ابن عباس رضی اللہ عنہم، عطاء، طاؤس، امام شافعی، امام مالک، امام احمد رحمہم اللہ کا قول ہے۔ مجاہد اور امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ لونڈی سے نکاح کے قائل ہیں اگرچہ آزاد عورت سے نکاح کی طاقت رکھتا ہو تو وہ عمومات سے دلیل لیتے ہیں، اور ان کے نزدیک اس آیت کا محمل قول ثانی ہے یا پھر ان کے نزدیک مفہوم شرط معتبر نہیں ہے۔ طَوۡلًا یہ معنوی اشتراک کی وجہ سے يَسۡتَطِعۡ کیلئے مفعول مطلق ہے اور اَنۡ يَّنۡكِحَ مفعول بہ ہے يَسۡتَطِعۡ کیلئے یا طَوۡلًا کے ساتھ متعلق ہے اور طَوۡلًا حاصل ہونے کے معنی میں مفعول بہ ہے۔ یعنی جو آزاد عورتوں سے نکاح کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ہے۔ الۡمُحۡصَنٰتِ بالاتفاق اس سے مراد آزاد خواتین ہیں جس کیلئے مَامَلَكَتۡ قرینہ دلیل ہے۔ الۡمُؤۡمِنٰتِ یہ قید مشرکات، کتابیات غیر کتابیات کے مقابل ہے یعنی اگر کوئی شخص آزاد مومن عورت سے

نکاح کی طاقت نہیں رکھتا ہے مگر آزاد اہل کتابیہ سے نکاح کی طاقت رکھتا ہے تو اس کیلئے جائز ہے کہ مؤمن لونڈی سے نکاح کرے۔ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اس میں فَلْيَتَزَوَّجْ کا فعل مقدر ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ اس سے دوسرے مسلمان بھائی کی لونڈی مراد ہے کیونکہ اپنی لونڈی سے کسی کیلئے نکاح کرنے کی ضرورت نہیں ہے (ابن جریر، قرطبی)۔ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ یہ فتات کی جمع ہے یعنی عرب اپنی اصطلاح میں غلام کو فتی اور لونڈی کو فتات کہتے ہیں اور صحیح حدیث میں وارد ہے کہ لونڈی کو اَمَتِي اور غلام کو عَبْدِي مت کہو بلکہ فَتَايَ وَفَتَاتِي بولو اور یہ حکم مستحب ہے۔ [صحیح بخاری کتاب العتق حدیث 2552 صحیح مسلم حدیث 2249]۔ اَلْمُؤْمِنٰتِ اس لفظ کے اشارے سے وہ مشرکہ لونڈی جو اہل کتاب میں سے ہے الگ کیا اسلئے اکثر اہل علم کا قول ہے کہ اہل کتاب کی لونڈیوں سے نکاح درست نہیں ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک یہ قید صرف فضیلت کیلئے ہے ان کا قیاس یہ ہے جب کتابیہ آزاد عورتوں سے نکاح جائز ہے تو لونڈیوں سے بھی جائز ہے لیکن یہ قیاس درست نہیں ہے کیونکہ شریعت میں لونڈیوں سے نکاح کرنے میں تنبیہ وتحذیر ہے اور مفسر صاحب اللباب نے اس کیلئے الگ فصل قائم کی ہے اور آٹھ وجوہات اس کی حرمت کی بیان فرمائی ہیں۔ لہذ آزاد کتابیہ عورت پر کتابیہ لونڈی کو قیاس کرنا درست نہیں۔ (2) دوسرا جملہ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ اس جملے میں لونڈیوں کے ساتھ شروط کے تحت نکاح کرنے کی ترغیب دی گئی ہے کیونکہ اکثر لوگ ان کے نکاح کرنے سے نفرت کرتے ہیں حالانکہ یہ درست نہیں ہے تو اس جملے میں مقصد یہ ہے کہ اس سے نکاح کیلئے ظاہری ایمان کافی ہے باقی باطنی یعنی دل کا حساب تو اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ ہم اس علم پر مکلف نہیں ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس سے ظاہری عمل کفر وشرک ثابت نہ ہو۔ تیسرا جملہ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ اس میں بھی لونڈیوں سے نکاح کی ترغیب ہے اس میں ان لوگوں کا رد ہے جو نسب حسب کی وجہ سے لونڈیوں کے نکاح سے نفرت کرتے ہیں یعنی جب تمہاری جنس ایک اور دین ایک ہے تو پھر نفرت کس بات کی؟۔ چوتھا جملہ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ یہ لونڈی سے نکاح کیلئے شرط ہے اگر چہ وہ بالغہ ثیبہ ہو اور اہل سے مراد ولایت کی اہلیت ہے یعنی مالک اور مولی۔ لونڈی سے مالک کی اجازت کے بغیر نکاح باطل ہونے کی اور یہ جملہ دلیل ہے کہ اس آیت میں غیر کی لونڈی سے نکاح کا ذکر ہے اپنی لونڈی مراد نہیں جیسا کہ گزر گیا ہے۔ پانچواں جملہ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ اجور سے مہر مراد ہے مقرر کیا ہو یا نہیں نقد ہو یا اشیاء یا پھر نفقہ مراد ہے۔ اہل علم کے نزدیک اس مہر کا حقدار مالک ہے البتہ نسبت لونڈی کی طرف اس لئے کی گئی ہے کہ مہر کا سبب لونڈی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اس مہر کی

حقدار لونڈی ہے۔ بِالْمَعْرُوفِ اس سے مراد شریعت وسنت کے موافق ہونا ہے (قرطبی) یا دینے میں تاخیر سے کام نہ لینا، ٹال مٹول سے اجتناب کرنا مراد ہے جس کو عادات جیلہ کہا جاتا ہے مُحْصَنٰتٍ یہاں پر اِحْصَانٌ سے مراد نکاح شرعی یا 29 30

پاکدامنی مراد ہے۔ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ سفاح علانیہ زنا کو کہا جاتا ہے اہل جاہلیت کی یہ برائی تھی کہ باندیاں اپنے گھروں پر اس عمل کیلئے بطور علامت جھنڈے لگاتی تھیں۔ (صحیح بخاری کتاب النکاح حدیث 5127)۔ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ یہ خِدْنٌ کی جمع ہے جو چھپی بدکاری کے دوست کو کہا جاتا ہے لہذا وہ عورتیں مُسٰفِحٰتٍ ہیں جو علانیہ بدکاری کرتی ہیں اور مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ وہ عورتیں ہیں جو چوری چھپے دوستیاں بدکاریاں کرتی ہیں۔ جیسا کہ فرمان ربانی ہے وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ یا مُسٰفِحٰتٍ سے عام فحاشی والیاں اور مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ سے مراد مخصوص شخص سے بدکاری کرنے والیاں مراد ہیں۔ سوال: سابقہ آیت میں صرف غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ آیا ہے اور یہاں پر وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ: کا بھی ذکر ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ جواب: اس آیت میں (مذکر) مردوں کا ذکر ہے اور ان پر مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ: کا اطلاق نہیں ہوتا ہے اور لونڈی میں یہ دونوں قسمیں موجود تھیں اسلئے مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ذکر کیا ہے۔ چھٹا جملہ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ یہاں پر احصان سے مراد قبولیت اسلام کے بعد نکاح ہے اور بِفَاحِشَةٍ: سے مراد زنا ہے جو چار گواہوں یا اقرار سے ثابت ہوا ہو۔ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ۔ مُحْصَنٰتِ: اس سے وہ آزاد خواتین مراد ہیں جن کی شادی نہیں ہوئی ہو یعنی کنواری زنا کر جائیں۔ الْعَذَابِ سے مراد سزا یعنی کوڑے حدود اللہ مراد ہیں اگر آزاد اور باکرہ کنواری ہے تو اس پر سو (100) کوڑے ہیں جو سورۃ نور آیت (2) میں ہے اور جب لونڈی زنا کا ارتکاب کر جاتی ہے تو آدھی سزا یعنی پچاس (50) کوڑے ہیں اور لفظ نِصْفُ قرینہ ہے کہ مُحْصَنٰتِ سے کنواری مراد ہے کیونکہ شادی شدہ زانیہ کیلئے تو سنگساری کی سزا ہے اور سنگساری تو آدھی نہیں ہوسکتی اور اس میں یہ بھی دلیل ہے کہ احکام شریعۃ میں غلاموں اور لونڈیوں کیلئے فرق ہے اور اس میں حکمت یہ ہے کہ سزا نعمت کے مساوی ہوتی ہے تو غلاموں کی نعمت بھی آدھی ہے تو سزا بھی آدھی ہے اور اس میں لونڈیوں کے ساتھ غلام بھی شریک ہیں جو دَلَالَةُ النَّصِّ سے ثابت ہوتا ہے اور دیگر حدود بھی اسی طرح ہونگے یعنی تہمت، شراب نوشی میں آزاد کیلئے اسی (80) کوڑے ہیں تو غلاموں کیلئے چالیس (40) کوڑے ہونگے۔ سوال: جب فَاِذَآ اُحْصِنَّ شادی شدہ ہونے کے معنی میں ہے تو اس قید لگانے کا کیا فائدہ ہے؟ جواب: اس میں ایک وہم کو ختم کیا گیا ہے، وہم و اشکال یہ پیدا ہو رہا تھا کہ آیا لونڈی کی سزا

(شادی کرنے کے سبب زیادہ ہوگی؟ تو جواب ہوا کہ لونڈی کی سزا دونوں حالتوں میں کوڑے ہی ہیں، رجم سنگساری نہیں ہے اور ہر دونوں حالتوں میں پچاس (50) کوڑے ہیں۔ اس کی دلیل وہ حدیث بھی ہے جو صحیح مسلم کتاب الحدود حدیث 1705 ترمذی کتاب الحدود حدیث 1441 میں بروایت علی رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ غلاموں پر حدود قائم کرو شادی شدہ ہوں یا کنوارے ہوں۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس مقام پر مزید چار جوابات ذکر کئے ہیں۔ ساتواں جملہ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ اس میں لونڈی سے نکاح کرنے کیلئے دوسری شرط ذکر ہے جبکہ سابقہ شرط مالی وسعت سے محرومی تھی۔ الْعَنَتَ اصل میں ہڈیوں کے جوڑنے کے بعد توڑ دینا ہے اور فقط مشقت کے معنی میں بھی ہے جیسا کہ فرمان الٰہی ہے وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ اور یہاں پر مراد زنا ہے کیونکہ زنا بھی دنیا و آخرت میں عذاب و سزا کا مستحق بناتی ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ گزشتہ شروط کے ساتھ لونڈیوں سے نکاح اس صورت میں جائز ہے جب کسی کو اپنے اوپر زنا کا خوف ہو اور شہوت پر قابو پانا اس کیلئے مشکل ہو۔ بعض اہل علم نے لام کو برائے تخصیص جواز قرار دیا ہے اور بعض نے صرف نفع کیلئے قرار دیا ہے۔ آٹھواں جملہ وَ اَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اگر کوئی شخص اپنے اوپر قابو پالے اور زنا سے صبر کرے اور لونڈی کے نکاح سے بھی اجتناب کرے تو یہ اس کیلئے بہت بہتر ہے اور اس سے فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کی اولاد غلامی سے بچ جائے گی۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ جس نے لونڈی سے نکاح کرلیا تو اس نے اپنے آدھے خاندان کو غلام بنا دیا۔ نواں جملہ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ امام آلوسی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس جملے میں لونڈیوں کے ساتھ نکاح کی نفرت پر دلانا مقصود ہے جیسے کہ یہ کوئی گناہ ہو۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَ يَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ يَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶﴾

"اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہارے لئے خوب کھول کر بیان کرے اور تمہیں تم سے پہلے صالح لوگوں کی راہ پر چلائے اور تم سے درگزر کرے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے" [26]۔

تفسیر 26: یہاں سے آنے والی تین آیتوں میں گزشتہ احکامات الٰہی پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب بیان ہو رہی ہے اور اس آیت میں ان ہی کی الگ الگ فائدے بیان ہو رہے ہیں: (فائدہ 1) يُرِيْدُ اللّٰهُ امام سیبویہ اور جمہور بصریوں کے نزدیک یہاں پر مفعول مقدر ہے یعنی تَحْلِيْلُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ وَ تَحْرِيْمُ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام تسلیم کرنا اور اس مخفی کو اصل مراد کہا جاتا ہے اور لِيُبَيِّنَ میں لام تعلیل یا عاقبت کیلئے ہے اور کوفیوں کے نزدیک لام

اَنْ کے معنی میں ہے اور یُرِیْدُ کیلئے مفعول ہے اس میں اور بھی اقوال ہیں لیکن پہلا قول بہتر ہے اس لئے کہ قرآن میں بعض مقامات پر یُرِیْدُ کے بعد اَنْ مذکور ہے جیسا سورۃ توبہ آیت 32 میں اور بعض آیتوں میں یُرِیْدُ کے بعد لام ذکر ہوا ہے جیسے سورۃ صف آیت 8 میں جہاں پر اَنْ ذکر کیا گیا ہے تو اس کو مقصد کہا گیا ہے اور جہاں لام ذکر ہوا ہے وہاں مراد تحقق مقدر ہے اور اس کی علت مذکور ہے اور ہر جگہ کے مناسب کلام وہاں مذکور ہے۔ یہاں پر مفعول میں تعمیم مراد ہے: أَمْرَ دِيْنِكُمْ مَصَالِحَ أَمْرِكُمْ مَا يَحِلُّ لَكُمْ وَمَا يَحْرُمُ۔ اَنْ کو حذف کر کے ان کے تین فائدے بیان کئے ہیں۔

پہلا فائدہ: یہ ہے کہ بیان کرنا اور بیان سے مراد حلال و حرام میں امتیاز تفریق کرنا یعنی اچھائی اور برائی کو واضح کرنا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کوئی بھی واقعہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے خالی نہیں جیسے فرمایا مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ (سورۃ انعام 38)۔ فائدہ 2: وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ: سنن کا معنی طریقہ ہے اور یہ سنت کی جمع ہے الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ: سے مراد گزشتہ انبیاء اور صالحین ہیں۔ اس میں تین اقوال ہیں: (توجیہ 1) مفسر آلوسیؒ نے فرمایا کہ مراد یہ نہیں ہے کہ بِعَيْنِهٖ یہی احکام سابقہ امتوں میں رائج تھے یعنی ان احکام کے جنس اور قسم کے احکامات تھے۔ اس میں لفظ مثل یا جنس مقدر ہے۔ (توجیہ 2) دوسرا قول یہ ہے کہ اس سورت میں جو یتیموں، بیواؤں، ناداروں، سفہاء اور خواتین میں میراث نکاح وغیرہ کے مسائل ذکر ہوئے بِعَيْنِهٖ یہی مسائل گزشتہ شریعتوں میں تھے (صاحب اللباب)۔ امام قاسمی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ گزشتہ آیتوں میں جو احکام ذکر ہوئے ہیں سابقہ دینوں شریعتوں میں بھی بعینہ یہی احکام تھے اور میں نے اسی طرح تورات کے سفر الأحبار للاولیین کی اٹھارہویں فصل میں پڑھے ہیں جو اس کی تائید ہے۔ (توجیہ 3) پہلے جملے میں ترغیب تھی اور اس میں تخویف ہے اور الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ: سے مراد جھٹلانے والے ہیں اور يَهْدِيَكُمْ سے مراد ان کو خبر دینا مقصود ہے اور سُنَنَ میں ان کے عذاب کی طرف اشارہ ہے۔ (قرطبی)۔ فائدہ 3: وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ کبھی احکام پر عمل کرنے میں مؤمن سے کمی ہو سکتی ہے تو اس پر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے یا توبہ سے مراد گزشتہ احکامات میں اللہ کی طرف سے بندوں پر رحمت ہے۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ بندوں کی مصلحتوں پر عالم ہے اور اس کے احکام دنیاوی اور اُخروی حکمتوں سے پُر ہیں۔

وَاللّٰهُ يُرِيْدُ أَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۗ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ أَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿۲۷﴾

"اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تمہاری توبہ قبول فرمائے اور جو خواہشات کے پیروکار ہیں وہ چاہتے ہیں تم اس حکم سے بہت دور

ہو چلے جاؤ"[27]۔

تفسیر 27: اس آیت میں احکام شرعیہ اور غیر شرعیہ کے تقابل کے طور پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب ہے۔ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ابن عطیہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ بظاہر یہ تکرار ہے مگر حقیقت میں یہ باطل پرستوں کے ارادے کی خبر ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ تکرار نہیں ہے بلکہ اس میں دو طریقوں سے فرق ہے: (1) پہلا طریقہ یہ ہے کہ پہلے توبہ علّیت یعنی علت کے طور پر ذکر ہے اور یہاں پر مفعولیت کے طریقہ پر ذکر ہے۔ وہاں توبہ علت اور فائدہ ہو کر مراد تھا اور یہاں پر عین توبہ مراد ہے (اللباب)۔ (2) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہاں توبہ کی قبولیت مراد تھی جبکہ یہاں وہ اعمال مراد ہیں جو قبولیت توبہ کیلئے سبب ہے (روح المعانی)۔ چونکہ یہاں اہل باطل سے تقابل اور ان کی پیروی سے خوف دلانا مقصود تھا تو اہتمام کیلئے لفظ وَاللّٰهُ کو مقدم کیا ہے اشارہ ہے کہ وہ ارادہ (جس سے ان اعمال کا تقرر ہوتا ہے جو توبہ کے اسباب ہیں) اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اسلئے کہ احکام شریعت مقرر کرنا اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے وہ احکام شرعیہ جس کے ساتھ توبہ قبول ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے۔ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ یہ لفظ عام ہے فاسقین، یہود، نصاریٰ، مجوس، مشرکین اور بدکاروں سب کو شامل ہے یعنی یہ ساری قسم کے لوگ جو غیر شرعی کاموں میں مصروف ہیں یہ درحقیقت خواہشات ہیں۔ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا اس کا متعلق مقدر ہے یعنی عَنِ الْحَقِّ جو کہ احکام شریعۃ کی اتباع ہے اور لفظ عَظِيْمًا دلالت کرتا ہے کہ کسی گناہ کا ارتکاب کبھی کبھار تو مومن سے بھی ہوتا ہے مگر وہ اس کو گناہ تسلیم کرتا ہے لیکن باطل پرستوں کی مکمل موافقت کرنا اور گناہوں کو جائز تصور کرنا یہ تو بہت بڑا میلان ہے اس ارادے کی کچھ تفصیل اس طرح ہے کہ مشرکین چاہتے ہیں کہ سوتیلی ماں سے نکاح کیا جائے۔ یہود چاہتے ہیں کہ خالہ پھوپھی سے نکاح جائز قرار دیا جائے اور دو بہنوں کو اکٹھا کرنا بھی درست قرار دیا جائے اور مجوسیوں کا اعتراض ہے کہ بھانجی بھتیجی اگر حرام ہے تو ماموں زاد و چچا زاد بہنوں کو بھی حرام کر دیا جائے نیز مشرکین اجرت زنا کو حلال سمجھتے ہیں تو ان سب کی خواہش یہی ہے کہ مومنین بھی ہمارے ساتھ ان اعمال میں شریک ہو جائیں۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾

"اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اپنے احکام میں تم پر آسانی لائے اس لئے کہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے"[28]۔

تفسیر 28: اس آیت میں عمل کی طرف ایک اور طریقے سے ترغیب ہے اور احکام شریعۃ اور غیر شرعیۃ میں فرق بیان کرتا

مقصود ہے یعنی احکام شریعت میں آسانی اور غیر شریعت میں تنگی و تکلیف ہے یُرِیۡدُ اللّٰهُ اَنۡ يُّخَفِّفَ عَنۡكُمۡ یہ تمام احکام شریعت کیلئے عام ہے جس کی تائید سورۃ اعراف آیت 157 سورۃ بقرہ آیت 185 اور سورۃ حج آیت 78 میں ہے (اللباب)۔ وَ خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ ضَعِيۡفًا یہ ماقبل کیلئے علت کے مرتبے میں ہے یعنی شرعی احکام میں آسانی پیدا کرنا انسان کے ضعیف ہونے کی وجہ سے ہے انسان کے ضعف کے متعلق مختلف اقوال ہیں: (1) پہلی وجہ یہ ہے کہ کثرت شہوت اور لذت اس کے ضعیف ہونے کیلئے سبب ہے: (2) دوسری وجہ خلق، بناوٹ جسم میں کمزوری کی بناء پر ضعیف ہے جیسا کہ سورۃ روم آیت 54 میں ہے: (3) تیسری وجہ یہ ہے کہ خواتین کے معاملے میں کمزور ہے ان سے باز نہیں رہ سکتا۔ امام قرطبیؒ نے اس موضوع کے متعلق بعض اقوال سلف سے نقل کئے ہیں اس آیت میں تصریح کی گئی ہے کہ دین اسلام تمام دینوں سے افضل ہے کیونکہ اس میں انسانوں کے حالات کی پوری ہم آہنگی ہے۔ فائدہ: امام بیہقی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ سورۃ نساء کی آٹھ آیتیں اس امت کیلئے ہر اس چیز سے بہتر ہیں جس پر سورج طلوع ہوتا ہے یہ تین آیتیں اور 31، 40، 48، 110، 147۔

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَـكُمۡ بَيۡنَكُمۡ بِالۡبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡكُمۡ‌ ۚ وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمۡ رَحِيۡمًا ۝ "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم اپنا مال آپس میں ناحق طریقے سے مت کھاؤ مگر یہ کہ تمہاری تجارت ہو باہمی رضامندی سے اور نہ تم اپنے نفسوں کو قتل کرو اور یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر نہایت رحم کرنے والا ہے" [29]۔

تفسیر 29: اس آیت میں چودھواں (14) حکم ہے جس میں تدبیر منزل کے امور اور مظالم کو دفع کرنے کا بیان ہے۔

ربط: سابقہ آیتوں میں مسائل میراث اور نکاح میں لوگوں کو اپنے حقوق مالی وغیرہ دینے کا ذکر ہوا جیسے اٰتُوا الۡيَتٰمٰى فَاِنۡ طِبۡنَ لَكُمۡ عَنۡ شَىۡءٍ مِّنۡهُ نیز میراث کے حصے اور مہر کی ادائیگی کا ذکر ہوا جیسے اٰتَيۡتُمۡ اِحۡدٰٮهُنَّ قِنۡطَارًا فَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ۔ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا بِاَمۡوَالِكُمۡ: تو اب ایک عام شرعی حکم بیان ہو رہا ہے جو اموال اور نفوس سے متعلق ہے۔ يَاۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا اس نداء (آواز) میں اس کے زیادہ اہتمام کی طرف اشارہ ہے۔ لَا تَاۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَـكُمۡ بَيۡنَكُمۡ: مال کھانے کا عام مجازی معنی مراد ہے یعنی فائدہ لینا یا اس کو فائدے کیلئے استعمال کرنا یا ظلم کے ساتھ کسی کے مال پر مسلط اور قابض ہونا۔ اَمۡوَالَـكُمۡ ایک دوسرے کا مال بَيۡنَكُمۡ آپس میں کھانا۔ بِالۡبَاطِلِ اس سے مراد ہر وہ طریقہ ہے جو خلاف

شریعت ہو مثلاً سود، جوا، لوٹ مار، غصب، چوری، ناپ تول میں کمی، حیلہ سازی سے مال کھانا، ناجائز طریقوں سے لین دین کرنا۔ ابن جریر و ابن کثیر رحمہم اللہ نے نقل کیا ہے کہ یہ بھی اس میں داخل ہے کہ کسی سے کوئی چیز لے لیتا ہے مگر حتمی طور پر فیصلہ نہیں کرتا ہے بلکہ یوں کہتا ہے کہ اگر پسند آئی تو خرید لونگا ورنہ واپس کر دونگا اور کچھ رقم بھی ساتھ دے دونگا خرید نے بیچنے والا دونوں ایسا کریں تو یہ فاسد تجارت ہے اگرچہ باہمی رضامندی سے کیوں نہ ہو۔ اِلَّآ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡكُمۡ یہ استثناء منقطع ہے اسلئے کہ تجارت حلال باطل میں داخل نہیں ہے۔ اور تَكُوۡنَ کی ضمیر اموال کی طرف راجع ہے تَرَاضٍ یہ مقدر صَادِرَةً کے متعلق ہے اور مِّنۡكُمۡ كَائِنٌ: کے ساتھ متعلق ہے جو مقدر ہے۔ تجارت لغت میں عوض اور بدلہ کو کہا جاتا ہے جبکہ اصطلاح شرع میں تجارت خرید وفروخت مع اپنے شرائط کو کہتے ہیں۔ یہاں پر تجارت کی تخصیص اسلئے کی ہے کہ یہ اکثر پیش آتا ہے اور انتہائی پاک کام ہے۔ تجارت سے عام معنیٰ بھی مراد ہوسکتا ہے یعنی کسی سے مال منتقل ہونا چاہے بیع اور شراء سے ہو یا ہبہ یا اجارہ اور میراث ہو البتہ بطریقہ شرعی ہو (اللباب، روح المعانی)۔ عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡكُمۡ۔ تَرَاضٍ نفس کی خوشی ہو دونوں جانب سے اور طریقہ شرعی کے موافق ہو اس میں بیوع کی اقسام میں سے ''خیار شرط'' داخل ہے۔ تَرَاضٍ کی دو قسمیں ہیں: (1) زبان سے قبول کرنا اور (2) فعل سے قبول کرنا جس کو تعاطی کہا جاتا ہے اس کی تفصیل امام ابن کثیرؒ نے لکھی ہے۔ وَلَا تَقۡتُلُوۡٓا اَنۡفُسَكُمۡ اس سے ایک دوسرے کو قتل کرنا مراد ہے کیونکہ سارے مومنین ایک نفس کی طرح ہیں۔ سوال: ہندو اپنے آپ کو قتل کرنا ثواب مانتے ہیں مگر ایمان والوں کا تو یہ عقیدہ نہیں ہے تو مسلمانوں کو اس طرح خطاب کیوں کیا گیا ہے؟ جواب: اگر نفس سے اپنی ہی جان مراد لی جائے تو اس میں خودکشی کرنے سے منع فرمایا جیسے بعض جاہل لوگ تنگ آکر پریشانیوں کا مقابلہ نہیں کرپاتے یہاں تک کہ اپنے نفس کو خود قتل کر لیتے ہیں یا مراد یہ ہے کہ اس طرح کے کاموں کا ارتکاب مت کرو جو تمہارے قتل کا سبب بنے یعنی دوسرے بے گناہ مسلمان کو قتل کرنا یا شادی کے بعد زنا کرنا یا مرتد ہوجانا (اللباب)۔ صحیح بخاری کتاب التیمم حدیث 345 ابوداؤد کتاب الطہارۃ حدیث 334 احمد 4۔203 شیخ البانی نے اس روایت کو صحیح کہا ہے حدیث ابوداؤد میں عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ کا واقعہ مذکور ہے کہ انہوں نے انتہائی سردی میں اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے غسل جنابت کے بجائے تیمم کیا۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمۡ رَحِيۡمًا اس میں اشارہ ہے کہ باطل خوراک اور قتل و دیگر غیر شرعی امور سے منع اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے۔ فائدہ: باطل طریقے سے مال کھانے اور کسی انسان کی جان کو قتل کرنے کے درمیان مناسبت یہ ہے کہ اگر تجارت میں رضامندی

کی شرط نہ ہوتی تو سب حلال تھا اسی طرح اگر باطل طریقے سے ایک دوسرے کے اموال کھانا ناجائز نہ ہوتا تو یہ بھی قتل وقتال اور لڑائی اور خونریزی کا سبب ہوتا کیونکہ اس صورت میں آپس میں لڑائی اور خونریزی ہوتی۔

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝

"جس نے بھی یہ کام زیادتی (احکام الٰہی سے اعراض) کرتے ہوئے اور ظلم (کمی) کرتے ہوئے کی تو ہم اس کو جہنم میں ڈال دیں گے اور یہ کام اللہ تعالیٰ پر آسان ہے"[30]۔

تفسیر 30: اس آیت میں تخویف اخروی کا بیان ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ سورۃ کی ابتداء سے یہاں تک جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے ان سب کو یہ شامل ہے۔ ابن جریر کا قول رحمہ اللہ ہے کہ آیت 19 سے آیت 30 تک شامل ہے کیونکہ آیت 19 سے پہلے والی تمام آیتوں کے ساتھ اپنی جگہ تخویفات ذکر ہوگئی ہیں وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ۔ فِعْلٌ سے ذکر کردہ ممنوعات کا ارتکاب مراد ہے اور ذٰلِكَ سے ان تمام منہیات کی طرف اشارہ ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا: یہ دونوں حال یا مفعول لہ ہے اس قید لگانے سے بھول اور خطاء سے احتراز کیا گیا ہے کیونکہ وہ معاف ہے۔ عُدْوَانٌ اور ظُلْمٌ میں فرق یہ ہے کہ عُدْوَانٌ: حد سے تجاوز کرنے اور ظلم حد سے کمی (تقصیر وتفریط) کرنے کے معنی میں ہے۔ اسی طرح عدوان دوسروں پر تعدی کی یعنی یتیموں، کمزوروں کا مال کھانا وغیرہ اور ظلم اپنے اوپر زیادتی ہے یعنی حرام طریقے سے مال وصول کرنا یا اپنے محرمات کے ساتھ نکاح کرنا ہے۔ فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا آگ میں ڈالنا عذاب دینے اور جلانے کے لئے ہے نَارًا میں تنوین برائے تنویع یا برائے تعظیم ہے۔ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرًا۔ ذٰلِكَ: میں آگ میں سزا دینے کی طرف اشارہ ہے اور اللہ پر آسان اسلئے ہے کہ اللہ تعالیٰ کو مکمل قدرت حاصل ہے اس کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا ہر چیز پر اس کو علم بھی حاصل ہے اللہ تعالیٰ کے پاس ہر چیز کا علم ہے اور اسی طرح ہر قسم کے معاصی اور گناہوں کو بھی جانتا ہے۔ اور سزا دینے کے بعد انجام سے بھی نہیں ڈرتا۔ (وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا) اسے انجام کا خوف نہیں۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَاۗىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ۝ "اگر تم ان بڑے گناہوں سے اجتناب کروگے جس سے تم منع کئے گئے ہو تو ہم دور کردیں گے تمہاری برائیاں تم سے اور تمہیں عزت والی جگہ میں داخل کریں گے"[31]۔

تفسیر 31: تخویف کے بعد اب اس آیت میں تبشیر بیان فرمارہے ہیں یہاں تبشیر دو قسم پر ہے: (1) گناہ صغیرہ کی عام معافی۔(2) جنت میں داخلے کی بشارت۔اِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا كَبَآئِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب اس سورۃ میں بعض گناہوں سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا تو اب اجتناب کرنے والوں کے چھوٹے گناہوں سے درگزر کرنے کا وعدہ کرتا ہے اور اس لفظ میں دلیل ہے کہ گناہوں میں چھوٹے اور بڑے گناہ ہیں۔اگر چہ بعض گناہ من وجہ صغیرہ اور من وجہ کبیرہ ہوتے ہیں۔یہ جمہور علماء کا قول ہے۔ابو اسحاق اسفرائنیؒ، ابو المعالیؒ اور قشیریؒ وغیرہ نے کہا ہے کہ گناہ سب کبیرہ ہیں البتہ کسی گناہ کو بڑے گناہ کے مقابل صغیرہ کہا جاتا ہے۔امام رازی نے لکھا ہے کہ اکثر اہل علم کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سارے کبیرہ گناہوں کا تعیین اور امتیاز نہیں کیا اس تعین نہ کرنے میں واضح حکمت یہ ہے کہ پھر لوگ اس آیت کو دلیل بنا کر گناہوں پر جراءت کر جاتے اور ایسا کرنا حکیم ذات کی حکمت کے خلاف اور مناسب نہیں۔اس کے باوجود بعض کبائر کا تعین آیتوں کے اشارات سے اور احادیث کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے اور اس کے متعلق علماء کے دو قول ہیں: پہلی قسم میں کبیرہ گناہوں کی تعیین اور تعداد کا بیان ہے۔ان میں سے چند یہ ہیں۔(1) عبداللہ بن عمر سے مرفوعاً نقل ہے کہ کبیرہ گناہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی، بے گناہ قتل، قصداً جھوٹی قسم کھانا ہے۔(صحیح بخاری کتاب الادب حدیث 77، 5976، ترمذی اور نسائی)۔(2) انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل ہے کہ کبائر اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی اور جھوٹ کا ارتکاب ہے۔(صحیح بخاری کتاب الشھادات حدیث 2654 صحیح مسلم کتاب الایمان حدیث 87)۔(3) ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل ہے کہ بڑے گناہ تین ہیں۔اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور پھر اسے حاجت روا سمجھ کر پکارنا۔دوسرا اولاد کو قتل کرنا۔تیسرا اپنے پڑوسی کی بیوی کے ساتھ بدفعلی اور زنا کرنا۔(صحیح بخاری حدیث 6001 ترمذی)۔(4) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ سات قسم کے گناہ ہلاک کرنے والے ہیں۔پہلا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرنا، دوسرا جادو کرنا، تیسرا بے گناہ قتل کرنا، چوتھا یتیم کا مال لینا، پانچواں میدان جنگ سے فرار اختیار کرنا، چھٹا سود کھانا، ساتواں پاکدامن خواتین پر تہمت لگانا۔صحیح بخاری کتاب الوصایا حدیث 2766 صحیح مسلم کتاب الایمان حدیث 89 (5) عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث صحیح بخاری کتاب الادب حدیث 5973 مسلم 90 میں مرفوعاً مذکور ہے کہ کبیرہ گناہ یہ ہیں۔اپنے والدین کو برا بھلا کہنا یا ان پر لعن طعن کرنا اس کی صورت یہ ہے کہ کسی دوسرے کے والدین پر لعن طعن کرنا بدلے میں وہ آپ کے والدین پر لعن طعن کریں۔تو وہ اس کے ماں باپ کو

بدلے میں جواباً کہیں گے۔صحیح بخاری کتاب الادب حدیث 5973،5977 اور ترمذی۔(6) ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے مرفوعاً وموقوفاً بھی نقل ہے کہ بڑے گناہ یہ ہیں ابن ابی حاتم 3۔5201 بزار فی کشف الاستار 106 بسند حسن کما قال شیخ زبیر وسیوطی فی تخریج ابن کثیر۔اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامیدی کرنا جسکو قنوط کہا جاتا ہے اور عذاب الٰہی سے بے خوف ہونا۔ابن جریر، ابن کثیر رحمہما اللہ۔(7) ابن عباس رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ کبائر یعنی بڑے گناہ صرف سات (7) ہیں تو انہوں نے جواب میں فرمایا سات سو (700) کے قریب ہیں مگر استغفار کے بعد کبیرہ کی حیثیت باقی نہیں رہتی ہے اور چھوٹے گناہوں پر ہمیشگی کرنے سے وہ چھوٹے گناہ نہیں شمار ہوتے بلکہ بڑے گناہ بن جاتے ہیں۔ابن جریر، ابن کثیر۔امام ابن کثیر نے مذکورہ احادیث کے علاوہ بعض کبائر تعین کے ساتھ ذکر کیے ہیں جس میں ذکر کردہ گناہوں کے علاوہ باقی مزید یہ ہیں: مردوں کا ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلی کرنا، شراب نوشی، چوری، کسی کے مال جائیداد پر قابض ہونا، بغیر کسی عذر رمضان کے روزے چھوڑنا، رشتے توڑنا، ناپ تول میں خیانت کرنا، بغیر شرعی عذر کے نماز اپنے وقت سے پہلے پڑھنا، نبی کریم ﷺ پر جھوٹ باندھنا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر طعن وتشنیع کرنا، گواہی چھپانا، رشوت لینا، زکوٰۃ سے اعراض کرنا، طاقت کے باوجود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے اعراض کرنا، اہل علم پر طعن وتشنیع کرنا۔دوسری قسم کبائر کی تعریف میں سلف کے اقوال مختلف ہیں: (1) شوافع کا قول یہ ہے کہ وہ گناہ جس پر خصوصی قرآن وسنت میں وعید وارد ہو۔(2) دوسرا قول امام بغوی کا ہے کہ ہر وہ گناہ جس پر حد واجب ہوتی ہو وہ گناہ کبیرہ ہے۔(3) تیسرا قول ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے کہ جس گناہ پر جہنم کی وعید ہو یا غضب، لعنت وارد ہو۔(4) چوتھا قول، ہر حرام جس سے منع کیا گیا ہو۔(5) پانچواں قول ہر وہ گناہ جس کی حرمت پر کوئی نص وارد ہو۔(ان اقوال کو امام آلوسی نے بغیر نسبت کے نقل کیا ہے)۔(6) چھٹا قول ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ہے کہ کبائر وہ ہیں جن سے اس سورۃ میں منع وارد ہے جو کل 33 ہیں۔نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ ۔اصل میں کسی چیز کے چھپانے کو کہتے ہیں یہاں اس سے مراد معاف کرنا درگزر کرنا ہے اور سَيِّاٰتِ سے مراد (اہل سنت والجماعت کا اتفاقی موقف ہے کہ) صغیرہ گناہ ہیں۔فائدہ: اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ بندہ مومن گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے کافر نہیں ہوتا سوائے شرک کے۔اور گناہ کبیرہ توبہ کے ذریعے یا اللہ تعالیٰ اپنے فضل کے ذریعے معاف فرماتے ہے۔اور گناہ صغیرہ توبہ کے ذریعے بھی اور نیک اعمال کے ذریعے بھی معاف ہوجاتے ہیں اور نیکیوں کے ذریعے سے بھی دھل اور مٹ جاتا ہے۔معتزلہ کا موقف یہ ہے کہ کبیرہ گناہ توبہ کے

بغیر معاف نہیں ہوتے ہیں اور گناہ صغیرہ نیک اعمال سے اس وقت معاف ہوتے ہیں جب کبیرہ گناہ کا ارتکاب نہ کرے اگر کبیرہ گناہ کیا ہو اور اس سے توبہ نہ کی ہو تو نیک اعمال سے صغیرہ گناہوں کی معافی نہیں ہوگی۔ سوال: اس آیت میں صغیرہ گناہوں سے معافی کے لیے کبیرہ گناہوں سے اجتناب کو شرط قرار دیا گیا ہے تو اس اعتبار سے معتزلہ کا مسلک حق ثابت ہوتا ہے؟ جواب (1): جب کسی چیز کو لفظ اِنْ سے معلق کیا جائے تو عدم شرط یعنی شرط موجود نہ ہونے سے اس چیز کا عدم ہونا لازم نہیں آتا۔ قرآن مجید میں اس قسم کی بہت سی آیات ہیں۔ پہلی آیت فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ عورت کی گواہی جائز ہے اگرچہ مرد موجود ہو۔ (2) وَإِن كُنتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَّقْبُوضَةٌ اگر کاتب موجود ہو اور سفر بھی نہ ہو تب بھی رہن جائز ہے اس طرح سورۃ نساء آیت 3 اور 110 سورۃ نور آیت 33 میں بھی ہے اور صاحب اللباب نے اور بھی آیتوں کو جمع کیا ہے۔ جواب (2): ابو مسلم کا قول ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس سورۃ میں گزرے ہوئے کبائر کا جس نے ارتکاب کیا ہو پھر اسے چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دے گا۔ جواب (3): یہاں پر کبائر سے مراد کفر اور شرک ہے مگر اقسام کے اعتبار سے اس کو جمع ذکر کیا ہے تو مراد یہ ہے کہ جب تم کفر اور شرک کی تمام اقسام سے اجتناب کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے کبیرہ و صغیرہ گناہوں کو اپنے فضل و کرم سے معاف کر دیگا اس کیلئے قرینہ سورۃ نساء آیت 48 ہے یہ جواب صاحب اللباب نے اپنی تفسیر میں اور ملا علی قاری نے مرقات میں ذکر کیا ہے۔

جواب (4): یہاں پر اجتناب کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ پر طاقت حاصل ہو پھر بھی خوف الٰہی سے ترک کر دے اس کی دلیل حدیث غار ہے متفق علیہ کہ ایک شخص نے اپنا عمل بطور وسیلہ اللہ تعالیٰ کو پیش کیا زنا پر قدرت پا لینے کے باوجود خوف الٰہی سے اس نے انتہائی مشکل مرحلے میں اجتناب کیا تو وہ اس کیلئے عمل صالح ثابت ہوا تو یہاں پر مراد یہ ہے کہ گناہوں پر طاقت حاصل کرنے کے باوجود خوف الٰہی کی وجہ سے اجتناب کرنا یہ عمل صالح ہے اور اس کے ذریعے سے صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں۔ نیز یہ جواب تکلفات سے خالی ہے۔ وَنُدْخِلْكُم مُّدْخَلًا كَرِيمًا: یہ جنت کی بشارت ہے یعنی جب سَيِّئَات معاف ہو جائیں اور کبائر سے بچا جائے تو جنت میں سب سے پہلے داخل ہوں گے۔ مُّدْخَلًا میم کے پیش سے پڑھا جائے تو یہ مصدر میمی ہے یا ظرف مکان ہے البتہ ظرف مکان ایسے مقام میں اخفش کے نزدیک مفعول ہوتا ہے اور سیبویہ کے نزدیک مفعول فیہ ہوتا ہے۔ كَرِيمًا یہ صفت مقام کیلئے آتی ہے جیسا کہ مَقَامٍ كَرِيمٍ۔ تو مراد ہے وہ مقام جو فائدوں والا خوبصورت ہو۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ﴿۳۲﴾ " اور تم تمنا نہ کرو اس چیز کی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ تمہارے بعضوں کو بعض پر فضیلت دی ہے مردوں کیلئے حصہ ہے اس سے جو انہوں نے کمایا اور عورتوں کیلئے حصہ ہے اس سے جو انہوں نے کمایا اور تم اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کا سوال کرو یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے"[32]۔

تفسیر 32: اس آیت میں مظالم سے نجات کے لئے پندرواں حکم بیان فرمار ہے ہیں۔ کیونکہ حسد کرنے سے ظلم جنم لیتا ہے لہٰذا حسد سے ہی اجتناب کرو تو ظلم سے بچ جاؤ گے۔ (ربط 1) پہلے منع فرمایا حرام خوراک اور قتل سے تو اب یہاں ان اسباب سے منع فرمار ہے ہیں جو حرام خوری اور قتل تک پہنچاتے ہیں۔ (ربط 2) پہلے اعضاء کی پاکی کا ذکر کیا گیا حرام چیزوں سے تو اب حسد سے دل کی صفائی طہارت کا ذکر بیان کر رہے ہیں کہ حسد سے بچنا کیونکہ حسد حرام کے ارتکاب اور گناہوں پر برانگیختہ کرنا ہے۔ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ: تمنی۔ کسی چیز کے حصول کی امید کو کہا جاتا ہے اکثر ناممکنات میں تمنی کا لفظ استعمال ہوتا ہے تاہم کبھی کبھار ممکنات میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے مَا فَضَّلَ اللّٰهُ الخ ۔ اس میں مرتبہ، جاہ، عزت، مال کی فراخی اور مردوں کیلئے میراث میں زیادہ حصہ وغیرہ سب شامل ہیں ترمذی کتاب الدعوات حدیث 3384 ابن ماجہ حدیث 2827 میں روایت ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تھا کہ مرد جہاد میں جاتے ہیں جبکہ ہم نہیں جاتیں اور ہمارا میراث میں آدھا حصہ ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی تمنا کا معنیٰ یہاں پر حسد ہے کیونکہ آیت میں حسد سے منع ہوا ہے اور حسد کی برائی اور نقصانات سورۃ فلق کی تفسیر میں ان شاء اللہ بیان ہوں گے۔ حسد کی برائی میں بہت سے احادیث مذکور ہیں جن میں دو چیزوں پر حسد کی اجازت و جواز ذکر ہے اس کا معنیٰ امام بخاری نے غِبْطَه (رشک) کیا ہے یعنی نیکی میں سبقت مراد ہے، حسد مذموم کے متعلق احادیث صحیح بخاری کتاب الادب حدیث 6076 ابوداؤد کتاب الادب حدیث 4910 صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ حدیث 23 اس کے علاوہ احادیث کثرت سے مذکور ہیں۔ حدیث کی بناء پر اس میں حسد و غبطہ دونوں شامل ہیں لیکن امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب تمنا اور غبطہ میں کسی اور شخص سے کوئی تعرض نہ ہو تو پھر جائز ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے تمنا کی وَدِدْتُّ اَنْ اُقْتَلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلَ (صحیح بخاری باب التمنی الشهادة حدیث 2797) کاش کہ میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں قتل کیا جاؤں

پھر زندہ ہو جاؤں پھر قتل کیا جاؤں۔ حسد حرام ہونے کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر بندہ راضی نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرتا ہے اور لوگوں سے دشمنی کر بیٹھتا ہے اور آپس میں حسد اور دشمنی گناہ کبیرہ ہے۔ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ یہ جملہ ماقبل بیان کی گئی نہی کے لئے علت ہے۔ یعنی حصوں کی تقسیم صفات اور حالات کی تقسیم اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے ذریعے مناسب طریقے پر کی ہے اور اس پر اعتراض صرف حاسدین کرتے ہیں اور یہ جملہ دلیل ہے کہ حسد مرد و عورت دونوں کے لئے حرام ہے اور سابقہ جملے میں لفظ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ سب کو شامل ہے خواہ مرد ہو یا عورت اس جملے (لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا) میں مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں: پہلا قول قتادہ کا ہے کہ اِکْتِسَابٌ عام ہے خیر کا عمل ہو یا شر کا ہو اور لفظ "نَصِيبٌ" ثواب و عقاب دونوں کو شامل ہے۔ دوسرا قول ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے نَصِيبٌ سے مراد میراث کا وہ حصہ ہے جو قرآن و سنت سے ہر ایک کیلئے ثابت ہے اور اِکْتِسَابٌ سے مراد ان کی صفات، استعداد و طاقت ہے جو تفاوت کے ساتھ ہے اور اس کو مجازاً اِکْتِسَابٌ کہا گیا ہے۔ تیسرا قول امام آلوسیؒ نے یہ نقل کیا ہے کہ ابوعبداللہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے نقل ہے کہ اس سے دنیا کی نعمتیں، تجارتیں، زراعتیں، کسب وغیرہ جو مقدر میں لکھا ہے وہ مراد ہیں لہٰذا نَصِيبٌ سے مراد وہ ہے جو تقدیر میں لکھا ہوا ہے۔ وَسْئَلُوا اللَّهَ مِن فَضْلِهِ اس جملے میں دو قول ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ اس میں دوسرا مفعول مقدر ہے یعنی أَمَانِيَّكُمْ یہ ابن عطیہ کا قول ہے اور ابوعلی فارسیؒ وغیرہ کے نزدیک شَيْئًا مقدر ہے اور مِن فَضْلِهِ میں پہلی توجیہ کے مطابق مِنْ اجلیہ ہے اور دوسری توجیہ میں یہ شَيْئًا کیلئے صفت ہے اور مفعول کا مخفی ہونا عمومیت کی دلیل ہے۔ دوسرے قول کے مطابق مِنْ زائدہ ہے اور یہ قول امام اخفش کا ہے تمنی کے مقابلے میں ہے یعنی صرف تمناؤں سے کچھ نہیں ملتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ سے مانگو وہ دعاؤں کو قبول کرنے والا ہے۔ قرطبی نے فرمایا کہ یہ حکم دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ سے طلب کرنا واجب ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث نقل ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگو کیونکہ اللہ تعالیٰ مانگنے والے کو پسند کرتا ہے اور فراخی کا انتظار کرنا افضل عبادت ہے اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں ہے کہ جو بندے اللہ تعالیٰ سے نہیں مانگتے تو ان پر اللہ تعالیٰ غضبناک ہوتا ہے۔ مذکورہ دونوں روایتوں کو امام ترمذی نے نقل کیئے ہے۔ (ترمذی کتاب الدعوات 3572 سلسلة الضعيفة حديث 492 شیخ البانی شیخ شعیب اور شیخ زبیر نے اس روایت کو ضعیف کہا ہے)۔ فائدہ: باب سُئِلَ سے امر مخاطب کے صیغے میں جمہور کے نزدیک قاعدہ یہ ہے کہ واو یا فا کے

بعد ہو تو اس میں ہمزہ ظاہر ہوتا ہے جیسا کہ فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ :(سورۃ یونس 94) اور ابن کثیر اور کسائی کے نزدیک اس آیت وَاسْـَٔلُوا میں تخفیف کی وجہ سے ہمزہ گرانا جائز ہے اور جب واو اور فاء نہ ہو یا امر غائب ہو تو قراء کا تخفیف پر اتفاق ہے جیسے سَلْ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ وَلْيَسْـَٔلُوْا مَاۤ اَنْفَقُوْا (سورۃ ممتحنہ آیت 10) اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا یعنی اللہ تعالیٰ نے تقسیم اور تقدیر اپنے علم کے موافق کی ہے کسی کا سوال قبول کرنا اپنے حکم کے مطابق کرتا ہے اور حاسدین کے دلوں کا اللہ کے پاس علم ہے۔

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۟ ”ہر ایک کیلئے ہم نے وارث بنائے اس مال کے جو ماں باپ اور قریبی رشتے داروں نے چھوڑا اور وہ لوگ جن سے تم نے پختہ قسمیں لی ہیں تو تم ان کو ان کا حصہ دو یقیناً اللہ ہر چیز پر گواہ ہے“ [33]۔ ع

تفسیر 33: میراث کے متعلق دفع مظالم کے لئے یہ حکم ہے۔ (ربط 1) یہ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ : کیلئے علت ہے یعنی کسی کے مال کی طمع مت کرو خواہ تم زندہ ہو یا فوت ہو جاؤ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے حصہ دار مقرر کئے ہیں۔ (ربط 2) یا پھر یہ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ سے متعلق ہے یعنی یہ میراث کا حصہ ہے میراث کے دو عناصر ہے کسی کی پیدائش ولادت اور قرابت سے متعلق ہے۔ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ كُلٌّ کا لفظ مضاف استعمال ہوتا ہے اور جب اضافت سے الگ کیا جائے تو مضاف الیہ کے عوض میں تنوین آتی ہے اور معنی میں مناسب مضاف الیہ لایا جاتا ہے۔ یہاں پر تقدیری کلام میں مختلف اقوال ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ مضاف الیہ ھَالِكٌ یا تَارِكٌ مقدر ہے اور لفظ ”تَارِكٌ“ کے ساتھ مَالًا بھی مخفی ہے اور جَعَلْنَا سے حکم شرعی مراد ہے اور ولایت کے اہل ہیں تاہم یہ اقربیت اور میراث کے معنی میں ہے۔ اور مِمَّا تَرَكَ. مَوَالِيَ کے معنی کے ساتھ متعلق ہے یعنی يَلُوْنَهٗ يَرِثُوْنَهٗ اور مِنْ برائے تبعیض ہے اور (مَا) موصول مال کے معنی میں ہے اور الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ بدل یا مَوَالِيَ کیلئے بیان ہے اور الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ میں الف لام مضاف الیہ کی ضمیر کے عوض میں ہے۔ یعنی وَالِدَاهُمْ وَاَقْرِبَاءُهُمْ : تو معنی یہ ہوا کہ ہر فوت شدہ شخص یا ہر مال چھوڑنے والے کے مال کیلئے ہم نے ورثاء و اقرباء مقرر کیئے ہیں جو میت کے کچھ مال کو بطور وراثت لیتے ہیں اور اقرباء، ورثاء ماں باپ اور دیگر رشتے دار ہیں اور الْوَالِدٰنِ کے ذکر کرنے سے اولاد کی طرف اشارہ ہے یعنی ولادت میراث کیلئے سبب ہے اس توجیہ پر یہ آیت لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا کے ساتھ متعلق ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ كُلٌّ کیلئے

شَیْئٍ مضاف الیہ مقدر ہے۔ مِمَّا تَرَكَ اس میں (مَا) سے مالِ میراث مراد ہے معنیٰ یہ ہے کہ ان چیزوں اور مالوں میں جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے موت کے بعد چھوڑے ہوں ہم نے میراث کے مستحق مقرر کئے ہیں۔ اس معنیٰ میں اس کی مناسبت مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ سے ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ كُلٍّ: کا مضاف الیہ مِنْكُمْ مقدر ہے۔ مَوَالِيَ عَصَبَة کے معنیٰ میں ہے اور مِمَّا برائے تبعیض ہے۔ (مَا) مَنْ موصولہ کے معنیٰ میں ہے اَلْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ تَرَكَ کیلئے فاعل ہے یعنی عصبہ کے وہ افراد جو ماں باپ چھوڑ گئے ہوں یعنی چچا، دادا، ماموں اور اقرباء چھوڑ گئے ہوں یعنی چچازاد یا اس سے نچلے طبقے میں اور بھتیجے اور ان کی اولاد (ان سب کو ہم نے ذوی الفروض کے بعد وارث مقرر کیا ہے) لہٰذا اس آیت میں اشارہ ہے کہ ذوی الفروض کے بعد (جن کی میراث کا ذکر دو آیتوں میں گزرا ہے) جمہور کے نزدیک بقایا میراث عصبہ کا ہے اور بعض کے نزدیک ذوی الأرحام کی طرف بھی اشارہ ہے ان دونوں قسموں کا ذکر احادیث میں تفصیلاً مذکور ہے اور اس ترتیب میں اس کا تعلق بطور تکملہ میراث کی آیت کے ساتھ ہے اگرچہ درمیان میں بہت فاصلہ ہے۔ چوتھا قول، مضاف الیہ مقدر ہے جو کہ مِنْكُمْ ہے اور اس میں وہ لوگ مخاطب ہیں جن کو وَ لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ میں خطاب ہے۔ مَوَالِيَ سے مراد ہیں عہد کرنے والے یعنی جن سے قسم لی گئی ہو کہ ایک دوسرے سے تعاون و مدد کرینگے۔ اس کو مَوْلَى الْمَوَالَاتِ کہتے ہیں۔ مِنْ برائے تبعیض ہے اور (مَا) موصولہ اَلَّذِيْنَ کے معنیٰ میں ہے یعنی ان دوستوں میں سے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑے ہوں جن سے انہوں نے اپنی زندگی میں ولایت (دوستی) کی ہو اور اس کو ولاء قدیم کہا گیا ہے وَ الَّذِيْنَ عَقَدَتْ اس توجیہ میں یہ اَلْوَالِدٰنِ پر عطف ہے یعنی تم نے ان سے بھائی چارے کی نئی قسم وعہد کیا ہو اسکو ولاء جدیدہ کہا جاتا ہے اس توجیہ پر یہ آیت لَا تَتَمَنَّوْا کے ساتھ متعلق ہے نیز یہ میراث کی آیت کا تکملہ ہے لیکن مولی الموالات کا حکم بعد میں ذکر ہوگا اس کے علاوہ بھی اس میں توجیہات ہیں جن کو امام آلوسیؒ اور صاحب اللباب نے ذکر کیے ہے لیکن وہ مقصد سے بہت بعید ہیں وَ الَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ: ایک توجیہ پہلے ذکر ہوئی کہ یہ اَلْوَالِدٰنِ پر عطف ہے دوسری توجیہ جو راجح اور مشہور ہے وہ یہ ہے یہ ایک علیحدہ کلام ہے اور یہ مبتداء ہے جس کی خبر فَاٰتُوْهُمْ ہے۔ عقد اور معاہدے کے متعلق بہت سے اقوال ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ یہ قسم (حلف) ہے زمانہ جاہلیت میں یہ طریقہ تھا کہ ایک دوسرے کے ساتھ (عہد) قسم کر لیتے کہ میرا دشمن تیرا دشمن، میرا خون تیرا خون، میری صلح تیری صلح، میرے مرنے کے بعد میری جائیداد کا تو وارث ہوگا

اسی طرح میں بھی تیرے دوست کو دوست، دشمن کو دشمن سمجھونگا، میری میراث تو لے گا، تیری میراث میں لونگا، میری دیت تو دیگا تیری دیت میں دونگا، اس حلیف کو حلیف کے میراث میں سے چھٹا حصہ مل جاتا تھا۔ یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہما، سعید بن جبیر اور حسن بصری رحمہم اللہ وغیرہ کا ہے پھر یہ قسم میراث کا أُولُوا الْأَرْحَامِ الخ سے منسوخ ہوا۔ **دوسرا قول:** یہ مواخات (بھائی چارگی) ہے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم مدینہ تشریف لائے تو آپ نے مہاجرین و انصار میں اخوت کا عقد کرایا جس سے یہ قانون لاگو ہوا کہ مہاجر فوت ہوجائے تو انصاری بھائی اس کی میراث لے گا اسی طرح انصاری کے فوت ہونے پر، مگر بعد میں گزشتہ آیت سے یہ حکم منسوخ ہوا، یہ قول بھی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ تیسرا قول یہ منہ بولے بیٹے مُتَبَنّیٰ کے متعلق ہے یعنی اپنے لئے کسی لڑکے کو بیٹا بنالیتے اس کی بیوی بہو کے حکم میں ہوتی اور بیٹے کے احکام اس پر جاری کرتے تھے میراث میں حصہ دار ہوتا پھر یہ حکم منسوخ ہوا (سورۃ احزاب کی ابتداء میں اس کی تفصیل ہوگی ان شاء اللہ)۔ چوتھا قول اس سے نکاح کا عقد مراد ہے یعنی میاں بیوی کی میراث جیسا کہ اس کا ذکر گزر گیا ہے یہ ابو مسلم اصفہانیؒ کا قول ہے اس قول کی بناء پر آیت منسوخ نہیں ہے لیکن ان تمام اقوال میں پہلا قول بہتر ہے البتہ منسوخ نہیں ہے نَصِيبَهُمْ سے مراد نصرت ہے اور عطیہ دینا ہے۔ ابن جریرؒ نے مجاہدؒ سے نیز امام بخاری نے کتاب التفسیر میں اس قول کو نقل کیا ہے۔ فائدہ: مَوَالِيَ مَوْلَى کی جمع ہے یہ لفظ مشترک ہے اور مختلف معانی کو شامل ہے۔ آزاد کرنے والا اور آزاد کردہ مولی العتاقہ کہا جاتا ہے حلیف (ہر قسم کا دوست) مولی الموالات چچازاد بھائی اور مددگار، اس آخری معنی میں اللہ کو بھی مولی کہا گیا ہے۔ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ مَوْلَى الَّذِينَ آمَنُوا (سورۃ محمد آیت (11) مَالِكُ کے معنی میں ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے لئے بطور صفت استعمال ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کیلئے بطور صفت ہے مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ عصبہ رشتہ دار، جیسا کہ ایک تفسیر آیت ہذا میں گزر رہی ہے۔ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا جاننے والا، خبردار، دیکھنے والا، اس جملے میں اطاعت کرنے والوں کیلئے ترغیب ہے اور نافرمانوں کیلئے (تخویف) ڈراوا ہے۔

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ ۚ فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللَّهُ ۚ وَاللَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ ۖ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيرًا ﴿٣٤﴾ مرد عورتوں پر حاکم ہیں بسبب اس کے جو اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور بسبب اس کے جو اپنے مالوں سے خرچ

کرتے ہیں پس نیک عورتیں فرمانبردار ہوتی ہیں پیٹھ پیچھے حفاظت کرنے والیاں بسبب اللہ تعالیٰ کی حفاظت کے اور وہ عورتیں جن کی سرکشی سے تمہیں خوف ہوتو انہیں نصیحت کرو اور انہیں اپنے بستروں سے الگ کرو اور انہیں مارو پھر اگر تمہاری اطاعت کریں تو تم ستانے کیلئے ان پر اور راستہ (طلاق) مت تلاش کرو یقیناً اللہ تعالیٰ نہایت بلند بہت بڑا ہے" [34]۔

تفسیر 34: اس آیت میں ستر واں حکم ہے جس میں ظلم کو دفع کرنے اور خانہ داری امور میں اصلاح کا بیان ہے (ربط 1) سابقہ آیت لَا تَتَمَنَّوْا میں اشارہ تھا کہ مردوں کیلئے بنسبت خواتین کے میراث میں زیادہ حصہ ہے تو اب اس آیت میں اس کی علت کا بیان ہے کہ اصل میں وہ خواتین پر نگران ہیں۔ (ربط 2) سابقہ آیت میں ایک عقد ذکر ہوا جو نصرت کا سبب ہے تو اس آیت میں عقد نکاح ذکر ہے کہ یہ عورتوں پر مردوں کیلئے سبب قیام ہے۔ (ربط 3) ابو مسلم اصفہانیؒ کے قول میں وَ الَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ سے نکاح مراد ہے تو اب گھریلو زندگی میں گزران کا طریقہ بتانا مقصود ہے تاکہ فساد کا خطرہ نہ ہو۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ الف لام ان دونوں میں جنسی ہیں یعنی مردوں کے جنس کو عورتوں کے جنس پر قیام کا درجہ حاصل ہے۔ بعض نے الف لام عہدی مراد لیا ہے یعنی وہ شخص جس میں عقلمندی ہوشیاری جرات ہو۔ ابو حیانؒ کا قول ہے کہ فقط داڑھی والا مراد نہیں ہے کیونکہ بعض داڑھی والے ہوتے ہیں لیکن وہ کسی فائدے اور نقصان کے نہیں ہوتے۔ البتہ پہلا قول بہتر ہے بعض افراد کی تخصیص خارجی قرینہ سے ہوتی ہے ابن عاشورؒ کا قول ہے کہ اَلرِّجَالُ سے مراد یہاں پر صرف شوہر اور اَلنِّسَآءُ سے صرف بیویاں مراد نہیں ہیں بلکہ دونوں جنس مراد ہیں اسلئے کہ یہ ایک قانون کلی ہے یعنی ایک قاعدہ ہے۔ قَوّٰمُوْنَ اسم فاعل اور مبالغے کا صیغہ جملہ اسمیہ کثرت مبالغہ اور تاکید پر دلالت کرتا ہے۔ مفسر ابن عاشورؒ قول کے مطابق یہ ایک قاعدہ شرعیہ ہے جس پر کئی احکامات متفرع ہو سکتے ہیں۔ قَوّٰمُوْنَ قیام سے لیا گیا ہے اور مبالغہ کا صیغہ ہے البتہ لفظ قیوم میں اس سے مبالغہ زیادہ ہے اسلئے وہ اللہ تعالیٰ کیلئے مختص ہے۔ قیام کا اصل معنی تو قیام اپنے اصلی معنی میں کھڑا ہونا یا کسی چیز میں اہتمام کرنے یا مضبوطی کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ مفسرین نے یہاں پر مندرجہ ذیل معانی کئے ہیں: امام قرطبی فرماتے ہیں کہ خواتین کا نان نفقہ دینے اور ان کی حفاظت پر قائم ہے (البتہ نفقہ کا لفظ مناسب نہیں ہے اسلئے کہ بعد میں اس کو سبب بنایا ہے جبکہ سبب اور مسبب ایک چیز نہیں ہو سکتے (نیز مرد حکام، امراء اور غازی بن سکتے ہیں جبکہ عورتیں نہیں) امام قرطبی آگے کہتے ہیں کہ کسی چیز پر قیام اس پر مکمل نظر رکھنا اور اس کی حفاظت کی کوشش کرنا ہے۔ مرد کیلئے عورت پر نگرانی یہ ہے کہ اس کی تربیت کرے گھر میں حقوق شرعی ادا کرتے ہوئے رکھے بلا ضرورت گھر سے باہر نہ

جائے دے۔ عورت پر شوہر کے شرعی حقوق کو ادا کرنا لازم ہے اس کی اطاعت لازمی طور پر کرے ہر وہ حکم جو خلاف شریعت نہ ہو مانے۔ آلوسیؒ نے لکھا ہے کہ مردوں کو چاہئے کہ عورتوں پر حاکموں کی طرح نگرانی کریں کہ بعض چیزوں کا حکم دے اور بعض سے منع کرے۔ صاحب اللباب نے لکھا ہے کہ قَوّٰامٌ وہ ہے جو رعایا کی مصلحتوں کا نگران ہو تدابیر، آداب اور تمام امور کا اہتمام اس کے ذمہ ہوگا۔ ابن کثیرؒ کا قول ہے کہ قیام کا معنی یہ ہے کہ آدمی سربراہ ہے عورت پر اس کو ادب سکھانے کا جب وہ ٹیڑھی ہو وغیرہ اور علی بن ابی طلحہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ قَوّٰمُوْنَ کا معنی یہ ہے کہ مرد عورتوں پر امیر ہونگے بیوی اطاعت کے مقام پر اطاعت کرے گی اور اطاعت یہ ہے کہ اس کی اولاد سے احسان کرے گی اور مال کی حفاظت کرے گی۔ اس قیام کیلئے اللہ تعالیٰ نے دو اسباب ذکر کئے ہیں۔ پہلا وھبی دوسرا کسبی۔ وھبی سبب یہ ہے بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مردوں کو کئی وجوہات سے عورتوں پر برتری اور فضیلت حاصل ہے بعض وجوہات حقیقیہ ہیں اور بعض کا تعلق شریعت سے ہے۔ عموی طور پر علم وعقل مردوں میں زیادہ ہوتے ہیں مشکل اور سخت کاموں پر قدرت رکھتے ہیں، تیر اندازی، گھڑ سواری، جنگی مہارتیں، امامت کبریٰ یعنی خلافت امارت، امامت صغریٰ، پیش امام وغیرہ، جہاد کرنا، اذان، خطابت حدود وقصاص میں شہادت، میراث میں زیادہ حصہ لینا، قتل خطاء اور قسامت میں دیت کی ادائیگی، نکاح، طلاق، رجوع کے اختیارات ان کے پاس ہیں نسب کی نسبت ان کی طرف ہوتی ہے۔ صاحب اللباب نے اس طرح گن کر ذکر کیا ہے آلوسیؒ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان فضائل کی تفصیل اسلئے نہیں کی ہے کہ اہل عقل کو یہ معلوم ہے پھر انہوں نے لکھا ہے کہ خلافت وامارت اور پیش امام ہونا یہ مردوں کے ساتھ خاص ہے یہ عورت کیلئے لائق نہیں ہے۔ ابن کثیرؒ نے فرمایا ہے کہ مرد کو عورت پر فضیلت حاصل ہے اسلئے نبوت اور بادشاہت مردوں ہی کا حق ہے جیسے فرمان نبوی ﷺ ہے کہ لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا اَمْرَهُمْ اَمْرَاَةً کبھی بھی وہ قوم کامیاب نہیں ہوسکتی جو اپنے اختیاراتِ ولایت عورت کو سونپ دے۔ (صحیح بخاری کتاب المغازی حدیث 4425)۔ قاضی ہونا بھی مردوں کیلئے خاص ہے مفسر قاسمیؒ کا قول ہے کہ اس آیت میں دلیل ہے کہ عورت منصب قضاء کا اہل نہیں۔ جیسا اس کیلئے امامت کبریٰ نہیں تو قاضیہ بھی نہیں بن سکتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں پر مردوں کو (نگران) قوام بنایا ہے لہٰذا ان کو اس منصب (قوامت) پر جانے کیلئے کوششیں نہیں کرنی چاہئیں کیونکہ ان پر مردوں کو حکمرانی کا حق حاصل ہے۔ اس کلام کو قاسمی صاحب نے امام سیوطیؒ کی کتاب اکلیل سے نقل کیا ہے۔ سوال: لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ الخ والی حدیث کی سند میں عوف ابن ابی جمیلہ ہے جس کو ابو سہل کہا

جاتا ہے۔ جس پر امام ذہبی نے اعلام النبلاء میں اور دیگر ناقدین نے اپنی کتب میں سخت کلام کیا ہے لہٰذا اس حدیث سے استدلال نہیں ہوسکتا ہے؟ جواب (1): یہ بخاری کے راویوں میں سے ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری کے مقدمہ میں فرمایا ہے کہ امام بخاری کا کسی راوی سے روایت لینا ثقہ ہونے کی دلیل ہے کیونکہ امام بخاری اصحاب الجرح والتعدیل میں سے ہیں۔ جواب (2): اس پر جرح تشیع اور قدریت کی وجہ سے ہے لیکن اکثر محدثین کا قول ہے کہ اہل بدعت سے روایت لینا شروط کے تحت درست ہے جب اس میں ثقہ ہونے کی دیگر صفات موجود ہوں لہٰذا اس میں ثقہ ہونے کی دیگر صفات موجود ہیں۔ سیر اعلام النبلاء جلد 6 ص 383 میں اس کو ثقہ منکر۔ ثقہ ثبت کہا گیا ہے۔ تہذیب الکمال جلد 22 ص 437 تا ص 441 میں اس کی توثیق ثابت کی ہے مثلاً امام احمد نے اسکو ثقہ صالح الحدیث کہا ہے۔ امام ابن معین نے ثقہ کہا ہے امام ابوحاتم نے صالح اور صدوق کہا ہے۔ امام نسائی نے ثقہ ثبت صدوق مشہور کہا ہے۔ امام ابوداؤد نے کہا ہے کہ محدثین کی پوری جماعت نے اس سے روایتیں لی ہیں لہٰذا اس وجہ سے ان سے روایت لینا درست ہے۔

جواب (3): عوف کی متابعت کرنے والے اور بھی بہت سارے راوی ہیں۔ ترمذی میں حدیث اس طرح ہے حمید الطویل عن الحسن عن ابی بکرۃ۔ سنن نسائی نے بھی یہی سند ذکر کی ہے۔ مسند احمد میں ابوعبدالرحمٰن بن جوشن عن ابیہ عن ابی بکرۃ ہے نیز مسند طیالسی میں بھی یہی سند ہے۔ مسند احمد میں حمید عن الحسن عن ابی بکرۃ۔ مبارک بن فضالۃ عن الحسن عن ابی بکرۃ کی سندیں ہیں مسند احمد جلد، 15 ص 216، 235، 237 مستدرک میں عبدالعزیز بن ابی بکرۃ عن ابیہ۔ حمید طویل کی سند سے بھی ذکر ہے اور مسند الشہاب جلد 2 ص 51 میں عن مبارک بن فضالۃ عن الحسن عن ابی بکرۃ کی مسند سے ہے صحیح ابن حبان جلد 7 ص 25۔ اور ابن قانع کے معجم الصحابۃ جلد 3 ص 143 عقبہ بن عبدالرحمٰن بن ابی بکرۃ عن ابیہ کی سند مذکور ہے۔ مصنف ابن ابی شیبہ جلد 15 ص 266 میں بھی یہی سند مذکور ہے تو معلوم ہوا کہ اس کی متابعت میں حمید الطویل، ابوعبدالرحمٰن بن جوشن، مبارک بن فضالۃ، عبدالعزیز بن ابی بکرۃ، وعبدالرحمٰن بن ابی بکرۃ بڑے ائمہ سے یہ روایت نقل ہے۔ فائدہ: اس مقام پر بات طویل ہوگئی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے کے دین سے ناواقف یا بے دین لوگ مل کر سربراہی، صدارت، وزارت عظمیٰ وغیرہ عورت کو دیتے ہیں اور جائز بھی تصور کرتے ہیں اور اس حدیث میں عوف پر اعتراض بھی کرتے ہیں تو ان شاء اللہ اس تحقیق کے بعد اعتراض کیلئے گنجائش نہیں رہے گی بات بالکل واضح کی گئی ہے۔ **وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ** یہ دوسرا سبب سببی ہے یہاں سے عورتوں پر مردوں کی برتری کا دوسرا سبب بیان فرمارہے ہیں اور یہ سبب کسبی ہے اور وہ ہے مرد خرچ

کرنے والا ہے یہ عقل کا بھی تقاضا ہے کہ وہی حاکم ہوتا ہے جو خرچ کرنے والا ہوتا ہے حدیث میں بھی یہ برتری ثابت ہے کہ اوپر والا ہاتھ خرچ کرنے والا ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الزکوۃ حدیث 1472 صحیح مسلم حدیث 1035،960)۔

یعنی مرد کا ہاتھ اوپر ہے البتہ خرچ نہ کرنے سے یہ سبب ختم ہو سکتا ہے۔ امام قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ شوہر جب بیوی پر خرچ کرنے سے عاجز ہو جائے تو اس کی قوامیت ختم ہو سکتی ہے اور ایسی صورت میں قاضی نکاح فسخ کرنے کا اختیار استعمال کر سکتا ہے۔ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ نے نکاح فسخ کرنے کا حکم ثابت کیا ہے کہ جب شوہر نان نفقہ نہیں دے سکتا ہو اور اس سے عاجز ہو گیا ہو تو پھر فسخ نکاح ہو سکتا ہے البتہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ مہلت دینے کے حق میں ہے کہ نکاح فسخ نہیں کیا جائیگا بلکہ اس کی مالی وسعت کا انتظار کیا جائیگا۔ یہاں پر مَآ اَنْفَقُوْا سے واجبی حقوق مراد ہیں یعنی عورت کا کپڑا، کھانا اور رہائش مہر وغیرہ۔ فَالصّٰلِحٰتُ شوہر کا حال ذکر کرنے کے بعد بیوی کا حال اور شوہر کے ساتھ رہنے کا طریقہ ذکر ہو رہا ہے اور عورت کی دو حالتیں ذکر فرمار ہے صالحات اور ناشزات۔ صالحات سے شرعی اصلاح مراد ہے اور یہ مبتداء ہے جس کی خبر قٰنِتٰتٌ ہے یعنی اللہ اور رسول ﷺ کی اور اپنے شوہر کی اطاعت گزار ہو البتہ شوہر کی اطاعت اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کے ماتحت ہے یعنی گناہ کے کاموں میں شوہر کی اطاعت نہیں ہے۔ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ یعنی اپنے نفسوں اور شوہروں کے مال کی حفاظت کرتی ہے۔ لام (فی) کے معنی میں ہے لام برائے وقت ہے جیسے لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ (سورۃ اسراء) میں ہے اور غیب مصدر ہے شوہر کے غائب ہونے کے معنی میں ہے جیسے لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ (سورۃ یوسف) میں ہے۔ اس کی تائید ابو داؤد طیالسی کی روایت میں ہے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا عورتوں میں اچھی خاتون وہ ہے جب آپ اس کی طرف نگاہ اٹھائیں تو آپ کو خوش کریں اور جب آپ اس کو حکم دیں تو اطاعت کریں اور جب آپ اس سے غائب ہو تو آپ کی غیر موجودگی میں اپنے نفس اور آپ کے مال کی حفاظت کریں۔ نسائی 6۔68 (قال شیخ البانی حسن مشکوۃ کتاب النکاح) (مسند طیالسی حدیث 2325 سلسلۃ الصحیحۃ حدیث 1838)۔ پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت کی۔ امام آلوسیؒ اور صاحب اللباب نے یہ توجیہ بھی کی ہے کہ لام اپنے معنی پر ہے اور کلام کا معنی یہ ہے کہ اپنے شوہر کے خفیہ رازوں کی حفاظت کرے اور اس کے عیوب کو چھپاتی ہو شوہر کے رازوں کو غیب کہا گیا ہے۔ پہلی تفسیر حدیث کے موافق ہے لہذا وہ بہتر ہے۔ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ نحاس کے نزدیک یہ باسببیہ ہے اور ما مصدریہ ہے اور حَفِظَ اللّٰهُ کے معنی ان کو توفیق دینا گناہوں سے بچنے کی اور ان کی حفاظت کرنا۔ اور زجاج کا قول ہے کہ

حفاظت اللہ تعالیٰ کا امر مراد ہے جو شوہروں کو نان نفقہ مہر کا اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اس کے بدلے میں بیویوں کیلئے شوہروں کے مال کی اور اپنے نفسوں کی حفاظت ضروری ہے۔ بعض کا قول ہے کہ حَفِظَ اِسْتَحْفَظَ کے معنی میں ہے یعنی بسبب اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں سے شوہروں کے مال اور اپنی نفسوں کی حفاظت کا مطالبہ کیا ہے ان دونوں (مال اور نفس) کی حفاظت ان پر حکم الٰہی ہے۔ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ یہ عورتوں کی دوسری قسم اور کیفیت کا بیان ہے یعنی "ناشزات" صالحات کو صیغہ اسم فاعل کے ساتھ ذکر کیا ہے جبکہ ان کو ناشزات نہیں کہا اسلئے کہ مسلمان خواتین اکثر صالحات ہوتی ہیں نشوز (جنگ جدال، بداخلاقی) کبھی کبھی کر لیتی ہیں۔ تَخَافُوْنَ خوف سے مراد وہ ناپسندیدہ حال، کیفیت ہے جو زمانہ مستقبل میں کسی ناپسندیدہ چیز کی وجہ سے پیدا ہو جائے اور اس کو علم ظنی کہتے ہیں۔ نُشُوْزَهُنَّ نشز اصل میں اٹھ جانے کو کہا جاتا ہے جیسا کہ فرمایا وَاِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا (سورۃ مجادلۃ)، نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا (سورۃ بقرۃ)۔ بلند زمین کو بھی کہا جاتا ہے یہاں نشوز سے مراد بیوی کا اپنے شوہر کی نافرمانی کرنا ہے جو اللہ و رسول کی اطاعت میں اس پر لازمی تھی اور شوہر کو ناپسند کرنا ہے کبھی یہ صفت شوہر میں بھی آسکتی ہے جیسا کہ اس سورۃ کی آیت (128) میں ہے یعنی شوہر کا بیوی سے نفرت اختیار کرنا۔ اس نفرت میں اپنے آپ کو بلند تر تصور کرنا ہوتا ہے اور صاحب اللباب نے امام شافعی سے نقل کیا ہے کہ نشوز کبھی فعلی اور کبھی قولی ہوتا ہے۔ قولی نشوز یہ ہے کہ پہلے جب شوہر اس کو پکارتا تو یہ لبیک کہتی اور بات کو عاجزی و محبت سے سنتی تھی اور شوہر کی باتیں اس کو اچھی لگتی تھیں لیکن اچانک یہ کیفیت برعکس ہوئی۔ فعلی نشوز یہ ہے کہ جب شوہر گھر میں داخل ہوتا تھا تو یہ اٹھتی اور جب وہ کسی کام کا حکم دیتا تو یہ خندہ پیشانی سے کرتی تھی وہ اسکو اپنے بستر پر بلا لیتا تو مسرور ہو کر اپنے آپ کو خوشی سے پیش کرتی تھی لیکن یہ حالات اچانک بدل گئے تو اس کو نشوز کہا گیا۔ ان علامات کے ذریعے سے نشوز کا علم حاصل ہو گیا تو بعد والے احکام اس پر مرتب ہوئے۔ فَعِظُوْهُنَّ امام قرطبی نے فرمایا کہ اس کو نصیحت کریں کہ کتاب اللہ و سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں شوہر کا بلند مرتبہ ذکر کیا گیا ہے اور عورتوں پر شوہر کے ساتھ خوش اسلوبی سے رہنے کا حکم واجب کیا گیا ہے اور شوہر کے بلند مراتب کا ذکر کریں جو اس آیت میں ذکر ہوئے ہیں اور اسے یہ حدیث بھی سنائیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میں کسی کو اجازت دیتا کہ کسی کو اکرام و عزت کے طور پر سجدہ کرے تو شوہر کیلئے اس کی بیوی کو سجدے کا حکم دیتا یعنی عورتوں کو شوہروں کیلئے سجدے کا حکم جاری کرتا (ابن ماجہ حدیث 1853 کتاب النکاح ابن حبان 1291 احمد 4-341 مستدرک حاکم 2-187 اس روایت کو حاکم ذہبی اور البانی نے صحیح کہا ہے السلسلۃ الصحیحۃ 1203) ایک اور

حدیث میں ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو بستر پر بلائے اور وہ حکم کی تکمیل نہ کرے تو صبح تک ملائک اس پر لعنت بھیجتے ہیں (صحیح بخاری کتاب النکاح حدیث 5194 و صحیح مسلم کتاب النکاح حدیث 1436) تو اس قسم کی احادیث و آیات اس کو پڑھ کر سنائیں اور خوف کی باتیں بطور نصیحت اس کو بیان کریں اگر وہ مان جاتی ہے تو اچھی بات ہے ورنہ پھر یہ حکم ہے کہ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ مَضَاجِعْ مَضْجَعٌ کی جمع ہے یہ آرام کرنے کی جگہ ہے۔ وَاهْجُرُوْهُنَّ میں بہت سے اقوال ہیں مفسرین کا مشہور قول یہ ہے کہ یہ وَاهْجُرُوْ یہ ہجران سے لیا گیا ہے چھوڑنے اور دور کر لے کے معنی میں ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن جبیر کے قول کے مطابق معنی یہ ہے کہ ان سے جماع مت کرو۔ ضحاک اور سدیؒ کا قول یہ ہے کہ بستر میں ان کی طرف پیٹھ کرو اور ان سے بات نہ کرو۔ مجاہدؒ کا قول یہ ہے کہ ان کو بستر میں چھوڑ دو اور خود دوسرے بستر پر آرام کرو (لیٹ جاؤ)۔ عکرمہ اور حسن بصری رحمۃ اللہ کا قول یہ ہے کہ یہ ہجر سے لیا گیا ہے بری گفتگو کو کہا جاتا ہے جیسا کہ تُهْجِرُوْنَ میں ایک تفسیر یہ ہے (سورۃ مؤمنون) یعنی ان سے سختی کرو اور مضاجع کا معنی ہے گھروں میں ان کو رکھ کر سختی کرو۔ ابن جریرؒ کے نزدیک اھجار سے لیا گیا ہے اور اھجار وہ رسی ہے جس سے اونٹ کو باندھا جاتا ہے تو معنی یہ ہے کہ ان کو بستروں پر باندھ لو قابو کرنے یا زبردستی جماع کرنے کیلئے۔ اس قول کو ابن جریر نے پسند کیا ہے اور دیگر اقوال پر تنقید کی ہے اور انہوں نے اس کیلئے ایک غریب حدیث نقل کی ہے مگر زمخشریؒ اور ابن عربیؒ نے اس کا رد کیا ہے پھر آلوسیؒ نے اس احتمال کے اثبات کے لیے زمخشریؒ پر رد کیا ہے اور جب ہجران سے بھی دیگر طریقوں سمیت فائدہ نہ ہو تو پھر تیسرا حکم یہ ہے وَاضْرِبُوْهُنَّ اور اس کو ضرب تادیبی کہتے ہیں یعنی آداب کیلئے مارنا جس طرح بچوں کو تعلیم و آداب کیلئے ادبا مارا جاتا ہے۔ ضرب سے غیر مبرح مارنا مراد ہے۔ (صحیح مسلم کتاب الحج حدیث 1218 ابوداؤد کتاب الحج حدیث 1905 ابن ماجہ کتاب المناسک حدیث 3074) ترمذی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل ہے کہ یہ مارنا مسواک یا اس جیسی لکڑی سے ہے اس طرح مارنا کہ ہڈی نہیں ٹوٹے کسی ہڈی کو اس طرح نہیں مارو کہ اس میں عیب آجائے، مکا یا تھپڑ مار سکتا ہے اور حدیث میں ہے کہ چہرے پر نہیں مارنا چاہئے۔ ابن عطیہ کا قول ہے کہ یہ تینوں عمل ترتیب سے جاری کرنا مراد ہے یعنی ایک امر جاری کرو اگر اس پر اصلاح ہو جائے تو ٹھیک ورنہ دوسرا حکم جاری کرو یعنی پہلے نصیحت کرو اور اس پر اصلاح ہو جائے تو ٹھیک ورنہ بستر الگ کرو اس پر اصلاح ہو جائے تو ٹھیک ورنہ پھر اس کے ساتھ ادب کے دائرے میں مار پٹائی کرے اگر تیسرے حکم سے بھی اصلاح نہ ہو تو پھر فدیہ لیکر خلع کرلے۔ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا اطاعت کے

لفظ سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے نشوز میں گناہ کا ارتکاب کیا تھا اور اطاعت یہ ہے کہ تمہارے ساتھ موافقت کریں اور جو امور ان پر واجب ہیں وہ ادا کریں اور نشوز کی علامات کو ختم کریں۔ فَلَا تَبْغُوا: تَبْغُوا طلب کے معنی میں ہے یعنی ان پر ان تین راستوں کے علاوہ کوئی اور راستہ مت تلاش کرو یعنی وعظ ہجر ان اور ضرب یعنی یہ کام پھر مت کرو۔ یہ جمہور مفسرین کا قول ہے یا مت تلاش کرو ان پر دلی محبت کا راستہ کیونکہ دل کی محبت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے یہ سفیان کا قول ہے یا ان پر ضرر اور تکلیف کا راستہ مت تلاش کرو تا کہ وہ پھر نشوز شروع نہ کریں اور عَلَيْهِنَّ کا لفظ اس آخری معنی کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔ امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ تَبْغُوا الْبَغِيِّ سے لیا گیا ہے یعنی زور اور ظلم کے معنی میں ہے۔ سَبِيلًا سبیل کے معنی میں ہے یعنی کسی بھی طریقے سے ان پر ظلم مت کرو اور اس لفظ میں طلاق بھی داخل ہے یعنی جب اطاعت شروع کر لیتی ہیں تو پھر ان کو طلاق دینے کی مت سوچو کیونکہ بے قصوری کی حالت میں طلاق جائز امور میں ناپسند عمل ہے۔ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيرًا اس جملے میں شوہروں کیلئے وعظ ہے کہ مارنے یا ادب کیلئے چھوڑ دینے میں تم اپنی بڑائی مت سمجھو یہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں رخصت دی ہے اصل تکبر و بڑائی تو اللہ تعالیٰ کی صفت ہے چونکہ۔ قَوّٰامِيْنَ (حُكَّام) بھی کبھی کبھار ظلم کرتے ہیں اور شوہر بھی حاکم ہے تو ان کو ظلم سے بچنے کا حکم اور اس سے ڈرانا مقصود ہے۔ عُلُوّ اللہ تعالیٰ کی حقیقی صفت ہے جو اللہ تعالیٰ کے بلند ہونے پر دلیل ہے جس کیلئے قرآن مجید کی دوسری آیات میں اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ دلیل موجود ہے۔ جس کو بغیر تحریف، تشبیہ، تمثیل ماننا چاہئے اور فرق یہ ہے کہ عُلُوّ صفات کے اعتبار سے ہے اور دونوں میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ۝ "اگر تم ان دونوں کے آپس کے اختلاف سے ڈرو تو ایک منصف اس (مرد) کے کنبے میں سے اور ایک منصف اس (عورت) کے کنبے میں سے بلاؤ اگر وہ دونوں (منصف) اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں تو اللہ تعالیٰ ان کی آپس میں موافقت پیدا کر دے گا یقیناً اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا خبردار ہے" [35]۔

تفسیر 35: اس آیت میں سورت کے احکامات میں سے اٹھارواں حکم بیان فرمایا ہے اور یہ حکم میاں بیوی کے درمیان واقع ہونے والے ظلم کو دفع کرنے کے لئے ہے۔ اور یہ سابقہ آیت کیلئے بطور تکملہ ہے یعنی فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ میں عورت کی اطاعت کی حال کا ذکر تھا تو اب (عِصْيَان) نافرمانی کی صورت میں اس کا حکم بیان ہو رہا ہے لیکن لفظ عِصْيَان مسلمانوں

کے ساتھ اچھا نہیں لگتا ہے تو اسلئے لفظ شقاق اور خوف ذکر کیا ہے۔ وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ۔ شِقَاقَ شق سے لیا گیا ہے جس کا معنی جانب اور طرف کے ہے جب دو بندوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے تو ان سے دو گروہ بن جاتے ہیں۔ بَيْنِهِمَا بین حقیقت میں ظرف ہے شقاق کے لئے (مفعول فیہ) ہے مگر مفعول بہ کے حکم میں ہو گیا اور شقاق مصدر اس کی طرف مضاف کیا گیا۔ اس خطاب میں دو قول ہیں (1) پہلا قول ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سعید بن جبیر ضحاک اور مجاہد رحمہم اللہ کا ہے کہ یہ خطاب ایمان والوں کے حاکموں اور امیروں کو ہو رہا ہے۔ (2) دوسرا قول سدی کا ہے کہ خطاب عورت اور مرد کے اولیاء سے ہو رہا ہے۔ فَابْعَثُوْا اس سے مراد مقرر کرنا اور بھیجنا ہے تاکہ ان کے درمیان اصلاح کریں اور ان کا اختلاف کسی بڑی دشمنی کا پیش خیمہ نہ بنے۔ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ حکم سے مراد وہ شخص ہے جو صاحب عقل اور شعور ہو اور فیصلہ کرنے کا تجربہ اور صلاحیت رکھتا ہو اور صاحب انصاف وعدل بھی ہو یعنی اچھے افکار کا مالک ہو۔ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اھل کو اس لیئے خاص کیا کہ ان کو خوب معلومات ہوتی ہیں اور حقیقت کو جانتے ہیں وہ دونوں حَکَم اچھی طرح جانچ پڑتال کرکے یہ معلوم کرلیں گے کہ ان کے رہنے یا جدائی کا ارادہ ہے اور ان کے آپس میں اختلافات کیا ہیں اور جدال کے اسباب کیا ہیں امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ اگر کوئی صاحب عدل خاندان میں نہیں ہے تو غیر خاندان میں سے عادل دو افراد مقرر کریں اور تفتیش وتحقیق کے طریق کار کو امام قرطبیؒ نے تفصیل سے ذکر کیا ہے ان حاکموں کے پاس فیصلہ کرنے کا اختیار ہے یا نہیں؟ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور شعبیؒ وغیرہ کا قول ہے کہ ان کو مکمل اختیار حاصل ہے کیونکہ دو قاضی مقرر ہوئے ہیں صرف دو گواہ یا وکیل نہیں ہیں لہٰذا ان کا فیصلہ حاکم وقت کا فیصلہ ہے جنہوں نے انکو بھیجا ہے اس قول کو امام شافعیؒ اور امام احمدؒ نے پسندیدہ قرار دیا ہے امام ابو حنیفہ اور زجاج رحمہم اللہ کا قول ہے کہ ان کے پاس صرف اصلاح کا اختیار ہے شوہر کی رضامندی کے بغیر جدا کرنے کا اختیار ان کو حاصل نہیں ہے اور ان دونوں جانب کے دلائل امام آلوسیؒ اور قرطبیؒ نے لکھے ہیں لیکن دلائل کے اعتبار سے پہلا قول بہتر ہے۔ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ان ضمیروں کے متعلق دو قول ہیں يُّرِيْدَآ اور بَيْنَهُمَا حاکموں کی طرف راجع ہے یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہما ضحاکؒ اور مجاہدؒ وغیرہ کا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ پہلی ضمیر حاکموں اور دوسری ضمیر میاں بیوی کی طرف راجع ہے اور ہر دو اقوال میں صحیح نیت سے اللہ تعالیٰ کی امداد حاصل ہونے کی طرف اشارہ ہے یعنی جب دو بندے صحیح نیت سے کسی کام کا عزم کریں تو امداد الٰہی ان کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ حکم تمام صلح کرنے والوں کیلئے ہے کہ اگر ان کی نیت صحیح ہو تو ان کے فیصلوں اور جھگڑوں میں اللہ تعالیٰ خیر اور برکت پیدا کر کے

انجام بہتر نکالے گا اور یہ آیت دلیل ہے کہ انسان کو حَکَم کہنا درست ہے اور حَکَم کے پاس فیصلے لیکر جانا بھی درست ہے (جیسا کہ سورت مائدہ آیت 42 میں ہے)۔ نیز یہ آیت خوارج کے خلاف بطور دلیل ابن عباس رضی اللہ عنہما نے پیش کی تھی جب انہوں نے علی رضی اللہ عنہ سے بغاوت کی تھی اور دلیل میں آیت اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ پڑھ کر نعرہ لگا رہے تھے کیونکہ علی رضی اللہ عنہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ صلح کرنے پر تیار ہوئے تھے اور دو حَکَم جانبین سے مقرر کرنے کا فیصلہ ہوا جس پر حروریہ فرقہ خوارج مخالفت پر اتر آیا۔ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا خَبِیْرًا علیم ظاہر سے تعلق رکھتا ہے اور خبیر باطن کے ساتھ تعلق رکھتی ہے لہٰذا اس میں میاں بیوی کے ظاہری حال اور ان کے باطنی ارادوں کی طرف اشارہ ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ﴿٣٦﴾ۙ "اور تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ احسان کرو اور رشتہ داروں کے ساتھ یتیموں کے ساتھ اور مسکینوں کے ساتھ اور رشتہ دار پڑوسی کے ساتھ اور اجنبی پڑوسی کے ساتھ اور ہم نشینوں کے ساتھ اور مسافروں کے ساتھ اور جن کے تمہارے دائیں ہاتھ مالک بنے ہیں اور یقیناً اللہ تعالیٰ اترانے والوں اور فخر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے" [36]۔

تفسیر 36: اس آیت میں انیسواں حکم ہے جس میں حقوق اللہ و حقوق العباد میں ظلم سے بچنے کا طریقہ ذکر فرما رہے ہیں اور یہ دس (10) حقوق ہیں۔ (ربط 1) سابقہ آیت میں بیویوں کے ساتھ احسان کا ذکر تھا تو اس آیت میں بیوی کے ماسوا دیگر رشتے داروں کے ساتھ احسانات کا ذکر ہے تاکہ اخلاقِ کریمہ کی تکمیل ہوجائے۔ (ربط 2) سابقہ آیت میں اصلاح معاشرہ کے امور کا ذکر تھا تو اب یہ بتانا مقصود ہے کہ توحید اور اخلاص سے خالی ہو کر مذکورہ احسانات کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ وَاعْبُدُوا اللّٰہَ سابقہ آیت میں بھی اوامر اور نواہی یعنی حکم اور منع مذکور ہیں اور ان پر عمل پیرا ہونا عبودیت (بندگی) ہے لہٰذا اُعْبُدُوْا کا عطف ان پر مناسب ہے۔ امام قرطبی نے فرمایا یہ آیت محکم بالاتفاق ہے اور اس میں کسی قسم کا کوئی نسخ نہیں ہے اور تمام آسمانی کتب میں اس طرح وارد ہے اور یہ حکم عقلی بھی ہے۔ عبودیت کا معنیٰ (تذلل) عاجزی اور انکساری ہے اس ذات کیلئے جو مختار ہے۔ امام قرطبی نے اس مقام پر شرک اور ریاکاری کی اقسام اور ان کی قباحتیں تفصیل سے تحریر کی ہیں۔ صاحب اللباب نے فرمایا ہے کہ عبادت ہر وہ عمل ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے کیا جاتا ہے وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا

شریعت میں عبادت توحید باری تعالیٰ سے عبارت ہے۔ البتہ یہ جملہ وَلَا تُشْرِكُوا برائے تاکید متصل ذکر کیا ہے اس میں شرک کی نفی بہت ہی عموم کے ساتھ کی ہے یعنی نہی کا صراحتاً صیغہ اور اشراک کا لفظ جو کفر کی تمام اقسام کو شامل ہے نیز شرک ربوبیت، شرک الوہیت اور شرک خفی سب کو شامل ہے اور شَيْئًا ہر چیز کے عموم کیلئے ہے۔ مزید یہ کہ نکرہ نفی کے سیاق میں ہونے سے مزید عموم پیدا کرتا ہے اور اس شَيْئًا میں دو احتمالات ہیں پہلا احتمال یہ ہے کہ یہ مفعول بہ ہے یعنی کوئی چیز چیزوں میں سے خواہ ملائکہ، نبی، ولی، (فوت شدہ، یا زندہ،) جن، خواہش، شجر، حجر، تارے، سورج اور چاند وغیرہ ہوں یا مفعول مطلق ہے شَيْئًا مِنَ الْإِشْرَاكِ یعنی شرک کی تمام اقسام کیلئے عام ہے وَّبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا اس کی تفصیل سورۃ بقرہ آیت 83 میں گزری ہے۔ وَّبِذِي الْقُرْبٰى اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن سے والدین کی وجہ سے رشتہ داری حاصل ہوئی ہے چونکہ اس آیت کے مخاطبین امت محمدیہ ہیں اور اس امت کو صلہ رحمی کی زیادہ تاکید اور اہتمام کا حکم دیا ہے اس لئے یہاں "ب" کے ساتھ ذکر فرمایا۔ جبکہ سورت بقرہ میں اس کے مخاطبین بنی اسرائیل تھے اور ان میں صلہ رحمی کا اتنا اہتمام نہیں تھا اس لئے وہاں بغیر "ب" کے ذکر فرمایا۔ اور وہ اس امت کی طرح شان نہیں رکھتے ہیں اور اس جملے کے متعلق بھی کچھ تفسیر وہاں گزری ہے۔ وَالْيَتٰمٰى یتیم میں دو طرح سے عاجزی ہے: (1) کم سنی (2) ولی کا نہ ہونا یعنی اس پر خرچ کرنے والا نہیں ہے لہٰذا وہ بہت ہی شفقت کا حقدار ہے۔ وَالْمَسٰكِيْنِ اس قسم کے مقام میں مسکین اور فقیر میں فرق معتبر نہیں ہے یہ لفظ فقیر کو بھی شامل ہے۔ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى اس امت کی فضیلت کی وجہ سے ان پر مزید احکامات واجب ہوئے ہیں قرابت چاہے رشتہ داری کی وجہ سے ہو یا پڑوس وغیرہ کی وجہ سے۔ وَالْجَارِ الْجُنُبِ لفظ جنب صفت ہے اس میں واحد تثنیہ جمع مؤنث اور مذکر برابر ہیں اور جنب دور کو کہا جاتا ہے خواہ وہ نسبت کی دوری ہو یا پڑوس کی دوری ہو۔ نوف بکالی کا قول ہے کہ جَارِ ذِي الْقُرْبٰى مسلمان اور جَارِ الْجُنُبِ غیر مسلم یہودی نصرانی کو کہا گیا ہے اور احسان عام ہے یعنی ہمدردی کرنا ادب سے زندگی گزارنا، تکلیف میں مدد کرنا، حفاظت کرنا اور دعوت حق دینا۔ ابو نعیم اصفہانی نے حلیۃ الاولیاء، اور مسند بزار 1896 مجمع الزوائد 13536 روایت کی ہے اس روایت کو علامہ ہیثمی اور علامہ عراقی نے ضعیف کہا ہے جو انہوں نے جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ذکر کی ہے کہ پڑوسی تین قسم کے ہوتے ہیں پہلی قسم وہ ہے جن کے تین حقوق ہیں، دوسری قسم وہ ہے جن کے دو حقوق ہیں اور تیسری قسم وہ ہے جن کا ایک حق ہے۔ پہلا پڑوسی مسلمان رشتہ دار ہے، دوسری قسم کا پڑوسی غیر رشتہ دار مگر مسلمان ہے، تیسری قسم کا پڑوسی غیر مسلم کافر ہے جس کے پڑوسی

ہونے کے حقوق ہیں نیز **وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ**: ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد وغیرہ سے منقول ہے کہ اس سے سفر کا ساتھی مراد ہے۔ ابن جریج کا قول ہے کہ درس کا شریک یعنی ہم نشین یا درسگاہ کا ساتھی یا کسب میں شریک یا مسجد کا ساتھی پہلو میں بیٹھنے والا، نماز پڑھنے والا ساتھی، جس سے تعارف ہو جائے۔ علی اور عبداللہ رضی اللہ عنہم اور امام نخعی سے منقول ہے کہ اس سے مراد اپنی بیوی ہے جو بستر میں اس کی ساتھی ہے۔ **وَ ابْنِ السَّبِيْلِ**: مسافر شخص جو وطن سے بھی دور ہو اور خرچ کیلئے محتاج بھی ہو یا مہمان مراد ہے۔ **وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ**: اس سے مراد غلام لونڈی اور عام نوکر وغیرہ ہیں اور حیوانات بھی اس میں شامل ہیں۔ **اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا مُخْتَالًا**: خیلاء سے لیا گیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل ہے کہ مختال وہ شخص ہے جو اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہو اور دوسروں کے حقوق اپنے اوپر تسلیم نہ کریں اور بڑے پن اور تکبر کی وجہ سے کسی کا حق نہیں مانتا اور لوگوں سے نفرت بھی کریں اور ان سے نفرت بھی کرتا ہے۔ حدیث میں اس کا ایک مصداق اس طرح ہے: **مَنْ جَرَّ ثَوْبَهٗ خُيَلَاءَ لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ اِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ**: جس نے اپنا لباس ٹخنوں سے نیچے تکبر کی وجہ سے لٹکایا تو اسے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نظر رحمت سے نہیں دیکھے گا صحیح بخاری کتاب اللباس حدیث 5790۔ **فَخُوْرًا** اپنی صفات خود بیان کرنے والا کہ میں نے ایسا کیا اور ایسا ہوں تا کہ میری بڑائی لوگوں کو ظاہر ہو جائے اور یہ دونوں صفات انسان میں حقوق اللہ اور حقوق العباد سے نفرت پیدا کرتی ہیں تو اس میں اشارہ ہے کہ مذکورہ حقوق کی ادائیگی کے ذریعے سے صفات قبیحہ سے اپنی ذات کو پاک کرو۔ (تنبیہ) یہاں تک پہلا باب ختم ہوا اور سابقہ جملے (**اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا**) سے دوسرا باب شروع ہوتا ہے اور وہ آیت 43 تک ہے۔

(خلاصہ): اس باب میں منافقین کو زواجر تنبیہات دی جاتی ہیں کیونکہ وہ مذکورہ احکام کی مخالفت کرتے ہیں اور وہ بری صفات سے متصف ہیں یہاں پر ان کی دس بری صفات کا ذکر ہے اور ان کی یہ صفات آیت 36، 37 اور 38 میں مذکور ہیں اور بعد میں آیت 41 اور 42 میں ان کو آخرت کا خوف دیا گیا ہے پھر نماز اور طہارت کے متعلق خاص حکم ذکر ہوا جس میں اشارہ ہے کہ دینی امور کیلئے فہم، بیداری اور ظاہری طہارت ضروری ہے اور اس کے ذریعے نفاق سے نجات حاصل ہوتی ہے مذکورہ جملے میں ان کی دو بری صفات مذکور ہیں یعنی **مُخْتَالًا** اور **فَخُوْرًا**۔

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۳۷﴾

"وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی بخل کرنے کا حکم دیتے ہیں اور وہ اس کو چھپاتے ہیں جو انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے

فضل سے دیا ہے اور ہم نے کافروں کیلئے رسوا کرنے والا عذاب تیار کیا ہے'' [37]۔

تفسیر 37: اس آیت میں منافقین کیلئے وعید اور ان کی چار مزید بری صفات کا ذکر ہے اور یہ مختال اور فخور کی تشریح ہے الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ۔ اَلَّذِیْنَ کے اعراب میں مفسرین نے سات (7) احتمالات ذکر کیئے ہیں لیکن حالت نصبی جس میں اَعْنِیْ مقدر ہے یہ سابقہ آیت کے ساتھ متصل ہے یعنی اس قسم کی صفات والے لوگوں سے اللہ تعالیٰ محبت نہیں کرتا ہے تو تم بھی ان سے محبت و احسان مت کرو (قرطبی)۔ بخل سے مراد واجبات شرعیہ سے اعراض کرنا ہے چاہے مال ہو، دین ہو یا علم ہو۔ وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ خود بھی کنجوس اور گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ اور کنجوس بناتے ہیں۔ سورۃ منافقون آیت 37 بھی اس طرح ہے وَیَکْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ فضل سے مال، دین، علم سب مراد ہے۔ یہ صفت بخل سے بھی بدتر ہے یعنی اپنے آپ کو مسکین فقیر بے علم ثابت کرتے ہیں یعنی میرے ذمہ کوئی حق واجبی نہیں ہے حالانکہ مال علم سب ان کے پاس ہے۔ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا یہ دلیل ہے کہ اعتقادی منافق کافر ہے اور اہانت والا عذاب کافروں کے ساتھ خاص ہے۔ اگرچہ مطلق عذاب مومنوں کو بھی ہو سکتا ہے۔ اور اس میں اشارہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی اہانت کی ہے ان کو چھپایا اور بخل کیا تو عذاب بھی مہین ہے عمل کے ساتھ سزا برابر ہے۔

وَالَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ یَّكُنِ الشَّیْطٰنُ لَهٗ قَرِیْنًا فَسَآءَ قَرِیْنًا ۝ ''وہ لوگ جو لوگوں کو دکھانے کیلئے مال خرچ کرتے ہیں اور وہ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں لاتے اور وہ جو ہو شیطان اس کا دوست تو وہ برا دوست ہے'' [38]۔

تفسیر 38: یہ بھی منافقین کے لئے زجر اور توبیخ ہے اور اس آیت میں ان کی دوسری چار بری صفات کو بیان کیا گیا۔

پہلی صفت: احسان سے نکل کر اعراض اور مخالفت کرنا۔ منافقین کی دوسری قسم یہ ہے کہ مال ریاکاری اور شہرت میں خرچ کرتے ہیں یہ بھی بری صفت ہے۔ اول قسم میں تفریط کا معنی ہے اور دوسری قسم میں اسراف ہے جو افراط ہے یعنی ایک ہی شخص کبھی افراط کرتا ہے اور کبھی تفریط یا دو الگ الگ افراد ہیں وَالَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ۔ یہ تیسری صفت ہے۔ رِئَآءَ مفعول لہ یا حال ہے مرائین کے معنی میں ہے اور لام مقدر ہے یعنی لِلنَّاسِ۔ رِیَاء کی تفسیر اور برائی سورۃ بقرۃ میں گزری ہے۔ وَلَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یہ چوتھی صفت ہے منافق کا ایمان نہ ہونے کے برابر ہے جس طرح وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ سورۃ بقرہ آیت 8 میں ہے اسی طرح یہود و نصاریٰ کا ایمان بھی شرعی ایمان

نہیں ہے جیسا کہ سورۃ توبہ آیت 45 میں ذکر ہے اور حرف لام کو تکرار کے ساتھ ان کے ایمان کی نفی کیلئے ذکر کیا ہے۔ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا: امام قرطبی نے فرمایا اس کلام میں عبارت مقدر ہے یعنی قَرِيْنُهُمُ الشَّيْطٰنُ وَمَنْ يَّكُنِ الخ اور شیطان دونوں کیلئے عام ہے انسی ہو یا جنی ہو۔ قرین مقارن دوست اور ساتھی کو کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو شیطان انسی یا جنی کی بات مانتا ہے اور اس کی پیروی کرتا ہے تو یہ اس کا ساتھی ہے اور سورۃ زخرف آیت 36 اور 37 میں بھی اس طرح ذکر ہے۔

وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ۝

"اور ان پر کیا وبال ہوتا اگر وہ اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان لے آتے اور وہ اس میں سے خرچ کرتے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو دیا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کو خوب جاننے والا ہے" [39]۔

تفسیر 39: اس آیت میں زجر و تنبیہ کے ساتھ ساتھ صفات نفاق چھوڑنے کی ترغیب ہے۔ وَمَاذَا اس کے متعلق نحویوں کے دو قول ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ مَا استفہامیہ ہے جو کہ مبتداء ہے اور ذَا ۔ اَلَّذِيْ کے معنی میں ہے جو کہ اس کیلئے خبر ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مَاذَا ایک اسم کا مجموعہ ہے اور اَیُّ شَیْءٍ کے معنی میں ہے۔ عَلَيْهِمْ یہ وبال اور عذاب کے معنی میں ہے یا ایمان لانے کے معنی میں ہے۔ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ یہ ابتداء سے کلام ہے اور لَوْ شرطیہ کا جواب مقدر ہے یعنی حَصَلَتْ لَهُمُ السَّعَادَةُ ان کو ایمان لانے کی سعادت حاصل ہوتی یا پھر لَوْ مصدریہ ہے اور مَاذَا. عَلَيْهِمْ کے ساتھ متعلق ہے اور لَوْ کے جواب کی ضرورت نہیں ہے۔ ابن عطیہؒ نے فرمایا ہے کہ لَوْ کو شرطیہ مانا جائے تو پھر اس کیلئے مَاذَا عَلَيْهِمْ جواب مقدم ہے اور ایمان سے مراد ایمان شرعی ہے۔ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ یہ بخل کی صفت کے مقابل ہے انفاق سے بھی شرعی انفاق مراد ہے جو ریا کاری اور شہرت سے خالی ہو۔ لہٰذا یہ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ کے مقابل ہے۔ فائدہ: سابقہ آیت میں ایمان کی نفی بعد میں ہوئی ہے اور اس میں نفی پہلے ذکر کی گئی ہے وجہ یہ ہے کہ وہاں عدم ایمان ماقبل صفات قبیحہ کیلئے علت تھی اور علت بعد میں ذکر کی جاتی ہے جبکہ یہاں پر صفات سعادت کی طرف دعوت ہے تو اس میں ایمان کی طرف دعوت دینا پہلے ہی سے ضروری تھا۔ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ۔ بِهِمْ سے انکے مخفی اور ظاہری احوال مراد ہیں اور اس میں ترغیب کیساتھ ساتھ زجر اور وعید کی طرف اشارہ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝

"یقیناً اللہ تعالیٰ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا ہے اگر کوئی نیکی ہو تو اسے اللہ تعالیٰ دگنا کر دے گا اور اپنی طرف سے بہت بڑا اجر دے گا" [40]۔

تفسیر 40: اس آیت میں بشارت کے ساتھ اچھی صفات کی طرف ترغیب ہے اور امام قرطبی نے کہا ہے کہ یہاں ظلم کا معنی اجر و ثواب میں کمی کرنا مراد ہے اور امام راغب نے فرمایا کہ ثواب میں کمی کرنا اور عذاب میں اضافہ مراد ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ مِثْقَالَ محل موصوف کیلئے صفت ہے یعنی ظُلْمًا مِثْقَالَ یا یَظْلِمُ یَنْقُصُ کے معنی میں ہے پہلا مفعول مقدر ہے یعنی اَحَدًا اور دوسرا مفعول مِثْقَالَ ہے اور مِثْقَالَ ثِقْل سے لیا گیا ہے اصل میں تو صرف مقدار کو کہا جاتا ہے اور عرف میں چالیس قیراط پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے یہاں پر مقدار کے معنی میں ہے۔ ذَرَّةٍ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مشہور روایت کے مطابق منقول ہے کہ ذَرَّةٍ لال باریک چیونٹی کو کہا جاتا ہے اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی اس طرح منقول ہے۔ (روح المعانی) ابن عباس رضی اللہ عنہما سے دوسری روایت یہ ہے کہ ذرۃ چیونٹی کے سر کو کہا جاتا ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے تیسری روایت بھی منقول ہے کہ انہوں نے اپنے ہاتھ زمین کی مٹی میں داخل کئے اور پھر ان کو خوب جھاڑ دیا پھر فرمایا کہ اب جو ہاتھوں میں بچ گیا ہے یہ ذرہ ہے۔ بعض کے نزدیک سورج کی شعاؤں میں جو ذرات گھومتے نظر آتے ہیں مگر ان کا وجود اتنا باریک ہوتا ہے کہ ہاتھ میں نہیں آتے صرف دکھائی دیتے ہیں اسی کو ذرہ کہا جاتا ہے۔ لیکن پہلا قول مشہور ہے عرب لوگ کسی چیز کی کم مقدار کیلئے یہ لفظ استعمال کرتے ہیں تو ذرے سے مراد وہ کم مقدار ہے جو صرف خیال و گمان میں آتی ہے اور جب تھوڑا ظلم نہیں کرتا تو زیادہ بطریق اولیٰ نہیں کریگا جیسا کہ سورۃ یونس آیت 44 میں فرمایا اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ النَّاسَ شَیْئًا اور لفظ مِثْقَالَ میں اشارہ ہے کہ لوگ اس کو ثقل یعنی اس کو وزنی چیزوں کی مقدار میں استعمال کرتے ہیں۔ صحیح مسلم کتاب صفات المنافقین حدیث 2808 مسند احمد 3۔123 میں حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ مومن سے کچھ بھی الفاظ کم نہیں کرتا اسے دنیا میں بھی نعمتیں دیتا ہے اور آخرت میں اس کو بہتر بدلہ دیگا باقی کافر جو بھی اچھائی کرے اسکی وجہ سے اسے دنیا میں نیکی دی جاتی ہے اور جب وہ میدان محشر میں حاضر ہوگا تو اسے کوئی اجر و ثواب نہیں ملے گا۔ فائدہ: مندرجہ ذیل مقامات میں اللہ تعالیٰ سے ظلم کی نفی میں اور اس کے علم محیط کے ثبوت میں اور غیر اللہ کی ملکیت کی نفی میں یا قیامت کے دن اعمال سے ملاقات میں ذَرَّۃٌ کو ذکر کیا گیا ہے جو بہت ہی عمومیت کی دلیل ہے: سورۃ یونس آیت 61 سورۃ سباء آیت 3 اور 22 سورۃ زلزال آیت 7 اور 8 اور برے اعمال کے حساب کے مقام پر حَبَّةٌ

مِنْ خَرْدَلٍ ذکر ہے جو ذرے سے کچھ زیادہ ہے جیسا کہ سورۃ انبیاء آیت 47 سورۃ لقمان آیت 16 میں ہے اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رحم کی وجہ سے اپنے ایمان والے بندوں کی معمولی برائیوں کا حساب نہیں کرتا۔ واللہ اعلم۔ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً اس جملے میں پہلے جملے کی بنسبت مزید اضافہ ہے یعنی نیکی میں کمی نہیں ہے اور اچھائی میں اضافہ ہے۔ تَكُ کثرت استعمال کی وجہ حالت جزم میں ہو اور ضمیر متصل اس کے ساتھ نہ ہو تو اس مقام میں نون کو امام سیبویہ کے نزدیک حذف کیا جاتا ہے اسلئے کہ یہ نون ساکن مثل حروف لین (واؤ، یاء، الف) کے ہے اور حروف لین حالت جزم میں حذف ہوتے ہیں اس نون کو حذف کرنا اور باقی رکھنا دونوں جائز ہیں۔ مثلاً حذف تو اِنْ تَكُ میں ہے اور ثابت رکھنا اس مثال میں ہے: اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا ۔ حَسَنَةً نصب کی حالت میں تَكُ کیلئے خبر ہے اور اس کا اسم مقدر ہے جو مثال کی طرف راجع ہے اور وہ مؤنث ہے ذَرَّةٍ کی اضافت یا ذِرَّةٍ کی تاویل کی وجہ سے يُّضٰعِفْهَا مضاعف میں زیادت کی کثرت کا تقاضا ہے۔ وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ ۔ لَّدُنْ عِنْدَ کے معنی میں ہے لیکن اس میں بہت تمکین مراد ہے یعنی لَدَيْهِ مَالٌ اس وقت کہا جاتا ہے جب اس کے پاس مال موجود ہو جبکہ عِنْدَ عام ہے مال موجود ہو یا موجود نہ ہو فقط اختیار میں ہو۔ لَّدُنْهُ کے لفظ میں تاکید ہے اور اس میں دلیل ہے کہ ثواب میں یہ زیادتی صرف اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہے ورنہ کوئی سبب نہیں ہے۔ اَجْرًا عَظِيْمًا ۔ اَجْرًا کی تنکیر اور عظمت کے ساتھ اس کی تاکید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس (امر) کی انتہاء بندوں کو معلوم نہیں اور وہ جنت ہے۔

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿41﴾ "پس ان کی کیا حالت ہوگی جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور آپ کو ان کے متعلق بطور گواہ حاضر کریں گے"[41]۔

تفسیر 41: ماقبل میں قیامت کے احوال کی ہولناکی بیان ہوئی یہ آیت ماقبل کے لئے تاکید ہے تو جن لوگوں کے برے اعمال زیادہ ہوں ان کا کیا ہی برا حال ہوگا۔ یہ كَيْفَ محل رفع یا نصب میں ہے جس کیلئے تقدیری عبارت حَالُهُمْ یا يَكُوْنُوْنَ وَ يَصْنَعُوْنَ ہے۔ یہ لفظ آنے والے ہیبت ناک حالات میں استعمال ہوتا ہے اور كَيْفَ میں استفہام توبیخی ہے۔ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی طرف نبی و رسول بھیجے گئے ہوں خواہ وہ مسلمان ہوں یا کافر۔ بِشَهِيْدٍ وہ نبی و رسول مراد ہیں جو ان کی طرف بھیجے گئے ہوں اور اس طرح سورۃ نحل آیت 84، 89 میں بھی ہے۔ شہادت سے ان لوگوں کے اعمال پر گواہی دینا مقصود ہے جو اس وقت زندہ تھے یا نبی کی دعوت اور تبلیغ کی گواہی

دینا مراد ہے جو اس نبی کے توسط سے ان کو ملی ہے۔ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هٰؤُلَاءِ شَهِيدًا۔ هٰؤُلَاءِ اس میں مختلف اقوال ہیں امام آلوسیؒ کا قول ہے گواہی دینے والے انبیاء اور داعیان دین ہیں اور شہادت ان کی سچائی یعنی صدق پر ہوگی۔ یہ شہادت بطور تزکیہ ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ کافر مکذبین یعنی اس امت کے منکرین مراد ہیں مشرکین مکہ وغیرہ۔ یہ قول ابن مسعود رضی اللہ عنہ، ابن جریجؒ، سدیؒ، مقاتلؒ کا ہے۔ (تفسیر ابو حیانؒ) اس پر لفظ عَلٰی بطور قرینہ ہے اور شہادت سے مراد انکی تکذیب ہے یا شہادت بمعنی تبلیغ ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے صحابہ کرام مراد ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے اور عَلٰی لام کے معنٰی میں ہے اور ان کا شہادت دینا ایمان اور اتباع کے ذریعے سے ہے۔ یہ ابو العالیہ، قتادہ اور مجاہد رحمھم اللہ کا قول ہے۔ اس میں صحیح قول دوسرا اور تیسرا ہے جو صحیح حدیث سے ثابت ہے امام بخاری نے کتاب التفسیر حدیث 4582 میں امام مسلم نے کتاب صلوٰۃ المسافرین حدیث 800 میں اور امام ترمذی اور امام نسائی نے بھی نقل کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کے اعمال پر گواہی دینگے جو حیات رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود تھے اور ان کے اعمال پر شہادت دینگے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے قرآن کریم سناؤ؟ میں نے کہا میں آپ کو قرآن کریم سناؤں حالانکہ قرآن کا نزول تو آپ کی ذات اقدس پر ہورہا ہے آپ نے فرمایا میں دوسرے سے قرآن سننا پسند کرتا ہوں۔ لہٰذا میں نے سورۃ نساء کی تلاوت شروع کی جب میں تلاوت کرتے ہوئے اس آیت پر پہنچا تو آپ نے فرمایا بس کرو میں نے دیکھا کہ آپ کی مبارک آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ حدیث میں ہے کہ میں اس وقت کی شہادت دوں گا جب میں ان کے درمیان موجود تھا۔ ابن جریرؒ کی روایت میں یہ الفاظ بھی اس حدیث میں ہیں کہ مَا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ یعنی میں تو اس وقت کی گواہی دونگا جب تک میں ان میں موجود تھا جب تو نے مجھے اٹھالیا اور موت دی تو اس کے بعد کے احوال کا علم آپ کو ہے۔ (صحیح بخاری کتاب فضائل القرآن حدیث 5050 صحیح مسلم کتاب صلاۃ المسافرین حدیث 800)۔ اس کی تائید دیگر انبیاء کی شہادت سے ہوتی ہے۔ جیسا کہ سورۃ مائدہ آیت ۱۰۹ میں ذکر ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کی شہادت جو سورۃ مائدہ آیت ۱۱۷ میں ذکر ہوگئی ہے اس کی تفسیر ان شاء اللہ وہاں ہوگی۔ جن لوگوں نے کہا کہ ساری امت کا اعمال پر گواہی دینا مراد ہے کیونکہ امت کے اعمال آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش ہوتے ہیں یہ قول درست نہیں ہیں۔ تو ان کا قول دلیل کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے سورۃ مائدہ آیت ۱۰۹ کے بھی خلاف ہے۔ سوال: امام قرطبیؒ نے مذکورہ قول اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ جواب: امام ابن

کثیرؒ نے اس کا رد کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ تو ایک اثر ہے اور وہ بھی منقطع ہے اور اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور مرفوع حدیث بھی نہیں ہے لہٰذا اس قسم کی روایت کا اعتبار تفسیر میں نہیں ہوتا میں کہتا ہوں کہ اس زمانہ کے بعض جاہل اس قول سے غلط استدلال کرتے ہیں کہ نبی اکرم حاضر وناظر ہے لیکن ان کا یہ استدلال درست نہیں ہے ابن المسیب سے جو اثر منقول ہے اس میں فقط اعمال پیش کرنے کا ذکر ہے صبح اور شام کا اس میں بھی ذکر نہیں تو اس اثر سے حاضر ناظر ہوتے رہنے کا استدلال کیا جا سکے کہ آپ ہر جگہ حاضر ہوتے ہیں اور صرف اعمال پیش ہونا اور صبح اور شام کو اعمال پیش ہونا ان دونوں باتوں میں آسمان وزمین کا فرق ہے۔

يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ۭ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ۝ ع

"اس دن وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور رسول کی نافرمانی کی وہ چاہیں گے کاش اُن پر زمین برابر کی جائے اور وہ کوئی بات اللہ تعالیٰ سے چھپا نہ سکیں گے" [42]

تفسیر 42: اس آیت میں تخویف تکملہ ہے۔ یومئذٍ یہ یَوَدُّ کی وجہ سے یا سابقہ شَهِيْدًا کی وجہ سے منصوب ہے۔ اِذْ ظرف ہے اور تنوین یہاں محذوف مضاف الیہ کے عوض میں ہے وہ مضاف الیہ جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ الخ تک ہے۔ یَوَدُّ یُوَدُّ تمنّا کے معنی میں ہے۔ جنہوں نے آخری نبی کی رسالت کا انکار کیا اور انہیں جھٹلایا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ یہ جملہ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا پر عطف ہے۔ یعنی ان کافروں نے کفر کے علاوہ دوسری برائیوں، معاصی کا بھی ارتکاب کیا ہے۔ جیسے بدعات، رسومات، فسق، فجور وغیرہ۔ کلام یہاں یہ اشارہ دینا مقصود ہے کہ کفار اصول کے ساتھ ساتھ فروعات کے مخاطب اور مکلف ہیں۔ اس کی مکمل تفصیل تفسیر اللباب کے حاشیہ پر دیکھیں۔ اَلرَّسُوْلَ میں الف لام عہدی ہے یعنی آخری رسول مراد ہے۔ عَصَوْا میں ایک اور توجیہ بھی ہے یعنی یہ اَلَّذِيْنَ مقدر پر عطف ہے لہٰذا یہ دو گروہوں کا ذکر ہے کافر اور نافرمان مسلمان۔ اَلرَّسُوْلُ ایک توجیہ یہ ہے کہ جب الف لام جنسی یا استغراقی مانا جائے تو تمام انبیاء کے نافرمانوں کی طرف اشارہ ہے۔ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضَ۔ لَوْ مصدریہ ہے اور یَوَدُّ کیلئے مفعول ہے۔ اس تسویہ (برابری) کے متعلق بہت سے اقوال ہیں۔ (۱) ان کو دفنایا جائے اور زمین ان پر ہموار ہو۔ (۲) یہ لوگ اپنی خلقت پر جو مٹی ہے پر باقی رہیں انسانی خلقت کے بغیر۔ (۳) یہ کہ جب وہ حیوانوں کو دیکھ لینگے کہ وہ مٹی کے ساتھ مٹی بن گئے تو یہ بھی افسوس کرینگے کہ کاش ہم بھی اس طرح ہو جائیں۔ یہ سورۃ نبا آیت ۴۰ میں وارد ہے۔ (۴) یہ افسوس کرینگے کہ ہمارے اوپر محشر والے پاؤں رکھ کر چلیں

جیسا کہ زمین پر چلتے ہیں۔ وَلَا یَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِیْثًا یہ جملہ یَوَدُّ پر عطف ہے اور اس میں دو توجیہات ہیں:
31/31 پہلی توجیہ یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات چھپانے کی طاقت ہی نہیں رکھتے ہیں کیونکہ انکے تمام جوڑ واعضاء ان کے خلاف گواہی دینگے تو چھپانے کی طاقت نہیں ہے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات نہیں چھپائینگے بلکہ اقرار کرینگے اپنے گناہوں کا اسلئے کہ ان کو معلوم ہوا ہے کہ چھپانے سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ (سوال) سورۃ انعام آیت ۲۳ میں ہے کہ وہ کہینگے کہ ہمیں اپنے رب کی قسم کہ ہم نے شرک نہیں کیا ہے؟ (جواب) ابن جریرؒ وابن کثیرؒ نے سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسطرح سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ قیامت کے مختلف احوال ہیں۔ یعنی جب دیکھ لینگے کہ جنت میں صرف موحدین جارہے ہیں تو وہ کہینگے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِیْنَ اللہ کی قسم ہم نے شرک نہیں کیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ ان کے منہ پر مہر لگادے گا پھر ان کے ہاتھ پاؤں گواہی دیں گے تو یہ بول اٹھیں گے کہ وَلَا یَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِیْثًا۔ امام بخاری نے بھی کتاب التفسیر سورۃ حٰم سجدہ میں اس طرح روایت نقل کی ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَیْدِیْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم نماز کے قریب نہ جاؤ جبکہ تم نشے میں ہو یہاں تک کہ جو تم کہتے ہو اس کا تمہیں علم ہو اور نہ ہی حالت جنابت میں مگر تم جب راستے کو عبور کرنے والے ہو یہاں تک کہ تم غسل کرلو اگر تم بیمار ہو یا سفر پر یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے آئے یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو پھر تم پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی سے تیمم کرو پھر تم اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں پر مسح کرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت معاف کرنے والا بخشنے والا ہے" [43]

6/4 تفسیر 43: اس آیت کا ماقبل کے ساتھ ربط اور مناسبت چند صورتوں پر ہے: (ربط ۱) یہ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ سے متعلق ہے ایمان اور توحید کے بعد اہم عبادت کا ذکر ہے (اللباب)۔ (ربط ۲): سابقہ احکام میں جب اخلاق کی ترغیب دی گئی اور وہ بندوں کے حقوق تھے ماقبل میں مکارم اخلاق کی ترغیب گزری ہے اور وہ تمام حقوق العباد سے متعلق تھا اب یہاں حقوق اللہ میں اخلاص کا بیان ہورہا ہے (روح المعانی)۔ (ربط ۳): منافقین کی بری عادات واخلاق کا ذکر ہے اور ان اعمال پر زجر

تنبیہ ہے اور خوف عذاب الٰہی ذکر کرنے کے بعد ان کے مزید برے اعمال یعنی عبادات کے وقت نشہ آور چیزوں کا استعمال کرنا مذکور ہے جو کہ سبب جہالت ہے۔ نیز طہارت میں سستی سے کام لینا اس سے منع ذکر ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ دینی امور میں جہالت اور غفلت سے اجتناب کرنا چاہئے اور ایمان کے معاملے میں طہارت ظاہری کے ساتھ طہارت باطنی بھی اختیار کرنی چاہئے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ اس طریقے سے نداء تاکید کیلئے ہے تاکہ بعد والے حکم پر عمل ہو جائے اور اشارہ ہے کہ اس حکم پر عمل پیرا ہونا ایمان کا تقاضا ہے۔ وَلَا تَقْرَبُوْا قربت کی نہی یہ کنایہ ہے منع کرنے سے جیسے لَا تَقْرَبُوا الزِّنَا اور لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ میں ہوئی تھی اور یہ کنایہ ہے مبالغہ کا فائدہ دے رہا ہے۔ تنبیہ: شراب (خمر) کے متعلق پہلے سورۃ بقرہ کی آیت ۲۱۹ نازل ہوئی ہے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے اللہ ہمیں شافی یعنی مزید وضاحت سے شراب کا مسئلہ بیان کیجئے۔ تو سورۃ مائدہ آیت ۹۰ نازل ہوئی۔ (ابن کثیرؒ) اور ابو داؤد کتاب الاشربہ میں روایت ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد نبی کریم ﷺ نے منادی کروائی کہ نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جائیں۔ نسائی اور ابو داؤد کی روایت میں آیا ہے کہ علی، عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہما اور ایک اور صحابی نے مل کر شراب نوشی کرنے کے بعد نماز شروع کی عبدالرحمٰن امامت کے فرائض انجام دے رہے تھے تو انہوں نے سورۃ کافرون میں غلطی کر لی اس پر یہ آیت نازل ہوئی ابو داؤد کتاب الاشربہ حدیث 3671 ترمذی کتاب التفسیر حدیث 3026 حاکم 2، 307 امام حاکم و ذہبی اور شیخ البانی نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ ان روایات سے معلوم ہوا کہ مراد نماز کے قریب جانے سے منع ہے جبکہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ نماز کی جگہ جانے سے منع ہے لیکن یہ قول درست نہیں۔ اَنْتُمْ سُکٰرٰی: سکٰرٰی یہ جمع ہے سَکْرَان کی۔ لغت میں اس کے معنی میں ہیں بندش۔ سَکَرَ النَّھْرَ نہر کو بند کیا۔ سورۃ حجر آیت ۱۵ میں سکرت سے یہی معنی مراد ہے کاف کے زبر کے ساتھ "سَکَرٌ" ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو نشہ دلائے۔ جب مطلق سکر کا ذکر ہو تو مراد شراب ہوتی ہے اور جب سَکَرُ مَوْتٍ یا خوف یا نیند یا عشق کی وجہ سے ہو تو وہ مجازی ہے اور مقید ہوتا ہے جیسا کہ سَکْرَۃُ الْمَوْتِ سورۃ ق آیت ۹۔ وَتَرَی النَّاسَ سُکٰرٰی وَمَا ھُمْ بِسُکٰرٰی سورۃ حج آیت ۲۔ سکر کی تعریف میں اختلاف ہے۔ سفیان ثوری کا قول ہے کہ سکر کی حد یہ ہے کہ انسان کی عقل کام چھوڑ دے اور باتیں اس پر خلط ملط ہوں اور خود بھی اپنی باتوں کو بھی نہ سمجھتا ہو۔ امام احمد و امام مالک رحمہم اللہ کا قول یہ ہے کہ عقل حالت صحت سے بدل جائے۔ ابن منذر کا قول ہے کہ صرف پڑھنے میں فرق آجائے اور درست طرح نہ بول سکیں تو یہ نشہ یعنی سکر ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ سکر نشہ

میں کئی درجات ہیں پہلا درجہ اختلاط تلاوت ہے یعنی تلاوت میں غلطیاں کرتے رہنا۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ اپنی باتوں اور حال سے بے خبر ہو۔ یہاں پر یہ دونوں درجات مراد ہیں لہٰذا ایسی حالت میں نماز فاسد ہے۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ زمین آسمان مرد وعورت کا فرق نہیں کرسکتا ہو تو یہ شخص اپنے اقوال وافعال پر مجنون کے حکم میں ہے۔ (فائدہ 1) جمہور مفسرین کے نزدیک یہاں پر سکر سے مراد نشہ ہے جو شراب پینے سے پیدا ہو اور ضحاکؒ کے نزدیک نیند کا نشہ ہے جب بندہ نفل نماز پڑھتا ہو اور نیند کا جھونکا آجائے تو پہلے اپنی نیند پوری کرے پھر نفل نماز پڑھے کیونکہ ایسا نہ ہو کہ استغفار کے بجائے اپنے آپ کو بددعاء دے دے اور یہ صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الوضوء حدیث 213 نسائی کتاب الغسل حدیث 444 مسند احمد 1003)۔ امام عبیدہ سلیمانیؒ کا قول ہے کہ اس سے مراد انسان کا وہ حال ہے کہ بول وبراز یعنی قضاء حاجت یا پیشاب روک رکھا ہو اور اسی پریشانی کی کیفیت میں نماز ادا کررہا ہو حدیث میں ہے کہ تم میں سے کوئی ایسی حالت میں نماز نہ پڑھے جب حاقن ہو۔ حاقن وہ انسان جسکو قضائے حاجت کی ضرورت ہو یہ حدیث مختلف کتب میں صحیح سند سے ثابت ہے صحیح ابوداؤد، صحیح ترمذی، حاکم کتاب الطھارۃ۔ امام قرطبیؒ نے اس قول کو نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ ان اقوال کا معنی صحیح ہے کہ جو چیز بندے کی نماز میں حائل ہو اور خشوع خراب کرتی ہو اس کیلئے نماز مؤخر کرنی چاہیے جیسا کہ شدت بھوک میں تیار کھانا وہ بھی اس میں داخل ہے۔ یہ اسلئے کہ بغیر توجہ اور خشوع نماز ادا نہ کرے۔ میرے علم کے مطابق یہاں پر جمہور کا قول صحیح ہے اور یہ اقوال اپنے حالات ومواقع پر محمول کرنے چاہئیں کہ یہ اقوال سکر (نشہ) کے حکم میں داخل نہیں ہیں۔ (فائدہ ۲) اس میں یہ مقصد نہیں ہے کہ نشہ کیلئے نماز چھوڑ دو بلکہ مطلب یہ ہے کہ نماز کے وقت نشہ چھوڑ دو اور آیت میں مفسوخیت کا معنی نہیں ہے حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔ امام آلوسیؒ نے فرمایا کہ حالت نشہ میں نماز مت پڑھو یہاں تک کہ جو کچھ تم نماز سے قبل کہتے ہو اس کو تم جان لو یعنی تم نماز سے پہلے اپنی باتوں کو معلوم کرلو تا کہ اپنا کلام سمجھ سکو اس سے تمہیں معلوم ہوگا کہ میں کیا پڑھتا ہوں اسلئے یہاں پر تَقُوْلُوْنَ فرمایا تَقْرَءُوْنَ نہیں فرمایا کیونکہ نماز سے قبل صرف باتیں مراد ہیں اور نماز میں قراءت درود، اذکار دعائیں سب مراد ہیں۔ اسلئے سب کیلئے تَقُوْلُوْنَ مناسب ہے۔ اس جملہ میں دلیل ہے کہ نشہ آور وہ شخص ہے جو اپنے کلام کو نہیں سمجھتا ہے۔ اسلئے ایسے شخص کی طلاق واقع ہونے میں اختلاف ہے اس کیلئے تفسیر قرطبی کا مطالعہ کریں۔ وَلَا جُنُبًا یہ لفظ مصدر کے وزن پر ہے اسلئے اس میں واحد، تثنیہ، جمع، مذکر، مؤنث برابر ہے یہ مادہ بُعد یعنی دوری پر دلالت کرتا ہے لہٰذا جُنُب نماز ادا کرنے سے دور ہے اور طہارت سے دور ہے اور یہ لفظ جملہ

حالیہ اَنْتُمْ سُكٰرٰى پر عطف کیا ہے یعنی مفرد کو جملہ پر عطف کیا ہے حرف لَا تکرار کے ساتھ استعمال کرنے میں یہ فائدہ ہے کہ یہ نہی نماز کے قریب جانے سے منع کرنا ہر حالت کو شامل ہو جائے خواہ انفرادی حالت ہو یا اجتماعی حالت ہو اور اس میں بھی دو توجیہات ہیں: گذشتہ توجیہات کی طرح یہاں بھی دو توجیہات ہیں یعنی نماز کے قریب مت جاؤ حالت جنابت میں اور دوسرا معنی یہ ہے کہ نماز کی جگہ کے قریب مت جاؤ۔ یعنی حالت جنابت میں مسجد کے قریب مت جاؤ۔ اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ یہ استثنا مفرغ ہے اور حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے تو معنی یہ ہے کہ نماز کے قریب غسل کئے بغیر مت جاؤ البتہ اگر تم راستے کے مسافر ہو۔ یا مسجد کے قریب مت جاؤ مگر مسجد سے گزرنے والے ہو اور ایک معنی یہ ہے کہ اِلَّا غیر کے معنی میں ہے اور یہ جُنُبًا کیلئے صفت ہے تو معنی یہ ہوا کہ حالت جنابت میں نماز کے قریب مت جاؤ۔ البتہ اگر تم راستے پر گزر رو تو تم معذور ہو۔ اس مقام میں مفسرین کے دو قول ہیں: پہلا قول علی، ابن عباس رضی اللہ عنہم اور سعید بن جبیر اور مجاہد رحمہم اللہ کا ہے یعنی حالت جنابت میں نماز کے قریب مت جاؤ مگر جب سفر ہو اور پانی میسر نہ ہو تو تیمم کرلو۔ اس کو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے بھی پسند کیا ہے۔ دوسرا قول ابن مسعود رضی اللہ عنہ ابن المسیب حسن بصری اور عکرمہ رحمہم اللہ وغیرہ کا ہے کہ حالت جنابت میں مسجد کے قریب مت جاؤ البتہ جب مسجد ہی میں جنابت آجائے تو پھر مجبوراً گزر سکتے ہو یا پھر گھر میں غسل کا انتظام نہیں ہے اور گھر کا راستہ مسجد سے گزرتا ہے تو بھی مسجد سے گزر سکتے ہو۔ اکثر اہل علم اس حال میں مسجد سے باہر جانے یا گزر جانے کی اجازت بغیر تیمم کے دیتے ہیں البتہ مسجد میں ٹھہرنا منع ہے۔ اس قول کی روشنی میں صلاۃ سے مراد نماز کی جگہ ہے جیسا کہ سورۃ حج آیت ۴۰ میں ذکر ہے۔ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا یہ وَلَا جُنُبًا کیلئے (غایہ) یعنی انتہا ہے۔ مراد یہ ہے کہ پانی پر قدرت پالینے کے بعد نماز پڑھے اور مسجد میں جائے کیونکہ شرط غسل کرنا تھا وہ پورا ہو گیا۔ سوال: اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ کا استثنا پہلے کیوں ذکر کیا ہے۔ جواب ۱: اس میں اشارہ ہے کہ حالت جنابت میں نہی کا حکم مطلق نہیں ہے جیسا کہ سکر میں مطلق ہے۔ جواب ۲: یہاں مقصد نماز کی صحت ہے حالت جنابت میں (تیمم کے ذریعے جنابت زائل کرنے کے بعد) تو اس لیے غسل کو استثناء کے بعد ذکر کیا ہے۔ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى۔ عَابِرِیْ سَبِیْلٍ میں جو ابہام و اجمال تھا یہ اس کی تفصیل ہے نیز مستثنیٰ کے لئے اعذار کا ذکر ہے۔ سوال: عَابِرِیْ سَبِیْلٍ میں تو صرف سفر کا عذر تھا اور تفصیل میں مرض کا بھی ذکر ہوا ہے۔ جواب: عَابِرِیْ میں بطور مثال سفر کا ذکر تھا وجہ یہ ہے کہ سفر اکثر درپیش ہوتا ہے اور اس سے مسائل بدل جاتے ہیں اور مرض کی وجہ سے اکثر احکام نہیں بدلتے اور مرض تیز اور ہلکا بھی ہوتا ہے۔ مَرْضٰى مریض کی جمع

ہے اور مریض سے اس مقام پر مراد وہ مریض ہے جس کو پانی کے استعمال سے مرض بڑھنے یا موت کا خطرہ ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ مریض سے مراد یہاں تو زخمی ہے یا وہ آدمی جسے خسرہ کی بیماری لگی ہو اور اسے اندیشہ ہو اگر پانی استعمال کرے گا تو ہاتھ پر مرض بڑھ جائے گا یا موت واقع ہو جائیگی۔ اَوْ عَلٰی سَفَرٍ یہ محل نصب میں ہے مَرْضٰی پر عطف ہے۔ سَفَرٍ نکرہ ہے تاکہ اس میں عموم پیدا ہو جائے کہ سفر تھوڑا ہو یا زیادہ البتہ بعد والی شرط اس کے ساتھ مراد ہے یعنی اس کو وضو یا غسل کے لئے پانی میسر نہ ہو تو تیمم کر کے نماز پڑھ لے۔ نیز اس نماز کا اعادہ نہیں ہے۔ اس کی تائید (صحیح ابوداؤد حدیث 124 احمد 155.5) شیخ البانی فرماتے ہیں کہ اس روایت کو ایک جماعت نے صحیح کہا ہے) اس کی تائید ابوذر رضی اللہ عنہ والی روایت سے ہوتی ہے کہ پاک، صاف مٹی مسلمان کیلئے وضوء ہے اگرچہ اس کو دس سال پانی میسر نہ ہو اور جب اس کو پانی میسر ہو جائے تو پاکی حاصل کرے۔ (احمد 5-155 ابوداؤد حدیث 332 ترمذی حدیث 124 قال الترمذی حسن صحیح)۔ سوال: مرض اور سفر ذکر کرنے سے پتا چلا کہ صحت مند اور مقیم کیلئے تیمم جائز نہیں ہے اگرچہ پانی موجود نہ ہو؟ جواب: اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے کہ مقیم کیلئے صورت مذکورہ میں تیمم جائز ہے البتہ مریض اور مسافر کا ذکر اغلب کی وجہ سے ہوا ہے۔ صحت مند تندرست مقیمین پانی پالیتے ہیں۔ ان ائمہ کے بقول مریض اور مسافر تو صریح نص میں داخل ہیں اور تندرست مقیم اور تندرست آدمی نص کے معنی میں داخل ہے۔ جواب ۲: یہ ہے کہ بعد والے الفاظ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ مقیم، مسافر، مریض و صحت مند سب کو شامل ہے۔ امام قرطبی نے صحیح بخاری و صحیح مسلم کے حوالے سے ابوجہیم رضی اللہ عنہ کی سند سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حالت تندرستی میں پانی نہ ملنے کی وجہ سے تیمم کیا تھا۔ (صحیح بخاری کتاب التیمم حدیث 337 صحیح مسلم حدیث 369)۔ سوال: عَلٰی سَفَرٍ کے بجائے مُسَافِرِيْنَ کیوں نہیں فرمایا؟۔ جواب: یہ لفظ مقصد میں بالکل واضح ہے جبکہ مُسَافِرِيْنَ کے لفظ میں احتمال ہے کہ سفر کا ارادہ کرنے والا ہو۔ سوال: پہلے عَابِرِيْ سَبِيْلٍ: فرمایا جبکہ یہاں پر عَلٰی سَفَرٍ فرمایا کیا فرق ہے؟۔ جواب: عَابِرِيْ سَبِيْلٍ عام ہے مسجد سے گزرنے والا ہو یا سفر پر ہو جیسا کہ گزر گیا ہے۔ نیز تیمم کی اجازت کیلئے سفر سبب ہے صرف گزرنا نہیں ہے جبکہ وہاں استثنا مقصد تھا تو اس کیلئے عابری سبیل کافی تھا ور یہاں پر حکم مقصد ہے اس کیلئے سفر کا لفظ واضح ہے۔ سوال: مرض کو سفر پر کیوں مقدم کیا ہے؟ جواب: وہ مرض جس میں تیمم کی اجازت ہے بنسبت سفر کے عام ہے اسلئے کہ حالت مرض میں تیمم دو وجوہات سے ہو سکتا ہے جبکہ حالت سفر میں

(۱) پانی کے استعمال پر قادر نہ ہو۔ (۲) پانی ہی موجود نہ ہو جبکہ حالت سفر میں صرف دوسری وجہ سے تیمم جائز نہیں ہے
أَوْ جَآءَ أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَآئِطِ یہ بھی کُنتُم کی خبر پر عطف ہے اور یہ دلیل ہے کہ قَدْ کے بغیر فعل ماضی کَانَ کیلئے خبر بن سکتا ہے۔ یہ بصریوں کا قول ہے۔ غَآئِطِ اصل میں نشیبی زمین کو کہا جاتا ہے اور یہ عرب کی عادت پر مبنی ہے کیونکہ وہ قضاء حاجت کیلئے پردے کا اہتمام کرتے ہوئے نشیبی زمین کا انتخاب کرتے تاکہ اس کے ذریعے پردہ ہو تو ہر قسم کے بے وضوء ہونے سے کنایہ ہے جو دلیل شرعی سے حدث یعنی نجاست کا سبب ہو لیکن اکثری عادت کی بناء پر انسان فطری طور پر قضائے حاجت کے بعد جلدی پاکی چاہتا ہے اسلئے اس اعتبار سے لفظ غائط استعمال کیا ہے۔ أَحَدٌ لفظ میں اشارہ ہے کہ اس موقع پر انسان خلوت چاہتا ہے تو اس کیلئے أَحَدٌ کا لفظ مناسب تھا۔ سوال: یہاں پر صیغے جمع کے ذکر نہیں ہیں جیسا کہ کُنتُمْ اور بعد میں لَامَسْتُمُ میں ہے۔ جواب: عقل سلیم اس حالت میں خطاب کو پسند نہیں کرتا۔ أَوْ لَٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ اس میں تین اقوال مشہور ہیں: پہلا قول لَمَسْ سے مراد جماع ہے ابن جریرؒ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ لَمَسْ سے مراد جماع (مباشرت) ہے مگر ادب کی وجہ سے کنایہ استعمال کیا ہے اور اللہ جو چاہتا ہے کر لیتا ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہ قول علی، ابی بن کعب رضی اللہ عنہما مجاہد طاؤس، حسن بصری، عبید بن عمیر، سعید بن جبیر، شعبی، قتادہ اور مقاتل رحمہم اللہ سے نقل کیا ہے۔ صحیح بخاری حدیث 338 امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا بھی یہ قول ہے۔ اس سے دلیل لی گئی ہے کہ جنابت والا انسان جب پانی کے استعمال پر قادر نہ ہو تو وہ تیمم کر لے اور اس کی تائید عمار بن یاسر، ابو ذر ابوداؤد حدیث 332 ترمذی حدیث 124 عمران بن حصین رضی اللہ عنہم کی حدیث ہے ابن جریر رحمہ اللہ نے اس قول کو زیادہ معتبر قرار دیا ہے اور صاحب اللباب نے کہا ہے کہ اس قول کو ترجیح اسلئے دی گئی ہے کہ حدث اصغر کا ذکر أَوْ جَآءَ أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَآئِطِ میں آیا ہے تو اگر یہاں پر بھی (لَمَسْ) سے حدث اصغر مراد ہو تو تکرار پیدا ہوگا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد ہاتھ سے چھونا ہے اور بوسہ بھی اس میں شامل ہے یہ قول ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ابن عمر رضی اللہ عنہما نے نقل کیا ہے اور امام شافعی اور امام مالک کا بھی یہی قول ہے البتہ ان کے اقوال میں بھی اختلاف ہے۔ لہٰذا اس قول کی بناء پر عورت کو ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹ گیا اور یہ (حدث اصغر) یعنی بے وضو ہونے کا دوسرا سبب ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ لَمَسْ عام ہے جماع ہو یا ہاتھ لگانا ہو۔ صاحب اللباب نے اس قول کو ابن مسعود ابن عمر رضی اللہ عنہما اور ابراہیم نخعی کی طرف منسوب کیا ہے اور امام قرطبی نے اس قول کو امام مالک رحمہ اللہ کی طرف منسوب کیا ہے نیز امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس

مسئلے میں اقوال کو بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ فائدہ ۱: اس میں اللہ تعالیٰ نے پہلے رخصت کیلئے دو اسباب ذکر کیے ہیں یعنی مرض اور سفر اور پھر غسل اور وضوء کو بحکم فرض ذکر کیا ہے اور ترتیب اس طرح ہے کہ پہلے مرض اور سفر ذکر کیا اسلئے کہ یہ رخصت کے اسباب میں سب سے غالب اسباب ہیں۔ پھر اس (رخصت) کو عام کیا ہر اس شخص کیلئے جس پر طہارت فرض ہو اور وہ پانی پر قدرت نہ رکھتا ہو چاہے درندوں کا خوف ہو یا کنویں سے پانی نکالنے کیلئے برتن موجود نہ ہو یا دشمن کا خطرہ ہو یا کوئی اور سبب ہو البتہ یہ اسباب مرض اور سفر کی طرح زیادہ واقع نہیں ہوتے پھر طہارت اکبر کا ذکر کیا ہے یعنی جنابت سے پاکی حاصل کرنا اور یہ بہت کم پیش آتا ہے۔ مذکورہ ترتیب میں قلیل سے کثیر کی طرف ترقی ہوئی ہے یعنی کم سے زیادہ کی طرف جیسا کہ بیماری کم واقع ہوتی ہے اور سفر زیادہ اور سفر میں پانی نہ ملنا کثرت سے پیش آتا ہے بہ نسبت مرض کی حالت کے اور سفر کم ہے بمقابل قضاء حاجت کے کیونکہ قضاء حاجت سفر و حضر دونوں میں پیش آتی ہے پھر قضاء حاجت کا حال کم ہے (لَمَسْ) بیوی کو ہاتھ لگانے سے مگر یہ اس معنی پر مراد لیا جائیگا جب (مَسْ) سے چھو لینا ہو۔ (کشاف، بحر المحیط۔)

فائدہ ۲: ان چار چیزوں کے درمیان یعنی مرض، سفر، قضاء حاجت اور لَمَسْ کے درمیان حرف أَوْ مَانِعَةُ الْخُلُوْ کے لئے ہے ورنہ ان چاروں کا جمع ہونا جائز ہے پھر پہلے والے دونوں تیمم کیلئے سبب ہیں اور آخری دونوں اسباب حدث و جنابت کے ہیں تا کہ دونوں کی وجہ سے تیمم لازم ہو جائے لہذا چاروں چیزوں کے درمیان مَابِهِ الْاِشْتِرَاك تیمم کیلئے اسباب ہونا ہے۔ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً امام قرطبی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ پانی نہ ملنا عام ہے یعنی بالکل موجود نہ ہو یا موجود ہو مگر اس تک رسائی نہ ہو یعنی پانی نکالنے کیلئے برتن ڈول وغیرہ نہ ہو یا دشمن اور درندوں کا خطرہ ہو یا پیاس کا خطرہ ہو اور موجود پانی صرف پینے کیلئے کافی ہو سکتا ہو اور مریض کیلئے پانی نہ ملنا یہ ہے کہ وضوء سے شدت مرض کا خوف ہو یا پانی دینے والا کوئی نہیں ہے اور خود مریض لے نہیں سکتا ہو یا اسی طرح جو بندہ قید میں ہو یا پانی بہت مہنگا ہو اور اس کے پاس خریدنے کی استطاعت نہ ہو یا غبن فاحش پر پانی مل رہا ہو قیمتاً بہت مہنگا ہو جو اس کے خریدنے کے بس میں نہ ہو یا اس میں فاحش غبن ہو۔ فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا۔ تیمم لغت میں (قصد) ارادے کو کہا جاتا ہے۔ اس میں شرعاً نیت فرض ہے۔ صَعِيْدًا اس میں ابوحیان نے بہت اقوال نقل کئے ہیں۔ ابوعبیدہؒ فراء اور بغویؒ کا قول ہے کہ صرف مٹی کو کہا جاتا ہے۔ لیثؒ کا قول ہے کہ وہ زمین جو ہموار ہو اور پودوں سے خالی ہو۔ خلیلؒ نے فرمایا کہ بلند زمین کو کہتے ہیں۔ زجاجؒ کا قول ہے کہ زمین کی پشت کو کہتے ہیں خواہ اس پر مٹی ہو یا نہ ہو۔ طیب پاک ہونے کے معنی میں ہے جیسا کہ سورۃ نمل آیت 32 میں کہا گیا ہے جیسا کہ

سورۃ اعراف آیت 58 میں ہے۔ پہلا قول امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کا ہے اور دوسرا قول امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے۔ فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ اس میں تیمم کی شرعی تفصیل ہے۔ خواہ فقط وضو کیلئے ہو یا جنابت یعنی غسل کی جگہ ہو مگر طریقہ دونوں کا ایک ہے اَيْدِيْكُمْ صرف دونوں ہاتھ یعنی ہتھیلیاں مراد ہیں یا ایک قول کے مطابق کہنی تک ہاتھ مراد ہے مگر صرف ہتھیلی والا قول دلیل کے اعتبار سے راجح ہے اگر چہ دوسری جانب بھی روایت ہے۔ (نوٹ فِرَاعَیْنِ کہنیوں پر مسح کے الفاظ والی حدیث کو شیخ البانی نے منکر کہا ہے تخریج مشکوۃ رقم 529) ۔ (مترجم) (فائدہ) سورۃ مائدہ آیت ٦ میں مِنْهُ کے ساتھ مقید ہے تو یہ مطلق اس مقید پر حمل ہے اور مِنْ برائے تبعیض ہے۔ زمخشری نے یہ قول عرب کے تمام اہل لغت سے نقل کیا ہے اور ان لوگوں کا رد کیا ہے جنہوں نے کہا کہ یہ مِنْ ابتداء غایہ کے لئے ہے۔ تو یہ بات ثابت ہوئی تیمم میں مٹی کا کچھ حصہ لازمی طور پر ہاتھوں کے ساتھ ملنا چاہئے اور پھر جیسا صحیح بخاری کتاب التیمم حدیث 338 صحیح مسلم حدیث 112 کی روایت میں ہے کہ اُسے جھاڑ دے۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا اللہ تعالیٰ کی صفات میں كَانَ برائے استمرار یعنی ہمیشگی ہے۔ عَفُوًّا خطاء سے متعلق ہے اور غَفُوْرًا قصداً گناہ سے متعلق ہے۔ نیز عَفُوًّا آسانی کی طرف اشارہ ہے جو کہ تیمم ہے اور غَفُوْرًا میں طہارت سے صغیرہ گناہوں کی مغفرت کی طرف اشارہ ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ﴿٤٤﴾

"کیا آپ ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھتے جن کو کتاب میں سے کچھ حصہ دیا گیا ہے خرید تے ہیں وہ گمراہی اور وہ چاہتے ہیں کہ تم سیدھے راستے سے پھر جاؤ" [44]

تفسیر 44: اس آیت سے آیت 57 تک اس حصے کا تیسرا باب ہے اس باب میں اہل کتاب کیلئے تنبیہات اور وعیدات ہیں کیونکہ سابقہ ذکر شدہ نظام میں یہ لوگ بھی خلل پیدا کرنے والے ہیں اور منافقین کی طرح ظالم ہیں اور اس باب میں ان کی سترہ (17) صفات قبیحہ یعنی بُری صفات کا ذکر ہے۔ دو آیت 44 میں ایک آیت 45 میں سات آیت 46 میں ایک 49 میں ایک صفت آیت 50 میں دو صفات آیت 51 میں اور آیات 52، 53 اور 54 میں ایک ایک صفت کا ذکر ہے اور ان صفات قبیحہ کے درمیان آیت 47 میں ان کیلئے قرآن مجید کی طرف دعوت ہے اور آیت 48 میں ان کے شرک کا رد ہے اور آیت ٥٦ میں تخویف اخروی ہے اور آیت 57 میں بشارت کا ذکر ہے اور آیت ٥٧ میں خوشخبری ہے۔ (ربط ۱) منافقین اور یہود کی صفتوں میں بہت مماثلت یعنی برابری تھی اسلئے منافقین کے بعد اب یہودیوں کی صفتوں کا ذکر ہے اور

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ الخ درمیان میں جملہ معترضہ ہے۔ (ربط ۲) سابقہ آیت میں ایمان والوں کیلئے تنبیہ ذکر ہوئی کہ نشہ سے اجتناب کریں غفلت سے بچیں اور جنابت میں سستی وکاہلی سے گریز کریں جو یہودیوں کی صفات ہیں۔تو اب ان کی تفصیلی بداخلاقی کا ذکر ہو رہا ہے تاکہ ایمان والے ان کی برائیوں سے اپنے آپ کو بچائیں أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا آنکھوں سے دیکھنا مراد ہے اور اس کو الیٰ کے ساتھ متعدی بنایا ہے جس کا معنی ہے أَلَمْ تَنْظُرْ إِلَيْهِمْ ۔یا علمی رؤیت مراد ہے اور إِلَى کے ساتھ متعدی ہے کیونکہ یہ انتہاء کے معنی کو متضمن ہے۔یعنی أَلَمْ يَنْتَهِ عِلْمُكَ إِلَيْهِمْ ان دونوں حالتوں میں مومنوں کیلئے تعجب اور یہود کی بری صفات کی شہرت مقصود ہے۔نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ اس سے تورات کا کچھ علم مراد ہے اور اس قسم کے لوگوں کو ناقص یا نیم مولوی کہا جاتا ہے جس کا تذکرہ سورۃ آل عمران میں گزرا ہے۔ يَشْتَرُونَ الضَّلَالَةَ ۔إِشْتِرَا :استحباب پسند کرنے کے معنی میں ہے یا استبدال کا معنی لینے کی صورت میں عوض یعنی مبدل منہ مقدر ہے اور وہ بِالْهُدَىٰ ہے۔ضلالت عام ہے كَفَرَ بِاللهِ وَبِالرَّسُولِ نیز آخری نبی کی صفات میں تحریف کرنا جو تورات میں وارد ہوئی تھیں اور بے دینی کی اور اقسام یہ سب ضلال میں داخل ہیں یہ ضلال خود گمراہ ہونے کا ذکر ہے بعد میں اضلال دوسروں کو گمراہ کرنے کا ذکر ہے۔وَيُرِيدُونَ أَن تَضِلُّوا السَّبِيلَ۔ یہ اپنی بے دینی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اوروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔آخری نبی کی تکذیب اور مخالفت اسی وجہ سے کرتے ہیں تاکہ ایمان والوں کو مرتد کریں جیسا کہ آیت ۸۹ میں مذکور ہے۔اس نبی اور قرآن سے لوگوں کو روکتے ہیں۔چونکہ لوگوں کی گمراہی ان کے اختیار میں نہیں ہے اسلئے اللہ تعالیٰ نے صرف انکے ارادے کا ذکر کیا ہے یا ارادہ کوشش کے معنی میں ہے اور اس میں دلیل ہے کہ گناہ کا ارادہ یا دوسرے کو گمراہ کرنے کا ارادہ بھی گناہ کبیرہ ہے۔اس آیت میں ان کی دو بری صفات کا ذکر ہوا ہے۔

وَاللهُ أَعْلَمُ بِأَعْدَائِكُمْ ۚ وَكَفَىٰ بِاللهِ وَلِيًّا ۙ وَكَفَىٰ بِاللهِ نَصِيرًا ۝

"اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے تمہارے دشمنوں کو اور اللہ تعالیٰ کافی ہے بچانے والا اور کافی ہے مددگار" [45]۔

تفسیر 45: اس آیت میں گزرے ہوئے مضمون کی تاکید ہے اور انکی دوستی اور پیروی سے ڈرانا مقصود ہے۔ وَاللهُ أَعْلَمُ ۔أَعْلَمُ اسم تفضیل کا صیغہ ہے یعنی أَعْلَمُ مِنْكُمْ تم ان کی دشمنی کا کم علم رکھتے ہو جبکہ اللہ تعالیٰ کامل علم رکھتا ہے۔یا أَعْلَمُ عَلِيمٌ کے معنی میں ہے۔بِأَعْدَائِكُمْ یعنی ان کی دشمنی اور مومنوں کے خلاف ان کی تدبیروں کا وہ خوب علم رکھتا ہے یا ان کے انجام کو خوب جانتا ہے۔وَكَفَىٰ بِاللهِ وَلِيًّا ۔اس میں ایمان والوں کو تسلی دی گئی ہے کہ ان کی دشمنی کی پروا

مت کرو اور ان سے مت ڈرو۔ اسلئے کہ تمہارے لئے اللہ تعالیٰ ایسا حفاظت کرنے والا ہے کہ کسی اور کی حفاظت کی ضرورت نہیں اور یہ کفایت کا معنیٰ ہے۔ وَكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا یعنی اگر وہ تم سے جنگ پر اتر آتے ہیں تو تمہارا مددگار اللہ تعالیٰ ہے اور وہ اس طرح کا مددگار ہے کہ پھر کسی اور کی مدد کی ضرورت نہیں۔ لفظ کَفٰی تاکید کیلئے مکرر ذکر کیا ہے اور یہ توحید کی تعبیر ہے۔ عام اہل علم نے لکھا ہے کہ حرف (با) زیادہ لایا ہے جو کفایت کی تاکید کیلئے ہے زجاج نے کہا ہے کہ معنیٰ یہ ہے کہ كَفٰى اِلاكْتِفَاءُ بِاللّٰهِ ان دونوں اقوال میں (با) زائدہ نہیں ہے لیکن دونوں اقوال کا ابوحیان نے رد کیا ہے لفظ وَلِيًّا اور نَصِيْرًا منصوب ہے کیونکہ یہ حال یا تمیز ہے۔

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِى الدِّيْنِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ ”کچھ ان لوگوں میں سے جو یہودی ہیں باتوں کو ان کی جگہوں سے بدل ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور نافرمانی کی اور تو سن اور تجھے نہ سنایا جائے اور اپنی زبانیں موڑتے ہوئے رَاعِنَا کہتے ہیں اور دین میں طعن کرتے ہیں اور اگر یقیناً وہ کہتے کہ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی اور سنئے اور ہمیں دیکھئے تو یقیناً ان کے حق میں یہ بہت ہی بہتر اور درست ہوتا لیکن بسبب ان کے کفر کے اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی لہٰذا وہ ایمان نہیں لاتے مگر بہت ہی تھوڑے“ [46]

تفسیر 46: اس آیت میں یہودیوں کی مزید برائیوں کا ذکر ہے پہلے ناقص مولیوں کا ذکر تھا اور اب انکے بڑے مولویوں کا ذکر ہے ان کی عداوت اور بری صفتوں کا ذکر ہے اور ان کے یہ صفات ان کی عداوت کی دلیل ہے۔ اَلَّذِيْنَ هَادُوْا اس میں اعراب کے اعتبار سے مختلف اقوال ہیں: امام سیبویہ کا قول ہے کہ یہ خبر مقدم ہے اور قَوْمٌ يُحَرِّفُوْنَ مبتدا مقدر ہے اور فراء اور بغوی کے نزدیک لفظ مَنْ موصول مقدر ہے یعنی مَنْ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ: اور بعضوں کے نزدیک مبتدا مقدر ہے۔ یعنی هُمْ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا اور يُحَرِّفُوْنَ: حال ہے مزید اور اقوال بھی ہیں۔ هَادُوْا یہ تَهَوَّدُوْا کے معنیٰ میں ہے یعنی انہوں نے یہودیت اختیار کر لی۔ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ۔ كَلِمَ اسم جنس ہے اور كَلِمَةٌ اس کا واحد ہے اور یہاں کلمات سے تورات مراد ہے اس میں کبھی کبھی لفظی تحریف کرتے تھے یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات میں تحریف کرتے اکثر تحریفات معنوی کرتے تھے یعنی فاسد تاویلات وغیرہ یا کلمات سے مراد یہ ہے کہ قرآن وحدیث سن کر اس میں

تاویلات وتحریفات معنوی کرنے لگتے تھے۔ عَنۡ مَّوَاضِعِهٖ ضمیر کَلِمَ کی طرف راجع ہے کیونکہ وہ جنس ہے۔ واحدی کا قول ہے کہ ہر وہ جمع جس کے کلمات مفرد یعنی واحد سے کم ہوں تو اس کی تذکیر یعنی مذکر لانا درست ہے۔ اس طرح سورۃ مائدہ آیت 13 میں ہے اور سورۃ مائدہ آیت 41 میں مِنۡۢ بَعۡدِ مَوَاضِعِهٖ مذکور ہے۔ ابو حیان نے فرق بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ مِنۡۢ بَعۡدِ مَوَاضِعِهٖ وہاں استعمال ہوتا ہے۔ جہاں استقرار اپنی جگہوں پر معلوم ہوا اور عَنۡ مَّوَاضِعِهٖ وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں استقرار اپنی جگہوں پر معلوم ہو یا نہ ہو۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ جہاں ان کی سخت سرکشی و طغیان کا ذکر ہو تو وہاں عَنۡ مَّوَاضِعِهٖ ذکر کیا ہے جیسا کہ اس مقام پر ہے اور سورۃ مائدہ آیت 13 میں عَنۡ مَّوَاضِعِهٖ فرمایا ہے یعنی انہوں نے ابتداء سے ہی بغیر فکر اور سوچ کے تحریف کی طرف سبقت کی یعنی ان کلمات میں فکر ہی نہیں کی اور جہاں انکی زیادہ سرکشی کا ذکر نہیں ہے جیسا کہ سورۃ مائدہ آیت 41 میں ہے کیونکہ وہاں مذکور ہے کہ انہوں نے بعض فیصلوں میں نبی اکرم ﷺ کی طرف رجوع کیا ہے تو وہاں مِنۡۢ بَعۡدِ مَوَاضِعِهٖ ذکر ہے یعنی جلدی انہوں نے تحریف کی طرف سبقت نہیں کی ہے بلکہ وجوہات ان کو پیش آئیں تو انہوں نے تحریف کرلی۔ امام رازی نے کچھ اس طرح ذکر کیا ہے کہ جہاں ان کی تحریف معنوی اور باطل تاویلات ذکر ہیں وہاں لفظ عَنۡ استعمال ہوا ہے کیونکہ وہاں پر تجاوز کا معنی ہے اور جہاں تحریف لفظی اور معنوی دونوں مذکور ہیں وہاں مِنۡۢ بَعۡدِ مَوَاضِعِهٖ فرمایا ہے۔ لہٰذا سورۃ مائدہ آیت 41 میں واقعہ رجم ذکر ہے اس میں انہوں نے تحریف لفظی اور معنوی دونوں کی تھیں اور یہاں پر تحریف لفظی مراد نہیں ہے بلکہ تاویلات فاسدہ اور شبہات باطلہ ڈالنا مراد ہے نیز حق معنی سے لفظ کو باطل معنی کی طرف پھیر دینا مراد ہے جیسا کہ اس زمانہ میں مبتدعین اپنے مسلک کے دفاع کیلئے آیتوں اور احادیث کے ساتھ یہی سلوک برتتے ہیں۔ وَيَقُوۡلُوۡنَ سَمِعۡنَا وَعَصَيۡنَا اس میں دو توجیہات ہیں: (۱) پہلی توجیہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے عناد اور ضد کی وجہ سے اس طرح کہتے تھے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ امام راغب نے مفردات میں لکھا ہے کہ یہ عام ہے ہر اس بات کیلئے کہ جو ان کی خواہش کے خلاف ہوتی خواہ قرآن تورات یا سنت میں ہو تو وہ زبان حال سے ہو یا قال سے ہو سَمِعۡنَا کہہ دیتے اور کہتے کہ ہم اس کو جانتے اور سمجھتے ہیں لیکن ہم نہیں مانتے۔ وَاسۡمَعۡ غَيۡرَ مُسۡمَعٍ یہ سَمِعۡنَا پر عطف ہے اور يَقُوۡلُوۡنَ کے تحت ہے یہ قول زبانی ہے جو انہوں نے نبی کریم ﷺ کے سامنے کہا تھا۔ غَيۡرَ یہ ترکیب میں حال واقع ہے جو ان کی طرف سے بد دعاء ہے یعنی ہماری بات سنو تمہیں نہ سنایا جائے مراد ہے کہ تم بہرے ہو جاؤ۔ محمود کرمانی نے غرائب التفسیر میں لکھا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ تم

کان لگاؤ ہماری بات کو تم مرجاؤ تا کہ تم نہ سنو کیونکہ مردے نہیں سنتے ہیں۔ غَيْرَ مُسْمَعٍ یہ لفظ وہ لوگ آہستہ بولتے۔ یا لفظ غَيْرَ اِسْمَعْ کیلئے مفعول ہے۔ اس اعتبار سے کلام میں خیر اور شر دونوں کا احتمال ہے۔ احتمال خیر اس طرح ہے کہ اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ مَكْرُوْهًا وَلَا اَذًى: یعنی آپ کو تکلیف دہ کلام نہ سنایا جائے اور احتمال شر یہ ہے کہ غَيْرَ مُسْمَعٍ خَيْرًا: تمہیں خیر کا کلام نہ سنایا جائے۔ یہ زمخشری نے نقل کیا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے ابن عطیہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ مجاہد رحمہ اللہ اور حسن بصری رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ مُسْمَعٍ غَيْرَ مَقْبُوْلٍ اور غَيْرَ مُجَابٍ کے معنی میں ہے۔ وَرَاعِنَا اس کی تفسیر سورۃ بقرہ آیت 104 میں گزر گئی ہے۔ لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ یہ يَقُوْلُوْنَ کیلئے مفعول لہ یا حال کے معنی میں مصدر ہے۔ یعنی یہ لوگ عَصَيْنَا غَيْرَ مُسْمَعٍ اور رَاعِنَا میں لَيُّ اللِّسَانِ زبان کو ٹیڑھا کرتے ہیں خفیہ کہنے یا بظاہر خیر کا اظہار کرنے کے ذریعے سے یا رَاعِنَا میں الف کا مَدّ بڑھا دیتے اور یا کو حذف کرتے کہ اصل میں یہ رَاعِيْنَا ہے یا پھر یہ مقدر فعل کیلئے مفعول مطلق ہے یعنی يَلْئُوْنَ لَيًّا اور اس سے زبان کا پھیر دینا مراد ہے جو آل عمران میں آیت 78 میں گزرا ہے۔ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ اس میں بھی وہی تین احتمالات ہیں۔ ماقبل سے مفعول لہ یا حال ہے یعنی وہ کلمات بطور طعن کہتے ہیں یا مقدر فعل کیلئے مفعول مطلق ہے۔ یعنی يُطْعِنُوْنَ طَعْنًا دین اسلام میں طعن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا اس کلام میں خیر کی طرف دعوت ہے اگر یہ لوگ عَصَيْنَا کی جگہ اَطَعْنَا فرماتے اور غَيْرَ مُسْمَعٍ نہ کہتے ہو اور رَاعِنَا کی جگہ اُنْظُرْنَا کہتے تو لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ۔ خَيْرًا اسم تفضیل ہے اور جس پر فضیلت دی گئی ہے وہ مقدر ہے یعنی مِنْ قَوْلِهِمْ یہ ان کے گمان کے اعتبار سے ہے کیونکہ ان کے کلام میں کوئی خیر نہیں ہے۔ یا خَيْرٌ جَيِّدٌ اور فَاضِلٌ کے معنی میں ہے۔ تَفَضُّلِي معنی اس میں نہیں ہے۔ وَاَقْوَمُ عَدْلٌ اور انتہائی برابر کے معنی میں ہے یہاں پر بھی ان کے گمان کے مطابق تَفَضُّلِي معنی مراد ہے یا بغیر تَفَضُّلِي معنی کے صرف فعلی معنی مراد ہے آلوسی نے فرمایا کہ خَيْرًا سے مراد ان کو خوب نفع دینے والا اور اَقْوَمُ اَعْدَلُ فِي نَفْسِهٖ مراد ہے۔ انسان عموماً اور یہود خصوصاً نفع کا بہت لالچ کرتے ہیں تو خیر اسلئے پہلے ذکر ہے وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ یہاں پر سبب کی جگہ مسبب کو ذکر کیا ہے یعنی لَمْ يَقُوْلُوْا اَلْاَنْفَعُ وَ اَلْاَقْوَمُ انہوں نے فائدے والی اور عدل وانصاف کی بات نہیں کی ہے۔ یہ سبب لعنت ہے اور بِكُفْرِهِمْ سے سابقہ عنادی کفر مراد ہے اور یہ قول خیر اور اقوم چھوڑ دینے کا سبب ہے اور یہ چھوڑنا سبب لعنت ہے۔ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا اس استثنا میں تین اقوال ہیں: (1) پہلا یہ ہے کہ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ کے مفعول سے

استثنا ہوا ہے۔ (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ فَلَا یُؤْمِنُوْنَ کی ضمیر سے استثنا ہوا ہے دوسرے قول پر اعتراض ہے کہ یہ کلام غیر موجب ہے یعنی نفی ہے اور ہدایت کے لحاظ سے مستثنیٰ پر رفع ہونا چاہیے۔ (۳) تیسرا قول یہ ہے کہ مقدر موصوف کیلئے صفت ہے یعنی اِلاَّ اِیْمَاناً قَلِیْلاً اور قُلْتُ سے یا عدم ایمان مراد ہے یعنی ان کا ایمان بالکل نہیں ہے یا مراد بعض ایمانیات پر لغوی ایمان ہے لیکن اس سے شرعی ایمان حاصل نہیں ہوتا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝ "اے لوگو جو کتاب دیئے گئے ہو تم اس پر ایمان لاؤ جو ہم نے نازل کیا ہے وہ اس کی تصدیق کرنے والا ہے جو تمہارے پاس ہے اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو مٹا دیں پھر انہیں ہم ان کی پیٹھوں پر لوٹا دیں یا ہم ان پر لعنت کریں جس طرح ہم نے لعنت کی ہفتہ کے دن والوں پر اور اللہ تعالیٰ کا حکم کیا ہوا یعنی اٹل ہے" [47]

تفسیر 47: اس آیت میں ان کی سات (۷) بری صفات کا ذکر ہے۔ (ربط ۱) وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا میں صحیح اقوال کی طرف دعوت تھی تو اب کامل ایمان کی طرف اور قرآن کی طرف دعوت ہے اور دعوت کے ساتھ ساتھ دعوت کو موثر بنانے کیلئے وعید تخویف کے ذریعے تنبیہ کی ہے۔ اس کے بعد شرک سے تخویف ہے اسی طرح اپنے نفوس کا تذکیہ کرنے پر بھی وعید ہے۔ (ربط ۲) ان کی برائیاں اور کفریات بیان کرنے کے بعد اب ان سے نجات کیلئے کامل ایمان اور قرآن مجید کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ: اُوْتُوا الْكِتٰبَ لفظ دونوں گروہوں کو شامل ہے خواہ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ ہو یا کامل کتاب ہو یا اس سے ان کے بڑے بڑے مولوی مراد ہیں کیونکہ چھوٹے مولوی اور عوام تو ان کی تقلید کرتے ہیں لہٰذا ان کی اصلاح سب سے پہلے ضروری ہے۔ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ: تنزیل اور تصدیق ترغیب پر ابھارنے کیلئے ہے تصدیق کا معنیٰ سورۃ بقرہ میں گزر گیا ہے۔ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا: طمس لغت میں مٹانے کو کہتے ہیں لازمی اور متعدی دونوں طریقوں سے آتا ہے جیسا کہ سورۃ یٰسین آیت 66 میں ہے لَطَمَسْنَا عَلٰۤى اَعْیُنِهِمْ اور وَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ آیت 8 سورۃ مرسلات۔ یہاں پر چہروں کو بگاڑنے کے معنی میں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے بھویں کو لون کی طرح اور آنکھوں کو مثل صاد کے اور ناک کو مثل الف کے اور منہ کو مثل میم کے بنایا ہے ان کو مثل اونٹ یا گھوڑے کے پاؤں کے تلیے کی طرح بنا دے گا۔ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے جس کو آلوسی نے نقل کیا ہے۔

امام فرااور بغوی کا قول ہے کہ چہروں پر اللہ تعالیٰ بندروں کی طرح بال لے آئے گا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ وجوہ سے بڑے بڑے سردار اور اثر ورسوخ والے لوگ مراد ہیں۔ فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَا یہ طمس کی تفصیل ہے یعنی ان کے چہروں کو شکل گدھے کے بنادیں گے جس میں آنکھیں نہیں ہوتیں۔ وہاں تو صرف بال ہوتے ہیں۔ ابن عطیہ رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ ان کیلئے گدی میں آنکھیں بنادیں گے اور جب وجوہ سے سردار مراد لیے جائیں تو اس جملے کا مطلب یہ ہوگا کہ دنیا سے ان کی عزت و مرتبہ کو ختم کر دینگے اور ذلت میں ان کو مبتلاء کر دینگے۔ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ: هُمْ کی ضمیر اَلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کی طرف راجع ہے۔ یا وجوہ کی طرف راجع ہے اور لعن سے ان کے وجود کو مسخ کرنا مقصود ہے بندروں اور خنزیروں کی طرح۔ یہ ضحاک رحمہ اللہ اور حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے اور اس پر دلیل تشبیہ ہے یعنی كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ اس سے یہ بھی مراد ہوسکتا ہے کہ ان کو بد اخلاقی میں مبتلاء کر دینگے جیسے بندروں خنزیروں کی عادات ہیں اور لفظ اَوْ خلو امنع کیلئے ہے اور دونوں عذابوں کا جمع کرنا بھی جائز ہے۔ (سوال) یہاں پر اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے دو عذاب ذکر کیے ہیں کہ ایمان نہ لانے کی صورت میں اس کیلئے تیار رہو۔ انہوں نے ایمان بھی نہیں لایا اور عذاب بھی ان کو نہیں دیا گیا؟ (جواب ۱) یہاں پر شرط سب کے ایمان نہ لانے کی تھی جبکہ بعض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایمان لائے بعض بعد میں ایمان لائے باقی رہا ان لوگوں کا معاملہ جنہوں نے ایمان نہیں لایا ان کیلئے آخرت میں عذاب ہے۔ (جواب ۲) ان عذابوں کا وقت اللہ تعالیٰ نے مقرر نہیں کیا ہے لہٰذا بعد میں اللہ تعالیٰ ایسے عذاب لائے گا یعنی طمس چہروں کو بگاڑ دینا جیسا کہ بعض احادیث میں ثابت ہے۔ (مشکوٰۃ ابوداؤد حدیث 4613 ترمذی حدیث 2152 باب الایمان بالقدر میں اس قسم کے عذاب کا تذکرہ منکرین تقدیر کے متعلق ہے اور یہودی پہلے منکرین تقدیر تھا۔ (جواب ۳) یہاں دو عذاب ذکر ہیں طمس اور لعن، لعنت کے دو معنی گزر رہے ہیں لہٰذا ایک معنی کے اعتبار سے لعن ان پر آیا ہے جیسا کہ سورۃ بقرہ آیت 159 اور 174 میں ہے اور مذکورہ آیتیں بھی یہودیوں کے متعلق نازل ہوئیں۔

(جواب ۴) یہ عذاب ان پر قیامت کے دن ہوگا جیسا کہ سورۃ یٰسین آیت 66 اور 67 میں ہے۔

(جواب ۵) چہروں کا بگڑنا اور رَدٌّ عَلَى الْاَدْبَارِ کا پہلے کنائی معنی ذکر ہوا کہ ان کے سرداروں اور وڈیروں کو ذلیل کیا جائیگا لہٰذا یہ عذاب بنو نضیر و بنو قریظہ والوں پر مسلط کیا گیا تھا اس کا ذکر ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ کی تفسیر میں گزر رہا ہے۔ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا اَمْرُ اللّٰهِ سے مراد وعیدات یا وہ عذاب ہے جو ان پر مسلط کر دیا تھا۔ مفعول جاری ہونے

اور نافذ ہونے کے معنی میں ہے۔ یعنی زمانہ حال یا مستقبل میں واقع ہونے والا ہے اور سابقہ انبیاء علیہم السلام کے ادوار میں مخالفین جو کہ بنی اسرائیل کے بڑے گزرے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ کے فیصلے لاگو ہو گئے تھے۔ کَانَ برائے استمرار ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدِ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا ۝ ''یقیناً اللہ تعالیٰ نہیں بخشے گا یہ کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور بخش دے گا اس کے علاوہ جس کیلئے چاہے گا اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرائے تو تحقیق اس نے بہت بڑا گناہ گھڑ لیا'' [48]

تفسیر 48: (ربط ۱) جب اہل کتاب کو سابقہ آیت میں عذاب کی وعید سنا دی اور ساتھ ساتھ ایمان کی طرف ترغیب دی تو اب اس کی علت ذکر ہو رہی ہے کہ ایمان (توحید) کی وجہ سے مغفرت حاصل ہوتی ہے اور اس کے ذریعے سے دنیاوی عذاب سے بھی نجات حاصل ہوتی ہے اس بناء پر اِنَّ اللّٰہَ ماقبل کیلئے علت ہے۔ (ربط ۲) یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ ہم جنت کے حقدار ہیں کیونکہ ہم نجات یافتہ ہیں اور مومن ہیں حالانکہ وہ شرک میں مبتلاء تھے تو اس آیت میں از سرِ نو یہ بتلا دیا کہ جس ایمان کے ساتھ شرک خلط ہو جائے وہ ایمان کوئی فائدہ نہیں دے سکتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ سوال: شرک ذکر کیا ہے مگر کفر ذکر نہیں کیا؟۔ جواب: روح المعانی میں امام آلوسی نے لکھا ہے کہ شرک کے دو معنی ہیں۔ (۱) پہلا یہ عقیدہ رکھنا کہ اُن کے ساتھ ربوبیت یا الوہیت میں کوئی شریک ہے۔ (۲) دوسرا معنی یہ ہے کہ شرک کفر کے معنی میں ہے یہاں پر بھی یہ معنی مراد ہے۔ ابوحیان نے زجاج سے نقل کیا ہے کہ ہر کافر مشرک ہے کیونکہ کسی شخص کا نبی سے انکار اس وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ آیات جو یہ نبی لیکر آیا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہیں۔ لہٰذا جو چیز اللہ کی جانب سے تھی اس کی نسبت اس نے غیر اللہ کی طرف کی لہٰذا اس وجہ سے یہ مشرک ہوا اور میں (راقم الحروف) کہتا ہوں کہ ہر ایک کافر نے اپنی خواہش سے الٰہ بنایا ہے یعنی اپنی خواہش کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرایا ہے لہٰذا ہر کافر مشرک ہے تو اس جملہ کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کافر مشرک کو معاف نہیں کریگا۔ (تنبیہ) مفسر ابوحیان، آلوسی، اور رازی رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ اس آیت میں دلیل ہے کہ یہودی مشرک ہیں اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ آیت یہودیوں کے متعلق نازل ہوئی ہے تو اگر ان میں شرک نہ ہوتا تو یہ نہ فرمایا جاتا اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ دوسری وجہ یہ ہے کہ دوسرے جملے میں یہ بات گزر گئی کہ شرک کے علاوہ دیگر گناہ اللہ تعالیٰ چاہے تو معاف کر دیگا تو اگر یہودیت میں شرک نہ ہو تو پھر اللہ انہیں معاف کر دیگا جبکہ یہ تو مسلمانوں کے اجماع کے خلاف ہے اور آلوسی کا قول ہے کہ شریعت مطہرہ نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ یہود اہل کتاب مشرک ہیں اور علماء

مفسرین نے ان آیتوں کے متعلق لکھا ہے جن میں مشرکین کو اہل کتاب پر عطف کیا گیا ہے (اور عطف تو مغایرت چاہتا ہے) کہ ان میں لغوی اعتبار سے مغایرت ہے اور شرعی معنی کے اعتبار سے (اتحاد) ہے۔ (سوال) سورۃ زمر آیت ۵۳ میں ہے اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف کرتا ہے اس میں شرک بھی شامل ہے (اِنَّ اللّٰهَ يَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِيۡعًا ؕ)۔ (جواب ۱) وہاں مغفرت باعتبار توبہ ہے لفظ اَنِيۡبُوۡۤا اِلٰى اللّٰهِ اس کیلئے دلیل ہے اور یہاں توبہ کے بغیر ہے۔ (جواب ۲) وہاں خطاب ایمان والوں سے ہوا ہے اور اَلذُّنُوۡبَ سے شرک اور کفر کے ماسوا گناہ مراد ہیں۔ وَيَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ يَّشَآءُ۔ لَدُوۡنَ أَدۡوَنُ کے معنی میں ہے یعنی نیچے کم سے مراد یہ ہے کہ وہ گناہ جو شرک اور کفر سے کم ہو تو اللہ تعالیٰ توبہ کے بغیر بھی اپنی چاہت سے صغائر و کبائر کو معاف کرتا ہے۔ اور توبہ کے ذریعہ سے بھی معاف کرتا ہے۔ راجح قول کے مطابق صغیرہ و کبیرہ دونوں کیلئے توبہ بھی کر لے تب بھی اللہ تعالیٰ کی رضا معافی کے لئے شرط ہے۔ فائدہ: ابن عطیہ نے ذکر کیا ہے کہ ایمان اور کفر کی نسبت سے تمام انسان چار اقسام پر ہیں: (۱) پہلا جو کفر پر مرجائے وہ ہمیشہ کیلئے جہنم میں رہے گا اس مسئلہ پر علماء کا اتفاق ہے اور اس پر اجماع ہے اور اس پر بہت ساری آیتیں بطور دلیل موجود ہیں۔ (۲) دوسری قسم: وہ مومن مسلم جو محسن انسان ہو گناہوں سے اجتناب کرتا رہا یہاں تک کہ اسی پاکدامنی میں فوت ہو جائے تو یہ ابتداء سے بغیر سزا جنت میں داخل ہوگا۔ قرآن مجید میں جو آیتیں کامل مومنین کیلئے بطور بشارت آئی ہیں وہ اس پر دلیل ہے۔ (۳) تیسری قسم: مومن گناہ گار شخص ہو لیکن مرنے سے قبل گناہوں سے توبہ کر کے فوت ہو جائے تو اہل سنت کے نزدیک یہ شخص بھی دوسری قسم والوں کے ساتھ مرتبہ میں شریک ہے۔ البتہ متکلمین کے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے چاہے تو اللہ تعالیٰ اسے معاف کرے یا سزا دے۔ توبہ کی آیتیں اس پر دلیل ہے یعنی سورۃ طٰہٰ آیت 72، سورۃ فرقان آیت 70 اور 71۔ چوتھی قسم: مومن گناہ گار ہے بغیر توبہ فوت ہو جائے تو اسکے متعلق اختلاف ہے۔ اہل سنت والجماعت کے نزدیک اس جملہ (يَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ يَّشَآءُ) کا مصداق یہی صورت ہے اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو اُسے معاف کر دیگا ورنہ اسے سزا دیکر پھر جنت میں داخل کر دیگا۔ مُرۡجِئَه فرقہ کا نظریہ یہ ہے کہ یہ شخص جنتی ہے ایمان کیلئے گناہ مضر نہیں ہے لہٰذا یہ جنت میں جائے گا باقی رہیں وعید کی آیتیں تو وہ کافروں کے ساتھ خاص ہیں اور وعدے والی آیتیں تمام مومنین کیلئے ہیں۔ معتزلہ کا عقیدہ و نظریہ ہے کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب توبہ کئے بغیر مرجائے وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا خوارج کہتے ہیں کہ ایسا شخص کافر ہے اور ہمیشہ جہنم میں ہوگا۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اہل سنت والجماعت کے دلائل درست اور حق ہیں اور دیگر فرقوں کے

دلائل باطل ہیں اس وجہ سے امام قرطبیؒ نے فرمایا ہے کہ اس آیت کا پہلا جملہ محکم ہے اور دوسرا جملہ متشابہ ہے اس وجہ سے کہ
12/12 اس میں اختلاف ہے۔ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدِ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا یہ پہلے جملہ کیلئے علت ہے اور شرک کی بہت
قباحت بیان کرنے پر مشتمل ہے۔ اِفْتَرٰی فَرِیٌّ سے لیا گیا ہے۔ لغت میں قطع کرنے، الگ اور کاٹنے کو کہا جاتا ہے اور
یہ عموماً فساد کو مستلزم ہوتا ہے اس لئے فساد کو بھی کہا جاتا ہے اور قرآن کریم میں جھوٹ شرک، ظلم کے معنی میں مستعمل ہے۔ امام
راغب نے فرمایا کہ افتراء ایسے عمل وقول کا ارتکاب ہے کہ جسکا کرنا درست نہ ہو جس کا اطلاق جھوٹ اور گناہ کے ارتکاب پر
ہوتا ہے تو اشارہ ہے کہ شرک گناہ کبیرہ کے ساتھ ساتھ جھوٹ بھی ہے نیز چونکہ مشرک اپنے شرک کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف
کرتا ہے اور اس پر ثواب کی امید رکھتا ہے تو اسلئے کہا گیا کہ یہ تو افتراء اور جھوٹ ہے۔ سوال: اس سورۃ کی آیت ۱۱۶ میں
بھی یہی بات ذکر ہے مگر وہاں تو اس طرح ہے وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا؛ ان دونوں میں فرق کیا
ہے؟ جواب: یہ آیت یہود کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور وہ عوام الناس کے بارے میں ہے اور اہل کتاب اپنے گناہ
کیلئے خود سے دلیلیں بناتے ہیں لہٰذا اس کو اِفْتَرٰی کہا گیا اور عوام اپنے گناہ کیلئے دلائل نہیں بناتے اسلئے اس کو دور کی گمراہی
ضلال بعید کہا گیا ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُزَكُّونَ أَنْفُسَهُمْ ۚ بَلِ اللَّهُ يُزَكِّي مَنْ يَشَاءُ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ۝ "کیا آپ نے ان
لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جو اپنے آپ کو پاک کہتے ہیں۔ بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے پاک کرتا ہے اور وہ دھاگہ کے برابر
بھی ظلم نہیں کئے جائیں گے"[49]

تفسیر49: أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُزَكُّونَ أَنْفُسَهُمْ اس آیت میں ان کی ایک اور قباحت کا ذکر ہے کہ کفر شرک کا
ارتکاب کرنے کے باوجود اپنے آپ کو جنتی اور اللہ تعالیٰ کے دوست اور بیٹے قرار دیتے ہیں۔ (تزکیہ) اپنے آپ کو بری
عادات وصفات سے مبرا قرار دینا ہے حالانکہ یہ منع ہے کسی دوسرے کا تزکیہ بھی منع ہے البتہ خاص الفاظ کے ساتھ حدیث
۲۴ میں ہے صحیح بخاری کتاب الشهادات حدیث 2662 عادات واعمال سے بچاتا ہے اور اس تزکیے کی طرف دعوت وترغیب
مندرجہ ذیل آیتوں میں دی گئی ہے۔ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّىٰ، قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا. الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ خُذْ مِنْ
أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا؛ اور اپنا تزکیہ اپنی زبان سے کرنا منع ہے جیسا کہ سورۃ نجم آیت ۳۲
میں ہے فَلَا تُزَكُّوا أَنْفُسَكُمْ؛ کسی بھی بری اور قبیح عادت یا عمل سے اپنے آپ کو بچانا یا عمل ترک کرنا اپنی پاکیزگی بیان

کرکے۔ تزکیہ بالعمل یعنی عملا بری عادات سے رکنا اور اپنے آپ کو پاک رکھنے کی طرف ترغیب ہے۔ حدیث میں مذکور ہے کہ جب کسی کی صفائی اور تعریف کرنی ہو تو ان لفظوں کے ساتھ کرو: لَا اُزَکِّیْ عَلَی اللّٰہِ اَحَدًا یا اَنَا اَحْسِبُہٗ وَاللّٰہُ حَسِیْبُہٗ۔ صحیح بخاری کتاب الادب حدیث 6162 صحیح مسلم فی آخر کتاب۔ حدیث 65،3000 ابوداؤد حدیث 4805 ابن ماجہ حدیث 3744 فی الادب، بلا شرط کسی کا تزکیہ کرنا اس طرح ہے جیسا کسی کے دل یعنی باطن کا حال بیان کرنا ہے جس پر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عالم نہیں۔ بَلِ اللّٰہُ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ: بَلْ برائے (اضراب) دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کے تزکیہ کا اختیار ہے اور اللہ تعالیٰ کا تزکیہ بندے کو گناہوں سے بچانا صالح اعمال کی توفیق دینا ہے اور یَشَآءُ کا مفعول مقدر ہے یعنی تَزْکِیَتَہٗ اور وہ لوگ مراد ہیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو تزکیہ کے مستحق ہیں اور ان کی طرف سورۃ نجم آیت 32 میں اشارہ ہے هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی۔ وَلَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا: ضمیر کے مرجع میں دو قول ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ اَلَّذِیْنَ یُزَکُّوْنَ کی طرف راجع ہے تو یہ وعید ہے کہ ان کو اپنے تزکیہ پر جو عذاب ملے گا اس میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ کی طرف راجع ہے اور یہ خوشخبری ہے یعنی جن لوگوں کی اللہ تعالیٰ نے دنیا میں تعریف اور ستائش کی ہے انکے اجر وثواب اور درجات میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ فَتِیْلًا۔ فَتَلَ سے لیا گیا ہے رسی اور ڈور بٹنے (پرونے) کو کہا جاتا ہے۔ عرف عرب اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، عطاءؒ اور مجاہدؒ کے قول میں اس دھاگہ کو کہا جاتا ہے جو کھجور کی گٹھلی پر ہے۔ دوسرا قول ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابو مالک اور سدی سے نقل ہے کہ وہ میل جو انگلیوں کے ملنے سے ہتھیلی کے بیچ میں پیدا ہوتا ہے امام حسن بصری رحمہ اللہ کے بقول کھجور کی گٹھلی کی بیچ میں جو فاصلہ ہوتا ہے اسے کہا جاتا ہے۔ ان تمام اقوال میں یہ انتہائی کم چیز سے تعبیر ہے۔ فائدہ ۱: مفسر دمشقیؒ نے اللباب میں لکھا ہے کہ عرب لوگ کم مقدار کیلئے چار الفاظ استعمال کرتے ہیں: (۱) فَتِیْلَ (دھاگہ) (۲) قِطْمِیْر۔ کھجور کی گٹھلی پر جو باریک سفید چھلکا ہوتا ہے۔ اسے قطمیر کہا جاتا ہے۔ (۳) نَقِیْرَ کھجور کی گٹھلی کی پشت (شگاف) میں جو گودا ہوتا ہے اسی کو نقیر کہا جاتا ہے۔ (۴) چوتھی چیز ثفروق ہے جو کھجور کے دانے کے سر پر چھوٹا چھلکا سا ہوتا ہے۔ تین مثالیں تو قرآن مجید میں ہیں اور آخری مثال قرآن میں نہیں ہے۔ فائدہ ۲: لفظ فتیل اس آیت میں اور آگے آیت 77 میں ذکر ہے۔ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا اور سورۃ بنی اسرائیل آیت 71 میں ذکر ہے۔ یَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ فَمَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ یَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا اور بعد والی دونوں آیتیں ثواب اور بشارت کے مقام میں مذکور ہیں تو معلوم ہوا کہ اس آیت میں بھی

خوشخبری کی توجیہہ (بہتر) راجح ہے۔ کھجور اور اس کی گٹھلی کے درمیان دھاگہ مضبوطی اور (ربط) ملانے کے لئے ہوتا ہے یہ بھی بشارت کے ساتھ مناسب معلوم ہو رہا ہے۔ لہٰذا یہ خوشخبری کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے اور لفظ نقیر اسی سورۃ کی آیت ۵۳ میں بخل کے بیان میں آیا ہے۔ أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَإِذًا لَّا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا۔ یہ (بخل) کنجوسی کے بارے میں آیا ہے۔ یعنی جب انسان اپنے مال سے کچھ نکال کر دیتا ہے تو گویا مال کو کھرچتا ہے تو اس کے لئے نقیر کا لفظ مناسب ہے اور اسی طرح اس سورت میں وَمَن يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا: 124 میں بھی جنتیوں کے بارے میں ذکر ہے تو اس لفظ میں اشارہ ہے کہ ان کی نعمتوں میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جائے گی اس کے ساتھ بھی لفظ نقیر مناسب ہے اور لفظ قطمیر سورۃ فاطر آیت نمبر 31 میں ذکر ہے۔ وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِهِ مَا يَمْلِكُونَ مِن قِطْمِيرٍ ملکیت کی نفی مِن دُونِ اللهِ سے کی گئی ہے جیسا کہ قطمیر میں کھجور کی گٹھلی لپٹی ہوئی ہوتی ہے تو مشرکین بھی اپنے معبودوں کو غلافوں میں لپیٹ کر رکھتے ہیں جیسا کہ قبروں پر چادریں اور بتوں پر کپڑے ڈالتے اور لپیٹتے ہیں مگر یہ معبودان غلافوں کے مالک نہیں ہیں اسی طرح یہ بھی کسی کے بس میں نہیں ہے کہ کھجور کی گٹھلی سے یہ چھلکا ثابت سلامت ہٹادے بشمول ان کے معبودوں کے، سب عاجز ہیں۔ اس میں شرک فی التصرف کے رد میں ایک تمثیل کی طرف اشارہ ہے۔ وَاللهُ أَعْلَمُ بِحِكَمِ كِتَابِهِ

انْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللهِ الْكَذِبَ ۖ وَكَفَىٰ بِهِ إِثْمًا مُّبِينًا ﴿۵۰﴾ "دیکھ لیں کس طرح وہ اللہ تعالی پر جھوٹ باندھتے ہیں اور ان کا یہ جھوٹ باندھنا صریح گناہ کیلئے کافی ہے"۔ [50]

تفسیر 50: اس آیت میں یہودیوں کے ایک اور قبیح عمل کا بیان ہے۔ یعنی جب وہ اپنا تزکیہ کرتے ہیں تو اس میں وہ اللہ تعالی پر جھوٹ باندھتے ہیں یعنی اپنے جھوٹ کے تزکیہ کا حوالہ اللہ تعالی پر ڈالتے ہیں تو اس آیت میں انکے تزکیہ کی تکذیب ہے۔ انْظُرْ كَيْفَ اس میں نبی کریم ﷺ اور ہر مؤمن کو خطاب ہے کس طرح وہ لوگ اللہ تعالی پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ يَفْتَرُونَ عَلَى اللهِ الْكَذِبَ: افتراء کا معنی گزر رہا ہے یعنی وہ اپنے تزکیہ میں کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالی کے بیٹے ہیں (نَعُوذُ بِاللهِ) اور اس کے محبوب ہیں تو ان کا یہ کہنا جھوٹ ہے کیونکہ یہ خلاف واقع اور خلاف حقیقت ہے اور اللہ تعالی پر افتراء ہے اور اللہ تعالی کی طرف نسبت بھی جھوٹ ہے۔ یہ اصل میں دو گناہ ہیں۔ الْكَذِبَ: جاحظ کا قول ہے کہ کذب حقیقت کے خلاف اطلاع دینا ہے۔ شرط یہ ہے کہنے والے کو علم ہو کہ میں خلاف حقیقت اور خلاف واقعہ بات کر رہا ہو لیکن اس آیت

میں جاحظ کے اس قول کا رد ہے کیونکہ یہود اپنے لئے جو تزکیہ کرتے تھے وہ اپنا حق تصور کرتے تھے یعنی ان کو علم تھا تو معلوم ہوا کہ بیان کرنے والا حقیقت سے واقف ہو یا نہ ہو مگر اس کو کذب کہا جائیگا۔ وَ كَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا: ضمیر کذب کی طرف راجع ہے یعنی جھوٹ بھی گناہ ہے تو جب اس کے ساتھ افتراء مل جائے تو گناہ کے اوپر دوسرا گناہ ہے یا ضمیر بہ افتراء کی طرف راجع ہے اِثْمًا مُّبِيْنًا سارے عقل والوں کے نزدیک کسی پر جھوٹ بولنا یا افتراء تہمت لگانا بہت ہی ناپسندیدہ عمل ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴿۵۱﴾ "کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا کچھ حصہ ملا ہے جو بتوں اور باطل معبودوں کا عقیدہ رکھتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ لوگ مومنوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں".[51]

تفسیر 51: اس آیت میں ان کے دوسری قسم کی برائیاں بیان ہورہی ہیں۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ: یہاں اس آیت کے مصداق میں دو باتیں ہیں۔ (1) یا تو اس سے وہ لوگ مراد ہیں جن کی برائی آیت 44 میں گزر چکی ہے (2) یا اس سے وہ دوسرے لوگ مراد ہیں۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ مدینہ کے یہودیوں میں سے کچھ افراد مکہ مکرمہ آئے اور مشرکین مکہ کے ساتھ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کا معاہدہ کیا پھر مشرکین مکہ نے مدینہ سے آئے ہوئے ان اہل کتاب سے پوچھا ہم حجاج کرام کو اونٹوں کا گوشت کھلاتے ہے اسی طرح ہم بیت اللہ کی تعمیر کرتے ہیں، ہم طواف بھی کرتے ہیں اسی طرح ہم اپنے آباؤ اجداد کے دین پر ہیں ہمارے مقابلے میں محمد ﷺ نے اپنے آباؤ اجداد کا دین چھوڑا ہے، ہمارے ساتھ رشتہ داری ختم کی، پرانے دین کو چھوڑ کر نیا دین لائے ہیں اب آپ بتائیں کہ ہم دونوں فریقوں میں سے کون ہدایت پر ہیں؟ تو ان اہل کتاب نے فتویٰ دیا کہ تم ہی ہدایت یافتہ ہو۔ دوسرے قول میں ہے کہ ان لوگوں نے ان بتوں کو سجدہ بھی کیا تو یہ آیت ان کے متعلق نازل ہوئی۔ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ: اہل لغت نے کہا ہے کہ جبت اصل میں جبس تھا تو سین کو (تا) سے بدل دیا، جبس گندی اور بے فائدہ، بے کار چیز کو کہتے ہیں۔ اور طاغوت کا لغوی معنی بقرہ میں گزر چکا ہے اس کے مصداق میں مختلف اقوال ہیں۔ (۱) عکرمہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ مشرکین مکہ کے دو بتوں کے نام ہیں۔ (۲) ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ جبت حی بن اخطب اور طاغوت کعب بن اشرف ہے اور یہ دونوں یہودیوں کے بڑے علماء میں سے تھے۔ (۳) مجاہد رحمہ اللہ اور شعبی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ جبت منتر

سحر ہے اور طاغوت شیطان ہے۔ (۴) عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ جبت سے ساحر اور طاغوت سے شیطان مراد ہے۔ (۵) سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا قول ہے کہ جبت ساحر اور طاغوت کاہن ہے اس کے برعکس بھی کہا گیا ہے۔ (۶) قتادہ کا قول ہے کہ جبت سے مراد شیطان اور طاغوت سے کاہن مراد ہے۔ (۷) امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے کہ جبت سے بت مراد ہے اور طاغوت ہر معبود باطل پر بولا جاتا ہے امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس قول کو پسند کیا ہے۔ (۸) امام آلوسی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جبت سے مراد بت ہیں اور طاغوت سے مراد بتوں کے مجاورین ہیں جو ان کیلئے فرضی کہانیاں بنا کر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ (۹) قرطبی اور ابو حیان رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ابوداؤد کی حدیث میں ہے کہ طرق، طیرہ، عیافت یہ جبت ہے طرق پرندوں کو فال کیلئے اڑانا اور عیافت خط بنانے کے ذریعے سے غیب معلوم کرنا یعنی جو غیب کا دعویٰ کرنے والے ہیں وہ جبت ہیں۔ (۱۰) بعض مفسرین کا قول ہے کہ جبت سے بت اور طاغوت سے شیاطین مراد ہیں کبھی شیاطین ان بتوں سے ہم کلام ہوتے تھے تو یہ مشرکین تصور کرتے تھے کہ یہ ہمارے ساتھ ہم کلام ہیں ان تمام اقوال میں کچھ نہ کچھ آپس میں قربت ہے البتہ جبت اور طاغوت پر عقیدہ رکھنا ان کو سجدے کرنا یہ سب اعمال شرک اور کفر ہے تو معلوم ہوا کہ یہود اس وقت عوام الناس کی طرح کھلا شرک کرتے تھے" وَ يَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا - لِلَّذِيْنَ اس میں لام برائے تبلیغ ہے لام برائے خطاب نہیں ہے یا لام کا معنی فِي شَانِهِمْ ہے۔ هٰۤؤُلَآءِ مشرکین مکہ کی طرف اشارہ ہے اور اَهْدٰى میں افضلیت کا معنی نہیں ہے کیونکہ وہ مومنوں کو کسی بھی کھاتے میں شمار نہیں کرتے تھے اور ان کا یہ قول انتہائی حسد اور عناد پر بنا تھا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ۝

"یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی اور جس پر اللہ تعالیٰ لعنت کر دے اس کیلئے مددگار کبھی بھی نہیں پاؤ گے" [52]

تفسیر 52: یہ وعید ہے اور مذکورہ دلیل وقبیح صفات کا نتیجہ ہے۔ اسلئے کہ اُولٰٓئِكَ: مذکورہ صفتوں کیلئے دلیل ہے اور ان پر عام لعنت سورۃ احزاب آیت ٦١ میں کی گئی ہے" اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا: اس جملہ میں بہت تاکید ہے مَن برائے عموم ہے اور لَن تَجِدَ اور نَصِيْرًا نکرہ ذکر ہوا ہے یہ سب تاکیدات ہیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ انہوں نے ان باتوں سے مکہ والوں کو راضی کرنا چاہا لیکن وہ ان کی کوئی امداد نہیں کر سکتے۔

أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَإِذًا لَّا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا ۝ "انکے لئے بادشاہت کا کچھ حصہ ہے (اگر انکا حصہ ہوتا تو) وہ لوگوں کو کھجور کی گٹھلی کے داغ کے برابر کچھ نہیں دیتے۔[53]۔

تفسیر 53: اس آیت میں ان کی ایک اور قبیح صفت کا ذکر ہے۔ اس (أَمْ) کو منقطع کہا جاتا ہے۔ اس میں ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف انتقال کیا گیا ہے اور استفہام برائے انکار ہے یہ عام نحویوں کا قول ہے اور ابن قتیبہ کا قول ہے کہ أم استفہام کی ابتداء کیلئے آتا ہے اس جملہ میں یہود کے کلام کا رد ہے کیونکہ وہ اپنے پیروکاروں کو تسلی دیتے کہ عنقریب ہمارے ہاتھ میں حکومت آئیگی تو یہاں مُلْكٌ سے مراد دنیا کی سلطنت ہے یا ان کا دعویٰ جو مذکور ہے کہ خزانوں کے اختیارات ہمیں دیئے گئے ہیں جیسا کہ سورۃ اسراء آیت 100 میں ہے یا مُلْكٌ سے مراد نبوت ہے تو معلوم ہوا کہ ان کیلئے کسی قسم کا مُلک نہیں۔ أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَإِذًا لَّا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا: اس میں ان کی صفت بخل مذکور ہے اور اَلنَّاسَ سے عام لوگ مراد ہیں۔ یا صحابہ کرام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار مراد ہیں۔ آج بھی جو لوگ یہودیوں کے طور طریقے اپنائے ہیں ان میں بخل موجود ہوں گے۔ فائدہ: صاحب اللباب نے لکھا ہے کہ ان کا بخل ان کی کنجوسی ان کے لئے بادشاہت کے حصول سے مانع ہے کیونکہ کنجوسی اور بادشاہت دونوں جمع نہیں ہو سکتے وجہ اس کی یہ ہے کہ کسی کو بھی تابع اور اپنے ماتحتی میں لانے کے لئے اس پر احسان کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جیسے کہا گیا ہے بِالْبِرِّ يُسْتَعْبَدُ الْحُرُّ احسان کے ذریعے آزاد آدمی کو غلام بنایا جا سکتا ہے۔ معلوم ہوا جس کے ساتھ مالی طور سے احسان نہیں کیا جائے وہ تابعدار نہیں بنتا۔ پھر بادشاہت تین قسم کا ہے: (۱) ملک ظاہری یہ بادشاہت عام لوگوں کیلئے ہے جو ملک بن بیٹھتے ہیں اور (۲) ملک باطنی یہ علماء کیلئے ہے۔ (۳) ظاہری باطنی دونوں ملک یہ انبیاء کیلئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام میں سخاوت اور شفقت بطریقہ کمال ہوتی ہے اور خاتم النبیین میں تو یہ صفات بدرجہ اتم موجود تھیں۔

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۖ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا ۝

"کیا وہ لوگوں سے اس پر جو ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے دیا حسد کرتے ہیں پس بلاشبہ ہم نے آل ابراہیم علیہ السلام کو کتاب اور حکمت دی اور ہم نے ان کو بہت بڑی بادشاہت سے نوازا" [54]

تفسیر 54: اس میں بری عادات میں سے ایک اور بری عادت کا بیان ہو رہا ہے۔ لفظ أَمْ کے ذریعے سے ایک صفت قبیح سے دوسری صفت أَقْبَحْ کی طرف انتقال ہوا جو حسد ہے۔ حسد اس اعتبار سے بدترین صفت ہے کہ اس میں کسی سے نعمت

الٰہی کے زوال کی تمنا ہوتی ہے۔ اس کی تفسیر سورۃ بقرہ میں گزری ہے اور سورۃ فلق میں بھی ذکر ہوگی ان شاء اللہ۔ أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ۔ امام قرطبیؒ نے اس مقام پر حسد کی بعض برائیاں بیان کی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں حسد مذموم ہے اور حسد کرنے والا مغموم یعنی غمگین ہے۔ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ خشک لکڑیوں کو جلاتی ہے۔ (ابوداؤد حدیث 4903 مشکوٰۃ 4969 شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو ضعیف کہا ہے)۔ حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے کہ میں نے حاسد سے زیادہ کسی ظالم کو مظلوم کے ساتھ برابر نہیں پایا۔ ہمیشہ افسوس کرنا حاسد کا وطیرہ ہے۔ غموں کی بارش ہمیشہ ہمیشہ رونا دھونا اور آنسوں بہانا حسد کا نتیجہ ہے۔ حسد پہلا صادر ہونے والا گناہ ہے جو آسمانوں پر ابلیس سے صادر ہوا ہے یعنی ابلیس نے آدم علیہ السلام سے حسد کیا تھا اور زمین پر بھی پہلا گناہ ہے جو قابیل سے صادر ہوا یعنی اپنے بھائی کا قتل حسد کی وجہ سے کیا تھا۔ اَلنَّاسِ سے مراد نبی ﷺ ہے اور فضل سے مراد ختم نبوت ہے اور دیگر فضائل وکمالات جو قرآن وسنت میں مذکور ہیں اور اس میں زیادہ (شادیاں) نکاح کرنا بھی داخل ہے۔ یا النَّاسِ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ صحابہ کرام اور بعد میں آنے والے پیروکار شامل ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بہت سارے فضائل کا خطاب أُمَّةً وَسَطًا اور خَيْرَ أُمَّةٍ کے الفاظ سے دیا ہے یا پھر اَلنَّاسِ سے مراد عرب لوگ ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو بھیجا اور بنی اسرائیل سے بنی اسماعیل میں نبوت منتقل کی۔ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ: (فا) فصیحہ تعلیلیہ ہے جو شرط مقدر پر دلالت کرتی ہے یعنی اگر یہ لوگ حسد کرتے ہیں تو بہت بڑی غلطی پر ہیں۔ آل ابراہیم میں موسیٰ وعیسیٰ علیہم السلام اور دیگر بنی اسرائیل کے انبیاء کرام شامل ہیں یعنی جن کو تورات انجیل زبور اور صحائف دیے گئے تھے۔ حکمت سے مراد نبوت یا کتاب اللہ کے اسرار (رازوں) کا علم یعنی احادیث ہیں۔ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا: داؤد علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام کی بادشاہت کی طرف اشارہ ہے۔ اور ان کیلئے کثیر بیویاں بھی اللہ تعالیٰ نے حلال کی تھیں یعنی آخری نبی ﷺ اور صحابہ کرام کے ساتھ جن چیزوں پر تم حسد کرتے ہو وہ نعمتیں تو تمہارے بزرگوں اور نبیوں کو بھی دی گئی تھیں یعنی اگر یہ نعمتیں تمہارے نزدیک حسد کا ذریعہ ہے تو پھر اپنے نبیوں اور بزرگوں سے بھی حسد کرو۔

فَمِنْهُم مَّنْ آمَنَ بِهِ وَمِنْهُم مَّن صَدَّ عَنْهُ ۚ وَكَفَىٰ بِجَهَنَّمَ سَعِيرًا ﴿٥٥﴾ "چنانچہ ان میں سے بعض وہ ہیں جو اس پر ایمان لے آئے اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو اس سے رکے رہے اور دہکتی ہوئی جہنم انکے جلانے کیلئے کافی ہے"۔ [55]

تفسیر 55: اس آیت میں اہل کتاب کے بڑے بزرگوں کے احوال ذکر ہورہے ہیں اور یہ الزامی طور سے موجودہ اہل

کتاب پر رد ہے اس معنی پر اگر ان نعمتوں کی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے حسد رکھنا اچھی بات ہوتی تو آپ کے بڑوں نے انبیاء سابقہ کے ساتھ کیوں حسد نہیں رکھا؟۔ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ : بِهٖ ضمیر ان انعامات کی طرف راجع ہے جو آلِ ابراہیم علیہ السلام کو دیے گئے تھے اور اس آیت میں آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا مقصود ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی آل کو جو نعمتیں دی گئی تھیں لوگ ان کے متعلق دو حصوں میں تقسیم ہو گئے تھے لیکن ابراہیم علیہ السلام کی آل کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ان کی شان وشوکت بلند تر ہوئی ہے تو اسی طرح آپ کے متعلق بھی لوگ دو گروہ ہو گئے ہیں لیکن آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتے البتہ جو مخالفت کرتے ہیں ان کے لئے عذاب جہنم کے ساتھ تخویف ذکر فرمائی ہے۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ : (صَدَّ) فعل لازمی کا معنی دیتا ہے یعنی منہ پھیر دینا اور متعدی بھی آتا ہے یعنی اور لوگوں کو ایمان لانے سے منع کرنا۔ یہاں پر اٰمَنَ کے مقابلہ میں پہلا والا معنی بہتر ہے۔ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ۔ سَعَر اصل میں شعلے کرنا، جلا کر تقسیم کر دینے اور آگ جلانے کو بھی کہا جاتا ہے یہاں مفعول کے معنی میں ہے یعنی جَهَنَّمَ مُسْعِرًا یا مصدری معنی میں ہے اور مضاف مقدر ہے یعنی كَفٰى بِسَعِيْرِ جَهَنَّمَ ۔ سَعِيْرَ یہاں پر تمیز ہے اور لفظ كَفٰى میں اشارہ ہے کہ اگر دنیاوی عذاب ان سے پھیر لیا جائے تو اُخروی عذاب جہنم انکی سزا کیلئے کافی ہے۔ (فائدہ) سَعَرَ ۔ (س ع ر) کا مادہ قرآن مجید میں اُنیس (۱۹) مرتبہ مذکور ہے اس میں تین طریقے ہیں۔ :(۱) صرف فعل سُعِّرَتْ سورۃ تکویر آیت 12۔ (۲) اَلسَّعِيْرِ معرفہ سَعِيْرٍ نکرہ اس میں یہ جہنم کا نام اور اس کی آگ کی صفت ہے (۳) لفظ سُعُرٍ جمع ہے یا مصدر ہے سورۃ قمر آیت 24 اور 27۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ۭ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُھُمْ بَدَّلْنٰھُمْ جُلُوْدًا غَيْرَھَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿56﴾ "یقینا جن لوگوں نے ہماری آیتوں پر کفر کیا عنقریب انہیں ہم آگ میں ڈالیں گے جب بھی ان کی کھالیں جل جائیں گی تو ہم بدل دیں گے ان کے علاوہ کھالیں تاکہ وہ عذاب چکھیں یقیناً اللہ تعالیٰ خوب غالب خوب حکمت والا ہے" [56]

تفسیر 56: یہودیوں کے قبائح اور بری عادات اس پر زجر تنبیہ کرنے کے بعد عذاب یہاں سے تخویف اخروی بیان فرما رہے ہیں۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا ۔ صاحب اللباب نے لکھا ہے کہ اس آیت میں ہر وہ چیز داخل ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات، افعال اور اس کے اسماء پر دلالت کرے اسی طرح نازل کردہ کتابیں، ملائک اور مبعوث پیغمبر یہ سب اس آیت میں داخل ہے اور ان میں سے کسی کے بھی انکار کرنے پر یہ وعید ہے کفر عام ہے انکار کی صورت میں ہو شبہات ڈالنے

یا غور و فکر نہ کرنے کی صورت میں ہو یا انکار چاہے حسد و عناد کے طور پر ہو سب مراد ہیں۔ سَوْفَ امام سیبویہ کا قول ہے کہ یہ ڈرانے کیلئے مستعمل ہے اور کبھی کبھار صرف (س) (نائب) اس کی جگہ آتا ہے جیسا کہ سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ سورۃ مدثر آیت 26۔ اس میں قریب اور دور کا فرق ملحوظ نہیں ہوتا ہے اور دونوں کلمات وعید اور ثواب میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ جیسا کہ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى: سورۃ ضحیٰ آیت 5۔ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا: سورۃ مریم آیت 47 ''قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ: سورۃ یوسف آیت 98 البتہ مناسب وجہ کے ساتھ قریب اور دور کا ارادہ کیا جاسکتا ہے۔ (نُصْلِيْهِمْ) صَلِي اور اِصْلاً میں دخول کے معنیٰ کے ساتھ ساتھ جلانے اور بھون لینے کا معنیٰ بھی ہوتا ہے۔ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا: امام آلوسیؒ نے لکھا ہے کہ ہر جلائی ہوئی کھال کے بدلہ میں دوسری کھال پہنا دیں گے جس کا رنگ بدلہ ہوا ہوگا البتہ جنس یعنی چمڑا ایک ہی ہوگا۔ کیونکہ لفظ تبدیل اور تغیر جب کسی چیز میں ذکر ہو جائے تو مراد صفتی تبدیلی ہوتی ہے اور اصل مادہ برقرار رہتا ہے اس کی تفسیر سورۃ اعراف آیت 162 کے ضمن میں ان شاء اللہ ذکر ہوگی۔ آیت فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا: (سوال) اللہ تعالیٰ تو ہمیشہ کھال کے بدلنے کے بغیر عذاب دینے پر قادر ہے تو کھال بدلنے میں کیا حکمت ہے؟ (جواب ۱) اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی طرف اشارہ ہے۔ (جواب ۲) (چمڑا) کھال جلنے کے بعد نئی پیدا ہونے کی صورت میں نرم نازک ہوتی ہے جو پہلے سے زیادہ جلن اور تکلیف محسوس کریگی۔ (سوال) یہ نئی آنیوالی کھال تو بے گناہ ہے پھر اس کو سزا کیوں دی جاتی ہے۔ (جواب ۱) یہ گزر چکا کہ اصل چمڑا باقی ہے صرف صورت بدل گئی ہے۔ (جواب ۲) عذاب کا مستحق تو وہ جسم ہے جو اس میں موجود ہے چمڑا تو عذاب پہنچانے کا سبب ہے اسلئے لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ فرمایا ہے یعنی جلود والا مراد ہے اگر چمڑے کو ہی عذاب دینا مراد ہوتا تو عبارت اس طرح ہوتی کہ لِتَذُوْقَ۔ یہ امام بغوی، فراء، امام رازی رحمہ اللہ اور دیگر مفسرین کا قول ہے۔ لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ذَوْقِي سے صرف چکھنا مراد نہیں ہے بلکہ مراد مسلسل عذاب چکھنا ہے لفظ ذَوْقِي میں اشارہ ہے کہ اس عذاب میں سخت ہونے کے ساتھ کڑواہٹ بھی ہے یعنی سخت اور کڑوا عذاب ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا یہ ماقبل کیلئے علت ہے یعنی اس طریقے پر عذاب دینے کی قدرت رکھتا ہے اور لفظ حَكِيْمًا یہ اس تعجب کو ختم کرنے کیلئے فرمایا یعنی اگر کوئی اللہ تعالیٰ کی رحیم و کریم صفت پر تعجب کرے کہ کمزور بندے کو اتنا سخت عذاب کیوں دیتا ہے تو جواب ہوا کہ رحم و کرم کے ساتھ حکیم بھی ہے اور اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۗ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۡ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ۝ "اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے عنقریب ہم انہیں ایسے باغات میں داخل کرینگے کہ جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے ان کیلئے ان میں پاک صاف بیویاں ہیں اور ان کو ہم گھنے سائے میں داخل کریں گے" [57]

تفسیر 57: اس آیت میں ایمان والوں کے لئے بشارت اخروی کا ذکر ہے اور چونکہ اس میں مقصود کامل بشارت ہے اس لئے ایمان کے ساتھ ساتھ عمل صالح کو بھی ذکر کر دیا۔ اس کی مزید تشریح سورۃ البقرہ میں گزر گئی ہے۔ سَنُدْخِلُهُمْ حرف سین کو جنت کی قربت کیلئے برائے تاکید ذکر کیا ہے۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا لفظ اَبد اُخْلُوْدُ (ہیشگی) کی تاکید کیلئے ذکر کیا ہے اس میں اس شک کا ازالہ مقصود ہے کہ یہ خُلُوْدُ کسی طویل مدت کیلئے نہیں ہے بلکہ مستقل (ہمیشہ کیلئے) ہے۔ وَنُدْ خِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ۔ جنت میں ہمیشہ آرام وسکون کیلئے تاکید ہے۔ ظَلِيْلٌ ظِلٌّ کے مبالغہ کیلئے ذکر ہوا ہے فاعل یا مفعول کے صفتی معنی میں واقع نہیں ہے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ ظَلِيْلٌ اس سائے کو کہتے ہیں جو سورج کی روشنی سے ختم نہ ہو اور سردی گرمی کی تکلیف بھی اس میں نہ ہو اس قسم کا سایہ جنت کی خصوصیات میں سے ہے ظَلِيْلٌ ہیشگی پر دلیل ہے جیسا کہ سورۃ رعد آیت 35 میں ہے۔ (سوال) دنیا میں جس جگہ مستقل سایہ ہو وہاں کی ہوا صحت مند نہیں ہوتی ہے بلکہ اس میں فاسد مادے ہوتے ہیں نیز جب جنت میں سورج نہیں ہے تو سایہ بھی نہیں ہے پھر سایہ کا کیا فائدہ ہے؟۔ (جواب ۱) امام رازی کا قول ہے کہ اکثر بلاد عرب گرم ہیں اسلئے ان کے نزدیک سایہ عظیم سبب راحت اور نعمت ہے اور یہ ہمیشہ راحت سے کنایہ ہے۔ (جواب ۲) جنت کے انعامات دنیا کی نعمتوں پر قیاس نہیں کیے جاسکتے ہیں لہذا اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ سورج کے بغیر سایہ بنائے جس میں بہت راحتیں اور نعمتیں موجود ہوں اللہ تعالیٰ ہمیں ان نعمتوں کا اہل بنادے اَللّٰهُمَّ اٰمِيْن۔

خلاصہ: اس مقام سے سورۃ کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے جو آیت 135 تک جاری رہے گا۔ اس حصے میں ان امور سیاسی کا بیان ہے جن کا تعلق تحکیم عدل یعنی عادلانہ نظام قضاء اور فوجی نظام سے ہے اور یہ کل 9 سیاسی امور ہیں۔ اس میں تین ابواب ہیں پہلا باب آیت 86 تک ہے اس باب میں پہلا امر سیاسی ہے کہ امانتیں اور ذمہ داریاں حقداروں کو دی جائیں جو عہدوں کے حقدار ہوں اور اسی طرح عدل کا حکم دیا گیا ہے یعنی کتاب وسنت پر فیصلے کرنا۔ یہ آیت 58 میں ذکر ہے اور متصل آیت میں اللہ و رسول کی اطاعت اور امراء کی اطاعت کا حکم ہے پھر منافقین کے لئے زجر اور توبیخ ہے اس کے ساتھ

ان کی پانچ مزید بری اور قبیح صفات بیان ہو رہی ہیں اور یہ گزشتہ صفات کے ساتھ متعلق ہیں۔ پھر مختلف طریقے سے اللہ کے رسول کی اتباع کی طرف ترغیب کا بیان ہے۔ پہلی وجہ اور سبب یہ ہے کہ اس کی رسالت کا مقصد اس کی اطاعت ہے جو سبب مغفرت ہے۔ آیت 64 میں ہے دوسرا سبب اور وجہ حکم رسول ﷺ ماننے اور تسلیم کرنے کے بغیر ایمان حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ آیت 65 میں ہے تیسرا سبب اور وجہ پانچ فضیلتیں تب حاصل ہوں گی جب مکمل اطاعت رسول ﷺ کی ہو یعنی ایمان پر قائم رہنا اور بہترین صفت آیت 67 میں ذکر ہے۔ اجر عظیم آیت 68 میں ہے۔ صراط مستقیم کی ہدایت آیت 69 میں ذکر ہے اور عظیم رفقاء جو مُنعَمْ عَلَیْهِمْ لوگ ہیں کی جنت میں رفاقت ہوگی پھر اس کے بعد دوسرا حکم سیاسی امور کا ہے یعنی نظام عسکری کا ذکر ہے جو قتال کیلئے اسلحہ کی تیاری ہے۔ اللہ تعالی کے راستے میں قتال کا ارادہ کرنا ہے آیت اے میں۔ پھر منافقین کیلئے وعیدات کا ذکر ہے کہ وہ ان امور میں مداہنت یعنی سستی سے پیش آتے ہیں آیت 72 اور 73۔ پھر تیسرا حکم عسکری سیاسی ہے جو کہ جہاد فی سبیل اللہ کیلئے مخلص زاہد افراد کی تیاری ہے آیت 84 پھر اسباب قتال آیت 75 اور 76 میں مذکور ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴿٥٨﴾ "بلاشبہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کو ادا کرو اور تم جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو بلاشبہ تمہیں اللہ بہت اچھی بات کی نصیحت اس کے ساتھ کرتا ہے یقیناً اللہ تعالی خوب سننے خوب جاننے والا ہے" [58]

تفسیر 58: (ربط ا) جب اہل کتاب کی ایک برائی بیان ہوئی اہل کتاب کی برائیوں میں سے ایک برائی کتمان حق یعنی حق بات چھپانے کی تھی کہ مشرکین کا دین اس نبی کے دین سے بہتر ہے: هٰٓؤُلَاۤءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا۔ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے ساتھ حسد کرتے تھے یہ سب خیانت کی اقسام ہیں تو اب یہاں پر عام امانتوں کا ذکر ہو رہا ہے کہ اس میں خیانت سے بچو۔ قرطبی، صاحب اللباب۔ (ربط ۲) اللہ تعالی نے کامل خوشخبری حاصل کرنے کیلئے ایمان کے ساتھ اعمال صالح کا ذکر کیا ہے تو اب اعمال صالح کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) پہلے وہ اعمال جو انسانوں کے آپس کے معاملات سے متعلق ہیں یعنی امانتیں وغیرہ۔ (۲) دوسری قسم یہ ہے کہ ایک انسان دو انسانوں کے درمیان فیصلے کرتا ہے تو اس میں عدل وانصاف پر فیصلہ کرنا چاہیے یہ دونوں اعمال اس آیت میں ترغیب کے ساتھ ذکر ہیں۔

(ابوحیان)۔ (ربط ۳) تفسیر مہائمی میں لکھا ہے کہ گزشتہ آیت میں دخول جنت کا ذکر ہو گیا تھا اور دخول جنت کے اسباب میں سے امانت میں خیانت سے بچنا اسی طرح عدل وانصاف پر مبنی فیصلے کرنا ہے تو اب ان دو اسباب کو یہاں بیان کر رہے ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اس جملہ میں بہت ہی تاکیدات ہیں پہلی تاکید کلمہ اِنَّ۔ دوسری تاکید اللہ تعالیٰ کا صریح اسم یعنی اللہ۔ تیسری تاکید لفظ امر۔ مفسرین نے اگرچہ اس حکم اور خطاب کا سبب نزول خاص مانا ہے تاہم یہ حکم عام ہے وہ خاص سبب نزول یہ ہے کہ عثمان بن طلحہ بن ابی طلحہ سے نبی اکرم ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر کعبۃ اللہ کی چابیاں طلب کیں اور انہوں نے حوالے کر دیں آپ نے دروازہ کھولا پھر ان چابیوں کو واپس کیا اور ابھی تک چابیاں اسی خاندان کے پاس ہیں تو یہ آیت نازل ہوئی بعض روایتوں میں ذکر ہے کہ اس وقت وہ مسلمان نہیں تھا تو علی رضی اللہ عنہ نے چابیاں ان سے جبری طور پر حاصل کیں۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو پھر انہیں واپس دے دیں جس سے متاثر ہو کر وہ مسلمان ہوئے۔ لیکن ابن کثیر نے لکھا ہے کہ عثمان صلح حدیبیہ کے وقت مسلمان ہوئے تھے اور امام آلوسیؒ نے اس روایت کا تین طریقوں سے رد کیا ہے۔ نیز سبب نزول تو خاص ہے مگر آیت کا حکم عام ہے اور اس بات پر مفسرین کا اتفاق ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ باعتبار نزول یہ آیت عام ہے تیسرا قول یہ بھی ہے کہ یہ آیت مسلمان حکمرانوں اُمراء کے ساتھ خاص ہے لیکن ان اقوال میں پہلا زیادہ صحیح ہے۔

اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا۔ امام آلوسیؒ کا قول ہے کہ امٰنٰت امانت کی جمع ہے جو مصدر مبنی للمفعول ہے۔ ان تمام حقوق کو شامل ہے جو خواہ حقوق العباد سے ہوں یا حقوق اللہ، نیز قولی یا فعلی ہوں یا اعتقادی ہوں۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ ان تمام حقوق سے متعلق ہے جو انسانوں پر واجب ہیں حقوق اللہ ہوں جیسا کہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، کفالت، نذر وغیرہ یا حقوق العباد ہوں جو ان کے ایک دوسرے پر ہیں یعنی امانتیں وغیرہ اور صاحب اللباب نے امانتوں کی تقسیم میں ذکر کیا ہے کہ زبان کی امانت یہ ہے کہ جھوٹ، غیبت، چغلی، گالی گلوچ، فحش کلام، کفر اور بدعت وغیرہ سے اس کو محفوظ کرے گا۔ آنکھوں کی امانت یہ ہے کہ حرام کی طرف نگاہ نہیں اُٹھائے گا۔ کانوں کی امانت یہ ہے کہ فحش کلام گانے سننے، جھوٹ اور غیبت وغیرہ یعنی ہر اس بات سے کان محفوظ کریگے جو شریعت میں ممنوع ہے۔ اسی طرح تمام اعضاء اور جوارح کی امانتیں ہیں۔ ناپ تول میں نقصان نہ کرنا۔ امراء اور حکام کا اپنے رعایا میں عدل اسی طرح علماء کا عام عوام میں عدل یہ ہے کہ انہیں صحیح عقائد بتائیں۔ ان کو ہر قسم کے باطل تعصبات وغیرہ سے بچاتے رہیں گے۔ عورت کی امانت داری یہ ہے کہ اپنی شرمگاہ اور شوہر کے مال کی حفاظت کرے گی۔ عدت وغیرہ مدت میں خیانت سے کام نہیں لے گی۔ آلوسی نے فرمایا کہ اُمراء کی یہ ذمہ داری ہے

کہ اپنی رعایا کو دین وشریعت کے مسائل بتائیں گے ان کی حفاظت کرینگے اور عہدوں پر حقداروں کو مقرر کرینگے۔ وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ: واو برائے عطف ہے اور إِذَا صرف ظرف کیلئے ہے جو أَنْ تَحْكُمُوا سے متعلق ہے اور ابوحیان کے نزدیک یہ مقدر فعل سے متعلق ہے جو کہ أَنْ تَحْكُمُوا ہے۔ بِالْعَدْلِ۔ لغت میں عدل برابری کو کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ انعام آیت ۱ میں ہے۔ عرف میں عدل ظلم ستم کے مقابل ہے یعنی حقدار کو حق دینا اور مظلوم کو ظلم سے بچانا اور عدل وسط (درمیان) کو کہا جاتا ہے جس میں افراط یعنی زیادتی بھی نہ ہو اور تفریط (کمی) بھی نہ ہو اس کمی وزیادتی کو جور (ظلم) کہا جاتا ہے۔ قانون شرعی کے بغیر عدل کا پتا نہیں چل سکتا ہے لہذا عدل سے مراد قرآن کریم اور سنت رسول ﷺ ہے۔ قرطبیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ آیت علماء اور حکام کو شامل ہے کہ جب یہ حضرات فتویٰ دیں تو حلال وحرام اسی طرح فرض اور مستحب اسی طرح صحیح اور غلط میں تمیز کریں۔ یہ سب عدل ہے اور امانت ہے۔ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ: حالیہ احکام ماننے پر تیزی سے عمل پیرا ہونے کی ترغیب ہے اور ما قبل کیلئے علت بھی ہے۔ نِعِمَّا اصل میں نِعْمَ مَا ہے تو میم کو میم میں مدغم کیا گیا یہ فعل مدح کے ساتھ خاص ہے۔ یہ جملہ وعظ ہے اور نصیحت کی یاد دہانی کے لئے بھی ہے اسی طرح اس میں زجر اور تخویف بھی ہے۔ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا: یہ صفات بلا تشبیہ وتمثیل اور بغیر تاویل وتحریف اللہ تعالیٰ کیلئے حقیقتاً ثابت ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا اگر ان صفات کی اللہ تعالیٰ سے نفی کی جائے تو پھر اس کے برعکس صفات ضرور ثابت ہوں گی جو اندھا اور بہرا ہونا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کے نقائص یعنی عیوب سے پاک ومنزہ ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۖ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ﴿٥٩﴾ "اے ایمان والو تم اللہ کی اطاعت کرو اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اصحاب امر کی اطاعت کرو پھر اگر تم باہم کسی چیز میں اختلاف کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو اگر تم اللہ اور قیامت پر ایمان لائے ہو یہ بہتر اور انجام میں بہت اچھا ہے" [59] ع

تفسیر 59: (ربط) سابقہ آیت میں اولیاء، ذمہ دار حضرات اور امراء اور حکام وقت کو حکم ہوا کہ عدل انصاف سے رعایا کے امور انجام دو تو اب رعایا کو ان کی اطاعت فرمانبرداری کا حکم ہو رہا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اس ندا میں تاکید ہے کہ آنے والے حکم کا ماننا ایمان کا تقاضا ہے۔ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ۔ اہل سنت کے نزدیک حکم کی موافقت کو اطاعت کہتے ہیں بعد والے جملہ یعنی إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ الخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم وجوب کے لئے ہے۔

(سوال) رسول کی اطاعت تو اللہ ہی کی اطاعت ہے جیسا کہ وَمَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ تو پھر اس پر عطف کیوں کیا گیا ہے؟۔ (جواب) امام رازی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اس میں دو دلالتوں اور دو دلیلوں کا بیان ہے یعنی کتاب اللہ دلالت کرتا ہے حکم الٰہی پر اور امر رسول اس سے خود یعنی لازمی طور پر ثابت ہوتا ہے اور سنت دلالت کرتی ہے حکم رسول پر اور امر الٰہی اس سے التزاما ثابت ہوتا ہے تو یہ جملہ صریح دلیل ہے کہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کی متابعت واجب ہے لہٰذا أَطِيعُوا اللهَ میں وحی مَتْلُوّ یعنی جلی ہے اور أَطِيعُوا الرَّسُولَ میں وحی غَيْرَ مَتْلُوّ ہے چونکہ شریعت میں یہ دونوں مستقل دلیلیں ہیں اسلئے أَطِيعُوا کو مکرر یعنی تکرار کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ۔ صحابہ کرام اور تابعین سے اس کے مصداق کے بارے دو اقوال منقول ہیں۔ پہلا قول ابن عباس اور جابر رضی اللہ عنہم، حسن بصری، ضحاک اور مجاہد رحمہم اللہ کا ہے کہ اس سے مراد علماء اور فقہاء ہیں کہ وہ دین کی تعلیم دیتے ہیں اور امر سے مراد دین کا علم ہے یعنی کتاب و سنت کی تعلیم اور ان کی اطاعت مراد ہے۔ دوسرا قول ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ اس سے حکام اور ارباب اختیار لوگ مراد ہے۔ علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ امیر کا حق ہے کہ اپنی رعایا کو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات کا حکم دیگا اور امانت کی ادائیگی کریگا۔ جب وہ اس طرح کرے تو رعایا پر اس امیر کی اطاعت لازم ہے۔ (تفسیر رازی، اللباب) میں راقم الحروف کہتا ہوں کہ ان دونوں اقوال میں تضاد نہیں ہے کیونکہ سلف کے دور میں ارباب اختیار اور بادشاہ یقیناً علماء ہوتے تھے اور ایمان والوں کو امیر کی اطاعت پر کثیر تعداد میں احادیث وارد ہیں جو ابن کثیر، ابن جریر، صاحب اللباب نے نقل کی ہیں۔ (سوال) امیر کی اطاعت میں أَطِيعُوا کیوں نہیں فرمایا؟۔ (جواب) وجہ یہ ہے کہ أُولِي الْأَمْرِ کی اطاعت مطلق اور مستقل نہیں ہے بلکہ ان کی اطاعت مقید اور مشروط ہے یعنی جب وہ قرآن و سنت کے ماتحت حکم دیں تو قابل اطاعت ہیں ورنہ نہیں۔ جیسا کہ متفق علیہ حدیث میں وارد ہے کہ مَا لَمْ يُؤْمَرْ بِمَعْصِيَةٍ فَإِذَا أُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ۔ (صحیح بخاری کتاب الاحکام وکتاب التفسیر حدیث 4584 صحیح مسلم کتاب الامارۃ حدیث 1834)۔ نیز آخری جملہ میں حکم الٰہی یہی ہے کہ اختلاف کے وقت امیر کی اطاعت نہیں ہوگی بلکہ اللہ و رسول کی طرف رجوع کیا جائے گا اور مِنْكُمْ لفظ سے واضح ثبوت ملتا ہے کہ اولی الامر کامل مؤمن ہوگا لہٰذا کافر امیر نہیں ہوسکتا فاسق واجب العزل ہے۔ امام ابن حجر عسقلانی نے شرح بخاری میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول کی اطاعت کو الگ أَطِيعُوا سے اس لئے ذکر کیا ہے کہ جس چیز کے ساتھ ہم مکلف ہیں وہ قرآن و سنت دونوں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت وہ ہے جو

قرآن کریم میں نازل ہوئی ہے اور رسول کی اطاعت یہ ہے کہ قرآن مجید کی تشریح جو حدیث میں وارد ہوئی ہے۔(نیز یا جو اضافی کوئی حکم رسول کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے دیا ہو) طیبیؒ نے فرمایا ہے کہ أَطِيعُوا الرَّسُولَ میں اشارہ ہے کہ اطاعت رسول مستقل ہے اور اولی الأمر کے ساتھ أَطِيعُوا اس لئے نہیں فرمایا کہ وہ حکام اور ارباب اختیار مستقل بالاطاعت نہیں کیونکہ ان کی اطاعت مقید ہے قرآن وسنت کے ساتھ ممکن ہے کسی وجہ سے ان کی اطاعت واجب نہ ہو اس لئے مستقل أَطِيعُوا نہیں فرمایا۔ اور فَإِن تَنَازَعْتُمْ میں اس کی طرف اشارہ ہے۔ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ: تَنَازُعٌ یہ نَزْعٌ: سے لیا گیا ہے جو کھینچنے اور پکڑنے کے معنی میں ہے پھر عرف میں اس کا اطلاق سخت اختلاف پر ہوتا ہے کیونکہ سخت اختلاف میں ہر ایک حق کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس خطاب میں صحیح قول یہ ہے کہ یہ عام ہے جیسا کہ ابن جریر نے لکھا ہے کہ یہ ایمان والوں سے خطاب ہو رہا ہے کہ اے ایمان والو! جب تمہارے درمیان کسی بات پر اختلاف آجائے۔ یا حکام و ارکان سلطنت یا علماء، فقہاء سے کسی بھی معاملے میں تنازعہ پیدا ہو جائے تو کتاب وسنت کی طرف رجوع کرو۔ امام ابن کثیر نے بھی لکھا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا امر ہے کہ ہر وہ چیز جس میں لوگ اختلاف کر بیٹھیں وہ اصول دین میں سے ہو یا فروع دین میں سے ہو تو کتاب وسنت کی طرف رجوع کرنا پڑیگا۔ پھر لکھا ہے کہ تمام جھگڑے اور جہالتیں اللہ تعالیٰ کی کتاب اور سنت رسول پر پیش کیے جائینگے۔ پھر انہوں نے فرمایا ہے کہ جو شخص متنازع فیہ مسائل میں کتاب اور سنت کی طرف رجوع نہیں کرتا وہ اللہ اور قیامت پر ایمان لانے والا نہیں ہے۔ امام آلوسی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس میں خطاب عام مؤمنین کو ہے اور شَيْءٍ خاص ہے جس سے مراد صرف امور دین ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اگر تمہارا اختلاف ہو جائے اولی الأمر کے ساتھ امور دین میں۔ اور ابن عطیہ نے المحرر الوجیز میں لکھا ہے کہ مراد یہ ہے کہ تنازعے باہم ہو یا اولی الامر سے ہو۔ ابن عاشور نے لکھا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا تمام ایمان والوں کو یہ خطاب ہے، تبھی سے تو اختلاف نہیں ہو سکتا ہے اور اولی الأمر کا آپس میں اختلاف ہو یا کام رعایا کا آپس میں ہو یا یا رعایا کا أولي الأمر سے ہو یا علماء کا آپس میں دینی مسئلہ میں اختلاف ہو تو رجوع قرآن وسنت کی طرف کرینگے۔ لفظ شيء عام ہے تمام اختلافات اس میں داخل ہیں۔ (سوال) بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ خطاب خاص ہے یعنی رعیت کا اختلاف اُمراء سے پیدا ہو جائے، کیونکہ عوام کا اختلاف علماء کے ساتھ اس میں شامل نہیں ہے اس لئے کہ مجتہد سے مقلد کا تنازعے اور اختلاف نہیں ہو سکتا۔

(جواب) آیت کے الفاظ محققین اور حضرات مفسرین کے اقوال صریح دلالت کرتے ہیں اس بات پر کہ یہ حکم عام ہے۔

باقی رہا معاملہ مقلد کا تو اس پر اللہ تعالیٰ نے تحقیق کو واجب کیا ہے جیسا کہ اس آیت میں واضح ہے کہ فَاسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ اسلئے کہ علم دلیل کے ساتھ مسئلہ سیکھنے اور بتانے کا نام ہے لہٰذا جب مقلد علم مع الدلیل حاصل کریگا تو اسوقت مجتہد سے اختلاف ہوسکتا ہے۔ (سوال) امام ابن کثیر نے اس آیت کے ضمن میں صحیح بخاری سے عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ والی روایت نقل کی ہے کہ یہ اس کے متعلق نازل ہوئی ہے جب وہ اپنے (سریہ) مجاہدین کے دستہ سے ناراض ہوکر غصے میں آ گئے اور ان کو حکم دیا کہ آگ جلاؤ انہوں نے آگ جلائی پھر حکم دیا کہ اس آگ میں کود جاؤ لیکن انہوں نے انکار کیا اس میں رعیت کا امیر سے اختلاف (تنازع) آیا ہے؟۔ (صحیح بخاری کتاب الجھاد حدیث 2955 صحیح مسلم کتاب الامارۃ حدیث 1839)۔ (جواب) یہ قول مشہور اور صحیح ہے مفسرین کے ہاں یہ قاعدہ اور اصول بہت مشہور اور عام ہے کہ قرآن کریم کی کسی آیت کی تعبیر، مفہوم اور معنی کے حوالے سے معنی کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ الفاظ یا سبب کے خصوص کا: فَرُدُّوْہُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ۔ امام قرطبی نے فرمایا کہ مراد یہ ہے کہ لوٹا دو اپنے متنازع مسائل کو قرآن کریم یا رسول کی طرف جب وہ زندہ تھے یعنی ان سے پوچھ لو اور ان کی وفات کے بعد ان کی احادیث کی طرف رجوع یعنی ان میں غور وفکر کرو۔ یہ قول مجاہد، قتادہ اور اعمش کا بھی ہے اور یہ صحیح قول ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اسطرح کہہ دے اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَعْلَمُ۔ مگر یہ قول درست نہیں ہے۔ اس جملہ سے کسی نے قیاس ثابت کیا ہے اور کسی نے قیاس کا رد کیا ہے رد قیاس کا قول صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رُدُّوْہُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ فرمایا ہے یہ نہیں فرمایا کہ اِلَى الْمِثْلِ وَالنَّظِیْرِ۔ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ: اس جملہ میں تاکید تہدید اور ڈانٹ ہے جیسا کہ سورۃ بقرہ آیت ۲۲۸ اور ۲۳۲ میں گزرا ہے۔ ذٰلِكَ خَیْرٌ۔ ذلک اشارہ ماقبل عنوان کی طرف ہے کہ اللہ ورسول کی اطاعت کرو اور خاص کر اختلاف کے وقت ان دونوں کی طرف رجوع کرو۔ خیر میں تفضیلی معنی نہیں ہے کیونکہ اختلاف میں تو کسی بھی صورت میں خیر نہیں ہے۔ نیز اس (خیر) سے دنیاوی فائدے مراد ہیں۔ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا۔ تَاْوِیْلًا۔ سدی کا قول ہے کہ اس سے انجام یا مالی فائدہ وغیرہ مراد ہے۔ مجاہد کا قول ہے کہ جزاء مراد ہے۔ زجاج کا قول ہے کہ تمہاری تاویلات سے قرآن وسنت کی طرف رجوع بہتر ہے تاویل کا مطلب یہ ھیکہ لفظ کی مراد بیان ہوجائے جو ظاہر نہیں اگرچہ وہ حقیقت کیوں نہ ہو۔ تاویل کی تفسیر سورۃ آل عمران میں گزر رہی ہے۔ فائدہ: بعض مقلدین نے تقلید کے اثبات کیلئے اس آیت کو پیش کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ اس آیت میں اُولِی الْاَمْرِ کی اطاعت کا حکم ہے اور وہ علماء مجتہدین ہیں۔ مگر انکا یہ استدلال کئی

وجوہات سے کمزور ہے: پہلی وجہ یہ ہے کہ اطاعت الگ چیز ہے اور تقلید الگ چیز ہے اور اس میں اطاعت کا ذکر ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ پہلے بیان ہوا ہے کہ أُولِي الْأَمْرِ کی اطاعت مستقل اور غیر مشروط نہیں ہے بلکہ اللہ اور رسول کی اطاعت کے ماتحت ہے یعنی أُولِي الْأَمْرِ نے قرآن وحدیث پر حکم قولاً عملاً جاری کیا ہو تو اس کی پیروی ہوگی اور یہ تقلید نہیں ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ أُولِي الْأَمْرِ کی اطاعت کو مشروط کیا ہے کہ بوقت اختلاف قرآن وسنت کی طرف لازم رجوع کریں گے اور یہ تو تقلید کے صریح خلاف ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ ۖ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿٦٠﴾ "کیا آپ نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جو اس کا دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس پر ایمان لائے ہیں جو آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے اور جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا ہے۔ وہ ارادہ کرتے ہیں کہ فیصلہ لے جائیں طاغوت کی طرف۔ حالانکہ یقیناً وہ حکم دیئے گئے تھے کہ وہ اس کا انکار کریں اور شیطان ارادہ کرتا ہے کہ ان کو گمراہ کردے دور کا گمراہ کرنا" [60]

تفسیر 60: (ربط) سابقہ آیت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت اور اختلاف واقع ہونے کی صورت میں کتاب وسنت کی طرف رجوع کا حکم ذکر کیا گیا تو اب اس حکم کی مخالفت کرنے والوں کو زجر وتوبیخ کیا جا رہا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو قرآن کریم اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اپنے فیصلے دوسرے لوگوں سے کراتے ہیں۔ یہ لوگ منافق ہیں اگرچہ یہ لوگ ایمان کا دعویٰ کر رہے ہیں اب ان کے قبائح کا بیان ہے۔ اس آیت کے سبب نزول میں مختلف اقوال ہیں لیکن ان اقوال میں مشہور قول ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے جسکو ابن ابی حاتم اور ثعلبی رحمہم اللہ نے ذکر کیا ہے بشر نامی ایک منافق کا ایک یہودی کے ساتھ کسی بات پر تنازع ہوا تو منافق نے کہا کہ کعب بن اشرف جو کہ یہودی ہے اس کے پاس فیصلے کیلئے جاتے ہیں اس یہودی فریق مخالف نے کہا کہ نہیں بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلتے ہیں کیونکہ یہودی کو یقین تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم رشوت بھی نہیں لیتا اور فیصلہ عدل کے ساتھ کرتا ہے تو انہوں نے فیصلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش کیا آپ نے فیصلہ یہودی کے حق میں سنایا تو اس پر منافق ناراض ہوا اور فیصلہ دوبارہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس لیکر گیا پھر اس کے فیصلے پر بھی راضی نہیں ہوا۔ قرطبی۔ پھر عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس فیصلہ لیکر گئے تو یہودی نے اس کو تفصیل بیان کی کہ یہ شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فیصلے پر راضی نہیں اور اب آپ کے پاس آیا ہے تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پوچھا

کہ کیا یہ حقیقت ہے؟ انہوں نے تسلیم کیا کہ ہاں۔ لہٰذا عمر فاروق گھر میں داخل ہوئے اور تلوار لیکر آئے اور اس منافق کا سر قلم کیا (یعنی مرتد کی سزا قتل ہے جو عمر نے جاری کی)۔ پھر دیگر منافقین نے قصاص اور دیت کا مطالبہ کیا اور یہ عذر پیش کیا کہ اس کا مقصد تو موافقت اور صلح کی تھی تو اس ضمن میں یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ اَلَمْ تَرَ برائے تعجب ہے۔ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ۔ زعم باطل، جھوٹ اور حق تینوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ ابن درید کا قول ہے کہ اسکا استعمال اکثر مقام پر باطل کیلئے ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے بِئْسَ مَطِيَّةُ الرَّجُلِ آدمی کی بدترین سواری زَعَمُوْا کا لفظ ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الادب حدیث 6158) صاحب اللباب نے لکھا ہے کہ زَعِيْمٌ کبھی ظن گمان کے معنی میں آتا ہے اور کبھی ذمہ دار کفالت اور ذمہ داری کے معنی میں آتا ہے جیسا کہ سورۃ یوسف آیت 72 میں ہے وَاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ۔ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ: منافق کے دعویٰ میں کتب النبیہ پر ایمان کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ مقام ہے فیصلوں کا اور فیصلوں کا مرجع تو کتب الٰہی ہے۔ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ: یہ ارادہ عزم کے معنی میں ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ طاغوت یعنی غیر اللہ کی طرف فیصلہ کیلئے رجوع کرنا گناہ ہے تو فیصلہ کرنا تو بلاشبہ گناہ ہے تفسیر ابو سعود۔ طَاغُوْتِ امام ابن کثیر نے فرمایا ہے کہ طَاغُوْتِ عام ہے یعنی ان تمام لوگوں کیلئے ہے جو کتاب وسنت سے اعراض کرتے ہیں اور فیصلہ کسی اور کے پاس لیکر جاتے ہیں اس مقام پر طاغوت سے یہی بات مراد ہے۔ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ: اس میں سابقہ تعجب کیلئے مزید تاکید ہے۔ امام رازی نے کہا ہے کہ لفظ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ دلالت کرتا ہے کہ طاغوت سے فیصلہ کرانا اس پر ایمان کے مترادف ہے اور طاغوت پر ایمان کفر ہے اور اسی طرح کفر بالطاغوت ایمان ہے۔ امام قاسمی رحمہ اللہ نے یہاں پر ایک فرع ذکر کی ہے دو آدمیوں کے درمیان ایک مسلمان حاکم فیصلہ کرتا ہے فیصلہ ہو جانے کے بعد ایک فریق اس فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے اور اپنا فیصلہ کفریہ عدالت (انگریز کی بنائی عدالتوں) میں چیلنج کرتا ہے تو یہ بندہ کافر ہو گیا کیونکہ اس کا کفار کے شعار پر رضامندی ہے اور یہ کفر ہے کیونکہ وہ کفری قانون کو اسلام کے مقابل پسند کرتا ہے۔ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا اَلشَّيْطَانُ: یہاں پر طاغوت انسی یعنی کعب بن اشرف کو اور طاغوت جنی دونوں کو شیطان کہا گیا ہے۔ پہلے والے معنی کی بناء پر اس کلام میں تعجب ہے یعنی جن کی طرف یہ فیصلے لیکر جاتے تھے وہ تو ان کے گمراہ کرنے کے تعاقب میں ہیں اور دوسرے معنی کی بناء پر اس کلام کا معنی یہ ہے کہ طاغوت کی طرف فیصلے لیکر جانے پر شیطان جنی ان کے گمراہ کرنے کی کوششیں کرتا ہے۔ ضَلٰلًا یہ يُضِلَّهُمْ سے مفعول مطلق ہے جیسا اَنْبَتَ

اللہ تبا تا ہے یا پھر دوسرا فعل مقدر ہے یعنی فَيَضِلُّونَ ضَلٰلًا اور بَعِيْدًا اضلال کیلئے بطور تاکید ہے یعنی انکی گمراہی کہ حق سے بہت دور ہے یعنی شرک اور کفر۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا ﴿٦١﴾

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کی طرف جو اللہ نے نازل کیا ہے اور رسول کی طرف آؤ تو آپ منافقین کو دیکھیں گے کہ وہ آپ سے اعراض کرتے ہوئے منہ پھیریں گے" [61]

تفسیر 61: اس آیت میں پہلے سے زیادہ ترقی ہے یعنی پہلے طاغوت کی طرف انکی رغبت کا ذکر کیا تو اب ان کا تَحَاكُمُ إِلَى اللهِ وَالرَّسُوْلِ یعنی اللہ تعالیٰ اور رسول کے قانون پر فیصلوں سے نفرت بیان ہورہی ہے۔ وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَآ أَنْزَلَ اللهُ وَإِلَى الرَّسُوْلِ: اس صفت نفرت کی تعمیم کے لئے لفظ إِذَا اور (قِيْلَ) مجہول کا صیغہ لاتے ہے اور لفظ تَعَالَوْا میں اشارہ ہے کہ کتاب وسنت کی طرف دعوت بلند مقام ومرتبہ کی طرف دعوت ہے۔ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِيْنَ: ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ذکر کیا ہے اس میں اشارہ ہے کہ قرآن وسنت کے فیصلوں سے انکار اور اعراض کا اصل سبب نفاق ہے۔ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا تاکید کیلئے صُدُوْدًا مصدر کو ذکر کیا ہے اور اس کا فعل صَدَّ لازمی آتا ہے اور اسی طرح کبھی یہ صَدَّ فعل متعدی بھی آتا ہے جیسے سورۃ النمل میں ہے کہ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ سورۃ نمل آیت 24۔ ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے وَإِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ أَنْزَلَ اللهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا: فائدہ: اس آیت میں مقلدین پر واضح اور صریح رد ہورہا ہے کہ جب انکو قرآن اور صحیح حدیث کی دعوت دی جائے اور ان کے مذہب کے خلاف ہو تو وہ اعراض کرتے ہیں اور یہی حال منافقین کا ہے۔

فَكَيْفَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَاءُوكَ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا ﴿٦٢﴾ "پھر کیا حال ہوگا جب انہیں کوئی مصیبت ان (کے اعمال) کی وجہ سے پہنچتی ہے پھر آپ کے پاس آکر اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ ہم نے ارادہ نہیں کیا تھا مگر موافقت اور بھلائی کا" [62]

تفسیر 62: فَكَيْفَ إِذَآ أَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ: اس میں منافقین کی مزید قباحتوں (برائیوں) کا ذکر ہے اور اس جملہ میں دو قول ہیں: پہلا قول یہ جملہ معترضہ ہے اور ثُمَّ جَآءُوْكَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا پر عطف ہے۔ یعنی آپ کی غیر موجودگی میں آپ سے اعراض کرتے ہیں اور جب آپ کے سامنے آتے ہیں تو جھوٹ سے یہ کہتے ہیں کہ ہماری چاہت تو

احسان اور موافقت کی تھی۔ ان کے اس عمل پر درمیان میں وعید سنادی گئی کہ اگر ان پر عذاب آجائے تو اس وقت کیا کریں گے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ مسلسل ایک کلام ہے یعنی یہ لوگ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نفرت کرتے ہیں اور ان کے پاس فیصلے لیجانا پسند نہیں کرتے ہیں لیکن جب ان پر کوئی مصیبت آن پڑتی ہے تو باطل اور جھوٹے اعذار کیلئے آپ ہی کے پاس آتے ہیں اور یہ ان کی مجبوری ہے ورنہ تو امن میں یہ لوگ آپ کے پاس آنے کے لئے کسی وقت تیار نہیں۔ نیز جھوٹی قسموں سے اپنی پاکدامنی کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا مقصد تو مصلحت تھی۔ مُصِيبَةٌ اکثر مفسرین کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد اس منافق کا قتل ہے۔ ابو مسلم کا قول ہے کہ اس میں مقصد مختلف عذابوں کی وعید ہے کہ جب تم اللہ اور رسول کی اطاعت نہیں کروگے تو اس نفرت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا کے مختلف عذاب اور مصائب سے واسطہ پڑیگا۔ پھر یہ لوگ مجبور ہو کر آپ کے پاس آتے ہیں اور جھوٹی قسموں سے اپنے تزکیے کرتے ہیں۔ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ اس میں اشارہ ہے کہ اللہ اور رسول سے اعراض انتہائی بدترین گناہ اور سبب عذاب ہے اور بوجہ مرتد ہونے کے اس پر قتل بھی کیا جاسکتا ہے۔ پہلے قول کی بناء پر ثُمَّ جَاءُوكَ ۔ يَصُدُّونَ پر عطف ہے اور دوسرے قول کی بناء پر أَصَابَتْهُمْ پر عطف ہے۔ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ یہ جَاءُوكَ کی ضمیر سے حال ہے اور اس سے مراد جھوٹی قسم ہے اور ان کی یہ صفت سورۃ توبہ آیت 42، 56، 62، 74، 95 اور 96 میں بھی ہے اور سورۃ مجادلہ آیت ۱۴ میں بھی مذکور ہے۔ احسان اور موافقت کے معنوں میں مختلف توجیہات ہیں:

(۱) پہلی توجیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی کے پاس فیصلہ لیکر جانے کا ہمارا مقصد فقط اتنا تھا کہ مدعیٰ علیہ پر احسان ہوجائے اور اسی طرح مدعی اور مدعیٰ علیہ کے درمیان اتفاق اور مصالحت پیدا ہوجائے۔ (۲) دوسری توجیہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو صرف حق پر فیصلہ کرتے ہیں جبکہ ہمارا ارادہ یہ تھا کہ دونوں جانب سے احسان کیا جائے اور صلح اور موافقت سے کام لیا جائے اور دونوں جانب کو خوش رکھا جائے۔ (۳) تیسری توجیہ یہ ہے کہ وہ لوگ آئے اور انہوں نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے دیت طلب کی اور کہا کہ ہمارا کوئی اور مقصد نہیں ہے دیت طلب کرنے میں صرف مقتول کے ساتھ احسان کرنا مقصود ہے اور عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے درمیان آئندہ کیلئے موافقت پیدا ہوجائے۔ (۴) چوتھا سبب یہ ہے کہ ابن کیسان نے فرمایا کہ احسان اور توفیق سے مراد حق اور عدل کرنا مقصود ہے۔ (۵) پانچواں سبب یہ ہے کہ کلبی نے کہا ہے کہ احسان سے زبانی بات اور توفیق سے درست عمل مراد ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُل لَّهُمْ فِي أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا ﴿٦٣﴾

"یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو ان کے دلوں میں ہے لہٰذا آپ ان سے اعراض کیجئے اور انہیں نصیحت کیجئے اور ان سے دلوں میں اثر کرنے والی بات کیجئے" [63]

تفسیر 63: اس آیت میں ان کی اس بات کا رد ہے جو انہوں نے قسمیں کھا کر کی تھی اور گزشتہ قبائح پر تفریع فرمار ہے ہیں اور ان کے لئے آداب اور عادات بیان کرتے ہیں۔ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اس سے مراد انکا غصہ، نفاق، دشمنی اور جھوٹ ہے۔ پہلا ادب یہ ہے کہ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ: ایک معنیٰ یہ ہے کہ ان کے عذر قبول مت کرنا دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ ان کے دلوں کے راز فاش کرنے سے اعراض کرو یعنی ان کے دلوں کے رازوں سے اجتناب کرو کیونکہ ان کے ظاہر کرلے سے بعض اوقات بڑے بڑے فتنے نمایاں ہوتے ہیں یعنی اپنے نفاق پر ڈٹ جائیں گے ضد اور عناد پر پختہ اور قائم رہیں گے۔ صاحب اللباب۔ دوسرا ادب یہ ہے کہ وَعِظْهُمْ مَوْعِظَةً: میں وعید اور تنبیہ کا معنیٰ ہوتا ہے۔ یعنی ان کو جھوٹ بولنے، حسد، مکر اور نفاق سے منع کرو اور عذاب الٰہی سے ان کو ڈراؤ۔ تیسرا ادب وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا - فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ : میں تین قول یعنی توجیہات ہیں: پہلی توجیہ یہ ہے کہ تنہائی میں ان کو دعوت دین پیش کرو جیسا کہ نوح علیہ السلام کی دعوت میں دونوں طریقے تھے۔ ثُمَّ اِنِّيْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا : سورۃ نوح۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ان کے نفسوں سے متعلق ہے ان میں خفیہ نفاق ہے۔ تیسری توجیہ یہ ہے کہ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا سے متعلق ہے یعنی ان کے دلوں میں اثر کرنے والی بات کرو۔ کوفیوں کے نزدیک یہ ترکیب جائز ہے۔ قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا بلیغ سے مراد انتہا تک پہنچنے والا ڈرانا کہ اگر توبہ نہیں کریں گے تو قتل ہو جائیں گے۔ یا اس طرح کلام اور وعظ جو فصاحت اور بلاغت سے مزین ہوتا کہ ان کے دلوں میں تاثیر کرے اور ان آداب کے ساتھ تمام منافقین سے معاملہ کرنا چاہئے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَاۗءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝ "ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے اور یقیناً اگر وہ لوگ جب انہوں نے ظلم کیا آپ کے پاس آتے پھر وہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے اور رسول بھی ان کیلئے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا تو یقیناً وہ اللہ تعالیٰ کو بہت توبہ قبول کرنے والا نہایت رحم کرنے والا پاتے" [64]

تفسیر 64: سابقہ آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت چھوڑنے پر مختلف طریقوں سے ان پر زجر و توبیخ کی گئی

تھی اب یہاں اطاعت رسول کی طرف مختلف طریقوں سے ترغیبات ذکر کر رہے ہیں۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ یہاں پہلی ترغیب ذکر کر رہے ہیں۔ یعنی رسول کو بھیجنے کا مقصد اس کی اطاعت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس کو استثنیٰ مفرغ کہا جاتا ہے یعنی وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ لِشَيْءٍ مِنَ الْاَشْيَاءِ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ اس میں اشارہ ہے کہ جو رسول کی اطاعت نہیں کرتا تو یا وہ رسالت کو مہمل اور بیکار سمجھتا ہے کہ اس کا آنا بے فائدہ اور بے مقصد ہے۔ بِاِذْنِ اللّٰهِ میں (با) سببیہ ہے اور اِذْن سے مراد امر یعنی حکم ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے اور رسول اللہ کی اطاعت کی وجہ سے۔ (سوال) لِيُطَاعَ میں دلیل ہے کہ اللہ کا ارادہ ہے کہ رسول کی پیروی کی جائے جبکہ بہت سارے لوگ نبی کی پیروی سے اعراض کرتے ہیں تو یہ معتزلہ کے عقیدے کی تائید ہے کہ خارج میں اللہ تعالیٰ کے ارادے کے خلاف کام صادر ہو رہا ہے؟۔ (جواب ۱) ابو حیانؒ نے فرمایا کہ یُطَاعَ مجہول کا صیغہ ہے تو اس کا فاعل مقدر اور خاص ہے۔ یعنی لِيُطِيْعَ مَنْ اَرَادَ اللّٰهُ طَاعَتَهٗ۔ (جواب ۲) اذن ارادے کے معنی میں ہے یعنی بِاِرَادَةِ اللّٰهِ معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ توفیق دے گا اور نصرت کرے گا۔ فائدہ: صاحب اللباب نے لکھا ہے کہ یہ آیت دلیل ہے کہ انبیاء کرام گناہوں سے پاک ہیں کیونکہ اس آیت میں ان کی اطاعت کی مطلق دلیل ہے لہٰذا اگر بالفرض وہ گناہ کا ارتکاب کریں تو اس گناہ میں بھی ہم پر ان کی اطاعت فرض ہوگی اور کسی کام کا گناہ ہونا حرمت کی دلیل ہے تو معلوم ہوا کہ ایک ہی چیز ایک اعتبار سے حرام ہے تو دوسرے اعتبار سے واجب ہے تو یہ دو ضِدَّيْنِ یعنی حلت اور حرمت (مخالف) کا اجتماع ہے جو کہ محال ہے۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ۔ رسالت کا مقصد یعنی اطاعت رسول کا ذکر کرنے کے بعد تارکین اطاعت رسول کیلئے آداب کا بیان ہے۔ ظَلَمُوْا۔ ظلم سے مراد رسول ﷺ کے فیصلے اور اطاعت سے اعراض ہے کیونکہ منافقین نے اطاعت رسول سے منہ پھیرا تھا۔ جَآءُوْكَ اس سے مراد حاضر ہونا ہے مگر یہ حاضری ندامت اور توبہ کی حیثیت سے ہو۔ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ۔ نبی کریم ﷺ کے فیصلے کو چھوڑ دینے سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم ہوتی ہے کیونکہ سابقہ جملے میں اس کی اطاعت کو واجب کیا ہے تو اسلئے پہلے اللہ تعالیٰ سے استغفار لازم کیا ہے۔ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ یہ دعا طلب کرنے کیلئے وسیلہ ہے حیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ سے دعا کرانا ہے اور یہ وسیلہ شرعیہ ہے۔ سوال: جَآءُوْكَ مخاطب کا صیغہ ہے اس کی مناسبت سے اِسْتَغْفَرْتَ صیغہ خطاب لانا چاہتے تھا۔ ایسا کیوں نہیں ہوا؟۔ جواب: یہاں خطاب سے غائب کی طرف کلام پھیر دیا دو چیزوں کی صراحت کے لئے (1) وصف رسالت کی بلندی اور عظمت کو بیان کرنے کے لئے (2) نبی

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی کے حق میں دعا کرنے کی عظمت بیان کرنے کے لئے اور خطاب میں یہ دونوں وصف موجود نہیں ہے اور اس کی بلند شان اور اس کی دعا کی عظمت کیلئے ایسا ہوا ہے۔ لَوَجَدُوا اللّٰهَ یہ اِنَّ کیلئے خبر ہے اور اِذْ ظَّلَمُوْا۔ جَآءُوْكَ سے متعلق ہے۔ وَجَدُوْا سے وِجْدَانِ علمی مراد ہے اور دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے لہٰذا دوسرا مفعول تَوَّابًا رَّحِيْمًا ہے۔ یا وِجْدَان پالینے کے معنی میں ہے اور تَوَّابًا حال ہے اور پالینے میں اشارہ ہے کہ جب انسان نافرمانی کا ارتکاب کرتا ہے تو گویا کہ اللہ تعالیٰ اس بندے سے گم ہو گیا ہے یا اس نے اللہ کو بھلا دیا ہے۔۔ پھر جب توبہ کر لیتا ہے تو گویا کہ پھر اللہ تعالیٰ کو پالیتا ہے۔ توابا بہت توبہ قبول کرنے والا اور توبہ کرنے کا طریقہ سکھانے والا ہے۔ رَحِيْمًا آئندہ اس پر رحم کرتے ہوئے گناہوں سے بچانے والا ہے۔ سوال: نافرمانی معصیت کے موقعہ پر تو اللہ تعالیٰ سے استغفار کافی ہے تو یہاں پر رسول سے استغفار کی کیا حکمت ہے؟۔ جواب ۱: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی سے وہ ناراض ہو جاتے ہیں لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے عذر کا اظہار کرنے کا ادب سکھایا ہے۔ جواب ۲: یہاں گناہ رسول کا حکم کو چھوڑ دینا تھا تو توبہ کی قبولیت میں بھی وہ عمل لازم ہے جس کا چھوڑ دینا سبب گناہ تھا۔ فائدہ: مبتدعین نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر جا کر مغفرت اور دیگر ضروریات کی دعا کرنی چاہیے پھر انہوں نے عام اولیاء کی قبروں پر اپنے لئے دعاء کو جائز قرار دیا ہے۔ یعنی نبی کی قبر پر جا کر گناہوں کی مغفرت کے لئے خصوصاً اور عام دعائیں طلب کرنا جائز قرار دیا ہے۔ پہلا جواب تو یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا اولیاء اللہ کی قبروں پر حاضر ہو کر اپنے لئے دعا طلب کرنا کسی صحیح حدیث میں وارد نہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کبھی بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر حاضر ہو کر اپنے لئے دعا نہیں مانگی۔ الصارم المنکی صفحہ ۳۷۲۔ تو صحابہ کرام کا اس بارے میں اجماع ہے کہ انہوں نے قبر والوں سے اپنے لئے دعا نہیں مانگی ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی تخصیص ہے جس کی دلیل اس آیت میں ضمیریں ہیں ظَلَمُوْا۔ اَنْفُسَهُمْ۔ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ۔ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ۔ لَوَجَدُوْا: کیونکہ ضمیر ذات پر دلالت کرتی ہے لہٰذا اس میں تعیین اور تخصیص ہے۔ البتہ تعمیم یعنی عام کرنے کیلئے کوئی قرینہ موجود ہونا چاہیے جو اس تخصیص کو عمومیت میں بدل دے لیکن عمومیت کا کوئی دوسرا قرینہ یہاں نہیں ہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ لفظ جَآءُوْكَ آیا ہے جَآءُوْا اِلٰی قَبْرِكَ نہیں آیا ہے لہٰذا یہ قبر پر قیاس نہیں ہو سکتا ہے۔ اگرچہ قبر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ثابت ہے مگر برزخی زندگی ہے اور عالم برزخ پر دنیا کے احوال مرتب نہیں ہو سکتے۔ چوتھا جواب جب اس آیت کے متعلق صحابہ کرام سے

عمومیت کی تفسیر ثابت نہیں البتہ صحابہ کرام نے اس آیت کو عموم پر محمول نہیں کیا کیونکہ کسی صحابی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر جا کر دعائے مغفرت طلب نہیں کی۔ تو بعد میں کسی کو یہ لائق نہیں کہ ان کے خلاف کوئی تفسیر کر بیٹھے۔ الصارم المنکی صفحہ 274 میں لکھا ہے کہ وَلَا يَجُوْزُ إِحْدَاثُ تَأْوِيْلٍ فِيْ آيَةٍ أَوْ سُنَّةٍ لَمْ يَكُنْ عَلَى عَهْدِ السَّلَفِ وَلَا عَرَفُوْهُ وَلَا بَيَّنُوْهُ لِلْأُمَّةِ: کسی آیت یا حدیث میں اس قسم کی تفسیر اور تاویل جائز نہیں ہے جو سلف صالحین سے منقول نہ ہو اور نہ ہی انہوں نے امت کیلئے بیان کی ہو اور نہ اس کو وہ جانتے ہوں۔ پانچواں جواب یہاں پر جَآءُوْكَ فرمایا ہے نَادُوْكَ (تجھے پکاریں) نہیں فرمایا جبکہ سلف صالحین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قبر کے پاس دعاء طلب کرنا جائز نہیں ہے۔ الصارم المنکی صفحہ 113 پر لکھا ہے کہ اس بات پر سلف کا اتفاق ہے کہ قبر کی زیارت کرنے والا قبر سے کچھ طلب نہیں کرے گا یعنی اس سے دعا نہیں مانگے گا۔ اور وہ چیز جو زندگی میں اس سے طلب کرتے تھے مرنے کے بعد اس سے طلب نہیں کی جائے گی یا وہ چیز جو قیامت میں طلب کی جائیگی یعنی استغفار و شفاعت وغیرہ وہ بھی نہیں طلب کریگا۔ امام آلوسیؒ نے جلد 6 ص 125 میں وسیلے کے موضوع میں اس طرح تحریر کیا ہے کہ أَمَّا إِذَا كَانَ الْمَطْلُوْبُ مِنْهُ مَيِّتًا أَوْ غَائِبًا فَلَا يَسْتَرِيْبُ عَالِمٌ أَنَّهُ (طَلَبُ الدُّعَاءِ) غَيْرُ جَائِزٍ وَأَنَّهُ مِنَ الْبِدَعِ الَّتِيْ لَمْ يَفْعَلْهَا أَحَدٌ مِّنَ السَّلَفِ: چونکہ وہ ذات جس سے دعا طلب کی جاسکتی ہے فوت ہوئی ہو یا دور ہو تو سلف کے کسی عالم کا اس میں شک نہیں ہے کہ یہ عمل ناجائز ہے اور یہ ان بدعات میں سے ہے جس کو کسی نے بھی سلف سے نقل نہیں کیا ہے۔ چھٹا جواب قبر والے سے دعا تو سننے پر موقوف ہے اور مردوں کے سننے پر موقوف ہے اور مردوں کے سننے کی قرآن مجید نے نفی کی ہے۔ قرآن مجید میں اس پر واضح نصوص ہیں کہ مردے انبیاء یا اولیاء کرام ہوں دعا کرنے والوں کی دعا قطعاً نہیں سنتے (اور باتیں سنتے ہیں یا نہیں) اس کی تفصیل آئندہ آئیگی)۔ سورۃ یونس آیت 28 اور 29، سورۃ فاطر آیت 14، سورۃ احقاف آیت 5 اور 6 میں (سوال) اس مقام پر ابن کثیر، قرطبی رحمہما اللہ اور دیگر مفسرین نے اعرابی کی روایت کو نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد اس آیت کو پڑھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک سے استغفار کیا تھا اور خواب میں انہوں نے دعا کی قبولیت اور گناہوں کی معافی دیکھ لی تھی۔ (جواب) اس کا تفصیلی جواب سورۃ مائدہ آیت 35 وسیلہ کے عنوان میں دیا جائیگا ان شاء اللہ وہاں ملاحظہ ہو۔ قرطبی کے حاشیہ میں اس کی سند کو منقطع مرسل قرار دیا گیا ہے اور اس حدیث میں راوی ابو صادق ازدی کوفی کی ملاقات علی رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں۔ ابن کثیر اور ابو حیان رحمہم اللہ نے بھی اس روایت کو بغیر سند کے نقل کیا ہے اور یہ بات تو اتفاقی

ہے کہ حدیث کیلئے سند ذکر کرنا لازمی ہے نیز سند کے باقی حصہ پر تفصیلی کلام سورۃ مائدہ میں ذکر ہوگا۔ ان شاء اللہ

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿٦٥﴾ "آپ کے رب کی قسم وہ مومن نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ آپ کو حاکم مانیں اس چیز میں جو اختلاف ہو جائے ان کے درمیان پھر وہ نہ پائیں اپنے دلوں میں کوئی تنگی اس سے جو آپ فیصلہ کر لیں اور وہ تسلیم کر لے دل و جان سے تسلیم کرنا" [65]

تفسیر 65: اس آیت میں اطاعت رسول کی طرف ایک اور طریقہ سے ترغیب ہے وہ طریقہ یہ ہے کہ اطاعت رسول شروط کے ساتھ کرنا لازم ہے جو شروط اس آیت میں ہیں۔ یہ وہ شروط ہیں جن پر ایمان مبنی ہے اس آیت کے نزول میں دو واقعات ہیں ایک تو وہ قصہ جو گزر گیا ہے کہ منافق نے رسول کے فیصلے سے اعراض کرتے ہوئے عمر رضی اللہ عنہ کو فیصلہ پیش کیا تھا اور انہوں نے اسے قتل کیا تھا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ جو امام بخاری نے کتاب التفسیر حدیث 2361 میں نقل کیا ہے کہ زبیر رضی اللہ عنہ کا پانی کے مسئلہ میں انصاری سے اختلاف ہوا تو اس جھگڑے میں آپ علیہ السلام نے پہلے انصاری کیلئے مصلحتا پانی چھوڑنے کا حکم دیا کہ زبیر تم اپنی زمین کو نارمل پانی پلاؤ اور پھر اس کیلئے پانی چھوڑ دو اس پر اس انصاری نے ناراضگی کا اظہار کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ نیز جن لوگوں نے یہ واقعہ حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کے متعلق قرار دیا ہے تو اس پر کوئی صحیح سند سے دلیل وارد نہیں ہے۔ سبب نزول کوئی بھی ہو مگر آیت کا مفہوم اور حکم عام ہے۔ فَلَا وَرَبِّكَ اس میں تاکیدات اس طرح ہیں۔ حرف لام کا ذکر، اللہ تعالیٰ کا اپنی ذات ربوبیت پر قسم، پھر بطریقہ خطاب ذات ربوبیت کو نبی کی طرف مضاف کیا ہے اس میں اشارہ ہے کہ اس حکم میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کا اظہار فرمایا ہے۔ اور اس طرح نبی کی شان کی حفاظت کی ہے۔ فَلَا میں بہت اقوال ہیں پہلا قول امام ابن جریر کا ہے کہ یہ مقدر کلام کے رد کیلئے ہے جو سابقہ کلام سے ثابت ہوتا ہے اور وہ اس طرح ہے کہ یہ بات ہرگز نہیں ہے جو منافقین نے گمان کی ہے کہ زبان سے ایمان کا اقرار کرتے ہیں اور فیصلوں میں اوروں کو حاکم مقرر کرتے ہیں۔ ان میں لام پر وقف ہوگا اور وَرَبِّكَ سے نیا کلام شروع ہوگا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس لام کو قسم پر نفی کے اہتمام کیلئے مقدم کیا ہے۔ پھر لا کو دو مرتبہ لائے ہے جو نفی کی تاکید کیلئے ہے لہٰذا پہلے میں معنی اہتمام نفی کا ہے اور دوسرے میں نفی کی تاکید ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ حرف نفی پہلا يُؤْمِنُونَ پر داخل ہے اور دوسرا اضافی ہے اور وَرَبِّكَ درمیان میں جملہ معترضہ ہے۔ چوتھا قول زمخشری کا ہے کہ پہلا اضافی برائے تاکید ہے اور دوسرا اپنی

جگہ ہے۔اس قسم کے اقوال لَآ اُقۡسِمُ سورۃ واقعہ آیت 75، سورۃ قیامہ آیت 1، سورۃ انشقاق آیت 16، سورۃ حاقہ آیت 38، سورۃ تکویر آیت 15۔سورۃ بلد(1) میں بھی ہیں ان اقوال میں پہلا قول بہتر ہے لَا یُؤۡمِنُوۡنَ مفسر قاسمی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اس سے کامل ایمان مراد ہے۔حَتّٰی یُحَکِّمُوۡكَ فِیۡمَا شَجَرَ بَیۡنَهُمۡ ۔امام رازی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صفت ایمان کیلئے تین شرطیں قسم کے طور پر ذکر کی ہیں۔پہلی شرط ہر اختلافی معاملہ میں رسول اللہ ﷺ یعنی قرآن اور صحیح حدیث پر فیصلہ کرنا یہ اگر چہ عمل ہے مگر یہ صفت علامت ایمان قلبی ہے۔شَجَرَ یہ مادہ اختلاط اور اختلاف پر دلالت کرتا ہے۔جس طرح درخت کی شاخیں ایک دوسرے میں خلط ملط گھسی ہوئی ہوتی ہیں اسی طرح اختلاف کے وقت لوگوں کی باتیں ایک دوسرے میں داخل ہوتی ہیں اور یہ ہر قسم کے اختلاف کو شامل ہے۔اختلاف عوام کا ہو یا علماء کا دنیاوی معاملات میں ہو یا دینی سب کو شامل ہے۔دوسری شرط یہ ہے کہ ثُمَّ لَا یَجِدُوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیۡتَ اس میں دل کا یقین ظاہر کرنا ہے کہ نبی کا فیصلہ بالکل حق اور صحیح ہے یعنی پیغمبر ﷺ کا فیصلہ تسلیم کرنا صرف ظاہر میں نہیں بلکہ دل سے قبول کرنا اور دل سے ہی اسے حق سمجھنا ایمان کے لئے ضروری ہے تو معلوم ہوا کہ صرف تسلیم کرنا کافی نہیں جب تک دل کی تصدیق سے تسلیم کرنا شامل حال نہ ہو۔اَنۡفُسِهِمۡ اس سے دل مراد ہے۔حَرَجًا زجاج کے بقول اس سے مراد تنگی ہے۔مجاہد کا قول ہے کہ یہ شک کے معنی میں ہے مِّمَّا قَضَیۡتَ مفسر قاسمی نے فرمایا ہے کہ ہر صحیح حدیث اس میں شامل ہے لہٰذا ہر مومن پر لازم ہے کہ ہر صحیح حدیث کو ظاہر اور باطنا قبول کرے اور تقلیدی اور مذہبی تعصب کی وجہ سے اس کیلئے باطل تاویلیں اور حیلے تلاش نہ کرے جیسے مقلدین متعصبین اس مرض میں مبتلا ہیں کہ حدیث اور اہل حدیث سے دشمنی کرتے ہیں تو اس وعید میں وہ داخل ہیں۔تیسری شرط وَیُسَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا ہے یعنی وہ شخص جس کے دل میں یقین آ چکا ہے کہ نبی کی بات اور فیصلہ درست ہے مگر پھر بھی ضد اور عناد سے کام لیتا ہے تو فرمایا گیا کہ اپنے ظاہر کو باطن سے موافق کرو۔ابن کثیرؒ کا قول ہے کہ جب یہ لوگ سے فیصلہ کر لیتے ہیں تو باطن میں بھی اطاعت کریں اور کلی طور پر اس کو بغیر کسی قسم کے انکار یا جھگڑے کے تسلیم کریں۔امام آلوسیؒ کا قول ہے کہ یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کی لائی ہوئی شریعت اور قانون سب ان کے فیصلے ہیں۔جعفر صادق رحمہ اللہ کا قول ہے کہ کوئی قوم اگر عبادت گزار ہو یعنی نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ادا کرتی ہو لیکن نبی کریم ﷺ کے کسی عمل کو یہ قوم یا شخص ناپسند کرے یا یوں کہے کہ اس طرح نہیں بلکہ اس طرح جیسا ہم کہتے ہیں ایسا کرنا چاہئے تھا تو یہ قوم یا فرد اس نظریے کی وجہ سے مشرک ہے۔(سوال) اس آیت سے تو خوارج کا عقیدہ اور ان کی

تائید اور موافقت ثابت ہوتی ہے کہ جس نے شرعی فیصلہ نہیں کیا تو وہ کافر ہے۔ (جواب) اس میں ایمان کی نفی کیلئے تین شرطیں ذکر کی تین جو گزر گئی ہیں اس میں دوسری شرط تصدیق قلبی ہے اور تصدیق قلبی کی نفی سے لازما ایمان کی نفی ہوگی۔ فائدہ: صاحب اللباب نے لکھا ہے کہ یہ آیت عصمت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دلیل ہے کیونکہ ہم پر اللہ تعالیٰ نے اس کی ہر قسم کی اطاعت ظاہری اور باطنی امور میں لازم کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کے عمل میں گناہ کا کوئی ذرہ برابر شبہ بھی نہیں ہے۔

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿66﴾ ”اگر ہم یقیناً ان پر فرض کر لیتے کہ تم اپنی جانوں کو قتل کرو یا تم اپنے گھر اس سے نکلو تو وہ یہ کام نہ کرتے مگر ان میں سے تھوڑے اور یقیناً اگر کر لیتے وہ کام جو نصیحت کئے جاتے ہیں تو ان کیلئے بہت ہی بہتر اور دین میں زیادہ ثابت قدم رکھنے والا ہوتا“ [66]

تفسیر 66: اس آیت کی ابتدا میں منافقین کیلئے وعید ہے اور آخر میں اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ترغیب ہے البتہ دوسرے طریقے سے ہے وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ۔ امام آلوسیؒ نے کہا ہے کہ اس سے پہلے مقدر عبارت ہے یعنی ہم نے ان پر رسول کی اطاعت کو فرض کیا ہے جو کہ آسان کام ہے لہٰذا ان کو چاہئے کہ اس کو قبول کریں اگر رسول کی پیروی میں ہم ان پر یہ فرض کر لیتے کہ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ جیسا کہ بنی اسرائیل پر توبہ کیلئے فرض تھا اور اسی طرح اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کی حیات میں اس کی اطاعت میں بنی اسرائیل پر مصر سے ہجرت کرنا فرض ہوا تھا تو مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ۔ عَلَيْهِمْ کی ضمیر میں دو قول ہیں: (۱) پہلا قول یہ ہے کہ مومنوں اور کافروں دونوں کیلئے عام ہے۔ لہٰذا یہاں پر قلیل سے مخلصین ایمان والے مراد ہیں جنہوں نے اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں جہاد اور ہجرت دونوں کئے تھے۔ (۲) دوسرا یہ ہے کہ ضمیر صرف منافقین کی طرف راجع ہے تو قلیل میں پھر وہ منافقین مراد ہیں جو ریا کے طور پر سجدے کرتے ہیں یا قتال اور ہجرت کرتے ہیں۔ قَلِيْلٌ بدل ہونے کی وجہ سے قلیل پر پیش آیا ہے یہ فاعل مَا فَعَلُوْا سے بدل ہوا ہے کیونکہ یہ منفی غیر موجب کلام ہے۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ: اس جملہ میں اطاعت کی طرف ترغیب ہے جس کے دو فائدے بھی ذکر ہیں۔ مَا يُوْعَظُوْنَ: اس سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اتباع اور انقیاد ہے تمام اوامر اور نواہی میں پیروی جو وعدہ اور وعید پر مشتمل ہے اسلئے اس کو موعظہ کہا گیا ہے۔ خَيْرًا لَّهُمْ: دنیا و آخرت میں بے پناہ فائدے حاصل ہوں گے۔ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا اس سے دل میں ایمان کو پختہ مضبوط کرنا

مراد ہے یعنی اتباع رسول سے ایمان مضبوط ہوتا ہے اور تثبیت سے بقاء اور ایمان کا ثبات مراد ہے یعنی انسان پہلے بھلائی اور خیر مانگتا ہے پھر اس کی بقاء مانگتا ہے۔

وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٦٧﴾ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿٦٨﴾ "اور اس وقت ہم انہیں ضرور اپنی طرف سے (بہت بڑا اجر) اجر عظیم دیتے۔[67] اور ضرور ہم ان کو صراط مستقیم سے سرفراز فرماتے"[68]

تفسیر 67۔68: ان آیتوں میں اطاعت کے بعد دو فائدوں کا ذکر ہے جو اجر عظیم صراط مستقیم کی طرف رہنمائی ہے۔ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا: ایک مقدر سوال کا جواب دے رہے ہیں کہ اطاعت رسول پر مضبوط ہونے سے کیا حاصل ہوتا ہے۔ اَجْرًا عَظِيْمًا: دونوں کو نکرہ ذکر کیا ہے اس میں اشارہ ہے کہ اس اجر کا مخلوق کو اندازہ بھی نہیں اور اٰتَيْنٰا۔ مِنْ لَّدُنَّآ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف نسبت کی ہے جو اجر عظیم کی دلیل ہے۔ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا: ابن عطیہ کا قول ہے کہ اس سے وہ ایمان مراد ہے جو بندے کو جنت تک پہنچائے کسی نے کہا کہ وہ راستہ جو جنت تک پہنچانے والا ہے اور کسی نے کہا کہ عمل صالح مراد ہے۔ (سوال) صراط مستقیم کی ہدایت تو مقدم ہونی چاہیے تو اس کو کیوں مؤخر کیا؟۔ (جواب) ابن عطیہ کا قول ہے کہ یہاں صرف نعمتوں کا شمار کرنا ہے ترتیب نعمت ذکر کرنا مقصد نہیں ہے۔ البتہ ابوحیان اور صاحب اللباب نے کہا ہے کہ اس میں جنت کا راستہ اور اعمال مراد ہیں لہٰذا ترتیب صحیح ہے اور ان نعمتوں میں بہترین ترتیب ہے کیونکہ سب سے پہلے کسی چیز کے فائدے اور بھلائی پر نظر ہوتی ہے پھر دوسرے نمبر پر حصول مقصد کے لئے دل کی تسلی اور اطمینان پھر اجر اور ثواب مقصد ہوتا ہے پھر مزید فائدے اور جنت تک رسائی مقصد ہوتا ہے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿٦٩﴾ "اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے تو یہ لوگ ان لوگوں کے ساتھ ہونگے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر انعام کیا ہے نبیوں میں سے اور صدیقین میں سے اور صالحین میں سے اور یہ لوگ (رفیق) ساتھی کے طور پر اچھے ہیں"[69]

تفسیر 69: اس آیت میں اطاعت رسول کی طرف ترغیب ہے اور بہت بڑی نعمت کا حصول بھی ذکر ہے کہ اس اطاعت رسول پر ان کو مُنْعَمٌ عَلَيْهِمْ لوگوں کی رفاقت برزخ اور جنت میں حاصل ہوگی اور یہ اس اجر عظیم کی تفصیل ہے جو پہلے گزر چکی ہے وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ: قرآن میں جن کاموں سے منع ہوا ہے اور جن کاموں کے کرنے کا حکم ہوا،

صحیح احادیث میں جن کاموں کے کرنے کا حکم ہوا ہے اور جن کاموں کے کرنے سے منع کیا ہے وہ تمام اطاعت رسول ہے اس وجہ سے وَالرَّسُولَ کی اطاعت کے ساتھ الگ اطاعت ذکر نہیں کیا ہے۔ امام رازی اور صاحب اللباب نے لکھا ہے کہ مراد یہ ہے کہ فرائض ادا کرتے ہوئے جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور سنت کی پابندی کرتے ہوئے رسول کی اطاعت کی۔ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ: معیت سے مراد روحوں کا ملنا ہے عالم برزخ میں جیسا کہ حدیث میں وارد ہے کہ جب آپ کی روح مبارک بدن سے جدا ہو رہی تھی تو آپ نے فرمایا مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ صحیح بخاری کتاب المغازی حدیث 4463 ان لوگوں کے ساتھ جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ اَللّٰهُمَّ الرَّفِيقَ الْأَعْلَىٰ: اے اللہ تو بلند دوست ہے۔ یہ دوسرا اول کیلئے تفسیر ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ مراد ہے اس طرح مضمون اور حدیث ابن کثیر نے بھی اس آیت کی تفسیر میں ذکر کی ہے۔ اس مرافقت کیلئے امام ابن جریر و ابن کثیر رحمہم اللہ نے بہت سے روایتیں نقل کی ہیں۔ امام قرطبیؒ نے فرمایا ہے کہ ان کے ساتھ ایک مقام اور ایک جیسی نعمتوں میں ہونگے ان سے ملاقات کرینگے ان کی مجالس میں شریک ہونگے درجات میں فرق ہوگا مگر یہ لوگ آپنے آپ کو کم تر تصور نہیں کرینگے اور ان کے دلوں میں کسی قسم کی رنجش نہیں ہوگی۔ معیت سے جنت کے درجات میں اکٹھا ہونا مراد ہے اگرچہ درجات میں فرق ہوگا۔ مِنَ النَّبِيِّينَ اس میں الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ: کا بیان ہے اور یہ صحیح قول ہے اور اَلنَّبِيِّينَ سے تمام نبی اور رسول مراد ہیں اور الف لام استغراق کے لئے ہے تو امام الانبیاء علیہ السلام بھی اس میں داخل ہیں۔ وَالصِّدِّيقِينَ صدیق سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے ابتداء یعنی اول سے نبی کریم ﷺ کی تصدیق کی ہو جیسا کہ اس امت کے حواریوں اور اَلسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ ہیں اور اس امت میں اس کا سب سے اول مصداق ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہے جس کی تصدیق دیگر بڑے بڑے صحابہ کرام کیلئے سبب ایمان بنی۔ قرطبیؒ نے فرمایا ہے کہ صدیق وہ ہوتا ہے جو اپنے قول کی تائید عمل سے کرتا ہے۔ ابوحیان کا قول ہے کہ صدیق وہ ہے جس کے ایمان میں شک کی کوئی گنجائش ہی نہ ہو۔ جیسا کہ سورۃ حدید آیت 19 میں ہے۔ اسی طرح جو کثرت سے سچائی کا مظاہرہ کرتا ہے اس کو بھی صدیق کہتے ہیں۔ وَالشُّهَدَاءِ اس سے شہداء فی سبیل اللہ مراد ہیں یعنی بدر اور احد وغیرہ کے شہداء اور عمر، عثمان و علی رضی اللہ عنہم بھی دین اسلام کی وجہ سے شہید ہوئے ہیں یا اس سے شہادت کرنے والے مراد ہیں جو دین کو بیان کرتے ہیں اور اس کیلئے جہاد کرتے ہیں لہٰذا دین کی شہادت قائم کرنے والے اصحاب قسط مراد ہیں جیسا کہ آل عمران آیت 18 میں ہے۔ امام رازی

نے فرمایا ہے کہ اس میں شہید حکمی یعنی جو صرف شہید کے حکم میں وہ بھی شامل ہے وَالصّٰلِحِیْنَ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جن کا ظاہر اور باطن دونوں صالح ہوں اور سابقہ تینوں جماعتوں کے نقش قدم پر ہوں اس سے مراد تمام صحابہ کرام ہیں اور عکرمہ بھی اس قول کے قائل ہیں۔ فائدہ 1: ان چار صفات میں دو قول ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ یہ صفات ایک موصوف کی ہیں یعنی انبیاء کرام اس صفت کے حقدار ہیں کیونکہ وہ نبی بھی ہیں تو صدق والے بھی ہیں جیسا کہ سورۃ مریم میں آیت 41 اور 45 میں یہ صفت ابراہیم و ادریس علیہما السلام کی مذکور ہے اور سورۃ یوسف آیت 46 میں یوسف علیہ السلام کی ہے اور ہر نبی کیلئے صفت شہادت بھی ہے۔ دیکھئے سورۃ نساء آیت 41 اور 159، سورۃ بقرہ آیت 143، سورۃ مائدہ آیت 111، سورۃ نحل آیت 89، سورۃ حج آیت 78 اور سورۃ قصص آیت 85 اور صالح ہونے کی صفت بھی ہر نبی کیلئے ثابت ہے جیسا کہ سورۃ مریم آیت 10، سورۃ بقرہ آیت 130، سورۃ آل عمران آیت 39 اور 46، سورۃ انعام آیت 85، سورۃ انبیاء آیت 72 اور 86، سورۃ عنکبوت آیت 27 اور سورۃ قلم آیت 50 میں ہے اس توجیہہ کی بناء پر اَلَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ سے مراد انبیاء کرام علیہم السلام کی جماعت ہے جن میں مذکورہ تمام صفتیں پائی جاتی ہیں اور اس کی تائید سورۃ مریم آیت 5، سورۃ یوسف آیت 6، سورہ مائدہ آیت 110 میں ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ صفات الگ الگ افراد کی ہیں یعنی چار جماعتیں ہیں۔ (۱) پہلی جماعت انبیاء کرام علیہم السلام کی ہے۔ (۲) دوسری جماعت صدیقین کی ہے جیسے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وغیرہ ہیں۔ تیسری جماعت شہداء یعنی عمر فاروق، عثمان غنی اور علی رضی اللہ عنہم وغیرہ کی ہے۔ چوتھی جماعت صالحین کی جیسے دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ اس قول کو امام بغوی اور فراء نے عکرمہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے یعنی مُنْعَمْ عَلَیْهِمْ انبیاء کرام علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں اور اس طرح کلام سورۃ فاتحہ میں اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ کی تشریح میں گزر رہا ہے۔ ان دونوں اقوال کے ذریعے سے وہ سوال و شبہ ختم ہوا کہ اگر کوئی یہ اشکال کرے کہ اللہ و رسول کی اطاعت کرنے والے صدیقیت اور شہادت کے مرتبے میں نہیں ہونگے البتہ صالحیت کے مرتبہ میں ہو سکتے ہیں لیکن اس قسم کا اشکال کرنے والوں کے پاس معیت کا کوئی جواب اور معنی نہیں ہے لہذا جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ اور رسول کی اطاعت کرنے والے عام مراد ہیں اور مُنْعَمْ عَلَیْهِمْ خاص مراد ہیں جو انبیاء کرام علیہم السلام اور صحابہ عظام رضی اللہ عنہم ہیں۔ (سوال) نبوت کے ختم نہ ہونے اور جاری رہنے پر اس آیت سے استدلال کیا ہے مرزا غلام احمد ملعون نے اس آیت سے دلیل لی ہے اور استدلال کا طریقہ اس نے یہ اپنایا ہے کہ لفظ مَعَ اشتراک صفت کیلئے ہے یعنی جس نے

اللہ اور رسول کی اطاعت کی تو وہ صفت نبوت میں انبیاء کے ساتھ شریک ہوگیا اسی طرح صدیقین کے ساتھ اور شہداء اور صالحین کے ساتھ صفت میں شریک ہوا لہٰذا جو صفت نبوت میں شریک ہو وہ نبی ہوا؟۔ جواب ۱: یہ اس قسم کی تفسیر ہے کہ سلف صالحین میں سے کسی سے نقل نہیں ہے اور نہ ہی مومنین میں سے کسی مفسر سے نقل ہے لہٰذا تحریف معنوی ہے جو کہ عین کفر ہے۔ جواب ۲: الزامی جواب کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ کیا صحابہ کرام سارے انبیاء تھے کیونکہ اسی طرح مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ سورۃ فتح آیت 29 میں مَعَهٗ لفظ ہے اور اس آیت میں یقیناً مراد صحابہ کرام ہیں تو لازم ہوا کہ وہ سب نبی بن گئے۔ جواب ۳: سورۃ بقرہ کی تفسیر میں ہم نے مع کی تفسیر ذکر کی ہے کہ یہ مشترک لفظ ہے لہٰذا اس کا وہ معنیٰ کرنا چاہئے جو دوسری آیات محکمات سے متصادم نہ ہو۔ اگر اس میں معنیٰ اشتراکیت صفت لیا جائے تو دیگر نصوص اور آیات جو ختم نبوت پر دلیل ہیں انکی مخالفت ہوگی اور یہ قرآن کریم اور احادیث میں بے بنیاد اعتراضات کرنے والوں کا طریقہ ہے۔ جواب ۴: وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا: اس جملہ میں یہ بات واضح طور پر موجود ہے کہ معیت سے رفاقت مراد ہے اور رفاقت مجلس مکان وغیرہ میں استعمال ہوتی ہے صفت میں استعمال نہیں ہوتی ہے۔ اخفش نے لکھا ہے کہ رَفِيْقًا یہ حال یا تمیز ہے اور مفرد بھی جمع کیلئے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ آیت ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا: میں ہے۔ فائدہ ۲: امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے نَبِيّٖنَ کے بعد دوسرا درجہ صدیقین کا ذکر کیا ہے اور مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اس سے مراد سب سے اول ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہے جس سے یہ معلوم ہوا کہ وہ سب سے اول خلیفہ برحق ہیں۔

ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ عَلِیْمًا۠ۧ　　ع

"یہ فضل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو پورا جاننے والا ہے"[70]

تفسیر 70: اس آیت میں سوال کا جواب ہے سوال یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی عام اطاعت کرنے والے تو انبیاء کرام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنھم سے عمل میں کم ہیں تو ان کے ساتھ درجات میں بھی برابر نہیں ہیں تو ان کے ساتھ کس طرح اکٹھے ہونگے جواب ہوا کہ یہ ان کے عمل کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے۔ ذٰلِكَ اس میں اس رفاقت اور معیت کی طرف اشارہ ہے پہلی جو آیت میں گزری ہے۔ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ عَلِیْمًا یعنی اللہ تعالیٰ کو پورا علم ہے اطاعت کے ثواب فضل کی مقادیر اور اس کے مستحقین کا یا اللہ تعالیٰ کا علم نافرمانوں، اطاعت گزاروں، منافقین اور مخلصین اور وہ لوگ جو

رفاقت کے پورے حقدار ہیں سب کو احاطہ کرتا ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ خُذُواْ حِذْرَكُمْ فَٱنفِرُواْ ثُبَاتٍ أَوِ ٱنفِرُواْ جَمِيعًا ﴿٧١﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے بچاؤ کا سامان لے لو نکلو پھر گروہ گروہ یا اکٹھے نکلو" [71]

تفسیر 71: اس آیت میں امور سیاسی میں سے دوسرا حکم ہے یعنی قانون عدل کے اجراء کے بعد قتال فی سبیل اللہ کے اہتمام اور تیاری کا ذکر ہے۔ (ربط) قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت ذکر کرنے کے بعد اہل اطاعت کو حکم ہے کہ احیاء دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے قتال کی تیاری کرو۔ سربلندی دین کیلئے قتال کی تیاری کرو لیکن پہلا کام یہ ضروری ہے کہ اچھے طریقے سے تیاری کرو (عجلت) جلد بازی سے گریز کرو دشمن پر حملہ کرنے سے پہلے مکمل تیاری کرو اور منافقین کی چالوں اور دھوکوں سے بچتے رہو یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اس میں مخلص ایمان والوں سے خطاب ہے۔ خُذُوْا حِذْرَكُمْ: حذر میں (حا) پر زبر اور زیر دونوں پڑھے جاسکتے ہیں البتہ یہاں پر زیر منقول ہے۔ واحدی کا قول ہے کہ یہاں دو اقوال ہیں: (۱) پہلا قول یہ ہے کہ حذر سے آلات یعنی تلوار، بندوق اور دیگر آلات جدیدہ مراد ہیں یعنی اسلحہ پکڑ رکھو۔ (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ اخذ عمل کرنے کے معنی میں ہے یعنی اِحْذَرُوْا عَدُوَّكُمْ: یعنی دشمن سے اپنے آپ کو بچاؤ جیسا کہ خُذِ الْعَفْوَ میں ہے اس میں اسلحہ تیار کرنے بنانے کی طرف اشارہ ہے کہ اسلحہ کا بنانا اور استعمال سیکھو۔ قاسمی نے لکھا ہے کہ عرب لوگ جب بیدار ہوتے اور جان کو بچاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اَخَذَ حِذْرَهٗ: نیز اس چیز کو حذر کہتے ہیں جس کے ذریعے سے جان بچائی جاتی ہے یعنی اسلحہ، امام قرطبیؒ اور صاحب اللبابؒ نے لکھا ہے کہ آیت میں دلیل نہیں ہے کہ حذر سے تقدیر کا مقابلہ ہوسکتا ہے بلکہ اسلحہ رکھنا بھی تقدیر میں داخل ہے۔ ہم وسائل کو استعمال کرینگے کیونکہ ہم اس کے مکلف ہیں اور یہ عقیدہ بھی رکھیں گے کہ تدبیر سے تقدیر کا مقابلہ نہیں ہوسکتا کیونکہ ہم ایمان لانے میں ان دونوں کے مکلف ہیں۔ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اصل میں نفور اور نفار سے ہے یعنی برا جاننا ناپسند کرنا البتہ باہر جانے اور دشمن سے مقابلہ کرنے یا علم حاصل کرنے میں استعمال ہوتا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ جہاد کیلئے نکلنے والا جب بستی، گھر علاقہ سے نکلتا ہے تو اس طرح لگتا ہے کہ گویا اس کو مذکورہ تمام چیزوں سے نفرت ہے یعنی ان کی محبتیں جہاد کیلئے رکاوٹ نہ بنیں۔ ثُبَاتٌ اس کا مفرد ثبۃ ہے یعنی مضبوط گروہ اور اس گروہ کو سریہ بھی کہتے ہیں یعنی گروہ گروہ سریہ سریہ جہاد کیلئے نکلو اس وقت جب قتال فرض کفایہ ہو اور جب نظام شرعی قائم ہو تو امیر کے حکم پر چھوٹے دستوں کو بھی روانہ کیا جائیگا۔ اَوِانْفِرُوْا جَمِيْعًا: اس سے لشکر مراد ہے

یہ اس صورت میں ہے جب جہاد فرض عین ہو۔ حرف اَوْ تنویع کیلئے ہے اور اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا سے منسوخ نہیں ہے کیونکہ ہر عمل کیلئے الگ الگ حالات ہوتے ہیں یہ آیت صریح دلیل ہے کہ ایمان والوں پر جہاد شروط شریعہ کے مطابق فرض ہے۔ ابن عاشورؒ کا قول ہے کہ مفسرین نے اس آیت کیلئے کوئی خاص سبب ذکر نہیں کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عام قانون ہے اور اس میں فتح مکہ کیلئے تیاری کرنا مقصد ہے اس کا نزول چھ ہجری میں ہوا ہے اور فتح مکہ آٹھ ہجری میں ہوا ہے۔

وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿٧٢﴾

"بلاشبہ تم میں بعض یقیناً وہ ہیں جو بیشک نکلنے میں دیر کرتے ہیں پھر اگر تمہیں کوئی مصیبت پہنچے تو وہ کہتا ہے کہ یقیناً مجھ پر اللہ نے انعام کیا کہ میں ان کے ساتھ حاضر نہیں تھا" [72]

تفسیر 72: اس آیت میں منافقین کیلئے وعید ہے کہ وہ بیان کردہ سابقہ قانون کی مخالفت کرتے ہیں۔ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ عام مسلمانوں کو خطاب ہے لیکن حسن بصری، مجاہد، قتادہ رحمھم اللہ وغیرہ نے فرمایا ہے کہ اس سے منافقین مراد ہیں کیونکہ جہاد میں نکلنے کے وقت پیچھے رہتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔ یعنی یہ لوگ پیچھے بیٹھ جاتے تھے گھروں میں اور جہاد کی متعلق دیر کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اور یہ قول مومن کی شان کے خلاف ہے۔ لَيُبَطِّئَنَّ لازمی اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ فعل لازمی کا معنی یہ ہوگا کہ اِنْفِرُوْا کے امر پر عمل نہیں کرتے ہیں پیچھے رہنے کیلئے دیر کرتے ہوئے سستی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور متعدی کا معنی یہ ہے کہ اور لوگوں کو جہاد سے متنفر کرتے ہیں۔ امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہاں پر دونوں معنی اسلئے جائز ہیں کہ منافقین نے یہ دونوں کام کئے ہیں۔ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ یہاں پر مصیبت سے مراد قتل یا شکست ہے۔ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اس طرح قول کسی مومن سے خصوصاً دور نبوی میں صادر نہیں ہوسکتا ہے سوائے منافق افراد کے۔ سورۃ توبہ آیت ۸۱ میں بھی منافقین نے جہاد سے پیچھے رہ جانے کو انعام کہا ہے اور اس پر خوشی منائی ہے۔ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا یہاں شہادت حاضر ہونے کے معنی میں ہے اور اِذْ ظرفیۃ علّتیۃ ہے۔

وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿٧٣﴾ "البتہ اگر تمہیں اللہ تعالیٰ کا فضل پہنچے تو وہ ضرور کہے گا گویا کہ نہیں تھی تمہارے درمیان اور اس کے درمیان کوئی دوستی کاش کہ میں ان کے ساتھ ہوتا تو بہت بڑی کامیابی حاصل کرلیتا" [73]

تفسیر 73: یہ ان کی دوسری حالت کا بیان ہے وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ فضل سے مراد فتح اور مال غنیمت ہے

لَيَقُولَنَّ كَأَن لَّمْ تَكُن بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُ مَوَدَّةٌ: اس جملے کے متعلق مفسرین کے مختلف اقوال ہیں: (۱) پہلا قول یہ جملہ معترضہ ہے جس کا کوئی اعراب محل نہیں ہے اور اس میں بھی دو احتمال ہیں: پہلا احتمال یہ ہے کہ یہ اذلَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيدًا: کے ساتھ متعلق ہے یعنی ان کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ گویا کہ ان کا تمہارے ساتھ کوئی دوستانہ تعلق نہیں ہے۔ یہ ماتریدی اور زجاج رحمہما اللہ کا قول ہے۔ لیکن امام راغبؒ نے اس کا عربیت کے لحاظ سے سخت رد کیا ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ جملہ معترضہ ہے جو قول اور مفعول (مقولہ) کے درمیان واقع ہوا ہے یعنی يٰلَيْتَنِي كُنتُ مَعَهُمْ: مقولہ ہے اور كَأَن لَّمْ تَكُن جملہ معترضہ ہے۔ یہ زمخشری وغیرہ کا قول ہے دوسرا قول یہ ہے کہ یہ جملہ لَيَقُولَنَّ کیلئے مفعول ہے تو اس لحاظ سے مقولہ دو جملے ہیں ایک جملہ تشبیہ اور دوسرا جملہ تمنا اور مقصد یہ ہے کہ یہ جملہ ان منافقین کا مقولہ ہے جو دوسرے منافقین کو جہاد پر جانے سے منع کرتے تھے اور خود جہاد کے لئے نکل گئے تھے تو ان سے ہم کلام تھے کہ تمہارے اور اس نبی کے درمیان کوئی دوستی نہیں تھی کہ اس نے تمہیں غنیمت کے وقت چھوڑ دیا تو اس میں ضمیر بَيْنَهُ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہے یہ امام مقاتل اور فارسی کا قول ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ جملہ نصب کے محل میں ہے اور لَيَقُولَنَّ کی ضمیر سے حال ہے یعنی یہ بات وہ بعد میں کہتے ہیں اس حال میں گویا کہ تمہارے اور اس منافق میں کوئی تعلق دوستی تو کیا معرفت بھی نہیں تھی۔ ایک توجیہ میرے شیخ رحمہ اللہ کی ہے کہ یہ دونوں مقولے لَيَقُولَنَّ کیلئے ہیں ایک مقولہ مخفی طور پر اپنے نفس میں بولا ہے اور دوسرا مقولہ ظاہراً ہے اور بَيْنَهُ بمعنی بینی ہے۔ میری نظر سے کسی اور تفسیر میں یہ توجیہ نہیں گزری يٰلَيْتَنِي كُنتُ مَعَهُمْ اس میں یا منادی کیلئے نہیں فقط تنبیہ کیلئے ہے اس کو منادی کی ضرورت نہیں یہ قول امام فارسی وغیرہ کا ہے۔ بعض نے منادی کو مقدر مانا ہے کہ یاھؤلاءِ ہے۔ فَأَفُوزَ فَوْزًا عَظِيمًا: یعنی مال غنیمت میں بہت بڑا حصہ حاصل کر لیتے اور منافق کی دنیا پرستی کی طرف اشارہ ہے کہ جہاد میں اسے مال غنیمت کا لالچ ہوتا ہے اجر کا نہیں۔

فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۚ وَمَن يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ۝ "لہٰذا چاہئے کہ اللہ کے راستے میں لڑیں جو دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے بیچتے ہیں اور جو کوئی اللہ کے راستے میں لڑے پھر وہ قتل کر دیا جائے یا غالب آ جائے تو عنقریب ہم اسے بہت بڑے اجر سے نوازیں گے" [74]۔

تفسیر 74 اس آیت میں تیسرا سیاسی امر ہے یعنی جہاد کیلئے ایسے افراد تیار کرنے چاہئیں جن میں پورا اخلاص ہو اور ہر قسم کی

دنیا پرستی سے خالی ہو کر جہاد کریں۔ (ربط ۱) یہ بات بیان ہوئی کہ منافقین خود بھی اور دوسروں کو بھی جہاد سے روکتے ہیں تو اب مؤمنین کو حکم دیا جاتا ہے کہ منافقین کی باتوں میں مت آؤ جہاد کی طرف بڑھو۔ (ربط ۲) یہ بات گزر گئی کہ منافقین جہاد سے دور رہنے کو انعام الٰہی کہتے ہیں تو اب یہ فرمایا جارہا ہے کہ جہاد میں بہت بڑا اجر ہے لہٰذا جہاد کرنا انعام الٰہی ہے۔ فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ: مَاقبل کے ربط کی وجہ سے (فا) ذکر کرلے کا فائدہ معلوم ہوا۔ یہاں پر مفعول ذکر نہیں کیا تا کہ ان سب لوگوں کو شامل ہو جائے جو قتال کے حقدار ہیں جس میں ہر قسم کا کافر مراد ہے اور چونکہ اس مقام پر مخلص مجاہدین کے اخلاص کا ذکر مقصد ہے اسلئے صرف فاعل ذکر کیا ہے۔ اَلَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ: اس کے متعلق مفسرین کے دو قول ہیں: (۱) پہلا قول یہ ہے کہ يَشْرُوْنَ يَبِيْعُوْنَ کے معنی میں ہے یعنی دنیا کے مزے خواہشات لذتیں آخرت کی زندگی پر لٹاتے ہیں۔ اس میں نیت کے انتہائی اخلاص کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ يَشْرُوْنَ اِشْتِرَاءٌ کے معنی میں ہے یعنی دنیاوی زندگی کو آخرت کی زندگی پر فوقیت دیتے ہیں یعنی منافق لوگوں کو دعوت دیتے ہیں کہ نفاق چھوڑ دو اور قتال کیلئے بڑھو۔ لیکن پہلا قول بہتر ہے وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ: اس جملہ میں دعوت و ترغیب بلیغ ہے قتال فی سبیل اللہ کیلئے یعنی (مقاتل) مجاہد دو کاموں میں سے ایک کی ضرور نیت اور عزم کرے شہادت یا فتح اور میدان سے فرار بالکل ذہن میں نہ لائے چونکہ شہادت سبب اجر ہے اسلئے اسکو مقدم کیا ہے اور يَغْلِبْ سے مراد فتح غنیمت، دشمنوں کو قتل کرنا، شکست دینا اور ان امور میں کامیابی حاصل کرنا ہے۔ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا۔ (صحیح بخاری فرض الخمس حدیث 3123 و صحیح مسلم کتاب الامارۃ حدیث 1876 میں بھی اس طرح حدیث میں وارد ہے)۔ کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے راستے میں نکلتا ہے اور اس کو جہاد اور دین توحید کی سچائی نے گھر سے نکالا ہے تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ جنت میں داخل کریگا یعنی شہادت دیگا یا اس کو اپنے گھر مال غنیمت اور اجر کے ساتھ لوٹائے گا یہاں پر اَوْ مَانِعَۃُ الْخُلُوِّ کیلئے ہے اجر اور غنیمت دونوں بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ فائدہ: یہ آیت اور حدیث دلالت کرتے ہیں کہ شہادت غنیمت اور فتح کے ساتھ واپسی برابر ہے لیکن بہتر بات یہ ہے کہ یہ برابری مطلق اجر عظیم میں ہے اگرچہ کیفیت اجر میں شہادت بہت بڑا سبب ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۟

"اور تمہیں کیا ہوا ہے کہ اللہ کے راستے میں لڑتے نہیں ہو ان کمزور لوگوں کی خاطر جو مردوں میں سے اور عورتوں میں سے اور بچوں میں سے ہیں وہ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں اس بستی سے نکال جو کہ ظالم ہیں اس کے باشندے اور بنا دے ہمارے لئے اپنی طرف سے کوئی حمایتی اور بنا ہمارے لئے اپنی طرف سے کوئی مددگار" [75]

تفسیر 75 اس آیت میں جہاد و قتال کی ترغیب ہے اور اس کی علتوں کا بھی ذکر ہے اس آیت میں دو علتیں مذکور ہیں: پہلی علت فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اور دوسری علت وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ: ہے۔ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ: ما استفہامیہ برائے انکار ہے یعنی قتال چھوڑنے میں تمہارا کوئی عذر نہیں ہے حالانکہ اسباب قتال میں دو سبب موجود ہیں پہلی علت فی سبیل اللہ ہے (فی) لام کے معنی میں ہے اور اس کا مضاف مقدر ہے یعنی اعلاء اور سبیل اللہ سے مراد کلمۃ اللہ ہے یعنی دین کی سربلندی کلمہ توحید کے غلبہ کیلئے قتال کرو۔ دوسری علت وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ: ہے اس میں دو مشہور اقوال ہیں: پہلا قول ابن شہاب رحمہ اللہ کا ہے کہ یہ لفظ اللہ پر عطف ہے یعنی سَبِيْلِ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ: اور قِتَالٌ فِيْ سَبِيْلِ: یہ ہے کہ ان کو دشمن سے محفوظ کرنا تاکہ دشمنوں کی قید و عقوبت سے بچ جائے۔ دوسرا قول جو امام مبرد اور زجاج سے منقول ہے کہ مضاف مقدر ہے یعنی خِلَاصِ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ: یعنی کمزوروں کو دشمنوں کے ہاتھوں سے چھڑانا اور مُسْتَضْعَفِيْنَ: وہ لوگ ہیں جنکو کمزور کرنے کیلئے مشرکین ہر وقت کوششیں کرتے ہیں یا ضُعَفَاءِ کے معنی میں ہے اور یہ دلیل ہے کہ کبھی قتال میں کمزور مسلمانوں کو کافروں سے چھڑانا اور ان کے تسلط سے نجات دلانا مقصود ہوتا ہے۔ جیسے اس زمانہ میں دنیا کے مختلف ملکوں میں کافروں نے مسلمانوں کے ساتھ ظلم و بربریت کا بازار گرم کر رکھا ہے اور اس کو جہاد دفاعی کہتے ہیں۔ مِنَ الرِّجَالِ مَنْ بیانیہ ہے یہ تین قسم کے افراد ہیں: (۱) یہ بالغ افراد ہیں معذور اور ضعیف ہیں۔ (۲) وَالنِّسَآءِ عورتیں۔ (۳) وَالْوِلْدَانِ وِلْدَانِ: سے نابالغ بچے مراد ہیں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل ہے کہ میں اور میری والدہ مستضعفین میں سے تھے۔ وَالْوِلْدَانِ وِلْدَانِ: ولد کی جمع ہے اس میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں مشترک ہیں یا ولید کی جمع ہے تو پھر اس سے مراد غلام اور لونڈیاں ہیں البتہ پہلا قول بہتر ہے۔ وِلْدَانِ کے ذکر میں ان کے ظلم کی طرف اشارہ ہے کہ اتنے ظالم ہیں کہ معصوم بچوں کو بھی معاف نہیں کرتے۔ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا یہ مُسْتَضْعَفِيْنَ: کی صفت ہے۔ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا: قریہ سے مکہ مکرمہ مراد ہے الظالم اس کو صفت بحال متعلقہ کہا جاتا ہے اور اَهْلُهَا کو دو وجوہات ذکر کیا ہے: پہلا وجہ یہ ہے کہ کلام کو حقیقت پر محمول کرنا کیونکہ ظلم تو رہنے والوں کی صفت ہے۔ دوسرا وجہ یہ ہے کہ

ظلم کی نسبت (قریہ) بستی کی طرف کرنے سے مکہ مکرمہ کی توہین لازم آتی ہے اور ظلم سے مراد کفر شرک اور مسلمانوں کو مختلف قسم کی تکالیف پہنچانا ہے۔ یہ حکم مکہ مکرمہ کے علاوہ دیگر بستیوں کیلئے بھی ہے جہاں اس قسم کے حالات واقع ہو جائیں۔ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا: ولی سے مراد وہ شخص ہے جو ان کو ظالموں کے ظلم سے نجات دلائے اور ان کے دین اور نفسوں کی حفاظت کرے ان کیلئے ہجرت کا راستہ آسان کر دے۔ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا: مسلمانوں کی مدد سے ان کا تعاون وحمایت وغیرہ مراد ہے جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے فرمایا تھا کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ: بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ وَلِيًّا اور نَصِيْرًا میں مصدری معنی مراد ہے۔ یعنی وَلَايَةً وَنُصْرَةً اللہ تعالیٰ نے ان کی اس دعاء کو قبول فرمایا نیز نبی کریم ﷺ کی دعاء بھی ساتھ شامل ہوئی جیسا کہ (صحیح بخاری کتاب الاذان وکتاب الجہاد حدیث 3064 صحیح مسلم فی المساجد حدیث 186 - 277 میں وارد ہے) کہ فرض نماز میں رکوع سے اٹھنے کے بعد نبی اکرم ﷺ قنوت نازلہ پڑھتے تھے آپ نے اس میں مستضعفین کا نام لیتے ہوئے فرمایا: اے اللہ ولید بن ولید، سلمہ بن ہشام، عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہم کو نجات عطا فرما اور آپ کافروں کیلئے بددعاء کر رہے تھے۔ ان دعاؤں کو اللہ تعالیٰ نے شرف قبولیت دیا اور مکہ مکرمہ کو فتح فرمایا اور وہاں عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو (گورنر) امیر بنایا گیا اس نے مکہ مکرمہ کی مکمل حفاظت کی اور کافروں کے چنگل سے مسلمانوں کو نکالا اور ہر قسم کے ظلم کو مٹایا۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝ ''وہ لوگ جو ایمان لائے وہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں اور وہ لوگ جو کافر ہوئے وہ شیطان کے راستے میں لڑتے ہیں لہٰذا تم شیطان کے دوستوں سے لڑو یقیناً شیطان کا مکر انتہائی کمزور ہے''[76] ع

تفسیر 76 اس آیت میں بھی جہاد کی طرف ترغیب ہے اور ایک اور علت کا بھی ذکر ہے جو اصل مقصد میں مقابلہ کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ کافر طاغوت کا کلمہ بلند کرتے ہیں اور مؤمنین اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند کرتے ہیں لہٰذا اس مقصد کیلئے تم ضرور جہاد کرو۔ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ: طاغوت عام ہے انسی ہو یا جنی ہو مَعْبُوْدٌ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: اللہ کے سوا جس کی بندگی عبادت سمجھ کر کی جاتی ہو یا حاکم ہو اور سبیل سے یہاں ہر قسم کی بے دینی کفر شرک مراد ہے فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ: سابقہ مقابلہ پر (فا) برائے (تفریع) تشریح ہے۔ اولیاء سے مراد کفر، شرک اور ظلم کیلئے قتال کرنے والے ہیں اور یہ دلیل

ہے کہ طاغوت کیلئے قتال ونصرت کرنا شیطان کے ساتھ دوستی ہے۔ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا یہ مقدر عبارت کے ثبوت کیلئے دلیل ہے یعنی شیطان کے ساتھیوں سے مت ڈرو اس لئے کہ وہ اور اس کے ساتھی سب کمزور ہیں۔ کَیْدَ: امام رازی کا قول ہے کہ وہ تدبیر اور حیلہ جو کسی کو تکلیف دینے کیلئے خفیہ طور پر کیا جاتا ہے اس کو کَیْدَ کہتے ہیں۔ (سوال) سورۃ یوسف آیت 28 میں مذکور ہے کہ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ تمہارا کید فریب بہت بڑا ہے تو عورتوں کا کید تو شیطان کے کید سے زیادہ نہیں ہوسکتا ہے؟ (جواب) وہاں عورتوں کا کید مردوں کے مقابل مراد ہے جو کہ ان کے مقابل بڑا ہے اور یہاں شیطان کا کید جالِ اللہ تعالیٰ کے (کید) کے مقابل ہے جو یقیناً کمزور ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۭ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿٧٧﴾

"کیا آپ نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جن سے کہا گیا کہ تم روک رکھو اپنے ہاتھ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو پھر جب ان پر قتال فرض کر دیا گیا تو پھر ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے ڈرتا تھا اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی طرح یا اس سے بھی زیادہ ڈرنا اور انہوں نے کہا اے اللہ تو نے ہم پر قتال کیوں فرض کیا کیوں نہ ہمیں مہلت دی وقت قریب تک؟ فرما دیجئے دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے اور آخرت بہت بہتر ہے ان لوگوں کیلئے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا اور تم دھاگے کی مقدار بھی ظلم نہیں کئے جاؤ گے" [77]

تفسیر 77 اس آیت سے آیت 91 تک اس حصے کا دوسرا باب ہے اس حصہ میں منافقین کی آٹھ بری صفات اور ان پر دعیدیں مذکور ہیں جن کا تعلق رسول کریم ﷺ کی مخالفت سے ہے۔ یہ قباحتیں آیت 83 تک ذکر ہیں پھر اس کے بعد جہاد وقتال کی ترغیب اور اس پر ابھارنے کی دعوت ہے اور آدابِ قتال کا ذکر ہے اور مقصد جہاد وقتال کا ذکر ہے کہ وہ غلبہ توحید ہے آیت 87۔ پھر منافقین کی چار اقسام کا ذکر ہے وہ منافقین جو دار السلام کے باہر ہیں [1] ہجرت نہ کرنے والے۔ [2] جن سے معاہدہ ہوا ہو۔ (۳) جو قتال سے عاجز ہیں (۴) (مرکوس) فتنہ نفاق میں مبتلا۔ پہلے اور چوتھے قسم والوں سے قتال کا حکم ہے جبکہ دوسرے اور تیسرے قسم والوں سے قتال کا حکم نہیں ہے۔ (ربط) جہاد کی ترغیبات ذکر کرنے کے بعد اب ترک جہاد پر وعیدات کا ذکر ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ: اس کے سبب نزول میں

اختلاف ہے بعض مفسرین کا قول ہے کہ یہ ان مومنوں کے بارے میں نازل ہوئی کہ فرضیت جہاد کے بعد منافقین کی طرح سستی کرتے تھے اور بعض کا قول ہے کہ یہ منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے یہ دوسرا قول صحیح ہے کیونکہ يَخْشَوْنَ النَّاسَ اور لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ: یہ جملے قول ثانی کی تائید میں ہیں اور بعد والی آیتوں میں بھی منافقین کی واضح صفات نفاق کا بیان ہے قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ: یہ مکہ مکرمہ میں سب ایمان والوں سے کہا گیا تھا نیز مدینہ کے ابتدائی زمانے میں جب مسلمانوں کولڑنے کی قوت اور طاقت حاصل نہیں ہوئی تھی ایسے وقت میں دین کے دیگر امور میں مشغول ہونا چاہیے یعنی ادین کے فرائض کی پابندی کریں تاکہ جہاد کیلئے تیار ہوجائیں اسلئے بعد میں فرمایا کہ وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ وَءَاتُوا الزَّكَوٰةَ: اس میں دلیل ہے کہ جب انسان دین کا پورا تابع نہ ہوتو وہ جہاد بھی نہیں کرسکتا ہے کیونکہ پہلا جہاد نفس کے ساتھ ہے پھر جہاد کافروں کے ساتھ ہے فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ: جہاد کا حکم سورۃ بقرہ اور ان مدنی سورتوں میں ذکر ہے جو سورۃ نساء سے پہلے نازل ہوئی ہیں إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ: إِذَا برائے مفاجات ہے بمعنی اچانک یعنی ان کے ایمان کے دعوی سے تو یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ یہ اس طرح قتال سے منہ پھیر دیگے لیکن اچانک انہوں نے اسطرح کلام کیا۔ لفظ فریق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم سب مسلمانوں کو نہیں ہے بلکہ صرف منافقین کیلئے ہے۔ يَخْشَوْنَ النَّاسَ: خشیت سے مراد موت اور قتل سے ڈر ہے اور النَّاسَ سے مراد کافر ہیں یہ طبعی خوف نہیں ہے بلکہ منافقت اور بزدلی کا خوف ہے اسلئے یہ بہت بری صفت ہے۔ كَخَشْيَةِ اللَّهِ اس سے مراد وہ ڈر ہے جو تمام انسانیت بلکہ تمام مخلوقات میں طبعی طور پر موجود ہے جو موت سے یا عذاب الٰہی سے خوف ہے۔ عبارت میں تقدیری کلام ہے یعنی مِثْلَ خَشْيَتِهِمْ مِّنَ اللَّهِ: یا اس سے مراد مومنوں کا اللہ تعالیٰ سے خوف ہے اور عبارت میں مخفی عبارت اس طرح ہے مِثْلَ أَهْلِ خَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً اس کی ترکیب سورۃ بقرہ آیت 200 کی طرح ہے۔ أَوْ۔ بَلْ کے معنی میں ہے اور برائے ترقی ہے یا واؤ کے معنی میں ہے یا تنویع یعنی (قسموں) کیلئے ہے یعنی بعض تو اس طرح خوف کرتے ہیں جیسا کہ اللہ سے خوف کرنا چاہیئے اور بعض اس سے بھی زیادہ خوف کرتے ہیں۔ وَقَالُوا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ: امام قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ معاذ اللہ کہ کسی صحابی رسول سے اس طرح کلام ثابت ہوجائے اور (اس کے بعد امام قرطبیؒ نے صحابہ کرام کے اچھے اخلاق کا تذکرہ کیا ہے) لہٰذا یہ صفت منافقین کی ہے جو اللہ تعالیٰ پر اعتراضات کرتے ہیں۔ لَوْلَا أَخَّرْتَنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ: ان کے یہ دونوں اقوال مستقل اور الگ الگ ہیں اس لئے ان کو عطف کے ساتھ ذکر نہیں کیا ہے أَجَلٍ قَرِيبٍ سے موت کا وقت

مراد ہے۔زمخشری کا قول ہے کہ اس جملہ کا مقصد قتال سے رکنے کی مدت کو طول دینا ہے اور فرضیت قتال سے مہلت طلب کرنا چاہتے ہیں۔قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ: چونکہ قتال سے اعراض کرنا محبت دنیا کی وجہ سے ہے اسلئے اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ذلت وتحقیر ذکر کی اور دنیا کا تقابل آخرت کے ساتھ کیا۔مَتَاعٌ اس سے وہ تمام چیزیں مراد ہیں جن کے ذریعے سے دنیاوی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ قَلِيْلٌ یہ جلد زائل ہونے اور فنا ہونے کے اعتبار سے قلیل یعنی کم ہے۔امام قرطبیؒ کا قول ہے کہ قلیل اس لئے فرمایا کہ اس کی بقا نہیں ہے اور سورۃ توبہ آیت 38 میں بھی اس طرح ہے۔وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى امام آلوسیؒ نے لکھا ہے کہ آخرت سے اجر وثواب مراد ہے جو اچھے اعمال سے حاصل ہوتا ہے اور ان اعمال میں بڑا عمل قتال فی سبیل اللہ ہے۔خَيْرٌ یہ آخرت کی نعمتوں کی بقاء کے اعتبار سے ہے جیسا کہ سورۃ نحل آیت 96 میں ہے کہ (مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ) لِمَنِ اتَّقٰى: یعنی آخرت کی نعمتیں خصوصی طور پر تقویٰ سے حاصل ہوتی ہیں۔امام قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ اِتَّقَى الْمَعَاصِيَ: تمام گناہوں سے اجتناب کرنا نیز اس میں کفر شرک اللہ اور رسول کی مخالفت سب مراد ہیں۔وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا: ظلم سے اعمال کے ثواب میں نقصان مراد ہے یعنی تقویٰ کی وجہ سے اعمال بربادی سے محفوظ ہوتے ہیں۔

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۭ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۭ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ فَمَالِ هٰٓؤُلَاۗءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ۝ "تم جہاں کہیں بھی ہوگے موت تمہیں پالے گی خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہو اگر ان کو کوئی بھلائی پہنچے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر پہنچے ان کو برائی تو کہتے ہیں یہ آپ کی طرف سے ہے فرمادیجئے سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے تو کیا سبب ہے اس قوم کا کہ قریب نہیں ہیں کہ بات سمجھیں" [78]

تفسیر 78 یہ جملہ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ سے متعلق ہے یعنی تاخیر میں کوئی فائدہ نہیں اسلئے کہ موت سے نجات نہیں یا پھر جیسا کہ قتال سے اعراض کیلئے دو اسباب ہیں: پہلا سبب دنیا کی حرص ہے تو اس کی تردید اس کلام میں کی کہ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ: اور دوسرا سبب موت سے خوف تھا تو اس کے متعلق فرمایا کہ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ: چونکہ اس میں ہر ایک سبب مستقل ہے اسلئے دوسرے جملے کو پہلے والے پر عطف نہیں کیا ہے اور حدیث میں بھی قتال چھوڑنے کا سبب وَهْنٌ ذکر ہوا ہے جس کی تفسیر موت سے خوف اور دنیا سے محبت سے کی گئی ہے۔(ابوداؤد حدیث 4297 نسائی

حدیث 1338 احمد 5، 378 السلسلۃ الصحیحۃ حدیث 958، 500) اَیْنَمَا: کے لفظ میں عمومیت مکان ذکر کی ہے اور زمان کی عمومیت ذکر نہیں ہے اسلئے کہ تعمیم مکانی میں لازمی طور پر تعمیم زمانی آجائے گی (معنی یہ ہے کہ بندے کو جب کی جگہ موت آ پکڑے گی تو لازماً کوئی تاریخ دن تو ہوگا البتہ یہ لازم نہیں ہے کہ بندے کو فلاں تاریخ موت نے آ پکڑا تو لازمی نہیں کہ جگہ کی بھی تعیین ہوگی)۔ یُدْرِكْكُمُ ادراک پوری طرح گھیرنے اور احاطہ کرلے کو کہا جاتا ہے اس کی تفسیر سورۃ جمعہ آیت 8 میں ہے۔ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ بُرُوجٍ: برج کی جمع ہے اس میں ظہور کا معنیٰ ہے جیسا کہ سورۃ احزاب میں ہے کہ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ: لہٰذا بروج ان قلعوں کو کہا جاتا ہے جو دور سے نظر آتے ہیں اس مقام میں بہت اقوال ہیں: (۱) زمین کے قلعے بنگلے (۲) آسمانوں میں (۳) بروج السماء (۴) چاند کی منازل (۵) بڑے تارے، لیکن ان اقوال میں پہلا قول بہتر ہے۔ مُشَيَّدَةٍ: شید چونے سے تیار کی ہوئی یا بلند اور چوڑے کے معنی میں ہے وَلَوْ كُنْتُمْ لَوْ إِنْ کے معنی میں ہے یا وصلیہ ہے معلوم یہ ہوا کہ بروج کے بغیر تو تمہاری موت بہت ہی آسان ہے (اللباب)

وَإِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِنْدِكَ: اس میں منافقین کی ایک اور بری صفت کا ذکر ہے۔ حَسَنَةٌ عام ہے یعنی فتح، فراخی، سلامتی، امن خوشحالی، نعمت وغنا وغیرہ سب کو شامل ہے اور سَيِّئَةٌ بھی عام ہے بیماریاں، قحط، خوف، مہنگائی، غم، پریشانی، ساتھیوں کا قتل، شکست، فقیری وغیرہ "هَٰذِهِ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ: اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت بطور شکر نہیں ہے بلکہ رسول کی اتباع اور تاثیر کی نفی مقصود ہے یعنی ان کا کہنا یہ ہے کہ اس نعمت کا تعلق رسول کی اتباع سے اور اس کی آمد سے نہیں ہے بلکہ یہ نعمت فقط اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے" يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِنْدِكَ: یعنی یہ آپ کی نحوست کی وجہ سے ہے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے ان سے کہا تھا۔ سورۃ اعراف آیت 131 اور صالح علیہ السلام کی قوم نے بھی کہا تھا سورۃ نمل آیت 47 یا مراد یہ ہے آپ کی بے تدبیری سے ایسا ہوا۔ انکا کہنا تھا کہ یہ رسول تدبیر اور سیاسی امور کو نہیں جانتے اسلئے ہم پر شکست اور مصیبت آئی ہے۔ قُلْ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ: یہ ان باطل عقائد کا رد ہے اور صحیح بات کی طرف حق کی دعوت دی ہے کہ پیدا کرنے کے اعتبار سے ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے اور بطور تقدیر و قضاء اسی کے فیصلے چلتے ہیں۔ یہ اجمالی جواب ہے فَمَالِ هَٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثًا: اس میں منافقین کی ایک اور خصلت کا ذکر ہے یہ کلام مقام تعجب میں ہے یعنی تمام کاموں کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا تو ایک واضح بات ہے اور ان لوگوں کو اس میں بھی زیادہ جہل کی وجہ سے تردد ہے اور اس جملے میں ان کی جہالت کو مبالغہ کے طو

، پر ذکر کیا ہے جو کہ جہل کی انتہاء ہے یعنی سمجھنا تو انکی شان سے بہت دور ہے یہ جاننے کے قریب بھی نہیں جاتے جان لیتا تو ایک الگ ہی بات ہے۔ ان میں جاننے کی کوئی استعداد نہیں کیونکہ ان میں فقاہت ہی نہیں۔ دوسرا یہ ہے کہ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ استفہام علت کیلئے ہے اور وجود متقابل ثابت کرنے کیلئے لازم ہے یعنی سمجھداری کی قربت کیلئے کوئی راستہ نہیں ہے۔ حَدِيْثًا اگرچہ مبالغہ کیلئے نکرہ ذکر ہوا ہے لیکن مراد اس سے دین ہے جو اللہ کی طرف سے نازل کردہ قرآن وحدیث دونوں کو شامل ہے۔ یا اس سے مراد پہلی والی بات ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے حوادث یعنی ہر زمانہ کے حوادث اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں لیکن انہوں نے ابھی تک اصل حقیقی مالک کو پہچانا ہی نہیں۔ فقہ اس گہرے علم کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعے سے قرآن وسنت کے خصوصی راز نکالے جاتے ہیں اس لئے فقہ اجتہاد کو اور فقیہ مجتہد کو کہا جاتا ہے اور مقصد دین میں تفقہ حاصل کرنا ہے جیسا کہ سورۃ توبہ آیت 122 میں ہے۔ دلیل ہے کہ منافق ظاہری علم اور فہم حاصل کر سکتا ہے البتہ تفقہ سے محروم ہوتا ہے۔ فائدہ 1: منافقین سے تفقہ کی نفی بہت آیتوں میں مذکور ہے جیسا کہ سورۃ توبہ آیت 81، 87 اور 127، سورۃ فتح آیت 15، سورۃ حشر آیت 13 اور سورۃ منافقین آیت 3 اور 7 اور عام کافروں سے فقاہت کی نفی مندرجہ ذیل آیتوں میں ہے سورۃ انعام آیت 25 اور 65، سورۃ اعراف آیت 179، سورۃ انفال آیت 65، سورۃ اسراء آیت 46 اور سورۃ کہف آیت 57 اور قرآن کریم کی آیتوں کی تفصیل حصول فقاہت کیلئے ہوتی ہے جیسا کہ سورۃ انعام آیت 98 فائدہ 2: لفظ حدیث قرآن مجید میں 23 مرتبہ ذکر ہے۔ حدیث اس بات کو کہتے ہیں کہ جو نقل کی گئی ہے کبھی مطلق بات کو بھی کہتے ہیں جیسا کہ سورۃ نساء آیت 140، سورۃ انعام آیت 68، سورۃ لقمان آیت 6 اور سورۃ احزاب آیت 53 کبھی قصے کو بھی کہتے ہیں جیسا کہ سورۃ طٰہٰ آیت 9، سورۃ ذاریات آیت 24، سورۃ بروج آیت 17 کبھی نبی کریم ﷺ کی بات کو کہتے ہیں جیسا کہ سورۃ تحریم آیت 3 اور اکثر قرآن کریم کو اور حدیث رسول یعنی وحی الٰہی کو کہا جاتا ہے جو کہ بہت سی آیتوں میں مذکور ہے جیسا کہ سورۃ اعراف آیت 185، سورۃ کہف آیت 6، سورۃ زمر آیت 23، سورۃ جاثیہ آیت 6، سورۃ نجم آیت 59، سورۃ واقعہ آیت 81، سورۃ مرسلات آیت 50، سورۃ نساء آیت 87، سورۃ یوسف آیت 111 اور جمع کے صیغے کے ساتھ احادیث پانچ مرتبہ مذکور ہیں۔

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝ "جو تجھے کوئی بھلائی پہنچے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو تجھ کو کوئی مصیبت پہنچے وہ تیرے

نفس کی جانب سے ہے اور ہم نے تجھے لوگوں کیلئے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اللہ کافی گواہ ہے" [79]

تفسیر 79 اس خطاب میں دو قول ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ یہ خطاب نبی کریم ﷺ سے ہے البتہ مراد اس سے اُمت ہے، بہت مقامات پر قرآن مجید میں اس طرح ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ خطاب عام ہے یعنی جو بھلائی نیکی اچھائی تمہیں پہنچتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے" مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ: اللہ کے فضل کی وجہ سے ہے اس پر تمہارا کوئی حق واجبی نہیں البتہ اس خطاب میں نبی کریم ﷺ داخل نہیں" وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ: یعنی تیرے گناہ کی وجہ سے ہوتا ہے اور نفس سے مراد نفس اَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ: ہے وہ نفس جو گناہوں پر ابھارتا ہے۔ سوال: سابقہ آیت میں منافقین کا رد کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اس آیت میں ثابت کیا ہے کہ سَيِّئَةً انسان کے نفس کی طرف سے ہے؟۔ جواب ا: وہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نحوست کی نسبت تھی جو کفر کی نسبت تھی اور بطریقہ خلقت اللہ تعالیٰ کی طرف ہر چیز کی نسبت کرنی تھی جو درست ہے اور یہاں انسان کی طرف نسبت ظاہری طریقہ سے ہے جو گناہ کا ارتکاب کرتا ہے جیسا کہ سورۃ شوریٰ آیت 30 میں ذکر ہے۔ جواب ۲: مَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ: میں استفہام انکاری مقدر ہے۔ (جواب ۳) اس آیت کی ابتداء میں لفظ يَقُوْلُوْنَ مقدر ہے اور یہ فقاہت نہ ہونے کی تفصیل ہے" وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا: اس جملہ میں نبی کریم ﷺ کی بعثت کی عمومیت اور عظمت شان رسول ﷺ مذکور ہے اور منافقین کا رد ہے کیونکہ ان کی طرف نحوست کی نسبت کرتے ہیں جبکہ وہ سارے عالم کیلئے رسول بابرکت بن کر آئے ہیں اور ان لوگوں کا رد ہے جو نبی کی نبوت کو صرف عرب تک محدود تصور کرتے ہیں" وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا: اس میں منافقین اور دیگر منکرین رسالت کا رد ہے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی رسالت کی شہادت کیلئے کافی ہے کہ وہ صادق نبی اور رسول ہیں خواہ اس پر لوگ ایمان لائیں یا نہ لائیں ان کی رسالت پر شہادت بہت آیتوں میں ذکر ہے مثلاً سورۃ انعام آیت 19، سورۃ رعد آیت 42، سورۃ اسراء آیت 29، سورۃ عنکبوت آیت 52، سورۃ احقاف آیت 8، سورۃ فتح آیت 28

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝ "پس جس نے رسول کی اطاعت کی یقیناً اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور جو پھر گیا تو ہم نے آپ کو ان پر نگہبان نہیں بھیجا" [80]-

تفسیر 80: سابقہ آیت میں اثبات رسالت کا ذکر تھا جبکہ اس آیت میں استحکام رسالت کا ذکر ہے اور ان کی رسالت کا حق بیان ہوا کہ ان کی اتباع کرنا اصل حق ہے۔ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ: سبب یہ ہے کہ رسول کی اطاعت

رسالت کی وجہ سے ہے اور قاصد (رسول) کی بات مُرسل بھیجنے والی کی بات ہوتی ہے۔ دوسری تعبیر یہ ہے کہ رسول جو بھی بات کرتا ہے وہ وحی الٰہی ہوتی ہے جیسا کہ "وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰی اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی: سورۃ نجم آیت 3۔ جبکہ وحی تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے ان وجوہات کی بناء پر اللہ کی اطاعت رسول کی اطاعت نہیں کہلائے گی اسلئے اس طرح نہیں فرمایا کہ" وَمَنۡ یُّطِعِ اللّٰهَ فَقَدۡ اَطَاعَ الرَّسُوۡلَ: لفظ رسول میں اشارہ ہے کہ یہ صفت اور شان ہر نبی اور رسول کو حاصل ہے اور لفظ رسول میں اس حکم اور علت کی طرف اشارہ ہے "وَمَنۡ تَوَلّٰی فَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ: مِنۡ کی جزا مقدر ہے یعنی "مَنۡ تَوَلّٰی فَأَعۡرِضۡ عَنۡهُ: سورۃ نجم آیت 29 کے قرینہ سے ثابت ہوتا ہے کہ فَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ: جزاء کیلئے علت ہے عَلَیۡهِمۡ حَفِیۡظًا: امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا ان کے اعمال کی حفاظت کرنے اور حساب کرنے والا۔ حَافِظًا: اسلئے نہیں فرمایا کہ فقط حفاظت میں احکام کی تبلیغ داخل ہے اسلئے کہ اس کی وجہ سے گناہوں سے اور غضب الٰہی سے بچاؤ ہوتا ہے لہٰذا وہ رسول کی صفت ہوسکتی ہے اور نبی سے حفاظت کی نفی قتال سے منافی نہیں ہے اسلئے یہ آیت قتال کی آیت سے منسوخ نہیں ہے۔

وَیَقُوۡلُوۡنَ طَاعَةٌ ۫ فَاِذَا بَرَزُوۡا مِنۡ عِنۡدِكَ بَیَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنۡهُمۡ غَیۡرَ الَّذِیۡ تَقُوۡلُ ؕ وَاللّٰهُ یَكۡتُبُ مَا یُبَیِّتُوۡنَ ۚ فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ وَتَوَكَّلۡ عَلَی اللّٰهِ ؕ وَكَفٰی بِاللّٰهِ وَكِیۡلًا ۝ "اور وہ کہتے ہیں ہماری ذمہ داری تو آپ کی اطاعت ہے پھر وہ جب آپ کے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ رات کو اس کے خلاف مشورہ کرتا ہے جو آپ کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ لکھتا ہے جو وہ رات کو مشورہ کرتے ہیں لہٰذا آپ ان سے اعراض کریں اور اللہ تعالیٰ پر توکل کریں اور اللہ تعالیٰ کاموں کا پورا کارساز ہے" [81]

تفسیر 81 اس آیت میں منافقین کی اور قباحتوں اور برائیوں کا ذکر ہے طَاعَةٌ اس کا مبتدا مقدر ہے یعنی اَمۡرُنَا وَشَانُنَا طَاعَةٌ: یا اس کی خبر مقدر ہے یعنی مِنَّا طَاعَةٌ: اور مقدر عبارت اس طرح ہے: اِذَا كَانُوۡا عِنۡدَكَ یَقُوۡلُوۡنَ جب آپ کے پاس ہوتے ہیں تو اس طرح کہتے ہیں "فَاِذَا بَرَزُوۡا مِنۡ عِنۡدِكَ بَیَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنۡهُمۡ: یعنی جب آپ کی مجلس سے نکل جاتے ہیں تو مشورے کرتے ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ اور دیگر مفسرین نے بَیَّتَ کے بہت معانی ذکر کئے ہیں یعنی جھوٹ بناتے ہوئے اسے مزین کر دینا، تحریف کرنا بدلنا اور رات کو چہ مگوئیاں کرنا اس معنی کی تائید آگے آیت 108 میں مذکور ہے طَآئِفَةٌ مِّنۡهُمۡ: اس میں اشارہ ہے کہ ایک اور طائفہ ایسا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی ذرہ برابر بھی نافرمانی نہیں کرتا" غَیۡرَ الَّذِیۡ تَقُوۡلُ: تَقُوۡلُ میں دو قول ہیں: پہلا یہ ہے کہ یہ مخاطب کا صیغہ ہے اور خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سے ہے اور مراد نبی کریم ﷺ کے أوامر، نواہی اور سنت نبوی ہے اور غیر سے مراد خلاف سنت اعمال شرک، کفر، بدعات اور فسق وفجور ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ تَقُوْلُ مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور اس میں ضمیر طَائِفَةٌ کی طرف راجع ہے اور قول سے مراد طَاعَةٌ ہے اور غیر سے معصیت مراد ہے۔ وَاللّٰهُ یَكْتُبُ مَا یُبَیِّتُوْنَ: یَكْتُبُ سے ملائک کا صحیفوں میں لکھنا مراد ہے یا مراد قرآن مجید یعنی کتاب میں نازل کرنا ہے جس میں نبی کریم ﷺ کو خبر دینا مقصود ہے۔ امام قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ یہ آیت دلیل ہے کہ صرف قول یعنی زبانی دعویٰ بلا عمل کوئی فائدہ نہیں دیتا ہے۔ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ امام ضحاک کا قول ہے کہ بیان اور وعظ کے وقت ان کے نام مت لینا ورنہ وہ دشمنی شروع کرلینگے۔ مفسر ابوحیانؒ نے لکھا ہے کہ دل میں بھی ان سے انتقام لینے کا مت سوچو۔ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ: یہاں پر توکل کا حکم دینے سے مراد توکل پر ہمیشگی اختیار کرنا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ان کے شر سے اللہ تعالیٰ تمہیں بچائے گا لہٰذا اس پر اعتماد اور بھروسا کرتے ہوئے اپنا آپ اسی کو سونپ دو۔ یہ آداب تمام منافقین کے متعلق ہیں اور ہر وقت استعمال کرنے پڑتے ہیں لہٰذا یہ قتال کی آیتوں سے منسوخ نہیں ہے۔ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِیْلًا'' یہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کی تخصیص کیلئے علت ہے۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا ﴿۸۲﴾ ''کیا انہوں نے قرآن میں (تدبر) غور وفکر نہیں کیا اگر یہ قرآن ہوتا کسی اور کی جانب سے تو ضرور اس میں وہ اختلاف بہت زیادہ پاتے'' [82]

تفسیر 82 (ربط ۱) امام آلوسیؒ نے لکھا ہے کہ گویا یہ سوال وجواب کی صورت میں ہے یعنی جب نبی اکرم ﷺ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے صادق ہونے کی شہادت دی تو سوال پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی شہادت کس طرح معلوم ہوسکتی ہے تو جواب ہوا کہ ''اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ: یعنی اس نبی کی صدق وسچائی قرآن کریم میں غور وفکر کرنے سے معلوم ہوگی اسلئے کہ قرآن کریم کے صادق ہونے سے بلاشبہ صدق القرآن مستلزم ہے صدق رسول کے لئے۔ (ربط ۲) جب منافقین کی قباحتوں سے پتا چلا کہ وہ نبی کریم ﷺ اور قرآن مجید پر ایمان نہیں رکھتے تو اب انہیں دعوت دی جاتی ہے کہ قرآن مجید میں تدبر کرو تو رسول کی سچائی پر تمہیں دلائل حاصل ہوں گے۔ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الخ اس جملہ میں منافقین کیلئے وعید ہے اور ان کے ایک قبیح عمل کا ذکر ہے کہ وہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یوں نہیں فرمایا کہ ''اَفَلَا یَقْرَءُوْنَ وَیَتْلُوْنَ: اس لئے کہ قرآن مجید کی قراءت اور تلاوت تو کرتے تھے جیسا کہ خوارج کے متعلق تفصیلی روایت میں ہے صحیح بخاری کتاب المناقب حدیث 3610 میں ہے کہ یَقْرَءُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَا یُجَاوِزُ تَرَاقِیَهُمْ یعنی قرآن کی تلاوت کرینگے مگر ان کے حلق سے

نیچے نہیں اتریگا۔ معلوم ہوا کہ اصل مقصد قرآن میں تفکر اور تدبر ہے۔ اسی طرح سورۃ محمد آیت 24 میں منافقین کی صفت میں آیا ہے اور سورۃ مؤمنون آیت 68 میں مشرکین کی صفت میں مذکور ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ان دلائل سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید میں تدبر واجب ہے تاکہ اس کے معنی اور مقصد تک رسائی حاصل ہو۔ اور ان لوگوں کا قول فاسد ہے جنہوں نے کہا کہ صرف منقول تفسیر پر اکتفا کرنا چاہئے جو صرف نبی کریم سے منقول ہو۔ ابو حیان رحمہ اللہ کا قول ہے کہ مذکورہ اقوال روافض کے ہیں، میں راقم الحروف کہتا ہوں کہ تفسیر منقول مقدم ہے اور بالتدبر اس سے متوخر ہے البتہ دونوں ضروری ہیں۔ اور قرطبی، زمخشری وغیرہ کا قول ہے کہ یہ آیت دلیل ہے کہ تقلید باطل ہے اور غور وفکر اور استدلال واجب ہے اور تقلید باطل ہے دینی معارف حاصل کرنا لازمی ہے اور قیاس کرنا بھی درست ہے البتہ امام آلوسی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ قیاس اصولی اور اصطلاحی کیلئے یہ آیت دلیل نہیں ہو سکتی ہے۔ فَلَا میں (فا) عاطفہ ہے اور معطوف علیہ مقدر ہے یعنی أَيَشُكُّونَ فِي شَهَادَةِ اللهِ فَلَا يَتَدَبَّرُونَ: کیا وہ اس رسول کی نبوت کی سچائی میں شک کرتے ہیں اور قرآن مجید میں غور وفکر نہیں کرتے یا اس طرح ہے أَيُعْرِضُونَ عَنِ الْقُرْآنِ فَلَا يَتَدَبَّرُونَ: قرآن سے منہ پھیر لیتے ہیں اور غور وفکر نہیں کرتے تدبر اور تأمل کسی چیز کے اجزاء، اسباب اور آثار میں غور وفکر کے ذریعے سے اس چیز کے انجام میں تامل کرنے کا نام ہے قرآن کے تدبر میں سب سے پہلے معنی کا علم حاصل کرنا داخل ہے، اَلْقُرْآنَ۔ مفسر ابن عاشور کا قول ہے کہ قرآن میں تدبر کی دو قسمیں ہیں: پہلی قسم یہ ہے کہ آیتوں کا اپنے مقاصد شریعہ پر تفصیلی دلالت کرنے میں غور وفکر کیا جائے اور ان میں احکام، لطائف الخفیہ اور حکمتیں جان لی جائیں۔ دوسری قسم یہ ہے کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے اجمالی دلالت میں غور کیا جائے کہ یہ اللہ تعالی نے نازل کیا ہے اور سچائی پر مبنی کتاب ہے۔ البتہ طرز بیان سے پہلے والی قسم کی ترجیح ثابت ہوتی ہے یعنی اگر ان منافقین اور دیگر مخالفین قرآن نے، قرآن کی ہدایات اور رہنمائی میں غور کیا تو یہ لوگ جان لینگے کہ اس میں بہت خیر ہے اور نفاق کی بیماری سے بھی نجات حاصل کر لینگے۔ فائدہ: بغیر معنی جاننے کے تلاوت قرآن میں اجر ہے یا نہیں؟ اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے اس میں سے کچھ تفصیل میں نے تنشیط الاذہان کے مقدمہ میں لکھی ہے وہ مطالعہ کریں؛ میرے علم کے مطابق اگر کوئی شخص صرف تلاوت قرآن کرتا ہے مگر ترجمہ فہم قرآن کی طرف توجہ نہیں کرتا اور اسے ضروری بھی نہیں سمجھتا ہے تو اس تلاوت میں ثواب نہیں ہے البتہ اگر تلاوت کرتا ہے غور وفکر کرنے کی بھی سعی کرتا ہے لیکن ابھی اس میں کامیاب نہیں ہوا ہے اور صرف تلاوت کو کافی نہیں سمجھتا ہے تو ایسے شخص کیلئے ثواب کی امید ہے۔ وَلَوْ

كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ اس جملے میں دو احتمال ہیں: پہلا احتمال یہ ہے کہ گزرے ہوئے استفہامیہ جملہ پر عطف ہے۔ یعنی پہلے جملے میں عام تدبر کی ترغیب تھی تو اب عام سے خاص جزوی تدبر کی دعوت ہے تاکہ قرآن کی سچائی اس پر واضح ہوسکے یعنی ذکر عام کے بعد ذکر خاص ہے جو خاص کے اہتمام کی وجہ سے ہے دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ سارا جملہ اَلْقُرْاٰنَ سے محل حال میں واقع ہے اور یہ تدبر کیلئے قید ہے یعنی یہ لوگ قرآن مجید میں اس حوالے سے غور نہیں کرتے کہ اگر یہ اللہ تعالیٰ کے ماسوا کسی اور کی جانب سے ہوتا تو اس میں اختلاف پاتے لہٰذا جب اس میں اختلاف نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ ہی کی نازل کردہ کتاب ہے۔ البتہ اس میں پہلا احتمال بہتر ہے اسلئے اس طرح سورۃ محمد آیت 24 میں ہے مگر اس میں یہ قید نہیں ہے۔ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا: فِیْهِ میں ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے۔ ابو حیان رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ حجت نظری ہے وجہ یہ ہے کہ جب انسان گفتگو کرتا ہے اور کلام میں طویل زمانہ گزر جائے تو اس کلام میں ضرور اختلاف آتا ہے یا تو وصف کے اعتبار سے (بعض اوقات انتہائی بلیغ جملے استعمال کرتا ہے اور بعض اوقات (متوسط) درمیانہ اور بعض اوقات بالکل ساقط گفتگو کرتا ہے) بعض اوقات اس کی باتوں میں تضاد آتا ہے یا بعض اوقات جس چیز کی خبر دیتا ہے تو اس میں اس سے جھوٹ یا غلطی ثابت ہوتی ہے یا پھر اس کا مقابلہ ممکن ہوتا ہے باقی رہا قرآن مجید تو اس میں اس قسم کی کوئی غلطی معنوی ہو یا لفظی یا تضاد، کذب و خطاء غلطی وغیرہ بالکل نہیں ہے۔ ابن عطیہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اگر کسی شخص کو قرآن کریم میں کوئی غلطی، شک شبہ محسوس ہو تو اپنی فکر فہم کو ملامت کرے یا جھٹلائے اور کسی عالم قرآن کی طرف رجوع کرے اور اس سے سمجھ حاصل کرے۔ زجاج نے فرمایا کہ فِیْهِ ضمیر منافقین کی باتوں کی طرف راجع ہے۔ اس جملہ میں بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ: اور دیگر مخفی خبریں جن میں کسی قسم کا جھوٹ نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ یہ قرآن عالم الغیب کی طرف سے نازل ہوا جو کہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔ (سوال) قرآن کریم کی قراءتوں میں بہت اختلاف ہے اور معانی پر دلالت کے طریقوں میں اختلاف ہے۔ جیسے دلالۃ النص عبارۃ النص، اشارۃ النص، اقتضاء النص وغیرہ جو مختلف طریقوں پر واقع ہے؟ (جواب) امام قرطبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہاں پر اختلاف سے تناقض اور تفاوت مراد ہے جو ابو حیان کے قول میں گزرا ہے۔ امام ابوبکر جصاص کا قول ہے کہ اختلاف کی تین قسمیں ہیں: (۱) طریقہ تناقض ہے کہ ایک سمت میں جو معنیٰ اور عمل ثابت ہوتا ہو تو دوسرے طریقے سے اس کا معنیٰ برعکس ہو یعنی اس کی نفی ہو جو بالکل متقابل ہو۔ (۲) دوسرا طریقہ بلاغت و فصاحت میں ہے کہ ایک بہت بلیغ و فصیح کلام ہو جبکہ دوسرا اس کے برعکس ہو۔

(3) تیسرا اختلاف تلاوم کا ہے یعنی سارا کلام حسن اور صدق میں برابر ہو جیسا کہ قراءت کا اختلاف ہے جو حسن کلام اور مقصد قرآن میں کوئی نقصان پیدا نہیں کرتا یہاں پر پہلی والی دو قسمیں مراد ہیں یعنی قرآن میں تناقض اور تفاوت نہیں ہے جس سے خطا اور غلطی کے ساتھ تعبیر ہوسکے ہر وہ کتاب جو قرآن کریم کے ماسوا کسی نے تصنیف کی ہو اور خصوصاً جب طویل وقت میں لکھی گئی ہو تو اس میں تناقض اور تفاوت یقینی ہے۔ قاسمی نے کہا ہے کہ اس آیت میں کتابوں کے مصنفین کیلئے عذر ہے کہ ان سے غلطیاں ضرور ہوں گی اسلئے کہ غلطیوں سے پاک وسلامتی والی کتاب صرف قرآن کریم ہے۔ سوال: لفظ كَثِيْرًا کا مطلب یہ ہے کہ زیادہ اختلاف نہیں ہے تو کم لازمی ہوگا؟۔ جواب ۱: ابن عاشور نے لکھا ہے کہ کثیر کی قید ممتنع کی جانب میں ہے لفظ لَوْ کے ذریعے سے یعنی اثبات کی جانب میں، اصل کی نفی اختلاف کا فائدہ دیتا ہے۔ یعنی یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جواب ۲: صاحب اللباب نے لکھا ہے کہ یہ قید احترازی نہیں ہے بلکہ قرآن مجید عظیم کتاب ہے اور بہت سارے علوم پر مشتمل ہے لہٰذا اگر اس میں غلطی ہوتی تو بہت زیادہ ہوتی جب کہ زیادہ غلطی تو دور کی بات ہے تھوڑی بھی نہیں تو معلوم ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے (جواب ۳) اختلاف کی قسمیں ذکر ہوگئیں یعنی (۱) فصاحت و بلاغت (۲) سچائی اور عدم سچائی میں (۳) فاسد اور صحیح معنی میں (۴) تناقض (ٹکراؤ) میں (۵) تفاوت وغیرہ میں تو یہ اختلاف کی بہت ساری اقسام ہیں ان میں سے کسی میں بھی اختلاف نہیں پایا جاتا ہے تو ان اقسام کی کثرت کی وجہ سے کثیر کہا گیا ہے۔

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٨٣﴾

"جب ان کے پاس کوئی خبر امن یا خوف کی آتی ہے تو اسے مشہور کردیتے ہیں اگر وہ اسے لوٹائیں رسول ﷺ کی طرف اور اپنے میں سے اصحابِ امر کی طرف تو جان لیتے اس کی حقیقت کو وہ لوگ جو ان میں سے اس کی تحقیق کرتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہوتا اور اس کی رحمت تم پر تو ضرور تم شیطان کے پیچھے لگ جاتے مگر تھوڑے سے" [83]

تفسیر 83 اس آیت میں منافقین کے ایک اور غلط عمل کو ذکر کیا گیا ہے اور وہ ہے بلا تحقیق سنی ہوئی باتوں کو عام کرنا۔

ربط 1: بقول امام آلوسی رحمہ اللہ اس میں سوال کا جواب ہے جو اس جملہ سے پیدا ہوتا ہے لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا؛ وہ اس طرح کہ منافقین اور بعض کمزور فہم والے مؤمنین نبی کریم ﷺ سے کوئی بات سن لیتے جو بعض شروط وقیود

کے تحت ہوتی تھی لیکن وہ اسے بلا شروط و قیود پھیلا دیتے جس سے خلاف واقع معاملہ ہو جاتا تو اس آیت میں سوال پیدا ہوا کہ یہ تو وحی الٰہی میں اختلاف واقع ہوا تو اس آیت میں جواب ہوا کہ کسی خبر کو پھیلانے میں تمام شروط و قیود کی مکمل تحقیق کرنی چاہئے۔ ربط 2: یہ يَقُولُونَ طَاعَةٌ پر معطوف ہے اور درمیان میں جملہ معترضہ ہے یعنی ایک طرف تو انکا اطاعت رسول کا دعویٰ ہے لیکن دوسری جانب خبریں پھیلاتے ہوئے نبی کی طرف رجوع نہیں کرتے'' وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ: ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ جہاد کیلئے سریہ بھیج دیتے کبھی فتح ہوتی یا شکست دونوں صورتوں میں منافقین بے بنیاد خبریں پھیلا دیتے تھے بغیر کسی تحقیق کے۔ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ بعض مفسرین نے نبی کریم ﷺ کے طلاق کی خبر کا بھی ذکر کیا ہے جس کے متعلق ان منافقین نے بے بنیاد افواہیں پھیلائی تھیں حالانکہ نبی کریم ﷺ نے طلاق نہیں دی تھی۔ اَلْأَمْنِ سے مؤمن کی کامیابی مال غنیمت کا حصول اور فتح وغیرہ مراد ہے اور خوف سے سریہ کی عارضی شکست اور مغلوب ہونا مراد ہے منافقین کا طرز عمل یہ تھا کہ فتح کامیابی اور امن کی خبر کو توہین وتحقیر کے انداز میں پیش کرتے تھے اور اس انداز میں بیان کرتے کہ مؤمنین خوش نہ ہوں اور خوف کی خبر اس انداز میں پیش کرتے اور پھیلاتے تھے جس پر مومنین میں خوف وہراس پھیل جائے اور لوگ اسلام سے بدظن ہو جائیں۔ امام آلوسیؒ نے فرمایا کہ اس آیت میں بلا تحقیق بات کرنے پر وعید وتنبیہ ہے۔ (اور صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ حدیث 1064 صحیح ابوداؤد حدیث 4992 کی روایت میں ہے)۔ کہ كَفَىٰ بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَوْ إِثْمًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ۔ ایک انسان کے گناہ گار یا جھوٹا ہونے کیلئے یہ بات کافی ہے کہ ہر سنی ہوئی بات کو پھیلاتا ہے۔ امام رازی نے فرمایا کہ اس قسم کی بات کو نشر کرنے میں فساد کی بہت ساری وجوہات ہیں۔ فائدہ: امام جصاص اور رازی نے لفظ امن اور خوف کو دیگر احکام شریعہ کیلئے عام مانا ہے یعنی امن سے جواز، ثواب کے امور مراد ہیں اور خوف سے ناجائز اور گناہ کے امور مراد ہیں۔ أَذَاعُوا بِهِ لفظ إِذَاعَتْ مُتَعَدِّيٌ بِالْوَاسِطَةِ اور مُتَعَدِّيٌ بِلَا وَاسِطَةٍ دونوں طرح استعمال ہوتا ہے اور کسی نے کہا ہے کہ یہاں پر أَذَاعُوا یہاں پر تَحْدِيثِ۔ یعنی خبر دینے کے معنی کو متضمن ہے حرف (با) کے ساتھ مُتَعَدِّيٌ کیا گیا ہے اور بِهِ کی ضمیر امر کی طرف راجع ہے۔ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ: اس میں لوگوں کو تعلیم دی جاتی ہے کہ آداب اختیار کرو خصوصاً ان حالات کے وقت جن کے متعلق رسول اللہ ﷺ اور بڑے بڑے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف رجوع کرنا ضروری ہو کہ حقیقت اور حکم معلوم ہو جائے۔ رَدُّوهُ سے مراد نبی کریم ﷺ ہے ان کی بات کی طرف رجوع کرنا مراد ہے۔ اَلرَّسُولُ اگر امن اور

خوف سے دیگر احکام شرعیہ مراد ہوں تو حیات طیبہ میں ذات رسول مراد ہے اور وفات کے بعد سنت رسول ﷺ مراد ہے اور یہ تفصیل فَرُدُّوهُ الخ میں گزر چکی ہے۔ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ: اس سے اصحاب الرائی صحابہ رضی اللہ عنھم مراد ہیں جو ان امور پر نظر رکھتے تھے اور آئندہ اہل علم بھی اس میں داخل ہیں جیسا کہ گزر چکا ہے۔ لفظ مِنْهُمْ میں اشارہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم اس صفت میں ایک جیسے نہیں تھے علم بصیرت عقل میں بعض اعلیٰ درجہ پر تھے اور بعض کم درجہ پر تھے جبکہ درجہ صحابیت میں سب یکساں تھے۔ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ: لَعَلِمَهُ میں ضمیر امر کی طرف راجع ہے اور علم سے آنے والے واقعے کی خبر مراد ہے کہ وہ پھیلانے کے قابل ہے یا نہیں، سچائی پر مبنی ہے یا پروپیگنڈا ہے۔ يَسْتَنْبِطُونَهُ: استنباط نبط سے لیا گیا ہے۔ زمین سے پہلی بار پانی نکالنا یعنی پانی تو ہے مگر ہر آدمی اس تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا ہے جب تک کنواں بنا کر اس سے پانی نہ نکالے لہٰذا ایسے کاریگر جو بورنگ کھدائی وغیرہ کر سکتے ہوں یا زمین دانوں کو نبط کہا جاتا ہے۔ لہٰذا استنباط میں اپنے اجتہاد کے ذریعے سے نص قرآنی یا حدیث نبوی سے کسی مسئلہ کا حکم نکالنا ہوتا ہے اس لئے مجتہد کو مستنبط اور اجتہاد کو استنباط کہتے ہیں یہاں پر معنیٰ ہے کہ یہ ماہرین اپنے علم، عقل اور تدبیر سے اس آنے والی خبر کا حل نکال لیتے ہیں کہ یہ اشاعت یعنی پھیلانے کے قابل ہے یا نہیں۔ عکرمہ کا قول ہے کہ استنباط کا معنیٰ اس کی حرص اور اس کے بارے میں سوال کرنا ہے۔ ضحاک کا قول ہے کہ تَتَبُّع (تفتیش) کو استنباط کہتے ہیں۔ پہلے معنیٰ کے اعتبار سے مجتہدین سے صحابہ کرام مراد ہیں اور "مِنْهُمْ الَّذِينَ" کیلئے صفت ہے یعنی وہ ان کی جنس سے ہیں اور دوسرے اور تیسرے معنیٰ کے اعتبار سے مجتہدین سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی مراد ہو سکتے ہیں اور یہ بھی احتمال ہے کہ مذکورہ منافقین مراد ہوں یعنی جان لیتے وہ منافقین اس بات کی حقیقت کو جس کے وہ تعاقب میں لگے ہوئے تھے اور اس کے متعلق سوالات کرتے تھے۔ اور مِنْهُمْ کی ضمیر أُولِي الْأَمْرِ کی طرف راجع ہوتی ہے یعنی أُولِي الْأَمْرِ سے سوال کرتے ہیں (اللباب)

فائدہ 1: امام رازی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس آیت سے قیاس اور اجتہاد کا وجوب ثابت ہوا کیونکہ بعض احکام شریعہ نصوص میں موجود ہونگے لیکن ان کا عام ادراک استنباط و اجتہاد سے حاصل ہوگا البتہ جو مسائل و احکام شریعہ نصوص میں واضح موجود ہیں ان میں تو قیاس و استنباط کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی تفسیر میں اس کی مزید وضاحت کی ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جہاں نص و اجماع نہ ہو تو اس مسئلہ میں اجتہاد کیلئے یہ آیت دلیل ہے۔ فائدہ 2: اس آیت میں اگرچہ احکام شریعہ کیلئے استنباط کا ذکر ہوا ہے مگر صحیح بات یہ ہے کہ کئی وجوہات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ آیت جنگی امور کے

ساتھ خاص ہے۔ پہلا سبب یہ ہے کہ لفظ أمن اور خوف شرعی امور میں کبھی جائز اور ناجائز کیلئے استعمال نہیں ہوا ہے لہٰذا یہ بعید احتمال ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ احکام شریعہ سے متعلق اس سورۃ میں گزر گیا ہے کہ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ آیت 59۔ وہاں أُولِي الْأَمْرِ کو اختلاف کے وقت خارج کیا گیا ہے صرف اللہ و رسول کی طرف رجوع کا حکم ہے اور یہاں پر فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ نہیں فرمایا تو معلوم ہوا کہ جنگوں سے متعلق امور محسوسہ مراد ہیں۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ آیت میں ضمائر کا استعمال ہوا ہے اور وہ عمومیت پر استدلال نہیں کرتے ہیں۔ جیسا کہ آیت 64 میں گزرا ہے۔ چوتھا سبب یہ ہے کہ علماء اصولیین نے کہا ہے کہ قیاس گمان وظن کا فائدہ دیتا ہے اور اس آیت سے علم معلوم ہوتا ہے تو معلوم ہوا کہ اس سے قیاس واستنباط احکام شرعیہ مراد نہیں ہیں البتہ اگر ظن پر علم کا اطلاق درست ہو جائے تو پھر جائز ہے کہ قیاس کو علم کہا جائے۔ نیز یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ بعض افراد کو اللہ تعالیٰ صفت استنباط دیتا ہے البتہ احکام شرعیہ میں استنباط اور اجتہاد کیلئے دیگر نصوص موجود ہیں۔ (سوال) امام رازی اور امام جصاص نے لکھا ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عام آدمی کیلئے حوادث یعنی نئے واقع ہونے والے مسائل میں علماء کی تقلید کر لی چاہئے لہٰذا ثابت ہوا کہ تقلید واجب ہے؟۔ جواب ۱: اس آیت سے مسائل شرعیہ میں تقلید کا احتمال بہت بعید ہے پہلے یہ وضاحت گزر گئی ہے۔ جواب ۲: اس آیت سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ کسی عالم سے غیر منصوص مسائل میں سوال کرنا جائز ہے اور یہ حوادث کی بات ہے لیکن مذہب یا شخص کی تقلید نہ اس سے اور نہ ہی کسی اور نص سے ثابت ہے۔ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا: اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحمت تو کئی قسم پر ہے یعنی دینی، دنیاوی عام وخاص۔ اس جملہ میں ترغیب ہے اس حکم کی طرف جو لَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ الخ میں بیان ہوا یعنی اس طریقے کو اختیار کرنے سے اللہ تعالیٰ کا فضل ورحمت حاصل ہوتی ہے اور شیطان کے اتباع سے بچاؤ حاصل ہوتا ہے۔ سوال: إِلَّا قَلِيلًا استثناء کا تقاضا ہے کہ یہ تھوڑے لوگ تبعاً

کیلئے اللہ تعالیٰ کے فضل ورحمت کے محتاج نہیں ہیں حالانکہ نصوص سے یہ بات ثابت ہے کہ بغیر اللہ تعا

کرام بھی شیطان سے بچ نہیں سکتے۔ جواب: صاحب اللباب نے اس کی تین وجوہ بیان کی ہیں پہلی:

سے اسلام اور رحمت سے آخری نبی کی بعثت مراد ہے اور یہ استثنا اتَّبَعْتُمْ سے نہیں

کے موحدین ہیں جنہوں نے نبی اکرم کی بعثت سے قبل اپنے آپ کو کفر اور شرک

أبَادِي، زید بن عمرو بن نفیل، ورقہ بن نوفل اور دیگر وہ لوگ جو عیسیٰ علیہ السلام کے د

استثناء اَذَاعُوْا سے ہے۔ تیسری توجیہ یہ ہے کہ استثناء لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ الخ کے فاعل سے ہے۔ چوتھی توجیہ یہ ہے کہ یہ لَوَجَدُوْا کے فاعل سے استثناء ہے۔ پانچویں توجیہ یہ ہے کہ استثناء ضمیر مجرور عَلَيْكُمْ سے ہے اس کی تاویل پہلی وجہ کی طرف راجع ہے۔ چھٹی توجیہ یہ ہے کہ یہ استثناء مصدر سے ہے جس پر اس مصدر کا فعل دلالت کرتا ہے۔ اِتَّبَعْتُمْ یعنی اِتِّبَاعًا قَلِيْلًا: یہ زمخشری کا قول ہے۔ ساتویں توجیہ یہ ہے کہ یہ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ سے استثناء کیا گیا ہے اور اس کی تاویل تیسری توجیہ کی طرح ہے۔ آٹھویں توجیہ یہ ہے کہ لفظ قَلِيْلَ سے مراد عدم ہے یعنی نہ ہونا۔ یعنی کبھی قلت عدم کے معنی میں آتا ہے یہ ابن عطیہ اور طبری رحمہم اللہ کا قول ہے۔ نویں توجیہ لَاتَّبَعْتُمْ میں سارے انبیاء علیہم السلام کے مسلمان تبعین سے خطاب ہے اور قَلِيْلَ سے صرف محمد ﷺ کی امت مراد ہے لیکن یہ قول ضعیف ہے۔ اول توجیہ میں دو مزید توجیہات ہیں جس کو ابو مسلم اصفہانی نے ذکر کیا ہے۔ (۱) پہلا یہ کہ فضل اور رحمت سے مراد پے در پے نعمتیں اور امداد الٰہی ہے اور خطاب منافقین سے ہے کہ یہ منافقین اللہ تعالیٰ کے پے در پے نعمتیں فتح و نصرت کی وجہ سے ظاہراً شیطان کی پیروی نہیں کرتے اور اِلَّا قَلِيْلًا میں خالص مومنین مراد ہیں کہ فتح و نصرت ہو یا نہ ہو ان کے نزدیک حقانیت اسلام دلائل کی رو سے ہے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ اِلَّا قَلِيْلًا: سے نابالغ مراد ہیں اور استثناء منقطع ہے ان تمام وجوہ اور اسباب میں پہلی توجیہ اول توجیہ کے ساتھ بہتر ہے اور بلا تکلف ہے۔

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ۝ "پس آپ اللہ تعالیٰ کے راستے میں لڑیں آپ ذمہ دار نہیں بنائے گئے مگر اپنی ہی ذات کے اور آپ مومنوں کو رغبت دلائیں اُمید ہے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی لڑائی روک دے جنہوں نے کفر کیا ہے اللہ تعالیٰ بہت سخت ہے لڑائی میں اور بہت سخت ہے سزا دینے میں" [84]

تفسیر 84 امام آلوسی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جب منافقین کی مخالفت اور اطاعت سے روگردانی بیان کی گئی اور اسلامی احکام میں انکی (تقصیر) کمی ذکر ہوئی تو اب نبی کریم ﷺ کو منافقین کی پرواہ کئے بغیر قتال کرنے اور ان کے کرتوتوں سے صرف نظر کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے تو فَقَاتِلْ میں (فَا) مقدر شرط کے جواب میں واقع ہے یعنی اِذَا كَانَ كَذٰلِكَ فَقَاتِلْ: (جب معاملہ اس طرح ہے تو آپ قتال کریں) امام طبری نے لکھا ہے کہ یہ مَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ سے متعلق ہے یعنی اگر آپ اجر عظیم کا ارادہ رکھتے ہیں تو قتال کرو اور امام زجاج کا بھی یہ قول ہے اور بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ فَقَاتِلُوْا

اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ: سے متعلق ہے۔ فَقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ: لَا تُكَلَّفُ کا جملہ حال کی جگہ واقع ہے نیا کلام ہے۔ (سوال) یہاں پر نفس مکلف بہ ہے جبکہ ذات مکلف بہ نہیں ہوتی ہے؟۔ (جواب) اس سے مراد نَفْسَكَ کا فعل ہے جس سے مراد بذات خود عمل جہاد کیلئے بڑھنا ہے اور اس حصر میں اشارہ ہے کہ منافقین کے جہاد وقتال سے مخالفت کرتے یا پیچھے ہٹنے سے آپ پر کوئی اثر نہیں پڑیگا۔ یا لفظ وسع یہاں پر مقدر ہے جس کی دلیل لَا یُكَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ہے۔ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ: نفس کی ذمہ داری کے بعد اب اور لوگوں کی ذمہ داری ذکر ہو رہی ہے۔ حرض امام راغب نے لکھا ہے کہ تَحْرِیْضٌ اِزَالَةُ الْحَرَضِ: کو کہا جاتا ہے یعنی بے فائدے کاموں اور مشاغل سے لوگوں کو نکال کر جہاد و قتال کی طرف راغب کرو اور اس تحریض سے مراد وہ ترغیبات ہیں جو صحیح احادیث میں اجر و ثواب اور جنت میں درجات کی صورت میں وارد ہیں اور وہ بہت کثرت سے ہیں۔ اور یہ تحریض چاہے زبانی ہو، قلمی ہو یا اس کی تربیت ہو سب کو شامل ہے۔ عَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے جو یقینی ہے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ کریم ذات ہے اور وہ وعدہ کی تکمیل کرتا ہے لہٰذا جب وعدہ کرتا ہے تو پورا کرتا ہے اسلئے جب لفظ عسیٰ اس کی طرف ہو تو برائے یقین ہوتا ہے اس وعدے کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے ساتھ ہر غزوہ میں پورا کیا ہے جس کی دلیل سورۃ توبہ کی آیت 25 ہے یعنی لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰہُ فِیْ مَوَاطِنَ كَثِیْرَةٍ: یعنی بلاشبہ بہت سارے غزوات میں اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد کی ہے بَأْس لغت میں ہر برے کام اور بری بات کو کہا جاتا ہے اور مراد اس سے جنگ ہے۔ وَاللّٰہُ اَشَدُّ بَاْسًا: اس سے مراد یہ ہے کہ قوت، حملہ کرنا اور جنگ کرنا سخت ہے بنسبت ساری مخلوق اور خصوصاً مشرکین کے مقابلہ میں" وَاَشَدُّ تَنْكِیْلًا" نَكَلَ: قید کیلئے استعمال ہوتا ہے اور قید لازماً رکاوٹ پیدا کرتا ہے لہٰذا منع کرنے کو بھی بولا جاتا ہے اور عرف عام میں اس سزا اور عذاب کو کہا جاتا ہے جو عبرتناک ہو۔ یہاں عذاب مراد ہے اور اس کی سختی اتنی ہے کہ کوئی چھڑا نہیں سکے گا اور اس عذاب کیلئے کبھی کوئی زوال اور فنا نہیں۔

مَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً یَّكُنْ لَّهٗ نَصِیْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَیِّئَةً یَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰہُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ مُّقِیْتًا ﴿۸۵﴾ "جو کوئی سفارش کرے اچھی سفارش تو اس میں سے اس کیلئے حصہ ہوگا اور جو کوئی سفارش کرے بری سفارش اس کیلئے اس میں سے حصہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نگہبان ہے" [85]

تفسیر 85 (ربط ا) سابقہ آیت میں تحریض کا امر ہوا ایمان والوں کے لئے تو اب اس آیت میں اس بات کا ذکر ہے کہ یہ

تحریض جس کا دوسرا نام شفاعت ہے بہت اجر کا سبب ہے۔ (ربط ۲) جب لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ: جملے سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ کسی دوسرے عمل کے لئے جواب دہ نہیں تو وہم پیدا ہوا کہ کسی اور کے عمل سے ان کو اجر ثواب اور فائدہ بھی نہیں پہنچے گا تو جواب ہوا کہ نہیں فائدہ ملے گا لہذا یہ اس کی طرف اشارہ ہے۔ (ربط ۳) چونکہ نبی کریم ﷺ قتال کی ترغیب دیتے تھے تو بعض مومنین کے پاس قتال کیلئے وسائل نہیں ہوتے تھے تو ایک دوسرے کی سفارش کرتے تھے اور منافقین قتال سے رک جانے کیلئے ایک دوسرے کی سفارش کرتے تھے تو اس آیت میں ہر دونوں سفارشوں کا حکم ذکر ہوا ہے۔ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيبٌ مِّنْهَا: شفاعت اصل میں شفع سے لیا گیا ہے وتر کے مقابل ہے اس کا معنی طاق ہے یعنی شفع جفت کو کہا جاتا ہے عرف میں شفاعت کا معنی ہے فائدے تک کسی کی رسائی کیلئے بات کرنا، سفارش کرنا۔ خواہ وہ فائدہ دنیاوی ہو یا اُخروی۔ یا کسی تکلیف سے نکال دینا اور نجات دینا اگرچہ مشفوع لہ (جس کے لئے سفارش کی جارہی ہو) سفارش کرنے والے سے درجے میں بڑا ہو۔ (امام آلوسیؒ) اور حَسَنَةً وہ ہے جو جائز کام میں ہو۔ مفسرین نے اس کے بہت زیادہ مصداقات ذکر کئے ہیں (۱) اپنے ایمان کے ساتھ قتال کو جمع کرنا (۲) کسی مومن کے لئے قتال کے آلات کی سفارش کرنا (۳) ترغیب جہاد (۴) توحید وسنت کی طرف دعوت دینا (۵) ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کیلئے دعا کرنا (۶) کسی کا نفع یا نقصان دور کرنے کیلئے سفارش کرنا لیکن شرط یہ ہے کہ اس سفارش میں رشوت نہیں لے گا اور یہ جائز امور میں ہوگی اور کسی کے حق کو ساقط نہیں کریگا اور حدود شرعی ختم کرنے اور روکنے کیلئے سفارش نہیں ہوگی ان میں تین پہلے والے مصداقات آیت قتال سے مناسبت رکھتے ہیں۔ يَكُنْ لَّهٗ نَصِيبٌ مِّنْهَا نَصِيبٌ: وہ حصہ ہے جس کی مقدار معلوم نہ ہو البتہ ضرور ملنے والا ہو مِّنْهَا میں مِنْ شفاعت کیلئے سببیہ ہے۔ یا مِنْ ابتدائیہ ہے اور اس کا مضاف مقدر ہے یعنی مِنْ ثَوَابِهَا: وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً: اس کے مصداقات حَسَنَةً کے مقابل ہیں: (۱) کفر والوں سے دوستی اور کفر کو جمع کرنا (۲) انفاق فی سبیل اللہ (جہاد) سے لوگوں کو منع کرنا (۳) اور لوگوں کو منع کرنے کیلئے جہاد کی برائی بیان کرتے ہوئے لوگوں کو متنفر کرنا (۴) شرک کفر گمراہی اور بے حیائی کی طرف دعوت دینا (۵) مومن پر بہتان لگاتے ہوئے اس کی غیبت اور چغلی کرنا (۶) غیر شرعی کاموں میں سفارش کرنا (۷) مومن کو بد دعا دینا وغیرہ۔ يَكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا۔ امام قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ کِفْلٌ اس کمبل وغیرہ کو کہا جاتا ہے جو

اونٹ کی پیٹھ پر اسلئے ڈالتے ہیں کہ اس پر سواری آسانی سے ہو سکے اور مطلق حصہ کو بھی کہتے ہیں جیسا کہ یُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ۔ سورۃ حدید آیت ۲۸ اور شر میں بھی اکثر استعمال ہوتا ہے اس عبارت میں حَسَنَةً کے ساتھ نَصِيبٌ اور سَيِّئَةً کے ساتھ كِفْلٌ ذکر کیا ہے اس کو تَفَنُّنٌ فِي الْعِبَارَتِ کہتے ہیں یعنی الگ الگ تعبیر کرنا مراد ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ نَصِيبٌ وہ حصہ ہے جس میں زیادت ہو سکتی ہے لہٰذا وہ حَسَنَةً کے ساتھ مناسب ہے اور كِفْلٌ وہ حصہ ہے جو بالکل برابر ہو تو یہ سَيِّئَةً کے ساتھ مناسب ہے وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا: مُقِيْتٌ قوت سے لیا گیا ہے یعنی (روزی) جس کے ذریعے سے بدن کو تقویت اور حفاظت ملتی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت منقول ہے کہ اس کا معنی (مُقْتَدِرٌ) بہت قوت والا ہے اور ایک روایت میں حفاظت کرنے والا معنی منقول ہے۔ مجاہد رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ اس کا معنی شاہد ہے اور یہ بھی معنی منقول ہے کہ رزق پہنچانے والا اور جزا دینے والا ہے یہ سب معانی درست ہیں اسلئے کہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کے نَصِيبٌ اور كِفْلٌ پر نظر رکھتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے اس پر قادر ہے اور جزا دیتا ہے۔

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ﴿۸۶﴾

"جب تم پر سلام کرے کوئی سلام کرنا تو تم اس کا اچھا بدلہ لوٹا دو یا اس کے مثل جواب دو یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر حساب کرنے والا ہے" [86]

تفسیر 86 ربط 1: امام رازی اور صاحب اللباب رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ بعض اوقات دار الحرب کے قریب کوئی مجاہد سفر جہاد میں کسی شخص پر گزرتا ہے تو وہ انہیں سلام کرتا ہے سلام کا جواب دینے کے بجائے یہ اُسے قتل کرتا ہے یہ سوچ کر کہ کافر ہے تو اس آیت میں حکم ہے کہ ہر سلام دینے والے کا جواب دو کیونکہ سلام تو اکرام ہے اور اکرام کا بدلہ اچھے اکرام یا کم از کم برابری میں تو دینا چاہیے۔ لہٰذا اگر وہ کافر ہو تو مسلمان کو کوئی نقصان نہیں دے سکتا اور اگر مسلمان ہو تو اس کا قتل تو ویسے ہی گناہ کبیرہ ہے۔ ربط 2: امام آلوسی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گزشتہ آیت میں شفاعت حَسَنَةً کی ترغیب دی گئی تو اس آیت میں اس کی ایک خاص قسم ذکر ہوئی ہے کہ سلام سلامتی کیلئے دعا ہے جو اچھی زندگی گزارنے کیلئے شفاعت حسنہ ہے۔ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ: امام راغب نے کہا تحیہ لمبی زندگی نصیب ہونے کی دعاء کو کہا جاتا ہے پھر اس کا استعمال ہر دعا ئے خیر میں ہونے لگا۔ عربوں کی عادت تھی کہ ملاقات کے وقت آمنے سامنے ہو تو حَيَّاكَ اللّٰهُ: پڑھتے تھے پھر شریعت

میں اس کی جگہ السلام علیکم رکھا گیا اور اس کو تَحِيَّةُ الْإِسْلَامِ: کہا گیا ہے اور اس دعاء اسلام میں حَيَّاكَ اللهُ: کی دعاء سے فضیلت زیادہ ہے۔ اس میں سلامتی کی دعا ہے اور آفات زندگی سے حفاظت بھی ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ بعض کے بقول تحیۃ ملک (بادشاہی) کو کہا جاتا ہے اور لوگ ملتے وقت ایک دوسرے کیلئے (ملک) بادشاہی اور زندگی کے مختلف دعائیہ الفاظ استعمال کرتے تھے تو جمع کے الفاظ استعمال کئے گئے اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ: کے ذریعے سے یعنی بقا اور بادشاہی کے تمام الفاظ اللہ تعالیٰ ہی کیلئے خاص ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ تمام عیوب اور آفتوں سے سلامتی صرف اللہ تعالیٰ کیلئے خاص ہے۔ صحیح قول کے مطابق تحیۃ سے مراد شرعی سلام ہے یعنی السلام علیکم۔ اس میں مزید اقوال امام قرطبی رحمہ اللہ نے نقل کیے ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ کا ایک قول یہ ہے کہ اس میں چھینک کا جواب دینا مراد ہے کہ اس کا جواب يَرْحَمُكَ اللهُ ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہبہ دینا ہے یعنی کسی کو کوئی تحفہ دینا۔ ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگردوں (جصاص) کا قول ہے کہ اس سے ہدیہ دینا مراد ہے۔ کسی نے اس کو صلح کی دعوت دینا قرار دیا ہے لیکن یہ اقوال ضعیف ہیں اسلئے کہ قرآن مجید میں تحیہ سلام کیلئے آیا ہے سورۃ احزاب آیت 44، سورۃ نور آیت 61، سورۃ ابراہیم آیت 23 اور لفظ سلام بہت آیتوں میں وارد ہے۔ سورۃ مریم آیت 15، 23 اور 47، سورۃ روم آیت 69، سورۃ انعام آیت 54، سورۃ طٰہٰ آیت 47، سورۃ رعد آیت 24، سورۃ نحل آیت 59 اس میں لفظ سلام معرفہ ونکرہ دونوں ذکر ہوا ہے تو دونوں جائز ہیں۔ البتہ حدیث میں معرفہ صیغہ سے مذکور ہے۔ سلام کے دیگر احکام امام آلوسی، قاسمی، قرطبی وغیرہ نے تفصیلاً ذکر کئے ہیں۔

فَحَيُّوْا بِأَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا: یعنی تم سلام کا جواب اس سے اچھے الفاظ سے پیش کرو جو تمہیں الفاظ کہے گئے ہیں۔ احادیث صحیح اور حسن میں اس کی تفصیل آئی ہے کہ جواب میں وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہنا چاہیے۔ ابوداؤد کی روایت میں وَمَغْفِرَتُهٗ: آیا ہے لیکن اس میں یحییٰ راوی ضعیف ہے البتہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس کی روایت کو سہل بن معاذ سے حسن ذکر کیا ہے جبکہ امام ابن خزیمہ اور حاکم رحمھم اللہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ امام آلوسی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ یہ لفظ وَمَغْفِرَتُهٗ نہیں پڑھنا چاہئے تو یہ اتفاقی قول نہیں ہے اور قاسمی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس حدیث میں ان لوگوں کا رد ہے جو وَبَرَكَاتُهٗ کی زیادت کے قائل نہیں ہیں۔ اَوْ رُدُّوْهَا: جواب کی زیادت میں اَوْ برائے اختیار ہے لیکن یہ بات گزر گئی ہے کہ زیادت افضل ہے اور رُدُّوْهَا سے مراد برابر جواب دینا ہے۔ امام ابن کثیر نے لکھا ہے کہ تمام علماء اس پر متفق ہیں کہ سلام کرنا سنت ہے اور جواب دینا فرض ہے۔ البتہ ابوداؤد اور بیہقی کی روایت سے پتا چلتا ہے کہ فرض کفایہ

ہے۔ امام آلوسی نے اس مقام پر فقہائے احناف کے نزدیک سلام سے ۲۰ افراد کو مستثنیٰ قرار دیا ہے اور یہ (استثناء) انہوں نے بطرز اشعار ذکر کیا ہے لیکن صحیح قول یہ ہے کہ نمازیوں کو سلام کرنا سنت ہے البتہ جواب زبان سے نہیں دینا ہے اور ہاتھ سے سلام میں اختلاف ہے لیکن ہاتھ سے سلام کرنا صحیح حدیث میں ہے ترمذی حدیث 368 وقال الترمذی حسن صحیح۔ سنن نسائی ومسند الشافعی قال الشیخ البانی اسنادہ صحیح علیٰ شرط الشیخین البتہ اگر یہی صحیح حدیث میں آئی ہو تو وہ معتبر ہوگی لیکن صحیح حدیث کے ہوتے ہوئے قیاس سے کوئی حکم ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ حَسِیۡبًا : یعنی تمام اعمال اور خصوصاً سلام کے جواب پر حساب کریگا۔ یہ جملہ بھی اس سنت کے قائم کرنے اور سلام کے جواب دینے پر تاکید ہے۔

النصف

اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ؕ لَیَجۡمَعَنَّکُمۡ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ ؕ وَ مَنۡ اَصۡدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیۡثًا ﴿۸۷﴾

ع "نہیں کوئی معبود برحق مگر وہی وہ تمہیں قیامت کے دن ضرور جمع کریگا اس میں کوئی شک نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ سے کون زیادہ بات میں سچا ہے" [87]

تفسیر 87 اس آیت میں قیامت اور توحید کا اثبات ہے۔ ربط 1: جب یہ بات پہلے کہی گئی کہ تمہیں کوئی سلام کرے تو تم اس کے سلام کا جواب لوٹا دو اور اس کا باطن اللہ تعالیٰ کے حوالہ کردو اسلئے کہ اس کے ساتھ علم غیب میں کوئی شریک نہیں ہے اور قیامت کے دن اللہ تمام رازوں کو ظاہر کرے گا۔ ربط 2: پہلے قتال، شفاعت حسنہ، سلام کی طرف ترغیب دینا ذکر ہوا تو اب اس آیت میں مسئلہ توحید کا ذکر ہے کہ مذکورہ اعمال کی قبولیت کیلئے توحید اور ایمان بالآخرت شرط ہے۔ اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ: یہ جملہ اسمیہ ہے اور مبتداء اور خبر ہے نیز مستانفہ ہے۔ لَیَجۡمَعَنَّکُمۡ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ: یہ جملہ لفظ اللہ کیلئے دوسری خبر ہے۔ یا مستانفہ یعنی ابتداء سے کلام ہے اس میں دوسرا عقیدہ بیان ہوا ہے جو ایمان بالقیامہ ہے اِلٰی فِی کے معنی میں ہے یا جمع معنی حشر کیلئے متضمن ہے یا فِی الۡقُبُوۡرِ مخفی ہے اور اِلٰی غایہ کیلئے ہے اَلۡقِیٰمَۃُ یہ قیام کے معنی میں ہے اور تاء اس میں مبالغے کیلئے ہے اور یہ نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ سارے لوگ حساب کیلئے کھڑے (قیام میں) ہونگے۔ جیسا سورۃ تطفیف آیت 6 میں فرمایا کہ "یَوۡمَ یَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ: لَا رَیۡبَ فِیۡہِ: ضمیر جمع یا یَوۡمِ کی طرف راجع ہے۔ وَ مَنۡ اَصۡدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیۡثًا: حدیث بات اور وعدے کے معنی میں ہے اور یہاں پر خبر دینے کے معنی میں وارد ہے یعنی قیامت اور توحید کی خبر ہے۔ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ لَیَجۡمَعَنَّکُمۡ: اور یہ استفہام انکاری ہے جو اللہ تعالیٰ کی سچائی پر عموماً خصوصاً دلیل ہے۔ سوال: اَصۡدَقُ اسم تفضیل ہے لیکن صِدۡق تو مفہوم بسیط ہے اس میں تفاوت نہیں ہوتا ہے تو تفضیل

کس طرح ہوگی؟۔ جواب: امام آلوسی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہاں پر تفضیل (کمیت) مقدار کے اعتبار سے ہے کیفیت مراد نہیں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے کلام میں کوئی شبہ و احتمال جھوٹ کا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کلام بہت ہے اور اس میں بہت اقسام ہیں مگر سب صدق پر مبنی ہیں۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝ "تمہیں کیا ہو گیا کہ منافقوں کے بارے میں دو گروہ ہو رہے ہو اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے اعمال کے سبب الٹا کر دیا ہے کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے گمراہ کئے ہوئے لوگوں کو راہ راست پر لے آؤ جسے اللہ تعالیٰ بھٹکا دے تو ہرگز کوئی اسے راہ نہیں دکھا سکتا ہے" [88]

تفسیر 88 اس آیت میں منافقین کے احوال اور اقسام کا بیان ہے ان میں سے بعض منافقین تو وہ ہیں جن سے قتال کرنا درست ہے اور بعض کے ساتھ قتال کرنا درست نہیں ہے۔ یہ چار قسم کے منافقین ہیں جن کا چار آیتوں میں ذکر ہے اور یہ وہ منافقین ہیں جو دارالاسلام میں داخل نہیں اور ہجرت بھی نہیں کی۔ ربط 1: آیت 83 تک منافقین کی بری صفتوں کا ذکر ہوا پھر درمیان میں جملہ معترضہ تھا۔ تو اب ان صفات کی تشریح ہو رہی ہے کہ ان صفات کے باوجود ان کے نفاق میں شک مت کرو۔ ربط ۲: جب یہ بات بیان ہوئی کہ "وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا" اللہ تعالیٰ سے کوئی سچا نہیں ہو سکتا تو اب اس کی تشریح ہو رہی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے منافقین کے احوال ذکر کئے ہیں اور اس سے کوئی سچا نہیں تو تمہیں منافقین کے متعلق ذرہ برابر بھی شک نہیں کرنا چاہئے۔ فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ: ما استفہامیہ برائے تعجب اور ملامت ہے یا برائے انکار ہے اور تمام مومنین سے خطاب ہے۔ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ: اس میں احتمال ہے کہ فِئَتَيْنِ کے معنی سے متعلق ہے۔ یعنی "مَا لَكُمْ تَفْتَرِقُوْنَ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ یا فِئَتَيْنِ: سے حال ہے اور ذوالحال پر مقدم ہے اور فِئَتَيْنِ کے نصب (زبر) میں بھی دو وجوہات ہیں: (۱) یہ حال ہے لَكُمْ کی ضمیر سے اور اس کو حال لازمہ کہا جاتا ہے اور یہ بصریوں کا موقف ہے۔ یا مقدر كَانَ کیلئے خبر ہے یعنی كُنْتُمْ فِئَتَيْنِ: اور یہ کوفہ کے نحویوں کا موقف ہے مقصد یہ ہے کہ منافقین کے متعلق اختلاف کرنے کے لئے تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں کیونکہ ان کا کفر اور نفاق بالکل واضح ہو گیا۔ فائدہ 1: اس آیت کے سبب نزول اور اَلْمُنٰفِقِيْنَ: کے مصداق میں دو قول ہیں پہلا قول جس کو امام بخاری و مسلم نے اور ترمذی رحمہم اللہ نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ جنگ احد کے موقع پر کچھ افراد غزوہ سے پلٹ گئے جن کے

متعلق صحابہ میں اختلاف پیدا ہوا بعض نے کہا کہ یہ لوگ واجب القتل ہیں یعنی کافر ہیں اور بعض نے کہا کہ مسلمان ہیں کلمہ پڑھتے ہیں۔(صحیح بخاری کتاب فضائل مدینۃ حدیث 1884 صحیح مسلم کتاب الحج حدیث 1382) تو ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ دوسرا قول جس کو امام ابن کثیر نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے اور قرطبی رحمہ اللہ نے یہ قول ضحاک رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ یہ مکہ مکرمہ میں آباد ایک قوم تھی جنہوں نے اسلام کا کلمہ تو پڑھ لیا تھا مگر ہجرت نہیں کی تھی مشرکین کے خلاف جنگوں میں ساتھ نہیں دیتے تھے تو ان کے متعلق مومنوں میں اختلاف پیدا ہوا کہ وہ کافر ہیں یا مسلمان ہیں؟ اس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔ فائدہ 2: امام قرطبی نے فرمایا کہ پہلا قول سند کے اعتبار سے بہت قوی ہے جبکہ دوسرے قول کی تائید میں بعد والی آیت کے یہ الفاظ ہیں۔ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا: (یہاں تک کہ یہ لوگ ہجرت کریں) ان دونوں اقوال میں بظاہر تعارض ہے دو طریقوں سے اس کا حل ہے: پہلا طریقہ یہ ہے کہ ہجرت کے معنی میں تاویل کی جائے یعنی اس سے مراد واضح تو بہ لی جائے منافقت سے جیسا کہ آگے آئے گا ان شاء اللہ۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اسباب نزول میں تعارض کے وقت یہ توجیہ کی جاتی ہے کہ ایک اصل سبب ہے اور دوسرا عموم الفاظ کی وجہ سے مصداق ہے لہٰذا صحیح بخاری کتاب فضائل مدینۃ حدیث 1884 صحیح مسلم کتاب الحج حدیث 1382 حدیث کے الفاظ کے عموم سے وہ منافق مراد ہیں جو جنگ احد میں قتال سے اعراض کر گئے تھے اور اصل مصداق وہ منافقین ہیں جو مکہ مکرمہ اور اس کے گرد و نواح میں آباد تھے اور کلمہ پڑھنے کے باوجود ہجرت سے اعراض کر رہے تھے۔ فائدہ 3: ان تمام واقعات میں مومنوں کے ایک گروہ ان کے ظاہری کلمہ پڑھنے کو ان کے ایمان پر دلیل بناتا تھا جبکہ دوسرے گروہ کا استدلال ان کے فرض جہاد کو ترک کرنے اور کافروں سے تعاون کرنے پر تھا کہ یہ لوگ منافق ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ مَا لَكُمْ میں جو پہلا گروہ غلطی کر گیا تھا ان کیلئے اجر ہے کیونکہ مشہور حدیث ہے کہ مجتہد غلطی پر بھی ایک اجر کا مستحق ہے۔(صحیح بخاری ابوداؤد کتاب الاقضیۃ حدیث 3574 ابن ماجہ حدیث 2315) البتہ جب ظاہراً غلطی ہو تو اس کی پیروی منع ہے اور اس غلطی کی مذمت بھی ہونی چاہیے (ابن عاشور) وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ: رَكْسٌ کسی چیز کا واپس ہونا یا سر کے بل انڈیلنا اس کی مراد میں بہت اقوال منقول ہیں: ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک معنی یہ ہے کہ ان کو کفر کی طرف لوٹایا گیا ہے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جہنم میں اوندھے منہ ڈالے گا۔ تیسرا معنی سدی نے کیا ہے کہ ان کو گمراہ کرنا ہے ایک اور روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ان کو جہنم میں بند کیا ہے۔ امام بخاری کا قول ہے کہ ان کو خلط ملط یعنی مخبط العقل بنایا ہے اور بقول قتادہ ان

کو ہلاک کیا ہے اصل میں ان تمام تعبیرات کا مرجع ایک ہے۔ بِمَا كَسَبُوْا (با) سببیہ اور (ما) مصدریہ ہے مراد اعمال نفاق ہیں اور دیگر قبیح اعمال ہیں جو آیتوں میں گزرے ہیں۔ اُحد کی جنگ سے اعراض مومنین کے مقابل کافروں کی ظاہری مدد اور ترک ہجرت یہ سارے اعمال كَسَبُوْا میں شامل ہیں۔ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ: فَمَا لَكُمْ میں اجمالی تنبیہ تھی اور تعین نہیں کیا گیا تھا اس جملہ میں تعین کیا گیا ہے یعنی مومنوں کا وہ گروہ جو منافقین کو مومنین قرار دیتا ہے ان کا یہ قول غلط ہے ارادے کا ذکر زیادہ وعید کیلئے ہے یعنی وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے گمراہ کیا ہے ان کو تم صحیح راستے پر نہیں لا سکتے ہو لہٰذا اس کا ارادہ بھی بے معنی ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ تَهْدُوْا ان پر ہدایت یافتہ لوگوں کا حکم لگانا مراد ہے کہ ہدایت یافتہ ہیں۔ (قرطبی، ابوسعود) اس طرح مزید آیتیں بھی ہیں جیسا کہ سورۃ روم آیت 29، سورۃ اعراف آیت 186، سورۃ کہف آیت 17، سورۃ زمر آیت 36، سورۃ غافر آیت 33، سورۃ شوریٰ آیت 44، 46 ''وَمَنْ يُّضْلِلِ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا'' یہ سابقہ جملہ کیلئے تاکید ہے اور اس کیلئے یہ بمنزلہ علت بھی ہے۔ سَبِيْلًا نکرہ سیاق نفی میں عموم کیلئے ہے یعنی ایسے لوگوں کیلئے کوئی راستہ قائم رہنے والا نہیں تو ہدایت ان کو کس طرح حاصل ہوگی۔

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۠ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿89﴾

''وہ لوگ چاہتے ہیں کہ کاش کہ تم کفر کرو جیسا انہوں نے کیا ہے اور تم ان کے ساتھ برابر ہو جاؤ لہٰذا ان میں سے کسی کو تم دوست مت بناؤ یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہجرت کریں پھر اگر وہ پھر جائیں تو تم ان کو پکڑو اور انہیں قتل کرو جہاں کہیں تم ان کو پاؤ اور تم ان میں سے کسی کو دوست اور مددگار مت بناؤ'' [89]

تفسیر 89 یہ اَتُرِيْدُوْنَ جملہ سے متعلق ہے جو بطریقہ علت ہے یعنی یہ لوگ تو تعصب میں اس حد تک جا پہنچے ہیں کہ تمہیں دوبارہ کفر میں داخل کرنے پر تلے ہیں تو تم ان کی ہدایت کی کس طرح امید رکھتے ہو''وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا لَوْ: مصدریہ ہے مابعد کی تاویل کے ساتھ وَدُّوْا کیلئے مفعول ہے یا لَوْ شرطیہ ہے اور وَدُّوْا کا مفعول مقدر ہے اور اس کا جواب بھی مقدر ہے یعنی وَدُّوْا كُفْرَكُمْ: وہ تمہارا کفر یعنی اسلام چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔ لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا لَيُسَرُّوْا بِذٰلِكَ: اگر تم کفر کرو جیسے انہوں نے کیا ہے تو وہ اس پر بہت خوش ہوں گے'' فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً یہ تَكْفُرُوْنَ پر عطف ہے اور سَوَآءً مُسْتَوِيْنَ کے معنی میں ہے یہ لوگ تمہارا کفر اختیار کرنا اور پھر اس میں بھی اپنے ساتھ برابری چاہتے

ہیں۔ (سوال) كَمَا كَفَرُوْا اور سَوَآءً دونوں برابری پر دلالت کرتے ہیں تو اس تکرار کا کیا فائدہ ہوا؟۔ **جواب:** پہلی مماثلت فقط کفر میں ہے اور دوسری مساوات طریقہ کفر میں ہے جو منافقت کرتے ہوئے ارتکاب کفر اور گمراہ سرداروں کی پیروی ہے۔ فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ: جب ان کے کفر اور اور مؤمنین سے (عداوت) دشمنی کی تصریح و وضاحت کی گئی تو اب ایمان والوں کو ان سے براءت اور ہر قسم کی دوستی سے منع کیا جا رہا ہے۔ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یعنی اگرچہ یہ لوگ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ایمان کے دعویٰ کو ثابت کرنے کیلئے ہجرت کی ضرورت ہے اور اس وقت مدینہ کی طرف ہجرت فرض تھی کیونکہ باقی بستیاں دار الکفر اور مدینہ دارالاسلام تھا اور یہ فرضیت فتح مکہ تک تھی اس کے بعد مکہ سے ہجرت ختم ہوئی جبکہ ہر اس ملک سے ہجرت فرض ہے جہاں ایک مسلمان شعائر اسلام کا اظہار نہیں کر سکتا اور اس ملک کی طرف ہجرت کرنا لازم ہے جہاں آزادانہ طور پر اسلام پر عمل ہو سکے۔ اس طرح حکم سورۃ الانفال آیت 72 میں ہے۔

فائدہ: امام رازی، قرطبی اور آلوسی رحمہم اللہ کا قول ہے کہ ہجرت کی تین قسمیں ہیں: پہلی قسم دار الکفر سے دار الاسلام کی طرف ہجرت کرنا ہے۔ دوسری قسم ترک گناہ بھی ہجرت ہے۔ تیسری قسم اپنے گھر اور علاقہ سے بنیت قتال نکل جانا ہے اور گزری ہوئی آیت میں سبب نزول مدینہ کے منافقین کا احد سے واپس ہونا تھا تو اس میں ہجرت کی تیسری قسم مراد ہے اور سابقہ گناہ سے توبہ استغفار کرنا ہے جو کہ میدان جنگ سے فرار ہے اور سبب نزول اگر دوسرا مراد لیا جائے تو ہجرت سے پہلا والا مراد ہوگا۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ: اگر ہجرت سے پہلی یا تیسری قسم مراد ہو تو مقصد یہ ہوگا کہ اگر انہوں نے ہجرت کرنے سے اعراض کیا تو فَخُذُوْهُمْ تو پکڑنے سے مراد قیدی بنانا ہے۔ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ یعنی حرم میں ہو یا حرم سے باہر ہو اور وَجَدْتُّمْ سے قادر ہونا مراد ہے۔ فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا: اس تکرار میں بہت ہی تاکید ہے یعنی ان سے مکمل اجتناب کرو ان کی طرف سے کوئی ولایت اور نصرت مت قبول کرنا" فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا: میں مراد یہ ہے کہ تمہاری طرف سے ان کے ساتھ کسی قسم کی ولایت دوستی کی گنجائش نہیں ہے تو اس آیت میں منافقین کی پہلی قسم کا ذکر ہوا جن سے قتال جائز ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ۝٩٠ " سوائے ان لوگوں کے جو جا ملتے ہیں اس قوم کے ساتھ کہ

تمہارے اور اس قوم کے درمیان عہد ہے یا تمہارے پاس وہ اس حال میں آتے ہیں کہ ان کے سینے اس بات سے بند ہیں کہ وہ تمہارے ساتھ لڑیں یا وہ اپنی قوم کے ساتھ لڑیں اور اگر اللہ تعالیٰ نے ان کو تم پر مسلط کر دیا ہوتا تو وہ تم سے لڑتے لہذا اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں اور تم سے نہ لڑیں اور تمہاری طرف صلح پیش کریں تو اللہ تعالیٰ نے ان پر تمہارے لڑنے کی کوئی راہ نہیں رکھی ہے" [90]

تفسیر 90 اس آیت میں دارالاسلام سے باہر رہنے والے دو قسم کے منافقین کا استثناء کیا جارہا ہے: (۱) ایک قسم معاہدہ کرنے والوں کا ہے (۲) دوسری قسم بے بس عاجز منافقین ہیں۔ إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ إِلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ: اس استثنیٰ میں دو قول ہیں: (۱) یہ استثنیٰ متصل ہے جو فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ سے استثنیٰ کیا گیا ہے یعنی استثنیٰ قتل اور پکڑ میں ہے اور موالات اور دوستی میں نہیں ہے کیونکہ اس قسم کے لوگوں سے دوستی تو منع ہے یہ قوم کافر یا منافق ہے اور ملت سے معاہدہ کرنا یا پناہ حاصل کرنا مراد ہے اور قَوْمٍ بَيْنَكُمْ سے کافر مراد ہیں البتہ انکا مسلمانوں سے قتال نہ کرنے کا معاہدہ ہے۔ تو الَّذِينَ يَصِلُونَ کو مُعَاهَدُ الْمُعَاهَدُ کہتے ہیں لہذا جب تک وہ معاہدہ اور وصل ہیں تو ان سے قتال جائز نہیں ہے۔ أَوْ جَاءُوكُمْ حَصِرَتْ صُدُورُهُمْ: اس میں اور قسم کے منافقین کا ذکر ہے۔ أَوْ برائے تنویع ہے (یعنی قسم کیلئے ہے) حَصِرَتْ حال ہے اور بصریوں کے نزدیک قَدْ مقدر ہے قَدْ کوفیوں کے نزدیک بغیر قَدْ ہے۔ حَصِرَ (اِنْقِبَاض) تنگی ناپسندیدگی نفرت کراہت وغیرہ کو کہتے ہیں۔ أَنْ يُقَاتِلُوكُمْ أَوْ يُقَاتِلُوا قَوْمَهُمْ: یہاں پر مِنْ مقدر ہے۔ یعنی یہ لوگ تمہارے پاس آتے ہیں اس حال میں کہ ان کے سینوں میں تمہارے قتال سے بھی اور اپنی قوم کے قتال سے بھی تنگی ہے یعنی نہ تو ان سے قتال چاہتے ہیں اور نہ ہی تم سے قتال چاہتے ہیں۔ یعنی اپنی کافر قوم سے ملکر تمہارے خلاف بھی جنگ نہیں چاہتے اور نہ ہی تمہارے ساتھ ملکر اپنی قوم سے جنگ چاہتے ہیں یعنی بزدل اور بے بس ہونے کی وجہ سے کسی سے قتال نہیں کرتے۔ ایک توجیہ یہ بھی ہے کہ ہم مدینہ کی طرف ہجرت کرتے ہیں مگر اپنی قوم کے ساتھ قتال قومیت کی وجہ سے نہیں کرینگے یعنی قتال میں شرکت نہ کرنے کی شرط پر ہجرت کیلئے تیار ہیں۔ ان کیلئے اسلام کی ابتداء میں اجازت تھی اور اس کا مصداق بنو مدلج قبیلہ ہے لیکن جب اسلام قوی ہوا تو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ امام قرطبیؒ نے پہلے والی توجیہ کو ترجیح دی ہے۔ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقَاتَلُوكُمْ: اس جملہ میں مومنوں پر احسان کرنا مقصود ہے۔ تسلیط سے مراد ان کے دلوں سے رعب اور خوف ختم کرکے قوت اور طاقت سے نوازنا ہے۔ امام قرطبیؒ نے فرمایا ہے کہ اس تسلط

کے تین اسباب ہو سکتے ہیں: (۱) گناہوں کا مومنوں میں عام ہونا۔ مداہنت سستی کا آنا جس کی وجہ سے قتال چھوڑ دیتے ہیں لہذا مومنوں پر کافروں کا مسلط ہونا بطور عذاب ہوتا ہے (۲) دوسرا سبب یہ ہے کہ مومنوں کو گناہوں سے پاک کرنا (۳) مومنوں پر ابتلا اور امتحان کرنا۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ۔ یہ دلیل ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوتا ہے۔ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ یہ اس استثنیٰ کی تفصیل ہے جو اِلَّا الَّذِيْنَ میں ذکر ہے البتہ دو شرطیں اس میں وارد ہیں: (۱) پہلی شرط ان کا تم سے اعتزال ہے اور اعتزال اصل میں الگ کرنے کو کہا جاتا ہے اور اس مقام پر اعتزال سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ بوقت جنگ اپنی قوم سے الگ ہو جائیں اور تمہارے خلاف جنگ میں شرکت نہ کریں بلکہ مکمل طور سے غیر جانبدار رہیں۔ یا اعتزال سے مداہنت یعنی سستی کرنا مراد ہے۔ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ یہ اعتزال کا نتیجہ ہے۔ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ: یہ دوسری شرط ہے۔ سلم صلح کرنے اور تابع ہونے کے معنیٰ میں ہے اور لفظ القاء میں صلح کے کمال اظہار کی طرف اشارہ ہے گویا محسوس کی طرح ہے۔ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا: یہ امر ہے اور استثنیٰ کا معنیٰ ہے۔ عَلَيْهِمْ کا مضاف مقدر ہے۔ عَلٰى اَخْذِهِمْ وَقَتْلِهِمْ سَبِيْلًا: سبیل اذن اور دلیل کے معنیٰ میں ہے۔ اس میں ان سے تعرض نہ کرنے پر مبالغہ ہے کیونکہ جن پر کوئی راہ ہی نہیں تو پکڑ اور قتل کس طرح ہوگا؟۔

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ۭ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ۭ وَاُولٰۗىِٕكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝ "عنقریب تم اور لوگوں کو پاؤ گے وہ چاہتے ہیں کہ تم سے امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی امن میں رہیں جب وہ لوٹائے جاتے ہیں فتنے (شرک) کی طرف تو اس میں الٹا دیے جاتے ہیں پھر اگر وہ تم سے کنارہ کش نہ رہیں اور نہ ہی تمہاری طرف صلح پیش کریں اور نہ ہی تم سے اپنے ہاتھوں کو روکیں تو تم ان کو پکڑو اور جہاں کہیں بھی پاؤ تو ان کو قتل کرو اور یہی لوگ ہیں کہ ہم نے تمہارے لئے بنایا ان پر ظاہر غلبہ"[91]

تفسیر 91 اس آیت میں منافقین کی چوتھی قسم کا ذکر ہے اور ان سے قتل وقتال کا حکم ہے سَتَجِدُوْنَ اس وجدان سے ان کی خبر یا ان کو پالینا مراد ہے اور یہ ایک ہی مفعول کی طرف متعدی ہے۔ اٰخَرِيْنَ: اس لفظ میں اشارہ ہے کہ یہ قسم سابقہ قسموں سے بالکل الگ ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ بظاہر یہ لوگ سابقہ منافقین کی طرح ہیں مگر ان کے اور ان کی نیتوں میں فرق ہے۔ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ: یعنی یہ قوم اس قسم کے منافقین کی ہے کہ انہوں نے نبی

اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے سامنے اپنا ایمان ظاہر کیا تا کہ ان کے اموال اولاد اور جانوں کی حفاظت ہو اور کافروں کے ساتھ خفیہ راز باز اور دوستی اور ان کے باطل معبودوں کی عبادت بھی کرتے تھے اور یہ بھی ان سے امن میں رہنے اور اپنا سب کچھ بچانے کیلئے کرتے تھے۔ یُرِیْدُوْنَ میں ان کی نیت مراد ہے یعنی ان کی نیتوں میں جان بچانا مقصود ہے کسی کا عقیدہ اختیار کرنا مقصد نہیں ہے۔ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا: فتنہ سے مراد شرک اور مسلمانوں سے قتال کا ارتکاب ہے۔ اُرْكِسُوْا اس سے مراد شرک کی طرف پلٹنا ہے یا مسلمانوں کے وعدے سے انحراف کرنا ہے۔
فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ: اس گروہ سے قتال کیلئے تین شرطیں ہیں: (۱) پہلی شرط عدم اعتزال ہے یعنی تمہارے ساتھ صلح نہیں کرتے اور جنگ سے الگ نہیں رہتے اور ہر قسم ضرر تمہیں پہنچاتے ہیں یا کوششیں کرتے ہیں۔ پہلی آیت میں اعتزال کا ثبوتی معنی ذکر ہوا ہے اب اس آیت میں اس کی مخالف جانب مراد ہے۔ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ: یہ دوسری شرط ہے اور یہ اس مقام میں لَمْ کے تحت ہے۔ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ: یہ بھی نفی کے نیچے داخل ہے اور یہ تیسری شرط ہے یعنی اپنے ہاتھ تمہارے ساتھ جنگ سے نہیں روکتے ہیں۔ فائدہ: پہلی آیت میں دو شرطیں اثبات کی صورت میں ذکر ہیں اور یہاں پر تین شرطیں نفی کی صورت میں پیش کی گئیں۔ سبب یہ ہے کہ سابقہ قسموں سے اِعْتِزَال اور اِلْقَاء سَلَم کی مستقبل میں امید تھی اور اس قسم سے مستقبل میں بھی مذکورہ تین کاموں کی امید نہیں ہے اور یہاں پر حکم قتل وقتال کا ہے تو ہاتھوں کے نہ روکنے کا ذکر تاکید کے ساتھ آیا ہے یعنی یہ لوگ قتال کیلئے اچھی طرح تیار ہیں۔ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ثقافت مکمل قابو میں آنے کو کہتے تھے یعنی جب تمہیں ان کے قتل پر پوری قدرت حاصل ہو اور جہاں بھی ان کو پالو وہاں قتل کرو۔ اس میں بہت تاکید ہے وَجَدْتُّمُوْهُمْ کی بنسبت جو سابقہ آیت میں مذکور تھا اسلئے کہ یہ سابقہ منافقین کی بنسبت خبیث منافقین ہیں۔ وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا: اسم اشارہ لانے میں اشارہ ہے کہ یہ لوگ دیگر اقسام منافقین سے بالکل الگ ہیں کیونکہ ان سے ان کی علامات جدا ہیں۔ عَلَيْهِمْ یعنی ان کے پکڑنے اور قتل کرنے پر سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا: ان کے قتل پر واضح دلیل ان کا کفر منافقت اور قتل کا مستحق ہونا ہے۔ ابن عاشور نے لکھا ہے کہ اس میں اشارہ ہے ان کے قتل پر مومنوں کو مفسد اور دہشت گرد نہیں کہا جائیگا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۚ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ وَاِنْ كَانَ مِنْ

قَوۡمٍۭ بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَهُمۡ مِّيۡثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهۡلِهٖ وَتَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ مُّؤۡمِنَةٍ ۚ فَمَنۡ لَّمۡ يَجِدۡ فَصِيَامُ شَهۡرَيۡنِ
مُتَتَابِعَيۡنِ ۖ تَوۡبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ﴿۹۲﴾ "کسی مومن کیلئے لائق نہیں کہ کسی مومن کو قتل کرے مگر 36/36

غلطی سے اور جو کوئی غلطی سے مومن کو قتل کرے تو ایک مومن غلام آزاد کرنا ہے اور اس کے وارثوں کو دیت سونپی جائے گی مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں پھر اگر وہ (مقتول) اس قوم سے ہوں جو تمہاری دشمن ہے جبکہ وہ (مقتول) مومن تھا تو ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہے اور اگر کسی قوم سے ہو کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہے تو اس کے وارثوں کی طرف دیت سونپی جائے گی اور ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہے پھر جو غلام نہ پائے تو دو مہینے پے در پے روزے رکھنے ہیں یہ کفارہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے توبہ قبول کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا خوب حکمت والا ہے" [92]۔

تفسیر 92 اس حصہ میں تیسرا باب ہے اس حصے کا خلاصہ: یہاں سے آیت 135 تک چھ امور سیاسی کا ذکر ہے جن میں سے چار کا تعلق عسکری تربیت سے ہے۔ یعنی 92، 94، 97، 101 اور دوسرے نمبر پر کتاب وسنت کے فیصلوں سے متعلق ہے۔ یعنی آیت 105 اور 127 سے 130 تک۔ آیت 92 میں پہلا حکم جو ترتیب میں چوتھے نمبر پر ہے وہ مسئلہ قتل خطا اور اس کا حکم اور قتل عمد اور اس کی اخروی سزا ہے آیت ۹۳ میں۔ دوسرا حکم کسی کے مسلمان ہونے کی کامل اور مکمل تفتیش ہے تاکہ غلطی سے کسی مسلمان کو قتل نہ کیا جائے۔ آیت 97 میں اس کے بعد قتال فی سبیل اللہ کی طرف ترغیب ہے اور بشارت و خوشخبری ہے آیت 95، 96 میں۔ تیسرا حکم ہجرت نہ کرنے والوں کیلئے وعید ہے سوائے معذوروں کے۔ پھر ہجرت کیلئے ترغیب ہے اور اسلامی امارت وحکومت ان کیلئے رہائش وغیرہ کا انتظام کرے۔ آیت 98، 99 اور 100۔ چوتھا حکم۔ حالات سفر اور خوف میں نماز کا مسئلہ ہے تاکہ اسلامی فوج ومجاہدین سے (صلوٰۃ) نماز قضاء نہ ہو جائے۔ 101 سے 106 تک۔ پانچواں حکم قرآن وسنت کے فیصلہ کے وقت خیانت کرنے والے کی طرفداری سے بچنا اور ایسے افراد کے متعلق آداب اور انکی بری صفات کا ذکر آیت 109 تک ہے اور بعض وہموں کو ختم کرتا ہے 110 تا 112 میں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کا ذکر اور ان کو تسلی اطمینان آیت 113 میں ہے پھر آداب کا ذکر ہے پہلا ادب سرگوشی کے متعلق ہے آیت 114 میں۔ دوسرا ادب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے انحراف وعداوت اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے مخالفت پر وعید ہے آیت 115 میں۔ تیسرا ادب شرک ناقابل معافی جرم ہے اور شرک فی الدعاء اور فی التحلیل والتحریم پر انتباہ ہے اور شیطان سے بچنے کی تنبیہ ہے آیت 116 تا 121 میں اور ایمان والوں کیلئے خوشخبری ہے 122 میں اور آیت 123 میں ایک وہم کو ختم کیا گیا

ہے۔ پھر توحید کا دعویٰ ہے اور رد شرک فی التصرف ہے 126 میں چھٹا حکم عورتوں، بچوں یتیموں اور منکوحہ خواتین کے حقوق کا ذکر ہے آیت 130 تک۔ تین مقاصد کیلئے توحید کا ذکر ہے اور عذاب الٰہی سے خوف کا ذکر ہے 134 تک پھر ایک وہم کا جواب ہے آیت 135 میں۔ اس آیت میں چوتھے سیاسی حکم یعنی قتل خطاء کا ذکر ہے۔ (ربط ۱) کفار اور منافقین سے قتال ذکر کرنے کے بعد اب مومن کے قتل کا ذکر ہو رہا ہے۔ (ربط ۲) یہ بات گزر گئی کہ جب منافق، مومنوں سے قتال کرے اور اظہار کفر کا مرتکب ہو تو اس کے قتل پر سلطان دلیل موجود ہے اب یہ بات بیان ہو رہی ہے کہ مومن کے قتل پر کوئی دلیل وسلطان نہیں ہے۔ اسلئے فرمایا کہ "وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَأً وَمَا كَانَ: کی تفسیر سورۃ آل عمران میں گزر گئی ہے۔ یہاں پہ جمہور مفسرین کا یہ قول ہے کہ یہ نفی نہی اور حرمت کے معنی میں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے۔ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ، سورۃ احزاب آیت 53 اسلئے کہ اگر یہ صرف خبر کے معنی میں ہو تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کوئی مومن نہیں قتل کرتا ہے کسی مومن کو مگر خطاء غلطی سے اور نہ ہی قتل کیا ہے جبکہ یہ تو واقع کے خلاف ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ یہاں پر مراد نہی ہے۔ اِلَّا خَطَأً یہ لکن کے معنی میں استثنیٰ منقطع ہے یعنی اگر کوئی مومن دوسرے مؤمن کو غلطی سے قتل کر دے تو بعد میں اس کا حکم ذکر ہے۔ امام زمخشری کا قول ہے کہ نفی کا معنی اخبار ہے یعنی مؤمن کیلئے مناسب نہیں اور اس کی شان کے خلاف ہے کہ وہ دوسرے مومن کو قتل کرے کسی بھی علت اور سبب سے مگر بسبب خطاء یا کسی بھی حال سے مگر بحال خطاء۔ اس قول کی بناء پر استثنیٰ متصل ہے البتہ مفرغ ہے اور خطاء مفعول لہٗ یا حال ہے اور قتل خطاء وہ ہے جس میں قتل کا ارادہ نہ ہو اور اس قسم کا آلہ ہو کہ وہ غالباً سبب قتل نہ ہو یعنی نہ تو ارادہ قتل ہو اور نہ ہی آلہ قتل کا ہو یہ مفسر مہائمی اور مفسر آلوسی کا قول ہے اور قرطبی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ خطاء کی بہت سی قسمیں ہیں البتہ ان میں جامع عدم ارادہ یعنی قتل کا ارادہ نہ کرنا ہے تو یہ خطاء ہے اور اس کی ایک مثال یہ ہے کہ کافروں پر وار کرتے ہوئے ان کی صفوں میں مسلمان نشانہ بن جائیں۔ (۲) یا قتل کے مستحق شخص کے تعاقب میں غیر مستحق کو اس کے گمان پر غلطی سے قتل کیا یا کوئی شکار کرتا ہے یا نشانہ بازی کرتا ہے اور غلطی سے کسی مسلمان کو قتل کر بیٹھے۔ یہ سب قتل خطاء کی قسمیں ہیں: امام قرطبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اگر کسی شخص پر دوسرا شخص گر جائے اور نیچے والا مر جائے تو یہ بھی قتل خطاء میں شامل ہے۔ اسی طرح ایک شخص دوسرے شخص کو کھینچتا گھسیٹتا ہے اور دونوں گر جائیں اور مر جائیں تو دیت عاقلہ (خاندان) والوں پر ہے جس نے بندے کو گھسیٹا ہے ان کی جانب سے دیت ادا ہوگی۔ اسی طرح تصادم ایکسیڈنٹ وغیرہ میں دیت کا ذکر کیا ہے۔ وَمَنْ قَتَلَ

مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ: اس میں عَلَيْهِ لفظ مقدر ہے۔ رَقَبَةٍ گردن کو کہا جاتا ہے مگر ذکر جز اور مراد کل ہے یعنی صرف گردن نہیں بلکہ پورا نفس مراد ہے عرف میں اس کا اطلاق لونڈی اور غلام پر ہوتا ہے کیونکہ غلامی میں وہ اس طرح پابند ہوتا ہے جیسے کہ اس کی گردن باندھ لی گئی ہے۔ مُّؤْمِنَةٍ اس کفارہ میں آزاد ہونے والے کیلئے مؤمن ہونا بالاتفاق شرط ہے البتہ نابالغ جو ایمان میں ماں باپ کے تابع ہوتا ہے اس کے کفارہ میں اختلاف ہے۔ فائدہ 1: امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے صحیح حدیث نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک لونڈی سے سوال کیا کہ آيْنَ اللهُ یعنی اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟ اس نے جواب میں فرمایا فِي السَّمَآءِ آسمان پر ہے آپ نے پھر سوال کیا کہ میں کون ہوں فرمایا آپ اللہ تعالیٰ کے رسول اور بندے ہیں آپ نے فرمایا اس کو آزاد کرو یہ تو مؤمنہ خاتون ہے۔ اس حدیث کو صحیح مسلم کتاب المساجد حدیث 537، ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ حدیث 930، نسائی اور احمد 5۔447 نے معاویہ بن حکم کی روایت سے نقل کیا ہے اور موطا امام مالک میں عمر بن حکم کی سند سے اسے ذکر کیا گیا ہے لیکن امام ابن عبدالبر اور زرقانی نے کہا ہے کہ یہ تمام محدثین کے نزدیک راوی سے وہم ہوا ہے ورنہ صحابہ کرام میں عمر بن حکم کے نام سے کوئی صحابی نہیں ہے۔ فائدہ 2: کفارے کی ایک وجہ یہ ہے کہ اگرچہ خطا گناہ نہیں ہے لیکن چونکہ قاتل نے بے احتیاطی سے کام لیا ہے جو کہ اس کا جرم ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق میں تعطیل واقع ہوئی کیونکہ یہ مقتول زندگی اللہ تعالیٰ کی بندگی میں گزار رہا تھا یا اس کی نسل میں کوئی مؤمن پیدا ہو جاتا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ایک بندے کو زندوں کے گروہ سے الگ کیا جو آزادی سے زندگی بسر کر رہا تھا لہٰذا اب اس کو چاہئے کہ غلام کو آزاد کرے تا کہ وہ آزاد زندگی بسر کر سکے وہ غلامی میں مردے کی مانند ہے۔ باقی اللہ تعالیٰ اپنی حکمتوں کو خوب جانتا ہے۔ وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ: دیت اس مال کو کہتے ہیں جو مقتول کے خون کے بدلے میں اس کے وارث مقتول کو دیا جاتا ہے۔ مُّسَلَّمَةٌ تسلیم کا معنی بغیر قیل وقال اور تنگی کرنے کے ادائیگی ہے۔ اَهْلِهٖ سے وہ وارث مراد ہیں جن کا مرنے والے مقتول کے مال میں شرعی حق ہے البتہ ان وارثوں میں اگر کوئی کافر یا غلام یا اس کا قاتل ہو تو وہ اس دیت میں حصہ نہیں لے سکتا ہے اور کفارہ (غلام آزاد کرنا) اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور دیت دینا بندے کا حق ہے اور دیت ادا کرنے سے قتل کے انتقام کا جذبہ کم ہو جاتا ہے اور مصالحت پیدا ہو جاتی ہے اور دیت کے باقی احکام تفصیلی طور پر صحیح احادیث میں وارد ہیں یعنی قرآن میں اجمالی بیان ہے اور حدیث میں اس کی تشریح ہے تو معلوم ہوا کہ قرآن مجید پر عمل کرنے کیلئے علم حدیث کی بہت سخت ضرورت ہے اور موطا امام مالک میں حدیث عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے یہ حکم ثابت ہوا ہے کہ

دیت میں سونا دینے کی صورت میں ایک ہزار دینار اور چاندی دینے کی صورت میں 1200 درھم مقرر کئے گئے تھے اور ابو داؤد کتاب الدیات حدیث 4541 کی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اونٹوں والوں پر 100 سو اونٹ اور گائے والوں پر دو سو گائیں اور بکریوں والوں پر دو ہزار بکریاں اور دنبے مقرر کئے تھے اور موضح القرآن میں لکھا ہے کہ دیت چاندی کے حساب سے دو ہزار سات سو چالیس تولے بنتے ہیں موجودہ دور میں اس کے اندازے سے دیت دی جائے گی۔ اہل سنت والجماعت کے نزدیک دیت عصبہ یعنی قاتل کے خاندان پر ہے اگر خاندان یعنی (عاقلہ) نہ ہو یا بہت فقیر اور بے بس ہو تو پھر بیت المال سے دیت دی جائے گی اور اس دیت کی ادائیگی سیدنا علی، عمر، ابن عباس رضی اللہ عنہم کے فیصلے اور قول کی مطابق تین سال میں ہوگی۔ اِلَّآ اَنۡ يَّصَّدَّقُوۡا: یہ مقدر علیہ سے متعلق ہے یا مُسَلَّمَةٌ سے متعلق ہے معنیٰ یہ ہے کہ لازم ہے دیت کی ادائیگی یا وقتوں میں سے کسی وقت میں سونپ دی جائیگی یہ دیت وقتوں میں سے کسی وقت میں البتہ اگر معاف کر دے یا صدقہ کرے (دیت چھوڑ دے مقتول کے ورثاء رشتہ دار) اور اس معافی کو تصدق کہا ہے اس میں ترغیب دینا مقصود ہے جیسا کہ سورۃ بقرہ آیت 280 میں گزرا ہے اور یہ اصل میں قرضدار کو اپنا قرض چھوڑنا ہے۔ فَاِنۡ كَانَ مِنۡ قَوۡمٍ عَدُوٍّ لَّـكُمۡ وَهُوَ مُؤۡمِنٌ: كَانَ ضمیر غلطی سے قتل ہونے والے مقتول کی طرف راجع ہے۔ قَوۡمٍ عَدُوٍّ: اس سے حربی کفار مراد ہیں۔ یہ مقتول ان کافروں میں رہتا تھا یا ہجرت کی طاقت نہیں تھی یا ہجرت میں سستی سے کام لیا اور ہجرت نہ کرنے پر گناہ گار ہے مگر منافقت حقیقی اس میں نہیں ہے اور علامات کفر بھی نہیں ہے جیسا کہ آیت 89 میں ذکر ہوئے ہیں۔ فَتَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ مُّؤۡمِنَةٍ: یہاں پر عَلَيۡهِ مقدر ہے یعنی ایسے قاتل پر صرف کفارہ واجب ہے اور دیت واجب نہیں ہے ایک وجہ اس کی یہ ہے کہ دیت تو حقیقت میں وارثوں کا حق ہے اور اس کے وارث کافر ہیں اور اس مقتول مسلمان کے مال میں ان کا حق نہیں یعنی وہ وارث نہیں ہو سکتے تو اس کی دیت بھی نہیں لے سکتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اس مؤمن کی عزت ناقص ہے کیونکہ اس نے ہجرت نہیں کی ہے لہٰذا اس کے قتل کا حکم بھی ناقص ہے۔ جیسا کہ سورۃ انفال آیت 72 میں وارد ہے اور اس کے متعلق اسامہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ انہوں نے دارالحرب میں ایک شخص کو کلمہ توحید پڑھنے کے باوجود قتل کیا انہوں نے یہ سمجھا کہ وہ قتل کے خوف سے کلمہ توحید پڑھنے لگا ہے تو نبی کریم ﷺ نے اس کو دیت دینے اور قصاص کا حکم نہیں دیا البتہ غلام کی آزادی کا حکم دیا۔ (صحیح بخاری کتاب الدیات حدیث 6872) وَاِنۡ كَانَ مِنۡ قَوۡمٍۢ بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَهُمۡ مِّيۡثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهۡلِهٖ وَتَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ مُّؤۡمِنَةٍ: اس میں دو مشہور قول ہیں: (۱) پہلا

قول یہ ہے کہ اس سے وہ مومن مراد ہے جو کافروں میں رہتا ہو اور غلطی سے مارا جائے جبکہ اس قوم سے مسلمانوں کا عہد ہو یہ حسن البصری، جابر بن زید اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ وغیرہ کا قول ہے۔ اس میں دیت لازم آتی ہے۔ امام آلوسی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اہل سے اس کے مسلمان وارث مراد ہیں کیونکہ کافر کو دیت نہیں دی جاسکتی ہے اسلئے کہ وہ مسلمان کے وارث نہیں ہو سکتے جبکہ امام قرطبی کا قول ہے کہ اس کی دیت کافروں کو معاہدے کی وجہ سے دی جائیگی۔ دوسرا قول ابن عباس رضی اللہ عنہما اور امام شعبی رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے کہ اس سے مراد معاہد (ذمی) ہے اس کی دیت کافروں کو معاہدے کی وجہ سے دی جائیگی اور اسی وجہ سے یہاں پر وَهُوَ مُؤْمِنٌ نہیں فرمایا۔ اس کی دیت میں اختلاف ہے کہ آیا اس کی دیت آدھی ہوگی یا مومن جتنی ہوگی؟۔ ابن عربی نے کہا ہے کہ پہلا قول بہتر ہے کہ اس سے مراد مومن مقتول ہے کیونکہ بحث اسی کی ہو رہی ہے اور مطلق کو مقید پر محمول کیا ہے اور ابن جریر نے دوسرا قول پسند کیا ہے۔ فائدہ: یہاں پر دیت کو کفارہ پر مقدم کیا ہے یہ اس کے اہتمام کیلئے اور وہم کو ختم کرنے کیلئے ہے اسلئے کہ اس کی قوم کافر ہے تو وہم پیدا ہوا کہ دیت نہیں دی جائے گی۔ مِّيثَاقٌ سے مراد مسلمانوں اور کافروں کے درمیان جنگ بندی کا معاہدہ ہے خواہ وقتی ہو یا مستقل معاہدہ ہو۔ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ. لَمْ يَجِدْ: کا مفعول مقدر ہے یعنی رَقَبَةً مُّؤْمِنَةً: یعنی اس کو مومن غلام یا لونڈی کا نہ ملے یا اس کی ملکیت میں نہ ہو یا قیمت ادا کرنے کی طاقت نہ ہو یا غلام ملتے نہ ہوں جیسا کہ موجودہ دور میں، لونڈی غلام نہ ملنے کی صورت میں پھر قاتل پر مسلسل پے در پے دو ماہ کے روزے رکھنا بطور کفارہ لازم ہے۔ کفارہ کی ادائیگی خاتون پر ہو تو حیض، نفاس کی وجہ سے کفارہ میں انقطاع کفارہ نہیں ہوتا بلکہ یہ مسلسل شمار ہوتا ہے البتہ حیض میں علماء کا اختلاف ہے۔ تَوْبَةً مِّنَ اللَّهِ: یہ مقدر فعل کیلئے مفعول ہے یعنی شَرَعَ لَكُمْ ذَٰلِكَ: توبہ کی قبولیت کیلئے تم پر یہ حکم لازم کیا ہے۔ اس توبہ کے متعلق دو قول ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ قاتل نے بے احتیاطی کی ہے جو کہ گناہ کی قسم ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ توبہ برائے تخفیف ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آسانی کی گئی ہے کہ غلام لونڈی کے بدلہ میں تم سے روزہ کی قبولیت کی ہے۔ اور تَابَ قرآن میں تخفیف کے معنی میں کثرت سے آیا ہے۔ جیسا کہ سورۃ توبہ آیت ۱۱۷، سورۃ مزمل آیت ۲۰، سورۃ بقرہ آیت ۱۸۷ میں ہے جصاص نے لکھا ہے کہ یہ توبہ اور کفارہ امر تعبدی ہے یعنی اس بات پر دلالت نہیں کرتا ہے کہ قتل خطاء گناہ ہے۔ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا: ہر چیز پر عالم ہے تو قاتل کے حال پر بھی عالم ہے حکیم ہے تو مذکورہ احکام میں اس کی بہت ساری حکمتیں ہیں۔ فائدہ ۱: قتل کی اقسام: امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک قتل کی دو قسمیں ہیں: قتل عمد اور قتل

خطاء اور جمہور اہل علم کے نزدیک تین قسمیں ہیں: (۱) عمد (۲) شبہ عمد (۳) خطاء: قتل عمد میں قصاص ہے اور شبہ عمد اور قتل خطاء میں قصاص نہیں اس میں فرق یہ ہے کہ قتل عمد میں شروط ہیں یعنی قاتل بالغ ہو۔ قتل کے ارادے سے کسی ایسے آلہ سے مارے کہ اس سے عام حالات میں قتل ممکن ہو اور آلہ غالباً سبب قتل ہو۔ اس میں پہاڑ سے گرا دینا، پانی میں ڈبونا، آگ سے جلانا، بلندی سے یا چھت سے گرانا، اس پر دیوار گرانا، گردن دبا دینا، کھلائے پلائے بغیر قید میں رکھنا یہاں تک کہ فوت ہو جائے، درندوں سے نوچ نوچ کروا کر مار دینا کسی انسان پر جھوٹی گواہی دینا جس کی وجہ سے اس کو قصاص میں قتل کیا جائے اور پھر یہ اپنی گواہی سے رجوع کرے۔ کسی کو زہر یا موت کیلئے دوائی وغیرہ دینا جو اس کیلئے سبب قتل بنے یہ سب قتل عمد میں داخل ہے۔ (۲) قتل شبہ عمد: یہ ہے کہ کسی ایسی چیز سے کسی بے گناہ کو مارنے کا قصد کرے جس سے عموماً قتل نہیں ہوتا ہے لیکن وہ اتفاقاً مر جاتا ہے جیسا کہ لاٹھی، لکڑی یا پتھر سے اس حد تک زیادہ مارنا کہ وہ مر جائے وغیرہ چونکہ ان میں مار کر قتل کرنا مقصود نہیں ہوتا ہے مگر اتفاقاً مر جاتا ہے تو اس وجہ سے اس کو شبہ عمد کہتے ہیں یعنی قتل عمد کی طرح ہے ایسی صورت میں دیت مغلظ واجب ہوتا ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الدیات حدیث 6910 صحیح مسلم کتاب القسامۃ حدیث 1681 ابوداؤد کتاب الدیات حدیث 4547 ابن ماجہ حدیث 2628) میں حدیث وارد ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا کہ قتل عمد لاٹھی کوڑے اور پتھر سے واقع ہوتا ہے اور خطاء یہ ہے کہ بندہ کوئی جائز کام کرتا ہے یعنی نشانہ بازی کرتا ہے یا شکار کرتا ہے اور غلطی سے کسی بے گناہ آدمی کو قتل کر جاتا ہے یا کسی نے غیر آباد زمین میں کنواں بنایا ہو یا کوئی جال بچھایا ہو کسی اور کام کیلئے مگر اس میں بے گناہ انسان پھنس کر مر جائے اس حکم میں وہ قتل میں داخل ہے جو غیر مکلف سے صادر ہو جائے یعنی نابالغ یا دیوانہ کسی کو قصداً قتل کر دے تو یہ بھی قتل خطاء کے حکم میں داخل ہے (فقہ السنۃ ج 2 ص 426) اور ابو حیان نے ایک چوتھی قسم بھی ذکر کی ہے وہ نہ تو قتل عمد ہے اور نہ شبہ عمد ہے اور نہ ہی قتل خطاء ہے یعنی بھول کر قتل کرنا یا نیند میں قتل کرنا لیکن یہ قول غیر معروف ہے میں نے کسی اور سے سنا اور نہ ہی خود دیکھا ہے۔ **واللہ اعلم بالصواب** فائدہ ۲: کوئی خاتون اپنے بچے کو نیند کی حالت میں کروٹ میں (یا پہلو میں دبا دے اور وہ مر جائے) تو اس خاتون پر دیت واجب ہے یہ قتل خطاء میں داخل ہے جیسا کہ شیخ عثیمین نے اپنی کتاب دروس الحرم ج ۲ ص ۱۲ میں لکھا ہے اسلئے کہ اس پر قتل خطاء کی تعریف صادق آتی ہے کیونکہ اگر کوئی انسان کسی اور پر غلطی سے گر جائے اور اسے مار دے تو یہ بھی اس کے مشابہ ہے جیسے ماں کے پہلو میں مرنے والا بچہ ہے لہٰذا یہ دونوں قتل خطاء میں شمار ہیں۔ والدیت کی وجہ سے قصاص

ساقط ہونے سے دیت بھی ساقط ہوگی البتہ کفارہ باقی رہے گا۔ سوال: رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثٍ عَنِ الْمَجْنُوْنِ حَتّٰی يُفِيْقَ وَعَنِ النَّائِمِ حَتّٰی يَسْتَيْقِظَ وَعَنِ الصَّبِيِّ حَتّٰی يَحْتَلِمَ رواہ ابو داؤد حدیث 4400 ارواء الغلیل 5-297، احمد 6، 101 شیخ البانی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے الثمر المستطاب کتاب الصلوٰۃ 54 حاکم 4-389 ترمذی نصب الرایہ 4-165 معنیٰ یہ ہے کہ تین قسم کے لوگوں سے قلم اٹھالیا گیا ہے۔ دیوانے سے جب تک ہوشمند نہ ہوجائے اور سوئے ہوئے سے جب تک بیدار نہ ہو اور نابالغ سے جب تک بالغ نہ ہوجائے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوانہ سے ہوئی چوک یا بھول وہ تو مکلف ہی نہیں ہے تو کفارہ کیونکر دیگی۔ جواب: رُفِعَ الْقَلَمُ: سے مراد یہ ہے کہ اس پر گناہ نہیں ہے دوسری حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رفع حکم کا نہیں مراد جیسا کہ "رُفِعَ عَنْ اُمَّتِي الْخَطَاءُ وَالنِّسْيَانُ: اس حدیث میں بالاتفاق گناہ کا رفع مراد ہے اور احکام شرعیہ تو خطاء اور نسیان کی صورت میں بہت ساری عبادات اور جنایات میں مرتب ہوئے ہیں جیسا کہ نماز میں سہو آ خطاء پر سجدے واجب ہیں اور غلطی سے نماز میں کھانے اور پینے سے نماز فاسد ہوگی اگر چہ یہ گناہ نہیں ہے واللہ اعلم بالصواب

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿93﴾

"اور جس نے قتل کیا مومن کو قصد کے ساتھ تو اس کی سزا جہنم ہے ہمیشہ کے لئے اور اللہ کا غضب اور لعنت ہوگا ان پر اور ان کے لئے بڑا عذاب تیار کیا گیا ہے" |93|

تفسیر 93 قتل خطاء کا حکم بیان کرنے کے بعد اب قتل عمد (قصداً) کا حکم بیان ہو رہا ہے اور قصداً قتل کا حکم دو قسم پر ہے: (1) ایک تو دنیاوی حکم ہے وہ قصاص اور دیت ہے جو سورۃ بقرہ آیت 178 میں ذکر ہوا ہے۔ دوسری قسم (اخروی) آخرت کا معاملہ ہے تو وہ یہاں پر ذکر ہو رہا ہے۔ سورۃ بقرہ میں یہودیوں کا رد مقصود تھا تو وہاں قصاص کا حکم بیان ہوا ہے اسلئے کہ یہودیوں نے قصاص میں تحریف کی تھی اور یہاں تو مومنوں کا ذکر ہو رہا ہے تو انہیں ڈرانے کے لیے آخرت کی وعید سنائی جو قصداً اس کا ارتکاب کریگا۔ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا: تنکیر یعنی نکرہ ہونے میں اشارہ ہے کہ مومن کامل ہو یا فاسق مذکر ہو یا مؤنث ہو بالغ ہو یا نابالغ ہو اور قاتل کو اس کے ایمان کا علم ہو "مُتَعَمِّدًا" یہ يَقْتُلْ کے فاعل سے حال ہے اس میں یہاں عمد اور شبہ عمد دونوں داخل ہیں اسلئے کہ آخرت کے حکم میں دونوں شامل اور داخل ہیں فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ: گناہ کے ارتکاب میں جزاء وہ بدلہ ہے کہ بسبب جرم مجرم اس کا مستحق ہوتا ہے۔ خٰلِدًا فِيْهَا خُلُوْدٌ: طویل رہنے اور ٹھہرنے کو کہتے ہیں اور

ہمیشہ رہنے کو بھی کہتے ہیں اور جب لفظ اَبَدً ساتھ میں ذکر ہوجائے تو پھر ہمیشہ رہنا مراد ہوتا ہے۔ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ: اللہ تعالیٰ کی طرف سے انتقام لینا مراد ہے جس میں عفو درگزر نہ ہو۔ وَلَعَنَهٗ لعنت کا معنی ہے خاص رحمت سے محروم ہونا یعنی جنت سے جو کہ رحمت ہے اس سے محروم ہوگا۔ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا: اس قسم کا عظیم الشان عذاب جس کی مقدار صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ اس آیت میں پانچ تاکیدات کا ذکر ہے اور آخری تاکید جس میں "اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا فرمایا ہے اس میں تین تاکیدات ہیں ان تمام تاکیدات میں مؤمن کے قصداً قتل کرنے پر شدید وعید ہے اور بہت ہی قبیح والا عمل ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس بارے میں بہت سی احادیث اس عنوان میں جمع کی ہیں۔

فائدہ: معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ قصداً مؤمن کے قتل کا مرتکب اور شرک کے علاوہ ہر گناہ کبیرہ کا مرتکب ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور انکا استدلال اس آیت سے ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ قصداً مومن کو قتل کرنے والا جہنم میں رہے گا اور اس کی توبہ ناقابل قبول ہے اس قول کو امام ابن کثیر نے زید بن ثابت، ابوہریرہ، ابن عمر رضی اللہ عنہم اور ابوسلمۃ بن عبدالرحمٰن اور عبید بن عمر، حسن، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ وغیرہ سے بھی نقل کیا ہے کہ اس کی توبہ قبول نہیں ہے۔ اور امام قرطبیؒ نے ابن عباس، ابن عمر اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم سے دوسری روایت نقل کی ہے کہ اس کی توبہ مقبول ہے، لیکن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی پہلی روایت کو امام بخاری نے بسند سعید بن جبیر رحمہ اللہ نقل کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ سورۃ فرقان کی آیت 69 اور 70 جس میں توبہ کے بعد گناہ کی معافی کا تذکرہ ہے وہ اس آیت سے منسوخ ہے اسلئے کہ وہ مکی ہے اور یہ آیت مدنی ہے۔ اور انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ اس آیت کو کسی آیت نے منسوخ نہیں کیا ہے بلکہ اس مسئلہ میں یہ آخری آیت ہے اور امام ابن کثیر اور قرطبی رحمہم اللہ وغیرہ نے لکھا ہے کہ عام جمہور سلف صالحین اور عام مسلمانوں کا موقف یہ ہے کہ قاتل کیلئے قبولیت توبہ کی گنجائش ہے بشرطیکہ وہ خالص انابت کے ساتھ توبہ کرلے خشوع وخضوع کرے نیک اعمال کرے اور مرنے والے کے وارثوں کو راضی کرے۔ جیسا کہ سورۃ فرقان آیت 69 اور 70، سورۃ زمر آیت 53 اور اس سورۃ کی آیت 116 میں ہے وجہ یہ ہے کہ سابقہ دونوں آیتیں عام گناہوں کیلئے ہیں یعنی نفاق، شرک اور قتل وغیرہ اور بعد والی آیتیں شرک کے سوا باقی سب گناہوں کو شامل ہیں اور حدیث میں بنی اسرائیل کے ایک قاتل کا تذکرہ ہے جس نے سو افراد کو قتل کیا تھا پھر بھی توبہ کے ذریعے سے معاف کیا گیا لہٰذا اس امت کا قاتل اللہ تعالیٰ چاہے تو ضرور توبہ کے ذریعے سے معاف کردے گا جیسا کہ یہ واقعہ متفق علیہ حدیث میں واقع ہے۔ (صحیح بخاری کتاب احادیث انبیاء

حدیث 3470 صحیح مسلم فی التوبۃ حدیث 2766)۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس قول کو پسند کیا ہے: نوٹ: اس امت کی فضیلت بنی اسرائیل سے بہت زیادہ ہے۔ اس سے متعلق سلف کے بہت اقوال نقل ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ مطلق کو مقید پر محمول کیا جائیگا یعنی اس کی سزا یہ ہے لیکن توبہ کرنے کی وجہ سے وہ معاف ہوجائیگا جو مذکورہ آیتوں اور بہت ساری احادیث میں وارد ہے جن کو امام ابن کثیر وابن جریر رحمہم اللہ وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر اللہ تعالیٰ قاتل کو جزاء وسزا دینا چاہے تو یہ سزا ہے مگر توبہ کی وجہ سے یہ سزا ساقط ہوگی۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ وہ جہنم میں داخل ہوکر ہمیشہ اس میں رہے گا بلکہ یہ کہا ہے کہ اس سزا کا مستحق ہے اگر اللہ تعالیٰ معاف نہ کرے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ جہنم میں داخل ہونے کا معنی یہ ہے کہ طویل زمان اس میں رہے گا۔ امام قرطبیؒ نے فرمایا ہے کہ اس معنی میں قرآن مجید کے اندر یہ لفظ سورۃ انبیاء 34، سورۃ ہمزہ 3 میں آیا ہے اور عرف عرب میں بھی اس کا استعمال اس معنی میں ہوا ہے اور اس وجہ سے اس کے ساتھ لفظ ابدی ذکر نہیں کیا ہے۔ چوتھا قول ابو سعود نے لکھا ہے کہ یہ آیت اور ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر سلف صالحین کے قول کو شدید وعید پر محمول کیا جائیگا تاکہ مومن کے قتل سے لوگ باز رہیں۔ پانچواں قول یہ آیت منسوخ ہے سورۃ فرقان اور دیگر آیتوں سے مگر ابن عطیہ وغیرہ نے اس جواب کو ضعیف قرار دیا ہے۔ سبب یہ ہے کہ یہ اخبار ہے اور اخبار میں نسخ نہیں ہوتا ہے یعنی سزا کی خبر ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول صحیح اور صریح حدیث کے خلاف ہے جو گزرا ہے۔ بعض نے اس آیت کو شان نزول کی وجہ سے کافروں کے ساتھ مختص کیا ہے اور بعض نے تاویل کی ہے کہ اگر قاتل اس کا قتل ایمان کی وجہ سے کرتا ہو یا اس کا قتل جائز قرار دیتا ہو تو پھر مستقل جہنم میں رہے گا مگر ان اقوال کو اہل تحقیق نے ضعیف قرار دیا ہے البتہ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ توبہ کی وجہ سے بندے کا حق ساقط نہیں ہوتا ہے اور مطالبہ تو سزا نہیں ہے اور وہ سارے حقوق العباد میں ہے وہ دنیا میں مالک صاحب حق کو راضی کرنے سے ختم ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل ورحمت سے بھی معاف ہوسکتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللَّهِ مَغَانِمُ كَثِيرَةٌ ۚ كَذَٰلِكَ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿٩٤﴾ "اے ایمان والو جب تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں سفر کرو تو تحقیق کیا کرو اور اس شخص کو جو تمہیں اسلام کا کلمہ پیش کرے مت کہو کہ تم مومن نہیں ہو کیا تم دنیا کی چیزوں کے متلاشی ہو

جبکہ اللہ تعالیٰ کے پاس بہت ساری غنیمتیں ہیں تم پہلے اسی طرح تھے اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا لہٰذا تم تحقیق کیا کرو بیشک اللہ تعالیٰ ان اعمال پر جو تم کرتے ہو خوب خبردار ہے" [94]

تفسیر 94 اس آیت میں پانچواں امر سیاسی ہے جو اسلامی فوج پر لازم ہے کہ جب سفر میں ہو تو اچھے طریقے سے تحقیق کرے ایسا نہ ہو کہ تمہارے ہاتھوں سے مومن قتل ہو جائے۔ (ربط ۱) پہلے قتل خطاء کا عمومی ذکر ہوا اب قتل خطاء کا ایک خاص حکم ذکر ہے۔ (ربط ۲) پہلے مومن کو قتل خطاء کے ذریعے سے مارنے کا مسئلہ اور حکم ذکر ہوا تو اب قتل سے بچنے کا طریقہ ذکر ہو رہا ہے۔ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ: اس میں اشارہ ہے کہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ تحقیق اور بیداری سے کام لو۔ اِذَا ضَرَبْتُمْ جب تم زمین میں سفر کرو یہ حکم اگرچہ حضر میں بھی ہے کہ تحقیق سے کام لو لیکن اکثر سفر کے حالات میں کسی کو پہچاننا مشکل ہوتا ہے اور یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ میں جسکو قتل کرتا ہوں یہ مومن ہے یا نہیں" فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ: یہ لفظ بھی سابقہ تحقیق کیلئے تاکید ہے یعنی جب تمہارا سفر ہی اس کلمہ کی سربلندی کیلئے ہے تو جب یہ کلمہ کسی سے سنو تو لازم اس کی تحقیق کرو۔ فَتَبَیَّنُوْا امام راغبؒ نے لکھا ہے کہ تبین اور تحقیق لازم ہے مگر پہلے ثبوت مل جائے یعنی ایک چیز کیلئے ثبوت پہلے چاہئے تو پھر اس کی مزید تحقیق وَ تَبَیُّن کی ضرورت ہے اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ تَبَیُّن اَبْلَغ ہے تَثْبِیْت سے یعنی کسی چیز کے فقط ثبوت سے واضح بیان زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ ابو عبید اور ابن عطیہ رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ ثبوت اور وضاحت یعنی تَبَیُّن برابر ہیں لیکن پہلی بات درست ہے تَبَیُّن کا مقصد یہ ہے کہ اس پر پہلے سے کافر کا حکم صادر مت کرو پہلے تحقیق کرو اور تحقیق کے مختلف طریقے ہیں یعنی اسلام کا کلمہ پڑھنے والا ہے تو اس سے کفر کے متعلق پوچھو کہ کافروں سے براءت کرتا ہے یا نہیں شرک اور کفر سے توبہ کرتا ہے یا نہیں۔ اس میں کفر اور شرک کی علامات ہیں یا نہیں۔ اسی طرح اگر کسی بستی گاؤں شہر میں اسلام کے شعائر نظر آ جائیں تو حملہ سے رک جاؤ کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے اذان سن لینے کے بعد بستی پر حملہ کرنے سے منع فرمایا تھا۔ (صحیح بخاری کتاب الجہاد حدیث 2991 صحیح مسلم کتاب الجہاد حدیث 1365)۔ مسند حمیدی، بزار، طبرانی میں روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ مسجد نظر آ جائے یا اذان سنو تو اس بستی پر حملہ مت کرنا اور کسی کو بھی قتل مت کرنا (اللباب)۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤی اِلَیْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا: اس کو عطف مسبب علی السبب کہتے ہیں یعنی تَبْیِیْن اور تحقیق اس قول کیلئے سبب ہے یعنی تبین اور تحقیق اشتباہ ختم کرنے کیلئے ہے اور اشتباہ سلام پیش کرنے سے پہلے پیش آتا ہے۔ اِلْقَاء مکمل اظہار سے کنایہ ہے تاکہ مخاطب کو اس طرح

معلوم ہو جائے جیسے کہ اس کے سامنے کسی چیز کو ڈال دیا جائے۔ اَلسَّلٰمَ اس میں مشہور قراءت السلام ہے جو تحیۃ الاسلام کے معنی میں ہے یا استسلام (انقیاد) کے معنی میں ہے یعنی تابع ہونا۔ ابن عطیہ رحمہ اللہ کے بقول کنارہ کرنے اور چھوڑ دینے کے معنی میں ہے۔ ایک اور قراءت میں اَلسَّلَمَ آیا ہے جو اطاعت اور انقیاد کے معنی میں ہے۔ اسباب نزول میں صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4591، ترمذی کتاب التفسیر حدیث 3030، احمد 1\122 التعلیق علی الحسان 7\122 میں ہے کہ ایک شخص نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مخاطب ہو کر السلام علیکم کہا تھا اور اس وقت یہ کلمہ اظہار اسلام کا کلمہ تھا اور ابن جریر کی روایت میں ہے کہ اس شخص نے کہا کہ تسلیم ہو گیا ہوں اور بزار کی ایک روایت میں سیدنا مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ اس شخص نے أَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ: پڑھ لیا مگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ گمان کیا کہ یہ شخص جان بچانے کیلئے یہ کلمہ پڑھتا ہے پھر بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کو قتل کر ڈالا۔ ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ السلام۔ کا لفظ ان تمام روایات کو شامل ہے اس جملہ کا خلاصہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص اسلام کی علامت ظاہر کرے اور اس میں کفر کی کوئی نشانی نہ ہو تو ایسے شخص پر مشرک یا کافر کا حکم نہیں لگانا چاہئے۔ فائدہ: اب اگر کوئی شخص کفر و شرک کے کام انجام دیتا ہے مثلاً غیر اللہ کو پکارنا قبر پرستی اور غیر اللہ کے نام کی نذریں پیش کرنا اور اس کے ساتھ یہ کلمہ بھی پڑھتا ہے تو یہ آیت اس کے بچاؤ کیلئے دلیل نہیں ہے اسلئے کہ اس آیت میں وہ لوگ مراد ہیں جن میں کفر و شرک کی کوئی علامت ظاہر نہ ہو جبکہ اس میں تو ظاہر ہے۔ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اس میں ہمزہ استفہام توبیخ کیلئے مقدر ہے یا پھر یہ جملہ تَقُوْلُوْنَ کی ضمیر سے حال ہے۔ عَرَضَ اس سے مراد وہ غنیمت سامان وغیرہ ہے جو اس مقتول کے پاس تھا اور ساری دنیا کے ساز و سامان کو عرض کہا جاتا ہے کیونکہ وہ جلدی فنا ہونے والا ہے اور اس میں بقا اور دوام نہیں ہے اور عرض جب ساکن پڑھا جائے تو نقد رقم کے بجائے اور چیزوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے (قرطبی) فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ: یہ مجاہدین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے یعنی تمہیں اللہ تعالیٰ بغیر کسی شبے کے صاف ستھرا حلال مال غنیمت جائز طریقے سے عطا کریگا۔ مقاتل کے بقول اس سے آخرت کی نعمتیں بھی مراد ہیں۔ مَغَانِمِ یہ مَغْنَمٌ کی جمع ہے ظرف زمان و ظرف مکان اور مصدر میمی تینوں ہو سکتا ہے اور شریعت میں غنیمت اس مال کو کہا جاتا ہے جو لڑائی اور جہاد کے ذریعے سے دشمنوں سے حاصل ہو جائے كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا: سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہے کہ اس کا مطلب ہے کہ تم بھی پہلے اسی طرح ایمان کو کافروں کے خوف سے چھپاتے تھے اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا، عزت قوت و طاقت سے

نوازا تو تم نے اپنے ایمان کو ظاہر کیا ورنہ تمہارا بھی وہی حال تھا جو مقتول کا تھا اور مقاتل کا قول ہے کہ تم ہجرت کرنے سے پہلے کافروں کے درمیان تھے تو صحابہ کرام کے درمیان تم ڈر کے مارے اسلام کا کلمہ پڑھتے تھے تاکہ تمہیں امن ملے پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہجرت کی توفیق دی ہے۔ سوال: تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ابتداء اسلام میں تو اس طرح نہیں تھے تو یہ تشبیہ کس طرح صحیح ہوگی؟۔ جواب: یہاں پر خطاب میں سب صحابہ کرام مراد نہیں ہیں بلکہ بعض صحابہ کرام مراد ہیں جن کے ابتدائی حالات اس طرح تھے اور یہ قانون ہے کہ بعضوں کی وجہ سے خطاب سب کو ہوتا ہے۔ اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ تشبیہ سے مراد یہ ہے کہ ابتداء اسلام میں صرف کلمہ پڑھنے سے تمہارے مال وجان محفوظ ہوئے۔ اس کا انتظار نہیں تھا کہ تمہارے دلوں میں ایمان ہے یا نہیں لہٰذا تم اب اسی طرح کرو کہ ابتداء میں جو اسلام میں داخل ہو جائے تو اس کے ظاہری اقرار پر اکتفاء کرو۔ اس قول پر مذکورہ سوال نہیں آتا ہے۔ فَتَبَيَّنُوْا یہ تکرار برائے تاکید ہے یا پہلے والے تَبَيَّنُ سے مراد ان کی تحقیق ہے۔ جن کو تم قتل کا ارادہ کرتے ہو اور دوسری میں تَبَيُّن احسانوں کا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا ہے جو کہ اسلام ہے جس کو فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ: جملہ میں ذکر کیا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا: اس جملہ میں وعید ہے۔ خَبِيْر اس ذات کو کہا جاتا ہے جو مخفی چیزوں کا علم اس طرح رکھتی ہو جس طرح اسکو ظاہر پر علم ہوتا ہے اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ فائدہ: صاحب اللباب نے لکھا ہے کہ یہودی نصرانی اگر دعویٰ کر لیتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں تو اس کا اعتبار نہیں ہے اسلئے کہ وہ کبھی کبھی اسلام اپنے دین کو کہتے ہیں اگر وہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ: پڑھ لیں تو بھی اعتبار نہیں کرنا اور ان پر اسلام کا حکم مت لگاؤ کیونکہ وہ توحید کے کلمہ کے منکر ہیں اور جبکہ وہ محمد ﷺ کی رسالت کو صرف عرب امی لوگوں کیلئے مانتے ہیں ان کیلئے ضروری ہے کہ وہ اس بات کا اقرار کریں کہ ہمارا دین باطل ہے موجودہ دین اسلام ہے وہ صحیح اور درست ہے اور وہ حق ... فرض ہے۔

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾ "برابر نہیں ہو سکتے مومنین میں سے وہ جو بیٹھے رہنے والے ہیں سوائے (عذر والوں) معذوروں کے اور جو اپنے مالوں اور جانوں سے اللہ تعالیٰ کے راستے میں لڑنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے مالوں اور جانوں سے لڑنے والوں کو بیٹھے رہنے والوں پر مرتبے میں

فضیلت دی ہے اور سب سے اللہ تعالیٰ نے جنت بھلائی و اچھائی کا وعدہ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو بیٹھے رہنے والوں پر اجر عظیم کے لحاظ سے فضیلت دی ہے۔[95]۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے کئی مرتبے ہیں اور مغفرت اور خاص رحمت ہے اور ہے اللہ تعالیٰ معاف کرنے اور رحم کرنے والا'' [96]۔

تفسیر 95-96 ان آیتوں میں قتال فی سبیل اللہ کی ترغیب ہے۔ (ربط) یہ بات گزر گئی کہ حالات سفر میں کلمہ اسلام پڑھنے کے باوجود کسی کو بلا تحقیق قتل مت کرنا ایسا نہ ہو کہ گناہ کا ارتکاب کر بیٹھو۔ تو اشکال پیدا ہوا کہ اس خوف سے بہتر ہے کہ جہاد کیلئے جائے ہی نہیں کیونکہ اس قسم کے حالات اکثر آسکتے ہیں تو اس وہم کو ختم کرنے کیلئے کہا گیا کہ اس قسم کے وہموں کے ذریعے سے جہاد وقتال کے فضائل چھوڑ کر گھروں میں مت بیٹھو' لَا يَسْتَوِي الْقَٰعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ بیٹھنے سے مراد جہاد فی سبیل اللہ میں شریک نہ ہونا ہے اس سے مراد وہ افراد ہیں جن کی جہاد میں شرکت بوجہ عدم ضرورت لازم نہ تھی اور شریک نہ ہونے کی ان کو اجازت تھی اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو بدر میں شریک نہیں ہوئے کیونکہ ان پر حاضر ہونا لازم نہیں کیا گیا تھا۔ ان دونوں اقوال کا مقصد ایک ہے۔ ابوحمزہ کے قول کے مطابق تبوک سے پیچھے رہنے والے مراد ہیں مگر یہ قول ضعیف ہے۔ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ یہ ترکیب میں الْقَاعِدُونَ سے حال واقع ہے اس میں اشارہ ہے کہ جہاد سے رہ جانا سبب کفر نہیں ہے غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ: اس میں غَيْرُ پر تینوں اعراب جائز ہیں البتہ اکثر علماء کے نزدیک پیش کے ساتھ ہے لہٰذا حالت پیش میں الْقَاعِدُونَ سے بدل یا صفت ہے اسلئے کہ الْقَاعِدُونَ بسبب مصداق نکرہ ہے لہٰذا اس کی صفت غیر مضاف کے ساتھ جائز ہے اور زجاج کا قول ہے کہ یہ غیر استثنیٰ کے طریقے پہ ہے یعنی إِلَّا أُولِي الضَّرَرِ: لیکن پہلا قول پیش کے ساتھ بہتر ہے اسلئے کہ یہ کلام نفی میں ہے اور اس میں بدلیت بہتر ہے اور الضَّرَرُ سے بدن کا نقص مراد ہے یعنی لنگڑا، اندھا، زیادہ بیمار وغیرہ یا مال کا نقصان مراد ہے یعنی جہادی سفر پر جانے کیلئے مال نہیں کہ جس پر سامان خرید سکے۔ تو غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ سے صحیح سلامت بدن والے اور جن کے پاس سامان سفر بھی ہو مراد ہیں۔ (صحیح بخاری کتاب الجھاد والسیر حدیث 2839 ابن ماجہ حدیث 2764 احمد 3-103 میں ہے)۔

کہ یہ لفظ عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کے سوال پر نازل ہوا ہے۔ وَالْمُجَٰهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَٰلِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ يَسْتَوِي کا فعل صرف فاعل پر مکمل نہیں ہوتا ہے بلکہ جانب مقابل چاہتا ہے یہ اس کیلئے جانب مقابل ہے۔ أَمْوَٰلِهِمْ اس کو پہلے ذکر کیا مقصد یہ ہے کہ مجاہد جہاد میں پہلے اپنی تیاری مال سے کرتا ہے اور نفس کو بھی حاضر کرتا ہے اور

جہاد میں صرف مال بھی خرچ کرتا ہے تو معلوم ہوا کہ مالی جہاد عام ہے اور آیت سے مراد یہ ہے کہ وہ مومنین جو صحیح سلامت ہیں اور جہاد میں شریک نہیں ہوتے ہیں وہ ان مجاہدین کے ساتھ برابر نہیں جو جہاد میں اپنے مال و جان قربانی کیلئے پیش کرتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ دونوں گروہ ثواب اور اجر میں مساوی (برابر) نہیں ہیں باقی لفظ لَا يَسْتَوِي میں ابہام ہے اسلئے کہ اس میں درجات کے فرق کا تعین نہیں ہوا ہے۔ سوال: غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ: میں یہ دلیل ہے کہ معذور لوگ مجاہدین کے ساتھ برابر ہیں یا نہیں؟۔ جواب: بعض علماء کا قول ہے کہ لفظ غَيْرُ یہ دلالت نہیں کرتا ہے یعنی لفظ غیر میں اگر صفتی معنیٰ مانا جائے تو صفت کی تخصیص دلالت نہیں کرتی ہے کہ اس کے ماسوا میں حکم کی نفی ہو۔ یعنی مفہوم الصفت معتبر نہیں ہے۔ اگر استثناء مانا جائے تو کہا گیا ہے کہ استثناء نفی اثبات کو مستلزم نہیں یعنی یہ لازمی نہیں کہ نفی سے اثبات لازم آئے گا اور بعض علماء نے کہا ہے کہ استثناء نفی سے اثبات کے لیے مستلزم ہے تو پھر مساوات پر دلیل ہے۔ ابن عطیہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ (دوران جہاد معذورین مجاہدین کے ساتھ مساوی نہیں ہو سکتے البتہ قابل ملامت نہیں ہیں) صحیح بات یہ ہے کہ معذورین کیلئے جہاد کرنے والوں کے اجر میں حصہ ہے جس کی دلیل صحیح بخاری (کتاب الجهاد حدیث 2830 صحیح مسلم فی الامارۃ حدیث 1898) کی حدیث ہے کہ غزوہ تبوک سے واپسی میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ مدینہ میں لوگ ہیں جو تمہارے ساتھ اجر میں برابر کے شریک ہیں صحابہ کرام نے سوال کیا کہ وہ مدینہ میں ہیں اور اجر میں ہمارے ساتھ شریک ہیں آپ علیہ السلام نے فرمایا تم وادیاں کراس کرتے ہو اور سفر میں کسی علاقہ اور پریشانی سے نہیں گزرتے ہو مگر وہ بھی اس میں تمہارے ساتھ اجر میں شریک ہیں ان کو عذر نے روکا ہے۔ فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً: یہ جملہ مستانفہ بیانیہ ہے جب یہ بات بیان ہوئی کہ جہاد میں شریک لوگ اور پیچھے رہنے والے خواہ معذور کیوں نہ ہوں برابر نہیں ہیں تو سوال پیدا ہوا کہ زیادتی کا بھی احتمال ہے اور کمی کا بھی؟ برابر نہ ہونے میں ایک جانب زیادت ہو جیسا کہ اس کمی کا امکان ہے تو جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ یہاں پر برابر نہ ہونا یعنی (عدم) مساوات یہ ہے کہ جو لوگ قاعدین ہیں جہاد میں شریک نہیں ہیں مجاہدین کا درجہ ان سے بلند ہے چونکہ مساوات اور عدم یعنی برابر نہ ہونا فضیلت کے اعتبار سے ہے تو اسلئے لفظ فَضَّلَ ذکر کیا ہے اور لفظ اللَّهُ اس پر دلیل ہے کہ یہ فضیلت بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہے۔ دَرَجَةً یہ مفعول مطلق ہے یا تَفْضِيلَةً کے معنی میں ہے یا ذَا دَرَجَةٍ کے معنی میں حال ہے یا ظرف ہے یعنی فِي دَرَجَةٍ یا جر کا حرف مقدر ہے یعنی بِدَرَجَةٍ۔ اس کو (مَنْصُوبٌ بِنَزْعِ الْخَافِضِ کہا جاتا ہے) وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ

الْحُسْنٰى: (كُلًّا) وَعَدَ کیلئے مفعول اول مقدم ہے اور اَلْحُسْنٰى دوسرا مفعول ہے اور اَلْحُسْنٰى سے مراد جَزَاءَ الْحُسْنٰى ہے جوکہ جنت ہے۔ سوال: قَاعِدِیْنَ جہاد چھوڑنے والوں کیلئے کیوں اَلْحُسْنٰى درجہ ذکر کیا ہے؟ جواب ۱: جہاد فرض کفایہ ہونے کی وجہ سے وہ اجازت سے پیچھے رہے اسلئے وہ گناہگار نہیں ہیں۔ جواب ۲: یہاں پر كُلًّا سے مراد أُولِي الضَّرَرِ ہیں جن کیلئے مجاہدین کے ساتھ اجر ہے، پہلا جواب بہتر ہے۔ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا: سوال: مجاہدین کی فضیلت کو دوبارہ ذکر کیا ہے اور پہلے درجۃ اور یہاں پر اَجْرًا عَظِيْمًا جوکہ مغفرت ورحمت ہے ذکر کیا ہے اس کی اصل وجہ کیا ہے؟۔ جواب ۱: پہلی مرتبہ قاعدین سے معذور اور بیمار لوگ مراد ہیں اور دوبارہ ذکر کرنے سے بلا عذر وبلا ضرر جہاد سے رہنے والے مراد ہیں۔ جواب ۲: پہلے درجات سے دنیاوی منفعت یعنی مال غنیمت اور فتح وغیرہ مراد ہے جبکہ دوبارہ ذکر کرنے سے آخرت کے درجات مراد ہیں۔ جواب ۳: پہلے اجازت کے ساتھ جہاد سے رہنے والے مراد ہیں جبکہ بعد میں بلا اجازت مراد ہیں۔ جواب ۴: پہلے قتال فی سبیل اللہ کے مجاہدین مراد ہیں اور بعد میں جہاد بالنفس والمال عبادات کے ذریعے سے نفس سے مجاہدہ کرنے والے مراد ہیں۔ اسلئے بعد میں بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ: کی قید ذکر نہیں کی ہے۔ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً: یہ اجراً سے بدل بنا ہے یا پھر اس کیلئے دوسرا فعل مقدر ہے یعنی اَعْطَاهُمْ ان کو اللہ تعالیٰ دیگا، درجات سے بلند منازل مراد ہیں جو جنت میں انہیں اللہ تعالیٰ دیگا۔ صحیح بخاری کتاب الجھاد حدیث 2790 صحیح مسلم کتاب الامارۃ حدیث 1884 میں وارد ہے کہ جنت میں سو درجات ہیں اور ہر ایک درجہ کے درمیان زمین سے آسمان تک فاصلہ ہے اور یہ مراتب اور درجات اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کیلئے تیار کئے ہیں اور مغفرت میں سارے گناہوں کی معافی مراد ہے اس کو اسلئے ذکر کیا کہ گناہوں کی وجہ سے درجات کا زوال نہیں ہوگا اسلئے کہ گناہ سارے معاف ہونگے اور رحمت سے مراد بغیر کسی عذاب دیئے جنت میں داخل ہونا اور جہنم سے بچانا مراد ہے۔ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا: یہ حصول جنت ومغفرت کیلئے تاکید ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ۭ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۭ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا (97) "یقیناً وہ لوگ جن کو ملائک فوت کرتے ہیں وہ (ہجرت نہ کرنے کی وجہ سے) اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہوں تو ملائک کہتے ہیں کہ کس حال میں ہو تم وہ کہتے ہیں ہم زمین میں کمزور تھے وہ ملائک کہتے ہیں کہ اللہ کی زمین فراخ نہیں تھی لہٰذا اس میں تم ہجرت

کر لیتے پس ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بری پھرنے کی جگہ ہے" [97]۔

تفسیر 97 (ربط ا) پہلے جہاد کرنے والوں کیلئے خوشخبری (بشارت) کا ذکر تھا تو اب ترک جہاد یعنی ہجرت نہ کرنے والوں کیلئے وعید کا ذکر ہے۔ (ربط ۲) سابقہ آیت میں جہاد چھوڑنے والوں کا ذکر تھا تو اب ہجرت چھوڑنے والوں کا ذکر ہے اور ان آیتوں میں چھٹے امر یعنی سیاسی حکم کا ذکر ہے جو کہ مجاہدین کو پناہ دینا اور ان کی نصرت کرنا ہے جو کہ مسلمان حکمران اور عام مسلمانوں کا فریضہ ہے۔ آیت میں پہلے ہجرت نہ کرنے والوں کیلئے وعید ہے پھر عذر والوں کا تذکرہ اور ان کیلئے خوشخبری کا بیان ہے پھر ہجرت کرنے والوں کیلئے ترغیب اور ہجرت کرنے پر بشارت ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ: تَوَفّٰی اصل میں تَتَوَفّٰی سے فعل مضارع ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ ماضی ہو یعنی وہ افراد جو ہجرت نہ کرنے والے ہیں اس دوران میں فوت ہوئے ہوں۔ البتہ پہلا قول بہتر ہے اور تَوَفّٰی کا مشہور معنیٰ مراد ہے یعنی روح کا قبض کرنا تَوَفّٰی نسبت کے اعتبار سے تین طریقوں سے ذکر ہے: پہلا طریقہ اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت جیسا کہ سورۃ زمر آیت 42 اور بقرہ آیت 28 میں ہے وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ موت کو پیدا کرنے والا ہے حکم دینا اس کے اختیار میں ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ملک الموت کی طرف نسبت ہو جیسا کہ سورۃ سجدہ آیت ۱۱ میں ہے اور یہ نسبت اسلئے ہے کہ یہ ذمہ داری اس کو دی گئی ہے اور یہ مشہور قول کی بناء پر ہے کہ ملک الموت ایک ہے یا پھر ملک الموت سے مراد جنس ہے یعنی وہ ملائک جو ارواح کے لینے پر (مقرر) ہوں۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ملائک جمع کی طرف نسبت ہے یہ تو بہت آیتوں میں آیا ہے۔ سورۃ انعام آیت 61، سورۃ محمد آیت 27، سورۃ نحل آیت 28، 32، سورۃ انفال آیت 50 اور سورۃ اعراف آیت 37۔ اس میں وجہ یہ ہے کہ ملائک ملک الموت کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ظَالِمِىٓ اَنْفُسِهِمْ: ظلم سے مراد ہجرت نہ کرنا اور ایک کافر ملک میں رہائش رکھنا ہے اور حالت جنگ میں ایمان کے اظہار کے باوجود مشرکین کی مدد کرنا ہے۔ جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ کی نقل کردہ روایت میں ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل ہے صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4596 قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ: یہ سوال بطور ڈانٹ وتنبیہ ہے۔ مقصد یہ ہے کہ تم لوگوں نے ہجرت سے کیوں کنارہ کشی کی تھی اور مشرکین کے ساتھ تعاون کرتے رہے تھے۔ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِى الْاَرْضِ: یہ ان کے عذر کا بیان ہو رہا ہے کہ انہوں نے ہجرت چھوڑ کر مشرکین سے دوستی کیوں کی تھی یعنی ہم کمزور تھے ہجرت کرنے سے قاصر تھے اسلئے ہم نے مشرکین کا ساتھ دیا حالانکہ یہ نرا جھوٹ ہے کیونکہ حقیقی مستضعفین کی تو دو صفات ذکر ہوئی ہیں: (ا) راستے کا علم نہ ہونا۔ (۲) نکلنے کیلئے حیلے بہانے کی طاقت نہ ہونا

جبکہ یہ دونوں صفتیں ان میں نہیں ہیں یہ تو ہجرت کیلئے راستے بھی جانتے ہیں اور حیلے بہانے بھی نجات کیلئے نکلنے کا طریقہ بھی جانتے ہیں۔ فِي الْأَرْضِ: اس سے مراد سرزمین مکہ ہے جس سے اس وقت ہجرت فرض تھی: قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا: ان کے جھوٹے بہانوں کا ملائکہ کی طرف سے جواب ہے انہوں نے جھوٹا اظہار کیا کہ ہم طاقت نہیں رکھتے ہیں تو جواب ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی زمین وسیع ہے۔ ابن عطیہ اور قرطبی رحمہما اللہ کا قول ہے کہ یہ لوگ مسلمان تھے مگر فرض ہجرت سے اعراض ان کی وعید کا سبب بنا کیونکہ اگر وہ کافر ہوتے تو ہجرت پر ان کو ڈانٹ تنبیہ نہیں دی جاتی بلکہ اس ڈانٹ میں کفر وشرک کا ذکر ہوتا جیسا کہ سورۃ نحل آیت 28 اور سورۃ اعراف آیت 47 ان دونوں مقامات میں ملائکہ کا ان سے خطاب ہے موت کے وقت اور ان سے سوالات شرک سے متعلق کئے ہیں۔ یہ آیتیں اور ان جیسی اور آیتیں عذاب قبر پر دلیل ہیں اور روح نکلنے سے بعث بعد الموت تک جو مرحلہ ہے اس پر قبر کا اطلاق ہوا ہے: فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا: ہجرت نہ کرنے والوں کو آخرت کی وعید ہے اور چونکہ یہ کافر نہیں ہیں اسلئے یہاں پر لفظ خلود یا ابداً استعمال نہیں ہوا ہے۔

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاۗءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ﴿98﴾ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْھُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿99﴾ "مگر وہ جو عورتوں اور مردوں میں سے کمزور لوگ ہیں جو تدبیر کی طاقت نہیں رکھتے ہیں اور نہ ہی وہ کوئی راستہ پاتے ہیں [98] پس امید ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ درگزر فرمادے اور ہے اللہ تعالیٰ نہایت معاف کرنے والا اور بہت بخشنے والا" [99]۔

تفسیر 98-99 ان آیتوں میں معذورین کے عذر کے استثناء کا بیان ہوا ہے۔ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ یہ استثناء اس قول سے متصل ہے کہ: فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ: یا پھر یہ استثنیٰ منقطع ہے اور یہ قول دو وجوہات سے بہتر ہے: (۱) پہلا سبب یہ ہے کہ یہ آیت مستقل ہے اور استقلال دلالت کرتا ہے کہ یہ کلام پہلے والے کلام سے منقطع ہے۔ (۲) دوسرا سبب یہ ہے کہ سابقہ آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو ہجرت پر قادر تھے اور اس آیت میں ہجرت سے قاصر لوگوں کا ذکر ہے۔ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاۗءِ وَالْوِلْدَانِ: یہ مُسْتَضْعَفِيْنَ کا بیان ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ارشاد فرمایا کہ میں اور میری والدہ ان کمزور لوگوں میں سے تھے کیونکہ وہ اس وقت نابالغ تھے۔ (صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4597)
لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً: یہ جملہ استئنافیہ ہے یہ ان کی کمزوری کیلئے بطور علت ہے یا پھر حال ہے۔ بیضاوی نے کہا ہے کہ یہ

جملہ ماقبل کیلئے صفت ہے اسلئے کہ اَلْمُسْتَضْعَفِیْنَ تَعَیُّن نہ ہونے کی وجہ سے نکرہ کے معنی میں ہے۔ حِیْلَةً: امام قرطبیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ لفظ نجات کے تمام اسباب کیلئے عام ہے۔ وَلَا یَهْتَدُوْنَ سَبِیْلًا: (مدینہ کے راستے)۔ بہتر قول یہ ہے کہ اس سے ہجرت کے تمام راستے مراد ہیں یعنی جو ہجرت کے مقام تک پہنچنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پائے حِیْلَةً مکہ مکرمہ سے نکلنے کا طریقہ اور سبیل سے مدینہ اور مقام ہجرت تک رسائی مراد ہے۔ یہ دونوں میں فرق ہے۔ فَاُولٰٓئِكَ عَسَی اللّٰهُ اَنْ یَّعْفُوَ عَنْهُمْ: یہ ان کو علو درگزر کی خوشخبری ہے۔ سوال: جب یہ لوگ ہجرت کی طاقت نہیں رکھتے تو قانون الٰہی میں مکلف نہیں اور جو کسی عمل پر مکلف نہیں ہوتا ہے تو اس کے چھوڑ دینے پر مجرم گناہگار نہیں ہے تو پھر ان کیلئے عفو معافی کا کیا معنی ہے؟۔ جواب: اگر وہ سخت ترین مشقت کرتے تو ہجرت پر قادر ہو جاتے لیکن انہوں نے زیادہ مشقت نہیں اٹھائی تو اشکال پیدا ہوا کہ وہ گناہگار ہوئے تو اس اشکال کو دور کیا گیا کہ اتنی زیادہ مشقت پر وہ مکلف نہیں ہیں تو اس عفو آسے مراد انکا تحق سے ۔ ۔ نہ لینا مراد ہے (قرطبی) سوال: لفظ عَسٰی تو دلالت کرتا ہے کہ انکی معافی قطعی نہیں ہے؟ جواب: مفسرین نے لکھا کہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب لفظ عَسٰی آجائے تو وہ قطعی یقینی ہوتا ہے اسلئے کہ کریم جب وعدہ کرتا ہے تو وہ پورا کرتا ہے البتہ لفظ عَسٰی لانے کی حکمت یہ ہے کہ ہجرت چھوڑ دینے میں گنجائش نہیں ہے یہاں تک کہ معذور لوگوں کی معافی بھی یقینی نہیں ہے تو غیر معذوروں کو تو بہت خوف کرنا چاہئے (اللباب)، (زمخشری) وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا: لفظ كَانَ اللہ تعالیٰ کی صفات میں دوام ہمیشگی کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ (فائدہ) صحیح بخاری اور دیگر کتب احادیث میں وارد ہے کہ نبی کریم ﷺ فجر کی نماز کے بعد خصوصاً اور دیگر نمازوں میں عموماً آخری رکعت کے بعد ان ضعیف لوگوں کی نجات کی دعا اور کفار و مشرکین کیلئے بددعا کیا کرتے تھے جس کو قنوت نازلہ کہا جاتا ہے۔ (صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4598 صحیح مسلم کتاب المساجد حدیث 675)۔

وَمَنْ یُّهَاجِرْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یَجِدْ فِی الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِیْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ یَّخْرُجْ مِنْۢ بَیْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ یُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۧ "اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہجرت کریگا وہ زمین میں بہت فراوانی اور جگہ پائے گا اور جو کوئی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرتے ہوئے اپنے گھر سے نکلے پھر اسے موت آپکڑے پس یقیناً اس کا اجر اللہ پر ثابت ہو گیا اور ہے اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا رحم کرنے والا" [100]۔ ع

تفسیر 100 اس آیت میں ترغیب ہے کہ ہجرت سے زمین میں بہت فراوانی اور وسعتیں ملتی ہیں۔ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً: مُرَاغَمْ رَغَمْ رِغَامْ: سے لیا گیا ہے جس کا معنیٰ ہے ناک کا خاک آلود ہونا جس سے ذلت کا معنیٰ مستفاد ہے اور اس کے معنیٰ میں مختلف تعبیرات ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ضحاک کے نزدیک پلٹنے اور جانے کی جگہ کو کہا جاتا ہے۔ ابن زید رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ہجرت کی جگہ کے معنیٰ میں ہے۔ سدی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ معیشت کی جگہ مراد ہے یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں تو مراغم کا معنیٰ ہے بوقت ہجرت پلٹنے کی جگہ۔ لغوی معنیٰ کے ساتھ موافقت و مناسبت یہ ہے کہ کافر مسلمانوں کو قید و بند میں ڈال کر ذلیل کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے بندے ہجرت کی وجہ سے کافروں کو ذلیل کرتے ہیں اور ایمان والوں کو ہر چیز میں اللہ تعالیٰ وسعت دیتا ہے۔ وَّسَعَةً: فراخ زمین اور رزق کی فراوانی یہ بھی کہا گیا ہے کہ گمراہی سے نجات حاصل ہونا مراد ہے اس جملہ میں مہاجرین کے ایک وہم و اشکال کی تردید ہوئی ہے۔ اشکال اور وہم یہ تھا کہ بندہ کہتا ہے کہ میں اپنے علاقہ گھر وغیرہ میں اور رزق کی کشادگی میں خوب سیر ہوں ایسا نہ ہو کہ ہجرت کے بعد تنگی پریشانی آجائے تو جواب ہوا کہ ہجرت سے فراوانیاں آتی ہیں تنگی نہیں آتی لہٰذا اس وہم کا ازالہ ہوا۔ دوسرا وہم یہ تھا کہ گھر سے نکل جانے کے بعد یا میں مقصد تک پہنچ جاؤں گا یا نہیں اور اگر مقصد تک نہ پہنچ سکا تو مجھے کچھ اجر نہیں ملے گا تو جواب اس جملہ میں ہوا کہ: وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ: مُهَاجِرًا حال ہے جو ہجرت کی نیت پر دلیل ہے۔ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ: مفسر مہائمی کا قول ہے کہ اس سے وہ جگہ مراد ہے جس کا حکم اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے یا الٰی صرف لام کے معنیٰ میں ہے تو معنیٰ یہ ہے کہ وہ ہجرت اللہ تعالیٰ کی رضا اور رسول کی اطاعت کی وجہ سے کرتا ہے۔ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ یعنی مقصد تک رسائی سے پہلے اس پر موت آجائے اور ابوحیان کا قول ہے کہ اس میں ہر ہجرت مراد ہے جو اللہ کی رضا کیلئے ہو جیسے طلب علم، جہاد، حج یا کسی ایسے شہر کی طرف ہجرت جس میں دین کے کام زیادہ اچھے انداز میں بندہ کر سکتا ہو اور زیادہ عبادت کا موقعہ میسر ہو اور رسول کی اطاعت احسن طریقے سے ہو سکتی ہو اور حلال رزق کیلئے سفر بھی اس میں داخل ہے۔ عَلَى اللّٰهِ یہ واجب تفضّلی ہے اللہ تعالیٰ پر کسی کا کوئی حق واجب نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کے ذریعے سے اپنے اوپر فرض کیا ہے جیسا کہ آیت میں مہاجرین سے ہجرت کے بدلہ میں وعدہ گزر گیا ہے۔ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اس میں اس اجر کی عظمت کی طرف اشارہ ہے۔ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا: گناہوں کو معاف کرتا ہے اور ہجرت کا بدلہ دیتا

ہے۔ فائدہ 1: امام قرطبی رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت میں دلیل ہے کہ جس زمین میں سلف صالحین کو برا بھلا کہا جاتا ہو اور برے اعمال بھی ہوتے ہوں تو وہاں رہنا جائز نہیں ہے۔ فائدہ 2: ابن عربی کا قول ہے کہ زمین میں پھرنا دو قسم کا ہے ایک قسم بطریقہ ھرب ہے یعنی بھاگنا۔ دوسری قسم بطریقہ طلب پہلی قسم میں چھ قسمیں ہیں۔ (۱) دارالحرب سے دارالاسلام کی طرف ہجرت (۲) جس زمین میں بدعت غالب ہو وہاں سے ہجرت کرنا (۳) اس زمین سے نکل جانا جس میں حرام غالب ہو، (۴) بدنی تکلیف سے بچنے کیلئے نکل جانا جیسا کہ نبوت سے قبل موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکل گئے تھے۔ (۵) آب وہوا کی وجہ سے ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں منتقل ہونا (۶) مالی نقصان سے بچنے کیلئے اس علاقہ کو چھوڑ دینا اور وہاں سے ہجرت کر کے ایک وطن سے دوسرے وطن میں منتقل ہونا۔ دوسری قسم میں دو طریقے ہیں ایک طلب دین اور دوسرا طلب دنیا کیلئے ہے۔ طلب دین کیلئے نکلنے کی (۹) قسمیں ہیں (۱) سفر برائے عبرت (۲) سفر حج (۳) جہاد وقتال کیلئے سفر: (۴) معاش کیلئے سفر (۵) حلال مال بڑھانے کیلئے سفر کرنا (۶) علم سیکھنے کیلئے سفر کرنا (۷) تین مبارک مقامات کیلئے سفر کرنا ۱) کعبۃ اللہ، ۲) مسجد نبوی، ۳) مسجد اقصیٰ (۸) اسلامی ریاست کی حفاظت کیلئے پہرا دینے کیلئے، (۹) اپنے مسلمان بھائیوں کی ملاقات کے لئے سفر کرنا جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا عظیم ذریعہ ہے۔ ان اسباب میں چوتھا اور پانچواں سفر دنیا کی طلب کیلئے ہے اور چوتھا واجب اور پانچواں مباح ہے۔

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ إِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿۱۰۱﴾ ''اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں یہ کہ تم نماز قصر کرو اگر تمہیں اس بات کا ڈر ہو کہ وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے تمہیں فتنے میں ڈال دینگے یقیناً کافر تمہارے ظاہر دشمن ہیں'' -[101]

تفسیر 101 اس آیت میں ساتواں سیاسی حکم بیان ہو رہا ہے اور وہ حالت سفر میں (اور خوف میں) نماز کی پابندی ہے البتہ قصر و تخفیف کے ساتھ ہے۔ (ربط ۱) چونکہ ہجرت کا مسئلہ ذکر ہوا جس میں لازمی طور پر سفر کرنا پڑتا ہے تو سفر اور ہجرت کی مشقتوں کے جمع ہونے کی وجہ سے صلوٰۃ قصر کا حکم دیا گیا۔ (ربط ۲) یہ بات بیان ہوئی کہ ہجرت کی نیت پر پورا اجر ملتا ہے اگرچہ ہجرت پوری نہ ہو سکے تو اب صلوٰۃ قصر کا مسئلہ بیان ہو رہا ہے کہ حالات سفر و خوف میں اگرچہ نماز صلوٰۃ قصر ہو مگر اجر اللہ تعالیٰ پورا دیتا ہے۔ وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ ہجرت میں بھی ضرب فِي الْأَرْضِ ہے اسلئے اس پر عطف کیا ہے۔

عرف میں ضَرَبَ فِي الْأَرْضِ: کا اطلاق سفر پر ہوتا ہے صرف اپنی بستی میں گھومنے پھرنے کو ضَرَبَ فِي الْأَرْضِ نہیں کہا جاتا ہے۔ فِي الْأَرْضِ فِي سَبِيلِ اللهِ: نہیں فرمایا یا اسلئے کہ قصر نماز جہاد، حج، عمرہ، ہجرت، علم کی طلب وغیرہ کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ بالاتفاق مباح کاموں کیلئے سفر میں نماز قصر سنت ہے اور معصیت کے سفر میں اختلاف ہے۔ اَلْاَرْضِ خشکی اور تری دونوں کیلئے ہے اور مقدار سفر قصر میں محدثین اور مفسرین کا اختلاف ہے۔ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ: حرف (فِي) ان سے پہلے مقدر ہے۔ مِنَ الصَّلٰوةِ میں مِنْ برائے تبعیض ہے اور لفظ شَيْئًا مِنَ الصَّلٰوةِ: مقدر ہے یہ سیبویہ کا قول ہے اور اخفش کا قول ہے کہ مِنْ اضافی ہے۔ اس قصر میں دو قول ہیں: پہلا جمہور علماء کا ہے کہ اس میں قصر سے مراد رکعتوں کی تعداد میں کمی کرنا ہے پھر اس میں بھی دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ چار رکعتوں کی جگہ دو رکعت ادا کریں یہ سفری نماز ہے خواہ خوف ہو یا نہ ہو البتہ فجر اور مغرب میں قصر نہیں ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری کتاب تقصیر الصلوٰۃ حدیث 1092 میں وارد ہے مِنَ الصَّلٰوةِ مِنْ برائے تبعیض ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض نمازوں میں قصر نہیں ہے۔ جمہور کے نزدیک دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد صلوٰۃ خوف اور سفر دونوں ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر اہل علم سے منقول ہے کہ صلوٰۃ اقامت یعنی حضر چار رکعت ہے اور صلوٰۃ سفر دو رکعت ہے اور صلوٰۃ خوف ایک رکعت ہے۔ (صحیح مسلم کتاب صلاۃ المسافرین حدیث 686 / ابو داؤد کتاب صلاۃ السفر حدیث 1199 ابن ماجہ کتاب الاقامۃ الصلوٰۃ حدیث 1065) قصر میں تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد آسانی یعنی تخفیف ہے جب حالت جنگ ہو اور دشمن کے غلبہ کا خوف ہو یعنی وقت التحام ہو تو اشارہ سے صلوٰۃ کی ادائیگی یا صلوٰۃ میں ایک مقام سے دوسرے مقام میں منتقل ہونا جائز ہے۔ یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہما، طاؤس اور مجاہد رحمہم اللہ سے نقل ہے اور صحیح مسلم، ابوداؤد، ترمذی کی حدیث سے ماخوذ ہے کہ نبی کریم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ اب تو خوف نہیں ہے اور ہم امن میں ہیں تو جواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ صدقہ ہے اللہ تعالیٰ نے تم پر صدقہ کیا ہے۔ (صحیح مسلم کتاب صلوٰۃ المسافرین حدیث 686) تَصَدَّقَ اللهُ بِهَا عَلَيْكُمْ: لہٰذا اسے قبول کرو اور لفظ قصر رکعت کی کمی میں استعمال ہوتا ہے اور کیفیت وہیئت کی تبدیلی میں استعمال نہیں ہوتا۔ فائدہ: صلوٰۃ قصر، سفر میں بالاتفاق درست و جائز ہے البتہ واجب ہونے میں اختلاف ہے اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین عظام اور امام مالک رحمہ اللہ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ قصر واجب ہے اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک قصر اور مکمل صلوٰۃ میں اختیار ہے البتہ قصر افضل ہے۔

سوال: لفظ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ: سے پتا چلتا ہے کہ قصر واجب نہیں ہے۔ جواب ١: یہ آیت فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا: کی طرح ہے جو کہ صفا مروہ کے درمیان سعی کرنے سے متعلق ہے جبکہ وہاں سعی واجب ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے کہ اگر یہ سعی واجب نہ ہوتی تو عبارت میں أَنْ لَّا يَطَّوَّفَ الفاظ ذکر ہوتے صحیح بخاری کتاب التفسیر تو اسی طرح اگر یہاں پر واجب مراد نہ ہوتا تو عبارت أَنْ لَّا تَقْصُرُوا ہوتی۔ جواب ٢: امام آلوسی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ لوگ چونکہ پوری نماز کے عادی ہیں تو قصر سے وہم پیدا ہوتا ہے کہ یہ گناہ تصور نہ ہو تو اس وہم کو ختم کرنے کیلئے فرمایا کہ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا - إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا: یہاں پر فتنہ سے مراد حملہ کرنا یا دین سے پھیرنا اور خشوع کو زائل کرنا یا ہر اس عمل پر تعرض کرنا ہے جو تمہیں ناپسند ہو۔ سوال: اس جملہ میں دلیل ہے کہ قصر سفر اور خوف کے ساتھ مقید ہے یعنی سفر میں جب خوف ہو اور حالت امن میں قصر جائز نہیں ہے جیسا کہ اہل ظاہر کا قول ہے۔ جواب ١: امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ قید غالب اعتبار سے ہے اسلام کے ابتدائی دور میں سفر خوف پر مشتمل ہوتا تھا اکثر سفر میں خوف موجود تھا اور اس کی دلیل وہ احادیث مبارکہ ہیں جن میں وارد ہے کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حالت امن میں بھی قصر نماز ادا کی ہے ان احادیث کو امام ابن کثیر نے نقل کیا ہے اور پھر فرمایا ہے کہ یہ روایتیں اس بات کی دلیل ہے کہ سفر میں قصر پڑھنے کے لیے خوف کی شرط نہیں۔ (صحیح بخاری کتاب تقصیر حدیث 1083) جواب ٢: چونکہ ایک قول ہے کہ یہاں قصر کیفیت کے معنی میں ہے یعنی خوف سے صلوۃ کی کیفیت بدل جانا تو اس قصر میں خوف شرط ہے یہ قول ضحاک، سدی اور مجاہد کا ہے اور اس کی تائید میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے جو ابن جریر و ابن کثیر نے نقل کیا ہے کہ ہم قرآن مجید میں صلوۃ خوف تو پاتے ہیں اور قصر صلوۃ نہیں پاتے وہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل میں پاتے ہیں۔ (صحیح ابن ماجہ باب تقصیر الصلوۃ فی السفر حدیث 1066، احمد 2، 94 شیخ البانی نے اس روایت کو صحیح کہا ہے)۔ جواب ٣: ابن جریر نے علی رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے یہ قول نازل فرمایا کہ وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ: پھر ایک سال بعد جنگ کی نوبت آئی تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا کہ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا اور اس کا جواب مقدر ہے یعنی صلوۃ خوف کے طریقہ پر نماز پڑھو جو بعد والی آیت میں مذکور ہے۔ إِنَّ الْكَافِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُبِينًا: یہ جملہ معترضہ ہے اور حکم قصر کیلئے علت ہے یا پھر خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمْ: کیلئے علت ہے۔ عَدُوًّا یہ جمع کے معنی میں ہے یا مصدر ہے

اور لفظ ذُو مقدر ہے مُبِیْنًا معنی یہ ہے کہ ان کی دشمنی علامات سے ظاہر ہے یا ظاہر دشمنی کرتے ہیں۔

وَ إِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوْٓا أَسْلِحَتَهُمْ ۚ فَإِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۖ وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّنْ مَّطَرٍ أَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى أَنْ تَضَعُوْٓا أَسْلِحَتَكُمْ ۖ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ۗ إِنَّ اللّٰهَ أَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ "اور جب آپ ان میں ہوں پھر آپ قائم کریں ان کیلئے نماز تو چاہئے کہ ان میں سے ایک جماعت آپ کے ساتھ کھڑی ہو اور چاہئے کہ لے لے اپنے ساتھ اپنا (اسلحہ) ہتھیار پس جب وہ سجدہ کر لے تو وہ تمہارے پیچھے ہو جائے اور چاہئے کہ دوسری جماعت آئے کہ اس نے نماز نہیں پڑھی ہے وہ آپ کے ساتھ نماز پڑھ لے اور چاہئے کہ اپنا (سامان) بچاؤ اور ہتھیار لے لے وہ لوگ چاہتے ہیں جنہوں نے کفر کیا ہے کاش کہ تم اپنے اسلحے اور اپنے سامان سے غافل ہو جاؤ اور تم پر وہ ٹوٹ پڑیں یک بار ٹوٹ پڑنا اور تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اگر تمہیں بارش سے تکلیف ہو یا تم بیمار ہو یہ کہ تم اپنے ہتھیار رکھ دو اور اپنے بچاؤ کا سامان ساتھ رکھ لو یقیناً اللہ تعالیٰ نے کافروں کیلئے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے" [102]۔

تفسیر 102 (ربط) گذشتہ آیت میں نماز میں قصر رکعتوں کے تعداد کے حساب بیان ہوا اب یہاں کیفیت بیان کر رہے ہیں یعنی اب تفصیل کے ساتھ بیان فرما رہے ہیں اس ایک خاص حالت میں جب خوف ہو۔ اس آیت میں صلوٰۃ خوف کا ذکر ہے اور ماقبل پر اس مناسبت کی وجہ سے عطف کیا ہے یعنی جو خوف پہلی آیت میں مراد ہے وہی خوف عطف کی وجہ سے اس آیت میں بھی مراد ہے۔ بعض علماء کے نزدیک نماز کا یہ طریقہ صرف سفر کے ساتھ خاص ہے اسی طرح جمہور علماء کے نزدیک حضر یعنی گھر میں رہتے ہوئے بھی یہ طریقہ درست ہے ان وجہ سے اس کو مستقل آیت میں ذکر کیا ہے۔ وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ: اس قید کے ظاہر کے اعتبار سے ابو یوسف، حسن بن زید اور ابراہیم بن علیہ رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ صلوٰۃ خوف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھی حالت خوف میں دو جماعتیں ہونی چاہئے اور مزنی شافعی رحمہم اللہ کا قول ہے کہ صلوٰۃ خوف منسوخ ہوئی ہے لیکن یہ بات درست نہیں ہے صحیح بات یہ ہے کہ منسوخ بھی نہیں ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ

خاص بھی نہیں ہے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے صلوٰۃ خوف ادا کی ہے جیسا کہ سنن ابوداؤد اور سنن نسائی میں وارد ہے کہ طبرستان میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے صلوٰۃ خوف ادا کی تھی اس میں کافی تعداد میں صحابہ کرام شریک تھے کسی نے اعتراض بھی نہیں کیا تھا یہ اجماع کے مثل ہے اور خطاب میں جو تخصیص نبی کریم ﷺ کے ساتھ کی گئی ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ حکم بھی انہی کیلئے خاص ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً : سورۃ توبہ آیت 103 ۔ نیز ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر مطلقاً عموماً پابند ہیں اور خاص کر صلوٰۃ میں کہ جیسا کہ حدیث میں ہے: صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ (صحیح بخاری کتاب الادب حدیث 6008) امام قرطبی اور ابن کثیر رحمہم اللہ نے خوب تفصیل ذکر کی ہے۔ وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ : واضح دلیل ہے کہ نبی ہر وقت ہر جگہ ہر زمانہ میں حاضر و ناظر نہیں ہے اسلئے کہ اگر وہ ہماری جماعت کے ہوتے ہوئے حاضر ہو تو امامت کا حق انہیں کو حاصل ہے کسی اور کو امامت کا حق نہیں ہے اور نہ ہی نماز درست ہو سکتی ہے لہٰذا یہ عقیدہ انتہائی جہل اور شرک پر مبنی ہے۔ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ: اس سے جماعت مراد ہے اور اس لفظ میں اشارہ ہے کہ صلوٰۃ خوف میں دوران نماز میں آنا جانا اور کبھی قتال کی صف میں کھڑا ہونا ہوتا ہے یہ اعمال صلوٰۃ خوف کے منافی نہیں ہیں۔ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ: یعنی لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائیگا تو ایک گروہ امام کے ساتھ صلوٰۃ ادا کرے اور ایک گروہ دشمن کے مقابل دفاع کرے گا اور یہ بات ظاہر ہے اسلئے اس کی عبارت میں تصریح نہیں کی۔ وَلْيَاْخُذُوْا اَسْلِحَتَهُمْ: ضمیر اس گروہ کی طرف راجع ہے جو امام کے ساتھ نماز میں شریک ہے اس میں اہتمام نماز کے ساتھ ساتھ جہاد کیلئے بیداری مقصد ہے۔ فَاِذَا سَجَدُوْا: سجود سے امام کے ساتھ رکعت مراد ہے۔ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ فقط سجدہ پر نماز کا اطلاق بہت سارے نصوص میں وارد ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو اس کو چاہیے کہ دو سجدے ادا کرے۔ (صحیح بخاری صلاۃ خوف حدیث 942 صحیح مسلم صلاۃ خوف حدیث 839) یعنی دو رکعت نماز تحیۃ المسجد ادا کرے۔ فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ: ضمیر سجدہ کرنے والوں کی طرف راجع ہے یا پھر دوسرے گروہ کو لیکن پہلا قول صحیح اور بہتر ہے یعنی تمہارے پیچھے چوکیداری کیلئے وہ پہرہ دیتا رہے۔ چونکہ نماز میں قیام فرض ہے تو اس کیلئے فَلْتَقُمْ فرمایا اور جہاد میں اگرچہ قیام بھی ہوتا ہے لیکن لازمی نہیں ہے کسی بھی صورت میں حراسہ چوکیداری کا عمل ہو سکتا ہے۔ اسلئے فَلْيَكُوْنُوْا یہاں پر فرمایا ہے جو موجود ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا: یعنی وہ گروہ جو چوکیداری یا پہرا دینے پر

مصروف قعادہ آ کر امام کے ساتھ شریک ہو جائے اور امام سلام نہیں پھیریگا بلکہ ان کا انتظار کریگا۔ فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ: اس سے امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھنا مراد ہے اور یہ امام کی دوسری رکعت ہے اور دوسرے گروہ کے لئے پہلی رکعت ہے یا دوسری رکعت ہے۔ اس میں دو قول ہیں لیکن صحیح قول پہلے والا ہے (تفسیر قاسمی) اس آیت میں دونوں گروہوں کا ذکر نہیں ہوا ہے تو اس میں دو قول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ مقتدیوں کیلئے صلوٰۃ خوف ایک ہی رکعت ہے۔ سفیان ثوری اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ وغیرہ کا یہ موقف ہے۔ دوسرا قول جمہور علماء کا ہے کہ سفر میں صلوٰۃ خوف مقتدیوں کیلئے بھی دو رکعت ہے ایک رکعت امام کے ساتھ دوسری رکعت تنہا پڑھینگے۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں وارد ہے، اس صلوٰۃ کے دو طریقے ہیں: (۱) ایک طریقہ یہ ہے کہ ایک رکعت امام کے ساتھ اور ایک رکعت ہر ایک گروہ اکیلے ادا کرے گا جیسے صحیح بخاری میں وارد ہے۔ (۲) دوسرا طریقہ بھی صحیح بخاری میں ہے کہ پہلا گروہ ایک رکعت امام کے پیچھے پڑھ کر دوسری رکعت اسی جگہ تنہا اکیلے ادا کر کے سلام پھیر کر چلا جائے اور وہ گروہ جو مورچہ چوکیداری میں ہے وہ آ جائے گا اور امام کے ساتھ ایک رکعت ادا کر لے گا جب امام سلام پھیر دیگا تو پھر یہ لوگ اپنی باقی رکعت ادا کرینگے یہ تفصیل صحیح بخاری کتاب المغازی غزوہ ذات الرقاع میں موجود ہے۔ فائدہ: ابوحیان رحمہ اللہ نے ابن العربی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ صلوٰۃ خوف 24 طریقوں پر حدیث میں وارد ہے ابوحیان رحمہ اللہ نے اس میں سے دس (10) طریقے تفصیل کے ساتھ تحریر کئے ہیں۔ صاحب اللباب نے امام احمد رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ صلوٰۃ خوف میں جو بھی طریقے حدیث میں وارد ہیں ان پر عمل کرنا چاہئے اور وہ جائز ہیں پھر انہوں نے 6 یا 7 طریقے ذکر کئے ہیں۔ امام ابن کثیر نے فرمایا ہے کہ صلوٰۃ خوف کی بہت اقسام ہیں کبھی دشمن قبلہ کی جانب ہوتا ہے اور کبھی مخالف سمت میں ہوتا ہے کبھی خوف دشمن کا زیادہ ہوتا ہے اور کبھی کم ہوتا ہے کبھی نماز چار رکعت والی ہوتی ہے کبھی تین اور دو رکعت ہوتی ہے۔ کبھی جماعت نہیں ہوسکتی خوف زیادہ ہوتا ہے کبھی خوف کم ہوتا ہے تو صلوٰۃ با جماعت ادا ہوتی ہے کبھی سواری پر صلوٰۃ کی ادائیگی ہوتی ہے اور کبھی پیادہ ادائیگی ہوتی ہے ان اسباب کی وجہ سے اس میں احادیث مختلف آئی ہیں۔ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ: حذر سے بیداری یا وہ چیز مراد ہے جو اسلحہ کے علاوہ سامان بچاؤ میں سے ہو تو دوسری توجیہہ کے مطابق اسلحہ کا عطف خاص کا عام پر عطف ہے۔ فائدہ: اس مقام میں حذر زیادہ ذکر کیا ہے اسلئے کہ پہلے گروہ کی نماز پر دشمن کو اطلاع نہیں ہوتی لیکن جب ایک گروہ آتے اور دوسرا گروہ ایک رکعت پڑھ کر جا رہا ہو تو اس آنے جانے میں نقل و حرکت سے دشمن کو معلوم ہو جاتا ہے تو اس کے ساتھ لفظ حفاظت کیلئے حذر بار بار ذکر کیا کیونکہ دشمن کو صلوٰۃ میں

مشغول ہونے کا پتا چلا ہے تو حملے کا خطرہ بڑھ گیا ہے جیسا کہ بعد میں ہے: وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ: یہ جملہ استنافیہ ہے جس میں اسلحہ ساتھ رکھنے اور بیداری سے رہنے کی علت بیان کی ہے۔ وَدَّ تمنا کے معنی میں ہے لَوْ مصدریہ ہے اسلحہ کی غفلت سے مراد صلوٰۃ کے دوران میں اس کا رکھ لینا ہے اور اَمْتِعَتِكُمْ میں وہ سامان مراد ہے جو اسلحہ کے علاوہ جہاد میں مجاہد استعمال کرتا ہے۔ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً: وَاحِدَةً سے ایسا حملہ مراد ہے کہ دوسرے حملے کی ضرورت باقی نہ رہے لہٰذا اسلحہ پکڑنے کا مقصد دشمن کے اچانک حملے سے دفاع کیلئے ہے تو معلوم ہوا کہ حالات جنگ میں اسلحہ پکڑنے کا حکم واجب ہے۔ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ: جب عذر کی وجہ سے اسلحہ رکھنا واجب ہے تو بلا عذر اسلحہ پکڑنا جائز ہے۔ اَذًى اور مِّنْ مَّطَرٍ اور مرض سے وہ حالات مراد ہیں جن میں اسلحہ اٹھانے میں بہت زیادہ بوجھ اور مشقت ہو۔ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ: چوکس رہنے کیلئے اس حکم کو پھر دہرایا۔ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا: یہ خُذُوْا کے امر کیلئے علت ہے اور عَذَابٌ مُّهِيْنٌ: سے مراد شکست و مغلوبیت ہے یعنی تم شریعت کے مطابق حکم الٰہی سے اپنی حفاظت اختیار کرو اللہ تعالیٰ ضرور تمہارے دشمنوں کو تمہارے ہی ہاتھوں سے رسوا کریگا اور اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت تمہارے ساتھ شامل حال ہوگی یا پھر یہ کافروں کیلئے آخرت کے عذاب کی وعید ہے اور ایمان والوں کیلئے اطمینان ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات بجالائیں۔

فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿١٠٣﴾ " پھر جب تم نماز مکمل کر و تم اللہ تعالیٰ کا ذکر حالت قیام اور بیٹھے ہوئے اور اپنی کروٹوں کے بل کرتے رہو پھر جب تم بے خوف ہو جاؤ تو نماز قائم کرو یقیناً نماز ایمان والوں پر مقررہ وقتوں میں فرض ہے [103]۔

تفسیر 103 یہ سابقہ آیت کا تکملہ ہے یعنی صلوٰۃ خوف کے بعد ذکر کر دیا مطلب یہ ہے کہ شدت خوف کی صورت میں نماز کے وقت ذکر کرو یہ دونوں توجیہات مفسرین کے دو اقوال کے مطابق ہیں)۔ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ: اس میں دو تفسیر ہیں: (۱) قضا کا معنیٰ ادا کرنا اور فارغ ہونا ہے جیسا کہ اس فرمان میں ہے کہ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ۔ جب تم احکامات پورے کرو سورۃ بقرہ آیت 200۔ اور فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ: پس جب صلوٰۃ جمعہ ادا کی جائے سورۃ جمعہ آیت 10۔ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ: اس سے زبان و دل کا ذکر مراد ہے۔ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ: اس سے مراد ہر

حال میں ذکر کو ہمیشگی اور دوام ہونا مقصد ہے اسلئے کہ انسان کی زندگی ان ہی تین حالتوں میں منحصر ہے۔ جیسا کہ مجاہد دشمن کے مقابلے میں کھڑا رہتا ہے یا مورچہ میں دشمن کی تاک میں بیٹھا ہوا ہوتا ہے یا دشمن پر نشانہ لگانے کیلئے کروٹ کے بل ہوتا ہے یا زخمی حالات میں زمین پر کروٹ میں ہوتا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ذکر تکبیر پڑھنے سے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ اور ساتھ میں مسنون دعائیں پڑھنا مراد ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ جنگ کی شدت میں صلوٰۃ ادا کرنا مراد ہے، ایسا شدید خوف جس میں عموماً نماز باجماعت نہیں پڑھی جاسکتی ہے جیسا کہ سورۃ بقرہ آیت 238 میں ہے۔ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا: ایسے حالات میں تعین قبلہ لازم نہیں ہوتا ہے۔ لہٰذا فَاذْكُرُوا: سے مراد صلوٰۃ ہے جو مذکورہ تین حالتوں میں اپنی استطاعت کے مطابق ہے۔ امام قرطبیؒ نے یہاں پر ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے مسجد میں جہری ذکر سے لوگوں کو منع کیا تو انہوں نے جواب میں یہ آیت بطور دلیل پیش کی تو انہوں نے کہا کہ اس سے نماز مراد ہے مگر پہلی تفسیر بہتر ہے۔ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ: اطمینان سے مراد خوف کے ازالہ کے بعد والا اطمینان ہے یعنی جب پریشانی خوف مشقت وغیرہ ختم ہو اس میں دو احتمال ہیں: (۱) یعنی جب تم سفر سے پلٹ کر اطمینان سے مقیم ہوجاؤ تو نماز پورے ارکان و شرائط کے ساتھ اور مکمل ادا کرو۔ (۲) دوسرا احتمال یہ ہے کہ تم پر خوف کے بادل منڈلا رہے تھے وہ زائل (ختم) ہوئے تو اگرچہ سفر جاری ہے مگر صلوٰۃ باجماعت پڑھو یہ سورۃ بقرۃ 238 کی طرح ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا: اس میں ایک وہم کا جواب ہے وہم یہ تھا کہ حالات خوف وسفر میں نمازوں کو چھوڑ دیں یا مشقت کی وجہ سے صلوٰۃ کو موخر کردیں تو اس کا جواب ہوا کہ نماز اوقات مقررہ میں فرض ہے وہ کسی خوف یا مشقت کی وجہ سے موخر نہیں کی جاسکتی ہے۔ لہٰذا خوف میں امن سفر اور حضر میں حکم الٰہی کا اعتبار کیا جائیگا۔ كِتٰبًا مَّكْتُوْبًا: کے معنی میں ہے جس سے فرضیت مراد ہے اور مَوْقُوْتًا بمعنی مُؤَقَّتَةً یا مَحْدُوْدَةً ہے یعنی صلوٰۃ کیلئے اوقات مقرر ہیں جو اجمالاً قرآن کریم میں موجود ہیں۔ جیسے سورۃ بقرہ آیت 238، سورۃ روم آیت 17، 18، سورۃ ہود آیت 114، سورۃ بنی اسرائیل آیت 78، سورۃ طٰہٰ آیت 130 میں اور احادیث نبوی میں تفصیلاً اوقات کا مکمل ذکر ہے یہاں تک کہ سفر میں دو نمازوں کا جمع کرنا جیسا کہ صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ حدیث 1107 کتاب صلوٰۃ المسافر وقصرھا صحیح مسلم حدیث 703 میں وارد ہے ظہر وعصر، مغرب وعشاء اکٹھے پڑھنا جمع تقدیم وجمع تاخیر کے ساتھ یہ بھی عرفات اور مزدلفہ کی طرح اوقات (مَوْقُوْتًا) مقررہ میں شامل ہے اور مَوْقُوْت كِتٰبًا کیلئے صفت ہے اسلئے اس کو مذکر صیغہ سے ذکر کیا ہے۔

وَلَا تَهِنُوْا فِی ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ یَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَ تَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا یَرْجُوْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا۠ ۝ "اور تم سستی مت کرو (کافر) قوم کے (جنگ کیلئے) تلاش میں اگر تم دکھ (تکلیف) اٹھاتے ہو تو وہ بھی اس طرح دکھ اٹھاتے ہیں جیسا کہ تم دکھ اٹھاتے ہو اور تم اللہ تعالیٰ سے امید رکھتے ہو اس کی جس کی وہ امید نہیں رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا حکمت والا ہے" [104]۔ ع

تفسیر 104 (ربط) سابقہ آیت میں صلوٰۃ کی ترغیب دی گئی تو اب قتال کی ترغیب دی جاتی ہے اسلئے کہ ایسا نہ ہو کہ تم ذکر اذکار اور نماز کی طرف اتنے متوجہ رہو کہ قتال سے غافل ہو جاؤ تو اس آیت میں (تشجیع) بہادری کی ترغیب ہے۔ وَلَا تَهِنُوْا یہ پہلے کے معنی پر عطف ہے یعنی نماز اور ذکر کرو مگر قتال میں سستی مت کرو۔ وَهْن کا معنی سورۃ آل عمران میں گزرا ہے۔ عدم وہن سے اسباب وہن کو ترک کرنا مراد ہے یعنی دنیا کی محبت، اور موت سے خوف ہیں جن سے مؤمن میں وَهْن آتا ہے ان کو چھوڑ دو یعنی دنیا سے محبت اور موت سے خوف اور دیگر عبادات میں اس طرح مشغول ہونا کہ فرضی جہاد فراموش کردیں۔ فِی ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ: اِبْتِغَآء سے مراد ان کو تلاش کرنا ہے جہاں بھی گمان ہو سکتا ہے ان کو وہاں تلاش کرو قتل کرو۔ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ یَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ: اس میں کافر قوم کی تلاش اور قتل کی ترغیب ہے یعنی جنگی زخموں اور تکلیفوں میں تم شریک ہو یہ سورۃ آل عمران آیت 140 اور 165 کی طرح ہے۔ اشارہ ہے کہ جب وہ درد اور تکالیف پر صبر کرتے ہیں تو تم لازمی طور پر صبر کرو اسلئے کہ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا یَرْجُوْنَ درد اور تکالیف میں برابری کے بعد اب مؤمنین کا امتیاز ذکر ہو رہا ہے کہ دو تو اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ امام آلوسی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ سے امید رکھتے ہو اس چیز کی کہ کافروں کا اس بارے میں وہم و گمان تک نہیں یعنی تمام ادیان پر اپنے دین اسلام کو غالب کرنا اور بہت سارے اجر و ثواب سمیٹ لینا اور جنت کی نعمتوں کا مل جانا دلی تمنا ہے لہذا تم پر لازم ہے کہ شجاعت و دلیری اختیار کرو اور مصائب پر صبر اپناؤ یا رَجَآء کا معنی خوف ہے یعنی تمہارے دلوں میں خوف الٰہی ہے کہ کہیں اللہ تعالیٰ کا عذاب نہ آجائے لہذا اس خوف کی وجہ سے تم وَهْن سستی نہیں کر سکتے ہو۔ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا: تمہاری نیتوں خفیہ حالتوں (رَجَآء) وغیرہ پر عالم ہے اور اسکا حکم اور نہی (منع) حکمت سے خالی نہیں ہے۔

اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ وَ لَا تَكُنْ لِّلْخَآىِٕنِیْنَ خَصِیْمًا ۝

"یقیناً ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ کتاب نازل کی تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس کے ساتھ فیصلہ کریں جو اللہ تعالیٰ

نے آپ کو سکھلایا ہے اور آپ خیانت کرنے والوں کی خاطر جھگڑنے والے نہ ہوں" [105]۔

تفسیر 105 اس آیت میں آٹھواں سیاسی حکم ہے یعنی فیصلہ کرنے میں کتاب اللہ کے فیصلہ پر کسی کی طرفداری کو مقدم نہ کرنا خصوصاً جو خائن نہ ہو امانت دار ہو۔ (ربط ۱) چونکہ سابقہ آیت میں جہاد کی ترغیب اور مومنوں کی اللہ تعالیٰ سے امیدوں کا ذکر ہوا تو اب اس آیت میں بتایا جارہا ہے کہ کسی کی طرف داری مت کرنا کیونکہ یہ صفت منافقین کی ہے لہٰذا اس قسم کی صفات سے اپنے آپ کو پاک رکھو۔ (ربط ۲) سابقہ احکام صلوٰۃ، جہاد، ہجرت، صلوٰۃ خوف، سفر کا ذکر ہوا تو اب ذکر ہورہا ہے کہ تمام احکامات میں شریعت یعنی قرآن وسنت کی پیروی کرو اور اس کی طرف رجوع کرو اور منافقین کی طرح خیانت مت کرنا۔ إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ۔ (با) ملابست کیلئے ہے یعنی حق پر مُتَلَبِّسٌ اور مشتمل ہے یعنی اس میں کوئی مشکوک، باطل اور غلط بات نہیں ہے۔ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ نزول قرآن کے مقاصد میں سے یہ ایک مقصد ہے جو تمام آسمانی کتابوں کا مقصد ہے جیسا کہ سورۃ بقرہ آیت 213 میں ذکر ہوا ہے نزول قرآن کے بعض دیگر مقاصد دیگر آیتوں میں ہیں جیسے لوگوں کو قرآن کی تلاوت پیش کرنا سورۃ اسراء آیت 106 میں ہے اور کتاب اللہ کی تشریح کرنا سورۃ نحل آیت 44 اور 64 میں ہے۔ (نذیر، بشیر) ڈرانا اور خوشخبری دینا جیسا کہ سورۃ کہف آیت 2، 3، سورۃ شعراء آیت 193 اور سورۃ فرقان آیت ا میں ہے لوگوں کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال لانا سورۃ ابراھیم آیت 1: لوگوں کو عدل و انصاف پر قائم رکھنا سورۃ حدید آیت 25 اور بھی بہت سے مقاصد ہیں۔ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ: یہ رؤیت سے لیا گیا ہے جو کہ علم کے معنی میں ہے اور نبی کا علم وحی الٰہی ہے اور علم کو رؤیت اسلئے کہا گیا ہے کہ جو چیز علم یقینی سے ثابت ہو جائے وہ اس طرح ہوتی ہے جیسا کہ انسان نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہو۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ أَرَاكَ اللَّهُ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد داخل ہے اور اس عنوان میں انہوں نے بہت سے احادیث ذکر کی ہیں ان کا وہاں مطالعہ کریں لیکن نبی کا اجتہاد نص شرعی کی طرح ہے اسلئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی خطاء کو برقرار نہیں رکھتے۔ امام بیہقی اور ابن عبدالبر رحمہم اللہ نے عمر رضی اللہ عنہ کا اثر نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ نے مجھے دکھلایا ہے کیونکہ یہ خصوصیت نبی ﷺ کی ہے اسلئے کہ اس کی رائے حق ہے اور ہماری رائے تو گمان اور تکلف ہے۔ قرطبی، زمخشری، قاسمی رحمہم اللہ۔ فائدہ: بِمَا أَرَاكَ سے مراد وحی خفی ہے یعنی سنت رسول ﷺ ہے کیونکہ قرآن کی وحی کیلئے أَنْزَلَ یا أَوْحَى الفاظ مستعمل ہیں لہٰذا یہ دلیل ہے کہ سنت رسول دین میں قرآن کی طرح حجت اور وحی ہے۔ وَلَا تَكُنْ

لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ۔لِلْخَآئِنِيْنَ: یہ لفظ خَصِيْمًا کے ساتھ متعلق ہے اور یہ لام برائے تعلیل ہے اور یہ پہلا ادب ہے۔ یعنی خیانت کی وجہ سے اور ان کی طرف داری کی وجہ سے جھگڑالو مت ہو اور ان کی طرف داری مت کرنا۔ خائن عام ہے چور ہو یا اس کا معاون ہو یا کوئی جرم کر بیٹھا ہو اسلئے جمع کا صیغہ ذکر کیا ہے۔ فائدہ: ابو حیان رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ مفسرین نے اس آیت کے شان نزول میں طویل روایتیں ذکر کی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ طعمہ بن ابیرق نے قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کی زرہ (جنگی قمیص) چوری کر کے آٹے کے برتن میں چھپائی پھر بطور امانت ایک یہودی کے گھر میں رکھی اور اس یہودی کو اس کا علم نہیں تھا جب قتادہ نے طعمہ پر چوری کا دعوی کیا تو اس نے انکار کیا اور قسم کھائی کہ مجھے کوئی علم نہیں ہے۔ لہذا انہوں نے تفتیش شروع کی تو آٹے کی علامات یہودی کے گھر تک پہنچ گئیں تو طعمہ اور اس کے ساتھیوں نے اس یہودی پر الزام لگایا تو یہودی نے کہا کہ یہ طعمہ نے میرے پاس بطور امانت رکھی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے طعمہ کی قسم کی وجہ سے طعمہ کی طرف داری کا ارادہ کیا کہ اس کو چوری سے بری الذمہ قرار دے اور یہودی پر چوری کا حکم لگائے چونکہ نبی کریم ﷺ غیب دان نہیں، غیب کا علم نہیں جانتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق یہ آیتیں ایک رکوع تک نازل فرمائیں۔ (صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 3036)۔

وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۚ﴿۱۰۶﴾

"اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرو یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے" [106]۔

تفسیر 106 یہ دوسرا ادب ہے۔ (سوال) اللہ تعالیٰ سے مغفرت کو طلب کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے گناہ ہوا ہے۔ (جواب) جب یہ بات ثابت ہوئی کہ نبی کریم ﷺ عالم الغیب نہیں ہیں تو آپ نے صرف ظاہری موافقت کی وجہ سے ارادہ کیا کہ چوری کا حکم یہودی پر جاری کریں اسلئے کہ سامان یہودی سے برآمد ہوا تو یہ یہودی پر ثابت ہونے میں صریح دلیل ہے لہذا نبی کریم ﷺ نے گناہ نہیں کیا ہے اس لئے اس کی تاویل کرنا ضروری ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ، صاحب اللباب اور دیگر مفسرین نے مختلف توجیہات ذکر کی ہیں۔ پہلی توجیہ: مشہور قول ہے کہ عام لوگوں کی نیکیاں مقرب خاص بندوں کے گناہ تصور کئے جاتے ہیں یعنی حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ: یعنی خلاف اولیٰ کام ان کیلئے محتاج استغفار ہوتے ہیں۔ دوسری توجیہ: یہ استغفار بطور عبادت (تَعَبُّدِیْ) ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ تیسری توجیہ: یہ استغفار طعمہ کے طرف داروں کیلئے بطور دعا ہے یعنی ان کیلئے مغفرت کی دعاء کرو۔ چوتھی توجیہ: ؟ دل کی تنگی یہاں پر غین

نہیں بلکہ یقین ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا میرے دل میں تنگی آتی ہے (لوگوں کے اعمال سے) تو میں ستر (70) مرتبہ استغفار پڑھتا ہوں۔ (صحیح بخاری حدیث 6307 ترمذی 3259 فی الدعوات) اس سے معلوم ہوا کہ استغفار کیلئے بہت وجوہات ہیں لہٰذا لازم نہیں ہے کہ یہ گناہ کی وجہ سے ہو۔

وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ﴿١٠٧﴾

"اور آپ ان لوگوں کی طرف سے جھگڑا نہ کریں جو اپنے آپ سے خیانت کرتے ہیں یقیناً اللہ تعالیٰ اس شخص کو پسند نہیں کرتا ہے جو خائن گنہگار ہو" [107]۔

تفسیر 107 یہ تیسرا ادب ہے۔ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ۔ خائنین کیلئے دلائل پیش کرنے کو مجادلہ کہتے ہیں خواہ صحیح ہوں یا غلط۔ (سوال) اس جملہ میں اور وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا: میں کیا فرق ہے؟ (جواب) وہاں خاص قسم کی خیانت کرنے والوں کا ذکر تھا جبکہ یہاں الَّذِينَ يَخْتَانُونَ: عام ہے۔ یا پھر پہلے جملہ میں صرف ان کی طرفداری مراد تھی اور اس میں ان کی جانب سے بحث اور وکالت مراد ہے یا اس جملہ میں خائنین کی طرف داری اور جانب داری مراد ہے اور اس جملہ میں ان کو سزا سے بچانا مراد ہے۔ اس آیت میں واضح دلیل ہے کہ جن کا جرم ثابت اور ظاہر ہو ان کی طرفداری اور بچانے کے لئے ذرائع استعمال کرنا منع ہے۔ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ۔ اس میں وہ لوگ مراد ہیں جو چوری کرتے ہیں یا چوروں کا دفاع کرتے ہیں یا جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔ ان نفوس کے متعلق فرمایا جو اپنے نفسوں سے خیانت کرتے ہیں یعنی گناہوں کے ارتکاب سے اپنے آپ کو سزا کا مستحق بناتے ہیں اور اپنے نفسوں کو نعمتوں لذتوں اور ثواب سے محروم کرتے ہیں۔ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا: یہ لَا تُجَادِلْ کیلئے علت ہے خَوَّانًا مبالغے کا صیغہ ہے یعنی بہت خیانت کرنے والا انسان خیانت میں افراط کرنے والا۔ أَثِيمًا یہ بھی مبالغے کا صیغہ ہے یعنی گناہوں میں گھس جانے والا۔ ان دونوں صفتوں کو جمع اسلئے کیا ہے کہ پہلے والی صفت میں چوری کرنا اور امانت سے انکار کرنا مراد ہے اور دوسری صفت میں پاکدامن شخص پر تہمت لگانا مراد ہے۔ امام آلوسیؒ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے یا پہلی صفت سے زیادہ قسموں والا اور زیادہ چوریاں کرنے والا مراد ہے (طعمہ بن ابیرق میں یہ صفتیں تھیں) اور دوسری صفت باعتبار جدال وطرفداری وغیرہ ہے۔ اول صفت دوسری کیلئے سبب ہے اسلئے اسکو پہلے ذکر کیا ہے۔ ابو حیانؒ نے فرمایا ہے کہ خَوَّان اور أَثِيمٌ مبالغہ کے صیغے اسلئے ذکر کیے ہیں کہ جو ایک دو بار غفلت سے خیانت وچوری کر لیتا ہے تو اس

کا حکم اس طرح نہیں۔ (سوال) سورۃ انفال آیت 58 میں فرمان الٰہی ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ فقط خیانت اللہ کی محبت سے محرومی کا سبب ہے؟۔ (جواب) وہاں خیانت سے وعدہ خلافی مراد ہے اور وہ نفاق کی خاص علامت ہے جو مؤمن کی شان کے یکسر خلاف ہے یہاں پر خیانت سے مراد چوری ہے اگرچہ وہ گناہ کبیرہ ہے لیکن نفاق کی علامت نہیں ہے۔

يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ۝ "وہ لوگوں سے چھپتے ہیں اور (جبکہ) وہ اللہ سے نہیں چھپ سکتے ہیں اور وہ انکے ساتھ ہوتا ہے جب وہ راتوں کو اللہ تعالیٰ کی ناپسندیدہ باتوں کے مشورے کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس کو جو وہ کرتے ہیں گھیرنے والا ہے" [108]۔

تفسیر 108 اس آیت میں منافقین کی مزید بری صفات ذکر ہیں۔ يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ: یہ جملہ مستانفہ ہے یا سابقہ آیت میں جو مَنْ ہے اس سے حال ہے۔ استخفاء اپنے آپ کو چھپانے کو کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ رعد آیت 10 میں مُسْتَخْفٍ بِالَّيْلِ: آیا ہے۔ معنیٰ یہ ہے کہ لوگوں سے اپنے آپ کو چھپاتے ہیں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ اس سے مراد حیاء کرتا ہے۔ واحدی نے کہا ہے کہ یہ معنیٰ ہے تفسیر نہیں ہے یعنی حیاء کی وجہ سے جان چھپاتے ہیں اور لوگوں میں شرمندہ ہونے سے چھپتے ہیں چنانچہ اسی وجہ سے جھوٹی قسموں کے ذریعے سے چوری کا انکار کرتے ہیں اور چوری کا الزام اوروں پر لگاتے ہیں۔ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ: مراد عدم استطاعت ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے چھپ نہیں سکتے اسلئے کہ وَهُوَ مَعَهُمْ وہ ان کے ساتھ ہے یا اِسْتِحْيَاء مراد ہے تو پھر مراد صرف نفی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے حیاء نہیں کرتے۔ مَعَهُمْ یہ معیت عامہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اس میں سلف صالحین رحمہم اللہ سے دو قول منقول ہیں: (1) ایک قول یہ ہے کہ یہ متشابہات میں سے ہے اسکی معیت جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے مناسب ولائق ہو بلا تحریف و تعطیل و بلا تشبیہ و تمثیل و بلا تاویل۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ لفظ مشترک ہے لہٰذا اس کو ایک معنی پر حمل کرنا درست اور مناسب تاویل ہے اسلئے قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ معیت علم و بصر کے ساتھ ہے یعنی دیکھنے و سننے تک ہے (ذات کی حاضری مراد نہیں ہے) یہ اہل سنت والجماعت کا قول ہے اور جہمیہ، معتزلہ اور قدریہ وغیرہ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر مکان میں ہے اور استدلال اسی آیت سے کرتے ہیں مگر ان کا استدلال درست نہیں اسلئے کہ یہ صفت تو جسموں کی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے اور

بشر معتزلی نے جب اس آیت کو مناظرہ میں پیش کیا تھا: مَا یَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ: تو اہل سنت کی طرف سے مناظر نے اس کو جواب دیا تھا کہ کیا اللہ تعالیٰ تیری ٹوپی میں ہے تیرے اور تیرے گدھے کے پیٹ میں ہے ہرگز نہیں وہ تو پاک ذات ہے اس قسم صفت سے یہ قول وکیع رحمہ اللہ سے منقول ہے۔ اِذْ یُبَیِّتُوْنَ مَا لَا یَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ: تَبْیِیْتٌ رات گزارنے کو کہا جاتا ہے اور رات کو کام کرنا یا مشورہ کرنا یعنی طعمہ کے ساتھیوں نے رات کو اس کے بچانے کیلئے مشورہ کیا تھا۔ مِنَ الْقَوْلِ سے مراد جھوٹی قسمیں اور شہادت دینا ہے جس سے مجرم کو نجات اور بے گناہ کو سزا ملے اور قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قول سے رائے اور اعتقاد مراد ہے۔ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطًا: یعنی اگرچہ ان کے کام رات کے مشورے اور چوری وغیرہ مخفی کام ہیں مگر اللہ سے مخفی نہیں ہیں چونکہ ان کے ان اعمال میں بعض اقوال اور بعض افعال ہیں تو ان دونوں پر وعید وتنبیہ دینا مناسب ہے تو اقوال پر تنبیہ ان لفظوں میں ہوئی۔ اِذْ یُبَیِّتُوْنَ مَا لَا یَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ: اور ان کے اعمال کے متعلق اس جملہ میں سخت وعید دی ہے کہ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطًا۔

هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا فَمَنْ یُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَمْ مَّنْ یَّكُوْنُ عَلَیْهِمْ وَكِیْلًا ۝ "ہاں تم وہی لوگ ہو کہ تم نے ان کی طرف سے دنیا کی زندگانی میں جھگڑا کیا پھر کون ان کی جانب سے جھگڑا کرے گا قیامت کے دن یا کون ان کی طرف سے وکیل ہوگا" [109]۔

تفسیر 109: ان لوگوں سے خطاب ہے جو طعمہ کی طرف سے دفاع کر رہے تھے اور اس میں زجر اور توبیخ مقصد ہے۔ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا: جَدَلَ کا معنی ہے رسی کو مضبوطی سے پرو دینا اور بل دینا اور عرف میں اس کا استعمال جھگڑے پر ہوتا ہے گویا کہ لڑنے والوں میں سے ہر فریق اپنے مخالف اپنے مقصد سے موڑتا ہے۔ یہ زجاج کا قول ہے یا پھر یہ لفظ جدال سے لیا گیا ہے تو پھر معنی ہے زمین پر گرانا لہذا مراد یہ ہوا کہ ہر ایک دوسرے فریق کو زمین پر گرانے کی کوشش میں ہے یعنی ان کو ذلیل کرنا چاہتا ہے جو زمین پر گرانے کے مشابہ ہے۔ فَمَنْ یُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ: یہ استفہام توبیخی ہے یعنی استفسار برائے زجر اور تنبیہ ہے اور انکار کے معنی میں ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی جھگڑا بھی نہیں کر سکتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز پر علم رکھتا ہے اس سے کوئی چیز مخفی نہیں تو اس کے ساتھ قیامت کے دن کوئی لڑ بھی نہیں سکتا اور اسے کوئی دھوکا بھی نہیں دے سکتا قیامت کی تخصیص اسلئے کی ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بندوں سے حساب کرے گا تو کسی میں یہ قوت نہیں ہوگی کہ ایسا جواب دے کہ اسے چپ کرا دے۔ اَمْ مَّنْ یَّكُوْنُ عَلَیْهِمْ

وَكِيْلًا۔ اَمْ هَلْ کے معنی میں ہے اور یہاں پر استفہام میں انکاری معنی ہے۔ وکیل اس کو کہا جاتا ہے جسکو کام کا ذمہ دار بنایا جائے یہاں پر اللہ تعالیٰ کے عذاب وحساب سے بچانے کے معنی میں ہے یہاں پر وَكِيْلٌ کے صلہ میں عَلٰى ذکر ہوا ہے جو ولایت کے معنی دیتا ہے یا پھر لام کے معنی میں ہے۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾ "اور جو بھی برا عمل کرے یا اپنے نفس پر ظلم کرے پھر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے تو اللہ تعالیٰ کو بہت بخشنے والا نہایت رحم کرنے والا پائے گا" [110]۔

تفسیر 110 وعیدوں کو ذکر کرنے کے بعد اب توبہ کی ترغیب دی جاتی ہے۔ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ اس میں مفسرین نے کئی وجوہات سے فرق بیان کیا ہے: (۱) سُوْٓءٌ وہ برا عمل ہے جس سے دوسرا بندہ ناراض ہوتا ہے جیسا کہ انہوں نے یہودی اور قتادہ پر الزام لگایا تھا اور ظلم نفس پر اثر انداز ہونے والا وہ گناہ جو نفس کے ساتھ خاص ہو جیسے جھوٹی قسم۔ (۲) سُوْٓءٌ ہر گناہ کو کہا جائیگا سرک کے ماسوا اور ظلم سے مراد شرک ہے۔ (۳) سُوْٓءٌ گناہ صغیرہ ہے اور ظلم گناہ کبیرہ ہے۔ (۴) سُوْٓءٌ چوری یا ہر گناہ ہے اور ظلم کسی پر بہتان اور تہمت لگانے کو کہتے ہیں۔ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ: امام قرطبیؒ نے فرمایا ہے کہ استغفار کے ساتھ توبہ کرنے کی قید بھی مراد ہے کیونکہ توبہ کے بغیر استغفار فائدہ نہیں دیتا ہے اور دیگر نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مشیت (اگر اللہ چاہے) کی قید بھی ہے۔ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا: وِجْدَانٌ کے صیغہ سے تعبیر اسلئے کیا کہ ہر گناہ کرنے والے کو معلوم ہو جائے کہ معافی مانگنے والوں کیلئے اللہ تعالیٰ کی رحمت ومغفرت گویا کہ تیار رہے بس صرف طلب چاہیئے۔ امام قرطبیؒ اور صاحب اللبابؒ رحمہما اللہ نے سفیانؒ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ جس شخص نے یہ آیت اور آیت ۶۴ کی تلاوت کی اور پھر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تو اسے اللہ تعالیٰ معاف کر دے گا۔

وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾ "اور جو کوئی گناہ کماتا ہے یقینا اس کی اس کمائی کا وبال اسی پر ہوگا اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا خوب حکمت والا ہے" [111]۔

تفسیر 111 سابقہ آیت میں معافی مانگنے کی ترغیب تھی اور اس آیت میں (تخویف) گناہوں کے وبال سے ڈرانا مقصود ہے اور یہ بتایا جا رہا ہے کہ گناہ کا وبال کرنے والے ہی کے نفس پر آئے گا اور اس میں ایک وہم کا جواب بھی ہے کہ اگر کوئی کسی کی وجہ سے گناہ کر بیٹھے جیسا کہ طعمہ کی وجہ سے طرفداروں نے کیا اور وہ یہ گمان کریں کہ اس گناہ کا وبال اس پر ہوگا اسلئے کہ ہم نے اس کی وجہ سے گناہ کیا ہے تو جواب ہوا کہ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ: کسب ہر اس

بات یا عمل کو کہا گیا ہے جس میں اپنی ذات سے دفاع ضرر ہٹانا یا فائدہ سمیٹ لینا مقصود ہو اسلئے اللہ تعالیٰ کے افعال کو کسب نہیں کہا جا سکتا۔ اِثْمًا ہر گناہ کو کہا جاتا ہے خواہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو اس میں خیانت کیلئے جدال وغیرہ بھی داخل ہے۔ عَلٰی نَفْسِهٖ: عَلٰی گناہ گار پر (استعلا) غلبہ گناہ کیلئے لایا گیا ہے اس میں اشارہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی: کی طرف ہے۔ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا: یعنی ہر گناہ اور ہر گناہگار پر عالم ہے سزا اور معافی دینا اس کی حکمت پر مبنی ہے۔

وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾ "اور جو کوئی چھوٹا یا بڑا گناہ کرے پھر بے گناہ شخص پر الزام لگائے تو یقیناً اس نے اپنے ذمہ بہت بڑا بہتان اور ظاہر گناہ لے لیا" [112]۔ ع

تفسیر 112 یہ بہتان لگانے والوں کیلئے وعید ہے اور یہ اور قسم کا گناہ ہے اور طعمۃ کے واقعہ میں ایسے ہوا تھا کہ انہوں نے بہتان (چوری کا الزام) یہودی پر لگایا تھا۔ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا: ان دونوں میں بعض وجوہات کیساتھ فرق ہے: پہلا سبب امام طبری نے لکھا ہے کہ خَطِيْٓئَةً عام ہے ارادہ سے ہو یا بغیر ارادہ کے ہو جبکہ (گناہ) تو لازماً قصد وارادہ سے ہوتا ہے۔ دوسرا سبب خَطِيْٓئَةً وہ گناہ ہے جو بغیر قصد ہو اور اِثْمٌ وہ ہے جو قصد کے ساتھ ہو۔ تیسرا سبب خَطِيْٓئَةً گناہ صغیرہ ہے اور اِثْمًا گناہ کبیرہ ہے اور وہ گناہ بھی اس میں شامل ہیں جو واقعہ طعمۃ میں ذکر ہوئے ہیں۔ ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓئًا: بِهٖ کی ضمیر اثْمٌ: خَطِيْٓئَةً یا كَسْبِ ہر ایک کو راجع ہو سکتی ہے بَرِیْٓئً وہ فرد ہے جس نے گناہ نہیں کیا ہے اور پھر بھی اس پر گناہ کا الزام لگایا گیا۔ فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا: اِحْتَمَلَ میں حمل کے مبالغہ کا معنیٰ ہے یعنی یہ وزنی بوجھ ہے بہتان بُهِتَ سے لیا گیا ہے اور بہت حیران ہونے کو کہا جاتا ہے تو بہتان وہ جھوٹ ہے کہ سننے والا حیران ہو جائے۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا غیبت وہ ہے کہ مسلمان بھائی کا تذکرہ ایسے الفاظ اور کلمات سے ہو کہ اگر وہ اس کو سنے تو ان کو بری لگے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ اگر وہ عیب یا گناہ اس میں موجود ہو تو نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر وہ صفت اس میں موجود ہو تو غیبت ہے ورنہ بہتان ہے صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ حدیث 2589۔ وَاِثْمًا مُّبِيْنًا: یعنی وہ شخص دو گناہوں کا مرتکب ہوا ایک کسب گناہ کا دوسرا بہتان لگانے کا گناہ بہتان کو پہلے ذکر کیا ہے اسلئے کہ یہ بہت خطرے والا ہیبت ناک گناہ ہے یا مطلب یہ ہے کہ بہتان واضح گناہ ہے اسلئے کہ اس میں مسلمانوں کی بے عزتی اور جھوٹ لازم آتا ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا

يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝ "اور اگر آپ پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اسکی رحمت نہ ہوتی تو وہ آپ کو ضرور (بہکا دیتے) یقیناً قصد کیا تھا ان میں سے ایک گروہ نے کہ آپ کو بہکائیں اور وہ نہیں بہکاتے مگر اپنے آپکو اور وہ آپ کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور اللہ نے آپ پر کتاب وسنت نازل کی ہے اور اس نے آپ کو وہ سکھایا جو آپ نہیں جانتے تھے اور آپ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے" [113]۔

تفسیر 113 یہ آیت سابقہ واقعہ سے متعلق ہے اور اس میں ہمارے نبی کریم ﷺ کی عظمت شان اور عصمت ذات کا (۶) طریقوں سے ذکر ہے: (۱) اللہ تعالیٰ کا فضل (۲) اس کی رحمت (۳) ضلال سے بچاؤ (۴) کتاب وسنت کا نزول (۵) اس چیز کا علم جو ان کے پاس نہ تھا (۶) فضل عظیم کی نعمت۔ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ: بقول شہاب لَوْلَا کے جواب میں دو توجیہات ہیں پہلی توجیہ یہ ہے کہ لَهَمَّتْ اس کا جواب ہے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ اس کا جواب مقدر ہے یعنی لَاَضَلُّوْكَ ضرور آپ کو دھوکا دیتے یعنی آپ ان کی جھوٹی قسموں سے متاثر ہو کر فیصلہ میں (غلطی) خطاء کر جاتے۔ پہلی توجیہہ پر سوال وارد ہوتا ہے کہ جب یہ جواب ہے تو لَوْلَا کی وجہ سے هَمٌّ (قصد) کی نفی معلوم ہوتی ہے؟۔ (جواب) یہاں خاص قصد کی نفی ہے یعنی اَنْ يُّضِلُّوْكَ یعنی انہوں نے قصد کیا ہے مگر اضلال (گمراہ کرنے کا) نہیں۔ اور یہاں پر فضل سے مراد نزول وحی اور خصوصاً مذکورہ آیتیں ہیں جن میں اس واقعے میں مجرم کا حال معلوم ہوا اور رحمت سے مراد نبی کی عصمت ہے کہ ان کو غلط فیصلہ سے بچایا جائے (ابوحیانؒ) یا فضل سے مراد عام وحی ہے اور رحمت سے یہ خاص آیتیں مراد ہیں یا فضل سے وحی جلی اور رحمت سے وحی خفی مراد ہے۔ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ: ضلال سے مراد غلطی پر ابھارنا ہے بے قصور شخص کے ہاتھ کاٹنا اور ان پر چوری کا الزام لگانا اور حقیقی مجرم خائن کو بچالینا۔ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ: اسلئے کہ کسی کو گمراہ کرنے سے اس کا وبال سزا بلٹ کر اسی پر دنیا و آخرت میں آتی ہے یہ سورۃ بقرہ آیت 9 اور سورۃ آل عمران کی آیت 49 کی طرح ہے۔ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ: بقرہ۔ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ: صاحب اللباب نے اس کے دو سبب بیان کیے ہیں۔ پہلی وجہ: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے متعلق مستقبل میں عصمت یعنی گناہوں سے حفاظت کا وعدہ کیا ہے۔ دوسری وجہ: یہ ہے کہ موجودہ واقعہ میں عصمت رسول مراد ہے انہوں نے اگرچہ کوششیں کی ہیں مگر آپ کو گناہ میں مبتلا نہ کر سکے کیونکہ آپ ظاہری شواہد پر فیصلہ کر رہے تھے اور قانون یہ ہے کہ جب

قاضی ظاہری دلائل پر فیصلہ صادر کرتا ہے تو کوئی گناہ نہیں ہے۔ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ: یہ سابقہ جملہ کی تاکید ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے اور اس پر فیصلہ کرنا اور اس کی تبلیغ کرنا آپ کے فرائض منصبی میں سے ہے لہذا اللہ تعالیٰ ضرور غلطی سے آپ کی حفاظت کریگا اور ضرور آپ اس کے ظاہر پر ہی فیصلہ کریں گے۔ کتاب سے مراد قرآن کریم اور حکمت سے مراد سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے کی واضح دلیل ہے البتہ اس کو وحی خفی کہا ہے۔ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ: یہ جملہ بھی سابقہ جملوں کیلئے دو طریقوں سے تاکید ہے: پہلا طریقہ یہ ہے کہ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ: سے دین کے امور میں اسرار یعنی رازوں کی طرف اشارہ ہے اور قرآن وسنت کا علم اور حکمتیں جو آپ کو حاصل نہیں تھیں عطاء کیں لہذا آئندہ بھی آپ کو نعمت علم سے نوازیگا آپ کو یہ منافقین گمراہ نہیں کر سکتے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس سے سابقہ قوموں اور ان کے انبیاء کے حالات اور واقعات مراد ہیں اور آپ کو منافقین کے حیلے اور چال بتاتا ہے تاکہ آپ ان سے بچ کر رہیں۔ سوال: بعض جاہل لوگ اس آیت سے نبی کیلئے علم غیب یعنی کلی علم اور مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ: (جو کچھ ہوا ہے یا ہوگا) ثابت کرنے کیلئے استدلال کرتے ہیں اور ان کے استدلال کا طریقہ یہ ہے کہ علم کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے اور پہلا مفعول محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور لفظ (مَا) عموم کیلئے ہے تو معلوم ہوا کہ اس آیت کے نزول سے پہلے جو کچھ نبی کو معلوم نہیں تھا وہ سب کچھ ان کو علمی طور پر دے دیا گیا ہے یہ استدلال تفسیر نعیمی صفحہ 301، 141 اور جاء الحق صفحہ 49، 50۔ اور مقیاس حنفیت صفحہ 473 میں ذکر ہے۔ جواب ا: یہ قاعدہ کہ علم کا فاعل اللہ تعالیٰ ہو اور مفعول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہو تو اس سے علم کلی مراد ہوگا خود ساختہ ہے اس اُصول کا عربیت اور اصول فقہ کی کتابوں میں کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ اس قسم کے مقام میں فائدے کا دارومدار مفعول ثانی پر ہوتا ہے۔ لفظ (مَا) بھی اہل تحقیق کے نزدیک عموم کیلئے نہیں وضع کیا گیا ہے بلکہ شرح مواقف صفحہ 723 میں لکھا ہے کہ موصولات جن میں ((مَا) بھی داخل ہے) جنس کیلئے (وضع) کئے گئے ہیں۔ عموم وخصوص کیلئے نہیں وضع کئے گئے اور قرآن کریم میں خصوص کیلئے کئی مقامات پر ذکر ہوئے جیسا کہ وَاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ: سورۃ مائدہ آیت 20۔ عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ: سورۃ بقرہ آیت 239۔ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ سورۃ انعام آیت 91۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ: سورۃ علق آیت 5۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ الانسان سے جنس انسان مراد ہے تو اگر ان آیتوں میں عموم کیلئے ہو تو ساری امت بلکہ بنی اسرائیل یہاں تک کہ تمام انسانوں

کیلئے علم کل ثابت ہوجائے گا۔ جواب ۲: یہ سورۃ اور آیت ہجرت کے چوتھے سال نازل ہوئی ہے لہٰذا اگر علم کل نبی کو حاصل ہوگیا تھا تو پھر اس کے بعد والی سورتوں کی وحی نازل ہونے کی کیا ضرورت تھی چونکہ سورۃ توبہ اس کے بعد نازل ہوئی ہے اور اس میں آیت ۱۰۱ میں اشارہ ہوا کہ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ: آپ ان کو نہیں جانتے ہم ہی ان کو جانتے ہیں۔ اس آیت اور توبہ 101 کے درمیان تو پھر اس اعتبار سے بالکل ٹکراؤ ہے حالانکہ قرآن کلام اللہ ہونے کی وجہ سے ٹکراؤ سے پاک ہے۔ جواب ۳: مفسرین نے اس آیت میں لفظ (مَا) کی تخصیص کیلئے قیودات ذکر کی ہیں: قرطبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے مِنَ الشَّرَائِعِ وَالْأَحْكَامِ: ابوحیان رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ هُوَ الشَّرْعُ اور ابو سلمان رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ أَخْبَارُ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ: امام رازی رحمہ اللہ نے قفال سے نقل کیا ہے کہ مَا يَتَعَلَّقُ بِأُمُورِ الدِّينِ: دوسرا قول أَخْبَارُ الْأَوَّلِينَ: بعض مفسرین نے مِنْ عِلْمِ الْغَيْبِ: کا لفظ ذکر کیا ہے تو اس سے مراد وحی کے ذریعے سے بعض علم ہے۔ وَكَانَ فَضْلُ اللهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا: اس سے بعض انعامات مراد ہیں یعنی ختم نبوت اور آپ کی رسالت کا عام عرب وعجم کیلئے ہونا۔ نیز آپ کے معجزات اور معجزہ قرآن اور قیامت قائم ہونے تک آپ کی امت کا باقی ہونا اس کے علاوہ بھی آپ کے خصائص ہیں۔

لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿۱۱۴﴾ "ان کی اکثر سرگوشیوں میں خیر نہیں ہے البتہ جو صدقے کا نیکی کا یا لوگوں کے درمیان صلح کرانے کا حکم دے اور جو اللہ تعالیٰ کی رضامندی تلاش کرنے کیلئے یہ عمل کرے تو ہم اسے عنقریب بہت بڑا اجر دیں گے" [114]۔

تفسیر 114 اس آیت میں مشوروں کے متعلق آداب کا ذکر ہے۔ (ربط) گزشتہ آیت میں ثابت ہوا کہ طعمہ کو بچانے اور اس کی جگہ بے گناہ کو پھیرنے کیلئے انکے ساتھیوں نے مشورے جرگے کیے تھے تو اس مناسبت سے مشوروں کی اقسام بیان کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ نَجْوَاهُمْ میں ضمیر طعمہ اور اس کے ساتھیوں کی طرف راجع ہے۔ ابن عطیہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ضمیر عام انسانوں کی طرف راجع ہے اور یہ کلام استئنافیہ ہے نیا کلام ہے ماقبل سے اس کی کوئی مناسبت نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آیت عام ہو اگرچہ سابقہ واقعہ بھی اس میں داخل ہے۔ لَا خَيْرَ: یہ لفظ تاکید کیلئے ذکر کیا جاتا ہے اسلئے کہ لائے نفی جنس ہے اور جب چیز کے جنس کی نفی ہوگی تو لازماً شر باقی رہے گا۔ فِي كَثِيرٍ یہ مفہوم صفت کے

طور پر دلیل ہے کہ بعض مشوروں میں خیر ہے۔ مِنْ نَّجْوٰىهُمْ واحدی کا قول ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان جو خفیہ راز ہوتا ہے اس کو نجویٰ کہا جاتا ہے۔ زجاج کا قول ہے کہ دو یا زیادہ افراد جب لوگوں سے الگ ہو جائیں خواہ نظر آتے ہوں یا نہیں اس کیفیت کو نجویٰ کہتے ہیں۔ یہ لفظ کبھی مصدر آتا ہے جیسا کہ سورۃ مجادلہ آیت ۷ میں ہے اور کبھی کبھی کئی اشخاص کو مجازا کہا جاتا ہے جیسا کہ سورۃ اسراء آیت ۴۷ میں اِذْ هُمْ نَجْوٰى آیا ہے۔ کرمانی کا قول ہے نجویٰ کبھی نجی کیلئے جمع ہوتا ہے یہاں بہتر قول یہ ہے کہ نجویٰ مصدری معنی میں ہے اور اشخاص کے معنی میں بھی یہاں جائز ہے اور اضافت مِنْ ساتھ ہے۔ اِلَّا مَنْ یہ استثنیٰ متصل ہے اور مقدر عبارت یہ ہے کہ اِلَّا نَجْوٰى مَنْ کا مضاف نجویٰ یہاں مقدر ہے یا استثنیٰ منقطع ہے تو پھر اِلَّا لٰكِنْ کے معنی میں ہے۔ یہ دونوں اقوال اس پر بنا ہیں جب مصدری معنی ہو اور جب اشخاص مراد ہو تو استثنیٰ متصل ہے۔ سوال: کثیر سے بطریقہ مفہوم صفت معلوم ہوا ہے کہ بعض مشوروں میں خیر ہے تو پھر اس استثنیٰ میں کیا فائدہ ہے۔ جواب: مفہوم صفت سے معلوم ہوا کہ بعض نجویٰ میں خیر ہے لیکن وہ بعض مجمل تھے تو استثنیٰ سے اس کی تفصیل کی گئی کہ وہ تین قسم کے ہیں البتہ ان تین کی تخصیص اہتمام کی وجہ سے ہے بطور حصر نہیں ہے اور ہر وہ (نجویٰ) مشورہ جس میں دینی نقصان نہ ہو وہ جائز ہے۔ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ: سے مراد ابھارنا مقصد ہے اور صدقہ نفلی اور فرض دونوں ہو سکتا ہے اور معروف میں ہر نیکی شامل ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ مسلمان جب مسلمان سے خندہ پیشانی سے پیش آئے تو یہ بھی صدقہ ہے۔ (صحیح مسلم فی الادب حدیث 144 ترمذی فی الاطعمۃ حدیث 1833)۔ امام آلوسی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ہر قول اور فعل جب دلیل شرعی سے اس کا اجر و ثواب ثابت ہو وہ صدقہ ہے جیسے کسی کو قرض دینا، ضرورتمند کی مدد، کسی کو راستے کی رہنمائی کرنا وغیرہ۔ سوال: اصلاح و صدقہ تو نیکی میں شامل ہے تو اس کو الگ ذکر کرنے میں کیا فائدہ ہے؟۔ جواب ۱: ان دونوں کے زیادہ اہتمام کی وجہ سے الگ ذکر کیا ہے۔ جواب ۲: زمخشری کا قول ہے کہ صدقہ سے فرض صدقہ مراد ہے اور معروف سے نفل صدقہ مراد ہے لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے اور امام قرطبی رحمہ اللہ نے بہت تفصیل ذکر کی ہے وہاں مطالعہ کیجئے۔ اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ: اصلاح عام ہے قتل کے مسائل ہوں، مال کے ہوں، عزت کے ہوں اور مسلمانوں کے دیگر اختلافات ہوں سب کیلئے عام ہے۔ ان تین چیزوں کی تخصیص اسلئے ہوئی ہے کہ بھلائی کا عمل یا تو فائدہ پہنچانے سے ہوگا یا ضرر (دفع) ہٹانے سے ہوگا اور فائدہ پہنچانا جسم سے متعلق ہوگا یا روح سے متعلق ہوگا لہٰذا پہلی قسم تو صدقہ ہے اور دوسری قسم معروف ہے اور جب یہ ضرر ہٹانے کے ساتھ ہو تو اصلاح ہے اس طرح بھلائی کا فائدہ یا تو مامور کی طرف

سے دوسروں کو متعدی ہوگا تو یہ صدقہ ہے یا فائدہ مامور کے ساتھ لازم ہوگا تو معروف ہے یا مامور سے خود مامور کے واسطے سے کسی اور سے ضرر رفع کرنا ہوگا تو یہ اصلاح ہے۔ سوال: سورۃ مجادلہ آیت 9 میں نہی کی جانب میں اِثْمٌ، عُدْوَان، مَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ: کا ذکر ہے جبکہ أَمَرَ میں بِرٌ تَقْوىٰ کی تخصیص کی ہے اور صریح طور پر أَمَرَ وَنہی ذکر ہے تو اس آیت سے فرق کی وجہ کیا ہے؟۔ جواب: وہاں خطاب ایمان والوں سے ہے تو ان کو خطاب صریح ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے أَمَرَ اور نہی کا پورا خیال ورعایت کرتے ہیں اور یہاں پر چونکہ منافقین کے معاملات کا ذکر ہے تو اس لئے بطور خبر فرمایا کہ ان کی شان یہ ہے کہ بے فائدہ مشورے بہت کرتے ہیں اگرچہ یہاں پر اخبار بھی انشاء کے معنی کو مستلزم ہے۔ نیز منافقین کی جانب میں نجویٰ کی ممانعت اجمالی طور پر کی تا کہ اس میں عموم آجائے جبکہ وہاں بطور تخصیص اِثْمٌ عُدْوَانٌ اور مَعْصِيَتِ رسول کو ذکر کیا ہے کیونکہ یہ امور ایمان کے منافی ہیں نیز وہاں لفظ (بِرٌ) صَدَقَةٍ اَمَرَ بِالْمَعْرُوْفِ: اور اصلاح سب کو شامل ہے اور یہ سب متعدی خیر ہے یعنی وہ نیکی جو دوسرے کو منتقل ہو اور لفظ تقوىٰ خیر لازمی ہے اور یہ عموم مؤمنوں کی شان کے ساتھ موافق ہے۔ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ أَجْرًا عَظِيْمًا: چونکہ نیکی کے اعمال اخلاص اور صحیح نیت کے بغیر قبول نہیں ہوتے ہیں اسلئے اس جملہ میں اس کو ذکر کیا ہے۔ ذٰلِكَ میں ان تین اعمال کی طرف اشارہ ہے، اس جملہ میں تین اقوال ہیں: (۱) پہلے امر کرنے والے کا امر ذکر ہوا تو اب عامل کے اجر و ثواب کا ذکر ہے (۲) یہاں پر يَفْعَلْ يَأْمُرْ کی جگہ ذکر کیا ہے اس میں اشارہ ہے کہ ان امور کے لئے امر کے صیغے کا تعین نہیں بلکہ جس طریقے سے بھی ترغیب دی جائے تو درست ہے اسلئے کہ فعل کا لفظ امر سے عام ہے۔ (۳) امر سے مقصد عمل کرنا ہے اسلئے امر کی تعبیر فعل سے کی گئی ہے۔ اِبْتِغَآءَ طلب کرنا تلاش کرنا یعنی کوشش کے ساتھ کسی چیز کو ڈھونڈنا یہ مفعول لہٗ ہے مرضاۃ مصدر میمی ہے جس کے معنی رضا ہے اور رضا سے عمل میں اخلاص مراد ہے یعنی اللہ تعالیٰ کیلئے وہ عمل کیا ہو جس میں ریاکاری وغیرہ بالکل نہ ہو۔ أَجْرًا عَظِيْمًا: یہ دونوں نکرہ ہیں یعنی کثرت اور تعظیم کیلئے ہیں اور عَظِيْمًا مزید تاکید پیدا کرتا ہے۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى

وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۖ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾ ع "اور جس نے بھی رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کی ہدایت واضح ہونے کے بعد اور چل پڑا (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) ایمان والوں کے راستے کے علاوہ تو اُسے ہم پھیر دینگے جس طرف وہ چل پڑا ہے اور اُسے ہم جہنم میں داخل کرینگے اور جہنم پلٹنے کا بہت برا ٹھکانا ہے" [115]۔

تفسیر 115 یہ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ پر عطف ہے یہ ایک ضد ین (برعکس) کا بیان ہے دوسرے مخالف کے بعد۔ ربط آیات
اس میں بشارت تھی اور اس میں وعید ہے یہ بھی ربط کا طریقہ ہے یعنی ربط مخالف۔ ربط آیات وہاں پر اجر کے حصول کیلئے
اخلاص کی شرط لگائی ہے اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پیروی کو مستلزم ہے جبکہ اس کسی بھی عمل پر ثواب
یا اس عمل کے ضائع ہونے کے اسباب ہیں جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور ترک اتباع ہے۔ وَمَنْ يُّشَاقِقِ
الرَّسُوْلَ: آیت اگرچہ مذکورہ طعمہ کے واقعہ سے متعلق ہے جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے مگر الفاظ کے عموم سے اس کا حکم
عام ہے۔ قانون عربیت میں ہے کہ فعل مضاعف حالت جزم میں ادغام (دو حرفوں کو ایک دوسرے میں ضم کر دینا) اور فَكِّ
اِدْغَامِ (دونوں کو الگ کر کے پڑھنا) دونوں طرح درست ہے لیکن اِدْغَامِ شِدَّت مخالفت کی علامت ہے جیسا کہ سورۃ
حشر آیت ۴ میں ہے کیونکہ وہاں یہود کا ذکر ہے اور فَكِّ اِدْغَامِ: میں مخالفت کی کمی کی طرف اشارہ ہے یہاں جیسا کہ سورۃ
انفال آیت 13 میں ہے نیز فَكِّ اِدْغَامِ میں جدائی کی طرف اشارہ ہے یہاں پر یہ آخری نکتہ مراد ہے کہ رسول کی مخالفت
کرنے والے اس سے جدائی اختیار کر لے والے ہیں۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس کو شقاق اسلئے کہتے ہیں کہ
ایک فریق یا گروہ مخالفت کی وجہ سے ایک شق یعنی (طرف) رہ جاتا ہے اور دوسرے فریق یا گروہ دوسری جانب رہ جاتا ہے
تو اس میں دلیل ہے کہ شقاق کا اطلاق ارتداد، کفر، بدعت پر ہوتا ہے یعنی نبی کے مخالف عقیدہ قول وفعل وغیرہ اختیار کر کے
اس کو حق دین تصور کرنا یہ مشاقہ ہے صرف فسق پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا ہے۔ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى: اس قید کو
زیادہ قباحت کیلئے لگایا ہے یعنی وہ انسان جس کو دلائل سے حق معلوم ہوا ہے پھر بھی نبی کی مخالفت پر کمربستہ ہے اُس شخص سے
زیادہ مجرم اور مستحق عذاب ہے جو دلائل سے ناواقف ہے یعنی عالم بہت زیادہ مجرم ہے بنسبت جاہل ان پڑھ انسان کے جو
بے خبر ہے۔ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ: جہنم میں جانے کیلئے رسول کی مخالفت کے بعد یہ دوسرا سبب ہے
سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ: سے دین حنیف مراد ہے (ابوحیان) ایمان والوں کے عقیدے، عمل، اصول وفروع سب کو شامل
ہے (امام آلوسیؒ) اَلْمُؤْمِنِيْنَ سے مراد ہر زمانہ کے مؤمنین ہیں جو کسی بات پر مجتمع ہوں۔ اس قول کے مطابق الف لام
استغراقی ہے اور الف لام عہدی ہونے کی صورت میں صحابہ کرام مراد ہیں۔ یہ قول تین وجوہات سے بہتر ہے: پہلی وجہ یہ
ہے کہ آیت کے نزول کے وقت صرف صحابہ کرام موجود تھے۔ دوسری وجہ: یہ ہے کہ یہ اس حدیث کے موافق ہے۔ مَا اَنَا
عَلَيْهِ وَأَصْحَابِيْ: جس طریقے پر میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں۔ (صحیح ترمذی حدیث 2640 صحیح ابن ماجہ حدیث

3991 صحیح ابن حبان حدیث 6747)۔ شیخ البانی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ **تیسرا قول** یہ ہے کہ یہ قول سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس مشہور مقولے کے مطابق ہے کہ تم میں سے کوئی اگر اتباع کرنے والا ہو تو اس کو چاہئے کہ ان کی پیروی کرے جو فوت ہوئے ہیں کیونکہ زندہ شخص فتنوں سے نہیں بچ سکتا ہے اور یہ وہ لوگ تھے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ (مَنْ كَانَ مِنْكُمْ مُسْتَنًّا فَلْيَسْتَنَّ بِمَنْ قَدْ مَاتَ فَإِنَّ الْحَيَّ لَا تُؤْمَنُ عَلَيْهِ الْفِتْنَةُ أُولَئِكَ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) مشکوٰۃ کتاب الایمان حدیث 191 جامع بیان العلم وفضلہ 297 والہروی 1، 86، وابونعیم فی الحلیۃ 1، 305 کما ذکرہ الشیخ الالبانی رحمہ اللہ۔ تو اس قول میں وہ عقیدہ و عمل مراد ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاقی عمل ہے۔ امام آلوسی رحمہ اللہ نے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ الھدیٰ سے توحید و سنت اور عقیدہ مراد ہے اور اس جملہ میں جو مراد ہے وہ فروع ہیں۔ سوال: اس طرح کیوں نہیں فرمایا کہ يَتَّبِعْ سَبِيلَ غَيْرِ الْمُؤْمِنِينَ یا يُخَالِفُ سَبِيلَ الْمُؤْمِنِينَ: جواب: اس جملہ میں مومنوں کے راستے کی اہمیت اُجاگر کرنا مقصود تھا جو قرآن مجید کے مجموعہ سے ثابت ہے اس کے علاوہ مذموم اتباع یعنی غلط راستے کی پیروی کرنا ہے اور وہ مسلکوں اور دین بنانے والوں کیساتھ خاص ہے جبکہ باقی جو مطلق مخالفت ہے تو وہ عام ہے۔ مخالفت فسق و فجور کے طور پر ہو یا اجتہادی غلطی ہو اس کو بھی شامل ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ پہلی صفت کیلئے لازم ہے یعنی رسول کی مخالفت اور مُشَاقّہ البتہ کبھی مخالفت شریعت کی نص سے ہوتی ہے اور کبھی مخالفت اس چیز سے ہوتی ہے جس پر امت محمدیہ نے اتفاق کیا ہو اور وہ اتفاق یعنی اجماع ثابت بھی ہو وجہ یہ ہے کہ اجماع کے وقت امت محمدیہ خطاء سے محفوظ ہے۔ اسلئے کہ اس امت کے اجماع کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت کی ضمانت حاصل ہے جو اس امت کی عظمت شان میں سے ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ مرتبہ کی شناخت ہے۔ (نوٹ) یہ اجماع تب معتبر ہوگا جب شروط اجماع کے مطابق ثابت ہو۔ اس بارے میں بہت روایتیں آئی ہیں ان میں سے کچھ روایتیں کتاب اصول الاحادیث میں ذکر ہوئی ہیں، بعض علماء نے ان کے تواتر معنوی کا دعویٰ کیا ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ نے اجماع کو حجت قرار دیا ہے اور اس کی مخالفت کو حرام قرار دیا ہے اور انہوں نے خوب سوچ اور تدبر کے بعد اس آیت سے استدلال کیا ہے یہ نہایت عمدہ اور قوی استنباطات ہیں اگرچہ بعض علماء جیسا کہ امام راغب وغیرہ نے ان پر اشکالات ذکر کئے ہیں اور مفسر مہائمی کا قول ہے کہ یہ آیت اجماع کی مخالفت کے حرام ہونے کی دلیل ہے اسلئے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اور مومنین کی سبیل

کی مخالفت پر سخت وعید سنائی ہے تو لازم ہے کہ یہ حرمت دونوں (مُشَاقَّةُ الرَّسُوْلِ اور مخالفت اجماع) کیلئے ہوگی یا ایک کیلئے ہوگی تو ایک کیلئے تو باطل ہے یا پھر مجموعی طور پر دونوں کی وجہ سے حرمت ہوگی اور اکیلے اکیلے حرمت نہیں ہوگی اور یہ بھی باطل ہے کیونکہ رسول کی مخالفت یقیناً ہر صورت میں باطل وحرام ہے تو معلوم ہوا کہ ہر ایک کی مخالفت الگ الگ حرام ہے تو جب اجماع کی مخالفت حرام ہے تو اس کی اتباع فرض ہے تو کلام کا خلاصہ یہ نکل آیا کہ یہ آیت اجماع کے واجب ہونے کی دلیل ہے۔ اسلئے امام شافعی نے اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے اجماع کے حجت ہونے کی دلیل لی ہے جو مشہور واقعہ ہے اور راست امام شافعی کے شاگرد امام حزنی رحمہم اللہ سے خفاجی نے نقل کیا ہے اور اس قصہ کو مفسر قاسمی اور آلوسی رحمہم اللہ نے تفصیل سے ذکر کیا ہے اور امام ابن کثیر نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے اگرچہ اس استدلال پر امام راغب اور ابن حاجب نے مختصر الاصول میں (مناقشات) اعتراضات کیئے ہیں لیکن اجماع کے ثبوت کیلئے مزید دلائل بھی قرآن و سنت میں وارد ہیں سورۃ بقرہ آیت 143، سورۃ آل عمران آیت 110 اور احادیث بھی ہیں۔ فائدہ: امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے الفرقان بین الحق والباطل میں ایک عجیب مقالہ لکھا ہے جس کو قاسمی رحمہ اللہ نے تفصیل کیساتھ اپنی تفسیر میں لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے عقائد اور فروعات میں دین کامل پیش کیا ہے پھر انہوں نے قرآن مجید کی آیتیں نقل کی ہیں مثلاً سورۃ مائدہ آیت 3، سورۃ یوسف آیت 111، سورۃ نحل آیت 89، سورۃ توبہ آیت 115، سورۃ انعام آیت 119، سورۃ نساء آیت 59 پھر بھی اجماع کی ضرورت باقی ہے کیونکہ اس استدلال کرنے والے کو نص نہیں ملا ہوگا تو اس نے اجماع کیا ہوگا۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے دعویٰ کیا ہے کہ میں نے استقراء (تلاش) ان مقامات میں کی ہے جہاں اجماع وارد ہے تو اس میں نص ملا ہے یعنی اجماع نص پر ہوا ہے لیکن بعض علماء کو بھی نص نہیں ملتا یا وہ اسے نہیں پہچانتے تو وہ کبھی اجماع سے استدلال کرتے ہیں اور کبھی قیاس سے پھر ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جو لوگ بالکل کلی طور پر اجماع و قیاس کے منکر ہیں تو یہ درست نہیں ہے کیونکہ (دلیل نہ ملنے کی صورت میں) بہت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قیاس پر عمل کیا ہے اور جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ بعض مسائل ایسے ہیں کہ بغیر قیاس اور رائے اس پر کوئی دلیل نہیں ہے تو ان کا یہ قول غلط ہے۔ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى: اس میں ایک قول تو یہ ہے کہ اس کا اخروی انجام ہم اس کو اس عمل کے حوالہ کر دینگے جو اس نے دنیا میں اختیار کیا تھا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ہم اس کو اسی کام میں چھوڑ دینگے جو اس نے دنیا میں اختیار کیا ہے یعنی ان کیلئے ان برے اعمال کو آسان کر دینگے اور ان کو اسباب مہیا کر دینگے اور یہ بطور استدراج ہوگا۔ وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ: صلی کا معنیٰ آگ میں

جانے کیلئے داخل کرنا ہے۔ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا: مصیر مصدر رجوع کے معنی میں ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾

"یقیناً اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرتا ہے یہ کہ اس کے ساتھ شریک بنایا جائے اور معاف کرتا ہے جس کیلئے چاہے اس سے کم گناہوں کو اور جس نے بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرایا تو وہ یقیناً دور کی گمراہی میں جا پہنچا" [116]۔

تفسیر 116 سابقہ آیت میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اور مؤمنین کے راستے کی مخالفت کا ذکر ہوا تو اب اس مخالفت کا سب سے بڑا مصداق بیان ہو رہا ہے جو کہ شرک ہے اور اس آیت میں مخالفت کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے: پہلا (ا) عقیدہ میں مخالفت ہے جو کہ شرک ہے اور دوسری قسم میں معافی کی گنجائش ہے۔ آیت کی تفسیر گزشتہ آیت 48 میں گزر چکی ہے۔ ضلال دو قسم کا ہے (۱) وہ ضلال جو ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا (۲) دوسری قسم کا ضلال وہ ہے جو ایمان کے ساتھ جمع ہوسکتا ہے تو پہلی والی قسم کو ضلال بعید کہا جاتا ہے جو حق سے بہت مرحلوں کے ساتھ دور ہو اور چونکہ یہ مخالفت کرنے والا اپنے آپ کو ہدایت یافتہ تصور کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ تو گمراہ ہے۔

إِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ إِلَّآ إِنٰثًا ۚ وَإِنْ يَّدْعُوْنَ إِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ﴿۱۱۷﴾

"وہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوروں کو نہیں پکارتے مگر زنانہ (کمزور مخلوق) کو اور نہیں وہ پکارتے ہیں مگر سرکش شیطان کو" [117]۔

تفسیر 117 اس آیت میں مشرکین کے شرک اور ضلال بعید کے اسباب کا بیان ہے اور اس آیت میں شِرْكٌ فِي الدُّعَاءِ کا رد ہے اور دعاء تمام عبادات کو شامل ہے اسلئے کہ حدیث میں وارد ہے کہ اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ ترمذی وغیرہ (صحیح ابوداؤد حدیث 1479 صحیح ترمذی حدیث 2969 نسائی فی الکبریٰ حدیث 11464 ابن ماجہ حدیث 3828) إِنْ يَّدْعُوْنَ: امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس سے عبادات مراد ہیں یعنی ذکر جزء اور مراد کل ہے بالفاظ دیگر ذکر خاص جبکہ مراد عام ہے یا دعاء سے مدد حاجت و استعانت مراد ہے اسلئے کہ یہ دعاء کا اصل معنیٰ ہے۔ مِنْ دُوْنِهٖٓ إِلَّآ إِنٰثًا: اس کی تفسیر میں کئی توجیہات ہیں: پہلی توجیہہ ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ اس سے ان کے بت اوثان مراد ہیں اکثر ان کے نام مؤنث ہوتے ہیں یعنی لات، منات، عزیٰ وغیرہ۔ دوسری توجیہہ مشرکین اپنے بتوں کو مزین کرتے تھے جس طرح خواتین کو مزین کیا جاتا ہے سونے چاندی کے زیورات سے آراستہ کرنا خواتین کے لباس ان کو پہنانا وغیرہ اور اس میں مشرکین کی توہین بھی ہے کیونکہ وہ معاشرے میں خواتین کو بہت حقیر اور ذلیل تصور کرتے تھے بلکہ

جینے کا حق بھی نہیں دیتے تھے۔ دوسری جانب ایسے بتوں کے عبادت میں مصروف ہے جس کے عام مشابہت خواتین سے ہے۔ تیسری توجیہہ: ابن جریر رحمہ اللہ نے ضحاک رحمہ اللہ سے نقل کی ہے کہ اس سے مراد ملائک ہیں اسلئے کہ مشرکین ملائک کو اللہ تعالیٰ کیلئے بیٹیاں تصور کرتے تھے اور اپنے خیال کے مطابق ان کی عبادت بھی کرتے تھے ملائک کی مورتیاں خواتین کی شکل پر بنائے ہے اور صورت خواتین کی طرح بناتے تھے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس قول کی تائید سورۃ زخرف آیت ۱۹، سورۃ صافات آیت ۱۴۳ اور سورۃ نجم آیت ۲۷ میں ہے۔ **چوتھی توجیہہ:** ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے کہ مشرکین کے عقیدے کے مطابق اس سے مراد وہ جنی ہوتی تھی جو ہر بت کے ساتھ ہوتی تھی وہ جنی کبھی کبھار اپنی عبادت کرنے والوں کو ظاہر بھی ہوتی اور ان سے ہم کلام بھی ہوتی تھی جیسا کہ بعد والا جملہ اس پر دلالت کرتا ہے۔ پانچویں توجیہہ: حسن، علی بن طلحہ، ضحاک رحمہم اللہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے نقل ہے کہ اس سے مراد مردے ہیں۔ ابن جریر اور حسن بصری رحمۃ اللہ کا قول ہے کہ اِنَاثً ہر وہ چیز ہے جس میں جان نہ ہو جیسے کہ لکڑی، پتھر، سورج، چاند، قبروں کے مردے اور ان کو اِنَاثً اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ بھی بے بس کمزور ہیں جیسا کہ عورتیں مردوں کی بنسبت کمزور ہوتی ہیں۔ چھٹی توجیہہ: یہاں لوگوں کیلئے خاص ہے جو عورتوں اور ان کی شکلوں کی عبادت کرتے تھے جیسے عزیٰ ایک مؤنث جنی تھی بعض مؤنث جنی تھی۔ دور حاضر میں بھی بی بی زینب صاحبہ یا پیر دادی وغیرہ کی عبادت کرتے ہیں اور اس کو مدد کیلئے باقاعدہ پکارتے ہیں اس قسم کے لوگوں کی کثرت ہے۔ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا: (مرد) خالی اور چکنے کو کہا جاتا ہے جیسا کہ بغیر داڑھی شخص کو اَمْرَد کہتے ہیں اور جو خیر اور اطاعت سے خالی ہو اس کو مرید کہتے ہیں اور اسی مَرَدَ کو نافرمان سرکش ابلیس کہا جاتا ہے یا اس کی اولاد اور پیروکاروں کیلئے عام ہے خواہ انسی ہو یا جنی۔ **سوال:** مشرکین نے تو نہ شیطان کی عبادت کی ہے اور نہ ہی اس کو مدد کیلئے پکارا ہے پھر اس جملہ کا کیا معنیٰ ہے؟۔ **جواب:** کئی طریقوں سے ہے: پہلا طریقہ: دعا سے مراد اطاعت ہے کیونکہ اطاعت بھی عبادت کو کہا جاتا ہے لہٰذا جب وہ اسی شیطان کی اطاعت سے شرک کرتے ہیں تو خواہ انسانوں میں سے ہو یا جنات میں سے ہو یہ اس کی عبادت ہے۔ **دوسرا طریقہ:** امام ابو حاتم نے سفیان سے نقل کیا ہے کہ ہر (صنم) بت میں شیطان داخل ہوتا ہے اور مشرکین کو نظر آتا ہے یا ان سے ہم کلام ہوتا ہے اور ان کو دعوت شرک دیتا ہے جیسا کہ بعض واقعات میں وارد ہے کہ فلاں قبر سے آواز سنائی دی یا قبر سے ہاتھ نکلا یا فلاں بزرگ قبر سے نکلا تھا یہ سب شیطان کے کارنامے ہیں تو ان بتوں (اِنَاثً) کی عبادت حقیقت میں شیطان کی عبادت ہے۔

تیسرا طریقہ: میں نے معتمد ذرائع سے سنا ہے کہ (مصر لیبیا) وغیرہ بعض ملکوں میں ایسے لوگ موجود ہیں کہ باقاعدہ شیطان کی عبادت کرتے ہیں اس کے نام پر ذبح کرتے ہیں اور نذر مانتے ہیں اور جنات والوں سے میں نے سنا ہے کہ بعض جنات شیطان کی عبادت کرتے ہیں اور سورۃ یٰسین آیت 60 میں بھی اسی طرح مذکور ہے تو اس جملہ میں اس قسم کے لوگوں کا ذکر ہے۔ (سوال) پہلے جملہ میں ان کی دعاء کا حصر اِنَاثًا میں کیا گیا ہے اور بعد والے جملے میں شیطان میں حصر کیا گیا ہے حالانکہ ایک ہی چیز کا حصر الگ الگ چیز میں درست نہیں ہے؟۔ (جواب) دو طریقوں سے دیا جاتا ہے: (۱) یہ بات گزر چکی ہے کہ پہلے والے میں دعاء سے عبادت مراد ہے اور دوسرے والے میں اطاعت (۲) پہلے میں وہ لوگ مراد ہیں جو اِنَاثًا کی عبادت کرتے تھے اور دوسرے میں وہ لوگ مراد ہیں جو ابلیس کی عبادت کرتے ہیں۔

لَّعَنَهُ اللَّهُ ۘ وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ﴿١١٨﴾ ”اس پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے اور اس نے کہا میں ضرور تیرے بندوں میں سے اپنا حصہ بنالوں گا“ [118]۔

تفسیر 118 یہ جملہ شَيْطَانًا کیلئے صفت ہے یا اخبار یعنی خبر دینے کی صورت میں جملہ مستانفہ ہے یا دعاء کے طور پر ہے اور دوسرا جملہ (وَقَالَ) بھی پہلے جملہ پر عطف ہے۔ لَعَنَهُ اللهُ اس میں صراحتاً اس پر لعنت کا ذکر ہے اور اس پر خصوصیت کے ساتھ لعنت کرنی چاہئے۔ وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا: ابن عطیہ رحمہ اللہ نے فرمایا مفروض سے الگ کیا گیا حصہ مراد ہے یا مقرر کیا ہوا ہے یا واجب اور ضروری کے معنی میں ہے اور اس کا یہ قول ملائک کے اس قول پر بنی ہے جب انہوں نے فرمایا تھا۔ أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ اور یہ فساد اور خون خرابہ اس کے وسوسوں سے ہوتا ہے تو اس نصیب مفروض سے گمراہ لوگ مراد ہیں اور اتخاذ (بنانے کے) طریقے بعد والی آیت میں مذکور ہے اور سورۃ اسراء آیت 64 میں بھی ذکر ہے۔ سوال: نَصِيبٌ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کا حصہ کم ہوگا یعنی شیطانی حکم کم لوگ مانیں گے جبکہ عقل و نقل سے ثابت ہوتا ہے کہ ابلیس کے اطاعت گزار زیادہ ہیں۔ نقل تو یہ ہے۔ قَالَ أَرَأَيْتَكَ هَٰذَا الَّذِي كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ أَخَّرْتَنِ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُ إِلَّا قَلِيلًا: سورۃ بنی اسرائیل آیت 62۔ قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ: سورۃ حجر آیت 39۔ یہ دلائل نقلیہ ہیں اور عقلی دلیل یہ ہے کہ مسلمانوں میں فاسق و فاجر لوگ کثرت سے ہیں اور ان کو کافروں کے ساتھ اکٹھا کیا جائے تو پھر ان کی بہت زیادہ تعداد ہے؟۔ جواب ۱: ابو حیانؒ نے فرمایا ہے کہ لفظ نصیب عام ہے قلیل و کثیر

دونوں میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ سورۃ نساء آیت ۷ میں ہے لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ: سورۃ نساء آیت 7 جبکہ مردوں کا حصہ خواتین کے حصے سے زیادہ ہے۔ جواب ۲: عبادالصالحین میں ملائک اور جنات کے مومنین بھی داخل ہیں لہٰذا ان سب کو جمع کیا جائے تو پھر یہ شیطان کے پیروکاروں سے بہت زیادہ تعداد میں ہیں۔

وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللَّهِ ۚ وَمَن يَتَّخِذِ الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِّن دُونِ اللَّهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِينًا ﴿۱۱۹﴾ "انہیں ضرور بہکاؤں گا اور انہیں باطل امیدیں دیتا رہوں گا اور انہیں جانوروں کے کان چیر دینا سکھاؤں گا اور انہیں سکھاؤں گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی صورت کو بدل دیں جس نے بھی شیطان کو اللہ تعالیٰ کے سوا دوست بنایا تو اس نے (واضح) نقصان کیا"[119]۔

تفسیر 119 اس آیت میں اس طریقہ کا ذکر ہے کہ شیطان اپنا حصہ کس طرح بناتا ہے جو چار اقسام پر منقسم ہے۔

پہلا طریقہ: وَلَأُضِلَّنَّهُمْ: اس سے مراد مختلف وسوسوں اور حربوں کے ساتھ لوگوں کو دین حق سے بہکانا ہے اور بہکانے گمراہ کرنے میں نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اور غیر اللہ کی طرف جو ہوئی ہے اس کی تفصیل آیت 26 سورۃ بقرہ میں گزری ہے۔

دوسرا طریقہ: وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ: لوگوں کے دلوں میں خواہشات اور آرزوئیں پیدا کرنا اور ڈالنا۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس میں کوئی خاص قسم مراد نہیں ہے بلکہ ہر آدمی کیلئے اس کے حال کے مطابق آرزو دیتا ہے کسی کو طویل عمر کی کسی کو خواہشات کی تکمیل کی، توبہ مؤخر کرنے کی اسی طرح جنت اور جہنم سے انکار، موت کے بعد زندگی اور حساب سے انکار، کفر اور شرک کے باوجود جنت میں جانے اور سفارش سے جنت کی خواہش وغیرہ سب اس میں داخل ہیں۔ تیسرا طریقہ: وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْأَنْعَامِ: وَلَآمُرَنَّهُمْ مامور بہ مقدر ہے، یعنی بِالْبَتْكِ کان کاٹنا) وَبِالضَّلَالِ اور دیگر گمراہیاں، بِتكْ کا لفظی معنیٰ چیر دینے سے کیا ہے اور ابو عبید اللہ نے کاٹنے سے کیا ہے۔ حرف (فَا) میں اشارہ ہے کہ یہ لوگ میرے امر کے متصل بعد بغیر کسی سوچ وفکر کے فوراً شرک کا ارتکاب کرتے ہیں اور اس کی قباحت اور برائی میں لمحہ برابر نہیں سوچتے۔ مشرکین عرب میں یہ رسم جاری تھی کہ جب اونٹنی پانچ بچے جن لیتی پھر اگر آخری بچہ مذکر (نر) پیدا ہوتا تو اس کو بتوں کے نام پر وقف کر لیتے اور اس سے اپنے لئے فائدہ لینا جیسے سواری وغیرہ کرنا حرام تصور کرتے تھے اور اس کیلئے بحیرہ نام رکھ لیتے۔ یہ واحدی اور کئی مفسرین رحمہم اللہ کا قول ہے اور یہ سورۃ مائدہ آیت ۱۰۳ میں مذکور ہے۔ امر سے ترغیب دینا

مراد ہے البتہ لفظ امر میں اشارہ ہے کہ وہ شیطان کی باتوں وسوسوں کو اس طرح مانتے ہیں جیسا بندہ امر واجبی کو مانتا ہے۔ ہمارے اس دور میں لوگ اپنے بیٹے کو کسی مزار قبر والے کے نام پر نذر کرتے ہیں اور بطور علامت اس کے کان میں سوراخ کرتے ہیں یا سونے چاندی کی بالی اور کوئی چیز کان یا ہاتھ اور گلے میں بطور نمونہ ڈال دیتے ہیں۔ یہ بھی بہت بڑی جہالت والی بات اور عمل ہے۔ چوتھا طریقہ: وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللهِ خَلْقَ اللهِ یہ تَعْمِيْمٌ بَعْدَ التَّخْصِيْصِ ہے۔ اسلئے کہ بتک میں خَلْقَ اللهِ کی تبدیلی ایک خاص طریقے سے مراد ہے جبکہ اس جملہ میں بھی تبدیلی مراد ہے مگر یہ عام طور پر ہے زمخشری نے لکھا ہے کہ جانور کی آنکھ پھوڑ دیتے اس کا نام حام رکھتے۔ لیکن یہ اس کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ خَلْقَ اللهِ میں مفسرین کے دو قول ہیں: (۱) پہلا قول یہ ہے کہ یہ مصدر مفعول کے معنی میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی مخلوق امام آلوسیؒ کا قول ہے کہ مخلوق کی خلقت اور صفت دونوں میں تبدیلی منع ہے لہٰذا اس میں حام سے آنکھیں نکال دینا اور غلاموں کو خصی کرنا، چہروں میں: رسٌدوانا خواتین کا مردوں جیسا چہرہ بنانا اسی طرح مردوں کا اپنا چہرہ ولباس عورتوں کے مثل بنانا۔ لوط علیہ السلام کی قوم کا عمل یا سحق یعنی عورت کا عورت سے لطف اندوز ہونا، چاند اور سورج کی پوجا کرنا یا پتھروں کے بتوں کی عبادت کرنا یہ سب خَلْقَ اللهِ کی تبدیلی میں آتا ہے حلال جانور کے خصی کرنے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ بالوں میں لمبائی کیلئے یا زینت اور دوسروں سے مقابلے کیلئے بال جوڑ دینا یعنی وصل بھی اس میں داخل ہے۔ امام نسفی اور ابو حیان نے لکھا ہے کہ اس میں داڑھی پر کالا خضاب (رنگ) لگانا بھی داخل ہے۔ (صحیح بخاری کتاب احادیث الانبیاء حدیث 3462 صحیح مسلم فی اللباس حدیث 2103)۔ بَابُ الْاِسْتِحْبَابِ خِضَابُ الشَّيْبِ بِالصُّفْرَةِ وَالْحُمْرَةِ وَتَحْرِيْمُهٗ بِالسَّوَادِ، کہ سفید بالوں میں لال یا زرد رنگ (مہندی) لگانا مستحب ہے اور کالا رنگ لگانا حرام ہے باب کتاب اللباس والزینۃ امام ابوداؤد اور ترمذی رحمہم اللہ نے بھی اسے کالا کرنے کی ممانعت پر صحیح حدیث نقل کی ہے۔ مزید تفصیل فتح الباری جلد 1 ص293۔ ابن قیم رحمہم اللہ کی تہذیب السنن اور امام شوکانی رحمہ اللہ کی نیل الاوطار میں ملاحظہ کیجئے نیز اس میں داڑھی کا لنا شیو کرنا بھی تَغْيِيْرُ خَلْقِ اللهِ میں شامل ہے۔ نیز خصی کرنے کے متعلق مندرجہ ذیل علماء کا قول ہے: ابن عمر، ابن مسعود، ابن عباس انس رضی اللہ عنہم اور سعید بن مسیب، عکرمہ، ابوعیاض، قتادہ، ابو صالح اور ثوری رحمۃ اللہ علیہم اور سرمہ گودنے کا قول ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے صحیح بخاری اور چاند سورج کو معبود بنانے کا قول زجاج کا ہے۔ مذکورہ اقوال اکثر ابو حیان، آلوسی رحمہم اللہ وغیرہ مفسرین نے نقل کئے

تک ۔ دوسرا قول: خَلْقِ اللهِ کی تبدیلی کا یہ ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کے دین کو بدلنا مراد ہے۔ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں نقل ہے اور قتادہ، مجاہد، عکرمہ، ابراہیم نخعی، حسن اور حکم رحمہم اللہ سے نقل ہے۔ سورۃ روم آیت ۳۰ کی طرح ہے: دین کو خَلْقِ اس اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ انسان کی پیدائش فطرت پر ہے یہ مراد نہیں ہے کہ دین مخلوق کی طرح ہے کیونکہ دین تو قرآن ہے اور قرآن تو صفت الٰہی ہے وہ مخلوق نہیں ہے البتہ صاحب اللباب نے لکھا ہے کہ دین فطرت کا بدلنا دو طریقوں سے ہے: (۱) پہلا طریقہ: اللہ تعالیٰ نے بندوں کو دین توحید پر پیدا کیا ہے لہٰذا جو شرک کفر اور دیگر بے دینی کا ارتکاب کرتے ہیں وہ دین کو تبدیل کر کے خلق اللہ کو بدل لیتے ہیں۔ (۲) دوسرا طریقہ: یہ ہے کہ حرام کو حلال سے اور حلال کو حرام سے تبدیل کرنا مراد ہے میں راقم الحروف کہتا ہوں کہ دونوں معنی ایک دوسرے کے قریب ہیں یعنی سرمہ خوبصورتی کیلئے گدوانا یا خصی کرنا یا قوم لوط کا عمل اختیار کرنا، چاند سورج کی عبادت، داڑھی صاف یعنی شیو کرنا یا کالا خضاب وغیرہ امور سب اس میں داخل ہیں اور دین تبدیل کرنے میں داخل ہیں اور ان سے اجتناب دین ہے اور ارتکاب دین بدلنا ہے اور بے دینی کا مرتکب ہوتا ہے۔ ابن عاشور اور آلوسی رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ تَغْيِيْرَ خَلْقِ اللهِ میں ختنہ کرنا عورتوں کے کان میں زیور کیلئے سوراخ کرنا بدن سے اضافی بال صاف کرنا، داڑھی مٹھی سے زیادہ کم کرنا کالے رنگ کے سوا مکس لال اور کالا یعنی مہندی اور کتم سے مکس کر کے لگانا اور ناخن کاٹنا اس میں داخل نہیں ہے اسلئے کہ شریعت میں ان کاموں کے کرنے کا ثبوت ہے۔ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللهِ: اس جملہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو ڈرا دینا مقصود ہے۔ اور یہ ڈرانا شیطان کے اس عزم کے بعد ہے جو اس نے بندوں کو گمراہ کرنے کے لئے کیا ہے مقاتل نے کہا ہے کہ ولی سے مراد رب ہے یعنی اطاعت مطلق صرف رب کا حق ہے۔ ابو سلیمان کا قول ہے کہ ولی سے مراد دوست ہے۔ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا: سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں دنیا و آخرت کے فائدے ہمیشہ کیلئے ہیں اور شیطان کی اتباع میں فائدے کم اور ضرر بہت زیادہ ہے بے شمار غم اور عذاب آخرت ہے یعنی عارضی اور ناقص فائدے کی وجہ سے ابدی اور کامل نعمتوں کو چھوڑنا نقصان ہے۔

يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ "وہ (شیطان) ان سے وعدہ کرتا ہے اور انہیں امیدیں دیتا ہے اور ان سے شیطان وعدہ نہیں کرتا ہے مگر دھوکے کا" [120]۔

تفسیر 120 یہ خَسِرَ (نقصان) کیلئے علت ہے اور شیطان کے وعدہ میں فریب اور دھوکا ہے تو یہ سبب نقصان ہے۔

يَعِدُهُمْ سابقہ آیت میں فرمایا کہ لَأُضِلَّنَّهُمْ تو اس میں (گمراہ کرنے) کی تفصیل ہے گمراہ کرنے کیلئے جھوٹا وعدہ استعمال کرتا ہے اس کا دوسرا مفعول مقدر ہے یعنی ان کے ساتھ باطل وعدہ کرتا ہے اور سلامتی کا وعدہ کرتا ہے ان کو فقر و فاقوں کا خوف دلاتا ہے جب وہ مال خرچ کرتے ہیں نیز شیطان کے وعدوں کا مجمل اور مفصل ذکر سورۃ ابراہیم آیت 22، سورۃ بقرہ آیت 268، سورۃ اسراء آیت 64 میں ہے۔ وَيُمَنِّيهِمْ یہ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ کی تفسیر ہے یعنی لوگوں کے دلوں میں اس کی بات وسوسہ کی صورت میں جاگزیں ہوتی ہے۔ أُمَنِّيَنَّهُمْ اور يُمَنِّيهِمْ میں فرق یہ ہے کہ پہلے تو شیطان کا عزم ہے اور دوسری میں اس کا واقع ہونا ہے یا پہلے میں ایمانی عقائد میں مراد ہے اور دوسرے میں اعمال کے متعلق آرزوئیں مراد ہیں اور یہ تمنائیں اور وسوسے وہ خود اور اپنے ساتھیوں جو شیطان کے چیلے اور اولیاء الشیطان ہوتے ہیں ان کے ذریعے سے ڈالتا ہے۔ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا: چونکہ شیطان نے اپنے کاموں کو انجام دینے کیلئے قسمیں کھائی ہیں جس پر لام ونون تاکید کے لگائے تھے تو اس جملہ میں اللہ تعالیٰ نے اس کے رد کیلئے کلام میں تاکید بذریعہ حصر استعمال کی ہے۔ لفظ غُرُورًا کا معنی یہ ہے کہ ظاہر میں نفع ہو اور حقیقت میں ضرر و نقصان ہو۔ اس طرح سورۃ اسراء آیت 64 میں اور سورۃ فاطر آیت 40 میں بھی ہے۔ غُرُورًا: مفعول لہ یا مقدر عبارت ذَا غُرُورٍ: کے ساتھ صفت ہے۔

أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَلَا يَجِدُونَ عَنْهَا مَحِيصًا ﴿١٢١﴾

"ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور اس سے نہیں پائیں گے بھاگنے کی جگہ" [121]۔

تفسیر 121 اس آیت میں شیطان اور اس کے ساتھیوں کیلئے تخویف اور عذاب کی دھمکی ہے۔ أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَلَا يَجِدُونَ عَنْهَا مَحِيصًا: لفظ مَحِيصًا یہ ظرف مکان یا مصدر میمی ہے یا مجرد حَاصَ يَحِيصُ: سے لیا گیا ہے جو اصل میں نفرت کے ساتھ بھاگنے اور جان بچانے کو کہا جاتا ہے اور واحدی کا قول ہے کہ اس جملہ کا مقصد یہ ہے کہ ضرور بالضرور آگ میں داخل ہونگے یا ہمیشگی کیلئے ہے کہ اس میں مستقل رہیں گے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ۚ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا ﴿١٢٢﴾ "اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے (سنت کے مطابق) عمل کئے عنقریب ہم ان کو ایسے باغات میں داخل کرینگے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور ان میں ہمیشہ ابد تک رہیں گے اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے اور کون اللہ تعالیٰ سے (قول و اقرار) بات میں سچا ہوسکتا ہے" [122]۔

تفسیر 122 آخرت کا خوف بیان کرنے کے بعد اب بشارت اخروی ہے۔ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا: یہ دونوں مصدر ہیں اور نفس فعل کی تاکید کیلئے آتے ہیں یعنی وَعَدَ وَعْدًا وَ حَقَّ ذٰلِكَ حَقًّا: اور اس وعدے سے مراد سَنُدْخِلُهُمْ کا وعدہ مراد ہے اور اس کے حق ہونے کا ذکر قرآن کی بہت سی آیتوں میں ہوا ہے۔ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيلًا: یہ تیسری تاکید ہے قِيلًا تمیز ہے اور جمہور علماء کے نزدیک قَوْلَ قِيلًا: اور قَالَ مصادر ہیں جیسا کہ سورۃ زخرف آیت 88 میں ہے۔ ابن سکیت کا قول ہے کہ قَالَ اور قِيلَ دونوں اسم ہے اور قَوْلَ مصدر ہے ان تاکیدات کے ذکر کرنے کا فائدہ اس مقام پر یہ ہے کہ پہلے شیطان کے جھوٹے وعدوں اور باطل امیدوں پر قسم کا ذکر تھا تو اس کے مقابل اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی جنت کے وعدہ پر بہت تاکیدات کا ذکر ہے اس طرح آیت 87 میں گزرا ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ وہاں پر حدیث ذکر کیا تھا اور یہاں پر قیل ذکر ہوا ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ وہاں پر حدیث سے مراد کلمہ توحید ہے یعنی لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ جو تمام نبیوں کی دعوت کا محور رہا ہے اور وہ کلام جو ہمیشہ نقل کیا گیا ہو اس کو حدیث کہا جاتا ہے اور یہاں پر قول سے مراد سَنُدْخِلُهُمْ والا وعدہ ہے اور عرف میں قَوْلَ کا اطلاق وعدے پر ہو سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾

"نہیں ہیں دین اور بدلہ موقوف تمہاری خواہشات پر اور نہ ہی اہل کتاب کی خواہشات پر بلکہ جو کوئی برا عمل کرے تو اس کا وہ بدلہ دیا جائے گا اور وہ اللہ تعالیٰ کے سوا اپنے لئے کوئی بچانے والا اور مددگار نہیں پائے گا" [123]۔

تفسیر 123 (ربط) سابقہ آیت میں یہ بات گزر گئی کہ شیطان امنگوں، امیدوں اور وسوسوں سے لوگوں کو گمراہ کرتا رہتا ہے تو اب یہ حکم بیان کیا جاتا ہے کہ شریعت میں اس کی کوئی حیثیت و اعتبار نہیں ہے۔ لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ: مجاہد اور ابن زید سے روایت ہے کہ یہ خطاب مشرکین سے ہے کیونکہ اِنْ يَّدْعُوْنَ: میں ان کے شرک کا بیان ہے۔ بعض کے نزدیک یہ خطاب مؤمنین سے ہے لیکن بہتر قول یہ ہے کہ یہ خطاب عام ہے جس میں غیر اہل کتاب بھی شامل ہیں۔ لَيْسَ کے اسم فاعل میں تین قول ہیں: پہلا قول: یہ اس وعدہ کی طرف راجع ہے جو وَعْدَ اللّٰهِ میں ہے یعنی جنت و ثواب کا وعدہ امنگوں سے حاصل نہیں ہوتا (زمخشری)۔ دوسرا قول: یہ ہے کہ اٰمَنُوْا میں جو ایمان مذکور ہے اس کی طرف راجع ہے یعنی ایمان سے حاصل نہیں ہوتا یہ حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے۔ تیسرا قول: یہ مؤمنوں اور اہل کتاب کی ان باتوں کی طرف راجع ہے کہ ایمان والوں نے کہا کہ ہماری کتاب تمہاری کتاب پر حاکم ہے اور ہمارے نبی تمہارے نبی پر برتر ہیں اسلئے کہ وہ امام الا

نبیاء ہیں اور یہود نے کہا کہ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللهِ وَأَحِبَّائُهُ (نَعُوذُ بِاللهِ) ہم اللہ تعالیٰ کو ایسے محبوب ہیں جیسے اولاد اور ہم جنتی ہیں۔ تو فرمایا گیا کہ یہ درجات و جنت صرف امنگوں پر حاصل نہیں ہوتی۔ امام آلوسی نے کہا کہ اَمَانِيّ اُمْنِيَّةٌ کی جمع ہے جو کسی چیز کی صورت کو کہا جاتا ہے کہ نفس میں تو اس کا تصور موجود ہو مگر حقیقت میں کچھ نہ ہو اور اکثر جھوٹ پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ: اس میں اس عبارت کی طرف اشارہ ہے کہ لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى: نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ اور سَيُغْفَرُ لَنَا یہ سب کے سب جھوٹ پر مبنی تصورات ہیں۔ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ: یہ جملہ مستانفہ ماقبل جملہ کی تاکید کیلئے ہے اور اکثر مفسرین کے نزدیک یہ جملہ عام ہے ان مومنین کو بھی شامل ہے جو بغیر توبہ کئے مر جاتے ہیں۔ (سوال) اس جملہ میں دلیل ہے کہ کسی قسم کے گناہ کی معافی نہیں ہوگی بلکہ اس پر بدلہ دیا جائیگا جبکہ بہت ساری آیتوں میں عفو و درگزر کا ذکر بغیر توبہ کے ہے۔ جیسا کہ اس سورۃ میں دو مرتبہ فرمایا کہ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ: (جواب) احمد 1،11 کبریٰ 373،3 ابو یعلیٰ 98 السلسلۃ الصحیحۃ 2500 شیخ شعیب ارناؤوط بھی اس روایت کو صحیح کہتے ہے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سند سے نبی کریم ﷺ کا فرمان نقل ہے کہ جزاء سے دنیا کے مرض اور مصیبتیں مراد ہیں شیخ شعیب نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ احمد 1،11 سنن کبریٰ 3،373 اسی طرح سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں بھی ہے جو ابن جریر رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کی بیان کردہ حدیث میں بھی ہے جس کو امام مسلم نے صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ والادب حدیث 2574 و احمد رحمہم اللہ نے نقل کیا ہے اور بعض مفسرین کے نزدیک جیسا کہ ابن جریج اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ اس میں سُوْٓءًا سے مراد کفر اور شرک ہے جس پر توبہ کئے بغیر موت آئے تو لازمی سزا ملے گی۔ مگر پہلا قول راجح ہے۔ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا: ولی وہ ہوتا ہے جو دفاع اور حفاظت اور مدد کرتا ہے اور نصیر وہ ہے جو صرف مدد کرتا ہے البتہ حفاظت نہیں کر سکتا ہے۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾

"جو کوئی نیک عمل کرے خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو یہ لوگ جنت میں داخل ہونگے اور وہ تل کے برابر بھی ظلم نہیں کئے جائیں گے" [124]۔

تفسیر 124۔ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا: پر عطف ہے اس میں نافرمانوں کیلئے تخویف اور اس میں صالحین کیلئے تبشیر کا بیان

ہے۔ مکمل خوشخبری کیلئے عمل میں دو شرطیں لگائیں: پہلی شرط ایمان اور دوسری سنت کے مطابق عمل ہے۔ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ یہ مِنْ تبعیض کیلئے ہے۔ کیونکہ کسی انسان میں یہ قوت نہیں کہ تمام صالح اعمال بجالائے کیونکہ بعض اوقات کوئی عمل انسان کی قدرت سے باہر ہوتا ہے جیسا کہ زکوۃ، حج اور اسی طرح جہاد جو اپنے شرائط کے ساتھ فرض ہوتی ہے یا کوئی عمل عذر کی بناء پر اس سے ساقط ہوجاتا ہے جیسا کہ بعض علماء کے نزدیک بعض حالات میں نماز (صلوٰۃ) ساقط ہوجاتی ہے ابن جریر نے بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ یہ مِنْ زائد ہے لیکن یہ قول ضعیف ہے (ابوحیانؒ) مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى میں مِنْ بیان کیلئے ہے اس طرح سورۃ آل عمران 195 میں بھی ہے۔ اور لفظ اُنثیٰ کا ذکر کرنا دور جاہلیت کے رد کیلئے ہے کیونکہ دور جاہلیت میں عورتوں کو قتل کیا جاتا تھا اور ان کو میراث سے محروم کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے حقوق ثابت کیئے ہیں اس عنوان میں مرد اور عورت ایک جیسے ہیں۔ وَهُوَ مُؤْمِنٌ یہ جملہ حالیہ ہے اور حال کلام میں قید کیلئے لایا جاتا ہے تو اس میں اشارہ ہے کہ عمل صالح فائدے کے اعتبار سے ایمان پر موقوف ہے اور یہ اجماعی مسئلہ ہے۔ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا لَا يُظْلَمُوْنَ میں ضمیر ایمان والوں کی طرف راجع ہے یا پھر مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اور مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ: دونوں کی طرف راجع ہے اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا جیسا کہ سورۃ آل عمران آیت 108 اور سورۃ حم سجدہ آیت 46 میں ہے اور نقیر کی تفسیر گزر گئی ہے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿١٢٥﴾

"اور دین میں اس شخص سے کون زیادہ اچھا ہے جس نے اپنا چہرہ خالص اللہ تعالیٰ کیلئے جھکا دیا اور وہ نیکی کرنے والا ہو اور وہ پیروی کرے ملت ابراہیم کی جو پختہ موحد تھے اور بنالیا اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو خاص دوست" [125]۔

تفسیر 125 چونکہ سابقہ آیت میں اخروی نجات کے لئے ایمان اور نیک اعمال کو شرط بتایا گیا تو اب اس کی تفصیل اور فضیلت کا ذکر ہے اور فضیلت کیلئے دو اسباب بیان فرمارہے ہے: پہلا سبب یہ ہے کہ یہ دین (انقیاد) اطاعت وبندگی پر مشتمل ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ اس ملت ابراہیم علیہ السلام کے دین کی متابعت ہے اور فضیلت کی تعبیر لفظ اَحْسَنُ سے کی ہے صاحب اللباب نے لکھا ہے کہ اَحْسَنُ ہونے کی دو وجوہات ہیں: (۱) دین اسلام صحیح اعتقاد اور عمل صالح پر مبنی ہے لفظ اَسْلَمَ میں اعتقاد کی طرف اشارہ ہے اسلئے کہ یہاں پر اسلام انقیاد وعاجزی کے معنیٰ میں ہے اور یہ انقیاد سارے بدن سے مطلوب ہے صرف چہرہ کا ذکر اسلئے ہوا ہے کہ بدن میں سب سے حسین حصہ چہرہ ہے یہ جُزْ: کا ذکر ہے جس سے

مراد کُل ہے لہٰذا جب انسان دل سے اپنے رب کو پہچانے اور زبان سے اس کی عبودیت و ربوبیت کا اقرار کرے تو ایسے شخص نے اپنے آپکو اللہ تعالیٰ کیلئے تابع کیا اور مُحْسِنٌ میں صالح اعمال اور ترک سَیِّئَاتِ کی طرف اشارہ ہے اور یہ تمام نیک اعمال کو شامل ہے۔ ان دو شرطوں میں یعنی اَسْلَمَ وَ مُحْسِنٌ: میں تمام گمراہ فرقوں کا رد ہے کیونکہ ان کے طریقے فاسد وباطل ہیں کیونکہ وہ سب شرک فی الاستعانت میں مبتلا ہیں مشرکین تو اپنے معبودوں کے ذریعے سے شرک کرتے ہیں اور دھری (طبیعین) افلاک تاروں اور طبائع کے ذریعے سے جبکہ یہودیوں کی اِسْتِعَانَت عذاب کے دور کرنے پر ہے اور وہ اس بنیاد پر ہے کہ ہم نبیوں کی اولاد ہیں اور نصاریٰ کی استعانت کی بنیاد تَثْلِیثْ کا عقیدہ ہے کہ تین میں سے ایک معبود ہے اور معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ ہماری اطاعت سے ہمیں لازمی طور پر اجر ملے گا اور ہماری نافرمانیوں سے ہمیں سزا ملے گی لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔ اَسْلَمَ اور مُحْسِنٌ کے موصوف صرف اہل سنت والجماعت ہیں۔ دوسری وجہ احسن ہونے میں ملت ابراہیم علیہ السلام کی اتباع ہے جو اس قول میں مراد ہے: وَاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا: سبب یہ ہے کہ دین محمد ﷺ، دین ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ مشابہ ہے قبلے میں مناسک حج میں، ختنے میں اور ان اعمال میں جن کا ذکر وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ: میں ہے جبکہ دین ابراہیم علیہ السلام، یہود و نصاریٰ و مشرکین عرب کے نزدیک یکساں مقبول تھا اور سب کو اپنے نسب پر فخر تھا کہ ہم ابراہیمی دین اور خاندان پر ہیں تو یہ بحیثیت دعویٰ سب کے نزدیک مقبول دین قرار پایا تھا تو اللہ تعالیٰ نے آخری نبی کا دین اس کے ساتھ مشابہ کیا اس مشابہت کو اتباع کہتے ہیں لہٰذا آخری نبی کا دین ایک مستقل دین ہے مگر دین ابراہیم سے مشابہ ہے۔ اور اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ: میں علماء کا تیسرا قول یہ ہے جو کہ دیگر اقوال سے مختلف اور بلکل متضاد ہے یعنی پہلے میں صالح اعمال اور دوسرے (مُحْسِنٌ) میں عقیدہ توحید کی طرف اشارہ ہے۔ حنیف کی تفسیر سورۃ بقرہ میں گزری ہے۔ امام ابن کثیر نے یہاں پر حنیف کا معنی یہ کیا ہے کہ شرک کو جان کر اس کو چھوڑ دینے والا اور اللہ تعالیٰ کی طرف ایسے متوجہ ہونے والا کہ اُسے کائنات میں کوئی روک نہ سکے۔ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا: زمخشری کا قول ہے کہ یہ جملہ معترضہ ہے جس کا فائدہ یہ ہے کہ ملت ابراہیمی کی پیروی فرض ہے یعنی جو مرتبہ خلیل تک جا پہنچا ہو تو اس کی پیروی لازم ہے۔ ابو حیانؒ کا قول ہے کہ یہ جملہ استفہامیہ (مَنْ اَحْسَنُ) جو کہ خبر کے معنی میں ہے پر عطف ہے اور یہ جملہ معترضہ عرفیہ نہیں ہے۔ خلیل کے اشتقاق میں اقوال ہیں: (۱) جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ یہ خُلَّةٌ سے لیا گیا ہے یعنی وہ دوستی جس میں خلل کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہو۔ (۲)

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ خُلَّةٌ سے لیا گیا ہے جو فقر و محتاجی کے معنی میں ہے یعنی ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے خالص دوست ہیں اور ابراہیم علیہ السلام نے اپنی فقیری اور محتاجی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں دکھائی۔ ثعلب کا قول ہے کہ خلیل وہ ہے جسکی دوستی دلی اور گہری ہو یعنی دل میں سرایت کر گئی ہو۔ زجاج کا قول ہے کہ خلیل وہ ہے جسکی دوستی میں کوئی نقصان پیدا نہ ہو۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ خلیل فاعل کے معنی میں ہے یعنی محبت کرنے والا یا مفعول کے معنی میں ہے یعنی محبوب ہے۔ ابراہیم علیہ السلام میں دونوں صفتیں تھیں۔ اس اعتبار سے کہ ان کی تمام اعضاء میں اللہ تعالیٰ کی محبت سرایت کر چکی تھی لہذا ان کا دیکھنا سننا اور تمام حرکات وسکنات فقط اللہ تعالیٰ کیلئے تھیں اور اسی کی مدد سے تھیں۔ بعض مفسرین نے ان کی سخاوت، بہادری، مہمان نوازی کے واقعات اور قصے ذکر کئے ہیں جو خلیل ہونے کیلئے سبب بنے اور حبیب کا مرتبہ خلیل سے بلند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے نبی کی صفت میں حبیب اللہ ذکر ہوا ہے جیسا کہ صحیح حدیث میں ترمذی ابن ماجہ وغیرہ میں حبیب اللہ کا لفظ ہے مگر شیخ البانی فرماتے ہیں کہ حبیب اللہ کے الفاظ والی روایتیں اکثر ضعیف ہیں اور خلیل کا درجہ حبیب سے افضل ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اَلتَّعْلِيْقُ عَلٰى مَتْنِ الطَّحَاوِيَّةِ: ص 21 وهدايةالرواة على المشكوة حدیث 5693-94

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿١٢٦﴾ ع

"اور اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہیں جو کچھ آسمان اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو گھیرنے والا ہے" [126]۔

تفسیر 126 اس آیت میں توحید فِي التَّصَرُّف اور فِي الْعِلْم کا ذکر ہے یعنی ہر چیز کا علم رکھتے ہوئے ہر چیز میں اختیارات استعمال کرنا۔ ربط: صاحب اللباب نے اس آیت کی ماقبل کے ساتھ مناسبت اور ربط کو چار مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے۔ ربط ۱: یہ ایک وہم واشکال کا جواب ہے کہ اگر کوئی یہ گمان کر بیٹھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنے محتاج وضرورتمند ہونے کی وجہ سے خلیل بنایا تو جواب ہوا کہ اللہ تعالیٰ تو ہر چیز کا مالک ہے اس کو کسی کی حاجت نہیں ہے اور ان کو اپنے کرم کی وجہ سے خلیل بنایا ہے۔ ربط ۲: سورۃ کی ابتداء سے یہاں تک بہت سارے احکام، حکم کی صورت میں منع کرنے کی صورت میں، وعد اور وعید کی صورت میں بیان ہوئے تو اب اس آیت میں بیان ہوا کہ اللہ تعالیٰ مالک خالق اور الٰہ ہے لہذا اس کی ہر بات کو تسلیم کرنا بندوں کیلئے ضروری ہے۔ ربط ۳: جب سابقہ آیتوں میں وعد اور وعید یعنی خوشخبری اور عذاب کا ذکر ہوا تو اب اس بات کی وضاحت ہے کہ اس کی تکمیل کیلئے کامل قدرت اور تمام کلیات وجزیات کا علم ضروری ہے

تو اس آیت کے پہلے جملہ میں کمال قدرت اور دوسرے میں کمال علم کا ذکر ہے۔ ربط ۴: جب ابراہیم علیہ السلام کے خلیل ہونے کا ذکر ہوا تو اب اشارہ ہو رہا ہے کہ خلیل ہونے کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں ہے کیونکہ ہر چیز اس کی ملکیت میں داخل ہے تو اسی طرح ابراہیم علیہ السلام بھی مخلوق میں داخل ہے۔ ربط ۵: میں راقم الحروف کہتا ہوں کہ جب اَسْلَمَ وَجْهَهٗ کا ذکر ہوا تو تابع اور مطیع ہونے کیلئے پہلی بنیاد بیان ہو رہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی توحید ہے جس کے بغیر کسی کی بھی عبادت اور دین نا قابل قبول ہے۔ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ: لفظ (مَا) امام سیبویہ کے نزدیک عام ہے عقل والوں اور غیر ذوی العقول سب کو شامل ہے ذوی الارواح اور غیر ذوی الارواح سب کیلئے ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ کی کامل قدرت اور اختیارات کی طرف اشارہ ہے۔ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا: امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا علمی احاطہ ہے یعنی ایک ذرہ بھی اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾

"اور وہ آپ سے عورتوں کے بارے میں (فتوی) سوال کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں تمہیں پختہ حکم دیتا ہے اور وہ جو پڑھی جاتی ہے تم پر کتاب میں ان یتیم عورتوں کے بارے میں کہ تم انہیں نہیں دیتے ہو جو ان کیلئے مقرر کیا گیا اور تم ان سے نکاح کرنے میں رغبت رکھتے ہو اور کمزور بچوں کے بارے میں اور یہ کہ تم یتیموں کیلئے انصاف پر قائم رہو اور تم جو بھی اچھائی کرو تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے" [127]۔

تفسیر 127 یہ احکام سیاسی میں نواں حکم ہے جو ایک (بادشاہ) حکمران پر لازم کرتا ہے کہ اپنی رعایا میں سے خواتین، یتیم بچوں اور کمزوروں کے حقوق کی ادائیگی میں بھرپور کوششیں کرے۔ (ربط ۱) سابقہ آیت میں دین اسلام کی اچھائیوں کا لفظ احسن کے ساتھ ذکر کیا گیا تو اب ان میں سے کچھ کا ذکر ہے کہ دین اسلام مظالم جہالت کو مٹانے کا حکم دیتا ہے اور عدل و انصاف سکھاتا ہے۔ (ربط ۲) جب یہ بات ثابت ہوئی کہ کائنات میں اختیارات کلی اور علم کلی صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے تو اب اللہ تعالیٰ اپنی الوہیت کے اظہار کیلئے خاص حکم بیان فرما رہے ہیں تاکہ ضعیفوں کے حقوق کی ادائیگی ہو سکے اور اس میں اشارہ ہے کہ اس حکم پر عمل پیرا ہونا لازم ہے اسلئے کہ حکم ذات باری تعالیٰ کا ہے جو کہ عظیم ہے وَيَسْتَفْتُوْنَكَ: یہ فتی سے

لیا گیا ہے جو نوجوان کو کہا جاتا ہے اور فتویٰ طلب کرنے کو استفتاء کہتے ہیں اور فتویٰ کے ذریعے سے سائل کا اشکال ختم ہوتا ہے تو بات قوی ہو جاتی ہے۔ شریعت میں فتویٰ اس جواب کو کہا جاتا ہے جو قرآن وسنت کے دلائل پر مشتمل ہو صرف فقہاء کے اقوال نقل کرنے کو فتویٰ نہیں کہا جاتا ہے اسلئے فقہاء احناف نے لکھا ہے کہ مفتی مجتہد ہوتا ہے صرف اقوال فقہاء نقل کرنے والا مفتی نہیں ہوتا جیسا کہ ابن ہمام اور ابن عابدین نے کتاب القضاء میں ذکر کیا ہے۔ فِي النِّسَآءِ یعنی عورتوں کو میراث دینے کے بارے میں ہے جو دور جاہلیت کے دستور کے خلاف ہے۔ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ: بعض مفسرین کا قول ہے کہ اس سے مراد وہ احکام ہیں جو اس سورت کی ابتداء میں بیان ہوئے ہیں لیکن ان کا یہ قول ضعیف ہے کیونکہ بعد میں مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ: میں اس کی طرف اشارہ ہے تو لازمی طور پر تکرار آئے گا لہذا معتبر مہائمی نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد سابقہ کتب اور صحیفوں میں ذکر ہونا ہے البتہ دونوں اقوال میں يُفْتِيكُمْ فعل ماضی کے معنی میں ہے اور لفظ اللہ کو تاکید کیلئے مقدم ذکر کیا ہے۔ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِي يَتٰمَى النِّسَآءِ: یہ لفظ اللہ پر عطف ہے لہذا يُفْتِيكُمْ خبر مقدر ہے یا پھر يُفْتِيكُمْ میں جو ضمیر فاعل مقدر ہے اس پر عطف ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے اور صاحب اللباب نے اور بھی اعراب کی توجیہات ذکر کی ہیں یہاں پر کتاب سے مراد قرآن کریم ہے اور آیت 3 میں جو اس سورۃ کی ابتداء میں واقع ہے اس میں انصاف کا طریقہ ذکر ہوا ہے۔ الّٰتِي لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ: اس میں اس ظلم کی طرف اشارہ ہے جو آیت اَلَّا تُقْسِطُوْا 3 میں گزرا ہے اور مَا كُتِبَ سے مراد مہر، میراث، نفقہ وغیرہ ہے۔ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ: اس میں دو قول ہیں: صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4600 وصحیح مسلم کتاب التفسیر حدیث 3018 میں براویت عائشہ رضی اللہ عنہا مذکور ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ عَنْ مقدر ہے تو رغبت اعراض کے معنی میں ہے یعنی تم ان کے نکاح کرنے سے اعراض کرتے ہو ان کے مال یا حسن کم ہونے کی وجہ سے دوسرا قول یہ ہے کہ جو سعید بن جبیر اور مجاہد سے نقل ہے کہ یہاں پر حرف فِي مقدر ہے اور رغبت محبت کے معنی میں ہے یعنی ان کی مالداری اور حسن کی وجہ سے تم ان سے نکاح چاہتے ہو وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ یہ يَتٰمَى النِّسَآءِ پر عطف ہے یعنی وہ حکم جو سورت کی ابتداء (آیت 11) میں یتیم بچوں کے میراث کے متعلق ذکر ہوا ہے یا فِيهِنَّ کی ضمیر پر عطف ہے جو کمزور بچوں سے متعلق ہے مقصد یہ ہے کہ جاہلیت والے ان کو میراث نہیں دیتے تھے لہذا تم ان کو محروم مت کرنا۔ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ: اس کے عطف میں بھی وہی دو قول ہیں اور تیسری توجیہ یہ ہے کہ يَأْمُرُكُمْ کا فعل مقدر ہے اور قیام کوشش اور اہتمام کے

معنی میں ہے یتٰمٰی عام ہے لڑکیوں اور لڑکوں دونوں کیلئے ہے اور قسط سے ان کو میراث دینا مہر اور نکاح کی صورت میں نفقہ دینا مراد ہے۔ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِهِ عَلِيمًا: خیر ذکر کرنے میں نیک اعمال کی طرف ترغیب ہے ورنہ اللہ تعالیٰ تو ان کے شر پر بھی خبردار ہے اور خیر سے مراد ان گزشتہ بیان ہوئے احکامات پر عمل پیرا ہونا اور اس ضعیف طبقے کے ساتھ مزید احسانات کرنا ہے یا عام نیکیاں مراد ہیں۔

وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوزًا أَوْ إِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ وَإِنْ تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿۱۲۸﴾

"اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی (طبعی) بدخوئی کا اندیشہ ہو یا اعراض کرنے کا تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ یہ آپس میں صلح کریں کسی طرح صلح کرنا اور صلح بہت بہتر ہے اور نفس بخل کو حاضر کئے گئے ہیں اور اگر تم نیکی کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یقیناً جو تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے خوب خبردار ہے"[128]۔

تفسیر 128 اس آیت میں بیوی پر ظلم سے بچنے کیلئے ایک طریقہ ذکر ہوا ہے إِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ یعنی خافت علم یا گمان کے معنی میں ہے یا مراد علامات ہیں کہ کوئی خاتون اپنے شوہر میں قولی فعلی یعنی عملاً یا زبان سے بدخوئی دیکھ لے تو بیوی گھبرا جاتی ہے۔ مِنْ بَعْلِهَا شوہر اور سردار کو کہا جاتا ہے اور یہ صفت صرف مرد کیلئے ہے نُشُوزًا اصل معنی اسکا بلندی ہے یعنی شوہر اپنے آپ کو بڑا جانتے ہوئے بیوی سے منہ پھیر لیتا ہے اس کو زوجیت کے حقوق نہیں دیتا یعنی خلوت و مباشرت نہیں کرتا۔ أَوْ إِعْرَاضًا یعنی اس سے منہ موڑتا ہے، بیٹھنا، کلام اور محبت کرنا چھوڑ دیتا ہے لہٰذا نشوز خاص ہے اور اعراض عام ہے یا نشوز اعلیٰ اور اعراض ادنیٰ ہے۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا: مراد یہ ہے کہ شوہر اپنے بعض حقوق سے عورت کو بری کرے گا یعنی مہر، نفقہ، رات کی باری وغیرہ عورت کا حق ہے جبکہ شوہر کا حق یہ ہے کہ اللہ کی نافرمانی کے علاوہ دیگر کاموں میں بیوی اس کی اطاعت کرے اور کچھ دیگر خدمتیں بھی اس میں داخل ہیں یعنی ہر ایک بعض بعض حقوق کو چھوڑ دے لہٰذا اس میں کوئی گناہ نہیں ہے کیونکہ لَا جُنَاحَ سے اجازت مل گئی ہے اسلئے فرمایا کہ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ: صلح میں بہت فائدے ہیں یعنی نشوز اور اعراض سے صلح میں فائدے زیادہ ہیں اور یہ حکم میاں بیوی کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ الف لام برائے استغراق ہے یعنی ہر ایک کیلئے صلح بہتر ہے۔ وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ الْأَنْفُسُ مفعول اول اور الشُّحَّ مفعول ثانی ہے یہ مشہور قول ہے جبکہ دوسرا قول اس کے برعکس ہے اور نفس کے حاضر ہونے سے مراد

یہ ہے کہ کنجوسی اور بخل نفس کیلئے طبعی امر ہے جو اس سے جدا نہیں ہوتا امام قرطبی رحمہ اللہ کے بقول یہ جملہ خبریہ ہے اور شُحّ سے اچھائی وبھلائی کے کام سے رکنا مراد ہے۔(اللباب)۔ابن فارس کا قول ہے کہ شُحّ بخل اور حرص کے اکٹھا ہونے کو کہا جاتا ہے۔(ابوحیان)۔جب شُحّ حقوق کیلئے (مانع) رکاوٹ پیدا کرے تو یہ مذموم ہے جیسا کہ۔ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ: سورۃ تغابن آیت 16 یعنی جو نفس کے بخل سے بچ گیا تو وہ کامیاب ہے۔وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا: یہ خطاب شوہروں سے ہے یعنی اگر تم احسان کرو اپنی بیویوں کے ساتھ اور انھیں ناپسندیدہ ہونے کے باوجود بساؤ اعراض اور نشوز سے اجتناب کرو۔یا شوہروں کے علاوہ عام خطاب ہے یعنی اگر لوگ اپنے آپ کو ایک فریق کی طرف میلان سے بچائیں اور صلح و احسان کریں۔ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا: خبیر وہ ہے جو خفیہ رازوں سے باخبر ہو اور چونکہ شُحّ باطنی چیز ہے اور ظاہر وباطن دونوں سے تعلق رکھتا ہے تو لفظ خَبِیْرًا کو اس کی مناسبت سے ذکر کیا ہے۔

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۭ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۲۹﴾ "ہرگز تم طاقت نہیں رکھو گے عورتوں کے درمیان (محبت میں) عدل کرنے پر اگرچہ تم حرص رکھتے ہو لہٰذا تم مت جھک جانا مکمل (ایک طرف ہوکر) کہ تم دوسری کو چھوڑ دو لٹکی ہوئی کے مانند اگر تم اصلاح کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور نہایت رحم کرنے والا ہے" [129]۔

تفسیر 129 اس آیت میں عورتوں سے ظلم کو ختم کرنے کا ذکر ہے خصوصاً ان کاموں میں جو کام انسان کی طاقت میں ہوں اور جو انسان کی قدرت میں نہ ہو تو اس کیلئے عذر بیان ہوا ہے۔وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ: یعنی ایسا عدل جو عورتوں کے تمام معاملات پر مشتمل ہو یعنی محبت، حصہ داری اور خصوصا رات کی باری نیز نفقہ بنظر، رعایت، انس، طبعی خوشی، (امام آلوسی) اور بیہقی رحمہم اللہ کی روایت میں محبت اور جماع کا بھی ذکر ہے لیکن ان میں برابری انسان کی طاقت سے باہر ہے کیونکہ یہ امور غیر اختیاری ہیں یہاں تک کہ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ محبت کرنا آپ علیہ السلام کے اپنے اختیار میں نہ تھا اسلئے آپ نے فرمایا تھا کہ اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسْمِيْ فِيْمَا أَمْلِكُ فَلَا تَلُمْنِيْ فِيْمَا تَمْلِكُ وَلَا أَمْلِكُ: اے اللہ یہ میری تقسیم ہے جس پر میں قدرت رکھتا ہوں لہٰذا اس میں مجھے ملامت مت کرنا جس کا اختیار تجھے ہے (دلی محبت) اور مجھے نہیں ہے۔(ابوداؤد حدیث 2134، ترمذی حدیث 1140 ابن ماجہ 1971 شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو ضعیف کہا ہے جبکہ حاکم نے علی شرط مسلم کہا ہے اور امام ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے ارواء الغلیل

حدیث 2018 وَلَوْ حَرَصْتُمْ: اس میں واؤ وصلیہ ہے یعنی اگر چہ تم عدل کرنے کی حرص رکھتے اور کوششیں کرتے ہو۔ اس میں اشارہ ہے کہ باوجود اس کے کہ انسان اس پر بے بس ہے لیکن پھر بھی ضروری ہے کہ اپنی طاقت کو عدل و انصاف کی کوشش میں صرف کرے اور یہ حرص محمود ہے۔ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ: اس کا تعلق ان امور سے ہے جو انسان کی طاقت میں ہیں یعنی نان نفقہ اور رات کی باری مقرر کرنا۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ محبوب بیوی کی طرف قصداً میلان مت کرو یعنی تمہارے عمل اور بات سے وہ فرق ظاہر ہو جائے تو یہ منع ہے۔ كُلَّ الْمَيْلِ لفظ كُلَّ جب مصدر پر داخل ہو تو مصدری معنی کمال پر دلالت کرتا ہے اور میلان کامل کی نشانی یہ ہے کہ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ: یعنی نہ اسے طلاق دو گے اور نہ ہی اس کی ادائیگی حق کرو گے۔ فَتَذَرُوهَا یہ نہی کے جواب میں ہے جس میں اَنْ مقدر ہے اسلئے نصب کی حالت میں ہے یا تَمِيلُوا پر عطف ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے تو پہلے قول کی بنا پر معنی یہ ہے کہ ان دونوں کاموں کا جمع کرنا منع ہے اور دوسرے قول کی بناء پر ان کاموں میں سے ہر کام الگ الگ منع اور حرام ہے۔ ھا کی ضمیر اس عورت کی طرف راجع ہے جنہیں چھوڑ کر شوہر نے دوسری بیوی کی طرف ترجیح اور محبت دی۔ كَالْمُعَلَّقَةِ: کاف برائے تشبیہ ہے اور مراد ہر وہ چیز ہے جو آسمان سے زمین کی طرف لٹکائی گئی ہو جو نہ تو زمین پر پہنچتی ہے کہ قرار حاصل کرے اور نہ ہی آسمان تک پہنچتی ہے کہ اس سے منسلک ہو جائے۔ تو ایسے شوہر والی تو مطلقہ بھی نہیں ہے اور شوہر والی بھی نہیں ہے۔ قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس سے (مَسْجُونَة) جیل میں ڈالی گئی عورت مراد ہے اور اس میں ظلم کی انتہا کی طرف اشارہ ہے۔ وَإِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا: اصلاح سے عدل مراد ہے یعنی نفقہ وغیرہ میں اور تقویٰ اسے مراد میلان اور ظلم سے اجتناب ہے یا اصلاح سے توبہ مراد ہے اور تقویٰ سے آئندہ ظلم و میلان سے بچنا ہے (اللباب)۔ (سوال) گزشتہ آیت میں وَإِنْ تُحْسِنُوا اور یہاں وَإِنْ تُصْلِحُوا: فرمایا ہے؟۔ (جواب) اس آیت میں ناپسند ہونے کے باوجود نشوز اور اعراض سے اجتناب کرنے کی ترغیب تھی اور نُشُوز اور إِعْرَاض أَسَاءَت (برا کام) ہے اور أَسَاءَت احسان کے مقابل ہوتا ہے جبکہ اس آیت میں ظلم و جور سے منع ہے ظلم اور جور کے مقابل عدل کے ذریعے سے اصلاح ہوتی ہے لہٰذا ہر ایک کے ساتھ اس کے مناسب الفاظ ذکر ہیں۔

وَإِنْ يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِنْ سَعَتِهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ وَاسِعًا حَكِيمًا ﴿١٣٠﴾ "اگر یہ دونوں جدا ہوئے تو ہر ایک کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے (مستغنی) بے پرواہ کر دیگا اور اللہ تعالیٰ وسیع فضل والا حکمتوں والا ہے" [130]۔

تفسیر 130 یہ ماقبل پر عطف ہے یعنی جب اصلاح نہیں کر سکتے تو ۔۔۔ اعمال بدائی علیحدگی کا ہے جو شرعی طریقے سے طلاق
دینا ہے اسلئے فرمایا کہ۔ وَإِن يَتَفَرَّقَا اس میں اشارہ ہے کہ طلاق بہت ہی مجبوری سے دینی چاہئے۔ يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّن
سَعَتِهِ یعنی طلاق کے وقت ہر ایک اللہ تعالیٰ پر حسن ظن رکھے تو اس شوہر کو اللہ تعالیٰ اپنی فضل سے بیوی اور بیوی کو بہتر
شوہر عطا کرے گا یا اور طریقے سے ان کی مدد فرمائے گا۔ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيمًا: وَاسِعًا مطلق ذکر ہے یعنی
وَاسِعُ الْفَضْلِ، وَاسِعُ الرِّزْقِ، وَاسِعُ النِّعْمَةِ، وَاسِعُ الرَّحْمَةِ، وَاسِعُ الْقُدْرَةِ، وَاسِعُ الْعِلْمِ: تمام کمالات
میں اور حکمت میں وسیع ہے یعنی اشارہ ہے کہ وسعت حکمت کی بنا پر ہے کہ اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا ہے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ۗ
وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾

”اور خاص اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور یقیناً ہم نے حکم دیا تھا
ان لوگوں کو جو تم سے پہلے کتاب دیئے گئے اور تمہیں بھی کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اگر تم کفر کرو گے تو اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار
میں ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اللہ تعالیٰ خوب بے پرواہ اور قابل تعریف ہے“ [131]۔

تفسیر 131 ربط ۱: سابقہ آیت میں اللہ کی صفت مذکور ہے یعنی يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّن سَعَتِهِ: تو اب ان آیتوں کیلئے دلیل
ذکر کرتا ہے۔ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ الخ یعنی ملک اور ملک سب کچھ اسی کا ہے تو بلاشبہ واسع علم قدرت اور فضل والا ہے۔
ربط ۲: سابقہ آیتوں میں جو احکام ذکر ہوئے وہ یتیموں خواتین کمزور لوگوں سے متعلق تھے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ
اللہ تعالیٰ نعوذ باللہ کمزور ہے بلکہ اس کی قدرت اور علم ثابت ہے مگر یہ امور و احکام انسانوں کی ضرورتوں اور حاجتوں اور
مصلحتوں کی بناء پر ہیں۔ ربط ۳: سابقہ احکام پر عمل کیلئے تقویٰ کی ضرورت ہے اسلئے یہاں پر تقویٰ کی وصیت کی جارہی
ہے۔ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ: لام ملکیت اور ملک کیلئے ہے نیز عبدیت کیلئے ہے آسمانوں اور زمین
کے ذکر کرنے سے درمیانی خلا بھی شامل ہوتا ہے اور یہ جملہ ماقبل کے دو ربطوں کی بناء پر ماقبل آیت سے متعلق ہے اور
تیسرے ربط سے معلوم ہوتا ہے کہ مابعد کے ساتھ متعلق ہے۔ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ: وصیت سے
مراد اللہ تعالیٰ کا وہ امر ہے جو منسوخ نہیں ہوتا۔ اُوْتُوا الْكِتٰبَ سے مراد یہود و نصاریٰ اور تمام سابقہ (اُمَم) امتیں ہیں
جن کے پاس صحیفے تھے یا سابقہ نبیوں کی کتابیں تھیں اور اَلْكِتٰبَ سے جنس کتاب مراد ہے۔ (ابو حیانؒ)۔ یعنی

قَبْلِكُمْ یہ لفظ دلیل ہے کہ اُوْتُوا الْكِتٰبَ :اطلاق کے وقت قرآن والوں کو بھی شامل ہے اسلئے یہ قید ذکر کی ہے۔ وَاِيَّاكُمْ اسم موصول اَلَّذِيْنَ پر عطف ہے اور یہ فصیح کلام میں جائز ہے اور اُوْتُوا الْكِتٰبَ یعنی یہود ونصاریٰ وغیرہ چونکہ زمانے میں مقدم تھے اسلئے ان کو پہلے ذکر کیا ہے۔ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ اس میں (با) مقدر ہے یعنی بِاَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ یا اَنْ تفسیر یہ ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ تمام دینوں میں تقویٰ کا حکم ایک مستقل امر رہا ہے اور تقویٰ سے مراد کفر شرک اور دیگر ہر قسم گناہوں سے اجتناب اور تمام اعمال صالحہ کا اہتمام کرنا ہے۔ وَاِنْ تَكْفُرُوْا یہ وَصَّيْنَا پر عطف ہے اور قُلْنَا اس میں مقدر ہے اور خطاب موجود اور گزرے ہوئے سب کیلئے بطریقہ تغلیب ہے اور کُفر سے مراد تقویٰ اور اَمرِ تقویٰ سے انکار ہے اور اس شرط کی جزا بھی مقدر ہے یعنی فَلَا يَضُرُّهٗ كُفْرُكُمْ: یعنی اللہ تعالیٰ کو تمہارے کفر کا کوئی ضرر نہیں۔ فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ: یہ مقدر جزا کیلئے علت ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کا ساری مخلوق سے بے نیاز (مستغنی) ہونے کی دلیل ہے۔ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا: یہ ماقبل جملہ کیلئے تاکید ہے۔ غَنِيًّا اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے اور بے نیاز ہونے کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ بندوں کی عبادت کا محتاج نہیں اور بندے اگر عبادت چھوڑ دیں تو اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ حَمِيْدًا: تعریف کا مالک ہے یعنی بے شمار نعمتوں سے مخلوق کو نوازتا رہتا ہے باوجود اس کے کہ اسے مخلوق کی کوئی ضرورت نہیں لہٰذا وہ حمد کا حقدار ہے انسانوں میں جو مالدار ہوتے ہیں بداخلاقی کنجوسی اور بخل کی وجہ سے وہ تعریف کے مستحق نہیں ہوتے مگر اللہ تعالیٰ کی ذات ہر حال میں تعریف کی مستحق ہے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾

"اور خاص اللہ ہی کیلئے ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہی کارسازی کیلئے کافی ہے" [132]۔

تفسیر 132 وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ: (۱) یہ ماقبل سے متعلق اور مابعد کیلئے تمہید ہے جب یہ بات ثابت ہوئی کہ سارے عالم کی ملکیت اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہے تو مُنْتَظِم بھی وہی ہے یعنی ساری کائنات کا انتظام وہ خود چلاتا ہے تو اسلئے فرمایا کہ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا۔ وَكِيْلًا میں کفایت کا معنی یہ ہے کہ ساری کائنات کا نظام چلاتا ہے اور اس میں کسی مشیر نائب وزیر کی حاجت نہیں رکھتا۔ فائدہ: ان آیتوں میں تین مرتبہ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ: کا جملہ مذکور ہے اس کی بعض وجوہات یہ ہیں: ابن عطیہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ پہلی مرتبہ ذکر ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ (تفرق) علیحدگی میں اللہ تعالیٰ پر اعتماد بھروسا کرنے سے فائدہ حاصل ہوتا ہے دوسری مرتبہ ذکر کرنے سے اللہ تعالیٰ کا بندوں سے بے پروا

ہونا ذکر ہے اور تیسری مرتبہ میں عذاب کیلئے تمہید ہے۔ امام راغب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ پہلی مرتبہ فوت شدہ چیز پر تسلی دینا مقصود ہے دوسری میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وصیت اس کی رحمت سے ہے اور تیسری میں اللہ تعالیٰ کے غنی ہونے کی دلیل ہے اور امام رازی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ پہلی میں اللہ تعالیٰ کی وسعت جود یعنی سخاوت کی تاکید ہے اور دوسری میں اطاعت کرنے والوں کی اطاعت سے استغنا ظاہر کرنا مراد ہے اور تیسری میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ذکر ہے کہ وہ ہر چیز کو فنا کرنے اور وجود دینے پر قادر ہے۔ اور کسی کا قول ہے کہ پہلی مرتبہ میں ہمیں تنبیہ دی گئی ہے اس کی ملک اور وسعت پر اور دوسری میں تنبیہ ہے کہ ہم اس کے محتاج ہیں اور وہ غنی ہے اور تیسری مرتبہ میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت کرتا ہے اور کائنات کی تدبیر وہی کرتا ہے اور ہماری تدبیر پر عالم وقادر ہے۔ (ابوحیان رحمہ اللہ) اور یہ بھی وجہ ہے کہ پہلی مرتبہ تقویٰ کے امر کیلئے علت ہے اور دوسری مرتبہ اللہ تعالیٰ کے بے نیاز ہونے کیلئے دلیل ہے اور تیسری مرتبہ میں تمام بندوں کیلئے کفایت اور وکالت کیلئے علت ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ پہلی مرتبہ میں اللہ تعالیٰ کی ملکیت اور وسعت کی طرف اشارہ ہے اور دوسری مرتبہ میں اس کے ملک کلی کی طرف اشارہ ہے جو اس کے استغناء کیلئے دلیل اور اشارہ ہے اور تیسری مرتبہ میں کل مخلوقات کی تدبیر اور انتظام کی طرف اشارہ ہے کہ اس کیلئے اللہ تعالیٰ کافی ہے اور ان تمام توجیہات میں رد شِرْكٌ فِي التَّصَرُّفِ ہے یعنی کائنات میں کسی پیر فقیر انس وجن اور ملک کو کوئی اختیار نہیں ہے۔

إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ أَيُّهَا النَّاسُ وَيَأْتِ بِآخَرِينَ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ قَدِيرًا ﴿١٣٣﴾ "اگر وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اے لوگو! اور وہ اور لوگوں کو لے آئے اور اللہ تعالیٰ اس پر خوب قدرت رکھنے والا ہے" [133]۔

تفسیر 133 اس آیت میں تخویف دنیوی مقصود ہے کہ اگر تم تقویٰ اختیار نہیں کرو گے اور وصیت کو پامال کرو گے تو پھر عذاب کے مستحق ہوں گے اور یہ خطاب عام ہے اہل کتاب اور اس امت کے لوگ اس میں برابر کے شریک ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ آیت سورۃ محمد کی آیت 38 کی طرح ہے جو صاحب اقتدار اور بادشاہوں کو تنبیہ دینا مقصود ہے اور ان کے لیے تخویف ہے نیز اس میں امیر اور بادشاہ سب کو عدل وانصاف کا حکم دیا جاتا ہے کہ اپنی رعیت سے عدل وانصاف کرو نیز اس آیت میں عالم کو بھی امر ہے کہ اسے اپنے علم پر عمل کرنا چاہئے ورنہ اس حکم میں داخل ہوگا۔ إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ: حرف عطف اسلئے ذکر نہیں کیا کہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سابقہ آیتوں میں تصرف کلی اور عمومی ملکیت کا ذکر تھا تو انسانوں کی پیدائش اور موت بھی اس کے تحت داخل ہیں۔ يُذْهِبْكُمْ: یہ لفظ عذاب کے ذریعے سے ہلاک کرنے یا شان

وشوکت ختم کرکے مغلوب کرنے ہر ایک کو شامل ہے۔لہٰذا اَیُّھَا النَّاسُ: میں کافر مومن گناہگار مشرک سب شامل ہیں یعنی ہر ایک کا لیجانا اس کے حال کے مناسب ہے کیونکہ ہلاک کرنا نہیں فرمایا اسلئے کہ وہ اکثر عذاب میں ذکر ہوتا ہے اور کبھی کبھار فنا کرنے میں ذکر کیا جاتا ہے۔وَیَاْتِ بِاٰخَرِیْنَ:مفسر ابوحیان کا قول ہے کہ غَیْرُکُمْ اسلئے نہیں فرمایا کہ اس میں انسانوں کے علاوہ بھی داخل ہوتے ہیں اور آخَرِیْنَ سے مراد صرف اولا د آدم یعنی انسان ہیں جبکہ یہاں غیر انسان مراد نہیں۔وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی ذٰلِکَ قَدِیْرًا: ذٰلِکَ میں انسانیت کی پیدائش اور موت کی طرف اشارہ ہے اور اس جملہ میں ماقبل خوف کیلئے تاکید ہے۔

مَنْ کَانَ یُرِیْدُ ثَوَابَ الدُّنْیَا فَعِنْدَ اللّٰہِ ثَوَابُ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ ۭ وَکَانَ اللّٰہُ سَمِیْعًۢا بَصِیْرًا ۝۱۳۴ ع ۱۹

"جو (اپنے عمل پر) دنیا کا ثواب طلب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے پاس دنیا و آخرت دونوں کا بدلہ ہے (لہٰذا دونوں طلب کرنے چاہئیں) اور اللہ تعالیٰ سننے والا دیکھنے والا ہے" [134]۔

تفسیر 134 تخویف دنیوی کے بعد آخرت کیطرف ترغیب ہے ابن عطیہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ جس کا عقیدہ صرف دنیا جمع کرنا ہو اور اس کے علاوہ کچھ ارادہ نہ ہو تو ان کو یہ بات ظاہر کرو کہ تمھارا یہ گمان غلط ہے اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس دنیا و آخرت دونوں کا اجر اور بدلہ ہے اس قول کی بناء پر مَنْ کی جزاء مقدر ہے یعنی (فَلَیْسَ کَمَا ظَنَّ) امام قرطبی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ جو دنیا میں دکھلا دے اور نمائش کیلئے عمل کرتا ہے تو اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے جیسا کہ سورۃ ہود آیت ۱۶ میں ہے بلکہ دنیا و آخرت دونوں کا ارادہ کرے کیونکہ دونوں اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں یا صرف آخرت کا ارادہ کرے تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت دونوں دیگا۔اس قول کی بناء پر تقدیری عبارت اس طرح ہے: مَنْ کَانَ یُرِیْدُ ثَوَابَ الدُّنْیَا فَلَیْسَ لَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ ثَوَابٌ فَلْیُرِدْ بِعَمَلِہٖ ثَوَابَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ فَعِنْدَ اللّٰہِ ثَوَابُ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ: ماتریدی سے ابوحیان رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ (بتوں) اصنام کی عبادت پر جو عزت کا متلاشی ہو تو یہ نہیں ہوسکتا کہ اُسے عزت مل جائے کیونکہ دنیا اور آخرت میں عزت صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے دوسرا معنی یہ بھی ہے کہ جو غیر اللہ کی عبادت پر شفاعت اور قرب الٰہی چاہتا ہو تو یہ نہیں ہوسکتا البتہ جب اللہ تعالیٰ کی بندگی کرے تو اس پر دنیا اور آخرت کے اجر و ثواب ملتے ہیں۔ابوحیان رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اس کی جزا مقدر ہے یعنی فَلَا یَقْتَصِرْ عَلَیْہِ وَلْیَطْلُبِ الثَّوَابَیْنِ: صرف دنیا پر اکتفا نہ کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے پاس دنیا و آخرت دونوں کے ثواب ہیں لہٰذا دونوں طلب کرے۔امام راغب ؒ نے

فرمایا کہ اس میں اشارہ ہے کہ جب کوئی شخص حقیر چیز طلب کرتا ہے جبکہ نفیس واعلیٰ چیز کے ملنے کا امکان ہو تو یہ اس بات کی
دلیل ہے کہ یہ طلب کرنے والا حقیر ہے۔ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا: جب بندہ ارادہ کرتا ہے تو لا زماً زبان ہاتھ پاؤں 40/40
اعضاء استعمال کرتا ہے تو اس کیلئے سمیع فرمایا یعنی اقوال کیلئے اور بصیر اعمال کیلئے فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝ "اے ایمان والو قائم رہنے والے ہو جاؤ انصاف پر گواہی دینے والے اللہ کیلئے اگرچہ وہ
تمہارے اپنے نفسوں کے خلاف ہو یا والدین کے یا قرابت والوں کے اگر وہ شخص مالدار ہو یا فقیر اللہ تعالیٰ ان دونوں کا
زیادہ حقدار ہے لہٰذا تم خواہش کی پیروی مت کرو یہ کہ تم انصاف نہ کرو گے اگر تم زبان موڑ دیا چہرہ پھیر دو (اعراض کرو) تو
یقیناً اللہ تعالیٰ ان اعمال پر جو تم کرتے ہو خوب خبردار ہے" [135]۔

تفسیر 135 ربط ۱: اس سورۃ میں امور شرعیہ اور احکام انتظامیہ بیان ہوئے تو اشکال پیدا ہوا کہ ان امور میں رشتہ داری یا
غریب مسکین یا مالداری یا والدین کی رعایت کی گنجائش ہوگی یا نہیں؟ تو اس آیت میں جواب دیا گیا کہ نہیں حق بات
میں کسی کی رعایت کی اجازت نہیں۔ ربط ۲: سابقہ آیت میں دنیا وآخرت کے اجر وثواب کی ترغیب دی گئی ہے تو اس آیت
میں اس کے حصول کا طریقہ بیان ہوتا ہے کہ انصاف پر قائم ہونا، حق کی شہادت اور خواہش کی پیروی اور گناہوں سے
اجتناب اس کیلئے ذریعہ ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: ایمان کا تقاضا ہے کہ یہ بعد والا حکم مان جاؤ۔ كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ
بِالْقِسْطِ: قَوّٰمٌ مبالغہ کا صیغہ ہے جو قیام سے لیا گیا ہے اور اس صیغہ کو ذکر کرنے میں مقصد یہ ہے کہ ایک یا دو حکموں پر
قِيَامٌ بِالْقِسْطِ: فائدہ نہیں دیتا ہے جب تک کہ بار بار اور تمام حکموں میں عدل وانصاف پر قیام نہ ہو۔ قِسْطٌ، انصاف
اور عدل حقوق اللہ وحقوق العباد سب میں ہے اور قیام کے صلہ میں جب (با) کا ذکر ہو تو مقصد اہتمام اصرار یعنی پختگی سے ع ۲
ہمیشہ قائم رہنا مقصود ہوتا ہے۔ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ: کا معنیٰ ہے اللہ تعالیٰ کی رضاء اور خوشنودی کیلئے جو دنیاوی غرض سے بالکل پاک
ہو۔ شہادت سے حق کی گواہی یا اقرار وغیرہ مراد ہے شہداء کیلئے دوسری خبر ہے یا قَوّٰمِيْنَ کیلئے صفت ہے یا قَوّٰمِيْنَ کی
مقدر ضمیر سے حال ہے اور ابن عطیہ رحمہم اللہ کا قول ہے کہ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ سے توحید کی شہادت مراد ہے۔ فائدہ: قِيَامٌ
بِالْقِسْطِ: شہادت حق کیلئے سبب ہے اور سبب مسبب پر مقدم ہوتا ہے۔ نیز قِيَامٌ بِالْقِسْطِ: عام ہے جو قول اور فعل

دونوں کوشامل ہے اور شہادت قول کے ساتھ خاص ہے اور خاص پر عام اکثر مقامات میں مقدم ہوتا ہے۔ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ: حرف لَوْ میں دو وجوہات ہیں: پہلی وجہ یہ شرطیہ ہے اور اس کی جزا حذف کی گئی ہے یعنی اگر تم اپنی جانوں پر شہادت کرو تو یہ شہادت تمہارے ذمہ واجب ہے دوسری وجہ: یہ لَوْ وصلیہ ہے تو معنی یہ ہوا کہ اگرچہ تمہاری شہادت تمہارے نفسوں کے خلاف ہو اور شہادت دو طریقوں سے اپنے نفس کے خلاف ہو سکتی ہے: (۱) پہلا طریقہ یہ ہے کہ کسی اور کے حق کا اپنے اوپر اقرار کرنا۔ (۲) دوسرا یہ کہ وہ ضروری بیان شہادت تمہارے نفسوں پر ہو یعنی اپنے جرم کا اقرار اپنے اوپر شہادت ہے۔ (اللباب) اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ: اس شہادت حق میں اگرچہ والدین یا رشتہ داروں کو نقصان اور ضرر پہنچتا ہو مگر شہادت واجب ہے اور ایک قسم شہادت والدین اور قرابت والوں کیلئے ہے وہ تو شریعت میں درست نہیں ہے اسلئے کہ وہ تو سبب تہمت ہے۔ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا يَكُنْ کی ضمیر مشہود علیہ کی طرف راجع ہے یعنی جس پر گواہی دی جاتی ہے اگر مالدار ہو تو اس سے خوف یا امید والا لالچ ہو لیکن شہادت واجب ہے یا فقیر شخص ہو تو اس پر رحم ہوتا ہے اس کی غریبی وغیرہ کا لحاظ و رعایت شہادت حقہ میں جائز نہیں ہے فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا: ضمیر جنس مالدار اور فقیر کی طرف راجع ہے اور اَوْلٰى کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قانون شہادت مقرر کیا ہے اور اس میں مالدار و فقیر ہر ایک کیلئے مصلحت موجود ہے لہذا اپنی جانب سے کسی کی رعایت مت کریں قانون الٰہی جو مصلحتوں پر مبنی ہے اسے اپنی طرف سے پامال نہ کریں۔ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا: جب اللہ تعالیٰ کیلئے شہادت اور انصاف پر قائم رہنے کا حکم دیا گیا تو اب اس چیز سے ممانعت کا ذکر ہے جو اس کیلئے رکاوٹ ہے یعنی خواہش کی پیروی کرنا۔ هَوٰى وہ چیز ہے جس کی طرف نفس مائل ہوتا ہے اور شریعت کے خلاف ہوتی ہے۔ اَنْ تَعْدِلُوْا اس میں دو احتمال ہیں: (۱) یہ عدول سے لیا گیا ہے یعنی حق سے اعراض کرنا یعنی ظلم و ستم کرنا۔ (۲) دوسرا معنی یہ ہے کہ یہ عدل سے لیا گیا ہے اور یہ لَا تَتَّبِعُوْا کیلئے مفعول لہٗ کی جگہ آیا ہے تو اس کے معنی میں چار وجوہ ہیں: (۱) خواہش کی پیروی مت کرو كَرَاهَةَ اَنْ تَعْدِلُوْا: حق سے اعراض کرتے ہوئے اس معنی میں مقدر عبارت کی ضرورت نہیں ہے۔ (۲) خواہش کی پیروی مت کرو حق کو ناپسند کرتے ہوئے۔ (۳) خواہش کی پیروی مت کرو میرے حق سے تجاوز کرتے ہوئے (میں تمہیں منع کرتا ہوں) اس توجیہ میں بھی لفظ كَرَاهِيَةً مقدر ہے) (۴) میں تمہیں خواہشات کی پیروی سے منع کرتا ہوں یہ منع کرنا میرے عدل کی وجہ سے ہے۔ ابوالبقاء سے پانچواں سبب بھی نقل ہے کہ خواہش کی پیروی مت کرو عدل سے تجاوز کرتے ہوئے اس عبارت میں فِي اور لَا مقدر ہے اس کے علاوہ بھی بعض

توجیہات مذکور ہیں مگر وہ ضعیف ہیں۔ وَإِنْ تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا : یہ بھی قِيَامِ بِالْقِسْطِ : اور شہادت للہ کیلئے تاکید ہے خواہش کی پیروی سے ممانعت ہے اور قسط و شہادت چھپانے کے بارے میں ڈانٹ ذکر ہے اور یہ دو طریقوں پر مذکور ہے (۱) تَلْوُو لَيَّ الْلِسَانِ زبان پھیر دینے سے لیا گیا ہے یعنی حق کی گواہی سے اس طرح زبان موڑ دیا کہ مخاطب کو وہ الفاظ سمجھ میں نہ آئیں یعنی حق چھپاتے ہوئے بھی مخاطب محسوس نہ کر سکے۔ (2) دوسرا طریقہ تُعْرِضُوا ظاہراً چہرہ پھیر دینا یعنی حق کی شہادت سے مختلف عذروں اور بہانوں سے اعراض کرنا بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ تَلْوُوا الَى الْعُنُقِ : یہ گردن پھیر دینے کے معنی میں ہے اور یہ خطاب قاضی حاکم سے ہے جو شہادت حق کے بعد منہ موڑتا ہے اور حق کا فیصلہ نہیں کرتا ہے۔ (ابوحیان)۔ فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا : اس جملہ میں زبان پھیر دینے یعنی لَيِّ الْلِسَانِ اور حق کی شہادت سے اعراض کرنے پر وعید ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَى رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿١٣٦﴾

"اے ایمان والو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے نازل ہوئی ہے اور جو بھی کفر کرے اللہ اس کے ملائک اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور قیامت کے دن پر تو وہ یقیناً دور کی گمراہی میں جا پہنچا" [136]۔

تفسیر 136 یہاں سے سورۃ کا تیسرا حصہ اختتام تک ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں منافقین یہود و نصاریٰ کیلئے وعیدات کا بیان ہے کیونکہ وہ گزرے ہوئے بیان کردہ نظام میں خلل پیدا کرتے ہیں اس حصہ میں تین باب ہیں: پہلا باب آیت 149 تک ہے اس باب میں منافقین کیلئے وعیدات ہیں سب سے پہلے اس میں دین کے اصول پر استقامت اختیار کرنے کی دعوت ہے جو منافقین کے برعکس ہے۔ آیت 136 میں پھر منافقین کی تیرہ (13) خباثتوں اور قباحتوں کا بیان ہے اور ان پر وعید ہے آیت 137 میں ایک قباحت کا ذکر ہے اور آیت 138 میں دوسری قباحت کا ذکر ہے اور آیت 139 میں دو قباحتوں کا ذکر ہے اور آیت 140 میں کافروں اور مبتدعین کی مجالس کی شرکت پر تاکید کیساتھ (زجر) ڈانٹ ہے۔ اور آیت ۱۴۱ میں تین قباحتوں کا ذکر ہے اور آخرت کا خوف ذکر ہے اور آیت 142 میں چار قباحتوں کا ذکر ہے اور آیت 143 میں دو قباحتوں کا بیان ہے پھر آیت 144 میں مومنین کو کافروں اور منافقین کی دوستی اور تعلق سے منع کیا ہے پھر آیت

145 میں وعید کا ذکر ہے اور آیت 146 میں توبہ کی ترغیب دی ہے مگر چار شروط لگا کر پھر ایک وہم واشکال کا جواب ہے آیت 148، 149 میں۔ ربط: گزشتہ آیت میں قِيَامٌ بِالْقِسْطِ: یعنی عدل قائم کرنے کا حکم ہوا تو اب اس میں اس کے سبب کا ذکر ہے کہ وہ صحیح ایمان لانے پر موقوف ہے جو کہ اس آیت میں مذکور ہے۔ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا: اس خطاب میں مختلف اقوال ہیں: پہلا قول حسن بصریؒ سے نقل ہے کہ یہ خطاب تمام ایمان والوں سے ہے اور اس میں استقامت اور ایمان پر ہمیشگی اختیار کرنا مراد ہے یا یقین کی زیادتی مراد ہے۔ دوسرا قول زجاجؒ کا ہے کہ یہ خطاب منافقین سے ہے اور آمِنُوا سے ایمان میں اخلاص پیدا کرنا مراد ہے۔ تیسرا قول ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل ہے کہ یہ اہل کتاب کے ساتھ خاص ہے۔ اس کے علاوہ بھی اقوال امام آلوسیؒ اور صاحب اللبابؒ نے ذکر کئے ہیں۔ بِاللّٰهِ: ایمان باللہ میں توحید، اسماء وصفات مراد ہے اور ان کے احکام اس میں شامل ہیں۔ وَرَسُولِهِ: یہ اضافت عہدی کہلاتی ہے اور مراد اس سے آخری نبی محمد ﷺ ہے۔ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ: اس سے مراد قرآن مجید اور الَّذِي نُزِّلَ میں اشارہ ہے کہ قرآن پر ایمان میں شرط یہ ہے کہ آخری نبی پر نازل شدہ ہونے پر ایمان لائے۔ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ: اَلْكِتَابِ سے مراد جنس کتاب ہے یعنی تورات، انجیل اور زبور سب پر مشتمل ہے اور زمخشری نے أَنْزَلَ اور نَزَّلَ کا فرق اس طرح ذکر کیا ہے کہ نَزَّلَ اور أَنْزَلَ میں فرق یہ ہے کہ قرآن تھوڑا تھوڑا نازل ہوا ہے جو تئیس سال میں مکمل ہوا ہے اور نَزَّلَ باب تفعیل بھی آہستہ آہستہ تھوڑا تھوڑا نازل ہونے پر دلیل ہے جبکہ سابقہ کتابیں ایک ہی بار نازل ہوئی ہیں اسلئے ان کیلئے أَنْزَلَ باب افعال ذکر کیا ہے یہ بحث سورۃ بقرہ کی ابتداء میں گزر گئی ہے وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا: یہ جملہ ذکر کرنے میں ایمان لانے کے حکم پر تاکید ہے یعنی ایمان چھوڑنے سے کفر اور گمراہی حاصل ہوتی ہے۔ امام آلوسی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ واؤ حرف عطف جمع کیلئے نہیں ہے بلکہ ہر ایک کیلئے الگ الگ ہے اور مذکورہ ایمانیات میں کسی ایک پر کفر کرنا بھی ضلال بعید ہے اور بعض علماء کا قول ہے کہ مجموع مراد ہے اسلئے کہ ضلال کے ساتھ بعید بھی ذکر ہے اور ضلال بعید سے مراد یہ ہے کہ ایمان کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہ رہے۔

فائدہ 1: ایمان کی جانب میں ایمان باللہ اور بالرسول اور بالکتاب ذکر کیا ہے اور کفر کی جانب میں پانچ چیزوں کا ذکر کیا ہے وجہ یہ ہے کہ اللہ، رسول اور کتب پر ایمان سے ملائکہ اور قیامت پر ایمان لازمی طور پر ثابت ہوتا ہے لیکن بعض وقت کوئی شخص اللہ، رسول اور کتب پر ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر ملائکہ اور قیامت کو نہیں مانتا لہٰذا جانب کفر میں تردید کیلئے ایمان بالا

آخرۃ اور ملائکہ بیان فرمایا ہے۔ فائدہ 2: کتب اور رسل کو جمع کے صیغہ سے ذکر کیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک کتاب یا ایک رسول پر کفر کرنا سب کتابوں اور رسولوں پر کفر کرنے کے مترادف ہے اور حقیقی ایمان کی جانب میں آخری نبی اور قرآن مجید پر ایمان لانے سے تمام رسولوں اور کتابوں پر ایمان لازم ہو جاتا ہے۔ فائدہ 3: ایمان کی جانب میں رسول کا ذکر پہلے کیا ہے اور کتاب کا بعد میں جبکہ کفر کی جانب میں اس کے برعکس ہے سبب یہ ہے کہ رسول کی رسالت پہلے ہے قرآن کے متعارف ہونے سے اور قرآن مجید کا نزول اسی پر ہوا ہے۔ فائدہ 4: ملائکہ کا ذکر کتب و رسل سے پہلے کیا ہے وجہ یہ ہے کہ وہ واسطے ذریعے ہیں اللہ تعالیٰ اور رسولوں کے درمیان۔ فائدہ 5: امام آلوسی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ قرآن پر ایمان لانے کو دیگر کتابوں پر ایمان لانے سے پہلے ذکر کیا ہے تو اس میں اشارہ ہے کہ ہم اس منزل کتاب پر ایمان لائیں گے جس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہو اس کی مزید تفصیل سورۃ بقرہ آیت 4 میں گزری ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيلًا ۝ "یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے پھر انہوں نے کفر کیا پھر وہ ایمان لائے پھر انہوں نے کفر کیا پھر وہ زیادہ ہو گئے کفر میں (اور کفر پر مر گئے) تو اللہ تعالیٰ ان کو بخشے گا اور نہ ہی ان کو سیدھے راستے کی ہدایت دیگا" [137]۔

تفسیر 137 جب ایمان پر ثابت قدم رہنے کی تلقین کی گئی تو اب ان لوگوں کیلئے وعید کا بیان ہے جو ایمان میں تذبذب کے شکار ہیں: إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا: اس سے وہ لوگ مراد ہیں جن سے بار بار مرتد ہونے کا عمل صادر ہوا ہو خواہ اعتقادی منافق ہوں یا اہل کتاب میں سے ہوں۔ یہ امام آلوسی کا قول ہے منافقین کی یہ روش ہے کہ ایمان والوں کے سامنے دنیاوی فائدے یا مال متاع بچانے کیلئے ایمان کا اظہار کرتے ہیں اور کافروں کے سامنے کفر کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ بعض اہل کتاب نے بھی یہ کام اس غرض سے کیا کہ ایمان والوں کو شک میں مبتلا کریں اور اس سے ایک ایک بار ایمان اور کفر مراد نہیں بلکہ کثرت سے یہ عمل مراد ہے۔ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما، حسن بصری رحمہ اللہ، مجاہد اور ابن زید رحمہم اللہ سے نقل ہے۔ زجاج اور فراء اور بغوی کا قول ہے کہ اس سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام پر ایمان کا اظہار کیا پھر عیسیٰ علیہ السلام پر کفر کیا پھر محمد ﷺ پر کفر کیا ہے لیکن ابن عطیہ کے نزدیک یہ قول ضعیف ہے۔ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا: اس سے مراد کفر پر موت تک باقی رہنا ہے یعنی مرنے سے پہلے کفر سے باز نہیں آتے اور توبہ نہیں کی۔ (تفسیر ابو حیان) لَّمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ: بصریوں کے نزدیک اس قسم کی عبارت میں یَكُنْ کیلئے خبر مقدر

ہوتی ہے۔ یعنی مُرِيْنًا لِيَغْفِرَ لَهُمْ: جبکہ کوفیوں کے نزدیک لام برائے تاکید اضافی ہے۔ سوال: اس میں تاکید کی نفی ہے جو اس مقام کے ساتھ مناسب نہیں ہے۔ جواب: یہ نفی تاکید تہکم (مذاق اڑانے) کی صورت میں ہے اور یہ نفی کی تاکید کو مستلزم ہے اور یہ آیت دلیل ہے کہ کفر پر مرنے والے کی مغفرت نہیں ہے جیسا کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ: میں مذکور ہے۔ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا: اس میں دو احتمال ہیں: (۱) مرنے کے بعد ان کو جنت کے راستے پر نہیں چلائے گا بلکہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے اور اس ہدایت سے جنت تک رسائی مراد ہے جو ان کو حاصل نہیں۔ (۲) اِزْدِيَادِ: کفر سے ضد وعناد کی وجہ سے کفر پر قائم رہنا مراد ہے لہٰذا دنیا میں ہدایت کی توفیق سے وہ محروم رہیں گے اور اس آیت میں منافقین کی پہلی قباحت کا بیان ہے۔

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ۙ﴿۱۳۸﴾ "منافقین کو خوشخبری دیدو کہ ان کیلئے دردناک عذاب ہے" [138]۔

تفسیر 138 اس میں (زجر) ڈانٹنے کے بعد تخویف اخروی کا بیان ہے۔ بَشِّرْ بقول زجاج یہ بشارت تَهَكُّمِي (مذاق کی تاکید کو مستلزم ہے) یا ہر وہ خبر بشارت ہے جس سے انسان کا رنگ بدل جائے خواہ خبر خیر کی ہو یا شر کی ہو۔ (اللباب)۔ اس آیت میں منافقین کی دوسری صفت اور نام کا ذکر ہے۔

الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿۱۳۹﴾

"یہ وہ لوگ ہیں جو کافروں کو ایمان والوں کے سوا دوست بناتے ہیں کیا ان کے پاس عزت تلاش کرتے ہیں عزت کا اختیار سب کا سب تو صرف اور صرف اللہ کے پاس ہے" [139]۔

تفسیر 139 اس آیت میں منافقین کیلئے وعید اور ڈانٹ ہے اور ان کی دو قبیح صفات کا ذکر ہے۔ اَلَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ: کافر عام مراد ہیں یہود نصاریٰ مشرکین سب کو شامل ہے اور اس کی تفسیر سورۃ آل عمران آیت 28 میں گزر گئی ہے۔ ابوحیانؒ نے فرمایا ہے کہ ایمان والوں کو منافقین کی یہ صفت بہت تکلیف پہنچانے والی ہے۔ اس میں ایمان والوں کیلئے تنبیہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس صفت سے محفوظ رکھیں: اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ: اس میں منافقین کی ایک صفت کا ذکر ہے اور ہمزہ اس میں (توبیخ) ڈانٹ کیلئے ہے۔ عِزَّةَ اس میں نصرت، حفاظت، قوت، مصیبت سے نجات وغیرہ کیلئے مستعمل ہے جیسا کہ سورہ مائدہ آیت 52 میں ہے اور لغت میں عزت شدت (سختی) کو کہا جاتا ہے۔ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا۔ یعنی عزت کے اختیارات اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہیں سورۃ فاطر آیت

10 میں بھی اس طرح مذکور ہے۔ سوال: سورۃ منافقین میں ہے کہ۔ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ: ان دونوں کے درمیان کیا تطبیق ہے۔ جواب: سورۃ منافقون کی آیت 8 میں اتصاف مراد ہے یعنی عزت کی صفت اللہ تعالیٰ اس کے رسول اور ایمان والوں کیلئے ہے اور یہاں اختیار کے معنی میں ہے یعنی عزت کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے لہٰذا وہ رسول کو اور ایمان والوں کو عزت دیتا ہے اور کافروں کو عزت نہیں دیتا تو منافقین ان کے پاس عزت کے کیوں متلاشی ہیں؟۔

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ۝

"یقیناً اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے تم پر کتاب میں یہ کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیتیں کہ کفر کیا جا رہا ہو اور استہزا کیا جا رہا ہو ان کے ساتھ تو تم ان کے ساتھ نہ بیٹھو یہاں تک کہ وہ دوسری باتوں میں مشغول ہو جائیں ورنہ تم اس وقت انہی جیسے ہو گے یقیناً اللہ تعالیٰ کافروں اور منافقین سب کے سب کو جمع کرنے والا ہے"[140]۔

تفسیر 140 یہ بھی منافقین کیلئے وعید ہے سابقہ آیت میں یہ بات بیان ہوئی کہ کافروں کی دوستی میں عزت نہیں ہے لہٰذا ان سے دوستی منقطع کرو اب اس سے منع کے اسباب ذکر ہو رہے ہیں کہ اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے یعنی جب اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ جو مشرک ہے بیٹھنے سے منع کیا ہے تو تم ان سے دوستی کیوں کرتے ہو؟۔ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ: یہ منافقین اور ہر اس شخص سے خطاب ہے جو اپنے ایمان کو ظاہر کرتا ہے۔ فِي الْكِتٰبِ: اس سے مراد مطلق قرآن مجید فرقان حمید ہے اور سورۃ انعام ہے جو مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے۔ اَنْ اِذَا: اِنْ مُخَفَّفْ ہے مُثَقَّلْ سے اور اَنَّهٗ ضمیر شان مقدر ہے۔ سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا: یہ آیٰتِ اللّٰهِ سے حال ہے یعنی جب تم قرآن کے متعلق کفر کی باتیں سنو اور آیت اللہ عام ہے یعنی قرآنی آیت ہو یا اسلام کے احکام ہوں اور سمیع عام ہے سننے سے معلوم ہو یا علم کے کسی ذریعے سے معلوم ہو جائے کہ فلاں مجلس میں آیات کا کفر کیا جاتا ہے۔ اس وجہ سے سورۃ انعام میں لفظ اِذَا رَاَيْتَ استعمال ہوا ہے اسلئے یہ دیکھنے یا علم دونوں کیلئے ہے۔ وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا: سوال: استہزاء بآیٰتِ اللّٰهِ کفر ہے تو يُكْفَرُ کے بعد پھر کفر کا ذکر کیا معنی رکھتا ہے؟ جواب: کفر تو ظاہراً انکار ہے اور استہزاء تو ظاہر میں کفر نہیں ہے لیکن اس سے انکار لازم آتا ہے۔ نیز یہ بھی ہے کہ کفر قولی انکار اور استہزاء عملی انکار ہے یا کفر حقیقی کے ساتھ خاص ہے اور استہزاء عام ہے جو بطور تحقیر و توہین ہے اگرچہ یہ بھی حقیقی

کفر ہے یا مخالفت عملی ہو جیسے بدعت اور فسق وفجور کرنا اور سورۃ انعام کی آیت میں اسکو یَخُوْضُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا: سے تعبیر کیا ہے۔ فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ: اس سے مراد مجلس میں شریک ہونا ہے یعنی ٹھہر جانا خواہ کھڑا ہو یا بیٹھا ہوا ہو اور یہ اعراض کرنے سے کنایہ ہے جیسا کہ سورۃ انعام میں فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ فرمایا ہے۔ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ: خَوْض لغت میں کسی چیز میں گھس جانے اور پانی میں غوطہ مارنے کو کہا جاتا ہے۔ غَیْرِهٖ سے مراد کفر واستہزاء کے علاوہ یعنی دین اسلام کی باتیں یا مباح کاروباری وغیرہ باتیں مراد ہیں جس میں دین پر طعن وتشنیع نہ ہو۔ لفظ خوض مختلف تعبیروں کے ساتھ (۱۲) مرتبہ ذکر ہوا ہے اور ہر جگہ عبث کاموں میں استعمال ہوا ہے اور یہاں پر غَیْرِهٖ قرینہ کی وجہ سے شرعی اور مباح کاموں کیلئے ذکر ہوا ہے۔ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ: یہ لَا تَقْعُدُوْا: نہی کیلئے علت ہے۔ اذًا کی تنوین مضاف الیہ سے بدل ہے یعنی اِذًا قَعَدْتُّمْ مَعَهُمْ: مماثلت سے گناہ میں مشابہت مراد ہے اسلئے کہ اس میں حاضر ہونے میں اس پر کوئی جبر نہیں لہذا انکار کی قدرت کے باوجود گناہ کی مجلس میں شرکت گناہ میں برابری ہوگی یا مماثلت سے مراد کفر میں برابری ہے یعنی ان کے کفر و استہزاء پر راضی ہونا ہے کیونکہ غیر کے کفر پر راضی ہونا جب اس کو اچھا تصور کرلے تو یہ بھی کفر کا ارتکاب ہے۔ سوال: یہ خطاب منافقین سے ہے اور وہ تو کافر ہیں خواہ کافروں کی مجلس میں شریک ہوں یا نہ ہوں؟۔ جواب: یہاں پر کفر ظاہر کرنے سے مماثلت ثابت ہوئی ہے وجہ یہ ہے کہ ان کا کفر عام لوگوں کو معلوم نہیں تھا۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ جو گناہ کی مجلس میں شریک ہو اور اس کا رد نہ کرے تو یہ اس گناہ میں برابر کا شریک ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ سے نقل ہے کہ اس آیت میں ہر وہ شخص قیامت تک شامل ہے جو دین میں بدعات ایجاد کرتا رہتا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ اور امام آلوسی رحمہ اللہ نے سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے ایک روزہ دار (صائم) کو سزا دی تھی جب وہ شرابیوں کی مجلس میں بیٹھ گیا تھا حالانکہ وہ (صائم) روزہ سے تھا۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اس آیت کی تلاوت بطور دلیل کی تھی۔ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْكٰفِرِیْنَ فِیْ جَهَنَّمَ جَمِیْعًا: یہ سزا میں شرکت برابری کیلئے بیان کی گئی ہے اور منافقین سے مراد جنس منافقین ہیں اور مخاطب منافقین بھی اسمیں داخل ہیں اور یہ سزا جنس عمل میں سے ہے یعنی دنیا میں مجالس میں شریک تھے تو آخرت میں ان کے ساتھ عذاب میں بھی شریک ہونگے۔

الَّذِیْنَ یَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِیْنَ نَصِیْبٌ ۙ
قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَیْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ فَاللّٰهُ یَحْكُمُ بَیْنَكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ وَلَنْ یَّجْعَلَ اللّٰهُ

لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿١٤١﴾ "وہ لوگ جو تمہارے متعلق انتظار کرتے ہیں پھر اگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ع
تمہاری کامیابی ہو تو کہتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے اور اگر کافروں کیلئے کچھ (غلبہ کا) حصہ ہو تو کہتے ہیں کہ ہم تم پر
غالب آنے نہیں لگے تھے اور کیا ہم نے تمہیں ایمان والوں سے نہیں بچایا تھا لہٰذا اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان قیامت کے
دن فیصلہ کریگا اور ہرگز نہیں کریگا اللہ تعالیٰ کافروں کیلئے ایمان والوں پر غلبہ کا کوئی راستہ" [141]۔

تفسیر 141 اس آیت میں منافقین کیلئے (زجر) ذاٹنے ہے اور ان کی دو قبیح صفات کا ذکر ہے۔ اَلَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ: تَرَبُّص انتظار کو کہا جاتا ہے اور اس کا مفعول مقدر ہے یعنی (اَلدَّوَائِر) آنے والے اوقات میں حادثات کے منتظر ہیں۔ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ: (ف) حالات کی تفصیل کیلئے ہے اور پہلا حال مسلمانوں کی فتح کا ہے۔ مِنَ اللّٰهِ یہ قید فتح کی عظمت شان کیلئے ہے اور اشارہ ہے کہ فتح احسان الٰہی ہے۔ قَالُوْا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ: اس کا مقصد مقدر ہے یعنی ہمیں غنیمت میں حصہ دو یہ ذکر سبب ہے اور مراد مسبب ہے۔ (قرطبی، ابوحیان) وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ: یہ دوسرا حال ہے اس کو نصیب اسلئے کہا گیا کہ یہ تقدیری دنیاوی حصہ ہے جو کافروں کو بھی حاصل ہے اور اس حصے کی تحقیر دولت کی وجہ سے مِنَ اللّٰهِ نہیں فرمایا اور صحیح بخاری کتاب بدء الوحی حدیث 7 صحیح مسلم کتاب المغازی حدیث 1773 میں ہے کہ (اَلْحَرْبُ سِجَالٌ) جنگ تو مثل ڈھول کے ہے یعنی وہ برتن جس سے کنویں کا پانی نکالا جاتا ہے یعنی ایمان والوں کو غلبہ ملتا ہے مگر کبھی کافروں کو بھی عارضی غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ قَالُوْا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ: یہ منافقین کا کافروں سے خطاب ہے اور ان پر احسان جتلانا مقصود ہے۔ اِسْتِحْوَاذ غالب ہونے، احاطہ کرنے کے معنی میں ہے جیسا کہ سورۃ مجادلہ آیت 19 میں ہے کیا ہم مومنین سے ملکر تم پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتے تھے تمہیں قتل کرتے ہوئے یا قید کرتے ہوئے اور اس میں استفہام تقریری ہے اور مقدر عبارت اس طرح ہے: وَاَبْقَيْنَا عَلَيْكُمْ: ہم نے تم پر رحم کیا اسلئے وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ: منع سے مراد بچانا ہے یعنی ایمان والوں کے غلبے سے تمہیں اس طرح حفاظت دی کہ ہم تمہارے مقابلے میں نہیں آئے اور اس طریقے سے مومنین کمزور ہوئے ورنہ وہ ہماری شرکت سے تم پر غالب آتے۔ اس قول میں ان کا مقصد ان سے مال اور حصہ طلب کرنا ہے یعنی ذکر سبب کا ہے مگر مراد مسبب ہے۔ اس میں ایک قول یہ ہے کہ ہم نے تمہیں مومنوں کی اتباع یعنی قبولیت اسلام سے منع کیا تھا لہٰذا یہ تو ہمارا احسان ہے۔ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ: دنیا میں مومنین اور منافقین دونوں کے مال و خون ظاہری کلمہ پڑھنے سے محفوظ ہیں البتہ الگ فیصلہ جو ہونے والا ہے وہ قیامت میں

ہے۔ بَيْنَكُمْ سے مومنین منافقین اور کافر سب مراد ہیں یا دوسری جانب مقدر ہے یعنی بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ: وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا: اس آیت میں دو قول ہیں: پہلا قول علی، ابن عباس رضی اللہ عنہم کا ہے کہ پہلے جملے کے قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ امر قیامت کے دن ہوگا کیونکہ دنیا میں کافروں کو کبھی غلبہ حاصل ہو جاتا ہے جیسا کہ آیت میں ہے کہ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ: اور امام ابن عطیہ نے اس قول کی نسبت سارے مفسرین کی طرف کی ہے اگرچہ یہ بات درست نہیں ہے۔ دوسرا قول سدی وغیرہ سے منقول ہے کہ یہ دنیا میں ہے اور سبیل سے اس طرح غلبہ مراد ہے کہ ایمان والوں کی ساری قوتیں ختم ہوں جبکہ ایسا نہیں ہوگا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے دعاء طلب کی اپنی امت کیلئے کہ وہ قحط کے ذریعے سے سب ہلاک نہ ہوں تو یہ دعاء قبول ہوئی پھر آپ نے دعا مانگی کہ اے اللہ ان پر بیرونی دشمن اس طرح غالب نہ کرنا کہ ان کی ساری قوت کو ختم کرے تو یہ دعاء بھی قبول ہوئی۔ (صحیح مسلم کتاب الفتن حدیث 2829 صحیح ابن حبان 7236 احمد 175,1)۔ تیسرا قول یہ ہے کہ جو ابن عربی سے نقل ہے کہ یہ کلام ایک قید کے ساتھ مقید ہے یعنی لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا: (مِنْهُ) یعنی اپنی طرف سے ان پر مسلط نہیں کرے گا مگر جب یہ فسق و فجور کریں گے اور منکرات سے منع نہیں کریں گے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع تو بہ نہیں کریں گے تو ان کے اعمال کی وجہ سے ان پر دشمن مسلط اور غالب ہوگا۔ چوتھا قول یہ ہے کہ سبیل سے مراد حجت شرعیہ اور عقلیہ ہے یعنی باطل حق پر دلائل سے غالب نہیں ہو سکتا اور اس آیت سے علماء نے استدلال کیا ہے کہ کافر کی ولایت اور حکمرانی مسلمانوں پر درست نہیں ہے ولی اور متولی اور مسلمانوں پر شہادت یہ سب کافروں کیلئے مسلمانوں پر جائز نہیں ہے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ "یقیناً منافقین اللہ تعالیٰ کو فریب دیتے ہیں اور وہ بھی ان کو فریب دینے والا ہے اور جب وہ نماز کیلئے کھڑے ہوتے ہیں تو (سستی) کاہلی سے کھڑے ہوتے ہیں دکھلاتے ہیں لوگوں کو اور وہ یاد نہیں کرتے اللہ تعالیٰ کو مگر بہت کم" [142]۔

تفسیر 142 اس آیت میں منافقین کیلئے وعید و زجر ہے اور ان کی قبیح صفات کا ذکر ہے۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ: خِدَاع کی تفسیر سورۃ بقرہ میں گزر گئی ہے ان کا اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینا اپنے گمان کے مطابق ہے یا رسول کو (مخادعہ) دھوکا دینا مراد ہے۔ ایمان والوں کا ذکر نہیں کیا کیونکہ ان کے ساتھ دھوکا دینے کا مسئلہ پہلی آیت میں گزر گیا ہے۔ وَهُوَ خَادِعُهُمْ

: یہ ظاہری معنی پر محمل ہے البتہ اللہ تعالیٰ کی صفت مخلوق کی صفت کے ساتھ مشابہ (برابر) نہیں ہوتی اور وہ اس طرح ہے کہ دنیا میں اللہ نے ان کے مال اور خون کو حفاظت دی ہے اور قیامت میں ان کے ساتھ عذاب کا معاملہ کافروں والا ہوگا۔

وَإِذَا قَامُوٓا إِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوا كُسَالٰى: کسل سستی اور کاہلی کو کہا جاتا ہے۔ سبب یہ ہے کہ ان کا اجر ثواب کا ارادہ نہیں ہوتا اور نہ ہی نماز چھوڑنے پر عذاب کا خوف رکھتے ہیں۔ (امام قرطبی رحمہ اللہ) امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ نماز پڑھنے کی شان کی نیت ہوتی ہے اور نہ ہی یہ لوگ نماز کی فرضیت پر ایمان لاتے ہیں اور دل میں خشیت نہیں اور نماز کے معنی کو جانتے نہیں ہیں اور اس میں ایمان والوں کو تنبیہ ہے کہ وہ نماز کو اچھے طریقے سے فراخ دلی سے ادا کریں اور سستی کاہلی کا مظاہرہ نہ کریں۔ ابو حیان رحمہ اللہ نے اپنے زمانہ کے فلسفیوں کے متعلق لکھا ہے کہ گناہ کے کاموں کو چستی سے ادا کرتے ہیں اور نماز کیلئے جب آتے ہیں تو سستی و کاہلی کی روش اختیار کرتے ہیں۔ فَيَأْتُونَ الْمَنَاكِرَ فِي نَشَاطٍ وَيَأْتُونَ الصَّلٰوةَ وَهُمْ كُسَالٰى: يُرَآءُونَ النَّاسَ: پہلے ظاہری صفت تھی اور یہ باطنی قبیح صفت کا بیان ہے اور یہ جملہ حال ہے یعنی سستی کے ساتھ ساتھ ریاکاری کرتے ہیں۔ امام قرطبیؒ نے ابن عربی سے نقل کیا ہے کہ لوگوں کو نماز اسلئے دکھلاتے ہیں کہ لوگوں کو دھوکا دیکر ان سے مال کھائیں۔ يُرَآءُونَ: باب مفاعلہ کو برائے تاکید ذکر کیا ہے یعنی نماز پڑھنے سے اپنے آپ کو مسلمان ثابت کرنا چاہتے ہیں اور دیگر ہر خیر کا عمل دکھلاوے کے لئے کرتے ہیں۔ وَلَا يَذْكُرُونَ اللّٰهَ إِلَّا قَلِيلًا: اس میں دو توجیہات ہیں: (۱) امام قرطبی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ نماز میں تسبیح قراءت نہیں کرتے مگر بہت کم یعنی صرف اللہ اکبر پڑھتے ہیں۔ (۲) دوسری توجیہ یہ ہے کہ نماز کے بغیر بھی ذکر بہت کم کرتے ہیں اور قلت دو قسم پر ہے: ایک مقدار کے اعتبار سے ہے اور یہ یہاں پر مراد نہیں ہے کیونکہ بعض منافق ہزار تسبیح والا ہار لیکر ذکر میں مشغول ہوتے ہیں۔ دوسری قلت کیفیت کے اعتبار سے ہے یعنی تعداد تو بڑھا چڑھا کر کرتے ہیں مگر اس میں اخلاص نیت نہیں ہوتا اور دل سے غفلت کرتے ہیں نیز معنی بھی نہیں جانتے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اگر ان کا ذکر اللہ تعالیٰ کیلئے ہوتا یعنی اخلاص نیت سے تو کثرت سے ہوتا مگر چونکہ وہ دنیاوی غرض کی وجہ سے ہوتا ہے اور دنیا تو متاع قلیل ہے۔ (ابو حیان)۔

مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾

"متردد ہیں (کفر و اسلام) کے درمیان نہ تو ان (کافروں) کی طرف ہیں اور نہ ہی ان (مسلمانوں) کی طرف ہیں اور جن کو اللہ تعالیٰ گمراہ کردے آپ ان کیلئے ہرگز (ہدایت کی) راہ نہیں پائیں گے" [143]-

تفسیر 143 اس میں بھی منافقین کی صفات کا ذکر ہے۔ مُذَبْذَبِيْنَ يُرَاءُوْنَ يَايَذْ كُرُوْنَ سے حال ہے۔ امام راغب رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ذَبْذَبَةٌ اس چیز کی حرکت کی آواز کو کہا جاتا ہے جو (معلق) لٹکائی ہوئی ہو اور ہر طرف سے اس کو دھکا دیا جاتا ہو۔ تو منافقین کا حال بھی یہی ہے کہ ایمان والے اپنے پاس سے بھگاتے ہیں اور کہتے ہیں یہ ہمارے ساتھ نہیں ہیں اور کافر اپنے پاس سے ہٹاتے ہیں کہ یہ ہمارے ساتھی نہیں ہیں لہٰذا اس وجہ سے حیران و متردد ہیں۔ بَيْنَ ذٰلِكَ اس میں کفر اور اسلام کی طرف اشارہ ہے اور حدیث میں منافقین کی مثال اس بکری سے دی گئی ہے جو دو ریوڑوں کے درمیان ہو اور اس کو نر بکرے کی جفتی کی ضرورت ہو تو کبھی ایک ریوڑ میں گھس جاتی ہے اور کبھی دوسرے ریوڑ میں صرف اپنی خواہش پوری کرنا چاہتی ہے صحیح مسلم کتاب الایمان حدیث 2784: لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ اِلٰى: کا متعلق مخفی مقدر ہے یعنی مَنْسُوْبِيْنَ اُن کی نسبت نہ تو کافروں کے اور نہ مسلمانوں کی طرف ہوتی ہے۔ دونوں جملوں میں فرق یہ ہے کہ پہلے جملہ میں انکی صفت لازمی کا ذکر ہے یعنی وہ خود متردد و حیران ہیں اور دوسرے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اور لوگ بھی ان کی نسبت میں حیران ہیں یعنی مؤمنین کی طرح اخلاص بھی ان میں نہیں اور کافروں کی طرح واضح کفر بھی ان میں نہیں۔ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا: اس کے دو معنی ہیں: پہلا معنی یہ ہے کہ آپ ان کی ہدایت کیلئے راستہ نہیں پائیں گے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ آپ ان کو ہدایت پر نہیں پائیں گے یعنی کبھی وہ ہدایت پر نہیں چلیں گے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝ "اے ایمان والو کافروں کو ایمان والوں سے (صرف نظر کرتے ہوئے) دوست مت بناؤ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کیلئے (اپنے نفاق یا عذاب) پر ظاہر دلیل بناڈالو" [144]۔

تفسیر 144 ربط ۱: منافقین کی صفات کا ذکر ہوا ہے کہ وہ کافروں سے دوستیاں کرتے ہیں تو اب ایمان والوں کو ان صفات سے منع کیا جا رہا ہے۔ ربط ۲: جب منافقین کی قبیح صفتوں کا ذکر ہوا تو اب ایمان والوں کے لیئے ان کی دوستی سے ممانعت ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ: اس میں دو قول ہیں: اَلْكَافِرِيْنَ سے مراد ظاہر کافر ہیں دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے منافقین مراد ہیں مگر سابقہ صفات ان کے کفر پر واضح علامت ہے تو اسلئے ان کو کافر قرار دیدیا۔ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا: اس میں دو قول ہیں اور دونوں کی بناء پر خطاب مخلص ایمان والوں سے ہے عَلَيْكُمْ سے مراد عَلٰى نِفَاقِكُمْ ہے یہ پہلا قول ہے اور دوسرے قول کی بناء پر عَلٰى

عَذَابِکُمْ مراد ہے۔ سلطان سے برہان مراد ہے اور یہ مذکر کا صیغہ ہے۔

إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۖ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيرًا ﴿١٤٥﴾

"یقیناً منافقین آگ کے نچلے طبقہ میں ہونگے اور نہیں پائینگے آپ انکے لئے کوئی مددگار" [145]۔

تفسیر 145 اس آیت میں منافقین کیلئے آخرت کا تخویف ذکر ہے۔ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ: دَرْكِ سے طبقہ مراد ہے مفسرین نے جہنم کے سات طبقات ذکر کئے ہیں جو ایک دوسرے کے اوپر نیچے ہیں: (۱) جہنم (۲) لَظٰی (۳) حُطَمَةُ (۴) سَعِیْر (۵) سَقَرْ (۶) جَحِیْم (۷) هَاوِيَةُ: لفظ نار سے ان سب کی تعبیر ہوسکتی ہے ان میں سے بعض کی تفصیل سورۃ حجر میں آئیگی ان شاء اللہ۔ اور ان کو درکات اسلئے کہتے ہیں کہ ایک دوسرے کے اوپر ہیں اور منافقین کا عذاب اسلئے سخت ہے کہ انہوں نے کفر کا ارتکاب کرتے ہوئے اسلام کے ساتھ اِسْتِهْزَاءٌ خِدَاعٌ اور دیگر صفات قبیحہ کو جمع کیا ہے اور چونکہ منافقین کا کفر مخفی ہے یعنی چھپا ہوا ہے تو ان کیلئے سزا کی جگہ بھی نیچے مخفی رکھی ہے جو سزا مِنْ جِنْسِ الْعَمَلِ کے تحت ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيرًا: عذاب سے بچانے والا یا اس میں کمی کرنے والا۔

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَاعْتَصَمُوا بِاللَّهِ وَأَخْلَصُوا دِينَهُمْ لِلَّهِ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿١٤٦﴾ "مگر وہ لوگ جنہوں نے (نفاق سے) توبہ کی اور صالح عمل کیا اور مضبوط پکڑا اللہ تعالیٰ (کے دین) کو اور اپنا دین اللہ تعالیٰ کیلئے خالص کیا تو یہ لوگ مومنوں کیساتھ ہونگے اور عنقریب اللہ تعالیٰ مومنوں کو اجر عظیم دیگا" [146]۔

تفسیر 146 اس آیت میں منافقین کیلئے توبہ کی ترغیب ہے اور اس کی چار شرطیں ہیں چونکہ منافقین ایسی صفات سے متصف تھے جو ان شرطوں کے مدمقابل ہیں یعنی کفر فساد کافروں سے دوستی ان کے ذریعے سے عزت کی تلاش، ریاکاری سمعت وغیرہ لہذا ایمان کی شرط کفر کے مقابل ہے اور اس سے تعبیر إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا: سے کی ہے یعنی کفر ونفاق سے توبہ کرو تو تب صحیح ایمان پرکاربند ہوں گے۔ وَأَصْلَحُوا یہ ان کے فاسد اعمال کے مقابل ہے وَاعْتَصَمُوا بِاللَّهِ: یہ کافروں سے دوستی اور اس کے ذریعے سے عزت کی تلاش کے مقابل ہے اور اس سے مراد کتاب اللہ پر اعتماد اور اس پر اجر کی امید رکھنا ہے۔ وَأَخْلَصُوا دِينَهُمْ لِلَّهِ: یہ ریاء اور سمعت کے مقابل ہے۔ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ: ان صفات کے حاصل کرنے کے بعد اب یہ دنیا اور آخرت میں ایمان والوں کے ساتھ شامل ہونگے اگرچہ یہ لوگ مومن ہیں مگر حرف مَعَ کے ساتھ ان

کو ذکر کیا گیا ہے اس میں ان صفات کی قباحت کی طرف اشارہ ہے جن کے ساتھ یہ لوگ متصف تھے اور امام فراء نے لکھا ہے کہ مَعَ. مِنَ کے معنی میں ہے۔ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا: سَوْفَ لفظ میں جنت میں جانے کیلئے انتظار کی طرف اشارہ ہے۔ اَلْمُؤْمِنِيْنَ فرمایا ضمیر کو راجع نہیں کیا تو اس میں اشارہ ہے کہ پہلے سے منافق ہو پھر توبہ کرے یا ابتداء سے مؤمن ہو دونوں کیلئے استعمال ہوا ہے اور اَجر عظیم جنت سے کنایہ ہے۔

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا﴿۱۴۷﴾ ''اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دیکر کیا کریگا اگر تم شکر کرو اور تم ایمان لاؤ اور اللہ تعالیٰ انتہائی قدر دان اور خوب جاننے والا ہے''[147]۔

تفسیر 147 اس آیت میں توبہ کی طرف ترغیب ہے اور عذاب سے نجات کا ذکر ہے۔ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ منافقین سے خطاب ہے مَا استفہامیہ برائے انکار ہے اور بعض علماء کے نزدیک مَا نافیہ ہے جملہ کا مقصد یہ ہے کہ جب کوئی کسی کو سزا دیتا ہے تو اپنا غصہ ٹھنڈا کرتا ہے یا بدلہ لیتا ہے یا کوئی فائدہ حاصل کرتا ہے یا کوئی نقصان سے بچنے کیلئے ایسا کرتا ہے جبکہ اللہ ان چیزوں کا محتاج نہیں۔ بلکہ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ: میں عذاب تمہارے اعمال کفر کی وجہ سے ہے لہٰذا توبہ کر کے ایمان لاؤ اور شکر کرو تو عذاب ٹل جائیگا۔ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ: سوال: ایمان تو شکر سے پہلے ہے تو یہاں پر بعد میں کیوں ذکر کیا ہے؟۔ جواب 1: شکر سے اجمالی شکر مراد ہے یعنی جب انعام کرنے والے کا دل میں تعارف پیدا ہو جائے تو یہ ایمان کیلئے سبب بنتا ہے اور سبب مسبب پر مقدم ہوتا ہے۔ جواب 2: شکر سے مراد وہ توبہ ہے جو شرطوں کے ساتھ سابقہ آیت میں گزر گئی ہے اور ایمان پر توبہ مقدم ہوتی ہے اور ایمان سے مراد وہ ایمان ہے جس میں اِعْتِصَامُهٗ بِاللّٰهِ اور اخلاص ہو۔ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا شَاكِرًا: بغیر مبالغہ کے ذکر کیا ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تھوڑا عمل بھی شروط کے مطابق قبول فرماتا ہے اور اس پر بہت اجر دیتا ہے۔ عَلِيْمًا ایمان اور شکر پر عالم ہے لہٰذا اس کے مطابق بدلہ دیتا ہے۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ۝ "اللہ تعالیٰ برائی کی بات کو اونچی آواز سے پسند نہیں کرتا ہے مگر جس پر ظلم کیا گیا ہو اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے"[148]۔

تفسیر 148 ربط 1: مسلمانوں کے مقابلے میں منافقین کے قبائح اور مظالم کے بیان کے بعد اب یہاں سے اللہ تعالیٰ اجازت دے رہے کہ منافقین کی بری صفات کا تذکرہ کیا جائے اور انہیں بد دعا دی جائے۔ ربط 2: جب منافقین کا ان کی بری صفات کی وجہ سے رد کیا گیا تو انہوں نے عذر پیش کیا کہ ہم مجبوراً کافروں کا ساتھ دیتے ہیں تو اس آیت میں ان کا رد ہے کہ مجبوری میں تو بندے پر جبر ہوتا ہے جبکہ تمہارے اوپر کوئی جبر نہیں ہے۔ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ: پہلے ربط کے مطابق کسی شخص کی برائی بیان کرنا جَهْرَ بِالسُّوْٓءِ: میں مراد ہے۔ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ: سے وہ شخص مراد ہے جو ان کے ضرر اور شر سے تنگ آکر مجبور ہو کر بددعا کرتا ہے یا ان کی برائی بیان کرتا ہے مَنْ ظُلِمَ سے وہ شخص مراد ہے جو منافق یا فاسق کے مظالم سے تنگ ہو کر اظہار کرتا ہے کیونکہ وہ مظلوم ہے اور مظلوم کیلئے بددعا کی اجازت ہے اور ابن المستنیر اور قطرب کا قول یہ ہے کہ جَهْرَ بِالسُّوْٓءِ: سے مراد زبان سے کلمہ کفر کہنا ہے مَنْ ظُلِمَ سے وہ مراد ہے جس پر جبر کیا جائے کہ تم کفریہ جملے زبان سے بولو۔ جیسا کہ سورۃ نحل آیت 106 میں مذکور ہے۔ مجاہد رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اس سے وہ شخص مراد ہے کہ صحراء میں کسی کا مہمان بنے اور جس کا مہمان بنا ہے وہ مہمان نوازی سے انکار کرے۔ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا: ظالم کے ظلم کے سبب مظلوم کی بددعائیں سنتا ہے یا اس میں مظلوم کو ڈرایا جاتا ہے کہ حد سے تجاوز مت کرو۔

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ۝ "اگر تم برائی علانیہ کرو یا اسے خفیہ کر دو یا برائی کو تم معاف کر دو تو یقیناً اللہ تعالیٰ بھی بہت معاف کرنے والا بڑی قدرت والا ہے"[149]۔

تفسیر 149 یہ ان آداب کا ذکر ہے جو سابقہ رخصت و اجازت کے متعلق ہیں۔ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ یعنی مظلوم اگر جَهْرَ بِالسُّوْٓءِ کے بجائے اس ظالم کے ساتھ اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرے یا اس کے ساتھ خفیہ نیکی کرے اور اس کیلئے اللہ تعالیٰ سے خیر و ہدایت کی دعا طلب کرے اور صبر و تحمل سے کام لے تو اس پر اکتفا کرنا بہت اچھا ہے یا جس پر جبر کیا جاتا ہے وہ کلمہ توحید خاموشی سے پڑھتا رہے اور کلمہ کفر کے بجائے کفر سے انکار کرتے ہوئے عزیمت پر عمل کرے۔ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ: یعنی اگر ظالم کے ساتھ نیکی بھلائی وغیرہ نہیں کرتا ہے فقط درگزر سے اور خاموش رہنے پر اکتفا کرے تو پہلے والا اعلیٰ درجہ ہے اور برائی سے عفو کرنا یہ دوسرا درجہ ہے۔ یا وہ شخص جس پر جبر کیا جاتا ہے وہ اگر کلمہ توحید کا اظہار نہیں کرتا صرف

کلمہ کفر سے خاموش رہ جاتا ہے تو یہ تیسرا درجہ ہے۔ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا: اس میں مظلوم کو ترغیب دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ قادر ہونے کے باوجود معاف کرتا ہے جبکہ تم تو بے بس ہو تو تم کیوں معاف نہیں کرتے۔ اس میں اس شخص کیلئے تسلی ہے کہ اگر جبراً تم سے کوئی کلمہ کفر کہلوائے تو اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا ہے اور ظالم سے اللہ تعالیٰ انتقام لے سکتا ہے اسلئے کہ وہ قادر ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ "یقیناً وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں پر کفر کرتے ہیں اور ارادہ کرتے ہیں کہ تفریق پیدا کریں اللہ تعالیٰ کے (حکم) اور اس کے رسولوں کے (حکم) میں اور وہ کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض پر کفر کرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ بنائیں اس کے درمیان کوئی اور راستہ" [150]۔

تفسیر 150 خلاصہ: اس آیت سے آیت 169 تک دوسرا باب ہے اس میں یہودیوں کے متعلق گفتگو ہے اہل کتاب کے منکرین کیلئے وعیدیں ہیں اور ان کے ایک سوال کا جواب آیت 153 میں ہے۔ پہلے الزامی جواب ہے جس میں ان کے اکابرین کے پچیس (25) قبائح بیان ہوئے ہیں ان میں سے بعض پاک چیزوں کی حرمت کے اسباب کا ذکر ہے پھر اہل کتاب کے نیک لوگوں کیلئے خوشخبریاں ہیں پھر تحقیقی جواب آیت 163 میں اور 164 میں ذکر ہے اور آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا ذکر آیت 165 میں ہے پھر آیت 166 میں اللہ تعالیٰ اور ملائکہ کی شہادت قرآن کریم کی سچائی پر ذکر ہے اور آخری آیت میں آخرت کا خوف ذکر ہے۔ ربط: منافقین کی برائیوں کو بیان کرنے کے بعد اب یہودیوں کی برائیوں کا آغاز ہوتا ہے کیونکہ وہ ان بری عادتوں میں ایک دوسرے سے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ: یعنی ان کا ایمان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان کی طرح شرعی ایمان نہیں ہے اور بعض رسولوں پر کفر تمام رسولوں پر کفر کے مترادف ہے۔ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ: ان کا یہ فرق ارادہ کے طور پر ذکر کیا ہے یعنی زبانی دعویٰ تو ان کا یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں البتہ اس کے تمام رسولوں کو نہیں مانتے اور سابقہ جملہ (يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ) میں انکی حقیقت ذکر کی ہے کہ ان کا ایمان اللہ تعالیٰ پر بھی صحیح ایمان شرعی نہیں ہے۔ اس آیت میں یہ بات داخل ہے کہ جو یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب پر ایمان لاتا ہوں لیکن حدیث نہیں مانتا ہو تو یہ بھی اسی طرح اللہ تعالیٰ اور رسولوں میں فرق کے مترادف ہے۔ تنبیہ: فرق سے مراد ذات کا فرق نہیں بلکہ اللہ اور رسول پر ایمان

لانے میں تفریق مراد ہے جبکہ یہ بات تو یقینی دلائل سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات الگ ہے اور رسولوں کی ذات الگ ہے۔ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ: یہودیوں کا (زبانی) دعویٰ ہے کہ ہم ابراہیم اسحاق اور موسیٰ علیہم السلام کو مانتے ہیں اور اسماعیل عیسیٰ علیہم السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتے۔ اسی طرح نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے کا (زبانی) دعویٰ کرتے ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے انکار کرتے ہیں وَيُرِيدُونَ أَن يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا: ذٰلِكَ میں اشارہ ہے کہ سارے پر ایمان لانا اور سارے پر کفر کرنا جو کہ مذکور کی تاویل کیساتھ ہے اور یہ تو کفر اور ایمان کے درمیانی راستہ تلاش کرنا ہے جبکہ حقیقت میں درمیان میں کوئی راستہ نہیں (تفسیر ابو حیان) اس آیت میں ان کی چار صفات کا ذکر ہے۔

أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ﴿١٥١﴾

"یہی لوگ درحقیقت میں یقینی کافر ہیں اور ہم نے کافروں کیلئے رسوا کرنے والا عذاب تیار کیا ہے" [151]۔

تفسیر 151 یہ لفظ إِنَّ کیلئے خبر ہے یا اس کی خبر مقدر ہے یعنی (جَمَعُوا الْمَخَازِيَ) انہوں نے شرمندگی جمع کی ہے۔ یہ قول بہتر ہے اسلئے کہ یہ مستقل آیت ہے اور اس میں ان کی ایک اور صفت قبیحہ کا ذکر ہے۔ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا یعنی بلاشک اس کا معنی یہ ہے کہ ان اہل کتاب وغیرہ لوگوں کا کفر یقینی ہے یہاں حق سے مراد باطل کے مقابل نہیں ہے کیونکہ کفر تو حق نہیں ہوسکتا ہے۔ وَأَعْتَدْنَا یہ تمام کافروں کیلئے وعید وتخویف ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٥٢﴾ "اور وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور انہوں نے ان میں سے کسی ایک کے درمیان تفریق (جدائی) نہیں کی تو ان لوگوں کو جن کو ان کا رب اجر دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے" [152]۔

تفسیر 152 اس میں عمومی بشارت ہے اور مومنین اہل کتاب کے لیے خصوصی بشارت ہے وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ یہ ان کی بری صفت جو گزر گئی اس کے مقابل ہے یعنی وَيُرِيدُونَ أَن يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ: اور بعد والا جملہ أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ: یہاں پر سوف تنفیس وعدے اور تنبیہ کیلئے ہے بعد یعنی دوری کا معنی اس میں مقصود نہیں یعنی ان کے اعمال اور اجر باطل اور ضائع نہیں ہوئے ہیں کیونکہ انہوں نے کسی قسم کا کفر شرک نہیں کیا اور دیگر گناہ بخش

دیے گئے ہیں۔

يَسْأَلُكَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتَابًا مِنَ السَّمَاءِ فَقَدْ سَأَلُوا مُوسَىٰ أَكْبَرَ مِنْ ذَٰلِكَ فَقَالُوا أَرِنَا اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْهُمُ الصَّاعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذَٰلِكَ ۚ وَآتَيْنَا مُوسَىٰ سُلْطَانًا مُبِينًا ﴿١٥٣﴾ "آپ سے اہل کتاب سوال کرتے ہیں یہ کہ آپ ان پر (ایک ہی بار) ایک کتاب آسمان سے اتار لائیں پس یقیناً انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بڑی چیز کا مطالبہ کیا تھا پس انہوں نے کہا تھا دکھا دیں ہمیں اللہ تعالیٰ بالکل سامنے تو ان کو بجلی نے ان کے ظلم کی وجہ سے پکڑ لیا تھا پھر انہوں نے بچھڑے کو (معبود) بنا لیا تھا بعد اس کے کہ واضح دلیلیں ان کے پاس آ چکی تھیں پھر ہم نے یہ بھی معاف کیا اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو واضح غلبہ دیا تھا [153]"۔

تفسیر 153 اس آیت میں وعید ہے اور اہل کتاب کی دیگر قبیح صفات کا ذکر ہے۔ يَسْأَلُكَ أَهْلُ الْكِتَابِ ان کا یہ سوال عناد (تَعَنُّت) کے طور پر ہے اور یہ بری صفت ہے۔ أَهْلُ الْكِتَابِ اس سے وہ اہل کتاب مراد ہیں جنکا ذکر آیت 150 میں گزر گیا ہے یعنی رسولوں میں یا کتاب وسنت میں فرق کرنے والے ہیں۔ أَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتَابًا مِنَ السَّمَاءِ: انہوں نے کہا تھا کہ ایک بار ہم پر ایسی کتاب آسمان سے اتار لاؤ جس کو ہم پڑھ لیں اور اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کریں جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام اور دیگر نبیوں نے اپنی اپنی کتابیں ایک ہی بار لائی تھیں۔ یہاں پر تَنْزِيْل بمعنی اِنْزَال ہے مقصد یہ ہے کہ کتاب کا مکمل طور پر نزول ایک ہی دفعہ ہو اور اس قسم کا سوال عام مشرکین نے بھی کیا تھا جیسا کہ سورۃ فرقان آیت 32 میں ہے چونکہ یہ عنادی سوال تھا تو پہلے اس کا الزامی جواب دیا گیا ہے جو ان کے بڑوں کے قبائح کا تذکرہ ہے اور بعد میں آیت 163 میں تحقیقی جواب ذکر ہے۔ فَقَدْ سَأَلُوا مُوسَىٰ أَكْبَرَ مِنْ ذَٰلِكَ: فَا سبب کے لئے ہے اور پہلے عبارت مقدر ہے (آپ برداشت کریں اس بات کو بڑی بات مت سمجھیں) کیونکہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بہت بڑا سوال کیا تھا یعنی سوال تو ان کے بڑوں نے کیا تھا مگر اس پر یہ لوگ خوش ہیں تو یہ بھی اس میں شریک شمار ہوں گے۔ فَقَالُوا أَرِنَا اللَّهَ جَهْرَةً: (فَا) سوال کی تفصیل کیلئے ہے اور سورۃ بقرہ آیت 55 میں اس طرح گزرا ہے۔ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّاعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ: ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا صَاعِقَةٌ موت کے معنی میں ہے اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آگ تھی جو آسمان سے نازل ہوئی اور اس کے بعد لفظ مخفی ہے یعنی موسیٰ علیہ السلام کی دعاء سے زندہ ہو گئے (تفسیر

قرطبی) نیز یہ ان کی ایک دوسری قباحت کا بیان ہے۔ بِظُلْمِهِمْ سے عنادی سوالات مراد ہیں۔ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ: یہ بھی ان کی قباحت کا ذکر ہے اَلْبَیِّنَاتِ سے مراد وہ معجزات ہیں جو موسیٰ علیہ السلام لیکر آئے تھے اور اس میں توحید کی دلیلیں تھیں۔ سوال: سورۃ بقرۃ کی ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ بچھڑے کو معبود بنانے کا واقعہ أَرِنَا اللَّهَ جَهْرَةً: سے قبل ہوا ہے۔ جواب: یہ ثُمَّ ترتیب اخبار کیلئے ہے ترتیب واقع کیلئے نہیں ہے۔ (تفسیر ابو حیان)۔ یعنی ثُمَّ تعقیب ذکری کیلئے ہے۔ فَعَفَوْنَا عَنْ ذَٰلِكَ: ان کی توبہ کرنے کی وجہ سے جو سورۃ اعراف آیت 149 میں ذکر ہے ہم نے معاف کیا۔ وَآتَيْنَا مُوسَىٰ سُلْطَانًا مُبِينًا: اس سے مراد تورات ہے جو واضح حجت ہے اور سلطان حجت سے حاصل ہوتی ہے یا اس سے مراد وہ خوف و رعب ہے جو موسیٰ علیہ السلام کا فرعون پر تھا کہ ان کو قتل نہیں کر سکتا تھا اور بنی اسرائیل نے اس رعب کی وجہ سے اس حکم کو تسلیم کیا کہ اُقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ

وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّورَ بِمِيثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوا فِي السَّبْتِ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا ۞ "اور ہم نے ان سے وعدہ لینے کیلئے ان پر طور پہاڑ کو اٹھا لیا اور ہم نے ان سے کہا کہ تم دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ اور ہم نے ان سے کہا کہ تم ہفتہ کے دن میں حد سے تجاوز مت کرو اور ہم نے ان سے مضبوط عہد لیا تھا" |154|۔

تفسیر 154 اس آیت میں بنی اسرائیل کی دوسری قباحتوں کا ذکر ہے لیکن ان قباحتوں کی تصریح نہیں کی ہے اسلئے کہ بِمِيثَاقِهِمْ کا مطلب یہ ہے کہ ان سے تورات پر عمل کرنے کیلئے وعدہ لیا گیا اور اس وعدہ کے وقت طور پہاڑ کو ان کے سروں پر اٹھایا گیا جیسا کہ سورۃ بقرۃ آیت 63 میں ذکر ہوا ہے لہٰذا اس میں بھی ان کی قباحت کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا: میں حکم کی تبدیلی کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ سورۃ بقرۃ آیت 59 میں ذکر ہوا ہے تو یہ بھی ان کی قباحت کی طرف اشارہ ہے اور اسی طرح وَقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوا فِي السَّبْتِ: میں اس عمل کی مخالفت کرنے کی طرف اشارہ ہے جو سورۃ بقرۃ آیت 65 اور سورۃ اعراف آیت 163 میں ذکر ہے۔ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا: ابو حیان نے فرمایا کہ اس میں ان کے اس میثاق توڑنے کی طرف اشارہ ہے جو سورۃ آل عمران آیت 81 میں مذکور ہے۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِآيَاتِ اللَّهِ وَقَتْلِهِمُ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَقَوْلِهِمْ قُلُوبُنَا غُلْفٌ ۚ بَلْ طَبَعَ اللَّهُ

عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ "پھر (ہم نے) بسبب انکے اپنے عہد کو توڑنے کے اور ان کا اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر کفر کرنے کے اور ان کا انبیاء کو ناحق قتل کرنے کے اور (بسبب) ان کے کہنے کے کہ ہمارے دل علم کے برتن ہیں بلکہ بسبب ان کے کفر کے ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی ہے پس وہ ایمان نہیں لاتے مگر بہت تھوڑے" [155]۔

تفسیر 155 اس آیت میں ان کی مزید قباحتوں (بری عادات) کا ذکر ہے اور ان قباحتوں کو جو بعد میں ذکر ہیں اسباب تحریم طیبات کہتے ہیں لہٰذا اس آیت میں ان میں سے (6) مذکور ہیں۔ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ: اس کے متعلق دو قول ہیں: (1) پہلا قول یہ ہے کہ یہ متعلق ہے بعد والی حَرَّمْنَا آیت 160 سے اور فَبِظُلْمٍ بدل ہے بِمَا نَقْضِهِمْ سے اس قول کو زجاج اور زمخشری رحمہما اللہ وغیرہ نے اختیار کیا ہے۔ (2) دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا متعلق مقدر یعنی لَعَنّٰهُمْ یا اَذْلَلْنَا هُمْ: یہ قول ابن عطیہ اور ابو حیان رحمہما اللہ وغیرہ کا ہے اور مِيْثَاقَهُمْ سے وہ وعدے مراد ہیں جو گزشتہ آیت میں ذکر ہیں جو انہوں نے توڑ ڈالے۔ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ: اس کی تفسیر گزر گئی ہے۔ وَقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ: اس کی تفسیر سورۃ بقرہ آیت 88 میں گزری ہے۔ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ: یہ ان کے اس قول کا جواب ہے کہ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ یعنی ان کے دلوں تک حق کی رسائی اسلئے بند نہیں ہے کہ وہ پردے میں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مہر لگانے کی وجہ سے بند ہیں اور اس پر مہر لگانے کی وجہ بھی ان ہی کا کفر ہے۔ سوال: سورۃ بقرۃ آیت 88 میں بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ فرمایا ہے اور یہاں پر بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ فرمایا ہے؟ جواب: سورۃ بقرۃ میں یہودیوں پر لعنت کے اسباب کا بیان تھا جیسا کہ آیت 89، 159 اور 161 میں اس کا تفصیلی ذکر ہے اور لَعْنَةُ اللّٰهِ کی خاص رحمتوں سے محروم ہونا ہے اور یہاں ان کی جہت ساری قبیح صفات کی وجہ سے ان کی جہالت ضد وعناد کا اظہار مقصود ہے تو اس کیلئے طبع کا لفظ زیادہ مناسب ہے۔ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا: سورۃ نساء آیت 46 میں اس طرح گزرا ہے اور لفظ قَلِيْلًا میں مشہور تین قول ہیں: (1) اِيْمَانًا قَلِيْلًا (2) زَمَانًا قَلِيْلًا (3) قَلِيْلًا مِّنْهُمْ: سوال: سورۃ بقرہ آیت میں فرمایا کہ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ جواب: وہاں لعنت ذکر کرنے کی وجہ سے بہت تاکید کی ضرورت تھی تو حرف مَا میں قلت کی بہت تاکید کی گئی یہاں تک کہ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس قلت سے مراد عدم ایمان ہے یعنی ان کا ایمان ہی نہیں ہے۔ (وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِحُكْمِهِ) اس آیت تک ان کی وہ قبیح صفات ذکر ہوئیں جو عیسیٰ علیہ السلام کے دور سے پہلے تھیں اب ان کا ذکر ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں تھیں۔

وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿١٥٦﴾

"اور بسبب ان کے کفر کرنے اور مریم پر بہت بڑے بہتان باندھنے کے" [156]۔

تفسیر 156 اس آیت میں ان کی دو قبیح صفات کا ذکر ہے جو اسباب مہر میں سے ہیں اور یہاں پر کفر سے مراد عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت سے انکار ہے یا بغیر والد کے عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش جو کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت عظیم سے انکار ہے۔ (اللباب) وَبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا: بُهْتَانًا اس گناہ کو کہا جاتا ہے جس کے بڑے ہونے اور سخت ہونے سے انسان حیران رہ جائے اور اس کو نکرہ ذکر کرنا اور عَظِيْمًا کے ساتھ تاکید کرنا بہت ہی تاکید در تاکید ہے اس بہتان کا ذکر سورۃ مریم آیت 27 میں ہے۔ صاحب اللباب نے لکھا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے مریم علیہا السلام پر یہود کے بہتان کا ذکر کیا کہ بہتان عظیم ہے اور عائشہ رضی اللہ عنہا پر منافقین کے بہتان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ: سورۃ نور آیت 16 تو معلوم ہوا کہ شیعہ روافض جو عائشہ رضی اللہ عنہا پر طعن و تشنیع کرتے ہیں یہودیوں کے مثل ہیں جو مریم علیہا السلام پر طعن کرتے تھے۔

وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۭ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ﴿١٥٧﴾

"اور ان کا یہ کہنا کہ ہم نے مسیح کو قتل کیا ہے جو عیسیٰ علیہ السلام مریم کا بیٹا اور اللہ تعالیٰ کا رسول ہے انہوں نے اس کو نہ تو قتل کیا ہے اور نہ ہی اس کو سولی پر چڑھایا ہے لیکن ہم شکل بنا ان کیلئے (مثل عیسیٰ علیہ السلام) ایک شخص اور یقیناً وہ لوگ جنہوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا بلاشبہ وہ اس کے متعلق شک میں ہیں نہیں ہے ان کے پاس اس پر کوئی علم (دلیل) مگر اپنے گمان کی پیروی کرتے ہیں اور انہوں نے اس کو حقیقت میں قتل نہیں کیا ہے" [157]۔

تفسیر 157 اس آیت میں ان کی ایک دوسری قباحت کا بیان ہے اور اس کی تردید بہت طریقوں سے کی گئی ہے: (1) پہلا طریقہ: قَوْلِهِمْ فرمایا قَتْلِهِمْ نہیں فرمایا یعنی ان کا یہ قول جھوٹ پر مبنی ہے انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا: اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ: سوال: یہودی تو ان کی نبوت کے منکر ہیں تو انہوں نے رسول کیوں کہا؟ جواب 1: ان کا یہ رسول کہنا بطور استہزاء ہے جیسا کہ سورۃ حجر آیت 6 اور سورۃ شعراء آیت 27 میں ہے۔ جواب 2: یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے تعریف ہے تاکہ ان کیلئے سبب تذلیل ہو: وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ: چونکہ قتل اور

صلیب میں ملازمہ نہیں ہے کیونکہ کبھی بغیر صلیب قتل ہوتا ہے تو اس کی نفی کرلی (اور صلیب پر قتل کا طریقہ یہ ہے کہ بندے کو ایک لکڑی سے باندھ لیا جاتا ہے اور کسی تیز دھار آلے سے اسے قتل کردیا جاتا ہے یا تیر سے مارا جاتا ہے) اسلئے صلیب کی بھی نفی کردی۔ یہود نے اور پھر ان کی تقلید میں نصاریٰ نے چونکہ دونوں نے (قتل وصلب) کا دعویٰ کیا ہے لہٰذا قرآن نے ان دونوں کی تردید کی ہے۔ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ: تشبیہ مجہول کا صیغہ ہے جو شبہ سے لیا گیا ہے اور شبہ شکل میں برابری کو کہا جاتا ہے اور اس کا نائب الفاعل حذف ہوا ہے اور لَهُمْ نائب الفاعل کی جگہ ہے مطلب یہ ہے کہ ان کو عیسیٰ علیہ السلام کے قتل میں شبہ واقع ہوا یعنی انہوں نے ایسے شخص کو قتل کیا ہے جو شکل میں عیسیٰ علیہ السلام سے مشابہ کیا گیا تھا یا پھر شبہ اشتباء سے لیا گیا ہے اور لام عَلٰی کے معنیٰ میں ہے تو معنیٰ یہ ہوا کہ ان کو عیسیٰ علیہ السلام کے صلب کے متعلق اشتباہ ڈالا گیا ہے یعنی یہود کے اکابرین نے عیسیٰ علیہ السلام کو نہیں پایا تو ان کی جگہ دوسرے بندے کو پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا جب اس کی شکل بدل گئی تو انہوں نے لوگوں سے کہا کہ یہ سولی پر لٹکا ہوا عیسیٰ علیہ السلام ہے۔ فائدہ 1: ابن جریر رحمہ اللہ نے ابن وہب رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنے ستائیس مخلص ساتھیوں سمیت ایک گھر میں داخل ہوئے تو یہودیوں نے اس گھر کا گھیراؤ کیا جب گھر میں اندر داخل ہونے لگے تو عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب ہو کر فرمایا کہ کوئی ہے جس کو جنت کی طلب ہو تو ان میں سے ایک شخص فرمانے لگا میں جنت کا گھر چاہتا ہوں تو اللہ تعالیٰ نے اس کی شکل عیسیٰ علیہ السلام کی صورت میں تبدیل کی اور عیسیٰ علیہ السلام جبریل کے ساتھ مکان کی چھت پر جو سوراخ کیا گیا تھا اس کے ذریعے سے آسمان پر چڑھ گئے اور یہودیوں نے اس شخص کو قتل کیا جو عیسیٰ علیہ السلام کا ہم شکل بنا تھا۔ اس روایت پر شبہ کا پہلا معنیٰ دلالت کرتا ہے ایک اور روایت میں اس طرح ہے کہ جب ان کو مکان میں عیسیٰ علیہ السلام نہیں ملے کیونکہ وہ چھت سے آسمانوں پر چڑھ گئے تھے تو انہوں نے ایک شخص کو سولی پر چڑھایا اور قریب کسی کو نہیں چھوڑا بس مشہور کیا کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دیدی جب اس کی شکل بگڑنے لگی تو انہوں نے مشہور کیا کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا ہے تو لوگوں پر التباس واشتباہ ڈال دیا یعنی عوام لوگ ایک شک والی کیفیت میں مبتلا ہوئے یہ روایت دوسرے معنیٰ کے ساتھ موافق ہے۔ فائدہ 2: اس مسئلہ میں انجیل کے مختلف نسخوں اور نصاریٰ کی متضاد خبریں وغیرہ اور ان پر تردید اور القاء شبہ پر ان کے اعتراضات اور اس کے جوابات اور انجیل خامس سے اس شبہ کی موافقت جو عبارت میں وارد ہے یہ تمام بحث بالتفصیل امام قاسمی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں نقل کی ہے اور آخر میں امام ابن تیمیہ کی کتاب الفرقان بین الحق والباطل سے مکمل تشریح نقل کی ہے اُسے

مطالعہ کریں۔ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ: یعنی یہود ونصاریٰ نے جو عقیدے کا اختلاف کیا ہے وہ ان کے قتل کے بارے میں شک میں ہیں یعنی یہودیوں نے ان کو قتل کرنے کے بعد شک کیا کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہے یا نہیں بلکہ کوئی اور شخص ہے۔ بعض نے کہا کہ چہرہ تو اسی کا ہے لیکن باقی بدن اس کا نہیں ہے۔ باقی رہے نصاریٰ تو وہ عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے عقیدے کے بعد تین گروہوں میں تقسیم ہوئے: نسطوریہ، ملکانیہ، یعقوبیہ۔ نسطوریہ نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام ناسوتیت کے اعتبار سے صلیب دیئے گئے ہیں اور لاہوتیت کے اعتبار سے زندہ اور باقی ہیں۔ ملکانیہ کا قول ہے کہ قتل اور صلب ان کی لاہوتیت کو احساس اور شعور سے جا پہنچا مگر قتل ان کو ذات کے اعتبار سے نہیں پہنچا اور یعقوبیہ کا قول ہے کہ قتل اور سولی دی گئی۔ عیسیٰ علیہ السلام ایک جوہر ہے جو دو جوہروں سے پیدا ہوا ہے اور یہ سب اقوال متضاد اور بے معنی ہیں: مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ بِهٖ: کی ضمیر عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی طرف راجع ہے اور الا استثناء منقطع ہے اسلئے کہ ظن الگ ہے اور علم الگ ہے تو معنی یہ ہوگا کہ لٰكِنْ يَتَّبِعُوْنَ اتِّبَاعَ الظَّنِّ: (سوال) پہلے فرمایا کہ وہ شک میں ہیں اور یہاں پر فرمایا کہ وہ ظن (گمان) کے پیروکار ہیں جبکہ شک اور ظن میں فرق ہے؟ جواب: عرب کی اصطلاح میں جب کسی چیز میں یقین نہ ہو تو اس میں کبھی شک سے تو کبھی ظن سے تعبیر کرتے ہیں۔ (تفسیر ابوحیان) وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا: جمہور مفسرین کا قول یہ ہے کہ (ہ) ضمیر عیسیٰ السلام کی طرف راجع ہے اور یقیناً حال کی جگہ واقع ہوا ہے یعنی مُتَيَقِّنِيْنَ اَنَّهٗ عِيْسٰى: اس حال میں کہ ان کو یقین ہو کہ یہ عیسیٰ علیہ السلام ہے یا مقدر موصوف کیلئے مفعول مطلق ہے یعنی قَتْلًا يَقِيْنًا: اور حسن کا قول ہے کہ یقیناً حقاً کے معنی میں ہے اور فراء، بغوی اور ابن قتیبہ کا قول ہے کہ (ہ) ضمیر علم کی طرف راجع ہے اور قتل احاطے اور گھیر لینے سے کنایہ ہے۔

بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝

”بلکہ اسے اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھایا ہے اور اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے“ [158]۔

تفسیر 158 بل اس میں مَا قَتَلُوْهُ سے اضراب ہے یعنی انہوں نے اس کو قتل نہیں کیا ہے اور صلیب پر بھی نہیں چڑھایا ہے تو کیا طبعی موت سے فوت ہوئے ہیں تو فرمایا نہیں بلکہ ان کو تو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اُٹھایا ہے اور رفع کی تفصیل سورۃ آل عمران آیت 55 میں گزر گئی ہے وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا: میں اس میں دو سوالوں کے جوابات مذکور ہیں:

سوال 1: زمین و آسمان کے درمیان خلا ہے آکسیجن نہیں ہے اور اوپر چڑھنے کے اور اسباب بھی نہیں ہیں تو کس طرح وہ

آسمانوں پر چڑھ گئے؟۔ جواب 1: لفظ عَزِيْزًا میں سب باتوں کا جواب ہوگیا۔ سوال 2: آخری نبی کو اس طریقہ سے نہیں اُٹھایا گیا بلکہ وہ فوت ہوئے؟: (جواب) لفظ حَكِيْمًا ہوا یعنی اس کی کامل قدرت اور حکمت کے سامنے کوئی کام مشکل نہیں ہے اور اس کے ہر کام میں حکمت ہے۔

وَإِنْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴿۱۵۹﴾ "اور نہیں ہے کوئی اہل کتاب میں سے مگر وہ ضرور اس پر موت سے قبل ایمان لائے گا اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہونگے" [159]۔

تفسیر 159 اس آیت میں عیسیٰ علیہ السلام کی موت کی نفی ہو رہی ہے۔ وَإِنْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ: اس میں دو مشہور قول ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ جو ابن عباس رضی اللہ عنہما، حسن، ابو مالک وغیرہ کا ہے کہ بِهٖ اور مَوْتِهٖ میں ضمیریں عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہیں یعنی جب قرب قیامت میں عیسیٰ علیہ السلام زمین پر نزول فرمائیں گے تو اس وقت کے موجود یہودی اور نصرانی عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئیں گے۔ دوسرا قول جو عکرمہ، مجاہد اور ضحاک وغیرہ سے منقول ہے کہ بِهٖ کی ضمیر عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اور مَوْتِهٖ کی ضمیر اہل کتاب کی طرف راجع ہے تو معنیٰ یہ ہے کہ ہر یہودی یا نصرانی جب فوت ہوتا ہے تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا نا حق اور لازم ہے لہٰذا وہ ایمان لے آتا ہے مگر ان کا یہ ایمان فرعون کے ایمان کی طرح بے فائدہ ہے لیکن اس میں پہلا قول بہتر ہے جس کی تائید میں صحیح بخاری و صحیح مسلم کی حدیث ہے جو امام بخاری نے کتاب البیوع باب قتل الخنزیر اور کتاب الانبیاء باب نزول عیسیٰ علیہ السلام اور صحیح مسلم میں کتاب الایمان باب نزول عیسیٰ علیہ السلام میں نقل کی ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ قریب ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام تمہارے درمیان تشریف لائے فیصلہ کرنے والا عدل کرنے والا صلیب توڑے گا خنزیر کو قتل کریگا جزیہ ٹیکس کو ختم کریگا مال کی فراوانی ہوگی یہاں تک کہ کوئی مال قبول کرنے والا نہیں ہوگا دجال کو قتل کریگا اور زمین پر چالیس سال تک زندہ رہے گا پھر فوت ہوگا اور مسلمان اس پر جنازہ ادا کرینگے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس آیت کو تین بار دہرایا اور پہلے قول کے راجح ہونے کی دوسری دلیل بعد والا جملہ ہے۔ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا يَكُوْنُ: کی ضمیر عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہے اور اس کی شہادت کی تفصیل سورۃ مائدہ آیت 117 میں ذکر ہے اس آیت میں تیسرا قول عکرمہ رحمہ اللہ سے نقل ہے کہ بِهٖ میں ضمیر محمد ﷺ کی طرف راجع ہے۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿۱۶۰﴾

"لہٰذا یہودیوں پر ظلم کی وجہ سے پاک مزیدار چیزیں ان پر ہم نے حرام کر دیں جو ان کیلئے حلال کی گئی تھیں اور ان کے اللہ تعالیٰ کے راستے سے بہت سارے لوگوں کو روکنے کے سبب" [160]۔

تفسیر 160 اس آیت میں یہودیوں کی قبیح صفات کا ذکر ہے جو نزول قرآن حکیم کے وقت ان میں پیدا ہوئی تھیں اور یہ بھی طیبات کی حرمت کیلئے اسباب ہیں اس وجہ سے (با) سببیہ کو پھر ذکر کرتے ہوئے واپس لایا گیا۔ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا: یہ فَبِمَا نَقْضِهِمْ: سے بدل ہے۔ مستقل کلام ہے اور اس کا متعلق بعد والے جملے میں ہے حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ یعنی طیبات جو کہ سورۃ انعام آیت 146 میں ذکر ہے اور سورۃ نحل آیت 118 میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے نیز ذلت مسکنت اور غضب میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ان پر رحمت الٰہی اور عزت کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا: سَبِيْلِ اللّٰهِ سے مراد توحید کا راستہ اور رسولوں کی اتباع ہے انہوں نے ہر رسول کے دور میں اس طرح کیا تو آخری رسول کے دور میں انہوں نے رسول اور قرآن مجید سے لوگوں کو منع کیا جس کی طرف اشارہ ہے۔

وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿161﴾

"اور بسبب ان کے سود کھانے کے اور یقیناً وہ اس سے روک دیئے گئے اور ان کا لوگوں کے مال ناجائز طریقے سے کھانا اور ہم نے ان میں سے کافروں کیلئے دردناک عذاب تیار کیا ہے" [161]۔

تفسیر 161 اس آیت میں ان کی مزید قباحتوں کا ذکر ہے اور حرمت کے اسباب کا ذکر ہے۔ وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا: ان پر سود کھانا حرام تھا جیسے ہمارے دین میں حرام ہے۔ وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ: اس میں ان کی زیادہ قباحت کی طرف اشارہ ہے کہ تورات و انجیل میں سود کی حرمت موجود تھی اور انہوں نے اس کی مخالفت کی۔ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ سورۃ توبہ آیت 24 میں ذکر ہے اور باطل سے وہ تمام طریقے کمائی کے مراد ہیں جو خلاف شریعت ہوں اور بلا دلیل ہوں۔ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا: ان میں کفر کے اسباب بہت ہیں۔ سوال: ان پر حرمت تو پہلے سے تورات میں ہوئی تھی لیکن بعض اسباب ان میں بعد میں پیدا ہوئے؟ جواب: امام آلوسی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ بعد والے اسباب بقاء اور دوام حرمت کیلئے ذکر ہوئے ہیں۔

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ
الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿162﴾ ع

"لیکن ان میں سے جو علم میں پکے ہیں اور مؤمن (وہ) جو ایمان لاتے ہیں اس پر جو آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے اور جو نازل کیا گیا ہے آپ سے پہلے اور نماز قائم کرنے والے ہیں اور زکوۃ ادا کرنے والے ہیں ایمان رکھنے والے ہیں اللہ تعالی اور قیامت کے دن پر یہ لوگ ہیں جن کو ہم بہت بڑا اجر دینگے" [162]۔

تفسیر 162 اس آیت میں اہل کتاب کے علماء ہوں یا عوام اچھی صفات کی وجہ سے ان کیلئے بشارت ہے۔ لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ: یہ حق پرست علماء کی صفت ہے جیسا کہ سورۃ آلعمران میں گزرا ہے۔ مِنْهُمْ میں اشارہ ہے کہ یہودیوں میں دو قسم کے علماء تھے زائغین اور راسخین۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ: بقول قتادہ اس میں مِنْهُمْ مقدر ہے یعنی علماء راسخین کے علاوہ عام بنی اسرائیل کے مؤمنین مراد ہیں اور یہ صفتیں راسخین میں بھی مراد ہیں۔ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ: امام سیبویہ اور عام بصریوں نے اس کو منصوب بالمدح کہا ہے اور ابن عطیہ اور کسائی نے اس کے برخلاف کہا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ یہ: وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ: پر عطف ہے اور مُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ: سے مراد انبیاء کرام علیہم السلام ہیں اور اِقَامَةُ الصَّلٰوةِ: سے نمازوں کی ادائیگی اور ان کا اظہار کرنا اور لوگوں میں جاری کرنا مراد ہے۔ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ یہ يُؤْمِنُوْنَ پر عطف ہے اور یہ عمل کا ایمان پر عطف ہے۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ: صاحب اللباب نے کہا ہے کہ علماء تین قسم کے ہیں: (1) فقط اللہ تعالی کے احکامات پر عالم (2) فقط اللہ تعالی کی ذات اور اس کی صفات پر عالم (3) اللہ تعالی کے احکام اور صفات اور ذات الہی کا علم رکھنے والے لہذا جب ان کو رَاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ: فرمایا کہ یہ احکام الہی ذات الہی اور صفات الہی پر عالم ہیں تو پھر فرمایا کہ یہ تو احکام ربانی جانتے ہیں۔ یعنی يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ ساتھ ساتھ اِقَامَةُ الصَّلٰوةِ اور اِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ پر عمل پیرا بھی ہیں پھر فرمایا کہ اللہ تعالی کے متعلق علم رکھتے ہیں اور ساتھ ساتھ معاد یعنی آخرت پر ایمان رکھتے ہیں جیسا کہ فرمایا وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ: تو تینوں قسم کے علم والوں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ اِيْمَانَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ: کو بیان کرنے میں بعد میں لایا گیا ہے اسلئے کہ پہلی صفتوں کا اعتبار اِيْمَانَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ: پر موقوف ہے تو یہ سابقہ صفتوں کیلئے شرط ہے اور کبھی شرط کو مشروط کے بعد ذکر کیا جاتا ہے۔ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا: چونکہ اس آیت میں کامل ایمان والوں کا ذکر ہوا ہے تو انکے اجر کیلئے حرف (س) جو قریب کے معنی پر دلالت کرتا ہے ذکر کیا ہے اور آیت 152 میں عام ایمان والوں کا ذکر تھا تو وہاں (سَوْفَ) ذکر کیا ہے جس میں دوری یا تاخیر کی طرف اشارہ ہے۔

فائدہ: وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ کے اعراب پر بعض لوگ (شیعہ) اعتراض کرتے ہیں کہ یہ قانون عربیت پر عثمان رضی اللہ عنہ نے لحن کیا ہے اس قسم کی دس آیتوں پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے۔ اس کا تفصیلی جواب تفسیر اللباب کے حاشیہ اور تفسیر روح المعانی میں ملاحظہ کیجئے۔

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿١٦٣﴾

"یقیناً ہم نے آپ کی طرف وحی کی جیسے وحی ہم نے نوح علیہ السلام کی طرف کی اور ان کے بعد دیگر نبیوں کی طرف اور ہم نے وحی کی تھی ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد کی طرف اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان علیہم السلام کی طرف اور دی ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور" [163]۔

تفسیر 163 اس آیت میں اس سوال کا تحقیقی جواب ہے جو آیت 153 میں گزر رہا ہے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک بار کتاب لیکر آنا نبوت کیلئے کوئی شرط نہیں ہے پھر مندرجہ بالا 12 نبیوں کا ذکر ہوا کہ ان کو ایک بار کتابیں نہیں دی گئیں حالانکہ وہ مشہور انبیاء کرام ہیں۔ اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ: وحی کا سلسلہ تو آدم علیہ السلام سے شروع ہوا مگر یہاں پر وحی سے ایسی وحی مراد ہے جو رد شرک کیلئے نازل ہوئی ہو لہٰذا مشرکین کا رد کرنے کیلئے جو وحی نازل ہوئی اس کا آغاز نوح علیہ السلام سے ہوا ہے: وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ: ان میں سے بعض کا ذکر سورۃ اعراف اور سورۃ ھود میں ہوا ہے یعنی ھود، صالح، لوط، شعیب اور یوسف علیہم السلام: وَأَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْمَاعِيْلَ وَاِسْحَاقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْأَسْبَاطِ: یہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب سب کے نزدیک انبیاء تھے: وَالْأَسْبَاطِ اس سے بنی اسرائیل کے دیگر انبیاء مراد ہیں یعنی زکریا، یحییٰ، ادریس اور الیاس علیہم السلام مراد ہیں۔ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهَارُوْنَ وَسُلَيْمَانَ: یہ وہ انبیاء ہیں جن پر یہودیوں نے مختلف الزامات لگائے تھے حالانکہ وہ سچے انبیاء تھے۔ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا: امام قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ اس میں 150 ایک سو پچاس سورتیں تھیں البتہ اس میں حلال وحرام اور دیگر احکام نہیں تھے صرف وعظ نصیحت اور فضائل ذکر تھے۔ اس کا ذکر اس لئے کیا کہ داؤد علیہ السلام کے فضائل بادشاہت کی وجہ سے نہیں ہیں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور نبوت کی وجہ سے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوئے تھے۔ سوال: یہاں پر موسیٰ علیہ السلام کا ذکر نہیں ہوا؟ جواب: انہی کی کتاب سے تو انہوں نے دلیل پکڑی تھی کہ وہ ایک ہی بار نازل ہوئی ہے اسلئے ان کی ضرورت باقی نہ رہی نیز ان کا ذکر بعد

والی آیت میں موجود ہے۔

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۭ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿١٦٤﴾

"اور ہم نے (بہت سارے) رسولوں کو وحی کی ہے جو یقیناً اس سے پہلے ہم نے آپ پر بیان کی ہے اور بہت رسول جن کو ہم نے آپ پر بیان نہیں کیا اور موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا ہے کلام کرنا" [164]۔

تفسیر 164 اس آیت میں دیگر انبیاء کا اجمالی ذکر ہے جو دو قسموں پر مشتمل ہے: پہلی قسم وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ: جیسا کہ سورۃ اعراف، سورۃ ہود، سورۃ شعراء، سورۃ انبیاء، سورۃ انعام اور سورۃ مریم وغیرہ میں مذکور ہے۔ وَرُسُلًا اس سے قبل فعل مقدر ہے یعنی اَرْسَلْنَا رُسُلًا: اور دوسری قسم وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ: ان کے حالات نام بلکہ ان کی تعداد بھی صحیح حدیث میں ثابت نہیں ہے نیز جس روایت میں ایک لاکھ چوبیس ہزار کا ذکر ہے وہ روایت ضعیف ہے اس روایت کو استاد محترم رحمہ اللہ نے ضعیف کہا ہے جبکہ مسند احمد حدیث 22189 کی تخریج میں حمزہ احمد الدین نے حسن قرار دیا ہے مزید تفصیل کے لئے السلسلۃ الصحیحۃ حدیث 2668 ملاحظہ ہو (مترجم)۔ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا: نحاس اور دیگر نحویوں کا اجماع ہے کہ جب فعل کے ساتھ مصدر مفعول مطلق ذکر ہو جائے تو وہ تاکید پر دلالت کرتا ہے یعنی یہاں پر حقیقی بغیر واسطے کلام مراد ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ ان لوگوں کے قول کے باطل ہونے کی دلیل ہے جنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے درخت میں اپنا کلام پیدا کیا اور درخت سے موسیٰ علیہ السلام نے سنا بلکہ اللہ تعالیٰ نے بغیر واسطے اُن کے ساتھ کلام کیا ہے اور اس جملہ کو ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے کلام کرنے پر دیگر انبیاء کی شان میں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے تو اسی طرح تورات ایک بارگی نازل کرنے میں کسی نبی یا کتاب کی شان میں کچھ کوتاہی واقع نہیں ہو سکتی۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿١٦٥﴾

"رسولوں کو (ہم نے بھیجا) خوشخبریاں دینے والے اور ڈرانے والے۔ تاکہ نہ ہو لوگوں کیلئے اللہ تعالیٰ پر کوئی (بہانہ) حجت رسول بھیجنے کے بعد اور اللہ تعالیٰ غالب اور بہت حکمت والا ہے" [165]۔

تفسیر 165 رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ: اس آیت میں رسولوں کی عظمت شان اور ان کے بھیجنے کی حکمت و مقصد ذکر ہے یعنی رسولوں کا کام حکم پہنچانا یعنی ڈرانا اور خوشخبری دینا ہے البتہ ان پر ایک بار کتاب نازل کرنا لازم نہیں ہے اور رُسُلًا

لفظ سابقہ رُسُلاً سے بدل ہے یا حال ہے یا پھر اَرْسَلْنَا فعل مقدر ہے: لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ: اس جملہ میں رسولوں کے بھیجے جانے کی حکمت اور مقصد ذکر ہے۔ سوال: اس سے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر اللہ رسولوں کو نہ بھیجتا تو لوگوں کے لئے اللہ تعالی پر حجت اور دلیل قائم ہوجاتی تو اس سے تو معلوم ہوا کہ رسولوں کو بھیج دینا اللہ تعالی پر واجب ہے اور یہ تو معتزلہ کا مذہب ہے؟۔ جواب: حجت سے مراد معذرۃ (بہانہ) کرنا ہے یعنی اگر اللہ تعالی رسولوں کو نہ بھیجتا تو لوگ اللہ تعالی پر اپنا بہانہ اور عذر پیش کرتے جیسا کہ سورۃ طٰہٰ آیت 134 اور سورۃ قصص آیت 47 میں ہے اور اللہ تعالی عذر کو بہت پسند کرتا ہے اسلئے وہ کسی کا عذر اپنی ذات پر نہیں چھوڑتا ہے۔ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيزًا حَكِيمًا: وہ عزیز ہے اس پر کوئی حجت دلیل قائم نہیں کرسکتا ہے۔ حکیم ہے رسولوں کے (ارسال) بھیجنے میں اس کی بہت حکمتیں ہیں۔

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿١٦٦﴾

"البتہ اللہ تعالی گواہی دیتا ہے اس کتاب پر جو اس نے آپ کی طرف نازل کی ہے اس کو اپنے علم سے نازل کیا ہے اور ملائک بھی گواہی دیتے ہیں اور اللہ تعالی ہی گواہی کیلئے کافی ہے" [166]۔

تفسیر 166 اس آیت میں قرآن مجید پر اہل کتاب کے اعتراض اور اس کے جواب دینے کے بعد اب اللہ تعالی اور ملائک کی شہادت قرآن مجید کی سچائی پر ذکر ہورہی ہے: لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ: استدراک سے قبل مستدرک کا ذکر لازمی ہوتا ہے یہاں پر چونکہ اہل کتاب کی تکذیب کا ذکر ہوا جو انہوں نے قرآن پر اعتراض کیا تھا تو گویا یہاں یوں کہا گیا کہ اہل کتاب تو قرآن کی سچائی پر شہادت نہیں دیتے ہیں لہٰذا اللہ تعالی ہی گواہی دیتا ہے اس کتاب کی سچائی پر جس کو اس نے آپ کی طرف نازل کیا ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ یہودیوں کے جواب میں ہے انہوں نے اس وقت کہا تھا کہ ہم آپ کی نبوت کو نہیں مانتے جب اللہ تعالی کا یہ حکم نازل ہوا اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ: تو جواب میں اللہ تعالی نے: لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ: فرمایا اور قرآن کی سچائی سے نبی کی سچائی لازما ہوگئی۔ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ: اس میں چار توجیہات ہیں پہلی توجیہ یہ ہے کہ نازل ہوا ہے قرآن اللہ تعالی کے علم سے یعنی اس کی ترتیب حسین اور طرز معجزانہ ہے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ نازل کیا ہے اللہ تعالی نے قرآن پاک آپ کی طرف اس وجہ سے کہ آپ اس کی طرف دعوت دے سکتے ہیں اسلئے کہ آپ اللہ تعالی کے علم میں اس کے اہل ہیں۔ تیسری توجیہ یہ ہے کہ نازل کیا ہے اللہ تعالی کے علم کے سبب سے جو تمام انسانوں کی مصلحتوں پر مشتمل ہے۔ چوتھی توجیہ یہ ہے کہ آپ کی طرف نازل کیا ہے اور عالم ہے اس کی حفاظت کرنے پر شیطانوں

ہے۔(تفسیر روح المعانی) وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ يَشْهَدُوْنَ: ملائکہ کی شہادت کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالی کی شہادت کی تائید میں ہی شہادت دینگے یا مطلب یہ ہے کہ جبرائیل لیکر آیا ہے اور تمام ملائکہ اس کے تابع ہیں یا مطلب یہ ہے کہ ملائکہ نے اس نبی کی مدد کی جنگ بدر اور احزاب وغیرہ میں لہٰذا یہ قرآن اور نبی کی سچائی کی تائید ہے: وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا: یعنی ملائکہ کی شہادت تو اللہ تعالی کی شہادت کے تابع ہے البتہ اگر ملائکہ شہادت نہ بھی دیتے تو اللہ تعالی کی شہادت کافی تھی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿١٦٧﴾

"یقیناً وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور روک رکھا اللہ تعالی کے راستہ سے وہ گمراہ ہوئے دور کی گمراہی میں" [167]۔

تفسیر 167 قرآن کریم و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی (صدق) بیان کرنے کے بعد اب منکرین کو وعید دی جاتی ہے خصوصاً ان اہل کتاب کے لیے وعید ہے جو قرآن پر بے جا اعتراضات کرتے ہیں۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: اشارہ ہے کہ قرآن اور رسول پر اعتراض کے طریقے پر کفر کیا ہے: وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: یعنی اس رسول کی صفات جو اُن کی کتابوں میں تھیں اس کو تبدیل کرتے یا چھپاتے تھے تا کہ اس رسول و قرآن پر کوئی ایمان نہ لائے: قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا: یعنی خود گمراہ ہیں اور اوروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ﴿١٦٨﴾ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿١٦٩﴾ "یقیناً وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور ظلم کیا نہیں اللہ تعالی کہ ان کو معاف کرے اور نہ ہی ان کو راہ دکھائے گا [168]۔ مگر جہنم کی راہ جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ کام اللہ تعالی پر آسان ہے" [169]

تفسیر 168 ۔ 169 اس آیت میں ان کو ڈانٹنے کے بعد اب ان کو خوف دلانا ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا: اس سے مراد انکار قرآن و رسول ہے مگر اس طریقے سے کہ لوگوں کو اس پر ایمان لانے سے روک لیتے ہیں اور حق کے ساتھ ضد و عناد کرتا ہے اور ظلم میں اشارہ ہے کہ وہ آپ بھی نہیں کرتے: لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا طریق سے وہ اعمال صالحہ اور ایمان مراد ہے جو جنت کے حصول کا سبب بنیں۔ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ: یہ استثناء مفرغ ہے اور نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى اور فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى کی طرح ہے: وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا: یعنی ان کی اللہ تعالی کوئی پروا نہیں کرتا اور اللہ تعالی کیلئے کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ "اے لوگو یقینا تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق بیان کرنے کیلئے رسول آ گیا ہے تو تم ایمان لاؤ تمہارے لئے بہتر ہوگا اور اگر تم کفر کرو گے تو جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے (وہ) اللہ ہی کا ہے اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے اور بڑی حکمت والا ہے" [170]۔

تفسیر 170 یہاں سے اس حصے کا تیسرا باب ہے اس باب میں پہلے عام خطاب ہے آخری رسول پر ایمان لانے کی ترغیب کیلئے تاکہ مذکورہ قبیح صفات سے نجات حاصل ہو سکے پھر خاص یہود و نصاریٰ سے خطاب ہے جس میں ان کے (غُلُوْ) حد سے تجاوز کرنے کا رد کیا گیا ہے جو انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کیا اور توحید کے چار کلمات سے نصاریٰ کا رد ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کی (عبودیت) بندہ ہونے کا اثبات ہے۔ آیت 172 میں بندوں کو ڈرایا گیا ہے اور 173 میں خوشخبری دی گئی ہے پھر عام خطاب ہے قرآن پر ایمان لانے اور اس کی پیروی کرنے کیلئے اور آیت 174 اور 175 میں (خوشخبری) بشارت دی ہے اور آخر میں ایک مثال قرآن کے انوار میں سے دی ہے جو بہن بھائیوں کیلئے میراث تقسیم کرنے کی ہے تاکہ دورِ جاہلیت کے ظلم کا خاتمہ ہو سکے۔ ربط 1: یہودیوں کے شبہات کا جواب ذکر کرنے کے بعد اب عام لوگوں کو آخری نبی پر ایمان لانے کی دعوت دی جاتی ہے۔ ربط 2: سابقہ آیتوں میں یہ بات ثابت ہوئی کہ وہ لوگوں کو دین سے منع کرتے ہیں اور رسول کی اتباع سے منع کرتے ہیں اور ظلم کا ارتکاب کرتے ہیں اب اللہ تعالیٰ عام خطاب فرماتا ہے ان کے خلاف کہ لوگو آؤ اور ان کی بات مت مانو بلکہ آؤ رسول پر ایمان لاؤ: يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ: الرَّسُوْلُ: سے مراد محمد ﷺ ہیں اور اس خطاب میں عام لوگوں کے ساتھ ساتھ یہود و نصاریٰ بھی شامل ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صفت رسالت کے ساتھ ذکر کیا جس میں ان کی اتباع کی تاکید کی طرف اشارہ ہے۔ بِالْحَقِّ (با) برائے ملابست ہے اور حق سے مراد قرآن، دین اسلام اور کلمہ توحید ہے یا با سببیہ ہے یعنی بسبب حق قائم کرنے کے: مِنْ رَّبِّكُمْ میں اشارہ ہے کہ اس رسول کے بھیجنے سے اللہ تعالیٰ تمہاری دینی اور روحانی تربیت کرتا ہے: فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ. خَيْرًا کے (زبر) نصب میں مختلف اقوال ہیں: (1) امام خلیل اور سیبویہ کا قول ہے کہ فعل مقدر ہے یعنی اِفْعَلُوْا خَيْرًا: نیکی کا کام کرو (2) امام فراء رحمہ اللہ بغوی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اس کا موصوف مقدر ہے اور یہ مفعول مطلق ہے یعنی اِيْمَانًا خَيْرًا یعنی بہتر ایمان جو مثل صحابہ کرام کے ایمان کے ہو (3) ابو عبید اور کسائی کا قول ہے کہ لٰكِنِ الْاِيْمَانُ خَيْرًا لَّكُمْ: ایمان

تمہارے لئے بہتر ہوگا: وَإِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ: اِنْ شرطیہ کی جزا مقدر ہے یعنی فَهُوَ قَادِرٌ عَلَىٰ تَعْذِيبِكُمْ: اللہ تعالیٰ تمہارے عذاب پر قادر ہے: فَهُوَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ: اللہ تعالیٰ تم سے بے پرواہ ہے۔ فَإِنَّ میں (ف) علت مقدر جزا کیلئے علت ہے لِلّٰهِ اللہ تعالیٰ کیلئے معنیٰ یہ ہے کہ اختیار بادشاہت، خلقت عبدیت اسی کیلئے ہے: وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيمًا حَكِيمًا: ہر چیز پر عالم ہے جس میں ان کا کفر بھی داخل ہے اور حکیم ہے ہر چیز میں اس کی حکمت ہے تو ان کو مہلت دینے اور عذاب نہ دینے میں بھی اس کی حکمت ہے۔

يَا أَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللّٰهِ إِلَّا الْحَقَّ ۚ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهُ ۚ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِنْهُ ۖ فَآمِنُوا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ ۖ وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ ۚ انْتَهُوا خَيْرًا لَكُمْ ۚ إِنَّمَا اللّٰهُ إِلٰهٌ وَاحِدٌ ۖ سُبْحَانَهُ أَنْ يَكُونَ لَهُ وَلَدٌ ۘ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَكَفَىٰ بِاللّٰهِ وَكِيلًا ﴿١٧١﴾ ع

"اے اہل کتاب! تم اپنے دین میں (غلو) زیادتی مت کرو اور تم اللہ پر مت کہو مگر حق کی بات پس مسیح عیسیٰ ابن مریم تو اللہ کا رسول اور اس کا کلمہ ہی ہے جو اس نے مریم کی طرف ڈالا اور اس کی طرف سے روح ہے لہٰذا تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور تم مت کہو کہ اللہ تین ہیں اس سے باز آجاؤ تمہارے لئے بہتر ہوگا پس اللہ ہی اکیلا معبود ہے وہ پاک ہے یہ کہ اس کیلئے اولاد ہو اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور کافی ہے اللہ تعالیٰ کارساز" [171]۔

تفسیر 171 عام خطاب کے بعد اس میں تخصیص ہے عام خطاب میں آخری رسول پر ایمان لانے کا حکم تھا جبکہ اس میں عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان میں (غلو) کرنے سے منع ہے کیونکہ حد سے تجاوز یعنی غلو اور اتباع رسول دونوں ساتھ نہیں چل سکتے: يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ: صاحب اللباب اور آلوسی نے حسن بصری رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ خطاب یہود و نصاریٰ دونوں سے ہے کیونکہ دونوں نے غلو عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کیا ہے غلو دو معنوں میں ہے (1) حدود شرعی سے تجاوز خواہ زیادتی سے ہو یا کمی کرنے سے جس کو افراط و تفریط کہا جاتا ہے۔ (2) دوسرا معنی حدود شرعی سے تجاوز کرنا مراد ہے جسکو افراط کہتے ہیں یہاں پر غلو کا پہلا معنی مراد ہے یعنی نصاریٰ نے افراط اور یہود نے تفریط کیا تھا لہٰذا دونوں کا رد ہے۔ نصاریٰ کا یہ عقیدہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام الٰہ ہے یا ابن اللہ ہے یعنی (نعوذ باللہ) اللہ کا بیٹا ہے یا اس میں اللہ نے حلول کیا ہے اور یہودیوں نے کہا کہ وہ ساحر کاہن (نعوذ باللہ) وَلَدُ الزِّنَىٰ ہے۔ اس طرح سورۃ مائدہ آیت 77 میں بھی آیا ہے مگر وہاں غلو کا دوسرا معنی مراد ہے جو کہ صرف نصاریٰ کا رد ہے: وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللّٰهِ إِلَّا الْحَقَّ: چونکہ غلو میں

اللہ تعالیٰ پر لازماً جھوٹ کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے تو متصلاً اس سے منع فرمایا کیونکہ یہ مستقل کفر ہے۔ لَا تَقُوْلُوْا بقول سے دل کا عقیدہ اور زبان سے کلام دونوں مراد ہیں۔ اِلَّا الْحَقَّ یہ استثناء منقطع ہے اس سے مراد اللہ کو ہر قسم کے شرک سے پاک اولاد سے اور حلول سے اور اتحاد سے پاک ماننا ہے اور یہ خطاب عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق نصاریٰ کے ساتھ خاص ہے باقی رہے یہودی تو انہوں نے بہت سارے دینی احکام میں اللہ تعالیٰ پر (افتراء) جھوٹ باندھا ہے: اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ: یہ صحیح اور حق عقیدے کا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اظہار ہے۔ لفظ رَسُوْلُ اللّٰهِ میں یہودیوں کا رد ہے وہ عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت نہیں مانتے نیز نصاریٰ کا رد ہے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ابن اللہ اور الوہیت کا عقیدہ رکھتے ہیں: وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَا اِلٰى مَرْيَمَ: کلمہ سے مراد یہ ہے کہ لفظ کُنْ کلمہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا کیا ہے یعنی ماں باپ کے نطفہ کے بغیر اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے یہ حسن اور قتادہ رحمہما اللہ کا قول ہے یا کلمہ سے مراد وہ بشارت ہے جو جبرائیل کے ذریعے سے مریم کو دی گئی تھی اور القاء سے مراد اس کلمہ کا مریم تک پہنچانا جبرائیل کے واسطے سے مراد ہے جیسا کہ سورۃ مریم آیت 17 میں ہے۔ وَرُوْحٌ مِّنْهُ سے مراد روح انسانی ہے لفظ ذُوْ مقدر ہے یعنی ذُوْ رُوْحٍ: اپنی زندگی میں روح کے محتاج ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ روح سے جبرائیل کا پھونکنا مراد ہے جو انہوں نے مریم کی قمیص کے گریبان میں پھونکا تھا سورۃ تحریم آیت 12 سورۃ انبیاء آیت 91 میں اس کا ذکر ہے۔ مِنْهُ مقدر لفظ کے ساتھ متعلق ہے اور مِن ابتداء کیلئے ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے روح صادر ہوئی ہے اور مِن برائے تبعیض یعنی بعض کیلئے نہیں ہے جو نصاریٰ کا عقیدہ اور استدلال ہے۔ ابوحیان اور آلوسی رحمہما اللہ وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ ہارون رشید کی مجلس میں ایک ڈاکٹر نے علی بن حسین الواقدی المروزی سے مناظرہ کیا اور گفتگو میں کہا تھا کہ تمہارے قرآن میں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا جز ہے تو معلوم ہوا کہ ولد ہے اور انہوں نے یہ لفظ تلاوت کیا کہ وَرُوْحٌ مِّنْهُ: اس عالم نے سورۃ جاثیہ آیت 13 کی تلاوت کرتے ہوئے فرمایا: وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ: کہ تمہارے استدلال کے مطابق تو جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اس سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا جز ہے اس پر نصرانی خاموش ہوا اور ہارون رشید نے اس عالم کو بہت بڑے انعام سے نوازا: فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ: یعنی اللہ تعالیٰ کی الوہیت پر اور رسولوں کی رسالت پر یقین کرو اور خلط ملط کرنے سے اجتناب کرو: وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ: شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ قبرصیہ میں لکھا ہے کہ نصاریٰ کے تثلیث اور اتحاد کے عقیدے میں مختلف اقوال و افکار ہیں کہ عاقل انسان ان کا اقرار نہیں کرسکتا اور سارے کلمات

ان کے انجیل میں متشابہات میں سے ہیں حالانکہ اس کے رد میں انجیل کے اندر محکمات یعنی واضح کلمات موجود ہیں۔ قاسمی نے سید عبداللہ الہندی سے نقل کیا ہے کہ نصاریٰ میں ایک گروہ ہے جس کو (کولی دی دنس) کہا جاتا ہے انہوں نے کہا الٰہ تین ہیں باپ، بیٹا مریم (نَعُوْذُ بِاللہِ)۔ امام آلوسیؒ نے یہ قول ان معروف تین فرقوں سے نقل کیا ہے یعنی ملکانیہ، نسطوریہ، یعقوبیہ اور ان میں جو اختلاف ہے وہ بھی بیان کیا ہے پھر تفصیل کیساتھ اس کا رد لکھا ہے (روح المعانی) اور بحث کے شروع میں لکھا ہے کہ امام زجاج سے نقل ہے کہ الٰہ تین ہیں اَلْاٰلِهَةُ ثَلَاثَةٌ اللہ، عیسیٰ اور مریم ان کا یہ عقیدہ سورۃ مائدہ کے آخر سے بھی معلوم ہوتا ہے اور مشہور تفسیر ایک یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک جوہر ہے اور تین اقانیم پر تقسیم ہے یعنی (1) اب کا اقنوم (2) ابن کا اقنوم (3) اور روح القدس کا اقنوم۔ پہلا ذات ہے دوسرا علم تیسرا حیات ہے مگر یہ سب بے دلیل باتیں ہیں۔ اِنْتَهُوْا تثلیث کے قول سے باز آجاؤ۔ خَيْرًا لَّكُمْ مقدر عبارتیں اس بارے میں گزر گئی ہیں اور یہاں پر مشہور عبارت مقدر یہ ہے لِيَكُنْ خَيْرًا لَّكُمْ (تاکہ تمہارے لئے اس میں خیر ہو) اس کے بعد نصاریٰ کے رد کیلئے چار کلمات کا ذکر ہے۔ پہلا کلمہ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ: اس میں تین معبودوں کے عقیدے کا واضح رد ہے۔ دوسرا کلمہ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ: چونکہ انہوں نے تثلیث کے عقیدے میں عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا تھا تو اس جملہ میں ان کا رد کیا گیا۔ تیسرا کلمہ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ: اس میں تصرف والوہیت کا رد ہے کہ عیسیٰ و مریم متصرف نہیں ہیں اختیارات صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں۔ چوتھا کلمہ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا: یہ سابقہ جملوں کیلئے تاکید ہے یعنی اللہ تعالیٰ تدبیر اور حفاظت میں خود کافی ہے لہٰذا اس کو کسی کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کے ساتھ کوئی اور الٰہ یا (ابن) بیٹا مان لیا جائے کیونکہ دوسرا الٰہ مانا جائے تو وہ معطل ہوگا اور معطل ہونا تو نقصان ہے اور نقصان والا تو الٰہ نہیں ہوسکتا ہے۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ۝ "ہرگز مسیح عار محسوس نہیں کرینگے یہ کہ وہ اللہ کے بندے ہوں اور نہ ہی مقرب ملائکہ اور جو کوئی اللہ کی بندگی میں عار محسوس کر کے تکبر کرے تو یقیناً وہ اپنی طرف سب کو جمع کریگا" [172]۔

تفسیر 172 اس آیت میں بھی نصاریٰ کا رد ہے کیونکہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کی عبدیت کے منکر ہیں۔ آلوسی اور صاحب اللباب نے روایت نقل کی ہے کہ نجران کے نصاریٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کیا تھا کہ آپ عیسیٰ علیہ السلام پر عیب جوئی کرتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ کس طرح؟ انہوں نے کہا کہ آپ ان کو عبداللہ کہتے ہیں تو یہ آیت ان کے رد میں نازل

ہوئی: لَنْ یَّسْتَنْکِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّکُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ: اِسْتِنْکَاف: نَکَفَ سے لیا گیا ہے اور نَکَفَ کسی چیز سے دوری اور نفرت کو کہا جاتا ہے یعنی عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی بندگی تکبر یا نفرت کی وجہ سے نہیں چھوڑتے اور تکبر نہ کرنا بندگی کا اظہار ہے اور بندہ ہمیشہ اطاعت اور بندگی پر پابند ہوتا ہے: وَلَا الْمَلٰٓئِکَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ: یہ اَلْمَسِیْحُ پر عطف ہے یعنی مقرب ملائک بھی اللہ تعالیٰ کی بندگی اور عبادت سے نفرت نہیں کرتے اور عار محسوس نہیں کرتے ہیں سوال: تو اس قسم کے مقام میں تو ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی ہوتی ہے یعنی عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی بندگی سے نفرت نہیں کرتے اور ملائکہ بھی نہیں کرتے اس سے تو ملائکہ کی برتری اور افضلیت عیسیٰ علیہ السلام پر ثابت ہوتی ہے جبکہ یہ جمہور سلف کے عقیدہ کے خلاف ہے؟ جواب 1: آیت میں اصل مقصود نصاریٰ کا رد ہے کیونکہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے (خرق عادت) (برص کے مرض سے نجات مادرزاد اندھے کا علاج مردے زندہ کرنا) کاموں کو جو کہ معجزات تھے دلیل بنایا تھا کہ وہ اِلٰہ ہے تو ان کا جواب ہوا کہ اگر (خرق عادت) کاموں سے کوئی اِلٰہ تصور ہوتا ہے تو پھر ملائک تو اس سے زیادہ کرتے ہیں تو ان کو کیوں اِلٰہ نہیں بناتے ہو اور ملائکہ کی عیسیٰ علیہ السلام پر فضیلت جزیہ ہے۔ جواب 2: نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ پیدا ہونے کو دلیل بنایا کہ وہ معبود ہے تو جواب ہوا کہ ملائکہ تو بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے ہیں تو ان کو اِلٰہ کیوں نہیں مانتے ہو نیز یہ بھی جزوی فضیلت ہے۔ (امام آلوسی صاحب اللباب)۔ جواب 3: امام بغوی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اس آیت میں مشرکین بِالْمَلٰٓئِکَةِ: کا رد ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی سے انکار نہیں کرتے اور نہ ہی نفرت کرتے ہیں نیز ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ملائک عیسیٰ علیہ السلام سے افضل ہیں۔ فائدہ: اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ فضیلت کلیہ کے ساتھ انبیاء افضل ہیں یا ملائک تو اس بارے میں کوئی نص قطعی نہیں جو ایک جانب کے پاس ترجیح کے لئے ہو لہٰذا اس میں خاموش یعنی (توقف) اختیار کرنا بہتر ہے البتہ یقینی دلائل سے ساری کائنات کی مخلوق پر آخری نبی ﷺ کی فضیلت ثابت ہے (تفسیر آلوسی) وَمَنْ یَّسْتَنْکِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَیَسْتَکْبِرْ: یہ لفظ تمام مشرکین اور کافروں کیلئے عام ہے اور عبادت سے مراد توحید فی العبادت والطاعت ہے اِسْتِنْکَاف وَاِسْتِکْبَارْ: میں فرق یہ ہے کہ اِسْتِنْکَافْ سے مراد کسی کام کو نفرت کی وجہ سے چھوڑنا ہے یعنی کوئی اس کام سے نفرت کرتا ہے اس کو ناپسند اور برا جانتا ہے اور اِسْتِکْبَارْ کا معنی کسی چیز کو تکبر کی وجہ سے چھوڑنا ہے یعنی کوئی اس کام کو برا نہیں جانتا بلکہ اپنے لئے تکبر کی وجہ سے اچھا تصور نہیں کرتا ہے تو اِسْتِنْکَافْ میں اِسْتِکْبَارْ سے اضافہ ہے چونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت سے انکار کرنے والے دو قسم

کے تھے اسلئے دونوں قسموں کو ذکر کیا ہے۔ فَسَيَحْشُرُهُمْ إِلَيْهِ جَمِيعًا: (سوال) جمع ہونا تو یقینی ہے اِسْتِنْكَاف سے تو مشروط نہیں ہے تو حشر کی مذکورہ شرط (اِسْتِنْكَاف وَاِسْتِكْبَار) کی جزا ہونا درست نہیں؟۔ (جواب اول) حشر سے مراد جزا دینا ہے یعنی انکا حشر جزا و سزا دینے کیلئے ہوگا تو دوسری جانب مقدر ہے یعنی وہ لوگ بھی جمع ہونگے جو اِسْتِنْكَاف وَاِسْتِكْبَار نہیں کرتے ہیں۔ (جواب 2) اس کی جزا مقدر ہے یعنی فَيُجَازِيهِ أَوْ يُعَذِّبُهُ: ضرور سزا یا ثواب دیگا۔

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ وَيَزِيدُهُمْ مِنْ فَضْلِهِ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ اسْتَنْكَفُوا وَاسْتَكْبَرُوا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۙ وَلَا يَجِدُونَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿١٧٣﴾

"لیکن وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے وہ پورا دے گا ان کو اجر اور ان کو اپنے فضل سے زیادہ دے گا اور وہ لوگ جنہوں نے اس کی بندگی کو عار محسوس کیا اور تکبر کیا تو ان کو عذاب دے گا عذاب (سخت) دردناک اور نہیں پائیں گے اپنے لئے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ ہی مددگار" [173]۔

تفسیر 173 اس آیت میں دونوں فریقوں کیلئے جزا و سزا کی تفصیل کا ذکر ہے ایک گروہ کیلئے خوشخبری ہے اور دوسرے کیلئے وعید ہے لہذا ایمان اور عمل صالح بندگی کرنے اور تکبر سے اجتناب کی دلیل ہے وَيَزِيدُهُمْ مِنْ فَضْلِهِ یعنی ان کی بندگی و عبادت کا جو اجر و ثواب ہے اس سے بڑھ کر اپنے فضل سے ادا کریگا: فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا یہ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ: کے مقابل ہے: وَلَا يَجِدُونَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا: یہ وَيَزِيدُهُمْ مِنْ فَضْلِهِ کے مقابل ہے، ایمان والوں کا پہلے ذکر کیا تا کہ ان کے دیکھنے پر کافروں کو حسرت پیدا ہو جائے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُبِينًا ﴿١٧٤﴾ "اے لوگو! یقیناً تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس دلیل آ گئی ہے اور ہم نے نازل کیا تمہاری طرف واضح نور" [174]۔

تفسیر 174 چونکہ ساری سورۃ میں منافقین، مشرکین، یہود و نصاریٰ کا رد کیا گیا اور پھر وَأَمَّا الَّذِينَ اسْتَنْكَفُوا: میں آخری اور خصوصی رد سب کا کیا گیا تو اب سب کو دعوت دی جا رہی ہے کہ آخری نبی پر اور قرآن مجید پر ایمان لے آؤ لہذا اس لئے عام خطاب فرمایا: قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكُمْ: ابن عباس رضی اللہ عنہ اور سفیان ثوری رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ بُرْهَانٌ سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کیونکہ ان کی رسالت و بعثت مخالفین اور منکرین پر قطعی حجت ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ برہان سے مراد قرآن مجید ہو: مِنْ رَبِّكُمْ یہ جَاءَكُمْ: کے ساتھ متعلق ہے یا برہان کیلئے صفت ہے

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا: اس سے قرآن مجید مراد ہے جیسا کہ سورۃ اعراف آیت 157 اور سورۃ تغابن آیت 8 میں مذکور ہے قرآن مجید نور ہے اسلئے کہ یہ اثبات حق کیلئے واضح دلیل ہے اور مُبِينٌ تاکید ہے اسلئے کہ وہ کسی کے شکوک و شبہات کو باقی نہیں چھوڑتا ہے۔

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَيَهْدِيهِمْ إِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ﴿175﴾ "پس وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اس قرآن کو مضبوطی سے تھام لیا تو ان کو داخل کریگا اپنی طرف سے خاص رحمت اور فضل میں اور اللہ تعالیٰ ان کو اپنی طرف سیدھی راہ پر چلائے گا"[175]۔

تفسیر 175 اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے برہان اور نور سے فائدہ اٹھالیا۔ آمَنُوا بِاللَّهِ اس سے مراد ایمان شرعی تفصیلی ہے جس طریقہ پر برہان اور نور نے پیش کیا ہے وَاعْتَصَمُوا بِهِ: ضمیر یا اللہ تعالیٰ یا نور کی طرف راجع ہے اگر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو تو مراد اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کرنا ہے تاکہ شیطان کے شر سے اور گمراہ ہونے سے بچ جائے اور اگر دوسرا معنی مراد لیا جائے تو پھر اعتصام برائے دلیل و عمل حجت پکڑنا مراد ہے: فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِّنْهُ: ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ رحمت سے جنت یا بے حساب ثواب مراد ہے جو عمل پر اعتماد کرنے کے بغیر صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت سے حاصل ہوتا ہے۔ وَفَضْلٍ تنوین برائے تعظیم ہے یعنی ایسا اجر و ثواب جس کا اندازہ بھی انس و جن نہیں لگا سکتے ہیں: وَيَهْدِيهِمْ إِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا: ضمیر فَضْلٍ یا اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے اور صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا يَهْدِيهِمْ: کیلئے دوسرا مفعول ہے یا ضمیر إِلَيْهِ سے حال ہے یا دوسرا فعل مقدر ہے یعنی يُعَرِّفُهُمْ ان کو دکھاوے گا۔ سوال: ہدایت تو دنیا میں ہے تو فضل و رحمت پر ہدایت مقدم ہے کیونکہ ہدایت دنیا میں حاصل ہوتی ہے تو پھر کیوں ہدایت کو بعد میں ذکر کیا گیا؟۔ جواب 1: اس میں مقصد اعلیٰ کو مقدم کیا ہے جو کہ فضل و رحمت ہے جو کہ مسبب کو سبب پر تقدیم ہے لیکن اس میں مزید اظہار خوشی ہے۔ جواب 2: رحمت سے توفیق مراد ہے اور فضل سے قبولیت مراد ہے اور یہ ہدایت پر مقدم ہیں۔

يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۭ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَ
هُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۭ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ۭ وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّ
نِسَاۗءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ ع

" آپ سے فتویٰ پوچھتے ہیں آپ فرما دیجئے اللہ تمہیں کلالہ کے متعلق فتویٰ دیتا ہے اگر کوئی مرد مر جائے اور اس کی کوئی اولاد نہ ہو اور اس کی ایک بہن ہو تو اس (بہن) کیلئے آدھا مال ہے جو وہ (بھائی) چھوڑ گیا اور وہ وارث ہوگا اور اس (بہن) کا اگر نہ ہو اس کی کوئی اولاد پھر اگر وہ دو بہنیں ہوں تو ان کیلئے دو تہائی اس مال میں سے ہے جو وہ (بھائی) چھوڑ گیا اگر وارث ہوں کئی بہنیں بھائی مرد اور عورتیں تو مرد کیلئے مثل دو عورتوں کے حصے کے ہے وضاحت کرتا ہے تمہارے لئے اللہ تعالیٰ تا کہ تم گمراہ نہ ہو اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے"[176]۔

تفسیر 176 (ربط) جب یہ بات بیان ہوئی کہ قرآن نور ہے تو اس نور کے ذریعے سے جہالت کی ظلمت میں سے میراث میں عورتوں کی حق تلفی پر روشنی ڈالی جا رہی ہے یعنی بہنوں کی میراث میں رسم جاہلیت کے توڑ کیلئے قرآن کا نور بیان ہو رہا ہے۔ يَسْتَفْتُوْنَكَ اس کو آیت الصیف کہا جاتا ہے جو سفر حجۃ الوداع میں جابر رضی اللہ عنہ کے متعلق نازل ہوئی ہے کہ انکی بہنیں زیادہ تھیں البتہ حکم قرآن عام ہوتا ہے۔ یہاں پر لفظ کلالۃ مقدر ہے جو کہ جواب کے قرینے سے معلوم ہوتا ہے۔ اَلْكَلٰلَةِ اس کی تفسیر گزر گئی ہے: اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ: سوال: کلالہ کی صحیح تعریف میں تو والد کا نہ ہونا بھی شرط ہے؟
جواب 1: اس کو اکتفا کہا جاتا ہے یعنی ایک لفظ ذکر ہو اور ایک حذف (غائب) کیا جائے اسلئے کہ اس کا حکم ظاہر ہوتا ہے کیونکہ مرنے والے کی بہن باپ کی موجودگی میں میراث سے محروم ہوتی ہے اور اس پر اجماع ہے۔ جواب 2: جرجانی کا قول ہے کہ لفظ ولد والد کو بھی شامل ہے کیونکہ وہ بھی پیدا ہوا ہے اور ولد سے مراد اکثر صحابہ کرام اور تابعین عظام کے نزدیک بیٹا ہے کیونکہ مرنے والے کی بیٹی موجود ہو تو بہن عصبہ ہونے کی وجہ سے آدھے مال کی حقدار ہوتی ہے۔ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ اس سے (اعیانی) سگی بہن مراد ہے اور جب وہ نہ ہو تو سوتیلی (علاتی) بہن مراد ہے جو صرف والد میں شریک ہو اور اخیافی بہن کا ذکر گزر چکا ہے۔ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ: یہ فرضیت کے طور پر ہے اس میں بھی وہ شروط ہیں جو پہلے ذکر ہوئی ہیں یعنی قرض کی ادائیگی اور وصیت پر عمل کے بعد تقسیم ہوگی اور آدھا دوسرے عصبہ کا ہے اگر موجود ہو اور اگر نہ ہو تو اسی بہن کی طرف بقایا حصہ لوٹایا جائیگا جو بطور عصبہ ہوگی۔ وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ: یعنی اس بہن کے مرنے پر اگر صرف بھائی ہی وارث ہو

اور اس خاتون کی اولاد نرینہ یا زنانہ نہ ہو اور والد بھی نہ ہو کیونکہ کلالہ کی شرائط میں سے ہے کہ والد بھی نہ ہو تو یہ بھائی اس بہن کے سارے مال کا وارث ہوگا جو کہ بطور عصبہ ہے۔ فَإِنْ كَانَتَا: ضمیران کی طرف راجع ہے جو إِخْوَةٌ کے اعتبار سے وارث ہوں: اثْنَتَيْنِ اس سے دو بہنیں مراد ہیں۔ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ: اس سے مراد وہ شخص ہے جو کلالہ ہو کر فوت ہوا ہو اور اس کے دو یا دو سے زیادہ بہنیں ہوں تو ان سب بہنوں کو مال کے تین حصے بنا کر دو حصے دیں گے اور ایک حصہ یعنی تیسرا حصہ عصبہ اگر موجود ہو اس کو دیا جائے گا البتہ اگر کوئی عصبہ موجود نہ ہو تو واپس ان بہنوں کو دیا جائیگا۔ وَإِنْ كَانُوا إِخْوَةً رِجَالًا وَنِسَاءً: یہاں پر إِخْوَةً کے ساتھ اخوات بھی مراد ہیں جو نساء کے قرینہ سے ثابت ہے یعنی کوئی بہن یا بھائی فوت ہو جائے اور ان کے وارث دو یا دو سے زیادہ بہن بھائی ہوں تو فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ: یہ چار مسائل اخوات کی وراثت سے متعلق ہیں: يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ أَنْ تَضِلُّوا: بصریوں اور مبرد کے نزدیک مضاف مقدر ہے یعنی كَرَاهِيَةَ أَنْ تَضِلُّوا: (تمہاری گمراہی کو ناپسند کرتے ہوئے) اور کوفیوں فراء بغوی اور کسائی وغیرہ کے نزدیک لام مقدر ہے یعنی لِئَلَّا تَضِلُّوا: اور یہ اللہ تعالی کے اس قول کی طرح ہے کہ إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا: سورۃ فاطر آیت 41 آلوسی اور صاحب اللباب رحمہم اللہ نے تیسری توجیہ ذکر کی ہے کہ مقدر عبارت کی ضرورت نہیں ہے بلکہ معنی یہ ہے اللہ تعالی گمراہی کی وضاحت کرتا ہے اسلئے کہ اس سورۃ میں بہت سارے مسائل جاہلیت کے ذکر ہو گئے اس مقصد کیلئے تاکہ ان سے اجتناب کیا جائے: وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ: وہ عالم ہے ان حکموں اور حکمتوں پر جن میں تمہارے لیے دنیا و آخرت کے فائدے ہیں۔ فائدہ 1: اس سورۃ کی پہلی آیت میں اللہ تعالی کی قدرت کا ذکر ہے اور آخری آیت میں اس کا علم ذکر ہوا ہے اور یہ دونوں صفتیں اللہ کی تمام الوہیت اور ربوبیت کی صفتوں کا مرجع ہیں یعنی ان دو صفتوں نے تمام صفتوں کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ فائدہ 2: امام سیوطی کا قول ہے کہ اس سورۃ کے آخر میں احکام میراث ذکر ہوئے ہیں جو انسان کی موت سے متعلق ہیں اس میں اشارہ ہے کہ ہر انسان کا اختتام موت پر ہے۔ اے اللہ ہم سب کے آخری انجام کو بہتر بنا اور ہمارا خاتمہ ابرار اور صالحین کے ساتھ فرما (اللّٰهُمَّ آمِين)۔

اس سورۃ کے امتیازات:

۱۔ جہالت کے مظالم سے یتیموں، بے کسوں اور کمزوروں کا دفاع۔

۲۔ خواتین پر روا رکھے گئے مظالم کے خاتمے کیلئے اصول۔

۳۔ میراث کے حصوں کی تقسیم زوجیت، ولادت یا اخوۃ کے سبب سے۔

۴۔ ان خواتین کا تذکرہ جن سے نکاح جائز نہیں۔

۵۔ منافقین کی (34) خباثتوں کا ذکر۔

۶۔ اہل کتاب کے (38) خباثتوں کا ذکر۔

۷۔ قصداً یا خطاءً کسی مؤمن کو قتل کرنے کا حکم۔

۸۔ صلوٰۃ سفر اور خوف کا حکم۔

۹۔ شرک پر سخت رد کہ اس کے مرتکب بخشش نہیں۔

۱۰۔ اللہ تعالیٰ کے لئے صفت کفی جبکہ حسیب شہید نصیر و کیل صفات کا ذکر۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِمُؤَلِّفِ الْكِتَابِ وَ كَاتِبِهٖ وَمَنْ اَعَانَ فِیْ هٰذَا الشَّانِ بِرَحْمَتِكَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ